

واپسی کی شرط پر خرید و فروخت (بیع و فاء)

[اسلامك فقء اكيڈمي (انڈيا) كے بائيسويں سمينار مورخه ۹ تا ۱۱ مارچ ۲۰۱۳ء منعقدہ جامع مسجد امروہہ
(اتر پرديش) ميں پيش كئے جانے والے علمي و تحقيقي مقالات، مباحثات اور مناقشات كا مجموعہ]

ايفا پبليڪيشنز - نئي دھلي

جملہ حقوق بحق، ناشر محفوظ

نام کتاب : واپسی کی شرط پر خرید و فروخت (بیع وفا)
صفحات : ۶۷۸
قیمت :
سن طباعت : فروری ۲۰۱۳ء
کمپوزنگ : محمد سیف اللہ

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱- ایف، بیسمنٹ، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی- ۱۱۰۰۲۵

ای میل: ifapublication@gmail.com

فون: 011 - 26981327

مجلس اولیٰ

- ۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی
- ۲- مولانا محمد برہان الدین سنہجلی
- ۳- مولانا بدر الحسن قاسمی
- ۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- ۵- مولانا عتیق احمد بستوی
- ۶- مفتی محمد عبید اللہ سعیدی



فہرست

۱۱	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	پیش لفظ
۱۳	۱- حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی صاحب	خطابات:
۱۶	۲- حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب	
۲۱	۳- جناب محمود صاحب (وزیر)	
۲۲	۴- حضرت مولانا عبداللہ مغیشی صاحب	
۲۵	۵- ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب	
۲۷	۶- حضرت مفتی زبیر بیات صاحب	
۲۹	۷- حضرت مفتی ابراہیم بہام صاحب	کلمات تشکر:
۳۰	۱- حضرت مولانا عتیق احمد بستوی صاحب	
۳۱	۲- مولانا مفتی عفان صاحب	
	پہلا باب: تسمیہ و امور	
۳۵		اکیڈمی کا فیصلہ
۳۶		سوالنامہ
۳۸	مفتی احمد نادر القاسمی	تلخیص مقالات
۶۶	۱- مفتی عبدالرزاق قاسمی	عرض مسئلہ:
۸۰	۲- مفتی منصف بدایونی	
	دوسرا باب: تفصیلی مقالات	
۸۹	ڈاکٹر شیخ محمد محروس المدرس (بغداد)	بیع و فاء اور رہن سے استفادہ کا شرعی حکم
۱۰۱	مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی	بیع بالوفاء کے شرعی احکام
۱۱۲	مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی	موجودہ حالات میں بیع الوفاء میں بیع سے استفادہ کا حکم
۱۲۳	مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی	بیع و فاء، مسائل اور احکام
۱۳۰	مفتی شبیر احمد قاسمی	بیع الوفاء کی شرعی حیثیت

۱۴۹	مولانا محمد سلمان منصور پوری	حکم بیع الوفاء؛ بصورت عقد بیع
۱۵۹	ڈاکٹر مفتی شاہجہاں ندوی	بیع و فاء کے احکام اور متبادل کی تلاش
۱۷۱	مولانا خورشید انور اعظمی	بیع و فاء- احکام و مسائل
۱۸۱	مولانا عبدالقیوم پالنپوری	بیع و فاء اور اس کا شرعی حکم
۱۹۲	مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی	بیع و فاء کی شرعی حیثیت
۲۰۲	مولانا خورشید احمد اعظمی	بیع الوفاء فقہاء کی تشریحات کی روشنی میں
۲۱۳	مفتی عبدالرزاق قاسمی امر وہوی	بیع الوفاء اور بیع سے انتفاع کا حکم
۲۲۸	مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی	بیع و فاء- چند جدید فقہی مسائل
۲۴۰	مولانا راشد حسین ندوی	بیع و فاء- شرعی نقطہ نظر
۲۴۹	مولانا محمد منصف بدایونی	بیع الوفاء اور اس کے احکام
۲۵۸	مفتی عبدالرشید قاسمی	بیع و فاء جواز و عدم جواز کی تفصیلات
۲۶۷	مفتی محمد عارف باللہ قاسمی	بیع و فاء شریعت کی نظر میں
۲۷۶	مولانا محمد مغفور باندوی	بیع و فاء- احکام و مسائل
۲۸۳	مولانا محمد عظمت اللہ ہدایت اللہ میر	بیع الوفاء ایک تحقیقی جائزہ
۲۹۴	قاضی وصی احمد قاسمی	بیع و فاء سے متعلق مسائل و احکام
۳۰۶	مولانا محمد یاسر قاسمی	بیع الوفاء کی حقیقت اور حکم
۳۲۷	مفتی محمد زاہد گڑھی سلیم پور	بیع و فاء پر احکام ربہن کا ترتیب
۳۶۰	مولانا رحمت اللہ ندوی	بیع الوفاء- حقیقت اور حکم
۳۶۸	مولانا حبیب اللہ اشہر بستوی	بیع الوفاء اور مال مرہون سے انتفاع
۳۷۷	مولانا شاہد علی قاسمی	بیع و فاء میں بیع سے فائدہ اٹھانا
۳۸۶	مفتی محمد یوسف قاسمی جوڈھپوری	بیع الوفاء میں بیع کے اجارہ و فروخت کی شرعی حیثیت
۳۹۵	مولانا محمد عمران ندوی	بیع و فاء- شرعی حیثیت اور حکم
۴۰۳	مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر، داہودی	بیع و فاء- احکام و تفصیلات
۴۳۶	مفتی سعید الرحمن قاسمی	بیع الوفاء کا شرعی حکم
۴۴۴	مفتی محمد خالد حسین نیوی قاسمی	بیع و فاء کے شرعی احکام اور دلائل
۴۵۲	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	بیع و فاء- حقیقت و احکام
۴۶۰	مولانا راجہ الامین	بیع و فاء اور اس کا حکم

۴۷۳	مولانا عمران اللہ قاسمی	بیع و فاء اور اس کی تفصیلی بحث
۴۸۱	مولانا محمد فاروق	بیع الوفاء شریعت کی نظر میں
تیسرا باب: مختصر تحریریں		
۴۹۱	مفتی جمیل احمد نذیری	بیع بالوفاء کی حقیقت اور حکم
۴۹۶	مفتی شیر علی گجراتی	بیع و فاء کی شرعی حیثیت
۴۹۸	مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی	بیع الوفاء کی حیثیت اصول شرع کی روشنی میں
۵۰۱	مفتی انور علی اعظمی	بیع و فاء سے متعلق احکام
۵۰۶	ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	بیع و فاء سے متعلق احکام اور مسائل
۵۱۲	مولانا ابوسفیان مفتاحی	بیع و فاء اپنے حکم کے اعتبار سے بیع ہے
۵۱۶	مفتی محمد عبدالرحیم القاسمی	بیع الوفاء کے شرعی احکام
۵۲۲	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	بیع و فاء میں انتفاع کا حیلہ
۵۲۸	مفتی سلمان پالنپوری قاسمی	بیع و فاء کی شرعی حیثیت
۵۳۳	مولانا اشرف عباس قاسمی	بیع و فاء اور فقہاء کی تشریحات
۵۴۱	مولانا کلیم اللہ عمری	بیع و فاء کی شرعی حیثیت
۵۴۸	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	بیع و فاء میں بیع و اہبسی کی شرط کا حکم
۵۵۴	مولانا محمد عرفان منصور پوری	ضرورت شدیدہ میں بیع و فاء سے استفادہ کا حکم
۵۵۸	مولانا عبداللطیف پالنپوری	بیع بالوفاء میں بیع سے استفادہ کا حکم
۵۶۲	مولانا محمد الاعظمی	بیع و فاء فقہاء کی نظر میں
۵۶۴	مفتی محمد مقصود فرقانی	بیع و فاء کا حکم
۵۶۹	مولانا محمد صادق مبارکپوری	تعال کی وجہ سے بیع و فاء میں بیع سے استفادہ
۵۷۳	مولانا ابرار خان ندوی	بیع و فاء کی حیثیت
۵۷۸	مفتی ریاست علی قاسمی رامپوری	بیع و فاء کا شرعی حکم
۵۸۱	مولانا غلام اللہ کاوی	بیع الوفاء شریعت کی نظر میں
۵۸۵	مفتی شبیر احمد دہلوی	بیع و فاء اور کراریہ کے مکان پر ڈپازت رقم کا حکم
۵۸۸	مولانا قمر الزماں ندوی	بیع و فاء (بیع بشرط و اہبسی) کا شرعی حکم
۵۹۲	مولانا حفیظ الرحمن مدنی	بیع بالوفاء مسائل اور احکام
۵۹۷	مولانا عبدالرحمن مفتاحی	بیع و فاء کے سلسلہ میں فقہاء کی آراء
۶۰۰	مفتی جنید بن محمد	بیع و فاء کے بیع اور رہن ہونے کا مسئلہ

۶۰۵	مولانا عبدالشکور قاسمی	بیچ و فاء کی شرعی حیثیت
۶۰۶	مفتی محمد شرف قاسمی	بیچ و فاء کا حکم
۶۰۸	مفتی محمد شاہد قاسمی	بیچ و فاء تعریف اور احکام
۶۱۲	مولانا یوسف علی	بیچ و فاء کی فقہی حیثیت
۶۱۷	مولانا عبدالخالق رامپوری	بیچ و فاء وقت کی ایک اہم ضرورت
۶۲۱	مولانا محمد رمضان علی فرقانی	بیچ الوفاء کا شرعی حکم
۶۲۸	مولانا نعیم اختر قاسمی	بیچ و فاء کی شرعی حیثیت
۶۳۴	مولانا ارشد دوساوا	بیچ و فاء اور دیگر متعلقہ احکام
۶۳۷	مفتی معز الدین قاسمی	بیچ الوفاء مسائل و احکام
۶۴۳	مولانا محمد عبید اللہ ندوی	بیچ الوفاء کی حقیقت اور شرعی حکم
۶۴۶	مولانا محمد روح اللہ قاسمی	بیچ و فاء کا حکم
۶۵۳	مفتی عبدالنواب اناری	بیچ الوفاء کے احکام
۶۵۸	مولانا احسن عبدالحمق ندوی	بیچ الوفاء کے شرعی احکام
۶۶۲	مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی درہنگوی	بیچ و فاء - بیچ ہے یا رہمن؟
۶۶۷	مولانا محمد نکیل اسلام پوری سعادت	بیچ الوفاء کی تحلیل و تجزیہ
۶۷۴	مفتی لطیف الرحمن ولایت علی	بیچ یا الوفاء - اسلامی نقطہ نظر

ریس لفظ

شریعت کے بعض احکام عبادات سے متعلق ہیں اور بعض معاملات اور دیگر مسائل زندگی سے، عبادات کے معاملے میں شریعت کا عمومی مزاج یہ ہے کہ ان کے مقاصد بھی متعین ہیں اور ان کے طریقہ کار اور ظاہری شکل کو بھی پوری طرح متعین کر دیا گیا ہے، جیسے نماز کا مقصد فُشاء و منکر سے بچانا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نماز کا پورا طریقہ نیت اور تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک قرآن و حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے، اس میں قیاس اور اجتہاد کی بہت کم گنجائش رکھی گئی ہے، اس کے برخلاف مثلاً خرید و فروخت کا معاملہ ہے، اس کا مقصد بنیادی طور پر ملکیت کی منتقلی ہے، جب کسی چیز کی بیع ہوتی ہے تو وہ بیچنے والے کی ملکیت سے نکل کر خریدنے والے کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، اس سلسلے میں صرف بنیادی اصولوں کی راہ نمائی فرمائی گئی ہے، جیسے یہ کہ ایسے معاملات باہمی رضامندی سے طے پانے چاہئیں، ایسا ابہام نہ ہونا چاہئے جو نزاع کا سبب بن جائے، جب تک کوئی چیز ملکیت اور قبضہ میں نہ ہو اگلے شخص سے اس کو بیچنا درست نہیں ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچنے والا اس شئی کو مہیا نہ کر پائے اور خریدار دھوکہ کھا جائے، اس طرح کی تمام تفصیلات کو قرآن و حدیث میں متعین نہیں کیا گیا ہے، تاکہ انسان کو اس میں آزادی حاصل رہے۔

غرض کہ احکام شریعت میں اشکال کی بھی اہمیت ہے اور مقاصد کی بھی، کسی فعل کو انجام دینے کے لئے جو صورت انجام دی جائے، اس کو بھی اہمیت حاصل ہے اور اس کے پیچھے جو مقاصد کار فرما ہیں وہ بھی اہم ہیں، لیکن معاملات کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو شکل کے اعتبار سے درست نظر آتی ہیں، مگر مقاصد کے اعتبار سے شریعت کے مزاج سے متصادم، جیسے: بیع عینہ، بیع عینہ دو افراد کے درمیان ہوتی ہے، جس میں ایک شخص اپنا کوئی سامان نقد کم قیمت میں فروخت کرتا ہے اور پھر اسی بیچنے والے شخص سے وہی چیز ادھار زیادہ قیمت میں خرید کر لیتا ہے، اس طرح نقد بیچنے والے کو نقد رقم حاصل ہو جاتی ہے، جس کی اس کو ضرورت تھی اور دوسرے فریق کو زائد رقم مل جاتی ہے، جو اس کا مقصود تھا، ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ خرید و فروخت کا معاملہ ہے، لیکن مقصد اور مال کے اعتبار سے سود کی شکل معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص کو قرض کی ضرورت تھی اس نے نقد رقم حاصل کرنے کے لئے زیادہ پیسے ادا کئے اور کم پیسے حاصل کئے، اس لحاظ سے اس کو جائز نہیں ہونا چاہئے، فقہاء نے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے اسے حرام تو نہیں کہا، لیکن مکروہ تحریمی قرار دیا۔

اسی طرح کے مسائل میں ایک ”بیع وفاء“ کا مسئلہ ہے، جس کا رواج زمانہ قدیم سے رہا ہے اور اس کے تعامل کو

دیکھتے ہوئے بعض متاخرین فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، بیع وفا کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کو نقد پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے شخص کو رہائش کے لئے مکان یا تجارت کے لئے دکان کی، پہلا شخص دوسرے شخص کو اپنا مکان یہ کہہ کر دیتا ہے کہ یہ مکان میں آپ سے فروخت کرتا ہوں، آپ اس سے فائدہ اٹھائیں، لیکن جب مجھے اتنے پیسے ہو جائیں گے تو یہ پیسے ادا کر کے میں آپ سے مکان واپس لے لوں گا، یعنی خرید لوں گا، ظاہری شکل کے اعتبار سے یہ خرید و فروخت کا ایک معاملہ ہے جو آپسی رضا مندی سے طے ہو رہا ہے، شکل کے لحاظ سے اسے جائز ہونا چاہئے، لیکن مقصد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ رہن کی ایک صورت ہے، پہلا شخص مکان رہن رکھ کر قرض حاصل کرتا ہے اور دوسرا شخص رہن پر مکان حاصل کر کے اس سے استفادہ کرتا ہے، گویا یہ رہن سے استفادہ کرنے کی ایک صورت ہے اور رہن سے استفادہ کرنا سود کے دائرہ میں آجاتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرض پر جو بھی نفع حاصل کیا جائے وہ ربا ہے، ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ اب بعض فقہاء نے معاملہ کی ظاہری شکل پر نظر رکھتے ہوئے اور بیع تصور کرتے ہوئے اسے جائز قرار دیا اور بعض نے مقصد کو سامنے رکھا اور قرض پر نفع حاصل کرنے کی ایک شکل قرار دیتے ہوئے اس کو منع فرمایا۔

چونکہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہے اور بڑے شہروں میں کثرت سے اس کا رواج ہے، نیز دونوں فریق اس کو اپنے لئے نفع بخش خیال کرتے ہیں اور اس میں ان کی رضا مندی شامل ہوتی ہے اور دونوں کی ضرورت اس سے پوری ہوتی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مسئلہ پر موجودہ حالات کے پس منظر میں غور کیا جائے، چنانچہ موضوع سے متعلق بڑے اہم مقالات آئے اور سیمینار کے درمیان مناقشات ہوئے، اکیڈمی ہمیشہ ایسے مسائل میں احتیاط اور اعتدال کی راہ اختیار کرتی ہے، اس لئے اس صورت میں عدم جواز کو ترجیح دی گئی، لیکن معاملے کی ایک صورت یہ ہے کہ معاملہ طے پاتے وقت دوبارہ واپس خرید کرنے کی بات نہ کہی جائے، البتہ دونوں فریق کے دل میں یہ بات ہو کہ اگر بیچنے والا اسی قیمت میں دوبارہ خرید کرنا چاہے تو اس سے یہ شئی بیچ دی جائے، تو یہ صورت جائز ہوگی، کیونکہ شریعت کے احکام اس گفتگو پر جاری ہوتے ہیں جو فریقین کے درمیان طے کرتے وقت ہوتی ہے، اس بات پر نہیں جو کسی معاملے کے طے کرنے سے پہلے ہو، یا طے کرنے کے بعد ہو، یا جس کو دل میں چھپا کر رکھا گیا ہو۔

ان مقالات و مناقشات کے مجموعہ کو محبت عزیز مفتی احمد نادر القاسمی (رفیق شعبہ علمی اسلامک فقہ اکیڈمی) نے بڑی محنت اور سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا ہے، امید ہے کہ اکیڈمی کے دوسرے مجلات کی طرح اسے بھی شوق کے ہاتھوں لیا جائے گا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے امت کے لئے نفع کا ذریعہ بنائے۔ آمین

{13}

خطابات:

اجتماعیت کے ساتھ ہونے والا ہر کام طاقتور ہوتا ہے

حضرت مولانا عبدالحق سنہلی صاحب ☆

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد
وعلى آله وأصحابه أجمعين اما بعد۔

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم، ”فلولا نفر من كل فرقة منهم
طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون“

صدر محترم! علماء کرام، محققین عظام و دانشوران قوم اور طالبان علوم نبوت اور بزرگان دین، یہ پروگرام جو اسلامک
فقہ اکیڈمی انڈیا کا یہاں منعقد ہو رہا ہے، یہ ایک طرف جہاں جامعہ کے لئے بہت بڑی سعادت کی بات ہے، وہیں فقہ اکیڈمی
کے لئے بھی ہے کہ اس کو ایسا سٹیج ملا، ایسا مقام ملا کہ جہاں بڑے بڑے محققین، محدثین اور اہم علماء کرام پیدا ہوئے اور جو ایک
تاریخی شہر بھی ہے، جیسا کہ تعارفی کلمات میں ابھی آپ نے سماعت فرمایا، میرا اس جامعہ سے والہانہ تعلق ہے اور یہ جامعہ کے
ارباب بست و کشاد بھی مجھ سے بڑی محبت فرماتے ہیں اور ویسے بھی ہمارے وطن کے صحن میں ہے، یوں تو مجھے اس حیثیت سے
کہ میں آپ حضرات کے لئے میزبانوں کی فہرست میں شامل ہوں، یوں بھی شکر یہ ادا کرنا چاہئے، بہر حال ایسے مجمع میں
جہاں علوم نبوت کے بڑے بڑے محققین، فقہاء محدثین اور محدثین فقہاء، یہ حضرات اور دانشوران قوم جمع ہیں اس میں، میں کیا
لب کشائی کروں، بہر حال یہ اکیڈمی کی بڑی اہم خدمات ہیں، اسے اس کے بانی کا خلاص کہئے، یا موجودہ حضرات کا جو اس کو
چلا رہے ہیں اور اس کے تحت یہ کام ہو رہا ہے اور اتنا صالح دینی اور طاقتور مواد قوم کو مل رہا ہے، کتنی تحقیقات و نشریات سامنے
آ رہی ہیں، میرا احساس ہے کہ بڑا علمی کام ہو رہا ہے، ظاہر ہے کہ علماء کرام اور فقہاء عظام کا ہاتھ ملت کی نبض پر ہوتا ہے وہ
دیکھتے ہیں کہ دور حاضر میں زمانے کی نبض، ملت اسلامیہ کی نبض کس طرح حرکت کر رہی ہے، اس کو کیسی دوا اس کے مرض کے

مطابق اور کونسی دو اس کے لئے تجویز ہونی چاہئے۔

یہ علماء کرام برابر سوچتے رہتے ہیں اور اس طرح کا تحقیقی کام پہلے بھی ہوتا رہا ہے، لیکن اجتماعیت کے ساتھ جو کام ہوتا ہے اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے اس میں بڑا وزن ہوتا ہے، تو بہر حال انہیں کاموں کی فہرست میں اس کے یہ سمینار بھی ہیں، جگہ جگہ یہ جو سمینار ہوتے ہیں اور ان میں ہمارے یہ علماء کرام اور فقہاء عظام اپنی اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں، ان سے ملت کو بڑا فائدہ ہوتا ہے، ہمارے اکابر، ابتدائے اسلام اور شروع ہی سے اور عہد نبوت سے برابر یہ غور و فکر کا کام کرتے چلے آ رہے ہیں، قرآن پاک کے اعلان کے مطابق ”فاعتبروا“ کے تحت ”ردالشیء الی نظیرہ“ کے تحت، آپ اعتبار کی تعریف جانتے ہیں، اس میں یہ قیاس بھی آتا ہے، تحقیق بھی آتی ہے، تو اس فن کے شناور برابر غوطہ زنی کر کے آبدار موتی نکالتے رہتے ہیں، قیمتی موتی نکالتے رہتے ہیں، غور و فکر کرتے رہتے ہیں، مجھے ایک واقعہ اس پر یاد آ رہا ہے، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب نے اپنی تفسیر ”معارف القرآن“ میں ”سورہ نحل“ کے شروع میں جہاں یہ آیتیں آئی ہیں: ”والخیل والبغال والحمیر لتركبوها وزینة ویخلق مالا تعلمون“ (سورہ نحل: ۱۶) اس کے تحت لکھا ہے کہ: حضرت مولانا یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہ جو سب سے پہلے صدر مدرس ہیں، دارالعلوم دیوبند کے اور جتہ الاسلام امام نانوتوی کے ہم سبق ساتھی ہیں، بہر حال وہاں انہوں نے واقعہ اس آیت: ”والخیل والبغال لتركبوها وزینة ویخلق مالا تعلمون“ (سورہ نحل: ۱۶) کے تحت لکھا ہے کہ جہاں اس آیت میں سواروں کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے گھوڑوں کو پیدا کیا، نچروں کو پیدا کیا، آرام و راحت کے لئے، سواری کے لئے، آرائش کے لئے اور وہیں یہ بھی فرمایا: ”ویخلق مالا تعلمون“ (سورہ نحل: ۱۶) اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں بھی پیدا کرنے والا ہے جو اس وقت حاشیہ خیال تک میں بھی نہیں ہیں، حضرت مولانا یعقوب صاحب نے اس کی روشنی میں فرمایا: ٹرین کا ثبوت قرآن پاک سے ملتا ہے، ان کے شاگرد حیرت میں پڑ گئے، ان کے شاگردوں میں بیان کرنے والے کون ہیں؟ حضرت مفتی شفیع صاحب کے والد مولانا یسین صاحب وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ حضرت مولانا یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند جو سب سے پہلے صدر مدرس ہیں، نے فرمایا کہ ٹرین کا ثبوت قرآن پاک سے ملتا ہے، شاگردوں نے کان کھڑے کئے، کہ یا اللہ کس طرح یہ ثبوت ہو سکتا ہے، قرآن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے دور دور تک، تو فرمایا کہ یہ جو کہا گیا ہے قرآن میں: ”ویخلق مالا تعلمون“ (سورہ نحل: ۱۶) کہ عنقریب ایسی سواریاں وہ وجود میں لانے والا ہے منصف شہود پر، ایسی ایسی سواریاں آنے والی ہیں، جو تمہارے حاشیہ خیال تک میں بھی نہیں ہیں، اس سے یہ ٹرین کا ثبوت ملتا ہے، تو مفتی شفیع صاحب اس کے تحت لکھتے ہیں کہ اگر اس زمانے میں ہوتے حضرت تو فرماتے کہ جہاز کا ثبوت بھی قرآن پاک سے ملتا ہے کہ ایسی ایسی سواریاں آنے والی ہیں کہ جن کو ابھی ظاہر نہیں کیا جاسکتا، لیکن عنقریب وجود میں آنے

والی ہیں جو تمہارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں، یہ ہے ان حضرات کا انداز غور و فکر۔

حضرت مفتی نسیم صاحب فریدی کا ابھی تعارفی کلمات میں ذکر ہوا ان ہی کا ایک واقعہ دارالعلوم دیوبند کے رسالہ میں چھپا تھا، حضرت مولانا نسیم صاحب فریدی نے، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ سے ابو داؤد شریف پڑھی تھی، وہ اپنے سبق کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک حدیث کا ذکر آ گیا، حضرت نے اس موقع پر فرمایا کہ یہ جو طلبا کے لئے رجسٹر حاضری ہوتا ہے اس کا ثبوت حدیث شریف سے ملتا ہے، طلباء کو حیرت ہوئی کہ یا اللہ یہ رجسٹر کا ثبوت کیسے حدیث سے دیں گے، تو حضرت نے وہ جو روایت میں آتا ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ جمعہ سے پہلے اذان کے بعد فرشتے رجسٹر لے کر دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جتنے لوگ خطبہ سے پہلے مسجد میں آتے ہیں ان کا نام رجسٹر میں درج ہوتا رہتا ہے، اور جب خطبہ کا وقت ہوتا ہے اذان ہوتی ہے۔ ”اذا خرج الإمام فلا صلوة ولا كلام“ اب نہ نماز کی اجازت ہے، نہ کلام کی اجازت ہے۔ امام آ گیا اور خطبہ شروع ہونے والا ہے، تو اس وقت یہ رجسٹر بند کر کے خطبہ سننے بیٹھ جاتے ہیں، تو حضرت نے فرمایا کہ دیکھئے! یہ جو حدیث شریف میں ہے کہ اذان کے بعد خطبہ سے پہلے آگئے انہیں حسب مراتب اور درجات کے اعتبار سے ان کی حاضری ہوتی رہتی ہے، اس سے رجسٹر حاضری کا ثبوت ملتا ہے۔

بہر حال یہ ہمارے اکابر اور اسلاف ہیں:

”اولئک ابائى فجنئى بمثلهم

اذا جمعتنا یا جریر الجامع

یہ علماء برابر کام کرتے رہیں گے، ”لیتفقہوا فی الدین“ (سورہ توبہ: ۱۲۲) کے تحت، تفقہ اور تحقیقات کا کام ہوتا رہے گا، اس کے لئے اللہ نے ان حضرات کو کھڑا کیا ہے، یہ جو کام ہو رہا ہے اس کی آواز پر آپ حضرات نے ماشاء اللہ لیدیک کہا اور امت کا کھن یہاں جمع ہو گیا ہے، بہت سے مقالات اور تحقیقات سامنے آئیں گی انشاء اللہ، اس کا بھی فائدہ ہوگا۔

مسائل کا حل اور رہنمائی علماء کی ذمہ داری ہے

حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب ☆

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

محترم ذی وقار صدر مجلس، علماء کرام، عمائدین ملت، حضرات اساتذہ، عزیزان گرامی طلباء، آج آل انڈیا اسلامک فقہ اکیڈمی کا بائیسواں اجلاس اس تاریخی جامعہ ”جامعہ اسلامیہ عربیہ مروہہ“ میں منعقد ہو رہا ہے اور ہم سب اس مبارک موقع پر یہاں جمع ہیں، الحمد للہ خطبہ استقبالیہ میں جامعہ کا مکمل تعارف آپ کے سامنے آیا، یہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے یہاں علوم دینیہ کی تعلیم، اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت جو یہاں دی جاتی رہی ہے، آج سے ۴۶ سال قبل جب میں اس جامعہ میں حاضر ہوا تھا اس وقت مجھے اس جامعہ میں ایک ایمانی اور روحانی کیفیت کا مشاہدہ ہوا اور آج جب کہ جامعہ ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہا ہے، الحمد للہ یہاں تعمیرات کا بھی ایک بڑا حصہ انجام پایا ہے، اور تعلیم بھی دورہ حدیث اور تخصصات اور حفظ و تجوید ہو رہی ہے، اس میں حاضر ہونے پر اور اس کو دیکھ کر بے انتہاء خوشی ہوئی اور اس بات کی زیادہ خوشی ہوئی کہ ہمارے اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذمہ داروں نے اس مبارک جگہ کا انتخاب کیا، جو تاریخی بھی ہے اور ہمارے اکابر علماء کی جولان گاہ اور ان کی خدمات کا مرکز بھی ہے، جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا) نے بہت جامع انداز میں فقہ اکیڈمی کا تعارف ہمارے سامنے کرایا کہ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟

۱۳/۱۳ اپریل ۱۹۷۳ء میں باضابطہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آ گیا تو مسلم پرسنل لا کے قیام عمل کے بعد طرح طرح کے مسائل ہمارے سامنے آنے لگے، نکاح، طلاق، وراثت، گارجین شپ، حضانت، وقف وغیرہ کی شرعی حیثیت سے متعلق، اس وقت یہ خیال ہوا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ماتحت ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کیا جائے جس میں ہمارے چند علماء ہوں اور ماہرین بھی ہوں، وہ علماء کی جماعت شریعت اسلامی کے مطابق ان مسائل کی تحقیقات کرے جو مسلم پرسنل لا کو درپیش ہیں، لیکن جب اس پر گفتگو ہوئی تو بورڈ کے پاس اتنی استطاعت نہیں تھی، لیکن یہ بات ہم لوگوں کے درمیان

طے پائی کہ اس سے علاحدہ ایک ایسا تحقیقاتی ادارہ قائم ہونا چاہئے، تاکہ مسلم پرسنل لاء کے علاوہ اور بھی جو نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں عوام کو ہمارے فیصلہ کا انتظار ہوتا ہے، وہ ادارہ جواب دے سکے، چنانچہ اس کے لئے مستقل ایک تحقیقاتی ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے نام سے قائم ہوا اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے جس کی تاسیس فرمائی، جس میں ملک کے سبھی گوشے سے علماء کرام نے شرکت کی، یہ اس ادارہ کا پس منظر ہے، یہ اس کی ضرورت ہے اب جب قیام عمل میں آ گیا تو دونوں کی اہمیت بڑھتی چلی گئی، مسلم پرسنل لاء کے سامنے بھی مسائل کی اہمیت بڑھتی چلی گئی، فقہ اکیڈمی کے سامنے بھی، اس کے سمینار ہوتے رہے، الحمد للہ یہ بائیسواں سمینار ہے جس میں آپ سب حضرات جمع ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اجتماع علماء کا جو سمجھنے کہ منتخب حضرات ہیں جو قرآن پاک میں کہا گیا ہے: ”ہو اجتباکم“ اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب کر لیا ہے، ”وما جعل علیکم فی الدین من حرج“ (سورہ حج: ۲۹) اور دین میں کوئی تنگی باقی نہیں رکھی، کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ جس کا جواب شریعت اسلامی میں نہ ہو، اس کی اس حیثیت سے جو اس ادارے کی خدمات ہیں بڑی لائق قدر اور لائق تحسین ہیں اور اس میں جو حضرات حصہ لیتے ہیں وہ بھی قابل مبارکباد ہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کی ذمہ داری ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں۔

آج الحاد، بے دینی، فحاشی اور عریانیت بڑھتی جا رہی ہے اور مختلف طریقوں سے وہ برائیاں جو پورے معاشرے میں پھیل جاتی ہیں اس کو جواز کا حکم دے دیا جا رہا ہے، بے پردگی، بے حیائی، مخلوط تعلیم، جنسی تعلیم اور بہت سی صورتیں ایسی ہیں جب پھیل جاتی ہیں لوگوں میں تو بڑے چھوٹے سب مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے اس ابتلاء عام کے زمانے میں ہماری ذمہ داری بڑھتی ہے کہ ایک طرف تو یہ تحقیقی کام آپ کر رہے ہیں، یہ بھی ضروری ہے، لیکن ایک طرف جہاں آپ اداروں سے منسلک ہیں جہاں آپ مدارس میں ہیں، جہاں جماعتوں میں ہیں، جہاں خود آپ کا اپنا مقام ہے، اپنے اپنے مقام پر گویا آپ مرجع ہیں، آپ عوام کے رہنما ہیں، مرجع ہیں، پیشوا ہیں، اس لئے ان کے اندر چار صفات کا ہونا ضروری ہے، اول تو یہ کہ استقامت علی الحق ہو، دوسرے استغناء عن الخلق، خلق سے وہ مستغنی ہو، صرف ان کے مالیات سے نہیں صرف ان کے نذرانے سے نہیں، بلکہ مدح سرائی سے بھی بے نیاز ہو، کون ہمارے حق کی بات کی تعریف کرتا ہے اور کون ہمارے حق بات کی مذمت کرتا ہے اس سے بے نیاز ہونا چاہئے، یہ استغناء کی صفت ہمارے اکابر میں تھی، ہم نے خود دیکھا ہے، تیسری صفت داعیانہ کردار ہے، آپ جہاں بھی ہوں آپ داعی ہیں اسلام کے، آپ کا سراپا، آپ کا لباس، آپ کی وضع قطع، آپ کے مدرسوں کا رنگ، آپ کے طلبہ یہ سب ایک پیغام ہوں لوگوں کے لئے، مثالی نمونہ ہوں، کہ اسلام ایسے ہی انسان پیدا کرتا ہے، ایسے ہی کردار سازی کرتا ہے تو اس طرح سے ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس چیز پر اپنے داعیانہ کردار کو کبھی فراموش نہ کریں، کہ آپ بہر حال علوم نبوت کے وارث ہیں، اس کے حامل ہیں، اس کو پھیلانا اس کو عوام تک پہنچانا ان کی اصلاح کی

ذمہ داری ہم پر ہے، اگر وہ گمراہ ہوتے ہیں اگر وہ خرافات میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہم اس کے جواب دہ ہوں گے، اگر ہم اس کو دیکھتے ہوئے خاموش رہتے ہیں تو ہم اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں، آپ اس سے متعلق حدیث سن چکے ہیں: ”من رأى منكم منكراً فليغيره بيده الخ“ (مسلم) منکر کو مٹانا معروف کو پھیلانا ہماری ذمہ داری ہے۔

چوتھی صفت ہے عالمانہ وقار: عالمانہ وقار آپ کے اندر ہونا چاہئے، عامیانہ نہیں، لوگ آپ کو اپنی خواہشات کی طرف لے جائیں، ایسا نہ ہو، بلکہ آپ لوگوں کی خواہشات کو دین کی طرف موڑیں، ہم تو دیکھتے ہیں، اکثر و بیشتر الحمد للہ یہ جگہ تو بہت بہتر ہے، ہمارے بزرگوں کی جگہ ہے، لیکن بہت سی جگہ مدرسوں میں اب جو جلسے ہوتے ہیں تو عوام کی خواہش کے مطابق ہوتے ہیں، نعت خوانوں کا ایک گروہ ہوتا ہے، چندہ کرنے والے مقررین کی تقریروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، اصل فائدہ مدرسہ کے جلسہ کا ہونا چاہئے دعوتی کام وہ نہیں ہو پاتا، اس کے لئے مزاج بنانے کی ضرورت ہے، جب ہمارے علماء کا مزاج عالمانہ وقار بن جائے گا تو وہ عوام کو اپنی رائے کی طرف موڑیں گے اور بتائیں گے، ہونا کیا چاہئے اور کس طرح ہو، اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں گے، اپنی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہ دیں گے، اور میں اس کی بہت مثالیں دیتا ہوں، میں نے حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کو دیکھا اور بھی بہت سے بزرگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہم کو ان کے راستے سے ہٹنا نہیں چاہئے، ہم جس قدر اپنے اکابر اور اسلاف کے راستے پر قائم رہیں گے، اتنا ہی زیادہ ہم عوام کو دین پر قائم رکھ سکیں گے۔

یہ بڑے فتنہ کا دور ہے، قدم قدم پر فتنہ ہے، اب دیکھئے! پچاس فیصد عورتوں کو پنچایت الیکشن میں کھڑے ہونے کی اجازت ہے، اب پنچایت الیکشن میں کھیا کی پوسٹ پر عورتیں آئیں گی، اگر نہیں آتی ہیں تو مسلمانوں کی ہر جگہ سیٹیں حذف ہو جائیں گی، نتیجہ یہ ہے کہ بہار میں تقریباً ۵۲ سیٹیں کھیا کی مسلمانوں کی جو تھیں وہ ختم ہو گئیں، اور غیر مسلم عورتیں کھیا کی جگہ پر آئیں، عورتوں کی آزادی، عورتوں کو بااختیار بنانا، حقوق نسواں کا نعرہ لگایا جا رہا ہے، یہ سب الحاد اور بے دینی کی فضا ہے، یہ سب عمل میں لایا جا رہا ہے، دیکھتے دیکھتے یہ سب چیزیں مزید پھیل جائیں گی، ہمارے پاس لوگ مسئلہ پوچھنے کے لئے آتے ہیں، کیا کریں؟ کھیا تھے، علاقے میں ہمارا نام تھا، اب یہ سیٹ عورت کے نام پر ہو گئی، ہم اپنی بیوی کو کھیا کی سیٹ پر کھڑی کر سکتے ہیں یا نہیں، عورت کھیا کا الیکشن لڑ سکتی ہے یا نہیں، کھیا بن سکتی ہے یا نہیں، اب یہ مسائل آپ کے سامنے آئیں گے، وہ مگر نگم میں، یعنی کارپوریشن میں چیئرمین ہو سکتی ہے یا نہیں؟ مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں ایسی بہت سی باتیں گھر کرتی چلی جاتی ہیں، جو ہم کو اسلاف کے راستے سے ہٹاتی ہیں، ہمیں بتانا ہوگا، آج مولانا نے اپنے خطبہ میں جس لڑکی کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، آج چاروں طرف سے صدا بلند ہوئی کہ موت کی سزا دینا چاہئے، موت کی سزا دینا چاہئے، پھانسی دینا چاہئے،

اور کل تک کیا تھا کہ اسلام میں سزائیں بڑی بے رحمی کی سزا ہے، لیکن آج وہی لوگ وہی حضرات اور میڈیا اور وہ سیاست داں جو کل تک اسلام کی سزاؤں کو، اس کی تعزیرات کو برا بھلا کہتے تھے آج اس سے بڑھ کر مطالبہ کر رہے ہیں۔

اسلام نے تو رجم کی سزا، زنا کی سزا پر ایسی شرائط رکھی ہیں، کہ ان کو پورا کرنا ہی مشکل ہے، اور تاریخ میں مشکل سے ہی سنگسار کی مثالیں ملتی ہیں، اس لئے کہ چار عینی شاہدین اور وہ بھی مرد ہونا ضروری ہے، دوسری قوموں نے ان سزاؤں کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا، لیکن اتنا جان گئے کہ آج زنا کی دو قسمیں پائی جا رہی ہیں: ایک زنا بالجبر اور ایک زنا بالرضا، زنا بالجبر تو قابل سزا جرم ہے اور زنا بالرضا قابل سزا جرم نہیں، غور فرمائیے: یہ سوسائٹی انسانوں کی باقی رہے گی؟، ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے، اسی طریقہ سے انہوں نے شراب کی دو قسمیں رکھیں: ایک قانونی شراب، اور ایک غیر قانونی شراب، لوگ بغیر لائسنس کے جو شراب بناتے ہیں دوکان کھولتے ہیں وہ غیر قانونی ہے، اور حکومت جن کو شراب بنانے یا بیچنے کا لائسنس دیتی ہے وہ قانونی شراب ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، نتیجہ یہ کہ بہت سے جاہل مسلمان محض پیسے کی آمدنی کے لئے بہت سی جگہوں پر لائسنس لے کر شراب کی دوکانیں کھول رہے ہیں، شراب کو حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی قسمیں کی جا رہی ہیں، اخبارات میں، یہ سارے مسائل ایسے ہیں جن پر ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو واقف کرائیں کہ حقیقت میں یہ چیزیں تم کو کہاں لے جائیں گی۔

ہم جس جمہوری حکومت میں رہتے ہیں وہاں ہم کو اپنی رائے دینے کا حق ہے، اور وہاں ہم اپنے عقلی دلائل دے سکتے ہیں، میں اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب بنگال اسمبلی میں ”لے پالک بل“ کی شہادت دینے کے لئے گئے تھے، جو غلط تھا، تو ہم لوگوں نے نہ تو قرآن کی ایک آیت پڑھا نہ کوئی حدیث پڑھی اور نہ یہ کہا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے، ہم نے کہا کہ یہ پورا قانون ہم نے آپ کا پڑھا ہے، یہ ناقابل عمل ہے، بیکار ہے، چلے گا نہیں، اور اس پر عقلی دلائل پیش کئے، جس کی اسمبلی کے چیئرمین نے کافی تعریف کی اور آخر میں وہ بل واپس لے لیا گیا، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ منطق اور علم کلام پڑھنے کو کام میں لانا ہے، یہ موقع ہے کہ ہم اپنے علم کلام کے ذریعہ سے اسے جاری کریں کہ شراب کی دو قسمیں نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ ایک ہی قسم ہے جو انسانی زندگی کو برباد اور تباہ کر دیتی ہے۔

آج دیکھئے! تمباکو کے خلاف قانون بنایا جا رہا ہے، تمباکو موت پیو، تمباکو تو ایک آدمی کو نقصان پہنچاتا ہے جو پیتا ہے اور شراب تو پورے معاشرے کو برباد کرتی ہے، ایک شخص شراب پی کر اپنے بوڑھے ماں باپ کو پیٹتا ہے، شراب پی کر اپنی بیوی بچوں پر غصہ نکالتا ہے، چوری، قتل، آبرو لوٹنا وغیرہ، پورے معاشرے کے لئے ناسور کی حیثیت ہے، اس کی ضرورت ہے کہ ہمیں ایسے مسائل پر غور کر کے ایسے مضامین ہم کو سامنے لانا چاہئے جس کو حکومت کے سامنے بھی پیش کیا جاسکے، ہمیں حق ہے،

یہاں دستور ہمیں پوری طرح سے اس کا حق دیتا ہے کہ ہم اپنی بات کہہ سکیں، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس طرح سے نہ کہیں، بلکہ اس طرح سے کہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے، جس طرح اب یہ قانون آیا کہ ہم جنسی کی شادی، یعنی مرد کی شادی مرد کے ساتھ اور عورت کی شادی عورت کے ساتھ، اب غور فرمائیے، اس میں کیا معقولیت ہے؟ یہ فیصلے سپریم کورٹ کے جج کریں، تعلیم یافتہ لوگ کریں اور ہم اس کا کوئی جواب نہ دیں، ہمیں معقولیت کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہئے اور ان زبانوں میں اس کو شائع کرنا چاہئے جو زبانیں آج سمجھی جاتی ہیں، یا ان اصطلاحات کے ساتھ کہنا چاہئے کہ جو اصطلاحات رائج ہیں اور قانون بنانے والے ان کا استعمال کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس ملک کے اندر اسلام کو باقی رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے، سوال یہ ہے کہ ہم اس میں شامل ہوتے ہیں یا نہیں، اللہ تعالیٰ جن لوگوں کے ذریعہ سے اس ملک میں اسلام کو زندہ رکھے گا ہم اس جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں، اس جماعت میں شامل ہونے کے لئے ہمارے اندر قربانی کا جذبہ ہونا چاہئے، اللہ کا بھیجا ہوا یہ دین رحمت سب کے لئے رحمت بن جائے اور یہ اسلام بازاروں میں، پارلیمنٹ میں، اور مختلف فکر میں چلتا پھرتا نظر آئے، میں کیا کہوں، ہمارے مسلم سماج میں شادیوں کا جو رنگ ڈھنگ نظر آنے لگا ہے اس نے ہمیں شرمندہ کر دیا ہے، ورنہ اسلام میں جو شادی کا مقام ہے، آپ اس کو نکاح کے خطبہ میں بیان کیجئے، غیر مسلم کا مجمع ہو تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں جو عزت عورت کو ہے وہ دنیا کے کسی مذہب میں نہیں، اسلام میں جو طریقہ شادی بیاہ کا ہے وہ سب سے زیادہ آسان ہے، ہم تلک اور جہیز سے جتنے نالاں ہیں دوسری قومیں اس سے زیادہ نالاں ہیں، ہم اسلامی معاشرہ کے لئے اپنی قوم کو جب تیار کریں گے تو یاد رکھیں کہ صالح مسلم معاشرہ کی ہی نہیں تعمیر و تشکیل ہوگی، بلکہ انسانی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل ہوگی، ایمانداری آئے گی، آج بڑے سے بڑا وزیر، بڑے سے بڑا لیڈر گھوٹالہ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا ہے، اگر ہم ایمانداری والی سیاست لائیں، ہم بتائیں کہ سیاست کیا ہے؟ ہم بتائیں کہ تجارت کیا ہے، سرکاری عہدوں پر قائم رہ کر کس طرح سے نظم و ضبط کو قائم کیا جاتا ہے، کیا ایمانداری اس میں ہونی چاہئے؟ اگر ہم یہ ذمہ داری لیں اور مجلسوں میں اپنے داعیانہ کردار کو ثابت کریں، تو سمجھئے کہ بہت جلد ہی انقلاب آئے گا، دنیا منتظر ہے، دنیا بد اخلاقی اور روحانی زوال سے تنگ آ چکی ہے اور ظلم و تشدد سے دنیا کافی پریشان ہے، ایسے میں آپ امن کا، انصاف کا، انسانی مساوات کا پیغام لے کر کے دنیا میں جاسکتے ہیں، اور ایسی مثالیں اپنے اعمال اور اخلاق سے پیش کر سکتے ہیں جس کی دنیا منتظر ہے اور دنیا اس کی تقلید کرنے کے لئے تیار ہے، اور اگر ہم کتاب اللہ، سنت رسول اللہ کے مطابق اپنی زندگیوں کو، اپنی اولادوں کی زندگیوں کو اپنے تلامذہ کو سنواریں اور جماعت تیار کر دیں اسلام پر عمل کرنے والوں کی تو انشاء اللہ عظیم روحانی اور اخلاقی انقلاب اس ملک میں آئے گا، اللہ ہم اور آپ کو نیک و توفیق عطا فرمائے۔

اظہار مسرت و استقبال

جناب محمود صاحب (وزیر)

السلام علیکم! چونکہ میں یہاں مہمانوں کے استقبال کے لئے کھڑا ہوں، اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ آج جو مجمع ہے وہ میری تقریر سننے کے لئے نہیں بیٹھا ہے۔ میں استقبال کرتا ہوں مجمع کے صدر عالی جناب عزت مآب حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی صاحب کا، اس کے بعد عالی جناب عزت مآب حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور امیر شریعت بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ) عالی جناب حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)، عالی جناب حضرت مولانا مفتی اشرف علی بنگلوری (امیر شریعت کرناٹک)، عالی جناب عزت مآب ڈاکٹر عبدالرزاق قسوم (الجزیریا)، عالی جناب عزت مآب ڈاکٹر سید طارق، عالی جناب عزت مآب مولانا ابراہیم بہام (افریقہ)، عالی جناب مولانا عبداللہ مغیثی، عالی جناب مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب (ندوۃ العلماء لکھنؤ)، مفتی عبدالرحمن صاحب، جناب ڈاکٹر جرب شان ترک (ترکی)، ڈاکٹر نجم الدین (ترکی)، شیخ معشوق میماک (ترکی) اور ڈائرس پر بیٹھے دیگر علماء کرام، اور اس شہر میں باہر سے آئے سبھی قابل احترام علماء کرام، اور ادارے کے طلبا کا۔

آج مجھے بے پناہ خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے اپنے شہر میں وہ بڑی شخصیتیں، وہ علماء کرام جنہوں نے ملک اور دنیا کو علم اور قرآن کے دائرہ میں رہ کر ایک نصیحت دی کہ ملک اور ایمان کس طرح سے چلتا ہے، میں ان کا بار بار دل کی گہرائیوں سے اپنی طرف سے اور اپنے شہر والوں کی طرف سے اور آپ سبھی حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں امید کرتا ہوں کہ علماء کرام اور عالم دین کی طرف سے اس امن پرستی کی بستی سے ہم کچھ ایسی نصیحتیں ضرور لے کر جائیں گے۔

میں سرکار کا نمائندہ اور وزیر ہونے کی حیثیت سے اس تاریخی اور اکابر و اسلاف کے شہر میں ایک بار پھر آپ سب کا استقبال کرتا ہوں کہ آپ حضرات نے یہاں تشریف لا کر ہم سب کو، اہل شہر کو اور اس جامعہ کو خدمت کا موقعہ عنایت کیا، اور ہماری عزت میں اضافہ فرمایا۔

تحفظ دین کا سلسلہ اور تجدید

☆ مولانا عبداللہ مغیشی صاحب ☆

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، قال رسول اللہ ﷺ: ”إن الله عز وجل يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة من يجدد لها دينها“۔

عالی قدر محترم اور حضرات علماء کرام! ابھی جو جنرل سکریٹری صاحب نے تعارف کلمات کے نام سے آپ حضرات کو مفصل خطبہ سنایا اسی میں صفحہ چار پر یہ حدیث بھی ہے جو میں نے پڑھی ہے، سنن ابوداؤد کی، یہ حدیث بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دین کے تحفظ اور اسلام کی حفاظت کے لئے اللہ رب العالمین نے حضور پاک ﷺ کی زبان مبارک سے قیامت تک کے لئے مکمل انتظام فرما دیا ہے، ہر دور میں ہر زمانے میں ایسے بزرگ رہے ہیں، اسی بنیاد پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کھڑے ہو کر یہ فرمایا تھا کہ لوگ مرتد ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں، اگر وہ رسی بھی نہیں دیں گے جو اونٹ کے باندھنے کی ہے، زکوٰۃ کے اندر اور دور نبوت میں وہ دے رہے تھے تو میں جہاد کروں گا، یہ پہلا مجدد ہے ملت کا، اور پھر ملت میں اللہ رب العالمین نے حدیث کے مطابق جب جب بھی سو سال کی مدت پوری ہوئی اور حالات بگڑے، خرافات نے وسیع پیمانے پر اپنا دامن پھیلا دیا اور علاقے کے علاقوں کو ارتداد کی شکل میں اور خرافات کی شکل میں مختلف شادیوں کی اور جہیز اور تلک کی لعنت میں گرفتار کر لیا تو اللہ نے ہر دور میں کوئی نہ کوئی مجدد پیدا کر دیا، یہ تفصیل کا وقت نہیں ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وہ مجدد ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پورے عالم کا رخ بدلا، اور اس کے بعد میں یہ بھی فرمایا ہے ہمارے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے کہ مجدد کے لئے ضروری نہیں ہے کہ فرد ہی ہو جماعت بھی ہو سکتی ہے، اللہ نے اس کے بعد میں شاہ ولی اللہ صاحب کی امانتوں کی حفاظت کے لئے دیوبند کے اندر دارالعلوم دیوبند قائم فرمادیا تو ”من“ اس پر صادق آ رہا ہے، اور صادق کیسے نہیں آئے گا اس وقت جتنی پیداوار یہاں بیٹھی ہے یہ ساری کی ساری اللہ کے فضل سے مجاہدین اور دین کے محافظین کی ہے یہ سب دارالعلوم دیوبند ہی کا فیض ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ملک کے اندر ہر دور میں ہر زمانے میں ایسے ادارے اور ایسے افراد اللہ نے پیدا کئے ہیں کہ جنہوں نے دین کی ہمیشہ حفاظت کی، حق پرستوں کی ایک جماعت ہمیشہ رہتی ہے اور اللہ کا فضل ہے کہ آج بھی وہ جماعت موجود ہے، مختلف علاقوں میں مختلف انداز سے مختلف تنظیمیں اپنے اپنے طور پر ملت کی اور اسلام کی حفاظت کرنے کے لئے رات دن سرگرداں رہتی ہیں، سن ۱۹۷۲ میں یہاں ہمارے جنرل سکریٹری صاحب تشریف فرما ہیں مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، اس پرسنل لاء بورڈ سے بھی پہلے اسلام کی حفاظت ہوئی، اور نازک صورت حال پیدا ہوئی تو اللہ رب العالمین نے پھر ہمارے ان اکابر کو پرسنل لاء بورڈ کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں دے دیا، ہمارے سامنے کھڑا کر دیا وہ کونسی منزل ہے جس منزل میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے آنکھیں ملا کر حکومت سے بات نہ کی ہو اور اسلام کا تحفظ نہ کیا ہو، اسی قافلہ میں ایک قاضی مجاہد الاسلام قاسمی بھی تھے وہ بھی اسی جماعت میں شامل تھے، انہوں نے محسوس کیا اور ہمارے جنرل سکریٹری صاحب نے بھی، جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ پرسنل لاء بورڈ نے یہ محسوس کیا کہ خاص کمیٹی جو تحفظ شریعت کے لئے بنیادی طور پر آنے والے مسائل کا حل پیش کرے، جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان کا حل پیش کرے، اس کے لئے اللہ رب العالمین نے ان حضرات کے دماغ میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کو منتخب کیا، انہوں نے اسی انداز سے ترتیب دیا، اسی انداز سے اس کو سنوارا اور بنایا۔

آج یہ فقہ اکیڈمی کا اجلاس اللہ کا شکر ہے تاریخی اجلاس ہے اور تاریخی مقام پر ہے، اور آج یہ کان کھول کر دنیا سن لے کہ ہمارے سارے کے سارے بزرگ جو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں خدا کے فضل سے وہ بھی سب جمع ہیں، تو کوئی بھی حکومت اتنے بڑے اکابر حق پرستوں کی موجودگی میں میں سمجھتا ہوں کہ کوئی غلط فیصلہ شاید نہیں کرے گی انشاء اللہ، اس لئے کہ یہ اکابر یہ بزرگ یہ اولیاء اللہ جو بیٹھے ہیں اور جو انبیاء کے وارث ہیں کیا ان کی موجودگی میں کوئی غلط فیصلہ ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ اپنی جانوں پر کھیل گئے، انہوں نے اپنے وطن چھوڑ دیئے، ان حضرات کی موجودگی میں غلط فیصلہ نہیں ہو سکتا، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی بھی اسی قافلے کے، اسی کارواں کے ایک خادم تھے۔ ان کی نگاہیں بہت دور رس تھی اور وہ بہت دور بینی کے ساتھ وہ دیکھا کرتے تھے، تو انہوں نے باقاعدہ یہ اسلامک فقہ اکیڈمی جن حالات میں قائم کی اللہ کا شکر ہے کہ ان کی امید آج نظر آرہی ہے اور اتنی بڑی تعداد میں حق پرست علماء یہاں جمع ہیں، اور یہ دل والا مدرسہ ہے اللہ کے فضل سے اس نے اپنا دل بچھا دیا تمام علماء کے لئے اور یہ وہ ادارہ ہے جس سے شیخ الاسلام اور بڑے بڑے اکابر امت کا نام جڑا ہوا ہے، اور یہ وہ ادارے ہیں جو دارالعلوم دیوبند کو افراد تیار کر کے دیتے ہیں، اور پھر وہ دین، شریعت اور تقویٰ للہیت کا رنگ چڑھا کر ملت میں خدمت کے لئے اور اسلام کی سر بلندی کے لئے بھیجتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند جو ہے وہ اصل میں ہم سب کی ماں ہے، ہم اسی کی چھاتیوں سے دودھ پیتے ہیں، اور یہاں جمع

ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں اور بھی تنظیمیں ہیں جو کام کر رہی ہیں وہ ساری کی ساری اللہ کا شکر ہے کہ اپنے باپ کی اور اپنی ماں کی وفادار ہیں، غدار نہیں ہیں، اور دارالعلوم دیوبند جس نے ہمیں یہ علم دیا ہے اسی نے یہ سبق بھی دیا ہے کہ ہم ایک ساتھ متحد ہو کر اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ بیٹھیں اور امت کے مسائل کا حل تلاش کریں۔

آخری ایک بات عرض کر دوں وہ یہ کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سمینار میری نگاہ میں بہت اہم ترین کام ہے اور بہت اہم ترین ضرورت کی تکمیل ہے، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم کر کے ایک نئی نسل، ایک نئی روح تیار کر دی ہے جو آئندہ ان بزرگوں کے اللہ کے یہاں چلے جانے کے بعد - خدا کرے کہ ابھی ان کی عمر میں برکت ہو - اس کام کو آگے بڑھاتی رہے گی، یہ بیداری اسلامک فقہ اکیڈمی نے دی اور اسی پر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کی نگاہ تھی، بار بار وہ فرماتے تھے، بہت خوشی ہے کہ ہمارے مفتیان کرام اور نئی نسل ہماری جو دارالعلوم سے، مظاہر علوم سے امر وہ سے، شاہی مراد آباد سے اور دیگر مدارس سے تیار ہو رہی ہے ان کو موقع مل رہا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس میں شریک ہو کر کہ ان کے ہاتھ میں قلم آجائے اور منہ کے اندر زبان آجائے تو انشاء اللہ آپ ہی حضرات دین کے محافظ ہوں گے اور دین کی حفاظت اور تجدید کریں گے۔

دنیا آپ کی طرف دیکھ رہی ہے اور لو لگائے ہوئے ہے

☆ ڈاکٹر محمد منظور عالم ☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ۔ اُمّ ابعد۔

صدر جلسہ! علماء کرام، نوجوانان ہند! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں اس موقع پر وقت زیادہ لئے بغیر تین باتیں آپ لوگوں کی خدمت میں رکھنا چاہتا ہوں جس میں ایک اور دو باتیں تاریخ اسلامک فقہ اکیڈمی کے اوراق سے تعلق رکھتی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ جب پہلی کانفرنس ہمدرد یونیورسٹی کے اندر رکھی گئی تھی، اس وقت کے تمام معروف علماء کرام، تمام مفتیان کرام جو اس وقت بہت اہم شخصیات تھیں، اس وقت ان کی اکثریت اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، اس موقع پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک جملہ کہا تھا جس کو میں اس وقت دہرا نا چاہتا ہوں، اور آل ریڈی یہ ریکارڈ ڈیڈ بھی ہے ان کا یہ اسٹیٹ منٹ، انہوں نے کہا تھا کہ میری عمر تقریباً ساٹھ سال کی ہو رہی ہے میرے بیس سال کو کم کر دو میں جب جوان تھا، چالیس سال میں ایسا پروگرام جو اسلامک فقہ اکیڈمی کے ذریعہ اس وقت ہو رہا ہے کبھی نہیں ہوا تھا، جہاں تمام اکابرین ایک ساتھ جمع ہیں، اور سب مل کر تمام مسائل پر غور و خوض کر رہے ہیں، یہ وہ تاریخی بیان تھا جس کا ثمرہ آج کوئی بھی دیکھ سکتا ہے، جو اس اسٹیج پر آیا ہے، یا جب بھی کبھی اسٹیج پر آتا ہے۔

دوسرا اسی طرح کا بیان خود حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا تھا، اس وقت کچھ لوگوں نے یہ بات کہی تھی کہ بہت سے ایسے نوجوان علماء کرام اسٹیج پر شامل ہو رہے ہیں جو ابھی اس لائق نہیں ہیں، ذرا غور سے سنئے ان کا جملہ، انہوں نے کہا تھا کہ ”آج کے صفار کل کے کبار ہیں“، آج کے صفار اگر یہ چیز سیکھ لیں گے تو کل کبار ہو کر اجتماعیت کا بہتر نمونہ اور ثبوت پیش کریں گے، ان کی یہ بات آپ لوگوں تک میں اس لئے پہنچا رہا ہوں کہ جب میں یہاں کھڑا ہو کر دیکھ رہا ہوں تو پوری دنیا میں جس طرح سے ساٹھ فیصد نوجوان پائے جا رہے ہیں، یہاں بھی تقریباً اسی تناسب میں نوجوان علماء، دانشور اور فقہاء کرام کا مجمع نظر آ رہا ہے۔

میں تمام اکابرین سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک نگاہ پوری دنیا پر ڈالئے، گذشتہ پچتر سالوں سے پوری دنیا بانجھ ہو گئی ہے، جو کئی ازم، چاہے وہ کمیونزم ہو، سوشلزم ہو، کپٹلزم ہو، دنیا میں انسانوں کی بنائی ہوئی ازم آج پچتر سالوں سے منظر عام پر نہیں آرہی ہے، اس لئے انسان ہر جگہ رہبر کی تلاش میں ہے، انسان ہر جگہ اپنے مسائل کا حل چاہ رہا ہے اور اس کا حل صرف اور صرف قرآن ہے، جس قرآن کو اللہ نے خود اپنی حفاظت میں لیا ہے، کیا یہ ضروری نہیں ہے ہمارے لئے کہ پوری انسانیت کے دکھ کو ایڈرس کرنے کے لئے ہم اس سے استفادہ کریں، چونکہ آپ وارثین انبیاء کرام اور نبی کریم ﷺ ہیں، آپ کے پاس تراث اسلامی ہے، آپ کو زمانے کے تقاضے کو سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے، قرآن سے رہبری حاصل کرنے، انسانیت کے فروغ کے لئے کھڑے ہونے، عزم کا اظہار کرنے اور لوگوں کے سامنے اس بات کو پیش کرنے کہ اسلام ہرگز ہرگز صرف مسلمانوں کا دین نہیں، بلکہ سارے انسانوں کا دین ہے اور سارے انسانو! اسلام کی رحمت سے واقف ہو جاؤ، اسلام کی رحمت کو سمجھو، اسلام وہ راستہ تمہیں دے گا جو اسلام نے نبی کریم ﷺ انبیاء کرام کے ذریعہ تمام انسانوں کو ایڈرس کیا تھا، اس کا موقع ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم اس پہلو کو اختیار کریں تو دنیا میں اس وقت اسلام کو قبول کرنے کی ایک چاہت ہے، لیکن اس کی ظاہری رکاوٹیں ہیں اور جب تک کہ ظاہری رکاوٹیں نہیں ہوں گی آپ اسلام کی جڑ میں نہیں جاسکتے، اور انسانیت کے فروغ کے لئے راہ نہیں نکال سکتے، میں اس گزارش کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ بات صحیح ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بھی ایک تحقیقی ادارہ بنانے کی بات کہی تھی، لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مدینہ منورہ میں بیٹھ کر اس مسجد نبوی میں بیٹھ کر اس کا خاکہ بنایا تھا جس خاکہ کو رنگ بھرنے کے لئے بہت سے لوگوں کا انتخاب کیا، اب ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ رہے ہیں، اس زمانے میں انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں نوجوانوں کو اس انداز سے تیار کرنا ہے کہ میرے بعد خلا نہ پیدا ہو، الحمد للہ آج میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ان کی یہ خواہش اللہ نے قبول فرمائی، اور آج کوئی خلا نہیں ہے، بلکہ نوجوانوں کے اندر ایک نئی صفت نظر آرہی ہے، حالات کو سمجھنے، قرآن سے تاویل کرنے کی، نبی کریم ﷺ کی سیرت و اقوال کو سمجھنے کی اور زمانے میں ایک حل دینے کی۔

غور و فکر کا یہ سلسلہ ساؤتھ افریقہ میں بھی شروع ہو

مفتی زبیر بیات (جنوبی افریقہ)

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى - اما بعد قال الله تبارك وتعالى: ”وأما ما ينفع الناس فيمكث في الأرض، كذلك يضرب الله الأمثال“۔

اکابرین عظام! علماء کرام، طلباء عظام! اور معززین سامعین حضرات، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میں پیشگی معذرت پیش کروں گا اس لحاظ سے کہ مجھے برجستہ کچھ عرض کرنے کے لئے کہا گیا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ اسٹیج پر میرے اساتذہ کرام موجود ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایک طالب علم کو جب اساتذہ کرام کے سامنے کچھ عرض کرنا ہوتا ہے تو اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور ان کے سامنے ایک طالب علم کو لب کشائی کرنا مشکل کام ہوتا ہے، بہر حال الافر فوق الأدب کے طور پر کچھ عرض کروں گا، یہ مبارک اور عظیم اجلاس، یہ اکیڈمی، یہ مدرسہ، یہ علماء کرام، یہ طلباء یہ سب کے سب الحمد للہ اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ اسلام زندہ ہے اور مسلمان ترقی پذیر ہیں اور الحمد للہ مسلمان اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اس وقت سارے عالم میں جو مایوس کن حالات ہیں ان حالات میں ان جیسی مجلسیں امید کا ایک روشن بینارہ ہیں، اللہم زد فرد، حضور ﷺ کا ایک ارشاد مبارک آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”طوبی لمن جعله الله مفتاحا للخير ومغلاقا للشر“ اور اہل علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ”من“ سے جہاں مراد فرد ہے وہاں جماعت بھی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور ان کی بنائی ہوئی یہ عظیم اکیڈمی اس کا پورا کا پورا مصداق ہے اور اس کے موجودہ اساطین و اکابرین جن میں حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا تھقیق احمد بستوی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا محمد عبید اللہ سعدی صاحب دامت برکاتہم اور جتنے بھی حضرات اس میں شریک ہیں سب کے سب اس عظیم فضیلت کے مصداق ہیں، اللہم اجعلنا جميعا منهم، اللہ ہم سب کو اس حدیث کا مصداق بنائے کہ ہم مفتاح للخیر بنیں اور مغلاق للشر، بہر حال جیسا کہ عرض کیا گیا کہ میرا تعلق ساؤتھ افریقہ سے ہے اور ہمیں اس بات پر خوشی ہے کہ من وجہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی تاسیس کی ایک وجہ ہمارے ملک کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی جنہوں

نے ہمارے ملک کے متعدد بار اسفار کئے اور جہاں کے مسلمان حضرت کے فیض سے خود مستفید ہوئے، ان ہی اسفار میں سے ایک موقع پر حضرت کے ایک اجلاس میں مسلم اطباء جمع ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت کے سامنے مختلف سوالات طب کے لحاظ سے پیش کئے تھے، یہ احقر بھی اس مجلس میں موجود تھا، یہ تقریباً تیس سال یا اس کے قریب پہلے کی بات ہے، حضرت نے اس موقع سے کچھ جوابات عنایت فرمائے، لیکن حضرت کو اس بات کی فکر ہوئی کہ ان جیسے جدید مسائل پر بجائے ایک مفتی کے جوابات کے جماعت کو تیار کرنا چاہئے جو اس پر غور و فکر کر کے اور اس سے متعلق تحقیق کر کے اس کا جواب دے، چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھی ایک وجہ بنی ہے اسلامک فقہ اکیڈمی کے تاسیس کی، تو ساؤتھ افریقہ کا اس اکیڈمی کے ساتھ تعلق اس لحاظ سے قائم ہے اور ہم امید کرتے ہیں یہ تعلق انشاء اللہ مستقل باقی رہے گا۔

الحمد للہ اس وقت یہاں علماء کرام کا ایک وفد بھی تشریف لایا ہوا ہے، جن میں جمعیت علماء کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا ابراہیم بھام صاحب اور جن کی طرف سے میں نیابت کر رہا ہوں اصل میں مولانا کی تقریر مکرر ہوئی تھی، اس موقع پر اور اسی طرح حضرت مولانا یوسف کران صاحب، جو مجلس العلماء کے مفتی کبیر ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں اور ہمارے ملک کے عظیم شافعی مفتی ہیں اور جنہوں نے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کے فضائل کی کتاب کا انگریزی میں بہترین ترجمہ کیا ہے، حضرت مولانا بھی یہاں موجود ہیں اور اسی طرح نوجوان علماء بھی تشریف لائے ہوئے ہیں ساؤتھ افریقہ سے اور اس موقع کی مناسبت سے میں گزارش بھی کروں گا کہ استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم سے کہ جس طرح وہ یہاں ہندوستان میں فقہ اکیڈمی کو نہایت عمدہ طریقہ سے چلا رہے ہیں، اسی طریقہ سے ہمارے ملک میں بھی آ کر کے اس کی بنیاد ڈالیں، تاکہ وہاں کے علماء بھی اسی طریقہ سے تحقیق اور مسائل کے حل میں لگ جائیں، حضرت سے امید ہے کہ اس گزارش کی طرف توجہ فرمائیں گے اور اس کو منظور فرمائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ جس طرح سابق سمیناروں میں مسائل کو باحسن طریق حل کیا گیا اسی طرح موجودہ سمینار میں جو اہم ترین مسائل ہیں اور جن کا سابقہ ہمیں بھی اپنے ملک میں پڑتا رہتا ہے، جیسے کہ سیاسی مسائل ہیں جتنی بھی مسلم اقلیتیں ہیں ان کو اس سے سابقہ پڑتا ہے، الیکشن میں حصہ لینا مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا ناجائز ہے، اگر جائز ہے تو کن کن صورتوں میں اور کہاں تک گنجائش ہے اور ان مشکلات میں اس کا کیا حل ہے؟، امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان تمام مسائل کا بہترین جواب اور اسی طرح دوسرے اہم موضوعات بیع الوفاء اور اسلامک بونس جس کو صلح کہا جاتا ہے اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی، انشاء اللہ۔

علماء اپنی ذمہ داری صحیح طریقہ سے نبھائیں

مفتی ابراہیم بہام (جنوبی افریقہ)

صدر جلسہ، محترم علماء کرام و اکابرین عظام!

اتحاد و اتفاق کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں، اتحاد و اتفاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امت میں کوئی اختلاف نہ ہو اور اختلاف رائے نہ ہو، اختلاف رائے پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گا، بقول مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صحیح اختلاف نہ اتحاد میں مانع ہے اور نہ باہمی توقیر و احترام میں، لیکن اگر اختلاف کے صحیح حدود کا لحاظ نہ رکھا گیا تو شاید اس کی تلافی ممکن نہ ہو اور تاریخ ہمیں معاف نہ کرے، ہم جب آج کل نوجوان سے بات کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ علماء کے حدود و اختلاف کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے، وہ زیادہ سے زیادہ دین اور علماء سے بیزار اور بدظن ہو رہے ہیں، اور علماء دین کے علم بردار ہونے کی وجہ سے اس کی وجہ سے دین سے بھی اللہ معاف کرے، بیزار ہو رہے ہیں، اور اس کی وجہ سے ان کا رجحان زیادہ سے زیادہ جدید فکر کے دانشوروں سے وابستہ ہو رہا ہے، جو بظاہر ان کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر علماء لوگوں کو متاثر اور ان کی صحیح قیادت نہیں فرمائیں گے تو لوگ متاثر ہونے کے لئے دوسرے راستے تلاش کریں گے، تو یہ علماء کے اوپر بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔

امام سفیان ثوریؒ کا ایک مقولہ ہے، وہ فرماتے تھے کہ فقیہ تو وہ ہے جو لوگوں کے مسائل کو سلجھاتے اور صحیح تجویز و سلوٹن پیش کرتے ہوں، ورنہ یہ بات کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے یہ تو سب کر سکتے ہیں، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ جب جنوبی افریقہ تشریف لائے تو ایک مرتبہ علماء سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایک فرد بے عزت ہو جائے تو یہ اتنی بڑی مصیبت اور المیہ کی بات نہیں ہے، لیکن کوئی عالم دین اپنی نسبت کی وجہ سے بے عزت ہو جائے تو یہ ایک بڑی آفت و مصیبت اور المیہ بن جاتی ہے، اس لئے ہمیں بیحد اور حد سے زیادہ مسرت ہے کہ علماء کرام اور اکابرین عظام ہندوستان میں اسلامک فکد اکیڈمی کی ماتحتی میں عصر حاضر میں نئے شرعی مسائل پر اجتماعی غور و فکر کا سلسلہ انجام دے رہے ہیں، ہم مندو بین جنوبی افریقہ اور علماء جنوبی افریقہ کی طرف سے اسلامک فکد اکیڈمی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور وہ واقعی اس کے مستحق ہیں۔

اطہار تشکر

حضرت مولانا تقی احمد بستوی صاحب ☆

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم النبیین محمد وعلی الہ وصحبہ اجمعین۔ اما بعد
صدر اجلاس، اکابر علماء و نو جوان فضلاء! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں، لیکن وقت اتنا
گذر چکا ہے اور آپ نے اتنے صبر سے اور بہت دلچسپی سے اس پروگرام کو سنا ہے اور سن رہے ہیں کہ شاید اگر میں شکریہ ادا نہ
کروں تو آپ لوگ میرے شکر گزار ہوں گے، اور ابھی شکریہ کا وقت بھی نہیں آیا ہے، اب اصل نشستیں شروع ہوں گی، اس
میں مناقشے ہوں گے، گفتگو ہوں گی، جب ساری نشستوں میں ہم اسی طرح بیٹھیں اور حصہ لیں دلچسپی کے ساتھ تب گویا شکریہ
کے مستحق ہوں گے، لیکن میں اس وقت ضروری سمجھتا ہوں کہ جو ہمارے مہمان باہر سے آئے ہیں، ترکی، الجزائر اور ساؤتھ
افریقہ سے ان کا شکریہ میں ضرور ادا کروں، وہ پتہ نہیں کس نشست میں ہوں اور کس میں نہ ہوں۔

مجھے آپ حضرات سے عرض کرنا ہے، آپ نے جو ارادہ کیا ہے وہ انشاء اللہ کریں گے، یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے،
رکاوٹیں ہر کام میں آتی ہیں کچھ مخالفتیں بھی ہوتی ہیں، یہ اگر ہم سوچیں کہ سو فیصد سب لوگ متفق ہو کر کام شروع کریں گے تو
اتفاق کے انتظار میں، ہم کام کو ملتوی کرتے رہیں یہ بات صحیح نہیں ہے جو حضرات بھی اس طرح کے کاموں کو مفید سمجھتے ہیں ان
کو ساتھ لے کر ہم کام شروع کریں، اگر مخالفت کی آوازیں کہیں ہیں تو ہم اس کو سنیں، تحمل سے کام لیں اس کے خلاف ری
ایکشن میں زیادہ نہ آئیں، کوئی بات ہم کہیں تو علمی اور سنجیدہ انداز میں کہیں، اگر آپ اس کام کو شروع کریں گے، اور وہاں
رفتہ رفتہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں گی تو وہاں کے جو مسائل ہیں انشاء اللہ وہ حل ہوں گے۔

مجھے معلوم ہے کہ ساؤتھ افریقہ میں مسلم پرسنل لاء کی منظوری کا موقع تھا مسودہ، قانون ترتیب پایا، مختلف مراحل
سے گذرا اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں اس قانون کو، اسلامی قانون اور احوال شخصیہ کو منظور کرادے، صحیح صورت میں اور
وہاں وہ نافذ ہو جائے، انشاء اللہ۔

آپ حضرات کی یہ تشریف آوری، اکیڈمی سے رابطہ انشاء اللہ یہ خیر کا ذریعہ بنے گا اور بہت سے نیک کاموں میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ آگے بڑھیں گے، میں یہاں کے اس ادارہ کے ذمہ داران کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے بزرگوں کی جگہ ہے بار بار یہ بات آئی ہے اور ان کے انوار و برکات ہم محسوس کرتے ہیں، ہم بے حس ہونے کے باوجود محسوس کرتے ہیں کہ اس ادارہ میں اور اس علاقہ میں ان کے انوار و برکات اور ان کے فیوض جاری ہیں اور عوام کا جو اس ادارے سے تعلق ہے جس طریقہ سے وہ اس ادارے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرتے ہیں، محبت کے ساتھ وہ ہمارے ان بزرگوں کی قربانیوں اور ان کے اخلاص کا نتیجہ ہے، بہر حال میں ان ہی چند کلمات کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔



مولانا مفتی عفان صاحب

جامعہ قاسمیہ شاہی، مراد آباد

حضرت صدر محترم! اسٹیج پر تشریف فرمانہایت ہی قابل قدر حضرات علماء کرام، مفتیان عظام و اکابرین ملت! سب سے پہلے میں سپاس شکر نذر کرتا ہوں اس رب دو جہاں کی بارگاہ میں جس کی توفیق از رانی سے ہمیں اس علمی و فقہی کارواں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا اور آپ حضرات جیسے بالغ نظر، مستند، معتبر علماء کرام نیابت حبیب کبریا ﷺ کے فریضے کو انجام دیتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے پرچم تلے اجتماعی طور پر مختلف مسائل میں شرعی نقطہ نظر سے غور و فکر کے لئے اس قدیم ترین دینی درسگاہ کے احاطے میں مجتمع اور اکٹھا ہوئے۔

ثانیاً: میں مشکور ہوں ادارے کی جانب سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے حضرات سرپرستان صدر عالی وقار، استاذ گرامی قدر حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی مدظلہ العالی، نائبین صدور حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا مفتی اشرف علی باقوی صاحب دامت برکاتہم، جنرل سکریٹری حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم اور دیگر اراکین مجمع الفقہ الاسلامی کا جنہوں نے ہمارے اس ادارے کو اس عظیم عالمی اور فقہی سمینار کے میزبان کے طور پر قبول فرمایا۔

ثالثاً: میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں ان تمام مندوبین کا اور مہمانان کرام جو سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر کے یہاں تشریف لائے، اور خاص طور سے ہمارے وہ بزرگ اور معزز مہمانان عظام جو اپنے ضعف اور پیرانہ سالی

کے باوجود اپنے نہایت قیمتی وقت کو فارغ فرما کر یہاں تشریف لائے، یقیناً ان حضرات کو سفر میں دشواریاں بھی ہوئی ہوں گی، اور بعض حضرات کو اسٹیشن پر انتظار کی زحمت بھی گوارا کرنی پڑی ہوگی، میں نہایت شکرگزار ہوں اپنے ان تمام مہمانان اور مندوبین کرام کا جنہوں نے اپنے قدم مہمنت سے اس تاریخی اور قدیم دینی درسگاہ کو مال مال فرمایا۔

رابعا: میں مشکور ہوں اہلیان شہر کا اور خصوصاً ہمارے اس جامعہ اور اس سمینار کے خصوصی معاونین کا جنہوں نے قدم قدم پر ہمارا تعاون کیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے دل کھول کر رکھ دیا ہے، اللہ ان کو دینی و دنیوی ہمہ جہت ترقیات سے خوب مالا مال فرمائے، ان کی جان و مال اپنے دین متین کی خدمت کے لئے قبول فرمائے۔



پہلا باب
تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ:

بیع الوفاء

۱- بیع وفا کے موضوع پر تمام مقالات، تحریروں اور بحث و مباحثہ کے بعد شرکاء سمینار کا احساس ہے کہ ہمارے معاشرہ سے باہمی تعاون اور قرض حسنہ کا جذبہ کم اور قرض کی واپسی میں ٹال مٹول کا مزاج بڑھتا جا رہا ہے، اس لیے سمینار امت مسلمہ سے اپیل کرتا ہے کہ قرض حسنہ کی جو فضیلت ہے اس کو حاصل کرنے اور قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کی قباحت سے بچنے کی فکر پیدا کی جائے، ساتھ ہی ساتھ شریعت اسلامی سے اس بارے میں جو رہنمائی ملتی ہے اس پر عمل کیا جائے۔

۲- شریعت میں رہن کا مقصد قرض کی وصولیابی کو یقینی بنانا ہے، لہذا قرض دہندہ کے لیے مال مرہون سے استفادہ کرنا جائز نہیں، یہ غریبوں کا استحصال اور سود خوری کا ایک ذریعہ ہے۔

۳- اگر قرض دہندہ مال مرہون سے فائدہ اٹھائے تو انتفاع کے بقدر رقم قرض سے منہا ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ اگر قرض کی پوری رقم کے بقدر انتفاع کر چکا ہو تو مال مرہون بغیر کسی مطالبہ کے مقروض کو واپس کرنا واجب ہوگا۔

۴- اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسن ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لیے اپنی کوئی چیز کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، جب کہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے، البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملے کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے؛ بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہو جائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ بائع کو فروخت کر دے گا تو ایسا کرنا درست ہوگا، اس صورت میں کہ خریدار کے لیے بیع سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، تاہم اس سے احتیاط کرنا بہتر ہے۔

۵- کسی بھی جائداد-دکان و مکان-کو کرایہ پر لین دین کے لیے ضمانت کے نام سے لی جانے والی رقم شرعاً قرض کے حکم میں ہے۔

۶- قرض کی بنا پر کرایہ میں مروجہ اجرت کے مقابلہ میں غیر معمولی کمی (غبن فاحش) ”کحل قرض جو نفعاً فہو حرام“ کے تحت ناجائز ہے۔

بیع و فاء

ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے، ضرورت کی وجہ سے بہت سی اشیاء وجود میں آتی ہیں اور مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور پیدا کیے جاتے ہیں لوگ حالات کا شکار ہوتے ہیں تو ان حالات سے نمٹنے کے لئے طرح طرح کی شکلیں تجویز کرتے ہیں تاکہ اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکیں جس میں بسا اوقات اس سے صرف نظر ہوتا ہے کہ شرعی حکم کیا ہے اور کبھی اس کی رعایت بھی پیش نظر ہوتی ہے تو واضح طور پر ممنوع و منکر سے بچنا مقصود ہوتا ہے۔

خرید و فروخت کے باب میں ”بیع و فاء“ بھی ضرورت و حالات کے تحت اختیار کی جانے والی ایک شکل ہے جس کو کھلے طور پر سودی معاملات سے بچنے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اختیار کیا گیا اور زمان و مکان کے فرق کے اعتبار سے اس میں وسعت و کثرت اور تنوع بہت پایا جاتا رہا اور پایا جاتا ہے، ہندوستان کے بعض خطوں میں اس کا کافی رواج پایا جاتا ہے، اسی لئے مجمع الفقہ الاسلامی (الہند) نے اپنے آئندہ سیمینار کے موضوعات میں اس کو بحث میں شامل کیا ہے تاکہ اس بابت تحقیق و مذاکرہ کے بعد امت کی رہنمائی کے لئے کوئی مناسب راہ تجویز کی جاسکے۔

بیع و فاء کی بنیادی شکل یہ ہے کہ ایک آدمی ضرورتمند ہوتا ہے، غیر سودی قرض ملتا نہیں اور سودی قرض لینا نہیں چاہتا تو وہ اپنے کسی سامان (زمین و جائیداد وغیرہ) کا سودا یوں کرتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں اس کو لے لو اور اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کرنے کے حال میں ہوں تو یہ سامان تم مجھ کو اسی قیمت پر دیدینا کسی دوسرے کو مت بیچنا۔

معاملہ یہ ہے کہ خرید و فروخت سے بچی جانے والی شے بیچنے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور خریدنے والا اس کا مکمل مالک بن جاتا ہے اور خرید کردہ شے میں اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ کچھ بھی کرے بیچے، ہبہ کرے، کرایہ پردے وغیرہ اور فروخت کردہ شے سے سابق مالک و فروخت کنندہ کا کوئی واسطہ نہیں رہ جاتا، بیع و فاء کا معاملہ اس سلسلہ میں اس سے مختلف ہے، تو اس بیع کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم کیا ہے؟

(۱) یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں۔

(الف) بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا

کیا حکم ہوگا؟

- (ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟
- (ج) خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟
- (د) خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچے تو اس بیچ کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟
- (۲) اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو
- (الف) جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟۔
- (ب) اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟۔
- (ج) اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

- (د) خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟
- (۳) آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے، تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے؛ کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لئے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت و رہن کی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

تلیصر مقالات:

بیع و فاء، موجودہ معاشی تناظر میں
تعارف و تجزیہ

مفتی احمد نادر القاسمی ☆

آج کی تیز رفتار ترقی اور نئی تبدیلیوں نے انسانی سماج میں جہاں حصول زر کے بے شمار طریقوں کو جنم دیا ہے، وہیں حصول معاش کی راہ میں بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں ہیں، بالخصوص مسلمانوں کے لئے، کیونکہ دنیا کی دوسری قوموں کے یہاں تو جائز و ناجائز کا کوئی تصور نہیں ہے، ان کے پیش نظر صرف منافع کا حصول ہوتا ہے، اس لئے ان کو تو کوئی پریشانی نہیں، مشکلات اور پریشانیاں تو مسلمانوں کو ہوتی ہیں، اور بد قسمتی یہ ہے کہ دنیا کے سارے بینکوں اور معیشت و تجارت اور کاروبار کے ضوابط و شرائط مقرر کرنے کی کلید اس وقت بین الاقوامی سطح پر غیر مسلموں کے ہی ہاتھوں میں ہے، برنس اور تجارت کے طریقوں کی ایجادات اور دولت کی تقسیم کے سارے معیار اور پیمانے بھی وہی طے کرتے ہیں۔

اب معاش و معاد کی اس صورت حال میں مسلمانوں کے لئے دو چیلنجز درپیش ہیں: ایک یہ کہ ان کو شریعت کے طے کردہ خطوط کی پاسداری کرنی ہے، اور دوسرے یہ کہ موجودہ پیچیدگیوں کے تناظر میں وسائل زندگی کی حصول یابی کو یقینی بنانا ہے، اور اسی معاشی دنیا میں جس میں کے بے شمار قباحتیں شرعی تناظر میں پائی جاتی ہیں، جینے کی راہ تلاش کرنی ہے اور یہ مسلم ہے کہ:

”مومن فقط احکام الہی کا ہے پابند“

اب اس صورت حال میں اگر کوئی ایسی شکل سامنے آجاتی ہے جس میں اسلامی بنیادوں پر سرمایہ کاری اور منافع کا حصول ممکن ہو تو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور اس کی عملی صورت دنیا کے سامنے پیش کرنا ہماری اہم دینی ذمہ داری ہے:

”فإذا قضیت الصلاة فانتشروا فی الأرض وابتغوا من فضل الله واذکروا الله کثیرا لعلکم

تفلحون“ (سورہ جمعہ: ۱۰)۔

(پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کو خوب یاد کرو تو فلاح پا جاؤ گے)۔

اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے ”بیع و فاء“ سے متعلق سوالنامہ مرتب کر کے ملک و بیرون ملک کے ارباب افتاء، علماء، فقہاء اور ماہرین معاشیات کے پاس بھیجا، اور اس سوالنامہ کی روشنی میں جو جوابات، مقالات و آراء کی شکل میں تحریریں اور مباحث تادم تحریر اکیڈمی کو موصول ہوئے ان کی تلخیص، دلائل اور تجزیہ یہاں پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ”وما ذلک علی اللہ بجز یز“۔

”بیع و فاء“ کی اصطلاح:

بیع و فاء سے متعلق حضرات مقالہ نگار کی آراء پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیع کن کن ناموں سے اسلامی تجارت اور فقہ اسلامی میں مشہور اور جانی جاتی ہے، اس کی تفصیلات بھی قارئین کے سامنے ہوں، غرض فقہی کتابوں میں تلاش و جستجو سے یہاں تک رسائی ممکن ہو سکی ہے کہ فقہ اسلامی اور چاروں دبستان فقہ میں اس بیع کو تیرہ ناموں سے موسوم کیا گیا ہے جو یہ ہیں:

۱- بیع و فاء، ۲- بیع الإطاع، ۳- بیع الطاع، ۴- بیع المعاد، ۵- بیع البدلین (مبادلتہ المال بالمال)، ۶- بیع الأمانہ، ۷- بیع العہدۃ، ۸- بیع الثنیا، ۹- الرہن المعاد، ۱۰- بیع المعاملہ، ۱۱- بیع الجائز، ۱۲- الرہن الحیازی، ۱۳- بیع الناس۔

بیع و فاء کی حقیقت:

”بیع و فاء جس کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا سامان کسی کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرے کہ خریدار ایک متعین مدت کے بعد اتنی ہی قیمت میں یا اس سے بڑھا کر دوبارہ فروخت کنندہ ہی کے ہاتھ فروخت کر دے، یا بائع پوری رقم واپس کر کے بیع اپنے قبضہ میں لے لے (تفصیلات و حوالہ جات آگے مقالات میں آ رہے ہیں)، اس سے متعلق کل ۹ مقالات تلخیص کرتے وقت رقم ملخص کو موصول ہوئے، یہ مقالات سوالنامہ کے کل ۳ مرکزی سوالات اور ۷ ذیلی (الف بائی) اجزاء، جن کو مستقل سوال بھی کہا جاسکتا ہے، کے جوابات پر مشتمل ہیں اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرات علماء کے آراء کی تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سوالنامہ کا پہلا سوال یہ ہے:

سوال نمبر ۱: یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں، اگر شرعاً درست ہے، تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

اس بارے میں مقالہ نگاروں کے درمیان دونوں طرح کی رائے پائی جاتی ہے، یہ بیع بھی ہے اور رہن بھی، منعقد بھی ہے، مشروط بھی ہے، فاسد بھی ہے، اور مشروط، فاسد، رہن وغیرہ تمام معاملات سے مرکب عقد بھی ہے، ان اختلافی آراء

اور اہل علم کے درمیان پانے جانے والے مختلف نظریات کی روشنی میں، اگر بیع ہے تو پھر مشتری کو اس سے فائدہ اٹھانے کے تمام اختیارات ہوتے ہیں، اور بائع ہی کو فروخت کرنے والی شرط صرف وعدہ ہے، اور وعدہ پورا کرنا ایک مومن کی حیثیت سے لازم ہے، نہیں کرتا ہے، تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

اس پہلے سوال کے جواب میں ۴۳ مقالہ نگار حضرات نے ”بیع و فاء“ کو منعقد اور حکماً بیع قرار دیا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا محمد فاروق، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا روح الامین، مولانا محبوب احمد فروغ قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا غلام اللہ کاوی، مولانا حفیظ الرحمن خیر آبادی، مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا عمران ندوی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ میر کشمیری، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا عبدالحق رامپور، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی عبد الرزاق قاسمی (امروہہ)، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی (بڑودہ) مولانا عبدالنواب اناری، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (منو)، مفتی رجب قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی محمد زاہد، مفتی محمد مقصود فرقانی اور مولانا یوسف علی (کریم گنج)۔

نیز یہ کہ مذکورہ مقالہ نگاران ہی میں سے کچھ حضرات نے اس بیع کو بیع فاسد قرار دینے کے باوجود مفید ملک مانا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا عبدالشکور قاسمی۔

جبکہ مندرجہ ذیل حضرات نے ضرورت و حاجت، نیز تعامل و عرف اور استحسان کی وجہ سے مطلقاً اس معاملہ کو بیع اور درست قرار دیا ہے:

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی دیولوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا عبدالحق رامپور، مفتی عبد الرزاق، سید قمر الدین محمود بڑودہ، مولانا عبدالنواب اناری، مفتی محمد شاہد قاسمی (امروہہ)، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مفتی سعید الرحمن قاسمی۔

اور مفتی عبدالرحیم قاسمی صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ بیع میں شرط لگانا تقاضائے بیع اور اصول کے خلاف ہے، اس لئے

یہ بیع درست نہیں ہے، اور مفتی راشد حسین صاحب کی رائے میں یہ بیع اور رہن کا مجموعہ ہے، اور مفتی شیر علی گجراتی نے بیع و فاء کو بیع مکرہ کے مشابہ قرار دیا ہے (دیکھئے مقالہ: مفتی راشد حسین ندوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی اور مفتی شیر علی گجراتی)۔

مذکورہ حضرات کے علاوہ ۲۹ مقالہ نگاران اس بیع کو سرے سے رہن ہی قرار دیتے، اور رہن کے ہی احکام جاری کرنے کا عندیہ پیش کرتے ہیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی جنید بن محمد، مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مفتی عادل خاں ندوی، مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبدالرحمن مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا حذیفہ لونا واڑہ، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا زین العابدین کیرالا، مفتی جنید عالم ندوی، قاسمی، مفتی محمد یوسف جوڈھپوری۔

مجوزین کے دلائل:

”وَجَوِّزُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ بِشَرَطِ سَلَامَةِ الْبَدَلَيْنِ لِصَاحِبِهِمَا“ (شامی ۵۴۶/۷) (مولانا محمد فاروق)، نیز موصوف اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ ضرورت اور حاجت ناس کی وجہ سے مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ، مشائخ بخاری اور امام نجم الدین نسفی اور صاحب نہایہ وغیرہم کے فتویٰ کے مطابق اس زمانہ میں بیع و فاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا، بحوالہ ایضاح النوادر ۳۷ مؤلفہ مفتی شبیر احمد قاسمی مرآباد، دیکھئے: مقالہ مولانا محمد فاروق)۔

☆ ”یسرا ولا تعسرا“ (حدیث عن معاذ بن جبل)۔

☆ ”الدين يسر“ (سنن نسائی رقم الحدیث: ۵۰۳۴)۔

☆ ”صاحب المنظومة أنه قال: اتفق مشائخ الزمان على صحة هذا البيع؛ لأنهما تلفظا بلفظ

البيع ولا عبرة بمجرد النية بلا لفظ، فإن من تزوج امرأة بنية أن يطلقها إذا مضى سنة لا يكون متعة“ (فتاویٰ بزازیہ ۲۵۱/۱ طبع جدید)۔

☆ ”ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا لبعض أحكامه منهم نجم الدين نسفي

فقال: اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا لبعض أحكامه، وهو الانتفاع به، دون البعض“ (تبيين الحقائق للزيلعي ۲۳۷/۶)۔

☆ ”وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز

الاستصناع لذلك“ (تبيين الحقائق ۶/۲۳۷، مقالہ مولانا محمد فاروق سورت)۔

☆ ”الضرورات تبيح المحظورات“ (دیکھئے مقالہ: مفتی شیر علی گجراتی)۔

☆ ”ولو بعده على وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة

الناس وهو الصحيح“ (درمختار ۴/۲۷۵) (دیکھئے مقالہ: مفتی جمیل احمد ندیری)۔

☆ ”وما ضاق على الناس أمر إلا اتسع حكمه“ (درمختار)۔

☆ ”الصحيح أنه ان وقع بلفظ البيع لا يكون رهنا، وإن ذكر البيع بلا شرط، ثم شرطه على

وجه المعاودة جاز البيع، ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا“ (البحر الرائق ۶/۱۲،

الفتاوى الهندية ۲۰۹/۳) (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالات: مولانا خورشید احمد اعظمی، محمد شکیل اسلام پوری، مفتی انور علی اعظمی،

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد زاہد امر وہہ، مولانا محمد جعفر علی، مولانا

ابوسفیان مفتاحی، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودہ)۔

☆ ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة، ومن هذا القبيل تجويز البيع الوفاء حيث

أنه لما كثرت الديون على أهل بخارى مست الضرورة إلى ذلك وصار مرعيا“ (مجلة الاحكام العديرة المقالة

الثانية اعادۃ: ۳۲) (دیکھئے مقالات: مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی امر وہہ، مفتی حذیفہ محمود لونواڑہ)۔

☆ ”قال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تبيين الحقائق ۵/۱۸۳)۔

شیخ ڈاکٹر محروس المدرس نے عراقی قانونی دفعات کے حوالہ سے اس معاملہ (بیع وفاء) کو ”الرهن الحيازي“ کا نام

دیا ہے، اور تفصیلات لکھنے کے بعد وہ فرماتے ہیں: ”لكن مشائخ بلخ استحسنوا ذلك، فأخذوه لتعامل الناس

به، وبه تأخذ“ اس کے بعد بیع وفا کو جائز قرار دینے والے علماء و مشائخ کے اقوال و دلائل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

☆ ”ويكون الأخذ به أولى، فجاز الأخذ ببيع الوفاء لتعارف بعض البلاد بذلك، وبه أخذ

الكثير“ (دیکھئے: موصوف کے عربی مقالہ کا ترجمہ)۔

گویا حضرت موصوف بھی بیع وفا کے لوگوں کے عرف و تعامل کی وجہ سے جواز کے قائل ہیں۔

بیع وفا کو رہن قرار دینے والے حضرات کے دلائل:

جن مقالہ نگار حضرات نے بیع وفاء کو سرے سے رہن ہی قرار دیا ہے ان کے دلائل و شواہد اور تائیدات مندرجہ ذیل

ہیں:

☆ ”نهى رسول الله ﷺ عن بيع و شرط“ (رواه الطبراني في المعجم الوسيط، نصب الراية ۴/۱۷)۔

☆ ”عن النبي ﷺ: لا تتركوا ماء ارتكبت اليهود وتستحلوا محارم الله بأدنى الحيل“ (اناش: الہفان/۴۳۳)۔

☆ ”عن النبي ﷺ: قاتل الله اليهود حرمت عليهم الشحوم فجملوها فبا عوها“ (حوالہ سابق)۔

☆ ”عن النبي ﷺ: يأتي على الناس زمان يستحلون الربا باسم البيع“ (ایضاً حوالہ مذکور) (دیکھئے

مقالہ: مولانا ولی اللہ مجید قاسمی)۔

☆ ”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالا للربا وسموه بالوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه

ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكة وهو ضامن لما أكل من ثمره، وأتلف من شجره، ويسقط الدين بهلاكه،

..... لافرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام“ (شامی ۲۴۶/۴)۔

☆ ”إن العبرة في العقود للمقاصد والمعاني، لا للالفاظ والمباني“ (شرح القواعد الفقهية قاعدة: ۵۵)۔

☆ ”قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام

، قال السيد: قلت للإمام الحسن الماتريدي: قد فشا هذا البيع بين الناس، وفيه مفسدة عظيمة،

وفتواك أنه رهن، وأنا أيضا على ذلك، والصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هذا ونظهر بين

الناس، فقال: المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذلك بين الناس، فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم

دليله“ (شامی ۲۴۶/۴) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد شاہد علی قاسمی، حیدرآباد، مفتی حذیفہ محمود)۔

☆ ”حكمه حكم الرهن لا يملكه المشتري“ (فتاویٰ ہندیہ ۱۶۴/۲)۔

☆ ”لأن صاحب المال لا يقرض إلا بنفع، والمستقرض محتاج، فأجازوا ذلك لينتفع

المقرض بالمبيع وتعارفه الناس، لكنه مخالف للنهي عن بيع و شرط ، فلذا رجحوا كونه

رهنًا“ (رد المحتار ۵۵۱/۷) (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ”حكمه حكم الرهن في أرجح الأقوال عندنا“ (فتاویٰ لیسید سابق ۹۰/۱) (دیکھئے مقالہ: مولانا کلیم اللہ

عمری)۔

ان دلائل کے علاوہ مذکورہ حضرات میں سے بعض مقالہ نگاران نے ماضی قریب کے اصحاب افتاء کے فتاویٰ بھی نقل

کئے ہیں، جن میں بیع و فاء اور رہن کی تفصیلات پر بحث کی گئی ہے۔

بیع و فاء کو بیع فاسد قرار دینے والے کے دلائل:

☆ ”بیع المعاملة و بیع الوفاء واحد، وإنه بیع فاسد، لأنه بیع لا یقتضیه العقد، وأنه یفید

الملك عند اتصال القبض به، كسائر البيوع الفاسدة“ (فتاویٰ سراجیہ علی ہاشم فتاویٰ قاضی خاں ۱۶۲/۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی)۔

☆ ”قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد بأمر البائع، وكل من غويضه مال ملك المبيع بقيمته“ (كز الدقائق)۔

☆ ”أن بيع العهدة المذكور لا أعرف حقيقة على التعيين والقول الفصل فيه أن البيع إن اقترن به شرط فاسد كأن يقول له بعثك هذا بعشرة؛ فإذا رددتها إليك رددته إليّ كان فاسداً، فلا ينتقل الملك في المبيع عن مالكة ولا في الثمن عن مالكة، بل هما باقيان على ما كان عليه“ (الفتاویٰ الفقہیہ الکبریٰ ۱۵۷/۲) (دیکھئے: مقالہ مولانا محمد یار علی نعمانی)۔

☆ ”شرط الثنيا يفسد البيع ولو اسقط، ويعتبر عنها في مصر بالبيع المعاد“ (شرح الرزقانی علی مختصر خلیل ۱۵۵/۵)۔

☆ ”مذهب المالكية والحنابلة والمتقدمون من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد، لأن اشتراط البائع أخذ المبيع إذا رد الثمن إلى المشتري يخالف مقتضى البيع..... وأيضاً يقصد من ورائه الوصول إلى الربا المحرم وهو اعطاء المال إلى أجل ومنفعة المبيع هي الربح، والربا باطل في جميع حالاته“ (موسوۃ فقہیہ مادہ: بیع الوفاء) (دیکھئے مقالہ: مفتی روح اللہ قاسمی، نیز مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مقالات: مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی عبدالشکور قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی شیر علی گجراتی وغیرہ)۔ ان تمام ہی حضرات نے علماء کے مزید وہ اقوال بھی نقل کئے ہیں جن میں رہن، فساد، اور صحت بیع کی بات کہی گئی ہے۔

۲- الف: سوال: بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں ۴۳ مقالہ نگار حضرات نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ بیع مکمل ہونے کے بعد اگر بائع اور مشتری کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اس بیع کو بائع ہی کے ہاتھ مشتری فروخت کرے، دوسرے کے ہاتھ نہ بیچے تو اس کی حیثیت وعدہ کی ہوگی جس کو مشتری کے لئے پورا کرنا، بعض حضرات کے نزدیک اخلاقاً، بعض کے نزدیک دیناً اور بعض کے نزدیک قضاءً اذقانوناً اور بائع کے مضطر ہونے کی وجہ سے واجب ہوگا۔

اس موقف کو اختیار کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی اشرف قاسمی، مولانا غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد فاروق، مولانا حفیظ الرحمن خیر آبادی، مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی ارشاد دساوا، محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا احسن عبدالحق ندوی، مفتی شبیر احمد قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی، مولانا مغفور باندوی، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا عظمت اللہ میر، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی ثنا الہدی قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی جنید بن محمد، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا محمد صادق مہاکپوری، مولانا سید قمر الدین محمود بڑودہ، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد جعفر علی رحمانی، مفتی رجب قاسمی، مولانا ابوسنیان مفتاحی۔

دلائل:

مذکورہ بالا حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں قرآنی آیات، احادیث اور فقہاء کی مندرجہ ذیل عبارات پیش کی

ہیں:

☆ ”وأوفوا بالعہد إن العہد کان مسئولاً“ (سورہ اسراء: ۳۴) (دیکھئے مقالات: مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی)۔

☆ ”عن زید بن أرقم عن النبی ﷺ قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نیته أن یفی له، فلم یف ولم یجی للمیعاد، فلا إثم علیہ، قال الأشرف: هذا دلیل علی أن النیة الصالحة یناب الرجل علیہا، وإن لم یقترن معها المنوی وتختلف عنہا، ومفہومہ أن من وعد وليس من نیته أن یفی ولم یف، فعلیہ الإثم سواء وفی بہ، أو لم یف، فإنه من أخلاق المنافقین ولا تعرض فیہ لمن وعد ونیته أن یفی فلم یف بغير عذر“ (مرقاۃ المفاتیح ۶۱۵/۸، کتاب الآداب باب الوعد، الفصل الثانی، فیض القدر ۸۹۱/۲، رقم الحدیث ۷۹۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا غلام اللہ کاوی)۔

☆ ”عن النبی ﷺ: المؤمنون عند شروطہم إلا شرطاً أحل حراماً وحرم حلالاً“ (جامع الصحیح للبخاری) (دیکھئے مقالہ: محمد شکیل اسلام پوری)۔

☆ ”عن النبی ﷺ: العدة دین، فیجعل هذا المیعاد لازماً لحاجة الناس“ (زیلعی ۱۸۳/۵، بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ۲۳۰/۲۸۰) (دیکھئے مقالہ: مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیر آبادی)۔

☆ ”عن النبی ﷺ: المؤمن إذا وعد وفا“ (حدیث:)۔

☆ ”وان ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع ویلزم الوفاء بالوعدہ، کذا فی فتاویٰ قاضی خان“ (ابندیہ ۲۰۹/۳)۔

☆ ”وفی الدرالمختار: ولو بعدہ علی وجه المیعاد جاز ولزم الوفاء، لأن المواعید قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح، كما فی الکافی والخانیة“ (۵۴۷/۷)، اس قسم کی فقہاء کی عبارتوں کے لئے مزید دیکھئے مقالات: مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد عفاں منصور پوری، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی عبدالنواب اناری، مفتی جمیل احمد ندیری، محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی اور مفتی سعید الرحمن قاسمی پٹنہ وغیرہ)

اس مسئلہ میں عام طور سے مقالہ نگار نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر وعدہ خلافی کرتا ہے تو گنہگار ہوگا، البتہ مفتی ارشاد دساوا اور مفتی جنید عالم ندوی قاسمی صاحبان نے اپنے مقالہ میں یہ تفصیل لکھی ہے کہ اگر کسی مجبوری یا کسی مصلحت کی وجہ سے واپس نہ کرے تو گنہگار نہ ہوگا، بلکہ گنہگار اس وقت ہوگا جبکہ وعدہ کرتے وقت ہی وعدہ کو پورا کرنے کی نیت نہ ہو (دیکھئے مقالہ مفتی جنید عالم قاسمی) اور مفتی ارشاد دساوا لکھتے ہیں: اگر مشتری کو اس کی ضرورت ہو یا کسی مصلحت کی بنا پر واپسی میں دشواری ہو تو..... گنہگار بھی نہ ہوگا (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

شرط فاسد ہے اور مقتضائے عقد کے خلاف ہے:

اس سوال ۲ (الف) کے جواب میں دوسرے مقالہ نگاران کا موقف یہ ہے کہ بیع و فاء میں بائع کی طرف سے بیع کو اسی کے ہاتھ فروخت کرنے کی شرط، شرط فاسد اور مقتضائے عقد کے خلاف ہے، اور بعض حضرات انہیں میں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ جب معاملہ سرے سے رہن ہی ہے، تو پھر اس شرط کا کوئی معنی اور مفہوم نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں رہن یا بیع تو خود بخود بائع یا راہن کے پاس واپس جائے گی ہی تو اس کے لئے شرط لگائے، یا نہ لگائے کوئی فائدہ نہیں، اس لئے یہ شرط لغو ہے، اور مشتری کے لئے واجب الایفاء نہیں ہے، اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مولانا محمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا ارتقاء الحسن قاسمی، محمد یار علی نعمانی، مولانا حذیفہ محمود لونا واڑہ، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا عبدالخالق (راپور)، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی شاہد قاسمی، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا زین العابدین کیرالا، مفتی محمد یوسف قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد زاہد، مولانا محمد کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالشکور قاسمی۔

دلائل:

ان حضرات نے اس کے لئے چند دلائل بھی ذکر کئے ہیں جو اس طرح ہیں:

☆ ”نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع و شرط“ (اعلاء السنن ۱۳۶/۳، حدیث نمبر ۴۶۶۶)۔

☆ ”عن النبی ﷺ: لا یحل سلف و بیع و شرطان فی بیع“ (ترمذی، عن عبداللہ بن عمرو، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراہیۃ بیع مالیس عندک ۱/۱۳۸، رقم: ۱۳۳۴) (دیکھئے مقالات: مفتی شاہد علی قاسمی حیدرآباد، مولانا محمد حذیفہ محمود لونوا واڑہ، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا خورشید انور اعظمی وغیرہ)۔

☆ ”فمذہب المالکیۃ والحنابلۃ والمتقدمین من الحنفیۃ والشافعیۃ إلى أن بیع الوفاء فاسد، لأن اشتراط البائع أخذ المبیع إذا رد الثمن إلى المشتري یخالف مقتضى البیع وحکمہ“ (موسوع فقہیہ ۲۶۰/۹) (ماخوذ از مقالہ مفتی شاہد علی قاسمی)۔

☆ ”ولا بیع بشرط لا یقتضیہ العقد ولا یلائمه وفيه نفع لأحدهما“ (رد المحتار ۷/۲۸۱) (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ”ولأن البیع علی هذا الوجه لا یقصد منه حقیقۃ البیع بشرط الوفاء، وإنما یقصد من ورائه الوصول إلى الربا المحرم..... والربا باطل جمیع حالاته“ (موسوع فقہیہ ۲۶۰/۹)۔

☆ ”وخرج المبیع من أن یكون مستحق الرد علی البائع لحصول البیع من المشتري، بتسلیطه، وكذلك لورهنه المشتري بطل حق الفسخ وولاية الاسترداد“ (بدائع الصنائع وکذا فی الدر المختار ۷/۲۹۲، ۲۹۳) (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالات: مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی حذیفہ محمود لونوا واڑہ، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ)۔

جبکہ بائع کی طرف بیع کی واپسی کی شرط کے سلسلہ میں مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مفتی عادل خاں، مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا یار علی نعمانی، مفتی یاسر قاسمی، مولانا عبداللہ مفتاحی، مولانا قمر الزماں ندوی نے بیع و فاء اور رہن کی تفصیلات اور فقہاء کے اقوال نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے، اپنی کوئی رائے واضح نہیں کی ہے کہ مشتری کا یہ شرط لگانا کیا حیثیت رکھتا ہے اور وہ شرائط واجب الایفاء ہیں یا نہیں۔

سوال نمبر (۱۷) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں ۳۸ حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ بائع اول سے بیچنے کی صورت میں سابقہ قیمت ہی لازم ہوگی، مشتری زائد کا مطالبہ نہیں کر سکتا، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا محمد فاروق، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی جنید بن محمد، مولانا عبداللہ مفتاحی، مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی خیر آبادی، مولانا

راشد حسین ندوی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد ثلیل اسلام پوری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ میر کشمیری، مفتی شیر علی گجراتی، قاضی وصی احمد قاسمی (پٹنہ)، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی یاسر قاسمی، مفتی اشرف عباس قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی (امروہہ) مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا محمد جعفر علی۔

دلائل:

مذکورہ حضرات نے اس زیادتی کو ربا اور قرض سے نفع اٹھانا قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ کی وہ آیات جو ربا کی حرمت کے سلسلہ میں وارد ہیں ان سے استدلال کیا ہے، اور فقہاء کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً:

☆ ”أحل البيع وحرم الربا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)۔

☆ ”وذروا ما بقى من الربا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۸)۔

☆ ”كل قرض جر نفعاً فهو ربا“ (منصف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۲۱۰۷۸)۔

☆ ”أما الذى يرجع الى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة“ (بدائع ۵۱۸/۶)۔

☆ ”لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له فى الربا،

لأنه يستوفى دينه كاملاً، فبقى له المنفعة فضلاً، فيكون ربا“ (در مختار مع الرش ۸۳/۱، وكذا فى ملتقى الأبحر، كتاب الرهن ۲۳۷/۲، والهداية ۵۲۲/۴) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد یوسف قاسمی جو دھپور)۔

☆ ”كل قرض جر نفعاً حرام، فكله للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن“ (در مختار فصل فى

القرض ۱۹۳/۳ رشیدیہ کوئٹہ) (مولانا صادق مبارکپوری)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ معاملہ حکماً بیع ہے اور اس معاملہ کو جب بیع قرار دے دیا گیا تو مشتری کو اختیار ہے کہ چاہے تو مشتری سابقہ قیمت ہی پر بائع اول کو بیع واپس کر دے، یا چاہے تو اس پر اضافی قیمت لے، البتہ بعض حضرات اس مسئلہ میں اس کی قید لگاتے ہیں کہ اگر بائع اول سے فروخت کرے تو اخلاقاً سابقہ قیمت ہی لے، اس سے زائد کا مطالبہ نہ کرے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے:

مولانا روح الامین، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا عمران ندوی، مفتی محمد

سعید اسعد قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت ممبئی، مفتی سعید الرحمن قاسمی (پٹنہ)، مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا عبدالحق (راپور)، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی عفتان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد حذیفہ محمود لونا واڑہ، مفتی محمد زاہد (گرڑھی سلیم پور) مفتی روح اللہ قاسمی (مدھوبنی) مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا عبد التواب انادی۔

یہ حضرات چونکہ بیع و فاء کے معاملہ کو بیع قرار دیتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک جس طرح عام خرید و فروخت میں منافع مباح ہے، اسی طرح یہاں بھی مشتری کے لئے منافع مباح ہے، اور دلائل عام طور سے فقہاء کی: ”الصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا الخ“ یا اس سے ملتی جلتی عبارت ذکر کی ہے، مسئلہ چونکہ واضح ہے، اس لئے یہاں فقہاء کی عبارتوں کو چھوڑا جاتا ہے (دلائل اور عبارات کے لئے مقالات کا مطالعہ مفید رہے گا)۔

سوال نمبر (ارج): خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

مشتری کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل ۴۸ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ بیع چونکہ مشتری کے قبضہ میں ہے، اس لئے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، نیز مجوزین میں بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، اور بعض کے خیال میں بیع کی مالیت کے بقدر ہی فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے: مفتی جنید بن محمد، مفتی عبد الرشید قاسمی (کانپور)، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی اشرف قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا عمران ندوی، مولانا یوسف علی، محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبد القیوم ابراہیم پالنپوری، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، محمد شکیل اسلا پوری، مولانا خالد حسین نیوی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ میر، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی، مولانا عبدالحق راپور، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفتان منصور پوری، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی عبد الرزاق قاسمی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبد التواب انادی، مفتی محمد ارشاد دساوا، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی امر وہہ، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا ابوسفیان مفتاحی۔

دلائل و شواہد:

مندرجہ ذیل فقہی عبارات اس کے جواز میں مختلف حضرات نے پیش کئے ہیں:

☆ ”قال رسول الله ﷺ: الظهر يركب إذا كان مرهونا، وليس الدر يشرب إذا كان مرهونا، وعلى الذي يركب و يشرب نفقته، هذا حديث حسن صحيح..... وفيه حجة لمن قال: يجوز لمرتها الانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته، ولولم باذن المالك“ (تختة الاحوذی ۴/۳۶۰ باب الانتفاع بالرهن) (مقالہ مولانا ابرار خاں ندوی)۔

☆ ”أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكام..... من حل الانتفاع به“ (شامی ۲/۵۷۷)۔

☆ ”صحيح في بعض الأحكام كحل النزل ومنافع البيع“ (ہندیہ ۳/۴۰۹)۔

☆ ”وذكر الزيلعي أن الفتوى على أنه بيع لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (البحر الرائق ۶/۱۳)۔

☆ ”ولعله بنى على أنه بيع صحيح لحاجة التخلص من الربا حتى يسوغ للمشتري أكل ربحه“ ()۔

☆ ”ومنها أن هذا الملك يفيد المشتري انطلاق تصرف ليس فيه انتفاع بعين الملك بلا خلاف بين أصحابنا كالبيع والهبة والصدقة والاعتاق والتدبير والكتابة والرهن والإجارة ونحو ذلك مما ليس فيه انتفاع بعين المبيع“ (بدائع ۳/۵۹۰) (ماخوذ از مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

البتہ بیع سے فائدہ اٹھانے کے مسئلہ میں مفتی عبدالرشید قاسمی کانپور کی رائے یہ ہے کہ صرف ادا کردہ قیمت کے بعد اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب کی رائے یہ ہے کہ اس کے عین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، مولانا یوسف علی کے خیال میں بیع سے قضاء فائدہ اٹھانا جائز ہے، دیانتہ نہیں، مفتی حذیفہ لونا واڑا کے خیال میں رہائش، بار برداری، وغیرہ کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں، البتہ خرید و فروخت اور رہن کا معاملہ کرنا جائز ہے (دیکھئے: مذکورہ حضرات کے مقالات)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں ۱۵ حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ان میں سے بعض اس بیع کو امانت قرار دیتے ہیں اور بعض مال مرہون سے انتفاع کی ممانعت والے قول کی وجہ سے مشتری کو فائدہ کی اجازت نہیں دیتے، کیونکہ اس صورت میں مشتری کو حق ملکیت حاصل نہیں ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا محمد اعظمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا ارتقاء الحسن قاسمی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مولانا عبدالحی مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی یوسف قاسمی جوڈھپوری، مولانا ابراہاں ندوی۔

دلائل:

ان حضرات نے عام طور سے فقہاء کی ذیل کی عبارتوں سے استیناد کیا ہے:

☆ ”أما التصرف الذى فيه انتفاع بعين المملوك كأكل الطعام ولبس الثوب، وركوب الدابة، وسكنى الدار، والاستمتاع بالجارية والصحيح أنه لا يحل، لأن الثابت بهذا البيع ملك خبيث، والملك الخبيث لا يفيد اطلاق الانتفاع، لأنه واجب الرفع“ (بدائع الصنائع ۴/۵۹۰) (مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ”وزوائد المبيع وفاءً كزوائد المبيع فاسداً، فيضمنه وفاقاً ويضمنها بالتعدى لبدونه، كزوائد الغصب“ (جامع الفصولین ۱/۱۳۰) (مقالہ: مولانا محمد یار علی نعمانی)۔

☆ ”كل قرض جر نفعاً فهو ربا“ (الجامع الصغير للسيوطي ۲/۲۸۴)۔

☆ ”ولا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الرهن، لأنه أذن في الربا“ (رد المحتار کتاب الرهن) (دیکھئے مقالہ: مفتی سلمان پالنپوری)۔

☆ ”ولا ينتفع المرتهن استخداماً ما وسكنى ولبساً وإجارة وإعارة، لأن الرهن يقتضى الحبس إلى أن يستوفى دينه دون الانتفاع“ (البحر الرائق کتاب الرهن ۶/۳۳۸ طبع رشیدیہ کوئٹہ)۔

☆ ”قلت: وهذا مخالف لعامة المعتمرات من أنه يحل بالإذن“ (شامی ۷/۵۱۰) (دیکھئے مقالہ: ابراہاں

خاں ندوی)۔

سوال نمبر (۱د): خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیچ کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں ۴۵ مقالہ نگار حضرات کی رائے یہ ہے کہ مشتری بیچ و فاء میں۔ جو صورت اور ظاہر بیچ ہے اور حقیقتاً رہن ہے۔ بیچ کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے، مانعین میں سے بعض حضرات نے اس کی بھی قید لگائی ہے کہ خرید و فروخت کا یہ معاملہ بائع کی اجازت پر موقوف و معلق رہے گا، جس کا مفہوم بھی یہی نکلتا ہے کہ مشتری خرید

وفروخت میں آزاد نہیں ہے، ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی جنید بن محمد، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد ندیری، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (دیوبندی)، مفتی سلمان قاسمی پالنپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا محمد عفتان منصور پوری، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی عارف باللہ قاسمی، محمد عظمت اللہ میر کشمیری، مفتی شیر علی گجراتی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی (پٹنہ)، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مفتی محمد اشرف عباس قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی منصف بدایونی، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبدالحئی مقتاجی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبدالنواب اناری، مولانا محمد حذیفہ محمود لونا واڑہ، مولانا عبداللہ ندوی، مفتی محمد رجب قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا ابوسفیان مقتاجی، مولانا محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد ابرار خاں ندوی، مولانا زین العابدین (کیرالہ)، مولانا محمد زاہد (گرڑھی سلیم پور) مولانا مجتبیٰ قاسمی، قاضی محمد کامل قاسمی۔

مذکورہ حضرات مانعین نے مندرجہ ذیل دلائل کا اس کے لئے سہارا لیا ہے:

☆ ”باع کرہ من آخر بیع الوفاء وتقابضاً، ثم باعه المشتري من آخر بيعاتهما وسلم وعاب، فللبائع أن يخاصم المشتري الثاني ويسترد منه الكرم“ (الفتاویٰ الہندیہ ۲۰۹۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد مغفور باندوی)۔

☆ ”ولیس للمرتھن أن يبيعه إلا برضاء الراهن، لأنه ملكه ومارضى بيعه“ (الہدایہ مع الفتح ۵۳۸/۵) (مولانا عبدالحئی مقتاجی)۔

☆ ”فإنه لا يملك بيعه“ (رد المحتار ۵۳۸/۷) (مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

☆ ”قلت: هذا العقد مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما“ (البحر الرائق ۱۳/۶) (دیکھئے مقالہ: مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا عفتان منصور پوری)۔

☆ ”وفيه من معنى الرهن أن المشتري لا يملك حق استهلاك المبيع ولا نقل ملكيته إلى أحد بعوض ولا بغير عوض ولا أن يرهنه ولا ينشئ عليه حقا عينيا لأحد، بل يجب عليه حفظه وصيانته، وأن المشتري ملزم برد المبيع بالوفاء إلى البائع متى رد هذا إليه الثمن، وهذا معنى الوفاء في تسميته“ (المدخل الفقہی العام ۶۱۱)۔

☆ ”اذا باع باتا أو وفاء أو وهب، إن هذا التصرف، فلا يصح، وإذا مات المشتري وفاء فورثته يقومون مقامه في أحكام الوفاء“ (بزازیہ ۴/۲۰۶، وبعده المشتري للبائع اور وثیقہ حق الاسترداد مع الرد ۸/۵۴۸) (اشرف عباس قاسمی)۔

اس کے علاوہ سابقہ سوالات کے جوابات میں پیش کی گئی عبارتوں کو پیش کیا ہے، جن کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

مجوزین (دوسری رائے):

مشتري کے لئے دوسرے سے اس بیع کو فروخت کرنے، مزید قیمت وصول کرنے اور استفادہ کے متعلق دوسری رائے یہ ہے کہ مشتري کو اس کی اجازت ہے، مشتري فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور فروخت بھی کر سکتا ہے، اس رائے کو اختیار کرنے والے ۲۲ مقالہ نگار حضرات ہیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی اشرف عباس قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا عبدالحق راجپور، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی (امروہہ)، مفتی محمد ارشاد دساوا، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مفتی یوسف قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی شبیر احمد قاسمی (امروہہ)۔ ان حضرات نے بنیادی طور پر اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ جب اس کو بیع تسلیم کر لیا گیا تو مشتري اس کا مالک قرار پایا، جب مالک ہو تو وہ اپنی ملکیت سے فائدہ اٹھانے کا اور اس کی قیمت طے کرنے وغیرہ کا اختیار خود رکھتا ہے، اس سے مشتري کو روکا نہیں جاسکتا۔

دلائل:

حضرات مجوزین نے اس سلسلہ کی بہت سی فقہی عبارتیں پیش کی ہیں، مثلاً:

☆ ”لأن الثمن حق العاقد، فلا ينبغي له أن يتعرض لحقه“

☆ ”بعض مشائخ زماننا قالوا: الشرط لولم يكن في العقد جعلناه بيعاً صحيحاً في حق

المشتري حتى ينتفع بالمبيع كسائر أملاكه“ (جامع الفصولین ۱/۲۳)۔

متفرق رائے:

البتة بعض حضرات کی رائے اس میں یہ ہے کہ فروخت کر سکتا ہے، قیمت اضافہ کر کے نہیں لے سکتا۔

بعض مقالہ نگار نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر دوسرے سے فروخت کرے تو قیمت زیادہ لے سکتا ہے، بائع اول سے فروخت کرنے کی صورت میں اضافی قیمت نہیں لے سکتا (دیکھئے: مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی اشرف قاسمی امر وہہ کہتے ہیں کہ اگر بیع بیچ دے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، مزید قیمت لینے سے متعلق مولانا یوسف علی کہتے ہیں: مزید قیمت لے تو قضاء جائز ہے، دیانتہ جائز نہیں ہے، مولانا قاضی محمد کامل صاحب اس مسئلہ میں کہتے ہیں کہ بیع میں نقص پیدا ہونے کی وجہ سے ثمن بائع اور مشتری کے درمیان تقسیم ہوگی، مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ بائع اول سے پوچھ لے تو بہتر ہے، ان تمام مسائل و مشکلات اور ضرورت و حاجت کے پیش نظر مفتی شبیر احمد قاسمی مراد آباد، اور مفتی عمران اللہ قاسمی کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بیع و فاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا (دیکھئے: دونوں حضرات کے مقالات)۔

سوال نمبر ۲: اگر بیع و فاء کو رہن قرار دیا جائے تو!

(۲ الف) جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

۴۷ حضرات مقالہ نگاران کی رائے یہ ہے کہ اگر بیع و فاء کو رہن قرار دیا جائے تو مشتری کے لئے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے، اس کا فائدہ اٹھانا قرض و امانت سے فائدہ اٹھانے کے مترادف ہوگا، جو سود ہے اور ممنوع ہے، اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مولانا محمد فاروق، مفتی جنید بن محمد، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی (امر وہہ)، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی جمیل احمد ندیری، محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مفتی محمد عادل خاں، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلیمان قاسمی پالنپوری، مولانا ابراہیم خاں ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ولایت ممبئی، مولانا عظمت اللہ میر، مولانا عارف باللہ قاسمی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مفتی یوسف قاسمی (جوڈھیور) مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا محمد سالم اعظمی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا محمد یاسر قاسمی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق رامپوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی (امر وہہ)، مولانا سید قمر الدین بروڈہ، مولانا عبداللہ مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی عبدالنواب انادی، مولانا محمد حذیفہ محمود، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا عبید اللہ ندوی، قاری ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رجب قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مفتی محمد جعفر ملی، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا زین العابدین کیرالا، ڈاکٹر شیخ محروس المدرس (عراق)، مفتی شاہجہاں ندوی۔

دلائل:

ان حضرات نے عام طور سے قرض و امانت سے استفادہ کی ممانعت کو پیش نظر رکھا ہے، مثلاً:

☆ ”کل قرض جو نفعا فہو ربا“ (حوالہ اوپر گزر چکا ہے)۔

☆ ”عن النبی ﷺ: لا یغلق الرهن من صاحبه الذی رهنه، له غنمه، وعلیہ غرمه“ (صحیح ابن حبان،

حدیث نمبر: ۵۹۳۴) (مقالہ مولانا شاجہاں ندوی)۔

☆ ”نہی رسول اللہ ﷺ عن صفقتین فی صفقة واحده“ (ابن جنبل رقم الحدیث: ۳۷۸۲، ابن حبان رقم

الحدیث: ۵۰۲۵، ۱۰۵۳) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد یار علی نعمانی)۔

☆ ”فان رسول اللہ ﷺ: الظهر یرکب اذا کان مرهونا، ولبن الدر یشرب اذا کان مرهونا،

وعلی الذی یرکب ویشرب نفقته“ (هذا حدیث حسن صحیح..... ومنه حجة لمن قال یجوز للمرتهن

الانتفاع بالرهن اذا قام بمصلحته، ولو لم یأذن المالك، وهو قول احمد و اسحاق و طائفة..... وذهب

الجمهور إلى أن المرتهن لا ینتفع من المرهون بشئ و تأولو الحدیث (تجہ الاحوذی ۴/۲۶۱) (دیکھئے مقالہ مولانا

ابراہم خاں ندوی)۔

☆ ”فاذا کان رهننا لا یملکہ ولا ینتفع به، وأی شئ کل من زوائد یضمن ویستردہ عند قضاء

الدين“ (تبيين الحقائق ۵/۱۸۳)۔

☆ ”ولیس للمرتهن الانتفاع بالرهن“ (ملتی ۱/۲۷۳)۔

☆ ”وکذا لیس للمرتهن أن ینتفع بالمرهون حتی لو کان الرهن عبد الیس له أن یرتخدمه،

وان کان دابة لیس له أن یرکبها، وان کان مصحفا لیس له أن یقرأ فیہ، لأن عقد الرهن یفید ملک

الحبس لا ملک الانتفاع، بأن انتفع به فہلک فی حال الاستعمال یضمن کل قیمتہ، لأنه

صار غاصبا“ (بدائع الصنائع ۵/۲۱۲) (دیکھئے مقالہ: راشد حسین ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام، مولانا خورشید انور اعظمی)۔

☆ ”لا یجوز للمرتهن أن یتصرف فی غیر المركوب والمحلوب وهو الصحیح، وعلیہ اکثر

الأصحاب“ (الانصاف ۵/۱۳۱)۔

☆ ”الثابت فی مذهب أئمتنا الحنفیة: عدم جواز انتفاع المرتهن بالرهن، أنه غیر ماذون

بذلك، وله ولاية الحبس فقط، وحتى لا یحصل علی منفعة زائدة، وفي ذلك شبهة الربا، لعدم

وجود المقابل لهذه الزيادة، إذ نماء الرهن للراهن دون غیره“ (دیکھئے: مقالہ شیخ ڈاکٹر محروس المدرس)۔

☆ ”والغالب من أحوال الناس أنهم يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع“ (شامی ۳۴۳/۵)۔

☆ ”قلت: وهذا مخالف لعامة المعتمرات من أنه يحل بالاذن، إلا أن يحمل على الديانة، وما فى المعتمرات على الحكم، ثم رأيت فى جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطا صار قرضا فيه منفعة وهو ربا“ (شامی ۳۴۳/۵) (دیکھئے مقالہ: راشد حسین ندوی)۔

ان مذکورہ عبارات کے علاوہ بہت سے مقالہ نگار حضرات نے اردو فتاویٰ بھی نقل کئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ: مولانا حذیفہ محمود، مفتی یاسر قاسمی وغیرہ)۔

دوسری رائے:

دوسری رائے بیع و فاء کے رہن قرار دینے کی صورت میں انتفاع کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اس سے انتفاع کی گنجائش ہوگی، اس میں بعض حضرات تو مالک کی اجازت کو شرط قرار دیتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ بقدر صرفہ، بعض حضرات اس کو رہن ہی نہیں مانتے، اور بعض مجوزین مطلقاً اس کی اجازت کے قائل ہیں، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا روح الامین، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا محمد اعظمی، قاضی محمد کمال قاسمی، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی شاہد علی قاسمی (امروہہ)، مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی۔

دلائل:

☆ ”ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشائخنا فى هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه وهو الانتفاع به، دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز الاستصناع لذلك، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تبيين الحقائق ۲۲۵/۱۵)۔

☆ ”وهذا البيع فى يد المشتري كالرهن فى يد المرتهن لا يملكه..... إلا بإذن مالكة“ (عالمگیری ۲۰۹/۳) (مفتی ریاست علی قاسمی)۔

☆ ”وقيل: بيع يفيد الانتفاع به“ (درمختار ۵۴۶/۷ باب الصرف)۔

سوال نمبر ۲ رب: اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل ۳۸ حضرات کا خیال یہ ہے کہ اس طرح خرید و فروخت کا معاملہ اور پھر کرایہ داری اور اس میں معمول سے کم کرایہ کی ادائیگی یہ شکل جائز نہیں ہے:

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد فاروق، مولانا جنید بن محمد، مفتی اشرف قاسمی، مفتی شبیر احمد دیوبولی، مولانا عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلمان پالنپوری، مولانا محمد قمر الزماں، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن، مفتی روح اللہ قاسمی، محمد عظمت اللہ میر، مولانا شیر علی گجراتی، ارتقاء الحسن کاندھلوی، محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، محمد یاسر قاسمی، مولانا عمران اللہ قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق (راپور)، مفتی عبدالرزاق امر وہہ، مولانا سید قمر الدین محمود بروڈہ، مولانا عبدالحی مفتاحی، مفتی محمد ارشاد دساوا، مولانا عبید اللہ ندوی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رجب قاسمی، مولانا مغفور باندوی، مولانا شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا محمد جعفر ملی، مولانا مجتبیٰ قاسمی، مولانا ابراہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا زین العابدین کیرالا، مفتی محمد عادل خان۔

دلائل:

ان حضرات کے نزدیک عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ یہ شکل دراصل قرض سے فائدہ اٹھانے، نیز ایک معاملہ میں دو معاملہ کرنے کے زمرے میں داخل ہے، جس کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔

☆ ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ (حوالہ اوپر گزر چکا ہے)۔

☆ ”عن عبد اللہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا يحل سلف وبيع“ (ابوداؤد باب فی الرجل

بیع مالیس عنده، ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ بیع مالیس عندک)۔

☆ ”نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع و شرط“ (نصب الرایہ)۔

☆ ”مالا یحتاج إلی مؤنة (قوت) کالدار والمتاع ونحوہ، لا یجوز للمرتہن الانتفاع بہ بغير

إذن الراهن بحال، لأن الرهن ومنافعه ونمائه ملک الراهن، فلیس لغيره أخذها بغير إذنه، فإن أذن

الراهن للمرتہن فی الانتفاع بغير عوض، وکان دین الرهن من قرض لم یجز، لأنه قرض یجر منفعه،

وذلك حرام..... وان الانتفاع بعوض هو أجر المثل من غير محاببات جاز فی القرض و غیرہ لكونه لم

ینتفع بالقرض بل بالاجارة،..... والخالصة أن الانتفاع إن کان بعوض جاز فی القرض و غیرہ إن کان

بأجر المثل، وإن کان بغير عوض لایجوز فی القرض“ (الفقه الاسلامی وادلتہ ۵/۲۵۸-۲۵۹) (دیکھئے مقالہ: مولانا

حذیفہ محمود)۔

☆ ”و كذلك لو باع عبدا على أن يستخدمه البائع شهرا أو دار اعلى أن يسكنه أو على أن يقرضه المشتري درهما أو على أن يهدى له هدية، لأنه شرط لا يقتضيه العقد، وفيه منفعة لأحد المتعاقدين، ولأنه شرط عليه السلام ”نهى عن بيع وسلف“، ولأنه لو كان الخدمة والسكنى يقابله شئ من الثمن يكون إجارة في بيع، ولو كان لا يقابله يكون اعارة في بيع، وقد نهى النبي ﷺ عن صفتين في صفقة“ (ہدایہ ۳/۲۴-۲۵ ورد المختار ۱۰/۱۳۰) (دیکھئے مقالہ: خورشید احمد اعظمی)۔

نیز اس مسئلہ میں مفتی جنید عالم ندوی قاسمی نے یہ تفصیل ذکر کی ہے کہ:

”کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ جو کثیر رقم لی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- ایک تو یہ کہ وہ رقم بہ طور ضمانت لی جاتی ہے، کرایہ دار جب مکان و دکان خالی کرتا ہے تو اس کی وہ رقم واپس کر دی جاتی ہے، ایسی صورت میں مذکورہ رقم کی حیثیت رہن کی ہے، اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، اور وہ رقم مالک مکان و دکان کے پاس امانت رہے گی، وہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا، اس صورت میں کرایہ معمول کے مطابق ہی لیا جاتا ہے، اگر مالک مکان و دکان اس رقم کو بہ طور قرض اپنے استعمال میں لاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کرایہ معمول سے کم لیتا ہے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، یہ اپنے قرض پر نفع اٹھانا ہے جو حرام ہے..... اگر کسی خاص مصلحت کے تحت وہ کرایہ کم لیتا ہے تو شرعاً یہ جائز ہے، ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ کے تحت نہیں آئے گا، اس لئے کرایہ دار نے جو رقم دی ہے وہ قرض نہیں ہے، بلکہ بہ طور ضمانت اور بہ طور رہن ہے (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ مشتری یا مرہن کے لئے کم کرایہ ادا کرنے کی سہولت سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، ان میں سے بعض حضرات تو مطلقاً اس کو معاملہ بیع کی وجہ سے درست قرار دیتے ہیں، بعض حضرات اجرت مثل ادا کرنے کی شرط پر اس کی اجازت دیتے ہیں، جبکہ مجوزین میں سے بعض حضرات رہن کو باطل قرار دے کر اجارہ کا معاملہ تصور کرتے ہیں، اور مستاجر کے لئے کم یا زیادہ کرایہ سے فائدہ اٹھانا امر مباح ہے۔

اس موقف کو اختیار کرنے والے مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی اشرف قاسمی، مولانا غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا معز الدین قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم پالپوری، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی محمد عادل خاں، مولانا محمد اعظمی، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد اشرف قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عفتان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی منصف بدایونی، مولانا عبدالنواب اناری، مولانا محمد حذیفہ لونا واڑہ، مفتی محمد یوسف قاسمی

(جوڑھپور)، مفتی شاہد علی قاسمی، مفتی عبدالقیوم پالنپوری، مفتی شاہجہاں ندوی۔

دلائل:

بنیادی طور پر مذکورہ حضرات نے اس معاملہ کو ”قرض“ سے نفع اٹھانے کے زمرے میں نہیں تسلیم کیا ہے، اس کے علاوہ فقہاء کی ان عبارتوں کو استشہاد میں پیش کیا ہے جس میں مال مرہون سے مرہن کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

☆ ”قال الله تعالى: إنا أن تكون تجارة عن تراضی منكم“ (سورۃ نساء: ۲۹)۔

”عن النبی ﷺ: لا یحل مال امرأ مسلم إلا بطیب نفس منه“ (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۳۸۸، مسند ابی یعلیٰ ۱۵۷۰، دار قطنی ۲۸۸۵) (مقالہ مولانا شاہجہاں ندوی)۔

☆ ”عن جابر بن عبد الله أن النبی ﷺ قال: لا یبیع حاضر لباد دعوا الناس یرزق الله بعضهم من بعض“ (سنن ابن ماجہ ۱/۱۵۷)۔

☆ ”عن أنس بن مالک قال: غلا السعر فی عهد رسول الله ﷺ: فقالوا: یا رسول الله! قد غلا السعر، فسعرلنا، فقال: إن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق“ (حوالہ مذکور ۱/۱۵۹) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد عمران ندوی اورنگ آباد)۔

☆ ”والجمهور علی جواز الغبن فی التجارة، مثل أن یبیع رجل یاقوتة بدرهم وهی تساوی مائة، فذلک جائز، وأن المالك الصحیح الملك جائز له أن یبیع ماله الكثير بالتافة الیسیر، وهذا مالا اختلاف فیہ بین العلماء إذ عرف قدر ذلک“ (تفسیر القرطبی ۵/۳۰۰)۔

☆ ”فهو عقد مزيج من بیع ورهن، لكن أحكام الرهن فیہ هی الغالبة ففیہ من معنی البیع احکام، أهمها أن المشتري بالوفاء یملك بمقتضى العقد منافع الشئ المبیع وفاء، فله أن ینتفع به بنفسه، وأن ینتفعه بإیجاره للبائع ذاته أو لغيره“ (الدخل الفقہی العام ۱/۶۱۱) (دیکھئے مقالہ: محمد عرفان منصور پوری)۔

☆ ”فالمستأجر..... إن كان هو المرتهن وجدد القبض لإجارة أجنبیا بمباشرة أحدهما العقد بإذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن وولاية القبض للعاقدة“ (رد المحتار ۱۵/۱۳، الفتاویٰ الہندیہ ۵/۳۵۶، وفي البداء ایضا: ولو آجره من المرتهن صححت الاجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض للاجارة، بدائع ۵/۲۱۲) (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

☆ ”استحسانا للتعامل بلانکیر (الدر المختار) قوله استحسانا أى یصح البیع ویلزم الشرط استحسانا للتعامل..... ولو حدث عرف فی شرط غیر الشرط فی النعل والثوب القبقات أن یکون

معتبراً إذا لم يؤد إلى المنازعه“ (شامی ۸۸/۵) (دیکھئے مقالہ: مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری)۔
متفرق آراء:

اس مسئلہ میں مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، محمد عمران ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ جواز کے لئے ضروری ہے کہ کرایہ اجرت مثل سے کم نہ ہو، اور مفتی جمیل احمد ندیری کہتے ہیں کہ اس میں اگر مالک مکان یا زمین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم کرایہ مقرر کیا گیا ہو تو کراہت سے خالی نہیں ہے، اور مولانا حدیفہ لونڈا کہتے ہیں کہ یہ صورت اس وقت جائز ہے، جبکہ بائع کی لی ہوئی رقم کو مرہون قرار دے کر اس کا استعمال اس کے لئے ممنوع قرار پائے (تفصیل کے لئے دیکھئے: مذکورہ حضرات کے مقالات)۔

ڈاکٹر شیخ محروس مدرس حنفی عراقی نے بھی رہن میں اجارہ کا مسئلہ اٹھایا ہے، تاہم انہوں نے بھی امام محمد سے امام ابوحنیفہ کی قرض سے نفع اٹھانے والی مکروہ والی روایت اور امام کرخی کی وہ روایت جس میں اگر معاملہ کے اندر نفع اٹھانا مشروط نہ ہو تو اس صورت کو جائز قرار دیا گیا ہے، نقل کرنے پر اکتفاء کیا ہے، انہوں نے اپنی طرف سے کوئی رائے اس مسئلہ میں نہیں دی ہے (دیکھئے: شیخ کا عربی مقالہ کا اردو ترجمہ)۔

سوال نمبر ۲ راج: اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل ۴۴ مقالہ نگاران، یعنی اکثر کی رائے یہ ہے کہ مشتری اس بیع سے کاشت یا اجارہ داری وغیرہ کے ذریعہ فائدہ نہیں حاصل کر سکتا:

مولانا محمد فاروق، مفتی جنید بن محمد، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی عبداللطیف پالنپوری، مفتی سلمان پالنپوری قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مولانا ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد یاسر قاسمی، مولانا حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی عبدالرزاق (امروہہ)، مولانا عبدالحی مقتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مفتی عبدالنواب انادی، مولانا محمد حدیفہ محمود لونڈا، مفتی محمد ارشاد دساوا، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی رجب قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد شاہد قاسمی، مولانا ابوسفیان مقتاحی، مفتی محمد جعفر ملی، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا زین العابدین، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد تشکیل اسلام پوری، مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، قاری ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی روح اللہ قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مفتی محمد یوسف قاسمی۔

دلائل:

ان حضرات کے پیش نظر وہی اسباب و وجوہ ہیں جو سوال اول کے ضمن میں بیع و فاء سے استفادہ کی بابت پیش کئے گئے ہیں، اس لئے ان دلائل کو تکرار کی وجہ سے یہاں سے حذف کیا جاتا ہے (حسب ضرورت وہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)۔

دوسرا نقطہ نظر:

اس مسئلہ میں دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ مشتری کے لئے اس بیع سے کرایہ داری اور کاشت کاری کے ذریعہ فائدہ اٹھانا درست ہے، جبکہ مجوزین ہی میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مرتہن راہن کی اجازت سے ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے، بغیر اس کی اجازت کے نہیں اٹھا سکتا، گویا مشروط اجازت یہاں بھی مشتری یا مرتہن کو حاصل ہے، اس رائے کے حاملین میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

مولانا راشد حسین ندوی، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی (مراد آباد)، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی غلام اللہ کاوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی اشرف عباس قاسمی، مفتی معز الدین قاسمی، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی خالد حسین نیوی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا شیر علی گجرات، مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی (پٹنہ)، قاضی وصی احمد قاسمی (پٹنہ)، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا عبدالخالق (راپور)، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد عرفان منصور پوری، مفتی ریاست علی قاسمی (امروہہ)، مولانا سید قمر الدین محمود، مفتی محمد یوسف قاسمی، مفتی محمد زاہد۔

دلائل:

حضرات مجوزین کے پیش نظر فقہاء کے وہی اقوال ہیں جن میں راہن کی اجازت سے اجارہ اور کاشت کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کو درست قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

☆ ”وان اجر المبيع وفاء من البائع ممن جعله فاسداً، قال: لا تصح الإجارة..... ومن أجازه جوز الإجارة من البائع وغيره وأوجب الأجر“ (فتاویٰ بزازیہ ۳/۱۳۳ مع الہندیہ)۔

☆ ”أن كل ما يصح بيعه قبل قبضه تجوز إجارته، ومالا فلا، وبيع العقار قبل القبض جائز، فكذلك إجارته“ (حوالہ سابق)۔

☆ ”وهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكة“ (شامی ۲/۵۴۶)۔

☆ ”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالا للربا وسموه بيع الوفاء، وهو رهن في الحقيقة، لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكة“ (شامی ۵/۲۴۶)۔

متفرق آراء:

بعض مقالہ نگار حضرات نے پھر وہی بحث چھیڑی ہے کہ اگر بیع ہے تو جائز اور رهن ہے تو ناجائز، جیسے مفتی غلام اللہ

کاوی، وہ لکھتے ہیں: اس کی انکم راہن کی ہوگی، ”فالغالب من أحوال الناس أنهم يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم، وكذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع“ (شامی ۲۱۱/۵-۲۱۰) (دیکھئے: مقالہ موصوف)۔

مولانا شیرعلی گجراتی اور مفتی اشرف عباس قاسمی کے خیال میں کاشت وغیرہ کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، کرایہ داری کا معاملہ نہیں کر سکتا (دیکھئے مقالات: مفتی شیرعلی گجراتی، مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

مفتی شبیر احمد قاسمی مراد آباد کے خیال میں مشتری کے لئے نفع کی اجازت ہے، ان کے الفاظ میں: ”لہذا راجح یہی ہوگا کہ بیع کو کرایہ پردے کرا جرت حاصل کرنا مشتری کے لئے اس وقت تک جائز ہوگا جب تک بائع ثمن دے کر بیع واپس نہ لے گا“۔

مزید اس سلسلہ کی فقہی عبارتیں اوپر گزر چکی ہیں، حسب ضرورت سوال نمبر ایک کے ضمن میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر ۲ رد: خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے کو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام ہی مقالہ نگاران کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع یا رہن کو فروخت کرنے کا کوئی اختیار اور حق نہیں ہے، اور اگر فروخت کر بھی دیتا ہے تو بائع کی اجازت پر بیع کا نفاذ موقوف رہے گا (چونکہ یہ رائے تقریباً اتفاق ہے، اس لئے اسمائے گرامی کی فہرست چھوڑی جاتی ہے)۔

اس مسئلہ میں متفرق آراء:

اس مسئلہ میں مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد سالم اعظمی، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی شاہد علی قاسمی نے اس کی صراحت کی ہے کہ مشتری بائع کی اجازت سے بیع کو فروخت کر سکتا ہے، اور مولانا جنید بن محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر مدت مکمل ہو جائے تو فروخت کر سکتا ہے، اور مفتی جمیل ندیری کا خیال ہے کہ فروخت تو نہیں کر سکتا، الا یہ کہ مشتری کو اپنا حق وصول کرنے میں کوئی دشواری اور مجبوری پیش آجائے، گویا ان حضرات کی آراء کا حاصل بھی جب بائع کی اجازت پر موقوف ٹھہرا تو عدم جواز ہی نکلتا ہے، صرف مفتی اشرف قاسمی کا خیال ہے کہ اس کے لئے فروخت کرنا جائز ہے، اور جو قیمت زیادہ ملے گی اسے بائع کو لوٹانا ضروری ہوگا۔

مفتی زاہد (گڑھی سلیم پور) اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: زیر بحث صورت مسئلہ میں اگر مشتری و فاء بائع کے علاوہ دیگر کے ہاتھ بیع و فاء فروخت کر دے تو وہ بیع نافذ ہوگی اور مشتری ثانی کے لئے بیع حلال ہوگی (دیکھئے: مقالہ موصوف ۹۲)۔

دلائل:

دلائل وہی نقل کئے ہیں جو رہن کے احکام سے متعلق سوال نمبر ۲ کے الف اور ب میں گزر چکے ہیں، مثلاً:

☆ ”ولو باعه المشتري للبايع أو ورثته حق الاسترداد، أي على القول بأنه رهن، وكذا على القولين قائلين، بأنه بيع يفيد الانتفاع به، فإنه لا يملك بيعه كما قدمنا“ (شامی ۵۳۸/۷، مکتبہ زکریا دیوبند) (دیکھئے مقالہ: مفتی محمد منصف بدایونی)۔

☆ ”وعليه الفتوى أعنى لا يملك المشتري بيعه من الغير كما في بيع المكره“ (البحر الرائق ۱۳/۶)۔

☆ ”فليس لأحد من البائع والمشتري أن يبيع مبيع الوفاء من آخر بدون إذن الآخر“

(در الاحکام ۱/۳۶۵، مجلہ الاحکام دفع: ۳۹۷) (دیکھئے مقالہ: محمد شہا جہاں ندوی)۔

سوال نمبر: ۳- آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے، تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے، لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے؛ کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لئے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت و رہن کی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

اس سوال کے جواب میں ایک رائے یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہے، اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہے، جو شرعاً سود میں شامل ہے اور ممنوع ہے، اس رائے کو مندرجہ ذیل حضرات نے اختیار کیا ہے۔

مولانا راشد حسین ندوی، مولانا محمد فاروق، مفتی جنید بن محمد، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا روح الامین، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالپوری، مفتی شبیر احمد دیولوی، مولانا عبداللطیف، مفتی سلمان قاسمی، مولانا محمد اعظمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی لطیف الرحمن ممبئی، مفتی انور علی اعظمی، مفتی روح اللہ قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا ارتقاء الحسن قاسمی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محمد اشرف عباس قاسمی، مفتی عمران اللہ قاسمی، مولانا عبدالخالق (راپور)، مفتی عبدالرزاق قاسمی (امروہہ)، مولانا عبدالحیٰ مفتاحی، مولانا محمد حدیفہ محمود لونواڑہ، مولانا محمد ارشاد دساوا، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی رحیب قاسمی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی ابوسفیان مفتاحی، مولانا شہا جہاں ندوی، مولانا محمد مختی قاسمی، مفتی محمد یاسر قاسمی، محمد سالم اعظمی۔

دلائل:

اس کے دلائل واضح ہیں، اور تقریباً مقالہ نگاران نے اسی کو استدلال میں پیش کیا ہے۔ یعنی: ”کل قرض جر نفعاً فهو ربا“ (حوالہ گڈرچکا)، ”وأحل الله البيع وحرم الربا“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۵)۔
دوسری رائے:

اس مسئلہ میں دوسری رائے یہ ہے کہ زرضمانت کی ضرورت موجودہ عہد میں عام طور سے مالک دکان و مکان کے ضرر سے بچنے کے لئے پڑتی ہے، اور مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ جس مکان اور دکان پر پہلے ہی سے زرضمانت ادا کیا گیا ہوتا ہے، اس میں کرایہ دار اور مالک دونوں کو اطمینان رہتا ہے، نہ کہ کرایہ دار کو اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ مالک اس سے خالی کرائے گا، اور نہ مالک کو خوف ہوتا ہے کہ کرایہ دار خاموشی سے بھاگ جائے گا، یا میری ملکیت کو نقصان پہنچائے گا، اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ دور کی یہ ایک ضرورت ہے اور کرایہ دار کی جانب سے رضا کارانہ طور پر یا عرف و حالات کی وجہ سے دی جانے والی رقم ہے، کرایہ کی کمی یا زیادتی، یا اس کی وجہ سے کرایہ دار کی منفعت کو نہیں جوڑا جاسکتا۔

اس رائے کے حامل مندرجہ ذیل حضرات ہیں:

مفتی ثناء الہدی قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی غلام اللہ کاوی، مولانا حفیظ الرحمن ندوی، مفتی جمیل احمد ندیری، مولانا محمد عمران ندوی، مولانا یوسف علی، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد خالد حسین نیوی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مولانا کلیم اللہ عمری، مولانا عبد الشکور قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا محمد عرفان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا عبد التواب اناوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا محمد جعفر ملی، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی، مولانا محمد یوسف قاسمی، مفتی عبد الرحیم قاسمی۔

دلائل:

ان حضرات نے جو دلائل دیئے ہیں ان کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ چونکہ زرضمانت کی شکل میں کرایہ میں کمی یہ قرض سے نفع اٹھانے کے دائرے میں نہیں آتا ہے، بلکہ معاملات کی بہتری کے لئے اختیار کیا جانے والا جدید طریقہ ہے۔

☆ ”يعتبر ویراعی کل ما اشترط العاقدان فی تعجيل الأجرة وتأجيلها وفي موضع آخر: يلزم الأجرة بشرط التعجيل، یعنی لو شرط أن تكون الأجرة معجلة لزم المستأجر تسليمها“ (شرح الحبلہ ۱/۲۶۱، ۲۶۵، بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۵۸۳) (مقالہ: مفتی محمد عرفان منصور پوری وغیرہ)۔
☆ قاعدہ: ”الغرم بالغنم“ (دیکھئے: مقالہ مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی)۔

☆ ”ہو عقد مخصوص برد علی دفع مال مثلی لآخر لیردمثلہ“ (شامی ۷/۳۸۸) (دیکھئے مقالہ: مولانا خورشید انور اعظمی)۔

متفرق آراء:

اس مسئلہ میں مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مفتی شبیر احمد قاسمی، مفتی عادل خاں، قاضی محمد کامل قاسمی، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی ریاست علی قاسمی، مفتی عظمت اللہ میر، مفتی منصف بدایونی، مولانا سید قمر الدین محمود نے اپنی کوئی رائے نہیں دی ہے۔

نیز بیع و فاء کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا یوسف قاسمی، مفتی محمد زاہد (گڑھی سلیم پور)، اور شیخ ڈاکٹر محروس المدرس نے عرف و عادت کے اصول و ضوابط پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، جسے پیش نظر رکھ کر غور کیا جاسکتا ہے۔

☆ ڈاکٹر محروس مدرس کے خیال میں یہ رائے زیادہ درست ہے کہ بیع و فاء کا معاملہ درست نہیں ہے، ان کے الفاظ ہیں: ”مانرا فی المسئلة“۔

☆ اولاً: نحن نتفق مع الذين لا يعتبرون هذا العقد بيعاً“ (تجہ: لاعبرۃ بجر الدیۃ بلا لفظ) (تفصیل کے لئے دیکھئے: شیخ کے عربی مقالہ کا اردو ترجمہ)۔

☆ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ زرعمانت والے مسئلہ میں اگر پیشگی رقم کو قرض تسلیم کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے وہ کہتے ہیں: ”احقر کے خیال میں قرض ماننا زیادہ موزوں ہے، کیونکہ رہن ماننے کی صورت میں بعض فقہاء کے نزدیک اجازت کے بعد بھی انتفاع درست نہیں ہے..... لہذا اگر وہ کرایہ (جس کی کمی قرض سے نفع اٹھانے کے مترادف ہے) اجرت مثل قرار دیا جائے، تو یہ اعتراض بھی ختم ہو جائے گا، اس طرح زرعمانت والے مسئلہ میں اجرت مثل کی شکل اختیار کر کے قباحتوں کو ختم کیا جاسکتا ہے (تفصیل کے لئے موصوف کے مقالہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے)۔

بیج الوفاء

(سوال نمبر ۱، ۲)

مفتی عبدالرزاق امر وہوی ☆

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بانیسویں فقہی سمینار کے ایک موضوع ”بیج الوفاء“ سے متعلق سوالنامہ کے ابتدائی ایک اور دو سوالات کا عرض احقر کے ذمہ کیا گیا تھا، عرض مسئلہ کے لئے کل ۷۰ مقالات اکیڈمی کی جانب سے بھیجے گئے، ان میں سے تین مقالے عربی زبان میں ہیں اور ۶۷ مقالات اردو زبان میں، پھر کچھ مقالات تو تفصیلی ہیں مگر اکثر مقالات مختصر ہیں، تمام مقالات کے مطالعہ کے بعد تجزیہ یہ سامنے آیا کہ ”بیج الوفاء“ کے عنوان سے کیا جانے والا عقد (۴۵) مقالہ نگار حضرات کی نظر میں عقد بیع ہے جس کی ضرورت شدیدہ کے وقت چند شرائط کے تحت اجازت ہے ان حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا غلام اللہ کاوی، مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا روح الامین صاحب، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری سعادت، مولانا محمد فاروق قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مولانا یوسف علی صاحب، مولانا محمد عمران ندوی، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی رجب قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد ارشاد صاحب دسدا، مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی، مولانا عبدالقادر صاحب اناری، مولانا سید قمر الدین محمود قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی امر وہوی، مفتی ریاست علی قاسمی رامپوری، مفتی محمد منصف بدایونی، مفتی محمد عقیان منصور پوری، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبدالخالق ندوی، مولوی زین العابدین، مولانا عمران اللہ قاسمی، مولانا اشرف عباس قاسمی، مولانا شاہین جمالی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مفتی شبیر احمد قاسمی، ڈاکٹر محروس المدرس، مفتی سعید الرحمن قاسمی، مولانا محمد عظمت اللہ ہدایت اللہ میر، مفتی محمد عارف باللہ القاسمی، مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد روح اللہ قاسمی، مفتی انور علی قاسمی، مفتی محمد خالد حسین نیوی، مفتی محمد شاہد قاسمی، مفتی محمد زاہد۔

۱۷/ مقالہ نگار حضرات کا کہنا ہے کہ خاص قید و بند کے ساتھ کیا جانے والا یہ معاملہ ”عقد رہن“ ہے ان حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مفتی سلمان پالن پوری قاسمی، مولانا عبداللطیف پالن پوری، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالن پوری، مولانا حفیظ الرحمن مدنی، مولانا محمد عادل خاں ندوی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر داہودی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا عبداللحی مفتاحی، مولوی محمد سالم اعظمی، مفتی محمد ارتقاء الحسن کاندھلوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی۔

(۴) مقالہ نگاروں کی نظر میں یہ معاملہ نہ بیع ہے نہ رہن، بلکہ یہ عقد فاسد ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا عبدالشکور قاسمی، مولانا کلیم اللہ عمری، مفتی شیر علی، مولانا محمد اعظمی۔

جبکہ (۴) حضرات نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ صرف اقوال کو نقل کر کے چھوڑ دیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مفتی شبیر احمد دیولوی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی محمد کامل قاسمی۔

اب ہمارے سامنے درحقیقت تین رائیں ہو جاتی ہے: ہر ایک رائے کے تعلق سے دلائل ہیں جو مختلف انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہم اولاً ان حضرات کے دلائل کو نقل کرتے ہیں جو اس عقد کو کسی نہ کسی شکل میں جائز قرار دیتے ہیں۔ مفتی شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورت اور تعامل ناس جواز کے قائلین کے موافق ہے اور تعامل ناس و عرف کو شرعی طور پر ”الثابت بالعرف کا ثابت بالنص“ کے عاقدہ سے حجت شرعیہ کا درجہ بھی حاصل ہے، لہذا ضرورت و حاجت ناس کی وجہ سے مشائخ سمرقند، مشائخ بلخ، مشائخ بخارا، امام نجم الدین نسفی اور صاحب نہایہ وغیرہم کے فتویٰ کے مطابق اس زمانے میں بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا، حضرت مفتی صاحب نے ضرورت و عرف کا لحاظ کیا ہے۔

مفتی جمیل احمد ندیری صاحب اختلاف اقوال کو نقل کرنے کے بعد بیع الوفاء کی پوری صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوئی ضرورت مند جو اپنی ضرورت کے معاملہ میں اضطرار شدید کو پہنچ چکا ہو اس کو غیر سودی قرض نہ ملتا ہو اور اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زمین جائیداد بیچنے پر مجبور ہو تو وہ بیع الوفاء کرے تو وہ حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں ”بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے۔“ جو اس کے جواز کے قائل ہیں اور مشتری پر وعدہ یا شرط جو بھی ہو پورا کرنا لازم ہوگا، اور وعدہ کے پورا کرنے کے لزوم پر ”در مختار“ کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے: ”ولزم الوفاء به، لأن المواعید قد تكون لازمة كحاجة الناس، وهو الصحيح۔“

آگے پھر انہوں نے اس معاملہ کو بیع مانتے ہوئے احکام کا ترتیب ذکر کیا ہے، نیز یہ بھی لکھتے ہیں کہ جواز کی بات ضرورت

کی وجہ سے ہے، اگر ضرورت شدیدہ نہ ہو تو پھر یہ معاملہ رہن ہوگا اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔ مفتی محمد سعید اسعد قاسمی کہتے ہیں کہ شریعت مطہرہ میں عرف و عادت وہ اصول ہیں جن پر بے شمار احکام شرعی کی بنیاد ہے، جیسا کہ ”بیع استصناع“ اور ایسا عرف جو لوگوں کے درمیان متعارف ہو اور لوگوں کی حاجت و ضرورت اس کی داعی ہو تو یہ استھان قرار پائے گا، جو نبی بر عرف ہوگا، اور حاجت و عرف کی بنا پر نص میں تخصیص جائز ہے، استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: الضرورات تتبع المظہورات، اسی طرح ”الامر اذا ضاق اتسع“ فقہ کے مشہور قواعد ہیں۔ مفتی ریاست علی صاحب اور مفتی شاہد صاحب اختلاف اقوال کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ استھاناً بیع ہی ہے کہ متعاقبین کے لئے اس چیز سے انتفاع جائز ہو جائے۔

مولانا روح الامین صاحب اصولی گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ: بیع و فاء سے مقصود یہ ہے کہ راہن کو اعتماد میں لیا جائے اور وہ شی متبوض سے انتفاع بھی کر سکے، البتہ تعبیر اور لفظ کے پیش نظر یہ معاملہ بیع ہے اور یہی قول راجح ہے اور ترجیح کی چند وجوہ ہیں:

(۱) بدون تلفظ محض نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کسی نے ایک عورت سے اس نیت کے ساتھ عقد کیا کہ ایک سال پورا ہو جائے گا تو وہ اسے طلاق دے دے گا تو محض اس نیت سے وہ متعہ قرار نہیں پائے گا۔

(۲) بیع کا لفظ نہ لغتاً رہن پر دلالت کرتا ہے نہ عرفاً، اس لئے لفظ بیع سے رہن کا قصد معتبر نہیں، بخلاف کفالہ اور حوالہ کے یہ دونوں عرفاً ”ضم“ کے معنی میں مشترک ہیں، لہذا ایک سے دوسرے کا ارادہ کیا جاسکتا ہے۔

(۳) اگر معانی و مقاصد کا اعتبار ہے تو اس معاملہ میں جہاں عاقدین کا مقصود استیثاق ہے، وہیں ان کا مقصود یہ بھی ہے کہ مقبوض سے انتفاع کرے، لہذا انتفاع کی رضا مندی کے بعد رہن قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، پھر مولانا نے اس کو عقد بیع قرار دینے کے بعد اس کی چار صورتیں نقل کی ہیں:

(۱) بغیر کسی شرط کے بیع کی جائے، محض دل میں یہ نیت ہو کہ بائع جب ثمن واپس کرے گا تو مشتری بیع واپس کر دے گا، یہ صورت جائز ہے۔

(۲) بغیر شرط کے بیع کی پھر وعدے کے طور پر شرط پر اتفاق کیا، یہ صورت بھی جائز ہے۔

(۳) عقد سے پہلے شرط پر اتفاق کر لیں پھر عقد کے وقت شرط کا ذکر نہ کریں، اکثر کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔

(۴) عقد کے وقت ہی فسخ کی شرط لگا دیں تو یہ اصول کے اعتبار سے فاسد ہے، کیونکہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے، مگر شرط فاسد متعارف ہو تو وہ شرط جائز ہوتی ہے اور معاملہ درست ہوتا ہے، کیونکہ انوار رحمت کی عبارت میں: ”إلأن یکون متعارفاً، لأن العرف قاض علی القیاس“ استثناء موجود ہے، لہذا مذکورہ صورت اصولاً ناجائز ہے، لیکن اس کا تعامل مسلم ہے پھر اسے بھی جائز قرار دینا چاہیے، مولانا اپنی اس ساری بحث میں عرف اور تعامل کو بنیاد بنا کر جواز کی بات کہہ

رہے ہیں۔

مفتی عارف باللہ صاحب نے بھی ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز مانا ہے اور استدلال میں ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة“ کے اصول کو پیش کیا ہے۔

مولانا یوسف علی صاحب بھی یہی لکھتے ہیں کہ: ضرورت و حاجت کو مد نظر رکھ کر بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا جائے، اور چونکہ اس کے جواز میں قواعد کا خلاف ہے، اس کے حل کے لیے فقہ کی عبارت ”وما ضاق علی الناس امر اتسع حکمہ“ اور ”القواعد تنترک بالتعامل“ وغیرہ کی طرف نظر کر کے غور کر لیا جائے۔

مفتی انور علی اعظمی، مولانا عبدالخالق صاحب رامپوری اور مفتی خالد حسین قاسمی صاحب اس معاملہ کو ضرورت کی وجہ سے بیع کہتے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ مشتری اگر مالک اول کے ہاتھ فروخت کرے تو سابق ادا کردہ قیمت سے زائد بھی لے سکتا ہے، مفتی انور صاحب تو لکھتے ہیں کہ اخلاقی طور پر مشتری کو سابقہ قیمت کا مطالبہ کرنا چاہیے، لیکن چونکہ مشتری بیع کا مالک ہے، اس لئے اپنی چیز کو بیچنے وقت وہ اس قیمت سے زیادہ کا یا ٹھن مثل کے مطالبہ کا قضاء مجاز ہے، البتہ اس صورت میں وعدہ کے عدم ایفاء کا گنہگار ہوگا۔

مولانا وصی احمد صاحب قاسمی لکھتے ہیں کہ: موجودہ دور میں جبکہ سودی نظام معیشت مکمل شباب پر ہے ایسی صورت میں امت کو سود جیسی لعنت سے بچانے کی یہی شکل ہے کہ عرف کا اعتبار کرتے ہوئے لوگوں کی حاجت اور ضرورت کے پیش نظر بیع الوفاء کو جائز قرار دیا جائے، مولانا نے عرف پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے مثالوں سے یہ سمجھایا ہے کہ حضرات فقہاء نے عرف کی دونوں قسموں: عرف عام اور عرف خاص کا اعتبار کیا ہے، عرف عام کی مثال ”بیع استصناع“ سے دی ہے، اور عرف خاص کی مثال ”مکان کی فروختگی میں مکان کی سیڑھیاں بیع میں داخل ہیں۔“ سے پیش کی ہے۔

مولانا یار علی صاحب یہ لکھتے ہیں کہ ضرورت و تعامل کی وجہ استثنائاً سے جائز تو قرار دینا چاہیے، اب اس میں مزید توسیع اختیار کرنا کہ صلب عقد کے اندر بھی شرط کو نافذ اور صحیح قرار دیا جائے خلاف اجماع ہے اور ضرورت سے زائد ہے اور ضابطہ ہے کہ ”ما بیع للضرورة بقدر بقدرہا“ اس لئے اگر روپے کی واپسی پر سامان کی واپسی کی شرط بطور معاہدہ عقد سے پہلے ہو یا عقد کے بعد ہو اور صلب عقد میں اس کا ذکر نہ ہو تو عقد صحیح ہوگا اور روپے کی واپسی پر سامان کی واپسی لازم ہوگی۔ مولانا نے دوسرے جزئیہ زائد کا مطالبہ نہ ہونے کی دلیل یہ لکھی ہے کہ درحقیقت اس صورت میں عاقدین کا بدلیں سے تبادلہ ہوگا کوئی نیا عقد نہیں ہوگا، لیکن مولانا نے تیسرے جزئیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مشتری کے لیے اس بیع سے فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے۔

مولانا اشرف عباس صاحب لکھتے ہیں کہ بیع و فاء اپنی اصل کے اعتبار سے تو درست نہیں، کیونکہ اس میں شرط کے ساتھ

میں بیچ ہے، مگر جواز کا مدار عرف اور تعامل پر ہے، لہذا اگر عرفاً اس میں غبن فاحش ہو جائے کہ مدت لمبی گزر چکی ہو تو مشتری اسی تناسب سے زائد قیمت لے سکتا ہے اور اگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد واپسی ہو رہی ہے تو اصل قیمت ہی پرواپسی ہونی چاہئے اور اس حوالہ سے درج ذیل جزیئہ سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے: ولوقال البائع: بعتك ببيعاً باتنا فالقول له إلا أن يدل على الوفاء بنقصان الثمن كثيراً إلا أن يدعى صاحبه تغيير السعر (در المختار ۷/۵۰۰)۔

مولانا عمران اللہ صاحب قاسمی نے بھی لوگوں کی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے اس کو جائز کہا ہے، البتہ بطور مشورہ کے یہ بات تحریر کی ہے کہ ”بیع کو ثمن اول کی ادائیگی پرواپسی کی شرط“ دوران عقد نہ لگائی جائے، بلکہ بعد میں یا پہلے بطور وعدے کے متعین کر لیا جائے۔

مولانا عمران اللہ صاحب ندوی اس معاملہ کو مشکل بیع تو مانتے ہیں، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ مشتری اگر مالک اول کو بیچے تو سابق ادا کردہ قیمت لازم نہ ہوگی، بلکہ اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ بیع کے اندر دونوں فریق کے مفاد کا لحاظ ضروری ہے ”بیع وفاء“ تو ضرورت مند آدمی کو غیر سودی قرض فراہم کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے، اس کے اندر مشتری کا فائدہ نہیں کے برابر ہے، اور اگر سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم کر دی جائے تو اس افراط زر کے زمانے میں ایک سال کے اندر زمینوں کی قیمت دوگنی ہو جا رہی ہے۔ لہذا سابق ادا کردہ قیمت لازم کرنے میں مشتری کا نقصان ہی نقصان ہے، اس لئے کہ بائع کوئی زمین بیع وفاء کے طور پر ایک لاکھ میں فروخت کرتا ہے اور مشتری سے وہ پیسے وصول کر کے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، پانچ سال کے بعد اس زمین کی قیمت پانچ لاکھ ہو جاتی ہے تو بائع تو ایک لاکھ دے کر پانچ لاکھ کی زمین واپس لے لے گا اور بے چارہ مشتری ایک لاکھ لے کر کف افسوس ملتا رہے گا کہ کاش میں نے ایک لاکھ روپے میں کوئی زمین رجسٹری کرائی ہوتی تو آج حلال طریقہ سے میرے پاس پانچ لاکھ روپے ہوتے۔

احقر کی رائے یہ ہے کہ بیع وفاء کے اندر زمین و مکان وغیرہ کی قیمت ثمن خلقی سونے سے طے کری جائے تو بہتر ہے اور سابقہ اور لاحقہ قیمت کا جھگڑا بھی پیدا نہیں ہوگا، مولانا کی یہ رائے اچھی معلوم ہوتی ہے، بیع سے فائدہ اٹھانے کی بابت مولانا نے لکھا ہے کہ اس کی حیثیت امانت کی ہے بائع کی اجازت سے استعمال کرنا درست ہے، اور اگر بغیر اجازت کے استعمال کرے تو ہلاکت کی صورت میں ضامن ہوگا، اس سلسلے میں مولانا نے ان فقہی عبارات سے استدلال کیا ہے جن میں عین رہن کو مرتہن کے ہاتھ میں امانت قرار دیا گیا ہے، نیز خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس سلسلے میں مولانا کا کہنا ہے کہ یہ بیع بائع اول کی اجازت پر موقوف ہوگی اور اس سلسلے میں استشہاد ”فتاویٰ عالمگیری“ کی عبارت سے کیا ہے: ”باع كرمه من آخر بيع الوفاء وتقابضاً ثم باعه المشتري ببيعاً باتناً ففيل البائع ان يخصم المشتري الثانی ويسترد منه الكرم۔“ (۲۰۸/۳)۔

مفتی محمد ارشاد صاحب نے بیع الوفاء کی دو صورتیں لکھی ہیں ایک صورت میں بیع کے احکام جاری ہوں گے اور ایک صورت میں رہن کے احکام جاری ہوں گے، جس صورت میں بیع کے احکام جاری ہوں گے وہ تو یہ ہیں کہ مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہو ابعد میں کسی اور مجلس میں واپسی کا تذکرہ ہو گیا اور مشتری نے اس کو منظور کر لیا تو شرعاً یہ بیع درست ہے، اور جب مشتری اس چیز کا مالک ہو چکا ہے تو بائع کی طرف سے واپسی پر اس کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، ہاں وہ وعدہ دے چکا ہے، اس لئے دیانتہ واپسی کرنی چاہئے، نیز وعدے کے مطابق زیادہ قیمت بھی نہیں لیننی چاہئے، اور چونکہ یہ عقد بیع ہے اس لئے مشتری کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے۔

اور دوسری صورت جس میں رہن کے احکام جاری ہوں گے یہ ہے کہ بیع ہونے کے وقت ہی بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا تذکرہ کر لیا گیا اور مشتری نے اس کو منظور کر لیا تو اس شرط کے تقاضہ عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہو جائے گی ہاں یہ شکل چونکہ بعینہ رہن کی ہے اور عقود میں معنی کا اعتبار ہوتا ہے لہذا حکماً یہ معاملہ رہن کا ہو جائے گا اس لئے رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے۔

مولانا محمد شکیل اسلام پوری نے قاضی خاں کی تفصیلی عبارت نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ عقد بیع ہی ہے، یہی مسلک صاحب نہایہ اور ابن نجیم کا بھی ہے، ہمارے اکابرین نے بوقت ضرورت اس کی اجازت دی ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے فتاویٰ خلیلیہ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے اور بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے، تاکہ فقہائے متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے، پھر مولانا نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس کو رہن کہتے ہیں، مولانا لکھتے ہیں کہ اس کو رہن کہنا بدون وجہ ناممکن ہے ایک تو اس لئے کہ عاقدین نے اپنے کلام میں رہن کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ کیا ہے تو صرف بیع کا اور قاعدہ مسلمہ ہے کہ ایک لفظ بولا جائے اور دوسرے معنی مراد لئے جائیں تو اس میں کسی نہ کسی علاقہ کا پایا جانا ضروری ہے اور لفظ بیع اور رہن میں کوئی بھی علاقہ نہیں، نہ عرفاً نہ لغتاً۔

دوسرے یہ کہ جب تک لفظ کا تکلم نہ کیا جائے نیت مخفی کا اعتبار نہیں چنانچہ آپ دل میں لا کھ طلاق کے ارادے کر لو، جب تک زبان سے نہیں نکالو گے طلاق واقع نہیں ہوگی، اسی طرح محشی ہدایہ نے زین الدین العراقی کے حوالہ سے نکاح مؤقت میں ایک جزئیہ اسی طرح کا ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص عقد نکاح میں توفیق کی شرط کا ذکر نہیں کرتا لیکن دل میں ارادہ ہے کہ اتنی مدت مثلاً ایک ماہ بعد طلاق دیدوں گا تو اس نکاح کی صحت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔

پھر مولانا نے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو اس عقد کو ناجائز قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ جو حضرات اس بیع کو ناجائز کہتے ہیں ان کے پیش نظر دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ ان حضرات نے اس کو ہزل پر محمول کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقیس اور

مقیس علیہ کے مابین کوئی مناسبت نہیں، اس لئے کہ ہازل تو بیع کا ارادہ ہی نہیں کرتا جبکہ بیع و فاء میں بائع کا ارادہ حقیقتاً بیع کا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ ”بیع بات“ کرنا نہیں چاہتا۔

دوسرے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ربا اور سود کو حلال کرنے کا ایک طریقہ ہے اس لئے ناجائز ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ایجاب و قبول لفظ بیع کے ساتھ پایا جائے تو بیع نام ہو جاتی ہے اور یقیناً یہ ربا سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، اور حیلہ علی الاطلاق ممنوع نہیں پھر حیلہ کے جواز پر مولانا نے متعدد امثلہ پیش کیے ہیں۔

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ بیع و فاء کی وہ صورت جس میں قرض کا وجود نہ ہو بلکہ معاملہ بیع کا اور جب ثمن واپس کر دے گا تو بیع اسے واپس لوٹا دی جائے گی۔ یہ عرف و حاجت کی بنیاد پر استحساناً درست ہے، پھر مفتی صاحب نے ”فتاویٰ بزازیہ“، ”البحر الرائق“ وغیرہ کی عبارت سے استدلال کیا ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ اگر شرط کا ذکر نفس عقد میں ہے تو یہ بیع فاسد ہوگی۔

مفتی معز الدین قاسمی صاحب نے اختلاف آراء کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس اختلاف کے بعد کسی ایک جہت کو متعین کرنا دشوار ہے، البتہ جو چیز قدر مشترک سب کے یہاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ رہن کا پہلو ہر ایک کے یہاں غالب ہے، اس لئے کہ وفاء فروخت شدہ چیز کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں فقہاء کرام رہن کو غالب رکھ کر بائع پر بھی وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ ”وفی بیع الوفاء یجب زکوٰۃ الثمن علی البائع“ (فتح القدر ۳/۴۸۶)۔

اس لئے بیع الوفاء کو رہن ہی کے درجہ میں رکھنا چاہیے اور چونکہ فقہائے کرام نے ضرورت کی بنیاد پر اس کو جائز بھی کہا ہے اس لئے اس سے انتفاع بھی جائز ہوگا۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب کے نزدیک بعض جہتوں (انتفاع وغیرہ) کے اعتبار سے بیع کے درجہ میں ہے، اور واپسی کا تذکرہ وعدے کے طور پر ہو معاملہ اس پر موقوف نہ ہو تو درست ہے اور ایفاء وعدہ لازم ہے، ڈاکٹر صاحب نے ”تبيين الحقائق“، ”ہدایہ“، ”عنایہ“، فتح القدر اور مباحث فقہیہ کی عبارات کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں ضرورت و عرف کی وجہ سے بیع و فاء کے جواز کی بات مذکور ہے، ان عبارات کے بعد لکھا ہے کہ ان دلائل کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ بعض احکام کے اعتبار سے اس کو بیع قرار دیا جانا انسب ہے۔

مفتی محمد اشرف قاسمی گونڈوی صاحب نے بھی ضرورت شدیدہ کے وقت جواز کی بات لکھی ہے اور یہ کہا ہے کہ عقد بیع میں واپسی مشروط نہ ہو، بلکہ آگے پیچھے یہ وعدہ کر لیا جائے تو بیع منعقد ہو جائے گی اور وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اور استدلال میں حضرت تھانویؒ کے فتاویٰ کو پیش کیا ہے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب ندوی نے ”بیع الوفاء“ کے سلسلے میں مختلف آراء اور دلائل کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

بربنائے تعامل اور ضرورت درست اور جائز ہے بشرطیکہ وقت اور مدت کی تعیین ہو اور سال بھر کے اندر اندر ہو، اور بہتر صورت یہ ہوگی کہ واپسی کی شرط عقد کے اندر نہ ہو بلکہ بعد میں کوئی معاہدہ کر لیا جائے۔

مفتی محمد عقیان صاحب منصور پوری تحریر کرتے ہیں کہ بیع و فاء جیسے معاملات کا بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت سہارا لینے کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے، پھر اس کی بہتر شکل یہ نکل سکتی ہے کہ مجلس عقد میں شرط یا وعدہ کے طور پر واپسی کا کوئی ذکر نہ ہو، بلکہ روزمرہ کے عام معاملات کی طرح اس کو بھی انجام دیا جائے، پھر کسی دوسری مجلس میں بائع مشتری سے اس رعایت کی درخواست کر لے اور مشتری منظور کر لے اب یہ معاملہ منعقد ہو جائے گا اور دیانتہ مشتری پر وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوگا اور چونکہ یہ معاملہ من کل الوجہ بیع نہیں ہے، اس لئے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی۔

تقریباً یہی تفصیل مفتی محمد منصف صاحب بدایونی نے بھی کی ہے، البتہ انہوں نے دو شرطوں کا اضافہ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ بیع ثمن مثل یا غبن بیس کے ساتھ کی جائے، چاہے ثمن کے بعض حصہ کو مؤجل رکھے، لیکن غبن فاحش کے ساتھ نہ کی جائے، خصوصاً اس بدعہدی کے دور میں تاکہ اگر مشتری وفائے عہد نہ کر سکے تو بائع کا بڑا نقصان نہ ہو۔

دوسرے یہ ہے کہ بد لین صحیح سالم اور محفوظ بھی ہوں۔ مفتی رحیب قاسمی صاحب نے ضرورت و حاجت کی وجہ سے اس معاملہ کو بیع مانا ہے اور ضرورت کے وقت اس پر عمل جائز رکھا ہے اور یہ لکھا ہے کہ بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیجا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیجا جائے اس شرط کو پورا کرنا قضاء اور دیانتہ لازم ہوگا، اور اس لزوم کی دو وجہیں لکھی ہیں: (۱) لوگوں کی ضرورت و حاجت (۲) یہ ہے کہ وعدہ کو پورا کرنا اگرچہ قضاء لازم نہیں، لیکن تعلق کی صورت میں لازم ہو جاتا ہے۔ قال فی البزازیة: ”إذا كفل معلقاً بأن قال: إن لم يود فلان أو أن أدفعه اليك ونحوه يكون كفالة بما علم أن المواعيد باكتساء صور التعليق تكون لازمة۔“ اور زیر بحث مسئلہ میں معنی تعلق کا وجود ہے، اس طرح کہ مشتری پہلے یا بعد میں کہتا ہے کہ اگر تم میرے پیسے واپس لاؤ گے تو میں تم کو اس کو بیچ دوں گا، لہذا یہ وعدہ پورا کرنا مشتری پر لازم ہے۔

مفتی مقصود صاحب فرقانی نے اس معاملہ کے جواز و عدم جواز کے دلائل کو نقل کرنے کے بعد یہ تحریر کیا ہے کہ اگر یہ معاملہ مقفضانے عقد کے خلاف شرط سے خالی ہو تو اس پر بیع کا اطلاق ہوگا، اور شرعاً وہ بیع منعقد ہوگی، اور بیع منعقد ہونے کے بعد بائع کی طرف سے بیع کے لئے مشتری سے یہ شرط کہ دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے یہ بیع سے متعلق حکم نہیں ہوگا، بلکہ یہ ایک وعدہ ہوگا جو مشتری کو قبول کرنے کے بعد اسے پورا کرنا لازم ہوگا، اور جب اس پر بیع کا اطلاق ہو رہا ہے تو مشتری کے لئے بائع کے ہاتھ فروخت کرنے نہ کرنے دونوں کا اختیار ہوگا۔

مفتی محمد زاہد صاحب سلیم پوری تفصیلی احکامات و اختلافات کو نقل کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع ہے، کیونکہ یہ معاملہ لفظ بیع کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے، اور عرف میں لفظ بیع کے اطلاق سے معنی بیع ہی مراد ہوتے ہیں، اور حاجت شدیدہ کے وقت محتاج شخص کے لئے بقدر حاجت جائز ہے، اور بیع کی واپسی کی شرط اگرچہ مقتضائے عقد کے خلاف ہے، لیکن برہنائے حاجت مشتری پر ثمن وصول کرنے کے لئے شرط رہن کے مانند ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ قول مفتی بہ کے مطابق مشتری کو اس کی وفاء پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ وفاء شرط نہ ہونے کی وجہ سے بائع کو اختیار فسخ حاصل ہوگا، لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ مشتری وفاء نے کسی دوسرے کے ہاتھ بیع وفاء پر عقد تام نہ کیا ہو۔

مولانا روح اللہ قاسمی پانچ اقوال مع ادلہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بیع وفاء کا مقصود رہن سے انتفاع حاصل کرنا ہے، اس لئے اگر اس کے معنی و مقصود پر نظر رکھی جائے تو قول اول (یہ بیع فاسد ہے) اور قول ثانی (یہ خالص رہن ہے) کو ترجیح حاصل ہوتی ہے اور اگر اس کے الفاظ پر نظر رکھی جائے تو پھر ان اقوال (قول ثالث، رابع، خامس) کو ترجیح حاصل ہوتی ہے جن میں فی نفسہ اسے جائز ہونے کی بات کہی گئی ہے، جیسا کہ متاخرین احناف کا مسلک ہے، ہم نے تین اقوال بیان کئے ہیں جن میں اس معاملہ کو جائز کہا گیا ہے، پہلا یہ کہ بعض احکام کے لئے مفید ہے دوسرا قاضی خان کا مختار قول ہے جس میں مسئلہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے، تیسرا قول جسے قول جامع کا نام دیا گیا ہے، ان اقوال میں قول جامع کی ترجیح سمجھ میں آتی ہے، پھر مولانا نے اس کی وجوہ ترجیح تفصیل سے بیان کی ہیں۔

(۱) علامہ سمرقندی نے مشائخ زمان کا اتفاق نقل کیا ہے زیلیعی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے، صاحب نہایہ کے ذریعہ ”علیہ

الفتویٰ“ کی صراحت ہے۔

(۲) اس قول کی نظیریں کتب فقہ میں موجود ہیں، جیسا کہ مضاربہ۔

(۳) صاحب بحر نے کہا ہے: ”وینبغی أن لا يعدل فی الافتاء عن القول الجامع“۔

(۴) قول جامع کو ہی ”مجلتہ الاحکام العدلیہ“ میں اختیار کیا گیا ہے۔

(۵) شیخ مصطفیٰ الزرقاء نے لوگوں کی حاجت و ضرورت کو بھی وجہ ترجیح بنایا ہے، ان وجوہ ترجیح کے بعد مولانا نے اس

شبہ کا جواب دیا ہے کہ یہ معاملہ درحقیقت ربا کو حاصل کرنے کا ایک حیلہ ہے۔

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی صاحب نے بیع الوفاء کی حقیقت اور اس سلسلہ میں حضرات فقہاء کرام کی آراء کو تفصیل سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ رائے اختیار کی جائے جس کی ترجمانی علامہ ابن نجیم کر رہے ہیں، یعنی یہ بیع ورہن سے مرکب ایک عقد ہے، بعض معاملات میں بیع ہے تاکہ اس سے انتفاع کا دروازہ کھلا رہے، اور بعض معاملات میں رہن ہے، تاکہ مشتری کو ایسا اختیار نہ ہو جو کہ بائع کے لئے مضر، نیز شریعت میں اس کی ایسی نظیر موجود ہے، جہاں

دو حکموں کو ایک کر دیا گیا ہے، حالت مرض میں ہبہ، وہ وصیت بھی ہے اور ہبہ بھی، اسی طرح ہبہ بالعوض معاملات میں بیع کا حکم رکھتا ہے، اور بعض معاملات میں ہبہ کا، اسی لئے شفعہ کا لزوم نہیں ہوتا، کیونکہ حقیقت میں یہ مبادلۃ المال بالمال نہیں ہے، جبکہ موہوب لہ سے رجوع کے باب میں ہبہ کی بجائے بیع کا درجہ دیا گیا ہے، ”ہندیہ“ میں ہے: ”ولو ذهب عقاراً من غیر شرط العوض، ثم إن الموهوب له عوضه من ذلك داراً فلا شفعة فی الدارین لافی دار الہبۃ ولا فی دار العوض“ اس لئے مرکب معاملہ ماننا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مفتی عبدالنواب صاحب اناوی نے فقہاء کرام کی تصریحات اور ان کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ شرعاً یہ بیع صحیح ہے اور ضرورت کے وقت ایسی صورتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور دلیل یہ دی ہے کہ ”مبادلۃ المال بالمال“ جو بیع کی اولین شرط ہے وہ یہاں پر بھی موجود ہے، اور متعاقبین شرعاً لائق عقد ہیں، کوئی چیز ایسی نہیں جو انعقاد عقد کے خلاف ہو تو پھر بیع کے منعقد اور درست نہ ہونے کے کیا معنی، اور یہ اسی صورت کا بیان ہے جب شرط و فاء صلب عقد میں نہ ہو۔ خواہ قبل العقد ہو یا بعد العقد۔ آگے لکھتے ہیں کہ چونکہ اس بیع کو بر بنائے عرف استحساناً اور ”ضرورة فوار عن الربا“ جائز قرار دیا گیا ہے اور اس میں باعتبار احکام دو چیزوں کو شامل کیا گیا ہے، یعنی حکم بیع اور حکم رہن سے مرکب کیا گیا ہے اور مشتری کے حق میں بیع اور بآلح کے حق میں رہن مقرر کیا گیا ہے جس کا تقاضہ یہ ہے کہ مشتری بیع سے منفعہ ہو اور بآلح کی شئی مرہون بوقت ادائے ثمن واپس ہو، اور یہ بجز اس صورت کے نہیں ہو سکتا کہ مشتری وقت معینہ پر بآلح کو اس کا سامان باعتبار معاہدہ یا باعتبار اقالہ یا باعتبار ثمن جدید مثل میں واپس کر دے۔

مولانا راشد حسین ندوی بھی اس بیع کو جائز اور مرکب مان رہے ہیں اور لکھتے ہیں کہ صلب عقد میں واپسی کی شرط لگانا تو مفسد عقد ہوگا، البتہ اصل عقد کے بعد وعدہ کے انداز میں شرط لگائی جاسکتی ہے، اور اس کا پورا کرنا ضروری ہوگا، اور اس کے جواز کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کو ایسی بیع قرار دیا جائے جس میں اقالہ کی شرط ہے، دوسری یہ کہ اسے اختیار شرط سے ملحق مانا جائے جس میں بیع واپس کرنے کی اجازت ہوتی ہے، فقہاء کی عبارات سے یہ جہت زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے، پھر اس کو اختیار شرط قرار دیں تو واپسی کے وقت قیمت میں اضافہ کی گنجائش نہیں، اور اگر اقالہ قرار دیں تو صاحبین کے نزدیک کسی نہ کسی صورت میں افاضہ ممکن ہے، لیکن امام صاحب کے نزدیک اضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں، اور فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے، نیز اگر قیمت بڑھا کر خریدنے کی پوری طرح اجازت دے دی جائے تو اس میں پوری طرح سود کی صورت پائی جاتی ہے، اور پھر جب اس کو اقالہ یا اختیار شرط کے ساتھ ملحق کر دیا تو اس سے نفع اندوز ہونا بھی درست ہو گیا۔

اور اس سلسلہ میں احقر کا نظریہ بھی یہی ہے کہ ”بیع الوفاء“ ایسی بیع ہے جو بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے خریدار کا فروخت شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا، اور بعض احکام کا فائدہ نہیں دیتی جیسے دوسرے کے ہاتھ بیچنا، اور ہماری اس رائے کی

وجوہات ترجیح یہ ہیں۔

- (۱) متعاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے اور لغتاً و عرفاً بیع سے بیع ہی مراد ہوتی ہے نہ کہ رہن۔
 (۲) لوگوں کو اس کی حاجت و ضرورت بھی ہے اور پھر تعامل و عرف بھی ہے۔
 (۳) ”مجلتہ الاحکام العدلیہ“ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔
 (۴) ہمارے اکابر علماء میں سے حضرت تھانوی اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ حضرات نے بھی ضرورت شدیدہ کے وقت متاخرین احناف کے قول کو اختیار کیا ہے۔

(۵) اگر اس معاملہ میں معانی و مقاصد کو ملحوظ رکھا جائے تو بھی بیع ہونا ہی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس معاملہ میں جہاں عاقدین کا مقصود استیثاق ہے وہیں یہ بھی کہ شی متبوض سے انتفاع کرے، اور جب فریقین انتفاع پر رضامند ہیں تو پھر اس کو رہن قرار دینا کسی بھی طرح صحیح نہیں۔

(۶) ضرورت کی وجہ سے قصداً جائز واسطہ کو استعمال کرتے ہوئے کسی حکم کو بدلنا حیلہ شرعی ہے اور جائز ہے اور مسئلہ بیع الوفاء میں بھی ایسا ہی ہے، کیونکہ بیع کی حقیقت رہن تھی اس رہن کو بیع سے تبدیل کر دیا گیا اور بیع ایک جائز واسطہ ہے اور جائز واسطہ کے ذریعہ ایک حکم کو بدلا جا رہا ہے، جو کہ جائز ہے، رہا مسئلہ یہ کہ بیع و فاء میں واپسی کی ایک شرط لگی ہوئی ہے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفسد بیع ہے، لہذا اس شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہوگئی۔ مگر ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ بیع و فاء کی وہی شکل تو جائز ہے جس میں شرط صلب عقد میں نہ ہو، بلکہ عقد کے تام ہونے کے بعد ثمن کی واپسی پر بیع کو واپس لینے کا معاملہ وعدے کے طور پر کیا جائے، اور اس وعدہ کی تکمیل دینا نیز قضاء ضروری قرار دی جائے، اور رہا یہ اشکال کہ عقد کے بعد لگائی جانے والی شرط بھی تو صلب عقد کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے۔ لہذا ایسا ہو گیا جیسا کہ صلب عقد میں شرط لگی ہو، مگر اس سلسلہ میں صاحبین کا قول راجح ہے جو یہ کہتے ہیں کہ عقد کے نام ہونے کے بعد جو شرط ملے ہوگی وہ اصل عقد کے ساتھ لاحق نہ ہوگی اور حنفیہ کے نزدیک یہی راجح بھی ہے، اب رہ جاتا ہے ان حضرات کا بیان جو اس معاملہ کو رہن قرار دیتے ہیں اور پھر تمام احکامات رہن کے جاری کرتے ہیں۔

مفتی محمد یاسر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ اصل قواعد کی رو سے بیع الوفاء قصداً رہن ہے، احکام رہن اور احکام بیع الوفاء کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اور اگر عقد میں فسخ کی شرط لگی ہو تو بیع فاسد ہے جو قواعد کی رو سے واجب الفسخ ہے۔ بیع الوفاء میں بظاہر دونوں لفظ بیع کا تلفظ کرتے ہیں، مگر ان دونوں کا مقصود بیع نہیں ہوتا چنانچہ مشتری بیع کا مالک نہیں ہوتا، جیسے بیع ہزل میں مشتری بیع کا مالک نہیں ہوتا، نیز بیع الوفاء میں بیع مکرہ کی بھی جھلک ہے، چنانچہ بیع مکرہ میں مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوتا یہی صورت حال بیع الوفاء میں بھی پائی جاتی ہے، لہذا بیع الوفاء یا تو فاسد ہے جس سے انتفاع

حرام ہے، یا بیع ہازل یا بیع مکرہ کی طرح باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیع الوفاء رہن ہے پس بلا ضرورت اس عقد کی کوئی گنجائش نہیں اور شی مرہون سے انتفاع جائز نہیں۔ اس کے بعد مولانا نے تمیز الحقائق موسوعۃ الفقہیہ وغیرہ سے وہ عبارتیں نقل کی ہیں جن سے اس بیع کا فساد اور رہن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مولانا عبدالحی مفتاحی صاحب بھی اس کو رہن قرار دے کر اس پر رہن کے احکامات جاری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔

مفتی جنید بن محمد صاحب و مفتی سلمان پالن پوری صاحب اس عقد کو مانتے تو رہن ہیں اور رہن ہی کے احکام جاری کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اگر سودی معاملات سے بچنے کے لئے یہ صورت اختیار کر لی جائے کہ مجلس عقد میں بیع کی واپسی کا کوئی ذکر نہ ہو، بلکہ بعد میں بطور وعدے کے نمونہ کی واپسی پر بیع کی واپسی منظور کر لیں تو اس کی گنجائش ہے۔

مفتی محمد حذیفہ صاحب نے اس موضوع پر تفصیلی مقالہ لکھا ہے اور عربی وارد و کتب فقہ و فتاویٰ سے بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں اور اخیر میں خلاصہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ بیع الوفاء اگرچہ ظاہر الفاظ اور عنوان کے اعتبار سے بیع اور شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہے۔ مگر مقصود اور معنی کے لحاظ سے رہن ہے، اس لئے بائع راہن، خریدار مرہون، بیع شی مرہون اور نمونہ مرہون بہ ہے، یہی اکثر فقہاء اور اصحاب افتاء کی تحقیق ہے، لہذا اس شی مرہون سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا مرہون کے لئے جائز نہیں نہ بائع یعنی راہن کی اجازت سے اور نہ بلا اجازت، اور اگر ساتھ میں کرایہ داری کا معاملہ کر لیا ہے تو اس شی سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، کرایہ چاہے مروج ہو یا مروج سے کم، مگر اس صورت میں بائع کے لئے لی ہوئی رقم کا استعمال کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہ رقم شی مرہون ہے۔

اور اگر اس رقم کو قرض سمجھ کر استعمال کیا جا رہا ہے تو پھر وجہ کرایہ ہونا ضروری ہے، ورنہ کرایہ کی کمی قرض سے استفادہ ہو کر سود اور ممنوع ہوگی۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ معاملہ باطل ہے اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، یہ بیع اس لئے نہیں کہ یہ حرام سود تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے جس میں عظیم فساد ہے نام و شکل بدلنے سے حلال نہیں ہوگا۔ اگر اس طریقہ کو ڈاکٹر مرلیض کے ساتھ اپنالیں کہ ضرر رساں چیزوں کا نام اور شکل بدل کر استعمال کرنے کے لئے دے تو مرلیض زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

مفتی عبدالقیوم ابراہیم پالن پوری صاحب لکھتے ہیں کہ: بیع و فاء صورت بیع بشرط اقالہ ہے پس اس عقد میں بیع اور شرط جمع ہو رہے ہیں اور حضور اقدس ﷺ نے بیع و شرط سے منع فرمایا ہے۔ ‘یہ نص عام ہے اور بیع میں شرط اقالہ کا عرف خاص ہے، اصل مذہب کے اعتبار سے عرف خاص سے نص عام کی تخصیص جائز نہیں ہے، پس یہ عقد خلاف مقتضی عقد شرط جس کو عرف عام حاصل نہیں کی وجہ سے فاسد ہوگا، اور معنی رہن ہے، اس لئے فاسد قرار دینے کے بجائے اکثر فقہائے کرام نے اس کو رہن

قراردیا ہے بندہ کے نزدیک راجح یہی ہے کہ اس کو رہن قرار دیا جائے۔
ہاں البتہ اگر اس عرف عام ہونا طے ہوتا تو یہ بیع صحیح قرار دی جاسکتی تھی، اور شرط بھی معتبر مانی جاتی۔
علامہ شامی لکھتے ہیں: ”إن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص إنما هو فيما إذا عارض النص

الشرعی فلا یتبرک به القیاس ولا یخص به الأثر بخلاف العرف العام“۔

مفتی عبدالرشید صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کے تعلق سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشتری جو سامان خرید رہا ہے یا بالفاظ دیگر قرض دے رہا ہے اس کا منشاء کیا ہے؟ قرض دینا ہے یا سامان خریدنا اگر وہ قرض دے رہا ہے تو نقصان اٹھانے کو تیار رہنا چاہئے، کیونکہ قرض دینے میں تو نقصان ہوتا ہے ہی، اور اسی لئے وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے، اور اگر سامان بحیثیت مشتری خرید رہا ہے تو پھر بیع کو تام ہونا چاہیے اور جملہ احکام بیع کے لاگو ہونے چاہئیں۔

اسی لئے اکثر فقہاء کرام اور ارباب افتاء نے بیع و فاء میں بیع کو رہن قرار دیا ہے تاکہ اس دور فساد میں فتنہ کا دروازہ نہ کھل جائے اور اس حیلہ سے لوگ سود کھانے والے نہ بن جائیں، کیونکہ عام رواج ہونے کے بعد بسا اوقات شرائط کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ ہاں بیع و فاء کی ایک شکل ایسی ضرور نکلتی ہے جو جائز ہے اور وہ یہ کہ شرط وفا عقد کے تام ہونے کے بعد ہو اور ایفاء عہد اخلاقی ہو، لیکن اس سے بائع کا مقصد تو صل نہ ہوگا، کیونکہ بائع کا مقصد اپنے سامان کی حفاظت تھی، لیکن بیع تام ہونے کے بعد مشتری اس میں من چاہا تصرف کر سکتا ہے بائع قانوناً اس کو پابند نہیں کر سکتا، ممکن ہے بہت سے لوگ مصنوعی مجبوری دکھا کر من چاہا تصرف کر لیں، اور ایفاء وعدہ نہ کر کے اپنا آلہ سیدھا کر لیں۔

رہا عرف کا مسئلہ تو آج کے دور فساد میں نہ جانے کن کن چیزوں کا عرف ہو گیا ہے اور نام بدل بدل کر لوگ سود کھانے کے عجیب عجیب طریقے اختراع کر رہے ہیں، مثلاً کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مکان اور گاڑی کے کرایہ کی طرح سونے اور چاندی کو کرایہ دیں تو کیا حرج ہے۔

مولانا نعیم اختر قاسمی صاحب کہتے ہیں کہ بیع و فاء میں متعاقدین ایسی شرط لگاتے ہیں جو اسے بیع کی حقیقت سے یکسر خارج کر دیتی ہے کیونکہ بیع کی روح یہ ہے کہ متعاقدین ایک دوسرے کی چیز کے اس طرح مالک بن جائیں کہ ایک کو دوسرے کی چیز سے کوئی سروکار نہ رہے اسی لئے بیع موقت درست نہیں۔

بدائع میں ہے: ”والمملک یقتضی اطلاق التصرف فی المملوک“۔

آگے مولانا نے شروط بیع کے صحیح ہونے کی چار صورتیں لکھی ہیں:

(۱) بیع خود اس شرط کی متقاضی ہو، مثلاً تسلیم بدلیں کی شرط۔

(۲) شرط مقتضائے عقد کے موافق ہو مثلاً ادھار بیع میں یہ شرط لگائے کہ ثمن کے بدلہ مشتری کوئی سامان رہن رکھے۔

(۳) شریعت میں اس کا ثبوت ہو، جیسے خیاری شرط۔

(۴) اس شرط کا تعامل ہو، جیسے تمہ لگانے کی شرط پر نعل خریدنا بیع و فاء میں جو شرط لگائی جاتی ہے وہ اس کے خلاف ہے، لہذا اس کو کم از کم بیع کا نام تو نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کو کالعدم قرار دینا چاہئے مگر فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ ”اعمال الکلام اولیٰ من اہمالہ“ اب اس کو لغو ہونے سے بچانے کے لئے دیکھا تو اس کی صورت رہن کی سی ہے، اور شریعت نے اس مقصد کے لئے رہن کو شروع کیا ہے، لہذا معانی کا اعتبار کرتے ہوئے اس پر رہن کے احکامات جاری ہونے چاہئیں۔

آگے لکھتے ہیں کہ اس معاملہ کو بیع کا نام دے کر دائن کا اپنے دین کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کا ایک حیلہ ہو اور ایسا حیلہ جس سے کسی حکم شرعی کا مقصد ہی فوت ہو جائے درست نہیں، پھر اگر کسی علاقہ کا عرف بھی ہو گیا تو نص سے متصادم ہونے کی وجہ سے عرف فاسد ہے جو معتبر نہیں۔

مولانا شاہد علی قاسمی تحریر کرتے ہیں کہ یہ معاملہ رہن ہی ہے، لیکن اگر خریدار مکان، دوکان، کھیت وغیرہ سے فائدہ اٹھانا ہی چاہے تو ضروری ہوگا کہ وہ اس کا عوض ادا کرے اس کے لئے وہ اجارہ کا عقد کر لے اور معروف اجرت کر کے فائدہ اٹھائے، ایسی صورت میں وہ قرض سے فائدہ اٹھانے والا نہ ہوگا، بلکہ یہ فائدہ بالعوض ہوگا جس میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ ایسی صورت اختیار کرنے میں مال مرہون رہن کے حکم میں باقی نہ رہے گا، بلکہ بیع کی حیثیت مال مستاجر کی ہوگی، اور عقد اجارہ کے احکام جاری ہوں گے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر مرہون مال مرہون کو اجارے پر لے لے تو عقد رہن باطل ہو جائے گا، کیونکہ ایک چیز میں دو جمع نہیں ہو سکتے۔

نوٹ: جو حضرات اس قاعدہ کو رہن مان رہے ہیں، ان میں سے بعض حضرات نے اس شکل کے جواز کی بات کہی ہے جبکہ بیع کی واپسی کی شرط عقد تام ہونے کے بعد لگی ہو۔

چار حضرات وہ ہیں جو اس عقد کو فاسد قرار دیتے ہیں۔

مولانا شبیر علی صاحب نے تو اس کو بیع مکروہ پر قیاس کیا ہے جس طرح بیع مکروہ فاسد ہے اسی طرح بیع و فاء بھی فاسد ہے، مولانا محمد اعظمی نے دلیل یہ دی ہے کہ اس پر بیع کے شرعی معنی کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ بیع کا شرعی معنی ہے: ”مبادلة الممال بالمال تملیکاً و تملکاً“ اور یہاں مشتری کا تملک و تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ نیز یہ شرط کہ بائع کے علاوہ دوسرے کو نہ بیچا جائے مقتضائے عقد کے خلاف ہے اس لئے بھی یہ معاملہ درست نہیں، اور جب بیع ہی درست نہیں تو اس سے انتفاع بھی جائز نہ ہوگا۔ مولانا عبدالشکور قاسمی لکھتے ہیں کہ اس شکل کو رہن بھی نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ شی مرہون سے نفع حاصل کرنا سود ہے اور سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔

مولانا کلیم اللہ عمری صاحب نے ”مجمع الفقہ الاسلامی جلد ۵“ کے فیصلہ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

بیع الوفاء (سوال نمبر ۳)

مولانا محمد منصف بدایونی ☆

دوکان و مکان وغیرہ کو کرایہ پر دینا اجارہ کہلاتا ہے، جس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اجیر رکھے تو وہ اس کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو (ابن ماجہ کتاب الاحکام)، نیز آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی کو اجیر رکھے تو وہ اس کی اجرت اسے بتلا دے (ہدایہ ۳/۲۹۳)، اس سے معلوم ہوا کہ اجارہ کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ معقود علیہ ”منفعت“ معلوم ہو اور اجرت و مدت اجارہ متعین ہو، لیکن آج کل ہر بڑے شہر میں اجارہ کے معاملہ میں رقم ضمانت یا ڈپازٹ کے نام پر مالکان کو کرایہ دار سے ایک موٹی رقم لیتے ہیں اور وہ اس رقم سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں، اس سلسلہ میں اکیڈمی کی جانب سے حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں مندرجہ ذیل سوال بھیجا گیا تھا:

سوال: آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک مکان یا دوکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے، لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لئے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے تو اب سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت ورہن کی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا۔

اکیڈمی کی جانب سے احقر کو اے مقالے موصول ہوئے۔ ان مقالات کے سوال (۳) کے جواب کو دیکھ کر مندرجہ ذیل آراء سامنے آتی ہیں:

(۱) زر ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی کو قرض سے فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا اور رو ہونے کی وجہ سے وہ کمی ناجائز ہوگی اور اجرت مثل واجب ہوگی۔ یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات مفتیان کرام کی ہے:

مولانا محمد الاعظمی منو، مولانا محمد حدیفہ بن محمود ٹیلر، مولانا محمد روح اللہ قاسمی، مفتی شیر علی گجراتی، مولانا ارتقاء الحسن

کاندھلوی، مولانا محمد یار علی نعمانی، مولانا محمد اشرف قاسمی، مولانا عبدالرزاق قاسمی، مولانا عبداللہ مفتاحی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد ارشاد دساوا، مولانا محمد احسن عبدالحق ندوی، مولانا عبدالقیوم ابراہیم پالنپوری، مولانا شبیر احمد دیولوی، مولانا سلمان پالنپوری، مولانا محمد فاروق، مولانا جنید بن محمد، مولانا لطیف الرحمن ولایت علی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مولانا محمد اشرف قاسمی۔

ان حضرات نے ”کل قرض جر نفعاً حرام“ اور ”کل قرض جر منفعة فهو ربا“ سے استدلال کیا ہے۔

مفتی انور علی اعظمی صاحب نے ”رجل استقرض دراهم واسكن المقرض في دار قالوا يجب اجر المثل على المقرض“ (شامی ص ۷۵) اور (مفتی عارف باللہ قاسمی، مفتی عمران اللہ قاسمی) ”التحوز عن حقيقة الربا وعن شبهته واجب“ (بدائع الصنائع ۷/۳۹۵) سے استدلال کیا ہے۔

مفتی محمد یار علی نعمانی نے ”نہی رسول اللہ ﷺ عن صفتين في صفقة واحدة“ (مسند امام احمد حدیث ص ۸۲-۳ صحیح ابن حبان ۱۰۵۳) کو مستدل بنایا ہے۔

مفتی رجب قاسمی لکھتے ہیں: اگر کرایہ پر لینے والا اجرة مثل دینے کو تیار نہ ہو تو وقف میں ضرورتاً جائز ہے۔ اور الا ان يكون ما قبضه المتولى صرفه في عمارة الوقف (ردالمحتار ۷/۴۰) سے استدلال کیا ہے۔
مفتی محمد زاہد لکھتے ہیں کہ اجرت مثل کے بغیر ناجائز ہے۔ اگر مقرض نے شرط لگائی ہے تو حقیقت ربوا اور اگر کمی کا عرف ہو تو المعروف کا مشروط کی وجہ سے شبہ ربوا ہونے کی وجہ سے البتہ اگر تبرعاً تخفیف کر دی ہو تو جائز ہے، التحوز عن حقيقة الربوا وعن شبهة الربوا الخ (بدائع الصنائع ۷/۳۹۵) سے استدلال کیا ہے۔

دوسری رائے: رقم ضمانت کرایہ دار سے دکان یا مکان خالی کرانے کے حق سے دستبرداری کا عوض ہے نہ قرض ہے اور نہ امانت ورہن۔

یہ رائے ہے مفتی محمد سعید اسعد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی کی اور مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی۔ ان دونوں مفتیان کرام کی رائے ہے کہ اگر اس رقم سے انتفاع کی اجازت نہ ہو تو امانت ہے ورنہ حق انتفاع کا بدل ہے اور اس کو کل قرض جر نفعاً کے تحت داخل نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا عبدالشکور، مولانا عبدالخالق صاحب کی بھی یہی رائے ہے اور انہوں نے ”فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال“ (درمختار، کراچی ۴/۵۱۹) سے استدلال کیا ہے۔

مولانا غلام اللہ کاوی لکھتے ہیں: اس رقم کی وجہ سے دکان کی مالیت میں بھی نقص آجاتا ہے، اس لئے کرایہ میں کمی

جائز ہوگی۔

تیسری رائے: زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں ہونے والی کمی ”کل قرض جو نفعا حرام“ کے تحت داخل نہیں ہوگی۔

مفتی جمیل احمد نذیری تحریر فرماتے ہیں کہ:

اس کی کو ”کل قرض جو نفعا حرام“ کے تحت لا کر قرض سے فائدہ اٹھانا نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ یہ تو ابن سلمہ کے قول: ”بل هذا بيع جر منفعة وهي القرض“ (شامی ۱۹۶/۳) کے انداز پر ہے۔ ”بل هذا اجارة جر منفعة وهي القرض“۔ دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ مقرض کو یہاں کوئی نقد یا عین حاصل نہیں ہو رہا ہے اور فقہاء نے جر نفعا کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: ”سواء كانت المنفعة نقدا أو عينا كثيرة أو قليلة“ (الفقه الاسلامی وادلتہ ۷۶۶/۳)۔

۲۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی لکھتے ہیں کہ اجرة قلیلہ کو ہی اجرت مثل قرار دیا جائے گا، فقہاء نے جہاں زر ضمانت کا تذکرہ فرمایا ہے، وہاں اجرة مثل کی وضاحت ان الفاظ سے کی ہے: فإذا كان بحيث لو رفعت عمارته لا تستاجر بأكثر ترك في يده بأجرا لمثل“ (شامی ۳۵/۹)، ”و الواقع في زماننا أنه يستأجر بدون أجر المثل بكثير ويدفع بعض الأجرة ويقطع بعضها من العمارة وقد يقال لجوازه وجه وذلك أنه لو أراد آخر أن يستأجره ويدفع للأول ما صرفه على العمارة لا يستأجره إلا بتلك الأجرة القليلة“ (رد المحتار ۳۳/۹)۔

لہذا اس اجرة قلیلہ کو ہی اجرة مثل قرار دیا جائے گا۔

مفتی حفیظ الرحمن مدنی کہتے ہیں:

اجارہ کے فاسد ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اس شرط زائد نے رواج کا درجہ حاصل نہ کر لیا ہو اور اس شرط نے رواج کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

”أما في زماننا فالعبد يأكل من مال المستاجر عادة كذا في الظهيرية“ (ہندیہ ۳۳۲/۳، الفقه الاسلامی وادلتہ ۳۸۲/۵)۔

چوتھی رائے یہ ہے کہ رقم ضمانت قرض ہے۔

اس شرط کے ساتھ کہ اجارہ اور قرض دونوں معاملوں کو الگ الگ صفحہ میں کیا جائے، یعنی کرایہ میں کمی کو قرض کے ساتھ شرط کے طور پر ذکر نہ کیا جائے تو جائز ہے اور اگر کرایہ میں کمی کو قرض کے ساتھ شرط کے طور پر ذکر کیا جائے تو ناجائز ہے۔

مفتی خورشید احمد اعظمی، مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی، مفتی محمد منصف بدایونی، مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی۔
”نہی رسول اللہ ﷺ عن صفقتين في صفقة“ (ہدایہ، مسند امام احمد حدیث: ۳۷۸۲، وفي رواية عن بيعتين في

بیعة (سنن ترمذی ۱/۲۳۳ و سنن ابوداؤد ۲/۳۹۵)۔

”کل قرض جر نفعاً حرام ای اذا كان مشروطاً كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة“

(رد المحتار ۷/۳۹۵)۔

”وفی الذخیرة: وان لم یکن النفع مشروطاً فی القرض فعلى قول الکرخی لا بأس به ثم

رأیت فی جواهر الفتاوی إذا كان مشروطاً صار قرضاً فیہ منفعة وهو ربا والا فلا بأس به“ (رد المحتار

۷/۳۹۵)۔

مولانا شاہین جمالی لکھتے ہیں کہ وقف کی جائیداد جب کرایہ کی کمی کے ساتھ رقم ضمانت لے کر دینا جائز ہے تو یہاں

بھی جائز ہوگا، استدلال میں پیش کی ہے:

”الثانية أن یكون لمسجد مثلاً حوانیت موقوفة علیه واحتاج المسجد لتکمیل أو عمارة

الخ“ (حاشیہ العدوی علی الخرشبی ۷/۷۹)۔

مولانا خورشید احمد اعظمی لکھتے ہیں: یہ کرایہ میں کمی ایسی ہی ہے، جیسا کہ نقد اور ادھار بیع میں شمن کی کمی زیادتی ہوتی

ہے، حالانکہ بالکل واضح ہے کہ ادھار بیع میں شمن کی زیادتی اجمل کے بدلے میں ہوتی ہے۔

پانچویں رائے: رقم ضمانت کو قرض قرار دیا جائے اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی اصلۃ قرض سے

فائدہ اٹھانا ہی ہے، لیکن ضرورت اور عرف عام اور عموم بلوی کی وجہ سے جائز ہونا چاہیے۔

مفتی عبدالنواب، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا مجتبیٰ قاسمی، مولانا نعیم اختر قاسمی، مولانا زاہد حسین ندوی، مفتی

عبدالرشید قاسمی نے ”الضرورات تیج المخطورات“ اور ”المشقة تجلب التیسر قواعد“ سے استدلال کیا ہے۔

مفتی شاہ علی قاسمی نے استصناع، بیع مسلم اور خیار شرط پر قیاس کیا ہے۔

رائے (۶): زر ضمانت اصلاً امانت ہے، لیکن کرایہ دار کی طرف سے استعمال کی اجازت ہونے کی وجہ سے قرضہ

شمار ہوگی اور کرایہ میں کمی جانے والی کمی بھی جائز ہوگی۔

مولانا عبید اللہ ندوی لکھتے ہیں:

جس طرح بائع کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا سامان کم قیمت پر بیچے یا زیادہ میں اسی طرح مالک کو اختیار ہوگا کہ وہ

کرایہ کم متعین کرے یا زیادہ۔

مفتی رحمت اللہ ندوی:

اصلاً امانت ہے، لیکن اس کا مدار عرف اور رواج پر ہونا چاہیے۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

رہن و امانت ہے۔ اگر کرایہ دار (مقرض) اپنی خوشی سے استعمال کی اجازت دے دے تو استعمال کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے۔ اس طرح یہ کل قرض جرنفعا کے تحت نہیں آئے گا اور اگر یہ رقم ضائع ہو جائے تو ضامن قرار دیا جائے گا۔ اس طرح یہ ”الغرم بالغنم“ قاعدہ کے تحت قرض پر فائدہ اٹھانا نہیں سمجھا جائے گا۔

مفتی محمد حذیفہ:

رہن ماننے کی صورت میں استعمال کی اجازت نہیں ہوگی اور کرایہ میں کمی جائز ہوگی اور قرض ماننے کی صورت میں استعمال کی اجازت ہوگی، لیکن کرایہ میں اجرت مثل سے کمی جائز نہیں ہوگی۔

مولانا محمد عمران ندوی:

رہن و امانت ہے، لیکن ضرورت ناس کی وجہ سے اجرت مثل سے کمی کی اجازت ہونی چاہیے۔
مفتی محمد خالد حسین نیوی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی سعید الرحمن قاسمی کی رائے ہے کہ امانت ہے، مالک کی اجازت سے تصرف جائز ہوگا، لیکن اجرت مثل سے کمی جائز نہیں ہے۔

مولانا یوسف علی لکھتے ہیں:

امانت ہے اور کرایہ کی کمی جائز ہوگی، کیونکہ یہ تراضی طرفین سے ہے۔
رائے نمبر ۷: زر ضمانت میں واپسی کی شرط نہ ہو اور اس کو موجر کی ملک سمجھا جائے تو یہ اجرت معجلہ ہے اور مثلاً ماہ بہ ماہ دی جانے والی اجرت، اجرت مؤجلہ ہے۔ رائے دہندگان: محمد منصف بدایونی، مولانا محمد یاسر قاسمی، مفتی عبدالرحیم قاسمی، مولانا عبدالخالق ندوی، مفتی محمد عفاں منصور پوری، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محبوب علی وجیہی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد اعظمی، میں سمجھتا ہوں کہ اس رائے میں کسی کا اختلاف نہیں ہوگا۔

”نعم جرت العادة أن صاحب الخلو حين يستأجر الدكان بالأجرة اليسيرة يدفع للناظر دراهم تسمى خدمة هي في الحقيقة تكملة أجرة المثل أو دونها، فهذه تحسب من الأجرة ايضاً“ (رد المحتار ۱۷/۳، فتاویٰ محمودیہ ۱۲۷/۵)۔

رائے نمبر ۸: یہ معاملات کی جدید شکل ہے۔

جس طرح بیع سلم میں بائع اور مشتری دونوں ایک دوسرے سے مستفید ہوتے ہیں اسی طرح یہاں موجر اور مستاجر بھی ایک دوسرے سے مستفید ہوتے ہیں اس لیے کرایہ کی کمی درست ہے۔

یہ رائے ہے: مولانا کلیم اللہ عمری۔

البتہ مولانا محمد سالم اعظمی نے اس زر ضمانت کے لینے کو بھی ناجائز لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: کیونکہ یا تو یہ زر ضمانت قرض ہے یا رشوت یا حقوق مجردہ کی بلا عوض بیع ہے اور ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے۔

تیسرے سوال کا جواب نہ لکھنے والے حضرات:

مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا محمد کمال قاسمی، مولانا زین العابدین، مفتی ریاست علی رامپور، مولانا سید قمر الدین محمود، مفتی محمد عادل خان ندوی، مفتی معز الدین قاسمی، مفتی روح الامین، مولانا ولی اللہ مجید قاسمی، مولانا محمد شکیل اسلام پوری۔

مذکورہ مفتیان کرام کے مقالات میں تیسرے سوال کا جواب احقر کی نظر کی گرفت میں نہیں آسکا۔

احقر کی رائے میں رقم ضمانت قرض قرار دیا جائے، البتہ قرض کا معاملہ الگ کیا جائے اور دوسری مجلس میں کرایہ داری کا معاملہ کیا جائے یا اس کے برعکس پہلے اجارہ کا معاملہ کر لیا جائے پھر قرض کا معاملہ ہو۔ اس طرح کرایہ کی کمی جائز ہوگی اور اس کو قرض پر فائدہ اٹھانا نہیں کہا جائے گا۔

(۱) ”کل قرض جر نفعاً حرام أى إذا كان مشروطاً كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة وفي الذخيرة: وإن لم يكن النفع مشروطاً فى القرض، فعلى قول الكرخى لا بأس به..... ثم رأيت فى جواهر الفتاوى إذا كان مشروطاً صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا، وإلا فلا بأس به“ (رد المحتار باب المراجعة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعاً حرام)۔ علامہ شامی نے قلت کے تحت فرمایا: ”ویؤید ما ذکر وہ فیما لو اهدى المستقرض للمقرض ان كانت بشرط كره وإلا فلا“ (حوالہ مذکورہ)۔

(۲) اگر مستقرض (قرض دار) مقرض (قرض خواہ) سے کوئی معمولی چیز زیادہ ثمن کے بدلے خریدے تو کرختی اور امام محمدؒ کے نزدیک بلا کر ہت جائز ہے۔ ”فشاء الشئ اليسير بثمان غال لحاجة القرض يجوز ويكره اى يصح مع الكراهة، وهذا لو الشراء بعد القرض لما فى الذخيرة، وإن لم يكن النفع مشروطاً فى القرض ولكن اشترى المستقرض من المقرض بعد القرض متاعاً بثمان غال فعلى قول الكرخى لا بأس به..... ومحمد لا يرى بذلك بأساً“۔

اور خصاف کے نزدیک یہ صورت مکروہ ہے: وقال الخصاف ما احب له ذلك، اور اگر بیع پہلے ہو اور قرض کا معاملہ بعد میں ہو تو خصاف اور محمد بن سلمہ امام بلخ کے نزدیک بلا کر ہت جائز ہے۔

هذا اذا تقدم الاقراض على البيع فإن تقدم البيع..... ذكر الخصاف أنه جائز وهذا مذهب محمد بن سلمة امام بلخ۔

اور شمس الائمہ حلوانی خصاف کے اسی قول پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ”وكان شمس الائمة الحلوانى يفتى بقول الخصاف“۔

البتہ بہت سے مشائخ بلخ اس کو قرض پر فائدہ اٹھانا ہی قرار دیتے ہوئے اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

”وكثير من مشائخ بلخ كانوا يكرهونه ويقولون: إنه قرض جر منفعة إذ لولاه لم يتحمل

المستقرض غلاء الثمن، جبکہ دیگر مشائخ فرماتے ہیں کہ اگر معاملہ الگ الگ مجلس میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ”ومن المشائخ من قال يكره لو كانا في مجلس واحد والا فلا بأس به“ (رد المحتار ۷/۳۹۷)۔ ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امام کرخی اور امام محمد کے نزدیک دونوں معاملے اگر الگ الگ ہوں تو بلاکراہت جائز ہے اور اگر بیع یا اجارہ پہلے ہو اور قرض کا معاملہ بعد میں ہو تو خصاف، محمد بن سلمہ اور شمس اللامہ حلوانی بھی بلاکراہت جائز قرار دیتے ہیں۔

قرض کے ساتھ اجارہ کا جواز عرف عام کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ”المشقة والحر ج انما يعتبر في موضع لا نص فيه، وأما مع النص بخلافه فلا ولا اعتبار عنده بالبلوى في موضع النص كما في بول الآدمي فإن البلوى فيه اعم“ (الاشاہ والنظار ص ۱۳۸)۔

اب رہا قرض میں تاخیر کا مسئلہ: تو اس میں یہ عرض ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے۔ حنفیہ کی دلیل مہلت نہ دینے کے سلسلہ میں یہ ہے کہ قرض ایک تبرع ہے اور مہلت دینا یہ دوسرا تبرع ہے اور ایک تبرع سے دوسرا تبرع لازم نہیں ہوتا۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ کیا تعادل کی وجہ سے تاخیر کو لازم کیا جاسکتا ہے یا نہیں، احقر کی رائے میں یہاں عرف و تعادل مؤثر ہونا چاہئے اور اگر اس کو مؤثر نہ مانا جائے تو قرض میں تاخیر کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقرض نے مستقرض کو مہلت دینے کا ایک وعدہ تو کیا ہی ہے کہ میں فلاں وقت تک تم سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کروں گا اور وعدہ پورا کرنا بھی لازم ہو جایا کرتا ہے۔

”وقد يلزم الوعد لحاجة الناس“ (البحر الرائق ۱۲/۶) کیونکہ مہلت کو اگر لازم نہ قرار دیا جائے تو مستقرض کا مقصد اور ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اور کبھی اس کو بہت بڑا نقصان بھی اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ الغرض رقم ضمانت کے نام سے لی گئی رقم کو قرض ماننا ان وجوہات کی بناء پر راجح ہے:

(۱) قرض ماننے کی صورت میں مالک مکان اس رقم سے بلاخطر فائدہ اٹھا سکتا ہے، برخلاف رہن سے انتفاع کے کہ اجازت کے بعد بھی اس میں کلام ہے۔

(۲) رہن سے انتفاع کی اجازت سے وہ رقم رہن سے نکل کر قرض کے دائرہ میں ہی آجاتی ہے۔

(۳) قرض ماننے کی صورت میں کرایہ دار یا مالک مکان میں سے کسی کے انتقال کے بعد کوئی پیچیدگی لازم نہیں

آئے گی کہ اس کو ترکہ سے وصول کر لیا جائے گا برخلاف رہن کے کہ اس میں پیچیدگی پیش آسکتی ہے۔

دوسرا باب

تفصیلی مقالات

بیع و فاء اور رہن سے استفادہ کا شرعی حکم

ڈاکٹر شیخ محمد محروس المدرس الاعظمی الحنفی، عراق ☆

ائمہ حنفیہ کے نزدیک ثابت شدہ حکم:

مال مرہون سے انتفاع کا عدم جواز ایک ثابت شدہ امر ہے، کیونکہ:

☆ مرتہن کو اس کی اجازت نہیں ہوتی، بلکہ اسے مال مرہون کو اپنے پاس صرف روکے رکھنے کا حق ہوتا ہے (الاختیار لتعلیل المختار للموصلی الحنفی (متوفی: ۶۸۳) ۶۶/۲، مطبع بانی لکھی قاہرہ ۱۳۷۰ھ، مطابق ۱۹۵۱ھ، باہتمام محمد ابودقیقہ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للکاسانی متوفی: ۵۸۷ھ، ۲/۴۱۸، مطبع عاصمہ قاہرہ، تقدیم احمد مختار عثمان)۔

مال مرہون سے حاصل ہونے والی آمدنی سے بھی استفادہ نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اس زائد آمدنی کے مقابلہ میں کسی چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ربا (سود) کا شبہ ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ رہن سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حقدار رہن کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

مشائخ بلخ نے اس میں حیلہ سے کام لیا ہے اور مشائخ بخاری نے اسی وجہ سے اس کا نام ”بیع و فاء“ رکھا ہے۔

بیع و فاء کی دو صورتیں ہیں:

- ۱- مشتری بائع سے کہے کہ اس سامان کو میں اس دین کے عوض فروخت کر رہا ہوں جو تمہارا ہمارے ذمہ ہے۔
- ۲- یا یہ کہے کہ میں اس سامان کو تم سے اس شرط پر فروخت کر رہا ہوں کہ جب میں تم کو اس کی قیمت ادا کر دوں گا تو تم واپس مجھے ہی فروخت کر دینا (رد المختار علی الدر المختار ۵/۲۷۵، مطبع مصطفی الحنفی قاہرہ)۔

اس کے جائز قرار دینے کی وجہ:

یہ ہے کہ اہل بلخ میں عام طور سے دین اور اجارہ کا رواج تھا۔ جس کی صورت ابھی آگے رہی ہے۔ اور دین اور اجارہ کروم (انگور کے باغات میں) درست نہیں ہوتا ہے۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قرض لینے والا ایک مخصوص اور متعین مقدار قرض لیتا ہے اور قرض لینے والا قرض دہندہ

کو کوئی اپنی چیز کرایہ پر دیتا ہے اور اس کی حفاظت کے بدلہ ہر ماہ ایک متعین مقدار میں رقم بھی ادا کرتا ہے جو اس چیز کی قیمت سے زائد نہیں ہوتی (الاشاہ والنظار لابن نجیم متونی: ۱۲۰/۲۷۰، موسیٰ الحلی ۱۹۶۸)۔

اور اہل بخاری طویل مدت تک کے اجارہ کے عادی تھے اور یہ درختوں میں ممکن نہیں تھا (بزاز یہ ۴۰۸، الاشاہ والنظار ۱۰۳/، سابقہ دونوں مراجع، صاحب اشاہ نے ان دونوں مراجع سے استشہاد کیا ہے)، اور اپنی گفتگو میں قاعدہ: "العسر تجلب التیسیر" بھی پیش کیا ہے۔

سوال: یہاں یہ سوال ہے کہ اگر قرض دینے والا یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کے قرض سے اس کو نفع پہنچے تو اس کے لئے کون سا حیلہ اختیار کیا جائے کہ اس کا نفع حرام نہ ہو، تو اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ سے منقول ہے، جیسا کہ امام محمد نے (کتاب الصرف) میں نقل کیا ہے کہ "یکرہ کل قرض جبر نفعاً" (ہر وہ قرض جو نفع کو کھینچے وہ مکروہ ہے) (الفتاویٰ الہندیہ ۲۰۲/۳-۲۰۳، طبع بولاق ۱۳۱۰ھ مکتبہ المثنیٰ بغداد، بدائع الصنائع ۱۰/۹۸۳، رد المحتار علی الدر المختار ۵/۱۶۶، ۱۶۷)۔

اور کرنی (حنفی فقیہ اور اصولی عالم جن پر بغداد میں حنفیت کی سرداری ختم ہوئی) (متونی: ۳۴۰) کہتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب صلہ عقد میں نفع مشروط ہو، اگر مشروط نہ ہو تو نفع جائز ہے، اس طرح کہ وہ اس کی طرف سے جو اس نے لیا تھا اس سے اچھی چیز لوٹا رہا ہے، لہذا اگر کوئی شخص دوسرے کو اس طرح قرض دے کہ اس سے زیادہ قیمت کا سامان خریدے تو یہ مکروہ ہوگا، اگر اس کی قرض دیتے وقت شرط لگا دے، اگر زیادہ قیمت کا خریدنے کی شرط نہ لگائے اور وہ خرید لے تو کرنی کی رائے کے مطابق کوئی حرج نہیں ہے (سابقہ مراجع)۔

اور خصاص کہتے ہیں کہ میں دونوں صورتوں میں اسے مناسب نہیں سمجھتا، اور شمس الائمہ حلوانی کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے، اور کتاب الصرف میں امام محمد شیبانی سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ سلف نے تمام کے مکروہ ہونے کی صراحت کی ہے، اس کے باوجود امام موصوف کہتے ہیں کہ اگر قرض لینے والا قرض دہندہ کو ہدیہ کچھ پیش کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (مذکورہ حوالہ جات)۔

اور محمد بن سلمہ بلخی کی رائے یہ ہے کہ بیع کو قرض پر مقدم رکھا جائے گا، اور اسی کو خصاص اور حلوانی نے اختیار کیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قرض دینے والا کوئی چیز جس کی قیمت بیس درہم ہو چالیس درہم میں بیچ دے اور پھر اسی کو ساٹھ درہم قرض دے تو اس کے ذمہ سو درہم ہو جائے گا، اور محمد بن سلمہ کی رائے میں اس سامان کو اسی طرح فروخت کیا جاتا ہے، ان کی رائے میں جواز کے لئے ایک دوسرا حیلہ بھی ہے، جس کی رو سے بلا کراہت انہوں نے جائز قرار دیا ہے، اور متاخرین کے مقتدر حضرات نے ان کی متابعت کی ہے، وہ یہ ہے کہ قرض لینے والا قرض دہندہ کو کسی چیز جیسے چھری اور کنگھی کی حفاظت یا دین کے دستاویز کی حفاظت کے لئے اس کو اجیر مقرر کر لے (تو یہ بلا کراہت جائز ہے) (فتاویٰ ہندیہ

۲۰۲۳، ۲۰۲۳ اور دوسرے حضرات نے دین کے وثیقہ (دستاویز کی حفاظت کو اس کے اپنے لئے حفاظت قرار دیا ہے، اس لئے وہ اجیر مقرر ہونے کے باوجود اس پر اجرت کا مستحق نہیں ہوگا (فتاویٰ ہندیہ ۵۲۲/۲، الفتاویٰ الہزازیہ ۴۹/۲، ۵۰، طبع بلاق ۱۳۱۰ھ)۔

بعض حضرات اس اجارہ کے مطلقاً عدم جواز کی طرف گئے ہیں، اور بعض کراہت کے ساتھ جواز کی طرف اور کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ دو عقد و مجلس میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر ایک مجلس میں ہو تو مکروہ ہے (بزاز یہ، درمختار واللمختار سابقہ صفحات، ہندیہ ۲۰۲۳، ۲۰۲۳)۔

سوال: سوال یہ کہ قرض خواہ (دہندہ) اگر یہ چاہتا ہو کہ مقروض کے گھر میں بغیر اجرت کے رہے تو اس میں حیلہ کی کیا شکل ہوگی؟

ابوبکر اسکاف کی رائے یہ ہے کہ اگر معلوم اجرت اور کم مدت کے لئے مقروض کا گھر کرایہ پر لیتا ہے اور پھر قرض دہندہ مقروض سے کوئی چیز اسی اجرت کے بدلہ معمولی قیمت میں خریدتا ہے، یہاں تک کہ اجرت اس قیمت کا بدلہ اور عوض قرار پا جائے جو اس نے قرض لینے والے سے بیچا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (دونوں کے برابر سرابرونے کی ہونے کی وجہ سے) (فتاویٰ غانیہ ۳۰۹/۲)۔

یہاں ایک دوسری رائے یہ بھی ہے کہ اس طرح کے مسائل کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے (انہیں میں ابوالقاسم صفار بلخی ہیں وہ ایک مسئلہ: اگر قرض دہندہ مقروض کے ترازو کا باٹ روزانہ کرایہ پر لیتا ہے، تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر اس باٹ اور پتھر کی کوئی اجرت نہ ہو اور نہ لوگوں میں اس کو کرایہ پر لینے کا رواج ہو تو اجرت واجب نہیں ہوگی (دیکھئے ہماری کتاب: مشائخ بلخ من الحنفیہ وما انفردوا بہ من المسائل الفقہیہ ۷۹۸/۲ طبع وزارت اوقاف عراق ۱۹۷۹) میں ذکر کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر ان اقوال کی نسبت محمد بن مسلمہ بلخی اور ابوبکر اسکاف کی طرف درست ہے، اور جو ان کے اقوال ہونے کی بنیاد پر لیا جا رہا ہے، تو اس میں سود کی نیت ظاہر ہے، جس کے جواز کی طرف اس میں رہنمائی کی گئی ہے تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اجرت کے نام پر سود خوری ہے، اور اس کو اس شرعی وصف کے ساتھ منصف کرنا بھی نہ تو قطعاً مناسب ہے اور نہ ہی اس کی شریعت میں کوئی گنجائش ہے۔

البتہ میں نے اس کو شرعی ضابطوں یا حیلوں کے ذریعہ قبول کرنے کے سلسلہ میں، اپنے جامعہ ازہر کے پی ایم ڈی کے مقالہ میں چند شرائط و قیود لگائے ہیں جو اس طرح ہیں:

۱- اس کے ذریعہ حرام سے نکلا جاسکتا ہو اور حلال تک رسائی حاصل ہو سکتی ہو (درالحکام شرح مجلہ الاحکام علی

۲- یہ کہ اس حیلہ کی وجہ سے، الف: کسی شرعی حکم کا ابطال لازم نہ آتا ہو۔

ب- یا کسی حرام کو حلال قرار نہ دیا جا رہا ہو۔

ج- یا اس میں عمومی مقاصد شرعیہ سے انحراف لازم نہ آتا ہو۔

۳- کسی آدمی کے حق کا ابطال نہ ہوتا ہو۔

۴- کسی معتبر اصل شرعی، یا ایسے مقاصد جن کی حفاظت و رعایت شرعا مطلوب ہو ان کے ابطال کا سبب نہ

بنے (دیکھئے: ہماری کتاب: مشائخ بلخ ۲/۸۹، ۷۹۱، نیز سابقہ مراجع: ہندیہ ۶/۳۹۰، بدائع الصنائع ۶/۲۵۱، رد المحتار ۳/۸۴)۔

اور حضرات فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ اس بارے میں اس مفتی سے مسئلہ بھی دریافت نہ کیا جائے جن کے بارے میں

فتویٰ میں تساہل برتنا یا غلط اور فاسد مقاصد کے لئے حیلے اختیار کرنا مشہور و معروف ہو (فتاویٰ ہندیہ ۳/۳۹۰)۔

نیز اس کی صحت کے بارے میں معاصر علماء میں سے سابق شیخ الازہر مرحوم عبدالرحمن تاج نے بھی اختلاف کیا

ہے (دیکھئے: ہماری کتاب: مشائخ بلخ ۲/۸۰۰ اور سابقہ مراجع)۔

مذکورہ تفصیلات کے بعد اب ہم بیع و فاء کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں:

اس بیع کے جواز اور کیفیات کے سلسلہ میں شروع سے ہی متعدد اقوال چلے آ رہے ہیں، یہاں تک کہ اقوال تک کا

احاطہ کیا گیا ہے (دیکھئے: ہماری کتاب: مشائخ بلخ ۲/۸۰۰، اور سابقہ مراجع) تاہم ہم نے اس کو صرف دو نقطہ نظر میں محدود و محصور کرنے کی کوشش کی ہے:

اول: یہ کہ یہ جائز ہے اور عقید صحیح ہے، لہذا مشتری کو فی نفسہ بیع و فاء سے بھی انتفاع کی گنجائش اور اس سے جو منافع

ہوں گے اس سے بھی یہاں تک کہ خود بائع کو کرایہ پر دے کر بھی فائدہ اٹھانا جائز ہے، اور خریدار بیع و فاء سے حاصل ہونے والی آمدنی اور نمو کا مکمل مالک ہوگا۔

دلیل: اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے معاملہ کرتے وقت لفظ بیع کا استعمال کیا ہے اور معاملات میں بغیر لفظ کے

صرف نیت کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص ایک سال کے بعد طلاق دے دینے کی نیت سے کسی عورت سے نکاح

کرے تو اس کا نکاح منعقد ہوگا اور یہ متعہ قرار نہیں پائے گا (دیکھئے: رد المحتار و در المختار، بزازیہ دونوں کے سابقہ مقامات و صفحات)۔

اصحاب رائے اس معاملہ میں اس نتیجہ تک پہنچے ہیں، کہ ابوبکر اس کا ف کہتے ہیں کہ مشتری نے بائع سے بیع لوٹاتے

وقت کرایہ داری سے جو آمدنی حاصل ہوئی ہو اس کے واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا، تو وہ وعدہ نہ تو لازم ہوگا اور نہ ہی اس کی واپسی

ضروری ہوگی، اور اگر مشتری نے وعدہ پورا نہیں کیا تو اس پر کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوگا اور بائع مشتری سے ادنیٰ اجرت کا بھی

مستحق نہیں ہوگا۔

- اگر صلہ عقد میں شرط لگا دی جائے تو بیع فاسد ہوگی (دیکھئے: فتاویٰ ہندیہ ۵۲۸/۲)۔
- دوم: دوسرا قول یہ ہے کہ یہ معاملہ حقیقت میں رہن ہے، اور اس کے مندرجہ ذیل احکام ہیں:
- بیع پر مشتری کی ملکیت ثابت نہیں ہوگی۔
 - بغیر بائع کی اجازت کے کسی طرح کا بھی نفع نہیں اٹھا سکتا۔
 - اگر اس میں سے کچھ کھالے تو ضامن ہوگا۔
 - اگر کچھ تلف کر دے تو بھی ضامن ہوگا۔
 - بیع ہلاک ہو جائے تو دین ساقط ہو جائے گا۔
 - ہلاک شدہ بیع کی قیمت سے جو زائد ہوگا امانت کی طرح ضامن نہیں ہوگا۔
 - اور دین ادا کرتے وقت اس کو واپس کرے گا۔

دلیل: یہ ہے کہ اس میں عاقدین کے مقاصد کا اعتبار ہے، اور اس کو جائز قرار دینے میں سود خوری کا حیلہ ہے۔
میں کہتا ہوں:

یہ نقطہ نظر جسے ”مجلۃ الاحکام العدلیہ“ میں معاملات کے مغربی نظریہ (شہری قوانین) کے ڈھانچے سے اخذ کیا گیا ہے، اور کتاب کی جلد اول کی چھٹی فصل میں مذکور ہے، اور جس کے مادے کے نمبرات یہ ہیں: ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳۔

ان مذکورہ مادوں اور دفعات سے یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ یہ امانات کے احکام سے اخذ کیا گیا ہے، مثلاً رہن حیازی (صرف مالکانہ حیثیت کا رہن) ان مادوں کے اجمالی مفہوم اسی پر دلالت کرتے ہیں، اگرچہ اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے، نیز فقہ اسلامی میں دونوں رہنوں (رہن تائینی، رہن حیازی) کے درمیان فرق بھی نہیں کیا گیا ہے، اسی لئے اگر رہن کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے رہن حیازی ہی مراد لیا جاتا ہے، اسی لئے انہوں نے از اول تا آخر کہیں الگ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

۲- اور عراق کا شہری قانون جو ۱۹۵۱ء میں مرتب ہوا تھا اس کے مادہ (۴۱) میں اس کی صراحت ہے کہ بیع وفا ”رہن حیازی“ ہے، جس کی قانونی دفعہ (۱۳۳۳) ہے، ان میں رہن حیازی کے مندرجہ ذیل احکام بیان کئے گئے ہیں:

بیع و فاء کی حقیقت:

اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں دو بنیادی معاملے ہیں:

اول: سوال یہ ہے کہ اس کے احکام کی بنیاد عرف عام پر ہے، یا مطلق عرف پر ہے (ابشاہ لابن نجیم ۱۰۲)، یہاں پر

ہمارے لئے بنائی کی اجرت اور بازار میں آواز لگانے والے اور دلال کی اجرت (اجارہ کی بحث میں) کا مسئلہ قابل غور ہے کہ کیا یہ جائز ہے کہ اس کو طحان (پسائی) کی اجرت پر قیاس کیا جائے، جس کی ممانعت سنت میں وارد ہے: ”نہی رسول اللہ ﷺ عن قفیز الطحان“ (نصب الراية ۳۰/۳ طبع المجلس العلمي البند ۵، ۱۳۵ھ، ۱۹۳۸ء)۔

اس کی شکل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا گندم، پیسے والے کو پیسے کے لئے دے اور پسائی کی اجرت اسی آٹے سے ادا کرے، اس کی ممانعت آئی ہے۔

اور نساخ کا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص بنائی کے لئے کسی کو دھاگا دے، جس سے وہ کپڑا بنے اور اس میں ایک تہائی یا ایک چوتھائی اجرت میں لے لے، تو اس کی ممانعت کو قفیر طحان، ہی کی ممانعت پر قیاس کیا گیا ہے۔

لہذا ان معاملات کا حکم یہ ہوگا:

- عامل کام کرنے والا اجرت مثل کا حقدار ہوگا، جو اجرت مسمی سے زائد نہ ہو اور معاملہ درست ہو جائے گا۔

- جواز کے باوجود جانین کی طرف سے اسے فسخ قرار دیا جائے گا۔

- یہ معاملہ درست ہو جائے گا، فساد کے اسباب ختم ہو جانے کی وجہ سے اور فساد کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں؛ محل کا مجہول ہونا۔

عاقدين میں سے کسی ایک کے لئے نفع کی شرط لگانا۔

معاملہ کے اس جز کا درست ہونا جس طرح سے شروع ہوا ہے۔

بیع فاسد کا عمومی حکم یہی ہے۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ قفیر طحان کی شرط کے باوجود یہ معاملہ درست ہے، لہذا اس کے لئے اس پے ہوئے آٹے میں سے بھی اجرت دینا جائز ہوگا اور اس کے علاوہ سے بھی، اس لئے کہ اس کا ناپ معلوم ہے (المبسوط للسرخسی (متونی ۳۸۳/۵، ہدایۃ المہندی شرح ہدایۃ المبتدی للرعینانی (متونی ۵۹۳) ۲۸۹/۳، مطبع ہصفاتی لکھنؤ ۱۳۰۴، بتعلیق محمد عبدالحی الملکنوی الحنفی (متونی: ۱۳۰۴))۔

مشائخ بلخ، بخاری اور خوارزم اور ابوعلی نسفی کی رائے یہ ہے کہ غزل اور نسخ (بنائی) میں بھی عرف کی وجہ سے اسی میں

سے مزدوری دینا جائز ہے (در مختار رد المحتار ۲۸۰/۵، بزازیہ ۳۰۵/۲، فتاویٰ ہندیہ ۳۴۵/۴)۔

اور قاضی خاں کی عبارت ان کے فتاویٰ میں ہے: ”اس میں بطور خاص علماء بلخ کا قول ہے“، اور دوسرے لوگوں نے

بھی اس کو اختیار کیا ہے (النوازل للسرقتدی (متونی ۳۷۵) ۲۸۰/۵، رد المحتار ۲۸۰/۵)۔

اور جو کچھ نوازل ابواللیث سمرقندی میں ہے، اس سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ابونصر سے اس بارے میں

دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر لوگوں پر کسی طرح کی کوئی شرط نہ لگائی جائے تو یہ جائز معاملہ ہے، اور اگر شرط لگا دی جائے تو محمد بن مسلمہ کے قول کی رو سے یہ جائز نہیں ہے اور نصیر اور فقیہ ابواللیث کہتے ہیں کہ متقدمین علماء کی رائے کے مطابق کپڑا بنائی میں تہائی اور چوتھائی کی اجرت والی شرط جائز نہیں ہے، لیکن مشائخ بلخ اسی کو بہتر اور تعامل ناس کی وجہ سے جائز قرار دیتے ہیں، اور میں فقیہ ابواللیث کی اس رائے کو اختیار کرتا ہوں (النوازل للسرقتی ابواللیث باب الاجارات)۔

مجوزین کے دلائل:

قیاس کو عرف اور تعامل کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے اور ان کے شہروں کا عرف اور لوگوں کا تعامل یہی ہے، چنانچہ امام سرخسی کہتے ہیں:

۱- قیاس کو عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے۔

۲- پھر یہ کہ اس میں منفعت بھی ہے کہ اس کی وجہ سے بنائی والا جلدی بن دے گا، اور بالخصوص اس وقت جب اس کپڑے میں سے اس کا بھی حصہ ہو (مبسوط للسرخسی ۹۰/۱۵)۔

لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نص کی تخصیص عرف خاص کی وجہ سے جائز ہے۔

۲- عرف خاص کی وجہ سے قیاس ترک کر دیا جاتا ہے تو:

عرف خاص کو مندرجہ ذیل مقامات میں اختیار کرنا درست ہوگا:

الف- جس میں کوئی نص نہ ہو۔

ب- اور جہاں کوئی قیاس نہ ہو۔

بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اس کو اختیار کرنا اولیٰ ہوگا، لہذا بیع و فاء کو اختیار کرنا بعض ممالک اور بلاد کے تعارف کی وجہ سے درست ٹھہرا، اور اسی کو بڑی تعداد (علماء کی) نے اختیار کیا ہے۔

اور جو لوگ عرف خاص کو معتبر نہیں مانتے ان کے نزدیک اور یہ کہا گیا ہے کہ یہی مذہب ہے کہ کوئی عام حکم خاص

عرف سے ثابت نہیں ہو سکتا، تو وہ تو عام ہی سے ثابت ہوگا (الاشاہ والنظار ۱۰۲، ۱۰۳ اور اس کے بعد کے صفحات)۔

جبکہ علماء اور فقہاء کی بڑی تعداد ایسی ہے جس نے مشائخ بلخ کی رائے اختیار نہیں کی ہے، یہاں تک کہا گیا کہ فتویٰ

کتاب کے جواب کے مطابق ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس پر نص موجود ہے، ورنہ نص کا ابطال لازم آئے گا (کتاب سے مراد

مبسوط ہے، اور اس میں ظاہر روایت کو نقل کیا گیا ہے، ردالمحتار ۲۸۰/۵)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مشائخ بخاری جنہوں نے کتاب کے جواب کو اختیار کیا ہے وہ حضرات نساج کی اجرت کے

جواز کا فتویٰ نہیں دیتے تھے، لہذا قفیز طحان کے معنی کی طرح کہ برابر سہرا تو جائز ہے، زیادتی ممنوع (فتاویٰ ہندیہ ۲۷/۵)۔

جبکہ ما قبل میں جو ذکر کیا گیا ہے یہ اس کے خلاف ہے، لہذا جب کتاب کے جواب کو اختیار کرنا درست ہے، تو جواز کا قول بھی تو بطور خاص مشائخ بلخ کی رائے ہے اس سے تو مزید احتمال اور قوی ہو جاتا ہے، اور جواز کے قائلین کی دلیل کو صدر الشہید کے قول سے پہلے ہی رد کیا جا چکا ہے، ان کا قول ہے: ”میں مشائخ بلخ کے استحسان والے قول کو اختیار کرنے کی بجائے اپنے اصحاب متقدمین کے قول کو اختیار کرتا ہوں، اس لئے کہ کسی ایک شہر کا تعامل جواز کی دلیل نہیں بن سکتا، جب تک کہ وہ شروع دور سے نہ چلا آ رہا ہو، تب جا کر وہ تقریرات نبی کی طرح دلیل بنے گا اور اس سے حکم شرعی کو ثابت کیا جاسکے گا، اگر ایسا نہیں ہے تو پھر لوگوں کا تعامل حجت نہیں بنے گا، اگر تمام کے تمام لوگ، اور تمام شہروں کے لوگ کسی چیز کو برتتے ہوں تو وہ اجماع قرار پاتا ہے، اور اجماع حجت ہے، آپ اس پر غور نہیں کرتے کہ اگر شراب کی خرید و فروخت اور سود خوری کا لوگوں میں تعامل اور عرف ہو جائے تو بھی اس کی حلت کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا“ (رد المحتار سابق مقامات و صفحات)۔

فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ دلالت النص نہ تو عام ہوتی ہے اور نہ اس کے ذریعہ عرف میں سے کسی عرف کی تخصیص کی جاسکتی ہے، جیسا کہ مشائخ بلخ سوچتے ہیں، اور غلہ کو بعض غلہ لانے والے کے ڈھیر سے اٹھالینے کو اور کپڑا بنائی میں اس سے کپڑا لے لینے کو جائز کہتے ہیں عرف اور اہل بلاد کے تعامل کی وجہ سے، اور جو حضرات اس کو جائز نہیں کہتے وہ اس کو فقیر طحان پر قیاس کرتے ہیں اور قیاس عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ جواز قیاس کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ نص کی اس دلالت کی وجہ سے ہے جو اس کو شامل ہے تو پھر نص عرف کے لئے تخصیص ہوگی، آپ غور نہیں کرتے کہ استصناع کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے، اور اعراف و تعامل کی وجہ سے ان قواعد سے اس کی تخصیص کرتے ہیں جن سے استصناع ممنوع قرار پاتا ہے، جبکہ ہمارے مشائخ اس تخصیص کی اجازت نہیں دیتے، اس لئے کہ یہ کسی ایک شہر کے لوگوں کا تعامل ہے اور اس کی وجہ سے کسی اثر اور نص کو خاص نہیں کیا جاسکتا، برخلاف استصناع کے کہ اس کا تعامل تمام شہروں اور ممالک میں ہوتا ہے اور اس قسم کے عمومی اعراف و تعامل کی وجہ سے قیاس کو بھی ترک کر دیا جاتا ہے اور نص کی تخصیص بھی ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے قیاس کو نہیں چھوڑا ہے، بلکہ فقیر طحان کے بعض معنی کی دلالت کی وجہ سے عرف کے سبب تخصیص کی گئی ہے، جیسا کہ مشائخ بلخ نے کپڑے کی بنائی والے مسئلہ میں لوگوں کے تعامل کی وجہ سے کہا ہے، تو پھر نص کی دلالت میں اتنا عموم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے تخصیص کی جائے (رد المحتار ۶/۵۸ اور اس کے بعد کے صفحات) تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ عرف کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دینے کا مسئلہ تمام معتبر فقہی متون اور کتابوں میں مصرح ہے (الدر المختار ۴/۳۶۴)۔

لہذا مندرجہ ذیل دو معاملوں میں حکم محصور ہو جائے گا:

الف - وہ قیاس جس کو عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے۔

ب۔ وہ عرف جس کو قیاس کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اور یہ اس وقت ہوگا جب اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ قفیز طحان والی نص عام ہے، تاکہ عام نہ ہونے کی صورت میں عرف کے ذریعہ اس کو خاص کئے جانے کی تحقیق کی جائے، میرا قلبی رجحان اس طرف ہے کہ وہ عرف جس کی وجہ سے کسی عام حکم کو خاص کیا جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ:

۱۔ عرف عام ہو، ۲۔ عرف پہلے سے چلا آ رہا ہو، حادثہ نہ ہو

الایہ کہ اگر عرف حادثہ ہو تو وہ نص قطعی یا شریعت کے عمومی قواعد سے متصادم نہ ہو۔

اسی اختلاف پر یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کسی آواز لگانے والے کو کوئی سامان کسی نے دیا تاکہ وہ آواز لگا کر فروخت کرے، اور اس نے آواز لگائی اور خریدار آگئے، مگر صاحب سامان اسے فروخت کرنے سے مکر گیا تو آواز لگانے والا اجرت کا مستحق ہوگا یا نہیں؟ تو ابو نصر بلخی کہتے ہیں وہ اجرت مثل کا حقدار ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ عرف تو یہ ہے کہ آواز لگانے والے نے سامان فروخت نہیں کیا تو اجرت کا مستحق نہیں ہوتا، تو اس کا جواب یہ دیا کہ یہ کوئی بات نہیں ہے، اس لئے یہ اجارہ فاسد ہے، لہذا وہ اجرت مثل کا حقدار ہوگا، فقیہ ابو الیث کہتے ہیں یہ قیاس ہے، اور استحسان یہ ہے کہ کچھ بھی واجب نہ ہو، کیونکہ اجرت مثل تجار کے تعامل سے طے ہوتا ہے، اور تجار اس اجرت سے ناواقف ہیں (النازل للسر قندی باب الاجارات) اور محمد بن سلمہ بلخی سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں امید کرتا ہوں کہ کثرت تعامل کی وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے فاسد ہے، جبکہ اس باب کے بہت سے مسائل ناجائز ہیں، لیکن لوگوں کی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے، جیسے دخول حمام کے مسئلہ میں (حمام میں جب انسان جائے گا تو یہ نہیں معلوم کہ کتنا پانی صرف کرے گا، کتنی دیر اس میں رہے گا اور اس جہالت کی وجہ سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس کے تعارف اور تعامل کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا گیا ہے، اسی کے مشابہ اجرت دے کر میلے اور نمائش، نیز باغ میں داخل ہو کر اپنی مرضی سے طے کردہ وقت کے مطابق جتنا چاہے پھل توڑنا، سیل لگی ہوئی مارکیٹ میں سامانوں میں سے کسی کو بھی اٹھانا ہے، اور اسی طرح مخصوص رقم کے آفر میں مول وغیرہ میں جانا، سامان خریدنا اور کھانا پینا جو موجودہ زمانے میں رائج ہے، کو قیاس کیا جاسکتا ہے) (دیکھئے: رد المحتار لابن عابدین ۶/۶۳)۔

میں کہتا ہوں کہ: ۱۔ فقیہ ابو الیث کی رائے میں یہی مختار ہے (الغایۃ ۲/۳۲)۔

۲۔ ابو نصر بلخی کے جواب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں اس موقف کو اختیار نہیں کرتے جو اس سے پہلے بیان ہوا، یعنی عرف کی وجہ سے قیاس کی تخصیص، یہاں تک کہ اس قیاس کی تخصیص جو بعض قیاس کو قیاس سے خاص کیا جائے، بایں طور کہ بنے ہوئے کپڑے میں بعض کو اجرت قرار دے کر بنائی کو جائز قرار دینا، اس وقت یہاں میں یہ محسوس کرتا

ہوں کہ اس جگہ عرف کو اختیار نہیں کیا جائے گا، باوجود اس کے کہ عرف عام ہے، قدیم ہے اور ہم لوگ واقف ہیں کہ آواز لگانے والا اس وقت اجرت کا حقدار نہیں ہوتا جب تک معاملہ پورا نہ ہو جائے، اگرچہ قیاس کا تقاضا ہے کہ اسے اجرت مثل دیا جائے، اور عراق میں اس کا اس وقت رواج بھی ہے۔

نیز میرا حجان اس مسئلہ میں سمرقندی کی رائے کو قبول کرنے کا ہے، اس لئے کہ:

۱- وہ عرف جس کی بات ہم کر رہے ہیں، وہ عرف عام ہے۔

۲- یہ عرف متواتر اور قدیم ہے، اور ابواللیث اس کے قدیم ہی ہونے کو اپنی کتاب ”الانوار“ میں ثابت کیا ہے

اور آج تک اس کا معمول چلا آ رہا ہے۔

۳- یہ عرف اس باب میں وارد کسی نص قطعی سے متصادم نہیں ہے۔ اور اسی سے قریب یہ مسئلہ بھی ہے کہ جب منادی

لگانے اور دلالت کو بیع حوالہ کر دی گئی اور اس نے اپنی محنت بھی اس کے لئے صرف کی، لیکن وہ کام کو مکمل نہ کر سکا، پھر صاحب

سامان نے دوسرا پرو کر اور آواز لگانے والا دلالت کر لیا تو کیا پہلے والے کے لئے اجرت ہوگی؟

اس کے جواب میں ابوالقاسم صفار لہجی کہتے ہیں کہ پہلے والے کو اپنی محنت اور عمل کے بقدر اجرت ملے گی (غائبہ سابقہ

ذکر کردہ صفحات، بزازیہ ۲/۴۸، ہندیہ ۳/۴۵۱)۔

فقہ ابواللیث اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو کچھ ابوالقاسم نے کہا ہے وہ قیاس ہے اور استحسان یہ ہے کہ

جب دلالت اول نے چھوڑ دیا، اور دوسرے نے اس کو فروخت کر دیا تو اس کو اجرت نہیں ملے گی، اس لئے کہ دلالت اس صورت

میں عرف یہی ہے کہ بغیر فروخت کے اجرت نہیں لیتا (سابقہ حوالہ جات)۔

دوسرا معاملہ یہ ہے کہ عقد میں لفظ کا اعتبار ہے یا عاقدین کی نیت کا؟ تو مذہب میں معتبر قول یہی ہے کہ ”عقد میں

مقاصد اور معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا“ (مجلد الاحکام العدلیہ مادہ: ۳، اشاہ والنظار ۷/۲۰۸، ۲۰۸ اور سابقہ دونوں

مراجع)۔

جن لوگوں نے اس پہلو کو غالب اور راجح قرار دیا ہے انہوں نے اس بیع و فاء کو رہن تصور کیا ہے، اور یہ بات میں

نے ”مجلد الاحکام العدلیہ“ سے لی ہے، اس میں ہے: ”بیع و فاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا“ (دیکھئے: سابقہ دونوں مراجع جو

پچھے حاشیہ میں گذرے) نیز ہم نے اس کو اہم اور معتبر فقہی کتابوں سے بھی لیا اور انہیں کتابوں کی عبارتوں کی اساس پر مسائل

وفروعات اور جزئیات بیان کئے گئے ہیں۔

یہاں پر وہ حضرات جو اس بیع کے جواز کے قائل ہیں اس طرف گئے ہیں کہ بغیر لفظ کے صرف نیت کا معاملات میں

اعتبار نہیں ہوتا، اور کوئی شخص بیع کے لفظ کے ساتھ بیع کرے گا تو وہ بیع ہی ہوگا (رد المحتار علی الدر المختار ۵/۲۷۶)۔

خلاصہ بحث:

اس پوری بحث کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ مندرجہ ذیل ہے؛
 اول: میں اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتا ہوں جس میں اس کو بیع تسلیم نہیں کیا گیا ہے، البتہ وہ لوگ جو اس کو بیع مانتے ہیں انہوں نے ”لا عبرة بمجرد النية بلا لفظ“ کو بنیاد بنایا ہے، اور طلاق کی نیت سے نکاح کرنے والے کے نکاح کو درست قرار پانے والے مسئلہ پر قیاس کیا ہے، جو مردود اور نادرست ہے، اس لئے کہ بیع وفا میں اس کی نیت عقد میں شرط لگانے کی وجہ سے ظاہر اور باہر ہے، جس کی وجہ سے یہ معاملہ اپنی حقیقت سے دوسری جانب منحرف ہو جاتا ہے، لہذا قضاء کے وقت اس کی نیت کا عدم قرار پائے گی، جب تک کے وہ عقد کے وقت طلاق کی نیت کی طرح بالکل واضح نہ ہو (درالحکام شریعہ الاحکام ۱۷۱)۔

ثانیاً: مذکورہ تفصیلات کو بنیاد بناتے ہوئے قاعدہ فقہیہ ”الامور بمقاصدها“ (الاشاہ ۳۷۵/۵) کی روشنی میں اس معاملہ کو حل کیا جاسکتا ہے، اور عاقدین کا ارادہ رہا تک پہنچنا ہے، جو حرام ہے اور واضح ہے، لیکن اس کے لئے عاقدین نے اس کا نام جائز اور معاملہ کارکھا ہے، رہن کا کبھی ان کا مقصد نہیں ہوتا، تا کہ وہ اس سے منفعت حاصل کر سکے، اگر اس کا نام رہن رکھ دیتے تو اس سے نفع نہیں اٹھا سکتے تھے، نہ ہی اس سامان سے اور نہ دین کے مقابلہ میں۔

لہذا اگر ان کی نیت زائد نفع کے حصول سے خالی ہوگی تو اس پر ہم اس قاعدہ کو منطبق کر سکتے ہیں ”العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للالفاظ والمباني“ اور ہم اس کی وہی صورت بیان کرتے جو ان کی نیت کے موافق ہوتی۔

ہم مذکورہ امور کی روشنی میں بھی اس عقد کے بطلان کی طرف گئے ہیں، نیز ان وجوہات کی وجہ سے بھی:

۱- رہن باخوری کو چھپانے کے لئے جائز معاملہ کا نام دینے والی بری نیت کو رد کرنا۔

۲- اس رہن کے معاملہ کو معتبر ہونے کے ممکن نہ ہونے کی وجہ سے، اس لئے کہ عاقدین نے اس سے معاہدہ کا

ارادہ نہیں کیا کہ اس معاملہ کو اقرب کا اعتبار کرتے ہوئے جائز تصرف کی طرف پھیرا جائے۔

۳- دونوں کی نیت کسی ایک معاملہ پر جامع نہ ہونے کی وجہ سے، کیونکہ ان دونوں کا مقصد قرض کا ایسا معاملہ کرنا ہے

جس سے قرض خواہ کو نفع پہنچے، قرض دہندہ نے قطعاً اس گھر کے مالک بننے کی نیت نہیں کی، جس طرح قرض لینے والے نے مکمل طور پر مالک بنانے کی نیت نہیں کی تھی، بلکہ دونوں کا ارادہ محض نفع وصول کرنے اور پہنچانے کا تھا۔

۴- جس نفع کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے وہ عقد کے مقتضیات میں سے نہیں ہے، نہ تو عقد اس کو ثابت کرتا ہے

اور نہ ہی اس پر کوئی نص ہے، اور نہ ہی اس کا ایسا عرف ہے جس میں کوئی اختلاف نہ ہو اور یہ میرا وہ موقف ہے جو ماقبل کی

صراحت کے مطابق ہے، کہ کسی چیز کی حلت اور حرمت کو نیت سے جوڑا جاتا ہے (الاشاہ، سابقہ ذکر کردہ صفحات)۔

نیز یہ بھی کہ اگر واقعی بائع اور مشتری نے اس معاملہ کو باطل کرنے کا ارادہ نہیں کیا، اور دونوں نے یہ کہا کہ ہم نے تو حرام سے دور رہنے کے لئے ایسا کیا ہے تو پھر اس معاملہ کو درست کہا جائے اس طرح کہ ایک عاقل بالغ کے کلام کو مہمل قرار دینے سے اس کو ذومعنی بنانا زیادہ بہتر ہے ”اعمال الکلاہ اولیٰ من اہمالہ“ (الاشاہہ ۱۳۵/۱، نیز مجلۃ الاحکام العدلیہ مادہ: ۶۰)، لہذا بجائے معاملہ کو باطل قرار دینے کے اسے رہن کی طرف پھیر دیا جائے اور رہن سے حاصل ہونے والی آمدنی سے قرض دینے والا کوئی فائدہ نہ اٹھائے، اور بیع ہلاک ہونے، اس سے آمدنی حاصل ہونے والے تمام امور میں رہن کے احکام کو ہی اس پر منطبق کیا جائے۔

جس طرح یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ اس کو یہ کہا جائے کہ بیع ہے اور اس کے ساتھ فاسد شرط کو ملادیا گیا ہے، لہذا عقد بیع درست اور شرط باطل اور لغو ہو کر بیع یقینی ہو جائے، امام زفر کے نکاح موقت والے قول پر قیاس کرتے ہوئے کہ ان کے نزدیک اس معاملہ میں شرط باطل ہے اور نکاح منعقد، اسی طرح یہ معاملہ بیع بالکل درست ہو جائے (الاختیار ۸۹/۳، بدائع الصنائع ۱۲۲۱/۳، بسوط ۱۵۳/۵)۔

اور یہ اس وجہ سے کہ:

اول: نکاح کی نیت عقد نکاح کے مکمل ہونے کی جہت کو متعین کرتی ہے، اور عقد مؤبد کے ساتھ منافی شرط لاحق ہوگئی ہے جو ایک عارض ہے، لہذا شرط اصل عقد کے لئے مفسد نہیں ہوگی، اسی لئے امام زفر نے اس شرط کو لغو قرار دیا ہے۔
دوم: جس طرح سے شوہر تاقیت کی شرط کے باطل ہونے کی صورت میں جس کی وجہ سے علاحدگی کا ضامن ہوتا ہے، اگر اس کی نیت کر لے تو اس کو حق طلاق اور خلع کا مالک بنا دیتی ہے، اور جس طرح عورت اس شرط کی وجہ سے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کی پوزیشن میں ہو جاتی ہے اگر نکاح میں اس کی شرط لگا دے اور شوہر اسے قبول کر لے۔
اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کی نیت اصل عقد کے منعقد ہونے پر متفق ہے، لہذا ہمارے لئے شرط کو لغو قرار دینا اور عقد کو درست تسلیم کرنا جائز ہو جائے۔

لہذا بیع و فاء میں ان دونوں کی نیت بنیادی طور پر شرط کو لازم کرنے سے واسطہ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی بھی قیمت پر دونوں معاملہ نہ کرتے، اس لئے معاملہ کو درست قرار دینا اور شرط کو باطل ماننا درست نہیں ہے، اس لئے کہ ان دونوں کی نیت اس کے علاوہ کسی مستحکم معاملہ پر متفق ہی نہیں ہے، لہذا ان دونوں کی نیت نہ ہونے اور امر ممنوع کے ارتکاب کی وجہ سے اس معاملہ کو ہی باطل قرار دینا لازم ہے، جس طرح سے اگر کوئی شخص کسی سے مردار، شراب اور خنزیر کی بیع کر لے تو حرام قرار دیا جاتا ہے، سوائے اس کے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس نے اپنی نیت میں مستحکم معاملہ کا ارادہ کیا تھا، تو جو کچھ ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے اور درست ہونے کی وہ شرائط جو مذکور ہوئیں پیش نظر ہوں۔

بیع بالوفاء کے شرعی احکام

مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی ☆

بیع بالوفاء کی تعریف:

کتب فقہ میں بیع بالوفاء کی دو صورتیں بتائی گئی ہیں:

الف- کسی کے ذمہ کسی کا دین ہو اور مدیون دائن سے کہے کہ میں تم سے اپنا یہ سامان اس شرط پر فروخت کر رہا ہوں کہ جب میں تمہارا دین ادا کر دوں تو تم میرا سامان مجھے واپس کر دینا یا میرا سامان میرا ہو جائے گا۔
ب- دوسری شکل یہ ہے کہ فروخت کرنے والا خریدار سے یہ کہے کہ یہ سامان تمہارے ہاتھ اس شرط پر فروخت کر رہا ہوں کہ جس وقت میں تم واپس کر دوں اس وقت تم میرا سامان مجھ سے فروخت کر دینا۔ درمختار میں ہے:
”صورتہ: أن یبیعه العین بألف علی أنه إذا رد علیه الثمن رد علیه العین“ (الدر المختار مع رد المحتار کتاب البیوع مطلب فی بیع الوفاء ۷/۵۴۵)۔

(یعنی بیع بالوفاء کی صورت یہ ہے کہ کسی سامان کو ایک ہزار کے بدلہ اس شرط پر فروخت کرے کہ جس وقت اس کو ثمن واپس کرے گا اس وقت وہ (خریدار) اس کا سامان واپس کر دے گا)۔
علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے:

”وفی الکفایة عن المحیط: هو أن یقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العین بما لک علی من الدین علی أنى متی قضیت فهو لی، وفی حاشیة الفصولین من جواهر الفتاوی: هو أن یقول: بعث منك علی أن تبیعه منى متی جئت بالثمن“ (الدر المختار مع رد المحتار کتاب البیوع مطلب فی بیع الوفاء ۷/۵۴۵)۔

(اور محیط کے حوالہ سے کفایہ میں ہے کہ ”بیع بالوفاء یہ ہے کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تم سے اپنا سامان تمہارے قرض کے بدلہ میں جو مجھ پر ہے اس شرط پر فروخت کیا کہ جب میں اس قرض کو ادا کر دوں تو وہ سامان میرا ہو جائے گا، اور حاشیہ الفصولین میں جواہر الفتاوی کے حوالہ سے ہے کہ فروخت کرنے والا یہ کہے کہ میں نے تم سے اس شرط پر بیچا کہ جب میں تمہارا دین ادا کر دوں تو تم مجھ سے اس کو فروخت کر دو)۔

☆ صدر مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیہ و جھارکھنڈ، پھلواری شریف پٹنہ۔

بیع بالوفاء کا شرعی حکم:

اس طرح کی بیع جس کو بیع بالوفاء کہتے ہیں شرعاً صحیح ہے یا نہیں اور خریدار کے لئے خریدی ہوئی شے میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہے یا نہیں اور ثمن یا قرض کی واپسی کے وقت خریدار پر سامان کی واپسی ضروری ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہاء کے مابین کافی اختلاف نظر آتا ہے، ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے یہاں تو بہت زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے، البتہ فقہاء حنفیہ کے یہاں بہت زیادہ تفصیل ہے، علامہ ابن نجیم نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”البحر الرائق“ میں ”بزازیہ“ کے حوالہ سے اس سلسلہ میں آٹھ اقوال نقل کئے ہیں اور ہر ایک کی تفصیل بیان کی ہے۔

فقہاء کے اقوال پر غور کرنے سے بنیادی طور پر تین قول سامنے آتے ہیں:

۱- بیع وفاء شرعاً جائز و درست ہے اور خریدار کے لئے خریدی ہوئی شے سے انتفاع حلال ہے، البتہ چونکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ثمن یا قرض کی ادائیگی کے وقت شے مبیعہ کو واپس کر دے گا، اس لئے اس کے لئے دوسرے سے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، اس کے قائل مشائخ سمرقند ہیں، ان میں سے امام نجم الدین نسفی بھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہمارے مشائخ اس کے جواز پر متفق ہیں، ”تبيين الحقائق“ میں ہے:

”ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعاً جائزاً مفيداً لبعض أحكامه وهو الانتفاع به دون البعض وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه“ (تبيين الحقائق كتاب الاكراه ۵/۸۳، ۸۴)۔

”البحر الرائق“ میں ہے:

”الثانى أنه بيع صحيح باتفاق مشائخ الزمان للعرف“ (البحر الرائق كتاب البيع باب خيار الشرط ۶/۱۲)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے اس پر مشائخ کا اتفاق ہے اور یہ عرف کی وجہ سے ہے۔ ”الموسوعة الفقهية“ میں ہے:

”وذهب بعض المتأخرين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء جائز مفيد لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالبيع دون بعضها وهو البيع من آخر“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔

حنفیہ اور شافعیہ میں سے بعض متأخرین کی رائے یہ ہے کہ بیع وفاء جائز ہے اور بیع کے بعض احکام کے لئے مفید بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشتری بیع سے انتفاع کر سکتا ہے، البتہ دوسرے سے فروخت نہیں کر سکتا ہے۔

علامہ ابن نجیم نے ”البحر الرائق“ میں لکھا ہے:

”وذكر الزيلعي أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (البحر الرائق باب خيار الشرط ۶/۱۲)۔

(اور زلیعی نے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ یہ بیع جائز ہے اور بعض احکام کے لئے مفید ہے، یعنی اس سے انتفاع حلال ہے، البتہ وہ دوسرے سے فروخت کرنے کا مالک نہیں ہے)۔

۲- بیع بالوفاء شرعاً صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ فاسد ہے، حقیقت میں یہ بیع نہیں ہے، بلکہ یہ رہن ہے اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، لہذا ایسی صورت میں خریدار خریدی ہوئی شے کا مالک نہیں ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھانا اس کے لئے حرام ہوگا اور قرض کی ادائیگی کے بعد اس پر اس شے کی واپسی لازم ہوگی۔ اس کے قائل حنفیہ میں سے ابوشجاع، علی السغدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی ہیں اور مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین شافعیہ بھی بیع الوفاء کے فاسد ہونے کے قائل ہیں۔

”تبيين الحقائق“ میں ہے:

”ومنهم من جعله رهناً منهم السيد الإمام أبو شجاع والإمام السغدی والإمام القاضي أبو الحسن الماتریدی قالوا: لما شرط عليه أخذه عند قضاء الدين أتى بمعنى الرهن؛ لأنه هو الذي يؤخذ عند قضاء الدين“ (تبيين الحقائق كتاب الاكراه ۵/۱۸۳)۔

اور ان میں سے کچھ فقہاء نے اس کو رہن قرار دیا ہے، ان میں سے سید امام ابوشجاع، امام علی السغدی اور امام قاضی ابوالحسن ماتریدی ہیں، یہ حضرات کہتے ہیں کہ جب اس نے دین کی ادائیگی کے وقت اس سامان کو واپس لینے کی شرط لگا دی تو یہ رہن کے حکم میں ہو گیا، اس لئے کہ شے مرہون ہی دین کی ادائیگی کے وقت واپس لی جاتی ہے۔

”الموسوعة الفقهية“ میں ہے:

”اختلف الفقهاء في الحكم الشرعي لبيع الوفاء... مذهب المالكية والحنابلة والمتقدمين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد“ (الموسوعة الفقهية بیع الوفاء ۹/۲۶۰)۔

(بیع وفاء کے حکم شرعی میں فقہاء کا اختلاف ہے،... مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین حنفیہ و شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ بیع وفاء فاسد ہے)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”رد المحتار“ میں ”جامع الفصولین“ کے حوالہ سے لکھا ہے:

”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيئاً للربا وسموه بيع الوفاء، وهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكة وهو ضامن لما أكل من ثمره وأتلف شجره ويسقط الدين بهلاكه لو بقي ولا يضمن الزيادة وللبنائع استرداده إذا قضى دينه لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام“ (رد المحتار كتاب البيوع مطلب في بیع الوفاء ۷/۵۴۶)۔

(وہ بیع جو سود سے بچنے کے لئے ہمارے زمانہ کے لوگوں میں متعارف ہے جس کو وہ لوگ بیع وفاء کہتے ہیں وہ

درحقیقت رہن ہے، خریدار اس کا مالک نہیں ہوگا اور مالک کی اجازت کے بغیر وہ انتقال نہیں کر سکتا ہے اور اگر اس کا پھل کھایا یا درخت کو نقصان پہنچایا تو وہ اس کا ضامن ہوگا اور اس شے کے ہلاک ہونے کی صورت میں اگر دین باقی ہو تو وہ ساقط ہو جائے گا اور خریدار اس زیادتی کا ضامن نہیں ہوگا اور بائع جب اپنا دین ادا کر دے تو وہ اس کو واپس لے سکتا ہے اور ہمارے نزدیک بیع و فاء اور رہن میں کسی بھی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۳- تیسرا قول جس کو قاضی خان نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ اگر لفظ بیع کا ذکر ہو تو وہ رہن نہیں ہوگا، بلکہ اس کو بیع قرار دیا جائے گا، البتہ اگر عقد بیع کے وقت بائع اور مشتری دونوں یا ان دونوں میں سے کسی ایک نے عقد فسخ کرنے کی شرط لگادی یا قرض کی ادائیگی کے وقت بیع کو واپس کرنے کی شرط کے ساتھ بیع کی یا بیع کے وقت اس طرح کی شرط نہیں لگائی، لیکن بائع اور مشتری دونوں اس بیع کو لازم نہیں سمجھتے تو ان صورتوں میں بیع فاسد ہوگی اور اگر بیع کے وقت اس طرح کی شرط نہیں لگائی، بلکہ بیع مکمل ہوئی، البتہ بعد میں ان دونوں نے قرض یا ثمن کی ادائیگی کے وقت بیع واپس کرنے یا اسی قیمت پر فروخت کرنے کا معاہدہ کیا تو ایسی صورت میں یہ بیع صحیح ہوگی اور خریدار کو اس میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہوگا، البتہ چونکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ثمن کی ادائیگی کے وقت بیع واپس کر دے گا اور وعدہ کو پورا کرنا شرعاً لازم ہے، اس لئے وہ وعدہ کے مطابق ثمن کی ادائیگی کے وقت بیع واپس کر دے گا۔

”البحر الرائق“ میں ہے:

”الثالث ما اختاره قاضی خان وقال: الصحيح إن وقع بلفظ البيع لا يكون رهناً ثم إن شرطاً فسخه في العقد أو تلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء أو تلفظاً بالبيع وعندهما هذا البيع غير لازم، فالبيع فاسد، وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطه على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا“ (البحر الرائق باب خيار الشرط ۱۲/۶)۔

جن لوگوں نے بیع و فاء کو صحیح قرار دیا ہے ان کے دلائل:

جن حضرات نے بیع و فاء کو جائز و درست قرار دیا ہے ان کے پیش نظر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ لوگوں کی ضرورت ہے، غیر سودی قرض ملتے نہیں، اس لئے سود سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کا عرف ہو چکا ہے اور عرف کی وجہ سے قواعد ترک کر دیئے جاتے ہیں، یعنی گرچہ یہ عقد قواعد شرع کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں مقتضاء عقد کے خلاف شرط لگائی جاتی ہے کہ یہ بیع لازم نہیں ہوگی، بلکہ جس وقت بائع دین یا ثمن ادا کرے گا اس وقت خریدار کو بیع واپس کرنی ہوگی اور مقتضاء عقد کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے عقد فاسد ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ اس بیع کا تعامل اور عرف ہے، اس لئے عرف پر عمل ہوگا اور قواعد ترک کر دیا جائے گا— جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے کہ وہاں بیع موجود نہیں ہوتی، بلکہ آرڈر دے

کر خرید و فروخت کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ اور جب بیع نہ ہو تو بیع صحیح نہیں ہوتی، لیکن چونکہ ضرورت بھی ہے اور عرف و تعامل بھی ہے، اس لئے قواعد کے خلاف ہونے کے باوجود یہ بیع جائز و درست ہوتی ہے۔

”و حجتہم فی ذلک: أن البیع بهذا الشرط تعارفہ الناس و تعاملوا بہ لحاجتہم إلیہ، فراراً من الربا، فیکون صحیحاً لا یفسد البیع باشرطہ فیہ، وإن کان مخالفاً للقواعد، لأن القواعد تترک بالتعامل کما فی الاستصناع“ (الموسوعة الفقہیة بیع الوفاء ۲۶۰/۹)۔

(اور بیع و فاء کے جواز کے سلسلہ میں ان فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ لوگ سود سے بچنے کے لئے اپنی ضرورت کے پیش نظر اس شرط کے ساتھ اس طرح کی بیع کرتے ہیں، ان میں اس کا عرف اور تعامل ہے، لہذا یہ بیع صحیح ہوگی اور اس میں شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوگی اگرچہ یہ قواعد شرع کے خلاف ہے، اس لئے کہ تعامل کی وجہ سے قواعد ترک کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے)۔

بیع و فاء کو رہن قرار دینے والے حضرات کے دلائل:

جن فقہاء کرام نے اس کو رہن قرار دیا ہے، انہوں نے اس بیع کو سود کھانے کا حیلہ قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ عقود میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا، یہی وجہ ہے کہ اگر ہبہ عوض کی شرط کے ساتھ ہو تو وہ بیع ہے، اس لئے کہ اگرچہ ہبہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس میں بیع کا مفہوم پایا جاتا ہے، اسی طرح اگر کفالہ میں یہ شرط ہو کہ اصیل کو بری قرار دیا جائے تو پھر وہ لفظاً کفالہ ہوگا، لیکن حقیقتاً حوالہ ہوگا اور اگر حوالہ میں اصیل کی عدم براءت کی شرط ہو تو وہ کفالہ ہوگا، نہ کہ حوالہ اور استصناع میں اگر مدت متعین ہو جائے تو وہ سلم ہو جائے گا۔ ان کے علاوہ کتب فقہ میں بہت ساری مثالیں موجود ہیں، لہذا بیع و فاء میں اگرچہ بیع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ رہن ہے، اس لئے کہ دین کی ادائیگی کے بعد اصل شے کی واپسی رہن ہی میں ہوتی ہے، بیع تو لازم ہوتی ہے اور شے مبیعہ خریدار کی ملکیت میں آجاتی ہے اور اس کو ہر طرح کے مالکانہ تصرف کا اختیار ہوتا ہے۔

”تمیین الحقائق“ میں ہے:

”قالوا لما شرط علیہ أخذہ عند قضاء الدین اتی بمعنی الرهن، لأنه هو الذی یؤخذ عند قضاء الدین والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ حتی جعلت الکفالة بشرط براءة الأصيل حواله وبالعکس کفالة والاستصناع عند ضرب الأجل سلماً“ (تمیین الحقائق کتاب الاکراه ۱۸۳/۵)۔

تیسرے قول کے دلائل:

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ عقد کے وقت یا اس سے قبل واپسی کی شرط لگانے سے عقد فاسد ہو جائے گا، ان کی دلیل

یہ ہے کہ اس طرح کی شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہے، کیونکہ عقد بیع کا تقاضا تو یہ ہے کہ لازم ہو، خریدار کو ہر طرح کے جائز تصرف کا اختیار ہو، وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت بھی کر سکتا ہو اور کسی کو ہبہ اور وصیت بھی کر سکتا ہو، لیکن مذکورہ بیع میں خریدار کو اس طرح کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جب صلب عقد میں مقتضاء عقد کے خلاف کوئی شرط لگا دی جائے تو عقد فاسد ہو جاتا ہے، نیز بائع اور مشتری کے نزدیک اس عقد سے حقیقت بیع مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے کچھ مدت تک کے لئے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے جو سود ہے اور سود کی حرمت و شناخت ہر حال میں ہے (دیکھئے الموسوعۃ الفقہیہ ۲۶۰/۹)۔

قول راجح اور اس کے دلائل:

بیع وفاء کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے تین بنیادی اقوال اور ان کے دلائل مذکور ہوئے۔ ان میں کونسا قول راجح اور اقرب الی الفقہ ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قول، یعنی بیع وفاء کے جواز اور صحت کا قول سمجھ سے باہر ہے، وہ قواعد شرع سے دور اور سود کھانے کا ایک حیلہ معلوم ہوتا ہے، چونکہ لوگوں میں غیر سودی قرض دینے کا مزاج نہیں ہے وہ اپنے قرض سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں جس کا یہ طریقہ تلاش کیا گیا ہے، ظاہری بات ہے کہ جب ایجاب و قبول کے ذریعہ بیع مکمل ہوگی تو بائع ثمن کا اور مشتری بیع کا مالک ہو گیا، ان دونوں کو اپنی ملکیت میں مالکانہ تصرف کا پورا اختیار ہونا چاہئے، یہ شرط لگانا کہ مشتری بیع کو فروخت نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا مالکانہ تصرف کر سکتا ہے، بلکہ صرف ایک خاص مدت کے لئے انتفاع کر سکتا ہے اور دین یا ثمن کی ادائیگی کے وقت اس پر بیع کی واپسی لازم ہے، یہ بیع نہیں، بلکہ بیع کا مذاق ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مشائخ نے اس کو باطل قرار دیا ہے، اور مذاق سے تعبیر کیا ہے:

”ومن المشائخ من جعله باطلاً اعتبره بالهزل“ (تبيين الحقائق كتاب الاكراه ۱۸۴/۵)۔

علامہ ابن عابدین شامی نے خیر یہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سید امام نے امام الحسن ماتریدی سے کہا کہ بیع وفاء لوگوں میں عام ہے اور آپ کا اور میرا فتویٰ یہ ہے کہ یہ رہن ہے تو کیوں نہیں، ائمہ اور علماء کو جمع کر کے ہم اس مسئلہ پر اتفاق کر کے لوگوں کے سامنے پیش کریں تو ابو الحسن ماتریدی نے کہا کہ اس وقت ہمارا ہی فتویٰ معتبر ہے اور یہی لوگوں کے درمیان شائع و رائج ہے، جو شخص ہماری مخالفت کرتا ہے وہ سامنے آئے اور دلیل پیش کرے۔

”فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم“ (رد المحتار كتاب البيوع باب الصرف ۵۳۶/۷)۔

بیع وفاء کو جائز اور صحیح قرار دینے والوں کی دو بنیادیں ہیں، ایک عرف، دوسری ضرورت، معلوم نہیں کہ ہندوستان کے کس حصہ کا عرف بیع وفاء کا ہے، اس سلسلہ میں ہر خطہ کے علماء و مفتیان کرام سے ان کے علاقہ کا عرف معلوم کرنا چاہئے، جس سے پتہ چلتا کہ کس علاقہ کا عرف بیع وفاء کا ہے، اس سے اس کی وضاحت بھی ہو جاتی کہ یہ عرف عام ہے یا عرف خاص پھر دونوں کے احکام پر بحث ہوتی، بہار میں تو کہیں بھی یہ عرف سمجھ میں نہیں آتا ہے، بہار کے کسی علاقہ میں سود بھرنے اور کسی

علاقہ میں زر پینگی سے یاد کیا جاتا ہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ضرورت مند کسی شخص سے بہ طور قرض کچھ رقم لیتا ہے اور اس قرض کی ادائیگی کے وقت تک کے لئے اپنی زمین قرض دینے والے کے پاس رکھتا ہے جس کی آمدنی سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے، میری معلومات کی حد تک بہار میں کہیں بھی بیج کا معاملہ نہیں ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ صریح رہن کی شکل ہے جس میں قرض دینے والا شہی مرہون سے انتفاع کرتا ہے جو ”کل قروض جبر نفعاً فہو ربا“ کے تحت حرام ہے۔ جہاں تک ضرورت و حاجت کا تعلق ہے تو اس کا تحقق قرض لینے والے کے ساتھ تو ہو سکتا ہے، اس کو قرض کی ضرورت پر دستگی ہے اور غیر سودی قرض نہ ملنے پر زمین وغیرہ رہن رکھنے پر مجبور ہو سکتا ہے، اس لئے بدرجہ مجبوری اس طرح رہن رکھ کر قرض لینے کی اجازت ہو سکتی ہے، لیکن قرض دینے والے کے ساتھ کوئی مجبوری ہے کہ سود کھائے اور صریح حرام کا ارتکاب کرے۔ حضرت تھانویؒ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں اس طرح کے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا ہے:

”اور رہن قصداً اور بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سو اصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر وہ بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں“ (امداد الفتاویٰ کتاب البیوع ۱۰۸/۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیع وفاء کو عرف و حاجت کی بنیاد پر صحیح قرار دے کر خریدار کے لئے شہی مبیعہ سے انتفاع کو جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے، یہ ربا کے دروازہ کو کھولنا ہے، حقیقت یہ ہے کہ:

الف- اگر معاملہ لفظ بیع کے ساتھ نہ ہو، بلکہ قرض لے کر زمین و مکان یا کوئی دوسری چیز بہ طور ضمانت رکھی جائے اور قرض کی ادائیگی کے وقت وہ شہی واپس لے لی جائے تو یہ رہن ہے، جیسا کہ دوسرا قول ہے اور شہی مرہون سے انتفاع حرام ہے، البتہ اگر مالک انتفاع کی اجازت دے دے اور وہاں شہی مرہون سے انتفاع کا عرف بھی نہ ہو اور قرض دینے والے کی طرف سے کسی طرح کا اشارہ بھی نہ ہو تو اس صورت میں شہی مرہون سے انتفاع کی گنجائش ہوتی ہے۔

ب- اور اگر لفظ بیع کے ذریعہ معاملہ طے پایا ہو اور عقد سے قبل یا صلب عقد میں دین یا شہن کی ادائیگی کے وقت بیع کی واپسی کی شرط لگادی گئی ہو یا اس وقت تو شرط نہیں لگائی گئی، لیکن دونوں فریق نے اس کو غیر لازم بیع سمجھ کر کیا تو ان سبھی صورتوں میں لفظاً بیع ہوگی اور حقیقتاً رہن یا یوں کہیں کہ یہ بیع شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہو جائے گی اور دونوں فریق پر اس عقد کو ختم کرنا لازم ہوگا۔ خریدار کے لئے خریدی ہوئی شہی سے انتفاع حرام ہوگا۔

ج- اگر معاملہ لفظ بیع کے ذریعہ طے پایا ہو اور عقد سے قبل یا صلب عقد کے اندر کسی طرح کی شرط نہیں لگائی گئی اور بیع تام و لازم سمجھ کر ہوئی پھر بعد میں دونوں فریق نے باہمی رضامندی سے دین یا شہن کی ادائیگی کے وقت بیع کی واپسی کا معاہدہ کیا تو

ایسی صورت میں یہ بیع لازم ہوگی اور خریدار کے لئے بیع میں ہر طرح کے جائز تصرف کا شرعاً اختیار ہوگا۔ وہ کسی سے فروخت بھی کر سکتا ہے اور کسی کو ہبہ و وصیت بھی کر سکتا ہے، بائع خریدار کو بیع کی واپسی پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔

ایفاء عہد کا حکم:

اب ایک بحث یہ آتی ہے کہ جب بیع مکمل ہو جانے کے بعد خریدار نے دین یا ثمن کی ادائیگی کے وقت بیع کی واپسی کا ارادہ کیا تو کیا خریدار پر اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ خریدار پر قضاء وعدہ کو پورا کرنا لازم نہیں ہے، اگر وہ بیع واپس نہ کرے اور معاملہ قاضی شریعت کی شرعی عدالت دارالقضاء میں پہنچے تو قاضی شریعت اس کی واپسی کا فیصلہ نہیں دے سکتے ہیں، البتہ دیانۃً اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہے، کیونکہ کتاب و سنت میں ایفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ”أوفوا بالعہد“ (بنی اسرائیل: ۳۴) کہا گیا ہے یعنی ایفاء عہد کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر خریدار وعدہ کو پورا نہ کرے اور بیع کی واپسی سے انکار کر دے تو وہ شرعاً گنہگار ہوگا، لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس کے ساتھ کوئی مجبوری پیش نہ آئے اور اس کے سامنے کوئی حکمت و مصلحت نہ ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی مجبوری ہو یا واپسی میں کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو پھر وہ گنہگار بھی نہیں ہوگا، اس لئے کہ وعدہ کو پورا کرنا اس وقت باعث گناہ ہے، جبکہ وعدہ کرتے وقت ہی پورا نہ کرنے کی نیت ہو، کیونکہ یہ منافق کی علامت ہے اور اگر وعدہ کرتے وقت ایفاء عہد کی نیت ہو، لیکن بعد میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے، اس کے سامنے کوئی مصلحت ہو تو پھر گناہ نہیں ہے۔

”مشکوٰۃ شریف“ میں ابوداؤد شریف اور ترمذی شریف کی روایت ہے:

”عن زید بن ارقم عن النبی ﷺ قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نيته أن يفى له فلم يف ولم يجيء للميعاد فلا إثم عليه“ (رواه ابوداؤد و الترمذی؛ مشکوٰۃ شریف باب الوعد: ۴۱۶)۔

(زید بن ارقم سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی اپنے بھائی سے وعدہ کرے اور اس کی نیت اس وعدہ کو پورا کرنے کی ہو اور وہ (کسی عذر کی وجہ سے) پورا نہ کر سکے اور وقت پر نہ آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا)۔

ملا علی قاری ”مشکوٰۃ شریف“ کی شہرہ آفاق شرح ”مرقاۃ المفاتیح“ میں مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”(فلم يف) أي بعذر (ولم يجيء للميعاد) أي لمانع (فلا إثم عليه) قال الاشراف: هذا دليل على أن النية الصالحة يثاب الرجل عليها وإن لم يقترن معها المنوى وتختلف عنها اه ومفهومه أن من وعد وليس من نيته أن يفى، فعليه الإثم سواء وفى به أو لم يف، فإنه من أخلاق المنافقين“ (مرقاۃ المفاتیح باب الوعد: ۶۳۷)۔

((اس نے پورا نہیں کیا) یعنی عذر کی وجہ سے (وہ وقت پر نہیں آیا) یعنی کسی مانع کی وجہ سے (اس پر کوئی گناہ نہیں ہے) اشرف نے کہا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اچھی نیت پر آدمی کو ثواب ملے گا گرچہ جس چیز کی نیت کی ہو پوری نہ ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وعدہ کرے اور اس کی نیت پورا کرنے کی نہ ہو تو اس پر گناہ ہوگا، خواہ اس کو پورا کرے یا نہ کرے اس لئے کہ یہ منافقین کے اخلاق میں سے ہے۔)

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- اگر فریقین کے درمیان معاملہ لفظ بیع کے ساتھ نہ ہو، بلکہ قرض لے کر زمین و مکان بہ طور ضمانت رکھا گیا ہو تو یہ رہن ہے، اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، قرض دینے والا اس شیئی مرہون سے کسی طرح کا انتفاع نہیں کر سکتا ہے، اس کے لئے اس سے انتفاع حرام ہے، نیز وہ اس میں کسی طرح کا مالکانہ تصرف بھی نہیں کر سکتا ہے، یعنی نہ تو کسی دوسرے سے اس کو فروخت کر سکتا ہے اور نہ ہی ہبہ و وصیت کر سکتا ہے، اس سے جو آمدنی ہوگی وہ بھی مالک زمین و مکان کی ہوگی اور قرض کی ادائیگی کے وقت شیئی مرہون کی واپسی ضروری ہوگی۔

۲- اگر معاملہ لفظ بیع کے ساتھ طے ہو اور عقد سے قبل یا عقد کے اندر یہ شرط ہو یا وعدہ ہو کہ بائع جس وقت دین یا ثمن ادا کرے گا اس وقت خریدار پر بیع کی واپسی لازم ہوگی جس کو بیع و فاء کہتے ہیں، جیسا کہ بیع و فاء کی تعریف میں مذکور ہوا تو یہ لفظاً بیع ہے، لیکن حقیقتاً رہن ہے، اس پر بھی رہن ہی کے احکام نافذ ہوں گے، یا یہ کہیں گے کہ چونکہ مقضیٰ عقد کے خلاف شرط لگائی گئی ہے، اس لئے یہ شرط فاسد ہے اور شرط فاسد کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوئی، بائع اور مشتری دونوں پر لازم ہوگا کہ اس عقد کو ختم کریں، خریدار کے لئے شیئی مبیعہ سے انتفاع یا کسی طرح کا مالکانہ تصرف حرام ہوگا۔ بیع و فاء کو حاجت و ضرورت اور عرف کی بنیاد پر جائز قرار دینا اور شیئی مبیعہ سے خریدار کو انتفاع کی اجازت دینا شرعاً صحیح نہیں، یہ سود کے دروازہ کو کھولنا ہے اور سود کھانے کا ایک حیلہ اختیار کرنا ہے۔ اس طرح کے حیلہ کی گنجائش خود بائع کے لئے تو ہو سکتی ہے، جبکہ اس کو بلا سودی قرض کسی جگہ سے نہ ملے اور اس کو انتہائی مجبوری ہو، لیکن خریدار کے لئے کوئی مجبوری نہیں ہے کہ وہ شیئی مرہون سے انتفاع کر کے صریحاً حرام کا مرتکب ہو۔

۳- اگر لفظ بیع کے ساتھ معاملہ ہو اور بیع کا معاملہ جس طریقہ پر ہوتا ہے اس طریقہ پر مکمل ہو، عقد سے قبل یا صلب عقد میں عقد کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کسی طرح کی شرط یا وعدہ نہ ہو، بلکہ بیع کا معاملہ مکمل ہو جانے کے بعد کسی دوسری مجلس میں بائع اور مشتری کے درمیان ثمن کی ادائیگی کے وقت بیع کی واپسی کا معاہدہ ہو تو بیع شرعاً صحیح و درست ہوگی، بائع ثمن کا اور مشتری بیع کا مالک ہوگا، کسی دوسرے کے ہاتھ موجودہ قیمت پر یا اس سے زائد قیمت پر فروخت کرنے کا حق ہوگا اور وہ زائد قیمت خریدار ہی کی ہوگی، نیز وہ اس میں کوئی دوسرا مالکانہ تصرف بھی کر سکتا ہے۔ اس پر قضاء اس کی واپسی ضروری نہیں ہوگی،

البتہ دیناً اور اخلاقاً ثمن کی ادائیگی کے وقت خریدار پر بیع کی واپسی ضروری ہوگی، لیکن اگر کسی مجبوری یا کسی مصلحت کے پیش نظر واپس نہ کرے تو گنہگار بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ گنہگار اس وقت ہوگا، جبکہ وعدہ کرتے وقت ہی وعدہ کو پورا کرنے کی نیت نہ ہو۔

۴- اگر رہن کی صورت ہو اور جس کے پاس رہن رکھا جائے وہ قرض تو تبرع کے طور پر دے اور شہی مہون کو کرایہ پر لے کر اس کو استعمال میں لائے، لیکن عام کرایہ سے کم کرایہ دے تو یہ جواز کا ایک حیلہ ہوگا، انتہائی ضرورت پر اس کی گنجائش ہوگی، عام حالات میں اس سے احتراز ہی کرنا چاہئے، ”فتاویٰ محمودیہ“ میں مفتی محمود الحسن صاحب نے اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

”یہ معاملہ شرعاً کرایہ اور ٹھیکہ ہے، مگر حیلہ کی صورت ہے، اس لئے بوقت ضرورت ایسی صورت پر عمل کرنا شرعاً درست ہے“ (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۲۶۷)۔

۵- کرایہ دار سے کرایہ کے علاوہ جو کثیر رقم لی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہیں:

الف- ایک تو یہ کہ وہ رقم بہ طور ضمانت لی جاتی ہے، کرایہ دار جب مکان و دکان خالی کرتا ہے تو اس کی وہ رقم واپس کر دی جاتی ہے، ایسی صورت میں مذکورہ رقم کی حیثیت رہن کی ہے اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے اور وہ رقم مالک مکان و دکان کے پاس امانت رہے گی، وہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا ہے، اس صورت میں عام طور سے کرایہ معمول کے مطابق ہی لیا جاتا ہے، اگر مالک مکان و دکان اس رقم کو بہ طور قرض اپنے استعمال میں لاتا ہے، اور اس کی وجہ سے وہ کرایہ معمول سے بہت کم لیتا ہے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، یہ اپنے قرض پر نفع اٹھانا ہے جو شرعاً حرام ہے، اور اگر مالک مکان و دکان کے پاس زر ضمانت کی رقم بہ طور امانت رہتی ہے وہ اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاتا ہے اور کسی خاص مصلحت کے تحت وہ کرایہ کم لیتا ہے تو شرعاً یہ جائز ہے، یہ ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ کے تحت نہیں آئے گا، اس لئے کہ کرایہ دار نے جو رقم دی ہے وہ قرض نہیں ہے، بلکہ بہ طور ضمانت اور بہ طور رہن ہے۔

ب- دوسری صورت پگڑی کی ہے کہ مالک مکان و دکان کرایہ کے علاوہ ایک خطیر رقم لیتا ہے اور وہ عرفاً اس رقم کا مالک بھی ہوتا ہے، اس کی واپسی کا وہ پابند نہیں ہوتا ہے، ایسی صورت میں مالک مکان و دکان ایک خاص رقم لے کر اپنے حق انتفاع سے دست بردار ہوتا ہے اور کتب فقہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ کوئی رقم لے کر اپنے حق سے دست بردار ہونا شرعاً جائز و درست ہے، لہذا پگڑی کی صورت میں مالک مکان و دکان پگڑی کی رقم کا شرعاً مالک ہوگا، اس کو اس میں مالکانہ تصرف کا اختیار ہوگا اور کرایہ دار کو بھی اختیار ہوگا کہ جس حق انتفاع کا وہ مالک ہوا ہے کسی دوسرے سے رقم لے کر خود اس حق سے دست بردار ہو جائے، وہ زائد رقم بھی لے سکتا ہے، ایسی صورت میں مالک تو اپنے حق انتفاع سے دست بردار ہوا، لیکن ابھی اس

مکان و دکان کا مالک ہے، چونکہ وہ مالک ہے، اس لئے وہ کچھ کرایہ بھی لیتا ہے تو شرعاً جائز و درست ہے، اس کو ”کل قرض مکاناً و دکاناً“ کے تحت نہیں لاسکتے ہیں، اس لئے کہ کرایہ دار نے جو رقم دی ہے وہ قرض نہیں ہے، بلکہ حق انتفاع کا عوض ہے۔

☆☆☆

موجودہ حالات میں بیع الوفاء میں بیع سے استفادہ کا حکم

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی ☆

بیع بالوفاء بشرط واپسی یا بمعاہدہ واپسی کسی سامان کو فروخت کرنا عالمی طور پر ایک متعارف بیع ہے اسے فقہاء احناف بیع بالوفاء یا بیع جائز کہتے ہیں (فتاویٰ قاضی خان ۲/۵۳۳)، بعض حنفیہ نے اسے ”بیع المعاملہ“ سے بھی تعبیر کیا ہے (فتاویٰ سراجیہ علی ہاشم فتاویٰ قاضی خان ۳/۱۶۲)، مالکیہ اسے بیع الثنیا کہتے ہیں (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۲/۹۹)، اور شوافع ”رہن معاذ“ قرار دیتے ہیں۔ اہل مصر اسے ”بیع امانت“ اور اہل شام اسے ”بیع الاطاعہ“ کہا کرتے ہیں (قاموس الفقہ ۲/۳۶۶)، لیکن بہار کی عوامی زبان میں اسے ”سود بھرنا“ کہا جاتا ہے۔

اس مخصوص طریق خرید و فروخت کی مختلف جہات کے اعتبار سے مذکورہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، بیع الوفاء کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید نے کسی ضرورت کے تحت عمر سے اپنا سامان زمین مکان دکان اس شرط پر ایک ہزار روپے نقد کے بدلے فروخت کیا کہ جب زید کے پاس یہ رقم فراہم ہو جائے گی تو وہ عمر کو ادا کر دے گا اور عمر خریدی ہوئی چیز زید کو واپس کر دے گا۔

اس صورت میں بظاہر بیع کے طور پر متعاقدین، یعنی فروخت کنندہ اور خریدار کے قبضے میں سامان اور اس کی قیمت واپس کر دے گا، تو وہ اسی قیمت پر دوبارہ اپنے قبضے کا سامان بیچ دے گا، یہ شرط، خواہ بلفظ بیع طے کی گئی ہو یا آپس میں دونوں نے بطور معاہدہ معاملہ کیا ہو، بہر صورت سامان پر خریدار کا قبضہ اس شرط یا معاہدہ کی وجہ سے عارضی ہے، جبکہ بیع کا تقاضا سامان پر خریدار کا دوامی قبضہ ہے جس سے وہ مال مقبوض میں مکمل تصرف کا حق دار ہوتا ہے اور یہ چیز یہاں مفقود ہے اور معاہدہ بھی چونکہ واجب الایقافہ ہے، اس لئے ایسے معاہدے سے حاصل شدہ قبضہ بھی محض وقتی قبضہ ہے جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں، لہذا تقاضائے عقد کے خلاف اس شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی اور اس طرح خرید و فروخت کا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، اس مسئلہ کو لفظ بیع سے تعبیر کرنے کا تقاضا بھی یہی ہے، تاہم عمومی طور پر حصول قرض کی مجبوری میں اس کا تعامل عام ہے، اس لئے اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور و خوض ضروری ہے۔

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہو شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ بوقت عقد لفظ بیع یا بیع بشرط الوفاء یا بیع الجائز کہہ کر اصل معاملہ کیا گیا ہے، اس لئے یہ بیع اصول شرعی کے مطابق منعقد اور درست ہو جائے گی، مگر شرط فاسد کی وجہ سے بیع بھی فاسد قرار دی جائے گی اور اس کو معاملہ رہن بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ عقد میں رہن کا ذکر نہیں کیا گیا تھا، لیکن شرط فاسد کے باوجود فروخت کردہ سامان پر اگر خریدار نے قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور خریدار کو اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا حق حاصل ہو جائے گا وہ حق بیع، و شراء، حق ہبہ، اور حق رہن، وغیرہ جملہ حقوق کا مالک بن جائے گا۔

”فتاویٰ سراجیہ“ میں ہے:

”بیع المعاملة و بیع الوفاء واحد و أنه بیع فاسد؛ لأنه بیع لا یقتضیہ العقد و انه یفید الملك عند اتصال القبض به، كسائر البیوع الفاسدة مذکورة فی فتاویٰ ابی بکر ابن الفضل“ (فتاویٰ سراجیہ علی باش فتاویٰ قاضی خان ۱۶۲/۳ مطبوعہ مصطفائی دہلی)۔

(بیع المعاملہ اور بیع الوفاء ایک ہی ہے اور یہ بیع فاسد ہے، کیونکہ یہ ایسی بیع ہے جس کا تقاضا عقد نہیں کرتا، مگر قبضہ حاصل ہو جانے پر یہ مفید ملک ہو جاتا ہے، جیسا کہ ساری بیوع فاسدہ کا یہی حکم ہے، یہ بات فتاویٰ ابی بکر ابن الفضل میں مذکور ہے)۔

”قبض المشتري المبيع فی البیع الفاسد بأمر البائع وکل من عوضیه مال ملک المبیع بقیمتہ“ کی شرح کرتے ہوئے اس کی دلیل یہ بیان فرمائی کہ

”لنا أن رکن البیع صدر من أهله مضافاً إلى محله فوجب القول بانعقاده و لا خفاء فی لأهلیة و المحلیة، و رکنه مبادلة المال بالمال و فیہ الکلام، و النهی یقرر المشروعیة عندنا لاقتضائه التصور، فنفس البیع مشروع، و به تنال نعمة الملك إنما المحذور ما یجاوره، کما فی البیع وقت النداء“ (البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۱۵۰/۶ مطبوعہ زکریا دیوبند)۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ رکن بیع اہلیت بیع رکھنے والے سے صادر ہوا ہے اور محل بیع کی طرف نسبت بھی صحیح ہے، لہذا اس کو منعقد قرار دینا واجب ہے اور اس میں کوئی پوشیدہ بات نہیں کہ اہلیت، محلیت، اور رکن بیع، یعنی مال کا تبادلہ مال سے اپنی جگہ صحیح ہے اور گفتگو بھی اسی میں ہے، لہذا انعقاد بیع میں کوئی مانع نہیں اور حدیث میں جو ”نہی النبی ﷺ عن بیع و شرط“ وارد ہے اس سے مشروعیت ہی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اصل میں مشروعیت کا تصور کیا جاسکتا ہے، لہذا نفس بیع

مشروع ہے اور اسی مشروعیت کے واسطے سے نعمت ملک بھی حاصل ہو جاتی ہے، رہی بات نہیں اور ممانعت کی تو وہ اقتضاء بیع کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے ہے، نہ کہ اصل بیع کی وجہ سے، جیسا کہ بوقت اذان جمعہ بیع کی ممانعت بوقت اذان، بیع کرنے کی وجہ سے ہے نہ کہ اصل بیع کی وجہ سے۔

غالباً امام اسپجانی نے اصل بیع کی حقیقت کو دیکھتے ہوئے اسے بیع جائز قرار دیا ہے۔
”فتاویٰ سراجیہ“ میں ہے:

”عن الشيخ القاضي الإمام الإسبيحاني أنه بيع جائز ويوفى بالوعد“ (فتاویٰ سراجیہ علی ہاشم فتاویٰ قاضی

خاں ۱۶۳/۳)۔

(اور شیخ قاضی امام اسپجانی سے منقول ہے کہ انہوں نے اسے جائز بیع قرار دیا ہے اور خریدار پر وعدے کا پورا کرنا

بھی لازم ہے)۔

الف - بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

بیع فاسد میں شرط فاسد کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع اور شرط دونوں فاسد ہوتے ہیں۔

لہذا اگر متعاقدین نے عقد بیع کے ساتھ ہی شرط فاسد کو منظور کیا ہے تو اب بیع (سامان، مکان، دکان، وغیرہ) کو قبضہ کے بعد خریدار کسی بھی شخص سے بیچ سکتا ہے اور بائع اول نے اس سامان کی جو قیمت آپس میں طے کی تھی وہ بھی بطور ثمن برقرار نہیں رہے گی، بلکہ بازاری قیمت پر اس کو فروخت کرنے کا حق ہوگا چاہے اسے پہلا فروخت کنندہ خریدے یا دوسرا، اس قیمت میں کمی بیشی کا اختیار بھی خریدار اول کو ہوگا، اور پہلے بائع سے دوبارہ بیع کی اس کی لگائی ہوئی شرط کا عدم ہو جائے گی، خریدار اول کو بائع اول سے بھی زائد قیمت لینے کا اختیار ہوگا، البتہ قرآن وحدیث میں ایفاء وعدہ کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر بائع اول سے بیچتے وقت اپنے وعدے کا وفادار ہونا چاہئے۔

لیکن اگر عقد کے وقت مذکورہ شرط نہیں لگائی گئی، بلکہ بلا شرط معاملہ طے ہوا پھر مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد آپس میں سابقہ قیمت پر ادائے ثمن کے بعد واپسی کا معاہدہ ہوا اور خریدار نے بیع بشرط واپسی طے کر دی تو اب خریدار پر صرف بائع اول سے بیچنا اور صرف پہلے طے شدہ دام پر بیچنا اور وعدہ پورا کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ”أوفوا بالعهد إن العهد كان مستولاً“ (بنی اسرائیل: ۳۴)، (اور وعدے کو پورا کرو اس کے بارے میں خدا تم سے پوچھے گا)۔

”فتاویٰ قاضی خاں“ میں ہے:

”فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (فتاویٰ قاضی خاں ۳۵۳/۲)۔

(پس اس وعدہ کو بھی لازم قرار دیا جائے گا عام لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (پاکستان) لکھتے ہیں:

”حنفی اور مالکی فقہاء نے وعدے کے وجوب کی بنیاد پر بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا ہے۔ اس بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اگر دوبارہ خریداری کو اصل اور پہلی بیع کے لئے شرط بنایا جائے تو یہ معاملہ صحیح نہ ہوگا، اور اگر فریقین نے پہلی بیع غیر مشروط طور پر کی ہے، لیکن بائع نے علیحدہ اور مستقل طور پر اس بیچی ہوئی جائیداد کو دوبارہ خریدنے کے وعدے پر دستخط کئے ہیں تو وعدہ کرنے والے پر اس کا ایفا لازم ہوگا اور عدالت کے ذریعہ بھی اس پر عمل کرایا جاسکے گا، اس صورت میں ایفا کے وجوب کو حنفیہ اور مالکیہ دونوں نے تسلیم کیا ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۹۸/۵، الخطاب تراجم: ۲۳۹، مطبوعہ بیروت ۱۴۰۲ھ)۔

ب۔ مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟
مجلس عقد میں بیع بالشرط کی صورت میں جب شرط کا لعدم ہوگی تو خریدار کو ہر طرح اختیار ہے جس سے چاہے بیچے اور جس قیمت پر چاہے فروخت کرے۔ البتہ خارج عقد بشرط واپسی کے وعدے کے بعد خریدار کو بہر حال بائع اول سے ہی بیچنا اور سابقہ طے شدہ قیمت پر ہی بیچنا لازم ہے وہ اضافی قیمت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

ج۔ خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

اب جبکہ اس بیع کو اصل کے اعتبار سے جائز بتایا جا چکا تو بیع پر خریدار کا حق تصرف نافذ ہوگا وہ جزوی طور پر ہر طرح نفع حاصل کرنے کا حقدار ہوگا، البتہ بعد العقد آپسی معاہدے کے تحت واپسی کی شرط کے بعد سامان خریدار کے پاس بطور امانت محفوظ رہے گا اور خریدار اسے نہ کسی دوسرے سے فروخت کا مجاز ہوگا، نہ اسے کسی تصرف اور نفع اٹھانے کا اختیار ہوگا۔
د۔ خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟
اصل عقد میں واپسی کی شرط والی صورت میں خریدار سامان پر قبضہ کے بعد دوسرے سے بیچ دے تو بیع جائز ہوگی، اور زائد قیمت وصول کرے تو یہ بھی جائز ہوگی، لیکن بعد العقد آپسی معاہدہ والی صورت میں نہ دوسرے سے بیع جائز ہوگی نہ زائد قیمت پر فروخت کرنا درست ہوگا۔

۲۔ اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو؟

اکثر مشائخ احناف اس صورت بیع کو بیع کی جگہ رہن قرار دیتے ہیں، انہیں فقہاء و مشائخ میں سید امام ابو شجاع اور امام ابو الحسن علی الماتریدی و القاضی السغدی۔ اور علامہ ابن عابدین شامی اور ہمارے دور کے مفتیان کرام اور دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب قدس سرہ شامل ہیں (فتاویٰ قاضی خاں ص: ۵۳ مطبوعہ مصطفائی دہلی)۔

علامہ سراج الدین اوشی نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے:

”وللبائع استردادہ إذا قضی دینہ متى شاء، لأنهم يريدون به الرهن حقيقة“ (فتاویٰ سراجیہ علی ہاشمی قاضی خاں ۱۶۳/۳)۔

(اور بیچنے والا جب خریدار کا قرضہ چکا دے تو وہ جب چاہے اپنا سامان واپس لے سکتا ہے، کیونکہ فقہاء اس کو حقیقت میں رہن قرار دیتے ہیں)۔

رہ گیا یہ اشکال کہ جب لفظ بیع کے ساتھ بشرط واپسی معاملہ ہوا ہے تو اسے بیع کے ظاہر لفظ سے رہن کے معنی کی طرف کیسے منتقل کیا جاسکتا ہے۔

تو علامہ اوشی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

”والعبرة للمقاصد لا للألفاظ، ألا ترى أن الكفالة بشرط براءة الأصل حوالة والحوالة بشرط مطالبة الأصيل كفالة“ (فتاویٰ سراجیہ ۱۶۳/۳)۔

(بات یہ ہے کہ اعتبار مقاصد کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا، چنانچہ اصل معاملہ کرنے والے کی برآة کی شرط کے ساتھ کفالہ کرنا حوالہ ہوتا ہے، نہ کہ کفالہ۔ اسی طرح اصیل سے مطالبہ کی شرط سے حوالہ کرنا کفالہ ہوتا ہے، نہ کہ حوالہ)۔

الف۔ جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

خریدار کی حیثیت امانت دار کی ہوگی وہ امین ہونے کی حیثیت سے اس بیع کو رہن قرار دینے کی صورت میں نہ مال مرہون کا مالک ہوگا نہ اس سے کوئی نفع اٹھا سکے گا، بلکہ اس کی حفاظتی غفلت کے سبب سامان کے ہلاک و ضائع ہوجانے پر خریدار سے اس کی قیمت کا تاوان وصول کیا جائے گا، البتہ خود بائع کی اجازت سے وہ حصول منافع کا حق دار بن سکتا ہے۔

ب۔ اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

اس صورت میں اکثر فقہاء کے نزدیک خریدار کا کم کرایہ پر معاملہ کرنا ناجائز ہے، کیونکہ خریدار مرہون بیع (مکان، دکان، زمین) سے مروجہ کرائے سے کم کرایہ کا معاملہ کر کے جو نفع اٹھا رہا ہے وہ درحقیقت اس ثمن پر اٹھا رہا ہے جو بیچنے والے کے ذمہ قرض ہے اور حدیث میں حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”کل قرض جبر منفعۃ فہو ربا“ (السیوطی، الجامع الصغیر ۹۳/۲) (ہر ایسا قرضہ جو نفع کھینچے وہ ربا ہے)۔

یہ روایت صحابہ کرامؓ کے آثار و اقوال کے طور پر سب کے نزدیک قابل اعتماد ہے اور بہت سارے صحابہ کرام سے منقول ہے، مثلاً حضرت فضالہ بن عبید کا اثر ”سنن بیہقی“ میں مذکور ہے۔

”کل قرض جبر منفعتہ فہو وجہ من وجوہ الربا“۔

بیہقی فرماتے ہیں کہ بالکل یہی اصول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۶/۸۴)۔
اور اسی اصول پر فقہاء کرام نے بہت ساری فقہی جزئیات کا استنباط کیا ہے۔
امام مالک فرماتے ہیں:

”من أسلف سلفاً فلا يشترط أفضل منه، وإن كان قبضة من علف فہو ربا“ (موط امام مالک ص: ۶۱۳)

مطبوعہ نور محمد کراچی)۔

(جو شخص کسی کو قرض دے وہ اس سے بہتر واپس دینے کی شرط نہیں لگا سکتا، یہاں تک کہ اگر ایک مٹھی بھر چارہ زائد لے لے تو وہ بھی ربا ہے)۔

امام بیہقی سے منقول ہے:

”ایک شخص نے عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا کہ میں نے ایک شخص سے پانچ سو اس شرط پر قرض لیے ہیں کہ میں اسے اپنا گھوڑا سواری کے لئے عاریۃً (مفت) دوں گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا تمہارا قرض خواہ جو بھی نفع اس گھوڑے سے حاصل کرے گا وہ ربا ہے (بیہقی

اسنن الکبریٰ ۵/۳۵۰)۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ خریدار نے جو مکان دکان خریدا ہے وہ بشرط واپسی بیع ہونے کی وجہ سے اس کے پاس رہن سے ہے اور رہن صرف باذن بائع مناسب نفع اٹھایا جاسکتا ہے زائد نفع نہیں اٹھا سکتا مثلاً: ”إذا ارتھن شاة شرب المرتھن من لبنھا بقدر علفھا، فإن استفضل من اللبن بعد ثمن العلف فہو ربا“ (اشوکانی نیل الاوطار ۵/۱۹۸)۔
(کسی نے کوئی بکری رہن رکھی تو مرتھن اس کے چارہ کھلانے کے بقدر دودھ پی سکتا ہے اگر دودھ اس کے چارہ سے زیادہ مہنگا ہے تو یہ اضافہ بھی ربا ہے)۔

اس ساری گفتگو کے بعد مسئلہ پر ایک اور نقطہ نظر سے بھی غور و فکر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جو قرض براہ راست حصول نفع کا ذریعہ بنے وہ بلاشبہ ربا (سود) ہے، لیکن جو قرض بصورت بیع، ثمن ہو اور کسی شرط فاسد کی وجہ سے وہ حکماً قرض بن جائے تو ایسے قرض حکمی کے زیر اثر حاصل ہونے والے نفع کو ربا نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ”کل قرض جبر نفعاً فہو ربا“ کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”مندرجہ بالا روایت میں لفظ ”قرض“ کے ساتھ ”جر“ کا لفظ مذکور ہے جس کے لغوی معنی کھینچنے کے آتے ہیں، لہذا

اگر پورے جملے کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ہر ایسا قرض جو اپنے ساتھ نفع کھینچ کر لائے وہ ربا ہے، اس عبارت کے الفاظ یہ واضح کرتے ہیں کہ ربا سے مراد صرف وہ معاملہ ہے جہاں پر قرضہ اپنے ساتھ نفع کھینچ کر لائے کہ گویا عقد قرض نفع کے ساتھ مشروط ہو، لہذا اس سے مقروض کی جانب سے از خود رضا کارانہ طور پر دیا جانے والا نفع ربا کی تعریف سے خارج ہو جاتا ہے“ (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۸۵/۶-۸۶ فیصل دیوبند)۔

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ خریدار نے بیچنے والے شخص سے کم کرایہ پر جو معاملہ کیا ہے وہ اگر رضا کارانہ ہے تو خریدار کے لئے مروجہ کرایہ سے کم کرائے پر معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ معاملہ ربا کی حد میں داخل نہیں ہے۔ ایک اور فقہی جزئیے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

نقد داموں پر ایک روپیہ کے بیس سیر گیہوں بکتے ہیں، مگر کسی کو ادھار لینے کی وجہ سے اس نے روپے کے پندرہ سیر گیہوں دیئے تو یہ بیع درست ہے، مگر اسی وقت معلوم ہونا چاہئے کہ ادھار مول لے گی (بہشتی زیور ص: ۲۲۹ چوتھا حصہ، فریڈیکڈ پو دہلی)۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا اس صورت بیع کے جواز پر اتفاق ہے (دیکھئے: المغنی لابن قدامہ ۱۷۷/۳، المبسوط للسرخسی ۱۳/۱۳، الدرستی علی الشرح الکبیر ۹۸/۳، مغنی المحتاج للشریحینی ۳۱۲/۲، سنن ترمذی کتاب البیوع باب نمبر: ۱۸، حدیث نمبر: ۱۳۳۱، جدید معاشی مسائل ۹۳/۳)۔ اور اس بیع میں بائع نے ادھار خریداری پر جو پانچ سیر گیہوں کا زائد نفع حاصل کیا ہے وہ دراصل اس ادھار ثمن کا عوض ہے جو خریدار پر قرض ہے، کیونکہ بیع موجد میں بیع مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے“ (جدید معاشی مسائل ۹۵/۳)۔ لہذا اس قرض سے بائع نے ادھار ہونے پر نفع حاصل کیا ہے جو بذریعہ بیع درست قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا صورت مسئلہ میں بھی کم کرایہ داری پر معاملہ جائز ہونا چاہئے۔ کیونکہ صاحب حق کو اپنے بعض حصہ حق سے دست بردار ہو جانے کا حق ہے۔

یہاں ایک صورت اور بھی ہے جو خریدار کے حق میں بالاتفاق سند جو از فراہم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ:

”رجل أقرض إنساناً دراهم وأراد أن يسكن دارالمستقرض بغير أجر قال أبو بكر الإسكافي يستاجر المقرض دار المستقرض مدة معلومة: سنة أو أكثر بأجر معجل، ثم يبيع من المستقرض شيئاً يسيراً بتلك الأجرة حتى يصير الأجرة قصاصاً بثمن ما باع من المستقرض“ (فتاویٰ قاضی خاں ۹۳/۳ مصطفائی دہلی)۔ (کوئی آدمی کسی شخص کو چند دراهم قرض دے اور وہ قرض لینے والے کے مکان میں بلا اجرت رہائش کرنا چاہے تو اس کی جائز صورت جیسا کہ امام ابو بکر الاسکافی نے فرمایا یہ ہے کہ قرض دینے والا قرض لینے والے سے اس کا مکان ایک متعین کرایہ نقد ادا کر کے ایک سال یا زیادہ کی مدت تک کے لئے لے لے، پھر قرض دینے والا قرض لینے والے سے کوئی

معمولی چیز اسی اجرت (کرایہ جو قرض دینے والے نے قرض لینے والے کو دیا تھا) کے بدلے بیچ دے تو یہی اجرت مستقرض سے بیچ کا ثمن برابر بن جائے گی اور معاملہ جائز ہو جائے گا۔

ج- اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ جن فقہاء نے بیچ بالوفاء کے طور پر خریداری کو رہن حقیقی کے حکم میں رکھا ہے ان کے نزدیک نہ بائع کو حق انتفاع حاصل ہے، نہ خریدار کو۔

حضرت مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند نے لکھا ہے:

”اگر بیع نامہ میں یا اس سے پہلے بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا ذکر آچکا ہے تو یہ بیع رہن کے حکم میں ہے کل جائیداد جس کی بیع ہوئی ہے رہن رہے گی، مگر (خریدار) کو اس سے انتفاع ناجائز ہے، نہ اس کی آمدنی لے سکتا ہے، نہ اس کو بیع کر سکتا ہے، نہ اجارہ نہ رہن نہ ہیہ، بلکہ اس جائیداد کا محض محافظ اور امین رہے گا، اور اس کی جس قدر آمدنی ہوگی وہ بھی تمام رہن رہے گی، روپیہ وصول ہونے پر اس جائیداد کے ساتھ اس کی آمدنی کی بھی واپسی ضروری ہوگی، جس طرح بکر (خریدار) کو اس جائیداد سے اس عرصہ میں نفع حاصل کرنا ناجائز ہے، اسی طرح زید (بائع) کو بھی نفع کا حق نہیں (فتاویٰ محمودیہ ۶/۲۸۷)۔

لیکن فقہاء کی صراحت کے مطابق اگر بائع نے انتفاع کی اجازت دی ہو تو خریدار اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جیسا کہ ماقبل میں سوال (ب) کے ذیل میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے، پھر بھی زیادہ بہتر اور معتبر شکل یہ ہے کہ خریدار شروع میں تو بلا شرط واپسی پختہ بیع کر لے، پھر مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد بائع سے وعدہ کر لے کہ جس وقت وہ اس خریدی ہوئی جائیداد کا پورا ثمن (جس کو طے کر کے خریداری کی گئی تھی) واپس ادا کر دے تو خریدار اس بیع کا سابقہ ثمن پر ہی اقالہ (واپسی کر لے گا۔ اور چونکہ اس درمیانی عرصے میں وہ جائیداد خریدار کی ملکیت میں ہوگی تو وہ اس سے بلاشبہ فائدہ اٹھانے کا حقدار ہوگا اور اس طرح کے وعدے محض نمائشی وعدے نہیں ہوتے، بلکہ انسانی حاجات کے پیش نظر یہ واجب الایفاء ہوتے ہیں۔

”وان ذکر البیع من غیر شرط ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع ویلزمہ الوفاء بالوعدہ؛ لأن المواعید قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (فتاویٰ قاضی خاں ۲/۵۳۳ مطبوعہ دہلی)۔

یہی بات فتاویٰ سراجیہ میں بھی کہی گئی ہے (دیکھئے: فتاویٰ سراجیہ علی ہاشم قاضی خاں: ۱۶۳)۔

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ اسلام اور جدید معاشی مسائل (۵/۷۲) میں لکھتے ہیں:

فقہاء نے اس طریقہ کار کو جائز قرار دیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ ”قد تجعل المواعید لازمة لحاجة الناس“ (ضرورت کے وقت وعدوں کو عدالتی طور پر بھی لازم قرار دیا جاسکتا ہے) حتیٰ کہ اگر وعدہ بیع کے موثر اور نافذ ہونے کے پہلے کر لیا جاتا ہے اور اس کے بعد بیع بغیر شرط منعقد ہوتی ہے تو ان فقہاء کے نزدیک ایسا کرنا

بھی جائز ہوگا (دیکھئے: جامع الفصولین ۲/۲۳۷، رد المحتار ۲/۱۳۵)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے۔
اگر یہ بیع حکم رہن میں داخل ہے تو خریدار کو اس کو کسی بھی قیمت پر بیچنے کا حق حاصل نہیں ہے اور اگر بیع بشرط واپسی بیع جائز کے حکم میں ہو، جیسا کہ امام اسیجانی نے کہا ہے تب بھی نہیں بیچ سکتا، کیونکہ یہ مقصد بیع بالوفاء کے خلاف ہے، البتہ جن فقہاء نے بیع فاسد قرار دیا ہے، جیسا کہ پیچھے نقل کیا جا چکا ہے ان کے نقطہ نظر سے بیع پر قبضے کے بعد ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اسی لئے کسی بھی قیمت پر بیچ سکتا ہے۔

۳- کثیر رقم ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا۔
مالک مکان و دکان کے لئے مکان و دکان پر یکمشت کثیر رقم حاصل کرنا جائز ہے، اس کی دو صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ مکان و دکان کے کرایہ دار سے پیشگی طور پر ماہانہ یا سالانہ طے شدہ کرایہ کے حساب میں شامل کیا جاتا رہے تو یہ بلاشبہ درست ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ وہ از سر نو کرایہ داری کے معاملہ پر رقم حاصل کر لے اور مارکیٹ ویلو کے مطابق ہی کرایہ طے کرے اور اسی رقم میں سے ماہانہ یا سالانہ علی الحساب مروجہ کرایہ وصول ہوتا رہے۔ یا یہ کثیر رقم سیکورٹی کے طور پر مکان و دکان کے مالک کے پاس جمع رہے اور مدت کرایہ داری ختم ہونے پر وہ پوری رقم دینے والے کو واپس کر دی جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ یہ کثیر رقم مالک مکان و دکان کے پاس بطور امانت و دیعت محفوظ رہے گی اور اس میں امانت ہی کے احکام جاری ہوں گے اور اگر مکان و دکان کے مالک نے اس کثیر رقم کو اپنے تصرف میں لانے کی اجازت کے ساتھ حاصل کیا ہے تو وہ قرض کے حکم میں ہے اور اس پر قرض کے ہی احکام نافذ ہوں گے۔

آج کل شہروں میں زر ضمانت کے عنوان سے جو کثیر رقم حاصل کی جاتی ہے وہ امانت و دیعت نہیں، بلکہ قرض ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ:

”قال عبد الله بن الزبير وإنما كان دينه الذي عليه أن الرجل يأتيه بالمال، فيستودعه إياه، فيقول الزبير لاء، ولكنه سلف فإني أخشى عليه الضيعة“ (محمد بن اسماعيل، صحيح بخاری ۴/۴۱۱)۔

(عبد اللہ بن الزبير فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت زبير پر جو قرض تھا اس کی صورت یہ تھی کہ لوگ ان کے پاس امانت رکھتے تھے تو وہ فرماتے ہیں کہ امانت مت رکھو، بلکہ اسے بطور قرض میرے پاس رکھ دو، کیونکہ مجھے اس کے ضائع ہوجانے کا ڈر ہے) اور اس شکل میں تمہاری امانت ضائع ہوجائے گی اور شرعاً میں واپسی کا ذمہ دار نہیں ہوں گا اور قرض کے طور پر رکھو گے تو ضائع ہوجانے پر ادائیگی کی ذمہ داری میرے اوپر رہے گی)۔

اور صورت معاملہ سے واضح ہے کہ زرضمانت کے نام پر حاصل کی جانے والی یہ کثیر رقم اسی غرض سے حاصل کی جاتی ہے کہ لینے والا اسے اپنی ضرورت میں استعمال کرنے کا مجاز ہوگا، لہذا یہ قرض کے حکم میں ہے۔ امانت و دیعت بالکل نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ مالک مکان و دکان اس کثیر رقم پر مکان و دکان میں مروجہ کرایہ سے کم کرایہ کی ادائیگی پر رقم لینے والے سے معاملہ کر لے تو اسے سو قرار دے کر حرام سمجھا جائے گا یا نہیں؟

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ کثیر رقم دینے والے نے رقم دیتے وقت مروجہ کرایہ سے کم کرایہ داری کی شرط پر دی ہے تو مقرض (قرض دینے والے) کے لئے قرض پر سود کا نفع حاصل کرنے کی وجہ سے یہ معاملہ کرنا حرام ہوگا۔

اور اگر یہ رقم مقرض و مستقرض کے درمیان کم کرایہ داری کی شرط کے بغیر مطلقاً کرایہ داری کے معاملہ پر حاصل کی گئی اور کرایہ کا معاملہ طے کرتے وقت مالک مکان و دکان نے رضا کارانہ طور پر مروجہ کرایہ سے کم کرایہ پر دینا طے کر دیا تو یہ صورت جائز ہوگی، کیونکہ اس شکل میں دین پر حصول نفع کا اطلاق نہیں ہوگا۔ جیسا کہ وقف کی جائیداد میں یہ کمی بیشی کا معاملہ درست قرار دیا گیا ہے (دیکھئے: حاشیہ العدوی علی الخرشی ۷۹۷)۔

خلو کی دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد پر چند دکانیں وقف ہیں، مسجد کی تکمیل یا نئی تعمیر کے لئے سرمایہ کی ضرورت پڑی۔ ایک دکان کا ماہانہ کرایہ تیس درہم ہے کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے جس سے مسجد کی تکمیل یا تعمیر نو کی جائے۔

لہذا مسجد کا متولی دکانوں کے کرایہ داروں سے خاص مقدار کی رقم مسجد تعمیر کرنے کے لئے ان سے وصول کرے اور ماہانہ کرایہ تیس درہم کے بجائے پندرہ درہم کر دے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ دکان کی منفعت صاحب خلو کرایہ دار اور وقف کے درمیان اس مقدار میں مشترک ہو جائے گی، جتنے پر صاحب خلو اور متولی وقف از روئے مصلحت راضی ہو جائیں۔ جیسا کہ الناصر کے فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے (اسلام اور جدید مسائل ۷۳)۔

اس مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے زیر بحث مسئلہ میں یکساں حکم جاری کیا جاسکتا ہے، اگرچہ بعض فقہاء نے ذاتی اور شخصی ملکیت والے مکان و دکان اور وقف کی دکان و مکان میں فرق کیا ہے اور جواز صرف ملکیت وقف والی جائیداد میں رکھا ان کا کہنا ہے کہ:

شخصی ملکیت اور وقف میں فرق یہ ہے کہ جو مکان شخصی ملکیت ہو اس کا مالک مکان کبھی اس کو کرایہ پر دینے سے باز آجاتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خود اس میں رہائش اختیار کر لے یا اسے فروخت کر دے یا معطل چھوڑ دے، لیکن جو مکان وقف کی ملکیت ہے اور کرایہ دینے کے لئے بنایا گیا ہے، اس کے بارے میں وقف کے متولی کو کرایہ پر دینے کے علاوہ کوئی

چارہ کار نہیں ہے (اسلام اور جدید معاشی مسائل ۷۸)۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ وجہ فرق خلو (پگڑی) کے مسئلہ میں تو چل سکتی ہے ذاتی مکان و مکان کی کرایہ داری کے مسئلہ میں نہیں چل سکتی۔ کیونکہ مکان و مکان سے حصول منفعت شخصی اور وقف ملکیت دونوں میں یکساں ہے۔ اس لئے رہائش یا فروخت یا مصلحتاً تعطیل بھی منفعت سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا دونوں ملکیتوں میں یکساں حکم جواز دیا جاسکتا ہے۔ اور ذاتی مالک مکان و مکان کو بھی مروجہ کرایہ وصول کرنے کے پورے حق میں سے آدھے حق سے دست بردار ہو کر کم کرایہ پر معاہدہ و مصالحت کر لینے کا بھی حق ہے، جیسا کہ مذکورہ مسئلہ میں وقف کے متولی کو یہ حق حاصل ہے۔

رہ گیا قرض پر حصول منفعت کا رہا ہونا اور اس بنا پر حرمت کا حکم لگانا تو وہ یہاں منفقود ہے، اس لئے کہ قرض پر وہ نفع ممنوع ہے جو عقد قرض کے ساتھ مشروط ہو، لہذا اس سے مقروض کی جانب سے از خود رضا کارانہ طور پر دیا جانے والا نفع ربا کی تعریف سے خارج ہو جاتا ہے۔

قرآن و حدیث کی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں کہ رأس المال پر وصول کی جانے والی کوئی بھی اضافی رقم، خواہ کم ہو یا زیادہ اگر عقد قرض میں مشروط ہوگی تو وہ ربا کہلائے گی، لہذا وہ حرام ہوگی (مفتی محمد تقی عثمانی: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۸۶۶)۔

بیع وفا، مسائل اور احکام

مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی ☆

بیع وفا کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ بائع خریدار سے کہتا ہے کہ آپ کا جو دین مجھ پر ہے، اس کے بدلہ میں یہ سامان میں آپ کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، اس شرط کے ساتھ کہ جب میں آپ کا دین واپس کر دوں گا تو یہ سامان میرا ہو جائے گا، یا بائع یہ کہتا ہے کہ یہ سامان آپ کے ہاتھ اتنی قیمت میں فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ جب میں ثمن آپ کو واپس کر دوں گا تو آپ یہ سامان مجھ کو دیدیں گے۔

”و صورته: أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بدین لك علی علی أنى متی قضیت الدین فهو لی أو يقول البائع: بعثك هذا بكذا متی دفعت لك الثمن تدفع العین الی“ (البحر الرائق ۸/۶، العنایہ ۱۳/۱۵۶)۔

(اس کی صورت یہ ہے کہ بائع خریدار سے کہے کہ میں نے یہ عین آپ سے اس دین کے بدلہ میں فروخت کیا، جو آپ کا میرے اوپر ہے، اس شرط پر کہ جب میں دین ادا کر دوں گا تو یہ عین میری ہو جائے گی، یا بائع کہے کہ یہ آپ سے اتنے میں فروخت کیا جب میں ثمن آپ کو دیدوں گا تو آپ عین مجھ کو دیدیں گے)۔

فقہ حنفی میں بیع وفا کے بارے میں اچھی خاصی تفصیل ملتی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان خاصا اختلاف بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ صاحب ”البحر الرائق“ نے ”بزازیہ“ کے حوالے سے کل آٹھ اقوال نقل کیا ہے اور ہر ایک کی تفصیل ذکر کی ہے۔

دوسرے فقہاء کے یہاں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے، فقہ حنبلی میں اس کو ”بیع الامانہ“ کہتے ہیں، ان کے یہاں یہ عقد باطل ہے، کشاف القناع (۸/۴۰۵) کتاب البیع میں ہے:

”قال الشيخ بیع الأمانة هو الذى مضمونه اتفاقهما أى اتفاق البائع والمشتري علی أن البائع جاء بالثمن أعاد إليه المشتري ملك ذلك ينتفع به أى بالمبيع المشتري بالإجارة والسكنى ونحو

ذلك كركوب ما يركبه وحلبه وهو أى البيع إذن عقد باطل بكل حال ومقصودهما إنما هو الربا بإعطاء دراهم إلى أجل ومنفعة الدار أو نحوهما هي الربح فهو في المعنى قرض بعوض“۔
 (شیخ نے کہا: بیع الامانہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ بائع اور خریدار دونوں اس پر متفق ہوں کہ جب بائع ثمن واپس کرے گا تو خریدار اس کی ملکیت کو لوٹا دے گا، خریدار بیع سے فائدہ اٹھائے گا، خواہ اجارہ پردے، یا رہائش اختیار کرے یا سواری کرے یا دودھ حاصل کرے، یہ عقد بہر حال باطل ہے، دونوں کا مقصد کچھ مدت تک کے لئے دراہم دے کر سود حاصل کرنا ہے، گھر وغیرہ کی منفعت یہی نفع ہے، یہ حقیقت میں قرض با معاوضہ ہے)۔
 بعینہ یہی عبارت بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مطالب اولی النہی (۲۸۶/۷) کتاب البیع اور الاقناع (۵۸/۲) شروط البیع میں بھی ہے۔

فقہ شافعی میں اس کو ”بیع العہدہ“ کہتے ہیں، اگر صلب عقد میں شرط فاسد لگا دی جائے گی تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اس پر بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے، اور اگر بیع سے قبل اس شرط فاسد پر اتفاق کر لیں گے، لیکن بیع میں صرف ایجاب و قبول کریں گے، شرط صرف ان کے دل میں پوشیدہ ہوگی، بیع میں اس کا ذکر نہیں ہوگا، تو امام شافعی کے نزدیک بیع صحیح ہوگی۔
 بعض علماء یمن نے اس کے جواز کا، جبکہ دوسرے بعض نے اس کے بطلان کا فتویٰ دیا ہے، ”الفتاویٰ الفقہیہ الکبریٰ“ میں اس اختلاف پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ عقد میں شرط فاسد کے ہوتے ہوئے اس کو صحیح کہنا یا شرط فاسد کے ذکر کے بغیر اس کو باطل کہنا ناقابل اعتبار ہوگا۔

”وبلغنی عن بعض علماء الیمن أنه أفتی بصحة بیع العہدہ وبعضهم أفتی ببطلانہ واختلافہم عجیب، فإن القول بالصحة عند اقتران الشرط الفاسد بالعقد وبعدهما عند إضماره قول ساقط لا یعول علیہ ولا یلتفت إلیہ بل المنقول فی مذهب الشافعی رضی اللہ عنہ من غیر خلاف یعتد بہ فی ذلک هو ما قررتہ فاعتمده ولا تغتر بما سواہ واللہ سبحانہ وتعالی اعلم“ (الفتاویٰ الفقہیہ الکبریٰ ۱۵۷/۲)۔
 (بعض علماء یمن کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیع العہدہ کے صحیح ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں، جبکہ بعض اس کے باطل ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں، ان کا اختلاف بھی عجیب ہے، اس لئے کہ عقد کے ساتھ فاسد شرط کے ملے ہونے کے وقت اس کو صحیح کہنا اور شرط کے پوشیدہ ہونے کے وقت اس کو باطل کہنا ناقابل بھروسہ اور ناقابل توجہ ہے، بلکہ امام شافعی کے مذہب میں اس سلسلہ میں بلا اختلاف قابل اعتماد قول وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے، لہذا اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے، اس کے علاوہ کسی قول سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے)۔

فقہ مالکی میں اس کو بیع الثنیا کہتے ہیں، اگر ثمن کی واپسی پر بیع کی واپسی کی شرط عقد ہی میں ہو، یا عقد سے قبل دونوں

اس پر متفق ہو جائیں پھر عقد کریں تو یہ بیع فاسد ہوگی، اگرچہ بعد میں اس شرط کو ساقط کر دیں اور اگر عقد کے وقت یا اس سے قبل شرط نہ لگائی جائے، بلکہ مطلق بیع ہو، بیع کے بعد مشتری ثمن کی واپسی پر بیع کے واپس کرنے کا وعدہ کر لے تو یہ بیع صحیح ہو جائے گی، مگر ثمن کی واپسی کے وقت بیع کو واپس کرنا مشتری پر واجب نہ ہوگا، بلکہ مستحب ہوگا، ان کے یہاں بیع فاسد میں اگر مشتری بیع پر قابض ہوگا تو اس کی آمدنی کا مالک ہوگا، اس لئے کہ وہ شیئی اس کے ضمان میں رہتی ہے، حاشیہ دسوقی، حاشیہ صاوی علی الصغیر اور بلفظہ السالک میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، عربی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

”معلوم ہونا چاہئے کہ بیع فاسد میں آمدنی خریدار کی ہوگی اگرچہ بیع الثنیا میں ہو جو راجح قول کے مطابق ممنوع ہے، بیع الثنیا وہی ہے جو مصر میں بیع المعاد کے نام سے مشہور ہے، یعنی بائع خریدار پر یہ شرط لگائے کہ جب وہ ثمن اس کو واپس کر دے گا تو وہ بیع اس کو واپس لوٹا دے گا، لہذا اگر وہ شرط بیع کے وقت لگائی جائے یا عقد کے قبل اس پر دونوں اتفاق کر لیں تو بیع فاسد ہو جائے گی، اگرچہ بعد میں شرط کو ساقط کر دے، اس لئے کہ واضح نہیں ہوگا کہ ثمن قرض ہے یا ثمن ہے... اگر خریدار بیع پر قبضہ کر لے گا اور واپس کرنے سے قبل اس سے آمدنی حاصل کرے گا تو آمدنی اس کی ہوگی اور یہی راجح ہے، اس لئے کہ وہی ضامن ہے... البتہ اگر خریدار بیع کے بعد بطور تبرع بائع سے وعدہ کر لے اور بیع کے لازم ہونے کے بعد اس سے کہے جب تم مجھے ثمن واپس کرو گے تو میں بیع تم کو دیدوں گا، تو بیع صحیح ہو جائے گا، لیکن اس وعدہ کو پورا کرنا خریدار پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ محض مستحب ہوگا“ (حاشیہ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۱۱/۲۹۹-۳۰۰، حاشیہ الصاوی علی الشرح الصغیر ۶/۳۶۷، بلفظہ السالک لا قرب المسالک ۶۵۳)۔

فقہ حنفی میں تفصیلی بحث ملتی ہے، صاحب ”البحر الرائق“ نے ”بزازیہ“ کے حوالہ سے آٹھ اقوال نقل کیا ہے، جیسا کہ اوپر اس کا ذکر ہوا، کچھ لوگوں نے اس کو ناجائز کہا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس کو جائز کہا ہے، عجیب اتفاق ہے کہ جو لوگ اس کو جائز کہتے ہیں وہ اس کو ربو سے بچنے کا حیلہ قرار دیتے ہیں اور جو لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں وہ اس کو ربو کھانے کا حیلہ قرار دیتے ہیں، بعض لوگوں نے تو اس کو مذاق سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نے آٹھویں قول کو جامع قول کہا ہے، اس کو بعض محققین کی رائے قرار دیا ہے، ان کے نام نہیں بتائے ہیں اور ان کی رائے ہے کہ اسی جامع قول کے مطابق فتویٰ دینا چاہئے، اس قول کا حاصل یہ ہے کہ یہ بیع بعض احکام کے اعتبار سے فاسد ہے، جس کا اثر یہ ہے کہ دونوں فریق میں سے ہر ایک کو حق ہوگا کہ اس عقد کو فسخ کر دے، بعض احکام میں صحیح ہے، جس کا اثر یہ ہوگا کہ مشتری کے لئے بیع کے منافع اور آمدنی حلال ہوگی، بعض احکام کے اعتبار سے رہن ہوگا اور مشتری دوسرے سے فروخت نہیں کر سکے گا وغیرہ۔

”القول الثامن الجامع لبعض المحققین أنه فاسد فی حق بعض الأحكام حتی ملک کل منہما

الفسخ وصحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه ولم يملك قطع الشجر ولا هدم البناء وسقط الدين بهلاكه وانقسم الثمن إن دخله نقصان كما في الرهن... وينبغي أن لا يعدل في الإفناء عن القول الجامع“ (المحرر الرائق ۹/۶)۔

(آٹھواں جامع قول جو بعض محققین کا ہے کہ وہ بعض احکام کے اعتبار سے فاسد ہے، چنانچہ دونوں میں سے ہر ایک کو فسخ کرنے کا اختیار ہوگا اور بعض احکام کے اعتبار سے صحیح ہے، جیسے بیع کے منافع اور آمدنی کا حلال ہونا اور بعض احکام کے اعتبار سے رہن ہے، چنانچہ خریدار کسی دوسرے سے فروخت کرنے یا اس کو رہن رکھنے کا مالک نہیں ہوگا، درخت کو کاٹنے اور مکان کو منہدم کرنے کا مالک نہ ہوگا اس کے ہلاک ہونے کی وجہ سے دین ساقط ہو جائے گا، اگر اس میں کوئی نقص ہو جائے تو ثمن کم ہو جائے گا، جیسا کہ رہن میں ہوتا ہے)۔

عاقبتین نے لفظ بیع کا استعمال کیا ہے اور کوئی شرط فاسد نہیں لگائی ہے، اس لئے بعض حضرات کی رائے ہے کہ اسے جائز ہونا چاہئے، مجھ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ کی بازیگری سے حقائق کیسے بدل جائیں گے، شراب کے بوتل پر شربت کا لیبل لگا دینے سے اس کی حقیقت کیسے بدل جائے گی؟

میرے وطن میں سودی قرض کے لینے دینے کے بہت سے طریقے رائج تھے، ان میں سے ایک طریقہ تقریباً تیس برس پہلے یہ تھا کہ مدیون نقد سود دینے کے بجائے اپنی کوئی زمین دائن کے پاس رہن رکھ دیتا تھا، اس کی رجسٹری بھی ہوتی تھی اور اس کو رہن لکھا جاتا تھا، اس کی ایک مدت بھی متعین ہوتی تھی، اس مدت کے گزرنے سے قبل مدیون دین واپس کر کے اپنی زمین واپس نہیں لے سکتا تھا۔ الا یہ کہ دائن بھی راضی ہو، البتہ اس مدت کے گزرنے کے بعد جب چاہتا دین واپس کر سکتا تھا، حکومت نے تقریباً تیس برس قبل ایک قانون بنایا اور ایک مدت مقرر کر دی کہ اتنی مدت تک اگر کسی دائن نے رہن کی زمین سے فائدہ اٹھالیا، تو اس کا دین ساقط ہو جائے گا اور مدیون دین سے بری ہو جائے گا، اس کو دین کا کچھ حصہ واپس کئے بغیر اپنی زمین واپس لینے کا حق ہو جائے گا، چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنی زمین واپس لے لی، اس کے بعد بھی قرض لے کر زمین رہن رکھنے کا رواج رہا، مگر اس کا نام رہن سے بدل کر ”بیع واپسی“ رکھ دیا گیا، اور اس میں مدت کی کوئی تعیین نہیں رہی، یعنی مدیون جب چاہے دین واپس کر کے اپنی زمین لے سکتا ہے، ظاہر ہے، لفظ ”رہن“ کو لفظ ”بیع واپسی“ سے بدل دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل گئی، اور کل اگر وہ رہن کی شکل میں سودی کاروبار تھا تو آج بیع واپسی کی شکل میں سودی کاروبار سے نکل کر حلال کاروبار نہیں ہو جائے گا، چنانچہ جن فقہاء نے اس کو رہن قرار دیا ہے، انہوں نے وضاحت کی ہے کہ عقود میں الفاظ و بیان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ مقاصد و معانی کا اعتبار کیا جائے گا، اسی لئے اگر کفالہ میں اصیل کے بری ہوجانے کی شرط

لگادی جائے تو وہ حوالہ ہوگا، نہ کہ کفالہ اور اگر حوالہ میں اصیل کے بری نہ ہونے کی شرط لگادی جائے تو وہ حوالہ نہیں رہ جائے گا، بلکہ کفالہ ہو جائے گا۔

”دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام“ میں قاعدہ کلیہ ذکر کیا ہے کہ عقود میں الفاظ و بیان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ مقاصد و معانی کا اعتبار ہوگا، اسی وجہ سے بیع الوفاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا۔

”(المادة ۳): العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للألفاظ والمباني، ولذا يجرى حكم الرهن في البيع بالوفاء.....“

(مادہ ۳: عقود میں الفاظ و بیان کے بجائے مقاصد و معانی کا اعتبار کیا جائے گا، اسی وجہ سے بیع الوفاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا)۔

اس کے علاوہ انہوں نے پانچ مثالیں اور بھی دی ہیں جن کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ عقد میں الفاظ و بیان کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ معانی و مقاصد کا اعتبار کیا جائے گا، سب کو ذکر کرنا طوالت کا سبب ہوگا۔

بعض معاصرین نے ثمن کے نقد اور دین ہونے میں فرق کیا ہے، یعنی اگر ثمن نقد ہو اور واپسی کی شرط صلب عقد میں نہ ہو تو یہ بیع و فاء جائز ہے اور اگر ثمن دین ہو، یعنی مشتری کا دین بائع کے ذمہ میں ہو اور اس دین کے بدلہ میں بائع بیع و فاء کرتے تو یہ رہن ہے، ثمن کے نقد یا دین ہونے میں فرق کیوں ہوگا، میں نہیں سمجھ سکا۔

اہل بلخ دین اور اجارہ کے عادی ہو گئے تھے، اہل بخاری طویل اجارہ کے عادی ہو گئے تھے، اور یہ درختوں میں صحیح نہیں ہے، اس لئے وہ بیع و فاء کرنے پر مجبور ہو گئے، لیکن ان کو بیع بات کرنے میں کیا مجبوری تھی، میں نہیں سمجھ سکا، فقہاء کے یہاں اکثر و بیشتر ضرورت و حاجت کا ذکر ملتا ہے، مگر خود ہندوستان میں بیع بات میں کیا دشواری ہے وہ کون سی حاجت و ضرورت ہے جس کی وجہ سے یہاں بیع و فاء کی اجازت دی جائے، ابھی تک مجھ کو سمجھ میں نہیں آیا، بیع سلم کو مثال میں پیش کیا جاتا ہے، بیع سلم کے جواز میں جو مجبوری ہے، وہ تو سمجھ میں آتی ہے، کاشتکار کو کبھی اس کے غلہ کے تیار ہونے سے قبل کوئی ناگہانی ضرورت پیش آ جاتی ہے، اور قرض نہیں ملتا تو بیع سلم پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن زمین کی بیع بات کرنے میں کیا دشواری ہے، وہ بیع و فاء پر مجبور ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ہے، سوائے اس کے کہ ایک آدمی کے پاس ایک ایکڑ زمین ہے اور نہیں چاہتا ہے کہ اس میں سے چند ڈسمل زمین بھی اس کی ملکیت سے نکل جائے، چاہے اس کے لئے اس کو سود ہی کیوں نہ دینا پڑے، اس لئے وہ بیع و فاء کرتا ہے۔

امام نسفی کی طرف جواز و عدم جواز دونوں کی نسبت کی گئی ہے، صاحب ”تبيين الحقائق“ نے ان کی طرف جواز کی نسبت کی ہے۔

”ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعاً جائزاً مفيداً لبعض أحكامه منهم الإمام نجم الدين النسفي فقال: اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه“۔

سمرقند کے بعض مشائخ نے اس کو بیع غیر لازم اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے، انہی میں امام نجم الدین نسفی بھی ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ اس زمانہ کے مشائخ نے متفقہ طور پر اس کو بیع غیر لازم اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے۔
 ”در الحکام شرح غرر الاحکام“ میں ان کی طرف عدم جواز کی نسبت کی گئی ہے۔

”قال الشيخ الإمام نجم الدين النسفي في فتاواه البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بيع الوفاء هو في الحقيقة رهن، وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن“ (در الحکام شرح غرر الاحکام ۶/۴۳۷)۔

(امام نجم الدین نسفی نے اپنے فتویٰ میں کہا ہے کہ ہمارے اہل زمانہ میں ربا سے بچنے کے لئے جو بیع متعارف ہے، جس کا نام انہوں نے بیع وفا رکھا ہے، یہ درحقیقت رهن ہے اور خریدار کے قبضہ میں بیع ایسی ہی ہے جیسے مرتهن کے قبضہ میں رهن ہوتا ہے)۔

پھر تفصیل کے ساتھ اس کے رهن ہونے کی وجہ اور اس کا حکم ذکر کیا ہے۔
 ”الحیظ البرہانی“ میں فتاویٰ نسفی سے عدم جواز ہی منقول ہے۔

”وفي فتاوى النسفي أن البيع الذي تعارف (عليه) أهل سمرقند وسموه بيع الوفاء تحرزاً عن الربا في الحقيقة رهن، والمبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن“۔

(فتاویٰ نسفی میں ہے کہ وہ بیع جو اہل سمرقند کے یہاں متعارف ہے، جس کا نام انہوں نے سود سے بچنے کے لئے بیع وفاء رکھا ہے، حقیقت میں رهن ہے، خریدار کے قبضہ میں بیع کی وہی حیثیت ہے جو مرتهن کے قبضہ میں رهن کی ہوتی ہے)۔
 علامہ شامی کا رجحان بھی عدم جواز کی طرف ہی ہے۔

”قلت: ينبغى لزومها على المشتري فقط على القول الذى عليه العمل الآن من أن بيع الوفاء منزل منزلة الرهن وعليه، فيكون الثمن دينا على البائع“ (رد المحتار ۲/۲۶۱، مطلب في زكوة ثمن السلمج وفاء ۱)۔
 (میں کہتا ہوں کہ اس قول کے مطابق جس پر آج کل عمل ہے کہ بیع وفاء رهن کے درجہ میں ہے اور ثمن بائع پر دین ہے، مناسب ہے کہ زکوٰۃ صرف خریدار پر واجب ہو)۔

میرے نزدیک ان فقہاء کی رائے راجح ہے، جو بیع وفاء کو رهن قرار دیتے ہیں، البتہ رهن کی اجازت سے مرتهن کے لئے شیئی مرهون سے استفادہ کو صحیح قرار دینا، موجودہ حالات میں جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ شیئی مرهون سے مرتهن کے لئے

استفادہ اس وقت جائز ہوتا ہے، جبکہ استفادہ کی شرط عقد میں نہ ہو یہاں تو یہ عقد شہی مرہون سے فائدہ حاصل کرنے ہی کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے راہن کی اجازت سے بھی مرہن کے لئے شہی مرہون سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہ ہوگا۔

”قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع، والله تعالى أعلم“
(حاشیۃ الطحاوی علی الدر المختار ۳/۲۳۶)۔

(میں کہتا ہوں، کہ آج کل اکثر لوگ رہن رکھتے وقت اس سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر فائدہ حاصل کرنا ہو تو وہ قرض دیں گے ہی نہیں، اور یہ شرط کے درجے میں ہے، اس لئے کہ مشہور قاعدہ ہے: ”المعروف كالمشروط“ یعنی جس چیز کا رواج عام ہو جائے وہ شرط کے درجے میں ہے، اس سے ناجائز ہونے کی تائید ہوتی ہے)۔

ان تفصیلات کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

- ۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے دراصل بیع نہیں ہے۔
- الف، ب، د- جب یہ بیع نہیں ہے، بلکہ رہن ہے تو فروخت کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔
- ج- خریدار کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے، عام طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ مرہن، راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن اس قول کا تعلق اس صورت سے ہے، جبکہ فائدہ اٹھانا مشروط نہ ہو، یہ معاملہ تو شہی مرہون سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہی کیا جاتا ہے، اس لئے راہن کی اجازت سے بھی فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔
- ۲- وہ رہن ہے۔

الف- اس کا حکم اوپر ”ج“ میں گذر چکا۔

ب- جائز نہ ہوگی، یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہے، جو باہے اور حرام ہے۔

ج- نہیں۔

۳- زر ضمانت کے نام پر لی گئی رقم دراصل رہن نہیں ہے، بلکہ بیع و فاء کی طرح قرض سے فائدہ اٹھانے کی ایک صورت ہے، اس لئے کہ کرایہ دار کو اگر مناسب کرایہ سے کم کرایہ پر مکان نہ دیا جائے تو ضمانت کے نام پر اتنی بڑی رقم وہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوگا، اسی طرح اگر مالک مکان کو روپیہ نہ دیا جائے، بلکہ اس رقم سے زائد قیمت کا زیور دے دیا جائے، تاکہ وہ اس کو اپنے پاس محفوظ رکھے تو وہ مکان کا کرایہ کم نہیں کرے گا، الغرض مالک مکان زر ضمانت کے نام سے رقم لے کر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی لئے اس کے بدلے میں کم کرایہ پر مکان فراہم کرتا ہے اور کرایہ دار موٹی رقم فراہم کرتا ہے اور اس کے بدلے میں کم قیمت پر مکان حاصل کرتا ہے، اس لئے یہ: ”کل قرض جور نفعاً“ میں داخل ہو کر سود ہے اور حرام ہے۔

بیع الوفاء کی شرعی حیثیت

مفتی شبیر احمد قاسمی ☆

بیع الوفاء کے اسماء:

اس عقد کو حسب ذیل ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے:

(۱) بیع الوفاء (۲) بیع الامانت (۳) بیع الاطاعت (۴) بیع المعاملہ (۵) البیع الجائز (۶) بیع الرهن اور الرهن

المعاد رکھا ہے۔

یہ چھ نام ہمارے سامنے ہیں، حضرات فقہاء نے ان مختلف وجوہات کی بناء پر اپنے اپنے طور پر اس عقد کو مختلف

ناموں سے موسوم کیا ہے اور ان ناموں کی وجہ تسمیہ بھی پیش کی ہے، چنانچہ ”در مختار“ میں ہے:

”وَبَيْعُ الْوَفَاءِ صُورَتُهُ أَنْ يَبِيعَهُ الْعَيْنُ بِالْفِ عِلَىٰ أَنَّهُ إِذَا رَدَّ عَلَيْهِ الثَّمَنَ رَدَّ عَلَيْهِ الْعَيْنَ وَسَمَاءُ الشَّافِعِيَّةِ الرَّهْنُ الْمُعَادَ، وَيُسَمَّى بِمِصْرَ بَيْعِ الْأَمَانَةِ وَبِالشَّامِ بَيْعِ الْإِطَاعَةِ (وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَّةِ) وَوَجْهُ تَسْمِيَّتِهِ بَيْعُ الْوَفَاءِ أَنَّ فِيهِ عَهْدًا بِالْوَفَاءِ مِنَ الْمُشْتَرِي بِأَنْ يَرُدَّ الْمَبِيعَ عَلَى الْبَائِعِ حِينَ رَدَّ الثَّمَنَ، وَبَعْضُ الْفُقَهَاءِ يُسَمِّيهِ الْبَيْعَ الْجَائِزَ وَلَعَلَّهُ مَبْنِيٌّ عَلَىٰ أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيحٌ لِحَاجَةِ التَّخْلِصِ مِنَ الرِّبَا حَتَّىٰ يَسُوِّغَ لِلْمُشْتَرِي أَكْلَ رِبْعِهِ وَبَعْضُهُمْ يُسَمِّيهِ بَيْعَ الْمُعَامَلَةِ وَوَجْهُهُ أَنَّ الْمُعَامَلَةَ رِبْحُ الدِّينِ وَهَذَا يَشْتَرِيهِ الدَّائِنُ لِيَنْتَفِعَ بِهِ بِمُقَابَلَةِ دَيْنِهِ (وَقَوْلُهُ) بَيْعُ الْأَمَانَةِ وَوَجْهُهُ أَنَّهُ أَمَانَةٌ عِنْدَ الْمُشْتَرِي (وَقَوْلُهُ) وَفِي بَعْضِهَا بَيْعُ الطَّاعَةِ وَهُوَ الْمَشْهُورُ الْآنَ فِي بِلَادِنَا“

(اور بیع الوفاء اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری کے ہاتھ عین بیع کو بیچے مثلاً ایک ہزار عرض میں اس شرط کے ساتھ کہ

جب ثمن واپس کر دے گا تو عین بیع بھی واپس کر دے گا، اور شافعیہ نے اس کا نام ”الرهن المعاد“ رکھا ہے، اہل مصر نے اس کا

نام ”بیع الامانت“ رکھا ہے، اور اہل شام نے اس کا نام ”بیع الاطاعت“ رکھا ہے، اس کے نیچے شامی میں ہے کہ اس کا ”بیع الوفاء“

نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں مشتری سے وفاداری کا عہد کیا جاتا ہے، بایں طور کہ مشتری بیع کو واپس کر دے گا جس

وقت بائع ثمن واپس کر دے گا، اور بعض فقہاء نے اس کا نام ”البيع الجائز“ اور ”البيع الصحیح“ رکھا ہے، اور شاید اس کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ عقد بیع ربا سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے صحیح اور جائز ہے، یہاں تک کہ مشتری کے لئے اس کا نفع کھانے کی گنجائش ہے اور بعض فقہاء نے اس کا نام ”بیع المعاملہ“ رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دین سے نفع اٹھانے کا معاملہ پایا گیا اور یہ اس طور پر ہے کہ قرض دینے والے نے بیع کو خریدنا ہے؛ تاکہ اپنے دین کے مقابلہ میں اس بیع سے نفع اٹھائے، اور ”بیع الامانۃ“ اس کا نام اس لئے ہے کہ بیع مشتری کے پاس بطور امانت رہتی ہے اور بعض نسخوں میں ”بیع الطائفة“ ہے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ ہمارے بلاد میں اس وقت یہی مشہور ہے۔

اور ”الاشاہ والنظار“ میں ہے کہ:

”وَمِنْ هَذَا الْقَبِيلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمَّى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَازُهُ مَشَافِئُ بَلْخٍ وَبُخَارَى تَوْسِعَةً“ (الاشاہ

والنظار قدیم ۱۳۰)۔

(اور اسی قبیل سے ہے، بیع الامانۃ جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری نے لوگوں سے تنگی

کو دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔)

بیع الوفاء کی حقیقت:

کوئی شخص صاحب ضرورت ہے اس کو روپیہ کی ضرورت ہے، اور کہیں سے ادھار بھی نہیں ملتا، اور اس کے پاس مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ موجود ہے، اور اس کو رہن میں رکھ کر روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر رہن میں رکھنے کی صورت میں مرتہن اس سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے کوئی شخص رہن رکھ کر بھی قرض دینے پر تیار نہیں، اور صاحب جائیداد اس ضرورت کی وجہ سے اپنی ہمیشہ کی جائیداد کو بالکل فروخت کرنا بھی چاہتا، تو اس طرح حاجت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے فقہاء نے عقد کی ایک نئی شکل نکالی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ صاحب ضرورت شخص اس طرح فروخت کرے کہ فروخت شدہ جائیداد مشتری کے پاس من کل الوجہ امانت تو نہیں، مگر مثل امانت کے ہوگی، کہ مشتری اس سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے، مگر اس کو فروخت نہیں کر سکتا۔ اور فائدہ اٹھانے کا سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک بائع لی ہوئی رقم واپس نہ کر دے، اور جب بائع رقم واپس کر دے گا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ اتنی ہی رقم لے کر جائیداد واپس کر دے جتنی میں بائع نے مشتری کو دیا تھا۔

علامہ ابن نجیم مصری: ”الحمر المراتق“ اور علامہ فخر الدین زلیعی ”تبيين الحقائق“ میں اس عقد کی نوعیت کو ان الفاظ

میں نقل فرماتے ہیں:

”وَصُورَتُهُ أَنْ يَقُولَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِي بِعْتُ مِنْكَ هَذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَكَ عَلَيَّ عَلَيَّ أَنِّي مَتَّى

قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِي أَوْ يَقُولَ الْبَائِعُ بَعْتُ هَذَا بِكَذَا عَلَى أَنِّي مَتَى دَفَعْتُ الثَّمَنَ تَدَفُّعَ الْعَيْنِ إِلَيَّ الْخُ“
(المحررات كراچی ۷/۶، زیلعی ۵/۱۸۳، ایضاح النوادر ۱/۶۹)۔

(اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع مشتری سے یوں کہہ دے کہ میں تیرے ہاتھ یہ شیء اس قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں جو تیرا میرے اوپر لازم ہے، اس شرط پر کہ جب میں قرض ادا کر دوں گا تو وہ شیء میری ہو جائے گی، یا یوں کہہ دے کہ یہ شیء اتنے میں اس شرط کے ساتھ تیرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں کہ جب میں ٹمن واپس دے دوں گا تو وہ شیء مجھ کو واپس کر دے گا)۔

بیع الوفاء کا جواز:

اس عقد کے جواز اور عدم جواز میں فقہاء متاخرین میں دو فریق ہو گئے ہیں:

فریق اول:

حضرت امام ظہیر الدین اور صدر الشہید اور تاج الاسلام وغیرہ نے شرط فاسد کی وجہ سے اس عقد کو فاسد قرار دیا ہے، اور امام ابو شجاع، امام علی سعیدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی وغیرہ نے اس عقد کو رہن کی طرح اور رہن کے حکم میں قرار دیا ہے، اور مرتہن کے لئے رہن سے انتفاع جائز نہیں ہے، اور بیع الوفاء میں مشتری بیع سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے یہ عقد ان کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ زیلعی اس کو ان الفاظ سے نقل فرماتے ہیں:

”مِنْهُمْ الْإِمَامُ ظَهِيرُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيدُ حَسَامُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ السَّعِيدُ تَاجُ الْإِسْلَامِ فَجَعَلُوهُ فَاسِدًا بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ (إِلَى قَوْلِهِ): وَمِنْهُمْ مَنْ جَعَلَهُ رَهْنًا، مِنْهُمْ السَّيِّدُ الْإِمَامُ أَبُو شُجَاعٍ وَالْإِمَامُ عَلِيُّ السَّعْدِيِّ وَالْإِمَامُ الْقَاضِي أَبُو الْحَسَنِ الْمَاتَرِيدِيُّ قَالُوا: لَمَّا شُرِّطَ عَلَيْهِ أَخْذُهُ عِنْدَ قَضَاءِ الدَّيْنِ أَتَى بِمَعْنَى الرَّهْنِ (إِلَى قَوْلِهِ)، فَإِذَا كَانَ رَهْنًا لَا يَمْلِكُهُ وَلَا يَنْتَفِعُ بِهِ“ (زیلعی ۵/۱۵۳)۔

فقہاء میں سے امام ظہیر الدین، صدر الشہید امام حسام الدین اور صدر السعید تاج الاسلام نے اس کو فسخ کی شرط کی وجہ سے عقد فاسد قرار دیا ہے۔ (زیلعی فرماتے ہیں) اور فقہاء میں سے جن لوگوں نے اس کو رہن قرار دیا ہے ان میں سید امام ابو شجاع اور امام علی سعیدی اور امام ابوالحسن ماتریدی وغیرہ شامل ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ جب قضاء دین کے وقت واپسی کی شرط لگائی ہے، تو یہ عقد رہن کا معنی ادا کرتا ہے۔ پس جب رہن ثابت ہوگا تو مرتہن اس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ ہی اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

فریقِ ثانی:

مشائخِ سمرقند اور مشائخِ بلخ اور مشائخِ بخاری نے مفلسین اور حاجت مندوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بیعِ الوفاء کو جائز قرار دیا ہے، اور امام نجم الدین نسفی نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانہ کے تمام مشائخ نے متفق ہو کر اس معاملہ کو جائز قرار دیتے ہوئے بہت سے احکامِ بیع کے لئے مفید ثابت کیا ہے۔

اور صاحبِ نہایہ نے اس کے جواز کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے، اور علامہ زین الدین ابن نجیم مصری نے دیون کی کثرت کے زمانہ میں بیعِ الوفاء کی صحت و جواز پر فتویٰ کا حکم فرمایا ہے۔

”وَمِنْ مَشَائِخِ سَمَرْقَنْدٍ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَمِنْهُمْ الْإِمَامُ نَجْمُ الدِّينِ النَّسْفِيُّ فَقَالَ اتَّفَقَ مَشَائِخُنَا فِي هَذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْإِنْتِفَاعُ بِهِ دُونَ الْبَعْضِ وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيهِ (إِلَى قَوْلِهِ): وَقَالَ صَاحِبُ النَّهَائِيَةِ: وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى“
(تبيين الحقائق ۱۸۳/۵، ايضاح النوادر ۷۱/۷۱)

(اور مشائخِ سمرقند میں سے وہ مشائخ بھی ہیں جو اس بیع کو جائز قرار دیتے ہیں، جو بعض احکامِ بیع کے لئے مفید ہے، اور ان میں سے امام نجم الدین نسفی نے کہا کہ اس زمانہ کے مشائخ اس عقد کے جواز پر متفق ہیں، یہ عقد بعض احکام کو مفید ہے، مثلاً بیع سے انتفاع حاصل کرنا اور بعض کو مفید نہیں (مثلاً فروختگی کے عدم جواز) اور یہ عقد لوگوں کی ضرورت اور تعامل کی وجہ سے جائز ہے اور صاحبِ نہایہ نے کہا ہے کہ اس کے جواز ہی پر فتویٰ ہے)۔

اور علامہ ابن نجیم مصری الاشہاء میں اس کے جواز کو ان الفاظ میں بھی نقل فرماتے ہیں:

”وَمِنْ هَذَا الْقَبِيلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمَّى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَازُهُ مَشَائِخُ بُلْخِ وَبُخَارَى تَوْسِعَةً لِنَحْ“
(الاشہاء والنظار قدیم ۱۳۰)

(اور اسی قبیل میں سے بیعِ الامانت ہے، جس کو بیعِ الوفاء کہا جاتا ہے، اس کو مشائخِ بلخ و مشائخِ بخاری نے لوگوں کے لئے وسعت دیتے ہوئے جائز قرار دیا ہے)۔

”وَمِنْهَا الْإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِينَ كَثُرَ الدِّينُ عَلَى أَهْلِ بُخَارَى، وَهَكَذَا بِمِصْرَ وَسَمُوهُ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّونَهُ الرَّهْنَ الْمَعَادَ“ (الاشہاء والنظار قدیم ۱۳۹، انوار رحمت ۲۱۵-۲۱۹)

(اور ان میں سے بیعِ الوفاء کی صحت پر فتویٰ ہے، جب اہل بخاری پر دیون کا سلسلہ زیادہ ہو گیا تھا، اور اسی طرح مصر میں بھی جواز کا فتویٰ ہے اور اس کو بیعِ الامانت کہا جاتا ہے اور شافعیہ نے اس کا نام ”رہن معاد رکھا ہے)۔

مناسب و معتدل کا حکم

اب معلوم ہوا کہ بیعِ الوفاء کے جواز و عدم جواز میں فقہاء متاخرین اور اساطین امت کے مابین اختلاف واقع ہو چکا

ہے، اور دونوں طرف ایسے ایسے فقہاء ہیں جن کے قول ورائے کو دلیل شرعی مانا جاتا ہے، اور لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس جواز کے قائلین کے موافق ہے۔ اور تعاملِ ناس اور عرف کو شرعی طور پر ”الثَّابِتُ بِالْعُرْفِ كَالثَّابِتِ بِالنَّصِّ“ (عقود رسم المفتی ۹۴) کے قاعدہ سے حجت شرعیہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں فریقِ اول کے دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصولاً عدمِ جواز کو ثابت کیا ہے، اور بوقتِ ضرورت فریقِ ثانی کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۱۰۷/۳)۔

اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوریؒ نے ”فتاویٰ خلیلیہ“ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے؛ تاکہ فقہاء متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے (مستفاد: فتاویٰ خلیلیہ ۳۹۵/۱، ایضاح النوادر ۱/۳۷)۔ اس لئے ضرورت اور حاجتِ ناس کی وجہ سے مشائخِ سمرقند اور مشائخِ بلخ اور مشائخِ بخاری اور امام نجم الدین نسفیؒ اور صاحب نہایہ وغیرہم کے فتویٰ کے مطابق اس زمانہ میں بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا۔

بیع الوفاء کے بارے میں مفصل بحث اور فقہاء کی آراء:

بیع الوفاء کو فقہی نقطہ نظر سے کس اصول اور ضابطہ کے دائرہ میں داخل کیا جائے؟ تو اس سلسلہ میں فقہاء متاخرین کے مختلف نظریات اور مختلف اقوال پر غور کرنے کے بعد حضراتِ فقہاء کے سات فریق اور سات اقوال و آراء ہمارے سامنے ہیں، جن کو ترتیب وار یہاں پر درج کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

فریقِ اول بیع صحیح کے قائلین

مشائخِ بلخ اور مشائخِ بخاری نے بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ جاری فرمایا ہے اور مشائخِ سمرقند میں سے امام نجم الدین نسفیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کو لوگوں کی ضرورت اور اس میں تعامل کی وجہ سے بیع صحیح کے اصول و ضابطہ کے دائرہ میں داخل کر کے صحیح قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ زمانہ کے تمام مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ایسی بیع ہے جو جائز ہے اور بہت سے احکامِ بیع کو محیط اور مفید ہے، اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا ہے، اور امام زلیعیؒ نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ اور علامہ ابن نجیمؒ نے ”الاشباہ“ میں بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے اور اس کی صحت پر فتویٰ نقل فرمایا ہے؛ لہذا بیع الوفاء شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔ حضراتِ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

”وَمِنْ مَشَائِخِ سَمَرْقَنْدٍ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ مِنْهُمْ الْإِمَامُ نَجْمُ الدِّينِ النَّسْفِيُّ فَقَالَ اتَّفَقَ مَشَائِخُنَا فِي هَذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوهُ بَيْعًا جَائِزًا مُفِيدًا بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْإِتِّفَاعُ بِهِ دُونَ

الْبَعْضِ وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامَلِيهِمْ فِيهِ وَالْقَوَاعِدُ قَدْ تَتَرَكُ بِالْتَّعَامُلِ وَجُوزَ الْإِسْتِصْنَاعِ
لِذَلِكَ وَقَالَ صَاحِبُ النَّهَائِيَةِ“

اور مشائخ سمرقند میں سے کچھ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اس کو بیع صحیح اور بیع جائز کے دائرہ میں داخل کیا ہے، جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، انہیں مشائخ میں سے امام نجم الدین نسفی ہیں، پس وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے مشائخ نے متفق ہو کر اس بیع کو جائز قرار دیا ہے جو عقد بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اور وہ اس بیع کے بعض منافع سے فائدہ اٹھانا ہے، بعض سے نہیں (جیسا کہ مشتری اس کو بیچ نہیں سکتا) اور لوگوں کے اس بیع کی ضرورت ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کے اس میں تعامل ہونے کی وجہ سے اس بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے، اور کبھی تعامل ناس کی وجہ سے

”وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى“ (تبيين الحقائق قدیم ۱۸۳/۵-۱۸۳۰)۔

قواعد وضوابط کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بیع استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے اور صاحب نہایہ نے کہا کہ اس کے بیع صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔

اور علامہ شامی نے اس کے بیع صحیح ہونے کو زلیعی کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، نیز علامہ ابن نجیم مصری نے بھی اسی طرح کے الفاظ نقل فرمائے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

”أَنَّ بَيْعَ صَاحِبِ يَفِيدُ لِبَعْضِ أَحْكَامِهِ مِنْ حِلِّ الْإِنْتِفَاعِ بِهِ إِلَّا أَنَّهُ لَا يَمْلِكُ بَيْعَهُ، قَالَ الزَّيْلَعِيُّ فِي الْإِكْرَاهِ: وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى“ (شامی زکریا ۵۳۶/۷، کراچی ۲۷۷/۵، و ہذا فی البحر الرائق کوئٹہ ۷/۶، زکریا ۱۲/۶)۔

(بے شک یہ بیع صحیح ہے جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اس کے ذریعہ نفع کے حلال ہونے کی وجہ سے، مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا مالک نہیں ہوگا، زلیعی نے کتاب الاکراہ میں فرمایا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے)۔

”الاشباه والنظائر“ میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

”وَمِنْ هَذَا الْقَبِيلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمَّى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَائِخُ بَلْخِ وَبُخَارَى تَوْسِعَةً“ (الاشباه والنظائر قدیم ۱۳۰)۔

(اور اسی قبیل سے بیع الامانہ ہے جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری نے لوگوں سے تنگی دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے)۔

اور ”الاشباه والنظائر“ میں دوسری جگہ صاف الفاظ کے ساتھ مذکور ہے کہ بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔

ملاحظہ فرمائیے:

”وَمِنْهَا الْإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِينَ كَثُرَ الدَّيْنُ عَلَى أَهْلِ بُخَارَى، وَهَكَذَا بِمِصْرَ، وَقَدْ سَمَّوْهُ

بَيْعُ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّونَهُ الرَّهْنَ الْمَعَادَ“ (الاشباه والنظائر قدیم ۱۳۹)۔

(اسی قبیل میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ جاری کرنا ہے جس وقت اہل بخاری پر دیون کی کثرت ہو گئی تھی اور ایسا ہی مصر میں ہوا ہے اور یقیناً اس کا نام مشائخ مصر نے بیع الامانۃ رکھا ہے اور شوافع نے اس کا نام ”الرهن المعاد“ رکھا ہے۔)

فریقِ ثانی بیعِ فاسد کے قائلین

امام ظہیر الدین ابو بکر محمد بن احمد البخاری اور امام شہاب الدین احمد الحلی و غیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء میں مقتضائے عقد کے خلاف شرطِ فاسد پائی جاتی ہے، اس لئے بیع الوفاء کو بیعِ فاسد کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل کیا جائے گا اور بائع کے ثمن اور دین کی واپسی کے موقع پر بیع کی واپسی کو بیعِ فاسد کے اصول و ضوابط کے مطابق واجب الاسترداد قرار دیا جائے گا؛ لہذا اس کا حکم تمام بیوعِ فاسدہ کے حکم کی طرح ہوگا، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ نے عقد بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

”وَاخْتَارَهُ الْإِمَامُ ظَهِيرُ الدِّينِ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ فَلَوْ تَبَايَعَا ثُمَّ قَالَ أَحَدُهُمَا: ”چون سیم آدمی بیع بمن بازده“
فَقَالَ: نَعَمْ لَا يَفْسُدُ الْبَيْعُ، أَمَا لَوْ شَرَطَاهُ فِي الْبَيْعِ يَفْسُدُ“۔ (الجامع الوجيز للبرازي على الهندية ۳/۴۰۷)۔

(اسی کو امام ظہیر الدین نے اختیار فرمایا ہے بایں طور پر کہ یہ بیعِ فاسد ہے؛ لہذا اگر طرفین نے عقد کر لیا ہے، پھر ان میں سے ایک نے کہا جب میں ثمن لا کر کے واپس کر دوں گا تو میری بیع مجھے واپس کر دینا، دوسرے نے کہا جی ہاں! تو بیعِ فاسد نہیں ہوگی، بہر حال اگر دونوں نے عقد بیع میں اس کی شرط لگا دی ہے تو بیعِ فاسد ہو جائے گی)۔

”وَالْأَصْحَحُ عِنْدِي أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ يُوجِبُ الْمَلِكَ بَعْدَ الْقَبْضِ وَحُكْمُهُ حُكْمُ سَائِرِ الْبَيْعَاتِ الْفَاسِدَةِ؛ لِأَنَّهُ بَيْعٌ بِشَرْطٍ لَا يَفْتَضِيهِ الْعَقْدُ، وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ بَيْعٍ وَشَرْطٍ الْخ“
(حاشیہ شلمی علی تبیین الحقائق ۵/۱۸۳)۔

(اور زیادہ صحیح میرے نزدیک یہی ہے کہ بیع الوفاء بیعِ فاسد ہے جو قبضہ کے بعد ملکیت کو لازم کرتا ہے اور اس کا حکم تمام بیوعِ فاسدہ کی طرح ہے؛ اس لئے کہ یہ بیع ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا، حالانکہ حضور ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے)۔

فریقِ ثالث بیع صحیح یا بیعِ فاسد کے قائلین

امام فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی و غیرہ نے فرمایا کہ بیع الوفاء رہن کے دائرہ میں نہیں ہو سکتی؛ بلکہ صحیح بات یہی

ہے کہ وہ عقد بیع ہی کے دائرہ میں داخل ہوگی؛ لہذا اگر صلب عقد میں اس بات کی شرط لگائی ہے کہ ثمن کی واپسی پر بیع بھی واپس ہو جائے گی تو صلب عقد میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی، اس لئے حضرات صاحبین فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع فاسد کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل ہے، اور اگر صلب عقد میں شرط نہیں لگائی ہے؛ بلکہ اولاً بغیر شرط کے عقد بیع وجود میں آجائے پھر اس کے بعد آپس کی تراضی سے اس بات کی شرط لگا دی جائے کہ ثمن کی واپسی پر بیع کی واپسی لازم ہو جائے گی تو ایسی صورت میں چونکہ صلب عقد میں شرط فاسد نہیں پائی گئی ہے، اس لئے یہ عقد بیع صحیح کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگا، اور وعدہ کے مطابق ثمن کی واپسی پر بیع کا استرداد لازم ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء کی حسب ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے:

”وَالصَّحِيحُ أَنَّ الْعَقْدَ الَّذِي جَرَى بَيْنَهُمَا إِنْ كَانَ بِلَفْظِ الْبَيْعِ لَا يَكُونُ رَهْنًا ثُمَّ يُنْظَرُ إِنْ ذَكَرَا شَرْطَ الْفَسْخِ فِي الْبَيْعِ فَسَدَ الْبَيْعُ، وَإِنْ لَمْ يَذْكُرَا ذَلِكَ فِي الْبَيْعِ وَتَلَفَّظَا بِلَفْظِ الْبَيْعِ بِشَرْطِ الْوَفَاءِ أَوْ تَلَفَّظَا بِالْمَبِيعِ الْجَائِزِ وَعِنْدَهُمَا هَذَا الْبَيْعُ عِبَارَةٌ عَنْ بَيْعٍ غَيْرِ لَازِمٍ، فَكَذَلِكَ وَلَفْظَةُ صَاحِبِ الْبَحْرِ، فَالْبَيْعُ فَاسِدٌ، وَإِنْ ذَكَرَا الْبَيْعَ بِلا شَرْطٍ، ثُمَّ شَرَطَاهُ عَلَى وَجْهِ الْمَوَاعِدَةِ جَازَ الْبَيْعُ وَلَزِمَ الْوَفَاءُ وَقَدْ يَلْزِمُ الْوَعْدُ لِحَاجَةِ النَّاسِ فِرَاراً مِنَ الرَّبَا“ (قاضی خان علی الہندیہ ۱۶۵/۲، تبیین الحقائق للریعی ۱۸۳/۵، المحررات بق کوئٹہ ۸/۶، فتاویٰ بزاز علی الہندیہ ۴۰۶/۲)۔

(اور صحیح یہی ہے کہ بے شک وہ ایسا عقد ہے جو متعاقدین کے درمیان میں جاری ہوا ہے، اگر لفظ بیع کے ساتھ عقد ہوا ہے تو وہ رہن نہیں ہو سکتا، پھر دیکھا جائے کہ اگر صلب عقد میں نسخ کی شرط کا ذکر کیا ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی، اور اگر صلب عقد میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا ہے اور دونوں نے لفظ بیع کا تلفظ وفا کی شرط کے ساتھ کیا ہے، یا دونوں نے بیع جائز کے ساتھ تلفظ کیا ہے اور ایسی بیع کا نام حضرات صاحبین کے نزدیک بیع غیر لازم ہے، تو بھی ایسا ہی حکم ہوگا اور صاحب بحر کے الفاظ یہ ہیں کہ ایسی صورت میں بیع فاسد ہو جائے گی اور اگر بغیر شرط کے دونوں نے عقد میں لفظ بیع کا ذکر کیا ہے، پھر اس کے بعد معاہدہ کے طور پر وفا کی شرط لگائی ہے تو بیع جائز اور صحیح ہو جائے گی اور وفا بھی لازم ہو جائے گی، اور کبھی سود سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وعدہ کا پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے)۔

فریق رابع رہن کے حکم کے قائلین

امام سید ابوشجاع اور امام ابو الحسن علی السغدی اور امام قاضی ابوالحسن الماتریدی اور ائمہ خوارزم اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ وغیرہ بیع الوفاء کو رہن کے اصول و ضابطہ کے دائرہ میں داخل کرتے ہیں، اور اس کو رہن ہی تسلیم کرتے ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ ائمہ خوارزم بعض شرائط کے ساتھ رہن تسلیم کرتے ہیں اور امام سیف الدین عصبہ علی الاطلاق اس کو

رہن تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ امام ابو شجاع اور قاضی ابوالحسن علی سعیدی بھی بیع الوفاء کو علی الاطلاق رہن کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل کر کے اس کے اوپر رہن کے حکم کی طرح حکم لگاتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا اور بیع سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا مشتری کے لئے جائز نہیں ہوگا؛ البتہ رہن کی طرح مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانا جائز ہو سکتا ہے، اور رہن کی طرح بیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے دین بھی ساقط ہو جائے گا؛ لیکن ائمہ خوارزم اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ مشروط کرتے ہیں:

(۱) بوقت عقد بیع مطلق رکھی جائے اور بوقت واپسی جب بائع ثمن لے کر حاضر ہو جائے گا تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنا دے۔

(۲) بیع مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہو جائے کہ جب بائع ثمن لے کر آئے گا تو خود بخود بیع فسخ ہو جائے گی۔

(۳) عقد کے بعد مشتری اصل مال پر نفع کی شرط لگا دے تو ان تینوں صورتوں میں ائمہ خوارزم بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیتے ہیں۔

اور یہ حضرات بیع الوفاء کو رہن کے حکم میں قرار دینے میں حسب ذیل نظائر پیش کرتے ہیں:

(۱) اس بیع میں مشتری کو بیع کی فروختگی کا حق نہیں۔

(۲) بیع کو دوسرے کے ہاتھ رہن میں رکھنے کا حق نہیں۔

(۳) بیع اگر باغ ہے تو اس کے درختوں کو کاٹنے کا حق نہیں۔

(۴) بیع اگر عمارت ہے تو منہدم کرنے کا حق نہیں۔

(۵) مشتری کے ہاتھ میں اگر بیع ہلاک ہو جائے تو ثمن اور دین ساقط ہو جاتا ہے؛ لہذا بائع سے ثمن کی واپسی کا

مطالبہ نہیں کر سکتا۔

(۶) اگر بیع میں نقصان اور کمی آجائے تو رہن کی طرح ثمن اور دین طرفین کے درمیان نقصان کے تناسب سے تقسیم

ہو جاتا ہے (بزازیہ ۲۰۹/۴)۔

(۷) جس طرح معاملہ رہن میں مرتہن کے مال رہن کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینے پر رہن کو یہ حق حاصل

ہو جاتا ہے کہ بیع باطل کر کے مال رہن کو اپنے قبضہ میں لے لے، اسی طرح بیع الوفاء میں بھی مشتری جب بیع کو دوسرے کے

ہاتھ فروخت کر دے گا تو مالک کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ بیع ثانی کو باطل کر کے مشتری ثانی سے مال بیع اپنے قبضہ میں لے

لے، ہاں البتہ یہ بات الگ ہے کہ مرتہن کو اپنے قرض کے وصول ہونے تک لوٹ کر مال رہن کو اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے،

اسی طرح بیع الوفاء میں بھی مالک کے قبضہ میں پہنچ جانے کے بعد مشتری اول کو اپنے ثمن کے وصول ہونے تک مالک سے مال

بیع اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے (بزازیہ ۴۰۶/۳، شامی زکریا ۵۳۸)۔

ان تمام نظائر کی وجہ سے ان حضرات نے اس کو رہن کے اصول و ضابطہ کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے، اور ان لوگوں کی رائے کے مطابق مشتری بائع کی اجازت کے بغیر مال بیع سے کوئی فائدہ اٹھانہیں سکتا۔ جو حسب ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

”قَالَ أَكْثَرُ الْمَشَايخِ مِنْهُمْ السَّيِّدُ الْإِمَامُ أَبُو شُجَاعٍ وَالْقَاضِي الْإِمَامُ أَبُو الْحَسَنِ عَلِي السُّعْدِيُّ، حُكْمُهُ حُكْمُ الرَّهْنِ لَا يَمْلِكُهُ الْمُشْتَرِي وَيَضْمَنُهُ الْمُشْتَرِي بِالْأَكْلِ مِنْ نَمْرِهِ وَلَا يُبَاحُ لَهُ الْإِنْتِفَاعُ وَلَا الْأَكْلُ إِلَّا بِإِبَاحَةِ الْمَالِكِ وَيَسْقُطُ الدَّيْنُ بِهَلَاكِهِ إِذَا كَانَ بِهِ وَقَاءً بِالَّذِينَ وَلَا يَضْمَنُ الزِّيَادَةَ إِذَا هَلَكَ لَا بِصُنْعِهِ وَلِلْبَائِعِ أَنْ يَسْتَرِدَّ إِذَا قَضَى الدَّيْنُ“ (فتاویٰ قاضی خان علی الہندیہ ۱۶۵/۲، تبیین الحقائق للریلیق ۱۸۳/۵)۔

(اکثر مشائخ نے کہا جن میں سید امام ابو شجاع اور قاضی امام ابو الحسن علی السعدی وغیرہ ہیں کہ اس بیع کا حکم رہن کے حکم کی طرح ہے، اس میں مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا اور اس کے پھل میں کھانے کی وجہ سے مشتری اس کا ضامن ہو جائے گا، اور مشتری کے لئے بیع سے انتفاع مباح نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں سے کچھ کھانا جائز ہے، مگر مالک کی اجازت سے جائز ہے اور بیع کی ہلاکت کی وجہ سے دین ساقط ہو جائے گا، جب بیع دین کے برابر ہو، اور زیادہ کا تاوان لازم نہیں ہوگا، جب مشتری کی تعدی اور لاپرواہی کے بغیر ہلاک ہو جائے اور بائع کو بیع واپس لینے کا حق ہوگا جب دین ادا کر دے)۔

اور ”الجامع الوجیز“ میں حافظ الدین بزازی نے ائمہ خوارزم کی رائے کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

”وَإِخْتَارَهُ أئِمَّةُ خَوَارِزْمٍ أَنَّهُ إِذَا أُطْلِقَ الْبَيْعُ لِكِنِّ وَكُلِّ الْمُشْتَرِي وَكَيْلًا يَفْسُخُ الْبَيْعَ إِذَا أَحْضَرَ الْبَائِعُ الثَّمَنَ أَوْ عَهْدَ عَلِيٍّ أَنَّهُ إِذَا أَوْفَاهُ فَسَخَ الْبَيْعَ وَالثَّمَنُ لَا يُعَادِلُ الْمَبِيعَ، وَفِيهِ غَبْنٌ فَاحِشٌ أَوْ وَضَعَ الْمُشْتَرِي عَلَى أَصْلِ الْمَالِ رِبْحًا بَانَ وَضَعَ عَلَى مِائَةِ عَشْرِينَ دِينَارًا فَرَهَنَ (إِلَى قَوْلِهِ) وَإِخْتَارَ خَاتَمُ الْمُجْتَهِدِينَ مَوْلَانَا سَيْفُ الدِّينِ الْعَصْبَةُ أَنَّهُ رَهْنٌ“ (بزازیہ علی ہاشم الہندیہ ۴۰۷/۳)۔

(جس کو ائمہ خوارزم نے اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ جب بیع کو مطلق رکھا جائے؛ لیکن جب بائع ثمن لے کر کے حاضر ہو جائے تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنا دے یا بیع مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہو جائے کہ جب بائع ثمن لا کر پیش کر دے گا تو عقد بیع خود بخود فسخ ہو جائے گا اور ثمن بیع کے برابر نہ ہو اور اس میں غبن فاحش ہو یا مشتری عقد کے بعد اصل مال پر نفع کی شرط لگا دے مثلاً ہر سودینار پر بیس دینار نفع کا رہے گا، تو ان تمام صورتوں میں یہ عقد رہن کے حکم میں ہوگا، اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے کہ وہ رہن ہی ہوگا)۔

فریقِ خامس بیع المکرہ کے حکم کے قائلین:

مشائخ بخاری میں سے امام صدر الشہید حسام الدین اور امام صدر السعید تاج الدین امام علاء الدین بدر اور صاحب ہدایہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی اور اس کو بیع فاسد قرار دینا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ امام ظہیر الدین بخاری نے اس کو بیع فاسد بھی تسلیم کیا اور بیع مکرہ کے درجہ میں بھی قرار دیا جو کہ درست نہیں ہے؛ بلکہ بیع مکرہ کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل کرنا زیادہ صحیح ہے، امام زیلعی نے ”تبيين الحقائق“ میں امام ظہیر الدین بخاری کو بیع مکرہ کے قائلین کی فہرست میں شمار فرمایا ہے، حالانکہ وہ بیع فاسد کے قائلین کی فہرست میں شامل ہیں، اسی وجہ سے ”بزازیہ“ میں اس بات کو صاف واضح کر دیا گیا ہے کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول و ضابطہ کے دائرہ میں داخل ہے، اس لئے بیع الوفاء بیع مکرہ کی طرح ہوگی۔

اور بیع فاسد کے اصول و ضوابط میں داخل نہیں ہے؛ لہذا بیع الوفاء کا حکم بیع فاسد کی طرح نہیں ہوگا؛ بلکہ بیع مکرہ کی طرح ہوگا اور امام ظہیر الدین بخاری نے دونوں کو مخلوط کر دیا ہے، اور امام علاء الدین بدر فرماتے ہیں کہ جنہوں نے دونوں کو مخلوط کر دیا ہے وہ درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ دونوں کے شرائط و ضوابط الگ الگ ہیں؛ لہذا بیع الوفاء واجب الاسترداد ہونے میں بیع مکرہ کی طرح ہوگی، بیع فاسد کی طرح نہیں۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

”وَمِنْ مَشَائِخِ بُخَارَى مَنْ جَعَلَ بَيْعَ الْوَفَاءِ كَبَيْعِ الْمُكْرَهِ مِنْهُمْ الْإِمَامُ ظَهِيرُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيدُ حُسَامُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ السَّعِيدُ تَاجُ الْإِسْلَامِ، وَصَوَّرْتُهُ أَنْ يَقُولَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِي: بَعْتُ مِنْكَ هَذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَكَ عَلَيَّ عَلَى أَيْ مَتَى قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِي، فَجَعَلُوهُ فَاسِدًا بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ عِنْدَ الْقُدْرَةِ عَلَى إِنْفَاءِ الدَّيْنِ يُفِيدُ الْمَلِكَ وَعِنْدَ اتِّصَالِ الْقَبْضِ بِهِ وَيَنْقُضُ بَيْعَ الْمُشْتَرِي كَبَيْعِ الْمُكْرَهِ؛ لِأَنَّ الْفَسَادَ بِاعْتِبَارِ عَدَمِ الرِّضَا، فَكَانَ حُكْمُهُ حُكْمُ بَيْعِ الْمُكْرَهِ فِي جَمِيعِ مَا ذَكَرْنَا“ (تبيين الحقائق ۵/ ۱۸۳)۔

(مشائخ بخاری میں سے جنہوں نے بیع الوفاء کو بیع مکرہ کی طرح قرار دیا ہے ان میں سے امام ظہیر الدین اور صدر الشہید حسام الدین اور امام صدر السعید تاج الاسلام (وغیرہ) ہیں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ یہ چیز میں نے تمہارے ہاتھ تمہارے دین کے بدلہ میں بیچ دیا ہے اس شرط پر کہ جب میں تمہارا قرض ادا کروں گا تو وہ چیز میری ہو جائے گی، تو ان حضرات نے اس عقد کو دین کی ادائیگی پر قدرت کے وقت فسخ عقد کی شرط کا اعتبار کرتے ہوئے عقد فاسد قرار دیا ہے، جو اتصال قبضہ کے وقت ملکیت کا فائدہ دیتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ مشتری کی بیع ٹوٹ جایا کرے گی جیسا کہ مکرہ کی بیع ٹوٹ جاتی ہے؛ اس لئے کہ عدم رضا کی وجہ سے اس میں فساد آیا ہے؛ لہذا بیع الوفاء کا حکم بیع مکرہ کے حکم میں ہوگا، ان تمام امور میں جو ہم نے ذکر کئے ہیں)۔

اور اس حکم کو امام حافظ الدین ہرازی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

”أَجَابَ عَلَاءُ الدِّينِ بَدْرٌ أَنَّهُ لَا يَصِحُّ وَعَلَى هَذَا اخْتِيَارُ صَاحِبِ الْهَدَايَةِ وَأَوْلَادِهِ وَمَشَائِخِ زَمَانِنَا وَعَلَيْهِ الْفَتْوَى أَعْنَى لَا يَمْلِكُ الْمُشْتَرِي الْبَيْعَ مِنَ الْغَيْرِ كَمَا فِي بَيْعِ الْمُكْرَهِ لَا الْبَيْعِ الْفَاسِدِ بَعْدَ الْقَبْضِ“ (ہرازیہ ۴۰۸/۴)۔

امام علاء الدین بدر نے اس طرح سے جواب دیا ہے کہ یہ بیع صحیح نہیں ہے اور اسی کو صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور ہمارے زمانہ کے مشائخ نے اختیار کیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، یعنی مشتری دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مالک نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بیع مکروہ میں ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے، جیسا کہ بیع فاسد میں قبضہ کے بعد ہوتا ہے۔

فریقِ سادس بیع اور رہن سے مرکب کے قائلین:

امام فخر الدین زاہد وغیرہ نے اس عقد کو من وجہ بیع صحیح اور من وجہ رہن تسلیم کیا ہے، یعنی صلہ عقد میں جب شرط کا ذکر نہ ہو تو مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اور بیع کی آمدنی کا مشتری مالک ہو کرے گا اور بائع کے حق میں یہ عقد رہن ہوگا، اس لئے مشتری بیع کے قبضہ اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کر سکتا، نہ دوسرے کو بطور ہدیہ دے سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو فروخت کر سکتا ہے، اور نہ ہی دوسرے کے ہاتھ میں رہن کے طور پر رکھ سکتا ہے اور جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو مشتری کو بیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا؛ لہذا بیع الوفاء میں من وجہ بیع صحیح کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہو جائے گی اور من وجہ رہن کے اصول و ضوابط کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہو جائے گی، اور اس عقد زرافہ کی طرح دو چیزوں سے مرکب مانا جائے گا جیسا کہ زرافہ گردن کے اعتبار سے اونٹ کی طرح ہے اور پیروں کے اعتبار سے گائے اور بیل کی طرح ہے، اسی طرح اس عقد کا حال ہے کہ مشتری بیع کی آمدنی کا مالک ہو جاتا ہے اور مشتری بیع سے ہر طرح کا نفع اٹھا سکتا ہے، تو اس اعتبار سے بیع صحیح ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں قبضہ کو منتقل نہیں کر سکتا اور دوسرے کو مالک نہیں بنا سکتا، اور ثمن کی واپسی پر بیع کی واپسی لازم ہو جاتی ہے تو اس اعتبار سے یہ عقد رہن کی طرح ہے۔ فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

”الْقَوْلُ السَّادِسُ مَا اخْتَارَهُ الْبَعْضُ وَاخْتَارَهُ الْإِمَامُ الزَّاهِدُ أَنَّ الشَّرْطَ إِذَا لَمْ يُذَكَّرْ فِي الْبَيْعِ نَجَعَلَهُ صَحِيحًا فِي حَقِّ الْمُشْتَرِي حَتَّى مَلَكَ الْأَنْزَالَ وَرَهْنًا فِي حَقِّ الْبَائِعِ فَلَمْ يَمْلِكِ الْمُشْتَرِي تَحْوِيلَ يَدِهِ وَمَلَكَهُ إِلَى غَيْرِهِ وَأُجْبِرَ عَلَى الرَّدِّ إِذَا أَحْضَرَ الدَّيْنَ؛ لِأَنَّهُ كَالزَّرَافَةِ مُرَكَّبٌ مِنَ الْبَيْعِ وَالرَّهْنِ“ (فتاویٰ ہرازیہ ۴۰۸/۴)۔

(قولِ سادس وہ ہے جس کو بعض فقہاء نے اختیار فرمایا ہے اسی کو فخر الدین زاہد نے پسند فرمایا ہے، بایں طور پر کہ جب عقد بیع کے اندر شرط کا ذکر نہ کیا ہو تو اس کو مشتری کے حق میں بیع صحیح قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری بیع کی آمدنی کا مالک

ہو جائے اور بائع کے حق میں رہن قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری بیع کا قبضہ اور بیع کی ملکیت کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا مالک نہ ہو جائے اور مشتری کو بیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا جب بائع دین ٹین لاکر پیش کر دے؛ اس لئے کہ یہ عقد زرافہ کی طرح بیع اور رہن سے مرکب ہے۔

فریقِ سابعِ صحیح اور بیعِ فاسد اور رہن تینوں سے مرکب کے قائلین:

امام حافظ الدین بزازی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کے اندر تین صفتیں موجود ہیں:

(۱) یہ بیع بیعِ تبحر کے مشابہ ہے، بیع تبحر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح بیع ہے اور صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں ہے؛ لہذا امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے اوپر بیع صحیح کا حکم لگا دیا جائے گا؛ لہذا مشتری اس عقد کی بیع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور حضراتِ صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے بعض احکام کے اعتبار سے اس کے اوپر بیع فاسد کا حکم لگا دیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مقتضائے عقد کے خلاف شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، اسی طرح اس عقد کے اندر بھی واپسی کی شرط بیع فاسد کے اصول کے مطابق شرط فاسد ہے، اور ان لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے جنہوں نے بیع الوفاء کو رہن کی طرح قرار دیا ہے اس کے اوپر رہن کا حکم لگا دیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مرہن کو مال رہن دوسرے کے قبضہ میں دینے اور دوسرے کو مالک بنانے کا حق نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اس عقد کے اندر مشتری کو دوسرے کی ملکیت میں دینے کا حق نہیں ہے، اس لئے اس کے اوپر معاملہ رہن کا حکم لگا دیا جائے گا؛ لہذا بیع الوفاء تین قسم کے عقود سے مرکب ہے، بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن ان تینوں سے مرکب ہے، جیسا کہ ایک جانور جس کا نام زرافہ ہے تین قسم کے جانوروں کی صفتوں کے ساتھ وہ جانور متصف ہے کہ گردن کو دیکھا جائے تو اس کے اندر اونٹ کی صفت ہے اور پیروں کو دیکھا جائے تو اس کے اندر گائے اور بیل کی صفت ہے اور رنگوں کو دیکھا جائے تو اس کے اندر چیتے کی صفت ہے تو جس طرح ایک جانور تین قسم کے جانوروں کی صفات کے ساتھ متصف ہو کر وجود میں آیا ہے اور اس طرح جانور وجود میں آنا صحیح اور درست ہے، اسی طرح بیع الوفاء بھی تین قسم کے عقود کی صفتوں کے ساتھ متصف ہو کر وجود میں آئی ہے۔ اور وجود میں آنا درست ہے اور اسی وجہ سے اس کو عقد صحیح اور عقد جائز ہی قرار دیا جائے گا اور جب اس عقد کے اندر یہ تینوں صفتیں موجود ہیں تو ان تینوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟ تو بزازیہ میں ہے کہ بیع صحیح کے پہلو کو ترجیح دینا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے؛ اس لئے کہ اس کو بیع صحیح قرار دینے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینا ثابت ہوتا ہے، اور صاحبِ مذہب کے قول کو ترجیح دینا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہوا کرتا ہے، عربی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

”قُلْتُ هَذَا الْعَقْدُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْعُقُودِ الثَّلَاثَةِ كَالزَّرَافَةِ فِيهَا صِفَةُ الْبَعِيرِ وَالْبَقَرِ وَالنَّمْرِ جَوْزٌ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ بِشَرَطِ سَلَامَةِ الْبَدَلَيْنِ لِصَاحِبَيْهِمَا (إِلَى قَوْلِهِ) لِأَنَّهُ يُشْبِهُ بَيْعَ التَّلْجِئَةِ وَإِنَّهُ صَحِيحٌ عِنْدَهُ

لَا عِنْدَهُمَا فَأَعْطَى لَهُ حُكْمُ الصَّحِيحِ عَمَلًا بِقَوْلِهِ وَحُكْمُ الْفَاسِدِ فِي بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلًا بِقَوْلِهِمَا وَحُكْمُ الرَّهْنِ فِي بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلًا بِقَوْلِ النَّاسِ كَمَا ذَكَرْنَا فِيمَا تَقَدَّمَ وَإِذَا وَقَعَ التَّرَدُّدُ فِي الْحَاقِقِ بِالْفَاسِدِ أَوْ الصَّحِيحِ فَالْحَاقِقُ بِالصَّحِيحِ أَوْلَى تَقْلِيلًا لِلْفَسَادِ وَتَرْجِيحًا لِقَوْلِ الْإِمَامِ فَيُعْتَبَرُ الْمَذْكُورُ ثَمَنًا لَا الْمَاخُودُ“ (فتاویٰ بزازیہ ۴۱۰، البحر المرائق کوئٹہ ۸۶)۔

(میں کہتا ہوں یہ عقد عقود ثلاثہ سے مرکب ہے جیسا کہ زرافہ اس میں اونٹ، بیل اور چیتے کی صفت ہوتی ہے، اس کی طرف لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز قرار دیا گیا ہے، متعاقدین کے لئے بدل کی سلامتی کی شرط کے ساتھ اور مصنف کا قول اس لئے کہ یہ عقد بیع تبیحہ کے مشابہ ہے، اور بے شک بیع تبیحہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک صحیح ہے، صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں؛ لہذا امام صاحب کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کو بیع صحیح کا حکم دیا جائے گا اور صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں بیع فاسد کا حکم دیا جائے گا اور دوسرے لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں رہن کا حکم دیا جائے گا، جیسا کہ ماقبل میں دوسرے کا قول ہم نے ذکر کر دیا ہے اور جب اس کو بیع فاسد یا بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنا درست ہے تو بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنا زیادہ بہتر ہوگا فساد کی کمی کو ثابت کرنے کے لئے اور امام ابوحنیفہ کے قول کو ترجیح دینے کے لئے؛ لہذا ذکر کی گئی چیز کو ثمن قرار دیا جائے گا نہ کہ ماخوذ اور مقبوض کو)۔

بیع کو کرایہ پر دینے کا حکم:

بیع الوفاء میں مشتری بیع کو کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ بات خوب ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کے درمیان کافی اختلاف واقع ہو چکا ہے، جس کو ہم نے اس مقالہ کے اندر واضح کر دیا ہے کہ بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع فاسد کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع مکرہ کے درجہ میں قرار دیا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان تمام صورتوں میں مشتری کی ملکیت نہیں ہو سکتی، اسی پر علماء الدین حنفی اور علامہ شامی کا رجحان ہے۔

اور اس کے برخلاف بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن سے مرکب عقد قرار دیا ہے، اور ساتھ میں یہ فرمایا ہے کہ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اسی لئے مشتری بیع کی آمدنی اور پیداوار کا مالک ہو جائے گا اور بائع کے حق میں رہن ہے اس لئے مشتری بیع کو بیچنے اور دوسرے کے ہاتھ رہن رکھنے کا مجاز نہ ہوگا، اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن اور بیع فاسد تینوں سے مرکب زرافہ کی طرح الگ سے ایک عقد تسلیم کیا ہے، اور بعض فقہاء نے تعامل ناس اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے، ان تمام فقہاء کے قول کے مطابق بیع الوفاء صحیح اور جائز عقد ہے؛ لہذا ان سب حضرات کے نزدیک مشتری کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانے اور بیع کے

ذریعہ سے آمدنی حاصل کرنے کا حق ہے اور آمدنی کا ایک ذریعہ اجارہ اور کرایہ پر دینے کا بھی ہے، اس لئے ان تمام فقہاء کے نزدیک مشتری کے لئے بیع کو بائع کے ہاتھ یا کسی دوسرے کے ہاتھ کرایہ پر دینا جائز ہے؛ لہذا اگر کھیتی کی زمین ہے تو مشتری اس زمین کو خود بائع کے ہاتھ میں یا کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ یا بیٹائی پر دے کر نفع حاصل کر سکتا ہے، اور اگر عمارت ہے اس کو بھی کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کر سکتا ہے، اور متناخرین کا فتویٰ اسی پر جاری ہو چکا ہے کہ آمدنی مشتری کی ملکیت ہوگی؛ لہذا راجح یہی ہوگا کہ بیع کو کرایہ پر دے کر اجرت حاصل کرنا مشتری کے لئے اس وقت تک جائز ہوگا جب تک بائع ثمن دے کر بیع کو واپس نہ لے گا، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

”وَإِنْ آجَرَ الْمَبِيعَ وَفَاءً مِنَ الْبَائِعِ مِمَّنْ جَعَلَهُ فَاسِدًا قَالَ لَا تَصِحُّ الْإِجَارَةُ (إِلَى قَوْلِهِ) وَمَنْ جَعَلَهُ رَهْنًا كَذَلِكَ لَمْ يَلْزَمِ الْبَائِعُ الْأَجْرُ، وَمَنْ أَجَارَهُ جَوَزَ الْإِجَارَةَ مِنَ الْبَائِعِ وَغَيْرِهِ وَأَوْجَبَ الْأَجْرُ“ (فتاویٰ بزازی علی الہندیہ ۴/۳۱۳، شامی زکریا ۷/۵۴۸، کراچی ۵/۲۷۸)۔

اور اگر بیع کو بیع الوفاء میں بائع کے ہاتھ اجرت دیا ہے تو جن لوگوں نے اس کو بیع فاسد قرار دیا ہے تو انہوں نے کہا کہ اجارہ صحیح نہیں ہوگا اور جنہوں نے رهن قرار دیا ہے ان کے نزدیک ایسے ہی اجارہ صحیح نہ ہوگا اور بائع پر اجرت لازم نہ ہوگی اور جن لوگوں نے بیع الوفاء کو بیع صحیح قرار دیا ہے ان لوگوں نے بیع کو بائع کے ہاتھ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ پر دینے کو بھی جائز قرار دیا ہے، اور اجرت بھی لازم ہو جائے گی۔

” (وَقَوْلُهُ) وَذُكِرَ فِي الْإِيضَاحِ أَنَّ كُلَّ مَا يَصْحُحُ بَيْعُهُ قَبْلَ قَبْضِهِ تَجَوُّزُ إِجَارَتِهِ وَمَا لَا فَلَا وَبَيْعِ الْعَقَارِ قَبْلَ الْقَبْضِ جَائِزٌ فَكَذَلِكَ إِجَارَتُهُ“ (فتاویٰ بزازیہ ۴/۳۱۳)۔

(اور ایضاح میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہر وہ شئی جس کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے اور جس کو قبل القبض بیچنا صحیح نہیں اس کو اجارہ پر دینا بھی صحیح نہیں ہے اور عقار کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے؛ لہذا اس کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہو جائے گا)۔

بیع الوفاء میں بیع کی آمدنی کا حق دار کون؟

جب لوگوں کی ضرورت اور تعامل ناس کی وجہ سے بیع الوفاء کو جائز قرار دیا گیا ہے تو مشتری کے لئے بیع کی واپسی تک اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور بیع سے جو آمدنی پیدا ہوگی وہ آمدنی بھی مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہذا اگر بیع کے ذریعہ سے کچھ آمدنی حاصل ہو جائے یا بیع عقار ہے اور کھیتی کی زمین ہے اس میں سے پیداوار حاصل ہو جائے تو وہ ساری کی ساری مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہذا اگر آمدنی اور پیداوار ضائع ہو جائے یا مشتری نے ضائع کر دیا ہے تو اس کا تاوان بائع کے لئے مشتری پر لازم نہیں ہوگا، یہی فقہاء کا آخری قول ہے اور صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا

فتویٰ اسی پر جاری ہو چکا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

”الَّذِي اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ فَتْوَىٰ صَاحِبِ الْهَدَايَةِ وَأَوْلَادِهِ وَمَشَايخِ الْعَهْدِ أَنَّ الْمَلِكَ يَبْتِئُ لِلْمُشْتَرِي فِي زَوَائِدِهِ وَلَا يَضْمَنُهُ بِالِاتِّلَافِ“ (فتاویٰ بزاز علی ہاشم الہندیہ ۴/۳۱۰)۔

(جس کے اوپر صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ مسلسل جاری ہو چکا ہے وہ یہی ہے کہ بیع الوفاء میں بیع کی پیداوار اور آمدنی میں مشتری کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور آمدنی کو ضائع اور ہلاک کر دینے سے مشتری بائع کے لئے ضامن نہیں ہوگا)۔

بیع الوفاء میں بیع کے نقصان کی تلافی:

اگر بیع الوفاء میں مشتری کے یہاں بیع ہلاک ہو جائے تو ثمن کی ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے؛ لیکن اگر بیع ہلاک تو نہیں ہوئی ہے؛ لیکن اس میں نقصان آجائے تو اس نقصان کی تلافی کی کیا شکل ہے؟ تو اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ بیع میں جتنا نقصان ہوا، دین ثمن میں سے اتنا مجری ہو کر ساقط ہو جائے گا، مثال کے طور پر ایک ہزار روپیہ لے کر کے بیع مشتری کے قبضہ میں دی گئی ہے اور بیع کی قیمت پندرہ سو روپیہ ہے اور بیع میں پانچ سو روپیہ قیمت کا نقصان ہو جائے تو ثمن میں سے پانچ سو روپیہ کی ادائیگی ساقط ہو جائے گی، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

”وَالَّذِي اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ فَتْوَى الْأَثَمَةِ وَالْأَسَاتِدَةِ فِي مَسْئَلَةِ نُقْصَانِ الْمَبِيعِ وَفَاءٍ سَقُوطِ حِصَّةِ النُّقْصَانِ مِنْ مَالِ الْوَفَاءِ وَهُوَ الثَّمَنُ وَيُقَسَّمُ مَالُ الْوَفَاءِ عَلَى قِيَمَةِ الْبَاقِي وَالْهَالِكِ فَيَسْقُطُ قِسْطُ الْهَالِكِ وَيَبْقَى حِصَّةُ الْبَاقِي بَيَانُهُ اشْتَرَى دَارًا بِالْوَفَاءِ قِيَمَتُهَا تُسَاوِي أَلْفًا بِمِائَةٍ فَخَرِبَتْ الدَّارُ حَتَّى صَارَتْ الْقِيَمَةُ خَمْسَ مِائَةٍ تَسْقُطُ مِنَ الثَّمَنِ خَمْسُونَ“ (فتاویٰ بزاز ۴/۳۱۲)۔

بیع الوفاء میں بیع کے نقصان کے مسئلہ میں اساتذہ اور ائمہ کا فتویٰ اس بات پر جاری ہو چکا ہے کہ مال وفاء یعنی ثمن میں سے نقصان کا حصہ ساقط ہو جائے گا اور ثمن وفاء بیع کے باقی حصہ پر اور بیع کے ہلاک شدہ پر تقسیم ہو جائے گا؛ لہذا ہلاک شدہ کا حصہ بائع کے اوپر سے ادا کرنا ساقط ہو جائے گا اور باقی کا حصہ باقی رہے گا، اس کی وضاحت یوں ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر ایک مکان خریدا ہو جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ کے برابر ہے اس کو سو روپیہ میں خریدا ہے پھر مکان منہدم ہو جائے یہاں تک کہ اس کی قیمت پانچ سو روپیہ رہ جائے تو ثمن میں سے پچاس روپیہ ساقط ہو جائیں گے۔

بیع الوفاء میں ثمن کی زکوٰۃ کون ادا کرے؟

یہاں یہ مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مشتری کے قبضہ میں بیع ہوتی ہے اور بائع کے قبضہ میں ثمن ہوتا ہے اور بیع چون کہ مال نمونہ نہیں ہوتی ہے، اس لئے بیع کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی؛ لیکن ثمن مال نمونہ ہوتا ہے، اسی لئے اس کے اوپر زکوٰۃ

واجب ہوتی ہے اور یہ مال فی الحال بائع کے قبضہ اور ملکیت میں ہے، اس اعتبار سے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع کے اوپر لازم ہوگا اور مشتری کے اوپر اس لئے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے کہ اس نے ثمن کے بدل پر قبضہ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ثمن درپردہ اس کی ملکیت ہے، اس لئے مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہو جائے گا، اور چوں کہ عقود و فسوخ میں، یعنی عقد کے منعقد ہونے میں اور عقد کے فسخ ہو جانے میں نقود متعین نہیں ہوتے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک مال متعین کی زکوٰۃ دو آدمیوں پر لازم آ رہی ہے؛ بلکہ لاعلیٰ التعمین اتنے مال کی زکوٰۃ بائع کے اوپر بھی لازم ہے اور مشتری کے اوپر بھی لازم ہے جو فقہاء کی اس طرح کی عبارات سے واضح ہوتا ہے:

”وَزَكَاةُ مَالِ الْوَفَاءِ عَلَى الْبَائِعِ لِأَنَّهُ مِلْكُهُ بِالْقَبْضِ وَعَلَى الْمُشْتَرِي أَيْضًا لِأَنَّهُ يُعَدُّ مَالًا لَهُ مَوْضُوعًا عِنْدَ الْبَائِعِ لَيْسَ فِيهِ زَكَاةُ مَالٍ عَلَى رَجُلَيْنِ لِأَنَّ النُّقُودَ لَا تَتَعَيَّنُ فِي الْعُقُودِ وَالْفُسُوحِ وَعَلَيْهِ صَاحِبُ الْهَدَايَةِ وَالْإِمَامُ الْبَزْذَوِيُّ“ (فتاویٰ بزازیہ ۴/۱۲۲)۔

(بیع الوفاء کے مال ثمن کی زکوٰۃ بائع کے اوپر اس وجہ سے لازم ہوگی کہ قبضہ کی وجہ سے بائع اس کا مالک ہو چکا ہے اور مشتری کے اوپر بھی اس لئے واجب ہے کہ وہ مشتری ہی کا مال شمار ہوتا ہے جو بائع کے یہاں رکھا ہوا ہے اور اس میں ایک متعین مال کی زکوٰۃ کا ادا کرنا دو آدمیوں پر اس لئے لازم نہیں آتا ہے کہ عقود و فسوخ میں نقود یعنی ثمن متعین نہیں ہوا کرتا ہے، یہی صاحب ہدایہ اور امام بزدوی کی رائے ہے)۔

بائع اور مشتری کا اختلاف:

اگر بائع اور مشتری کے درمیان اس طرح اختلاف ہو جائے کہ دونوں میں سے ایک اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی ہو چکی ہے واپسی اور استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں اور دوسرا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی نہیں ہوئی؛ بلکہ بیع الوفاء کے طور پر عقد ہوا ہے؛ لہذا ثمن کی واپسی پر بیع کا استرداد لازم ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دعویٰ پر بینہ اور گواہ پیش کر دیا ہے تو ایسی صورت میں کس کو ترجیح دی جائے؟ تو اس سلسلہ میں صاحب درمختار فرماتے ہیں کہ استسماً بیع الوفاء کا دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے؛ لیکن اس کے نیچے شامی نے ملاحظہ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ اولاً متناً خریدنے والے کے قول کو ترجیح دینے پر فتویٰ دیا ہے، پھر اس کے بعد بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے بینہ کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کے اوپر استسماً کا نشان لگایا ہے، اس کے بعد یہ وضاحت نقل فرمائی ہے کہ اگر مشتری نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا ہے کہ بیع مکمل ہو چکی ہے، اب استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور بائع دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں اگر دونوں نے بینہ پیش کیا ہے تو بائع کے گواہ کو ترجیح دی جائے گی اور اگر بینہ پیش نہیں کیا گیا؛ بلکہ دونوں کا تخصّص دعویٰ ہے، تو ایسی صورت میں بیع قطعی کا دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے گی، ہاں البتہ اگر بیع کے مقابلہ

میں ثمن کی کمی پر واضح دلیل اور قرینہ موجود ہو تو ایسی صورت میں بیع الوفاء کا دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح ہوگی؛ تاکہ بائع غبن فاحش کے نقصان کا شکار نہ ہو تو حاصل یہ نکلا کہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں اگر بیع الوفاء کا قرینہ موجود ہو، مثلاً بیع کے مقابلہ میں ثمن کی مقدار کم ہے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے بیع الوفاء کا حکم صادر کر دیا جائے گا اور دونوں کو اس کا پابند بنایا جائے گا اور اگر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے اور ثمن اور بیع کے درمیان تناسب میں تفاوت نہیں ہے اور نہ ہی غبن فاحش لازم آسکتا ہے تو ایسی صورت میں مشتری کے قول کا اعتبار کر کے بیع قطعی کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

”إِنَّ الْقَوْلَ لِمُدَّعِي الْوَفَاءِ اسْتِحْسَانًا، وَلَوْ قَالَ الْبَائِعُ بَعْتُكَ بَيْعًا بَاتًا فَالْقَوْلُ لَهُ إِلَّا أَنْ يَدُلَّ عَلَى الْوَفَاءِ بِنُقْصَانِ الثَّمَنِ كَثِيرًا (وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَّةِ) قَوْلُهُ: هُنَّ اسْتِحْسَانًا يَفْتَضِي تَرْجِيحَ مُدَّعِي الْوَفَاءِ فَيَنْبَغِي تَفْيِيضُهُ بِقِيَامِ الْقَرِينَةِ (إِلَى قَوْلِهِ): وَإِنْ ادَّعَى أَحَدُهُمَا بَيْعًا بَاتًا وَالْآخَرَ بَيْعَ الْوَفَاءِ وَأَقَامَ الْبَيِّنَةَ كَانُوا يُفْتُونَ أَنَّ الْبَائِعَ أَوْلَى؛ ثُمَّ أَفْتُوا أَنَّ بَيْعَ الْوَفَاءِ أَوْلَى وَهَذَا اسْتِحْسَانٌ (إِلَى قَوْلِهِ) وَلَوْ قَالَ الْمُسْتَشْرَى اشْتَرَيْتُهُ بَاتًا وَقَالَ الْبَائِعُ بَعْتُهُ بَيْعَ الْوَفَاءِ (إِلَى قَوْلِهِ) أَنَّ الْاسْتِحْسَانَ فِي الْاِخْتِلَافِ فِي الْبَيِّنَةِ تَرْجِيحُ بَيِّنَةِ الْوَفَاءِ وَفِي الْاِخْتِلَافِ فِي الْقَوْلِ تَرْجِيحُ قَوْلِ مُدَّعِي الْبَيِّنَاتِ (إِلَى قَوْلِهِ): وَهُوَ كَوْنُ الْقَوْلِ لِمُدَّعِي الْبَيِّنَاتِ بِمَا إِذَا لَمْ تَقِمِ الْقَرِينَةُ عَلَى خِلَافِهِ“ (الدر المختار مع الشامی زکریا ۷/ ۵۵۰، شامی کراچی ۵/ ۲۷۹)۔

(بے شک استحساناً بیع الوفاء کے مدعی کا قول معتبر ہوگا اور اگر بائع نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ بیع قطعی کے طور پر بیچا ہے تو اس کا قول معتبر ہوگا؛ لیکن اگر بیع الوفاء پر ثمن کے کثیر نقصان کی وجہ سے دلالت کرنے والی کوئی دلیل ہو تو بیع الوفاء کا اعتبار ہوگا اس کے نیچے شامی میں ہے کہ یہاں استحساناً کا لفظ بیع الوفاء مدعی کے دعویٰ کی ترجیح کا تقاضا کرتا ہے؛ لہذا اس کو قیام قرینہ کے ساتھ مقید کرنا زیادہ مناسب ہے اور اگر دونوں میں سے ایک نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا اور دوسرے نے بیع الوفاء کا اور دونوں نے بینہ قائم کر دیا تو فقہاء متاخرین اس بات پر فتویٰ دیتے تھے کہ بیع قطعی کی ترجیح کو اولیٰ قرار دیا جائے پھر اس کے بعد بیع الوفاء کی ترجیح کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دینے لگے اور بیع الوفاء کو ترجیح دینا مستحسن ہے اور اگر مشتری نے کہا کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں بینہ کے ساتھ میں اختلاف کی صورت میں مستحسن یہی ہے کہ بیع الوفاء کے بینہ کو ترجیح دی جائے اور بغیر بینہ کے قول میں اختلاف کی صورت میں بیع قطعی کے مدعی کے قول کو ترجیح دی جائے اور بیع قطعی کے مدعی کے قول کی ترجیح اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ جبکہ اس کے خلاف پر کوئی قرینہ قائم نہ ہو)۔

اور ”الاشباہ والنظائر“ کے حاشیہ حموی میں صاف الفاظ کے ساتھ بائع کے قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ جب مشتری اور بائع کے درمیان اس طرح کا اختلاف ہو جائے کہ مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرے اور بائع بیع الوفاء کا دعویٰ کرے تو ایسی صورت

میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے اس معاملہ کو بیع الوفاء قرار دیا جائے گا؛ اس لئے کہ بیع قطعی ہونے کی صورت میں مشتری کا فائدہ ہے اور بائع کا نقصان ہے اور بیع الوفاء ہونے کی صورت میں کسی کا نقصان نہیں؛ کیونکہ مشتری کو اپنا ٹھمن واپس مل جاتا ہے اور بائع کو اپنی بیع واپس مل جاتی ہے۔

”وَفِي الْفُضُولِ الْعِمَادِيَّةِ إِذَا اِخْتَلَفَ الْمُتَبَاعِعَانِ فَقَالَ الْمُشْتَرِي: اشْتَرَيْتُهُ بَشْرَاءً بَاتًّا، وَقَالَ الْبَائِعُ: بَيْعُ الْوَفَاءِ، فَإِنَّ الْقَوْلَ الْبَائِعِ؛ لِأَنَّ الْمُشْتَرِيَّ يَدْعِي زَوَالَ عَيْنِهِ بِالْبَتَاتِ وَمُدَّعِي الْوَفَاءِ يُنْكِرُ الزَّوَالَ، فَيَكُونُ الْقَوْلُ قَوْلَهُ“ (حاشیہ الحوی علی الأشباہ قدیم ۱۳۰)۔

(فصول عمادیہ میں ہے کہ جب متباہعین میں اختلاف ہو جائے تو مشتری کہتا ہے کہ میں نے عقد لازم اور عقد قطعی کے طور پر خریدا ہے اور بائع کہتا ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر میں نے بیچا (اور تم نے خریدا ہے) تو بائع کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی؛ اس لئے کہ مشتری معاملہ قطعی کے ذریعہ سے عین بیع کے زوال کا دعویٰ کرتا ہے اور بیع الوفاء کا مدعی زوال کا انکار کرتا ہے؛ لہذا اسی کے قول کا اعتبار ہوگا)۔

حکم بیع الوفاء؛ بصورت عقد بیع

مولانا محمد سلمان منصور پوری ☆

جواب (۱) الف:- بیع الوفاء (یعنی ثمن اول کے ساتھ اقالہ بیع کے وعدہ پر عقد کرنا) کی حقیقت میں فقہاء کی آراء مختلف رہی ہیں، جن میں سے تین اقوال درج ذیل ہیں:

قول اول: بہت سے حضرات نے اس بیع کو مطلقاً رہن کے حکم میں رکھا ہے، اور مشتری کے لئے بیع (مرہون) سے انتفاع کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ عقود میں الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا؛ بلکہ مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے، جیسا کہ اگر عقد کفالت میں اصیل کی برأت کی شرط لگائی جائے تو وہ عقد حوالہ بن جاتا ہے، اور اگر حوالہ کے الفاظ استعمال کئے جائیں؛ لیکن اصیل سے مطالبہ کی شرط ملحوظ ہو تو یہ عقد کفالت بن جاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے عقود میں محض الفاظ کو نہیں دیکھا جائے گا؛ بلکہ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ علامہ علی بن عثمان بن محمد التیمی الحنفیؒ ”فتاویٰ سراجیہ“ میں لکھتے ہیں:

”وعن السيد الإمام أبي شجاع والقاضي الحسن ماتريدي والقاضي الإمام علي الصغدني أن بيع الوفاء رهن حقيقة، ولا يطلق الانتفاع للمشتري إلا بإذن البائع فهو ضامن لما أكل واستهلك، وللبائع استبداده إذا قضى دينه متى شاء؛ لأنهم يريدون به الرهن حقيقة، والعبرة للمقاصد لا للألفاظ، ألا ترى أن الكفالة بشرط براءة الأصيلة حوالة، والحوالة بشرط مطالبة الأصيلة كفالة“ (فتاویٰ سراجیہ ۴۲۲)۔

”درمختار“ اور ”شامی“ میں ہے:

”قيل: هو رهن فتضمن زوائده (درمختار) وقال الشامي: وفي حاشية الفصولين عن جواهر الفتاوى: هو أن يقول: بعت منك على أن تبعه مني متى جئت بالثمن، فهذا البيع باطل، وهو رهن، وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح الخ۔ قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفتقر عن الرهن في حكم من الأحكام۔ قال السيد الإمام: قلت للإمام الحسن الماتريدي: قد فشا هذا البيع بين

الناس۔ وفيه مفسدة عظيمة، وفتواك أنه رهن، وأنا أيضاً على ذلك، فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هذا ونظيره بين الناس، فقال المعتمد اليوم فتوانا وقد ظهر ذلك بين الناس، فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله الخ۔

قلت: وبه صدر في جامع الفصولين فقال رامزاً لفتاوى النسفي: البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكة، وهو ضامن لما أكل من ثمره وأتلف من شجره ويسقط الدين بهلاكه لو بقي ولا يضمن الزيادة وللبيع استرداداه إذا قضى دينه لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام الخ، ثم نقل ما مر عن السيد الإمام“ (درمختار الشامي بيروت ۷/۳۲۳-۳۲۵، ہندیہ ۳/۲۰۹، خانی علی الہندیہ ۲/۱۶۳-۱۶۵)۔

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہوا کہ ان علماء و فقہاء کے نزدیک مقصد عقد کا اعتبار کرتے ہوئے بیع الوفاء پر رہن کی تمام احکامات جاری ہوتے ہیں اور یہ معاملہ ظاہراً بیع اور باطناً رہن کا ہے، اور اصولی اعتبار سے اس معاملہ میں عدم جواز کا پہلو غالب ہے۔ چنانچہ فقیہ النفس حضرت مولانا غلیل احمد صاحب سہارن پوری نور اللہ مرقدہا وغیرہم کی رائے یہی ہے۔ حضرت سہارن پوریؒ کی تحریر کے الفاظ درج ذیل ہیں: ”بیع الوفاء مروجا اگرچہ مختلف فیہ ہے؛ لیکن برائے قواعد شرعیہ عدم جواز سے خالی نہیں“ (فتاویٰ غلیلیہ ۱/۳۹۵)۔

قول ثانی: بیع الوفاء کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس میں بعض پہلوؤں کے اعتبار سے اگرچہ فساد پایا جاتا ہے؛ لیکن انجام کار یہ ایک جائز عقد بن جاتا ہے، جس کے ذریعہ مشتری کے لئے بیع پر قبضہ کے بعد اس سے انتفاع حلال قرار دیا جاتا ہے، جیسا کہ دیگر بیوعات فاسدہ میں قبضہ کے بعد ملکیت مان لی جاتی ہے، نیز لوگوں کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے شرط فاسد کو بھی اس عقد میں گوارا کر لیا گیا ہے۔ ”فتاویٰ سراجیہ“ میں ہے:

”بیع المعاملة وبيع الوفاء واحد وإنه بيع فاسد؛ لأنه بيع بشرط لا يقتضيه العقد، وإنه يفيد الملك عند اتصال القبض به كسائر البيوع الفاسدة المذكورة في فتاوى أبي بكر بن الفضل“ (فتاویٰ سراجیہ ۲۲۲)۔

اور ”درمختار“ میں ہے:

”وقيل: بيع يفيد الانتفاع به وفي إقالة شرح الجمع عن النهاية: وعليه الفتوى“ (درمختار)۔
اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”هذا محتمل لأحد القولين، الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه. قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى. الثاني القول الجامع لبعض المحققين أنه

فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ صحيح في حق بعض الأحكام: كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدين بهلاكه، فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما. قال في البحر: وينبغي أن لا يعدل في الإفتاء عن القول الجامع. وفي النهر: والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي“ (شامی زکریا ۷/۴۲۵)۔

اور ”تبيين الحقائق“ میں ہے:

”ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه وهو الانتفاع به، دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز الاستصناع لذلك، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تبيين الحقائق ديوبند ۶/۲۳۷)۔

اور علامہ چلی ”تبيين الحقائق“ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

”والأصح عندي أنه بيع فاسد يوجب الملك بعد القبض، وحكمه سائر البياعات الفاسدة، لأنه بيع بشرط لا يقتضيه العقد، وقد نهى النبي ﷺ عن بيع وشرط“ (حاشیہ چلی تبيين الحقائق ۶/۲۳۸)۔

اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اضطرار شدید کے موقع پر بائع کے لئے اس قول کو اختیار کرنے کی اجازت دی ہے (دیکھئے: امداد الفتاویٰ ۳/۱۰۸)۔

قول ثالث: لوگوں کے عرف و تعامل اور ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض حضرات فقہاء نے اس عقد کو دائرہ جواز میں لانے کے لئے یہ حیلہ پیش فرمایا ہے کہ اولاً بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور پھر مجلس عقد کے بعد آپس میں یہ طے کر لیا جائے کہ جب ثمن کی واپسی ہوگی تو اس بیع کا اقالہ کر لیا جائے گا، گویا بیع الگ ہو اور وعدہ الگ، دونوں آپس میں مشروط نہ ہوں۔ ہمارے اکابر میں ناظم مظاہر علوم حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نے ایک طویل فتویٰ میں اسی قول پر فتویٰ دیا ہے جو فتاویٰ خلیلیہ (۱/۳۹۵) پر درج ہے۔ ”فتاویٰ سراجیہ“ میں ہے:

”وعن الشيخ القاضي الإمام اللاسبيجاني أنه قال: إنه بيع جائز، ويوفي بالوعد، قال بعض مشائخنا: من أراد أن يرتهن شيئاً ويباح له الغلة فالوجه أن يشتري المحدود شراءً باتاً، ثم يقول المشتري للبائع: بعد التفرق عن مجلس العقد أن يقبل هذا البيع إليه إذا أوفى إليه جميع ما أدى من الثمن الخ“ (فتاویٰ سراجیہ ۲۲۲)۔

اور ”تبيين الحقائق“ میں ہے:

”وإن ذكرنا البيع من غير شرط ثم ذكرنا الشرط على الوجه المعتاد جاز البيع ويلزمه الوفاء بالميعاد؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة، قال عليه الصلوة والسلام: العدة دين“ (مجم الطبراني في الأوسط رقم: ۱۵۱۳، مجمع الزوائد قال في حزمة بن داؤد ضعفه الدارقطني ۱۶۶/۳) ”فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس إليه“ (تبيين الحقائق ديوبند ۲۳۷/۶)۔

اور بعض فقہاء نے اس میں یہ شرط بھی بڑھائی ہے کہ یہ بیع مطلق عن الشرط ثمن مثل پر یا عن سیر (یعنی قیمت مثل سے معمولی کمی) کے ساتھ ہونی چاہئے۔ پس اگر عن فاحش کے ساتھ یہ بیع ہوگی تو اصل مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ معاملہ بیع کا نہ ہوگا؛ بلکہ صرف رہن کا ہو جائے گا اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

”قال الشامي: قلت وهذا ظاهر على هذا القول، بأنه بيع صحيح لا يفسد الشرط اللاحق، فلا ينافي ما يأتي عن الشرنبلائية، وهذا وفي الخيرية: فيما لو أطلق البيع ولم يذكر الوفاء إلا أنه عهد عن البائع أنه إن أوفى مثل الثمن يفسخ البيع معه. أجاب: هذه المسئلة اختلف فيها مشائخنا على أقوال ونص في الحاوي الزاهدي أن الفتوى في ذلك أن البيع إذا أطلق ولم يذكر فيه الوفاء، إلا أن المشتري عهد إلى البائع أنه إن أوفى مثل ثمنه فإنه يفسخ معه البيع، يكون باتاً، حيث كان الثمن ثمن المثل أو بغبن يسير، وبه أفتى في الحامدية أيضاً، فلو كان بغبن فاحش مع علم البائع به فهو رهن الخ“ (شامی بیروت ۴۲۵/۷)۔

بہر حال یہ قول دراصل جواز کا ایک حیلہ ہے، تاہم اس میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں:

اول یہ کہ یہ معاملہ معروف ہونے کی بنا پر شرط نہ لگائے جانے کے باوجود مشروط ہی کے درجہ میں ہے۔ دوسرے یہ کہ عموماً یہ بیع ثمن مثل پر نہیں ہوتی؛ بلکہ عن فاحش کے ساتھ ہوتی ہے۔ مثلاً اصل زمین کی قیمت اگر دس لاکھ روپے ہے تو اس پر دو لاکھ روپے ثمن کے طور پر طے ہوتے ہیں، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں بیع مقصود نہیں؛ بلکہ رہن ہی مقصود ہے۔ انہی سب وجوہات کی وجہ سے اکابر علماء نے اس بیع کو مشتری کے لئے مشتبہ قرار دیا ہے۔ اس بارے میں مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کا درج ذیل فتویٰ بہت چشم کشا ہے، حضرت بیع الوفاء سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

”یہ صورت بیع الوفاء کی ہے اور اس کے جواز و عدم جواز میں اختلاف ہے، اور نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس طریق سے عقد کرنا بیع ہے یا رہن؟ اگر رہن ہے تو ظاہر ہے کہ بائع راہن ہوگا اور مشتری مرتہن، اور مرتہن کو شئی مرہونہ سے نفع حاصل کرنا علی الصبح ناروا اور سود ہے۔ ”لأن كل فرض جبر نفعاً فهو ربا“ (فتح القدير كتاب الحوالة ۳۵۵/۶، مصنف ابن ابي شيبة بیروت ۳۳۳/۴) اور اگر بیع ہے، جیسا کہ ظاہر ہے تو اس بیع میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ پندرہ سال کے اندر اگر بائع ثمن کو واپس

کردے تو مشتری مبیع کو واپس کر دے اور یہ قاعدہ فقہیہ ہے کہ ایسی شرط سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، پس بہر حال عقد مذکور شرعاً صحیح نہیں ہے، اور مشتبہ ہونے میں تو اس کے کچھ شبہ ہی نہیں ہو سکتا؛ لہذا ترک کرنا اس کا لازم ہے؛ کیونکہ مشتبہات سے بچنا بھی مامور بہ ہے، اور اتقاء شبہات موجب حفاظت دین ہے“ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۳۲۶/۱۳)۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ عقد شبہ سے خالی نہیں ہے۔ اب رہ گئی یہ ضرورت کہ بغیر اس طرح کے معاملہ کے ضرورت مند غریب کو قرض نہیں مل پاتا، تو اس کی بنیاد پر یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ ایسے ضرورت مند کے لئے اسی طرح گنجائش نکالی جائے، جیسے محتاج شخص کے لئے سود پر قرض لینے کی گنجائش ہوتی ہے۔ ”كما في الأشباه: ”يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“۔

لیکن قرض دینے والوں کے لئے مبیع یا مرہون سے انتفاع کی حلت یقیناً مشتبہ ہے، اور بالخصوص بہار وغیرہ کے علاقوں میں اس معاملہ کے جواز کا بہانہ بنا کر غریب کاشت کاروں کی زمینوں کے ساتھ امیر لوگوں کا جو استحصال عرصوں سے جاری ہے وہ صریح ظلم ہے، اس کی ہرگز تائید نہیں کی جاسکتی۔ ہونا یہ چاہئے کہ مرہن جائیداد کو نفع بخش بنائے اور اس کی آمدنی جمع کرتا رہے، اور جب دین کے بقدر آمدنی ہو جائے تو اپنا قرض وصول کر لے اور جائیداد اصل مالک کو واپس کر دے، یہی شکل بے غبار ہے، اور شبہ سے خالی ہے۔

جواب (۱) ب:- اس عقد کو خواہ رہن مانا جائے یا بیع، بہر صورت سابقہ ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا؛ رہن ماننے کی صورت میں تو یہ حکم ظاہر ہے، اور بیع ماننے کی صورت میں یہ یا تو بیع فاسد ہے جس کا فسخ ثمن مثل سے ضروری ہوتا ہے، یا عقد بیع سے الگ وعدہ اقالہ ہے، اور اقالہ ثمن اول ہی پر ہوا کرتا ہے، اور یہ وعدہ کم از کم دیانہ لازم ہے۔

”وقيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهناً، ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً. ولو بعده على وجه الميعاد جاز، ولزم الوفاء به؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح“ (در مختار مع الثانی بیروت ۲۲۵-۲۲۶)

جواب (۱) ج:- اس صورت میں خریدار کا مبیع سے فائدہ اٹھانا بالکل حرام تو نہیں کہا جاسکتا؛ کیونکہ مالک کی طرف سے اس سے انتفاع کی صراحت یا دلالت اجازت موجود ہے؛ البتہ مشتبہ ضرور ہے؛ اس لئے کہ اس میں ربا کا شبہ پایا جاتا ہے، جیسا کہ اوپر جواب [۱] الف میں گذر چکا ہے۔

جواب (۱) د:- اگر بیع مطلق واقع ہوئی ہے تو اصولاً بیع تام اور نافذ ہو چکی، اور مشتری کو مبیع کے اندر ہر طرح کا تصرف بشمول بیع کرنے کا حق حاصل ہو گیا؛ لیکن چونکہ اس میں عقد سے ہٹ کر دوسرے کے ہاتھ بیع نہ کرنے کا وعدہ بھی کیا

گیا ہے، اس لئے اس وعدہ کے پیش نظر مشتری اس کے بیچنے کا حق نہ رکھے گا، اور اس معاملہ میں یہ تصرف شے مرہون میں تصرف کے مثل ہوگا، حتیٰ کہ جو حضرات فقہاء اس طرح کی بیع کو مطلق جائز کہتے ہیں وہ بھی بیع ثانی کے حق میں اس عقد کو رہن کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

”الثاني القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، صحيح في حق بعض الأحكام: كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر“ (شامی زکریا ۷/۲۲۵)۔

رہن ماننے کی صورت میں مروجہ بیع وفا کا حکم:

جواب (۲) الف:- اگر اس معاملہ میں بیع کا لفظ استعمال نہ ہو؛ بلکہ صرف رہن کا ذکر ہو، جیسا کہ عام رواج ہے کہ لوگ اس طرح کے لین دین کے وقت بیع کا ذکر نہیں کرتے؛ بلکہ رہن ہی کے ارادہ سے معاملہ کرتے ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ اگر رہن اجازت دیدے تو مرہن کے لئے جائیداد سے انتفاع جائز ہوگا یا نہیں؟ تو اس بارے میں فقہاء کی دورائے ہیں:

(۱) یہ کہ اس اجازت کا کوئی اعتبار نہیں اور مرہن کے لئے نفع اٹھانا سراسر سود ہے، یہ رائے سمرقند کے بڑے عالم علامہ عبداللہ بن محمد اسلم سمرقندی کے حوالہ سے علامہ شامی نے ان الفاظ میں نقل فرمائی ہے: ”لا يحل له أن ينتفع بشيء بوجه من الوجوه؛ وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربوا، لأنه يستوفي دينه كاملاً فيبقى له المنفعة فضلاً، فيكون رباً، ولهذا أمر عظيم“ (شامی زکریا ۷/۱۳، مجمع الأنهر ۴/۲۷۳ مکتبہ فقہیہ الامۃ دیوبند)۔

(۲) دوسری رائے جو فقہ حنفی کی عام کتابوں میں مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ اگر رہن اجازت دیدے تو مرہن کے لئے شے مرہون سے نفع اٹھانا سود نہیں ہے؛ بلکہ فی نفسہ جائز ہے۔ ”وليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون، إلا بإذن الراهن، فإذا أذن له جاز أن يفعل ما أذن له فيه“ (البحر الرائق ۸/۲۳۸، مجمع الأنهر ۴/۲۷۳ مکتبہ فقہیہ الامۃ دیوبند)۔

اب ان دونوں متعارض اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے فقہاء نے دو توجیہیں پیش فرمائیں:

توجیہ ۱:- علامہ سمرقندی کا فتویٰ احتیاط اور دیانت پر مبنی ہے، جبکہ عام معتبر کتابوں میں اصل مسئلہ بیان کیا گیا ہے؛ لیکن اس توجیہ کو علامہ حموی نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ سود سے متعلق مسائل میں دیانت اور قضا دونوں کا حکم یکساں ہوتا ہے، اس لئے یہ تطبیق بے نتیجہ ہے۔

توجیہ ۲:- دوسری توجیہ یہ ہے کہ اگر رہن کا عقد کرتے ہوئے یہ شرط لگا دی جائے کہ مرہن شے مرہون سے فائدہ اٹھائے گا تو یہ معاملہ ناجائز ہوگا اور اگر شرط نہیں لگائی؛ بلکہ بعد میں ویسے ہی اجازت دے دی تو یہ درست ہوگا، اور اس کی نظیر

یہ ہے کہ اگر مستقر کسی سے قرض لینے کے بعد اپنی خوشی سے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرے تو اگر یہ ہدیہ قرض میں مشروط ہے تو ممنوع و مکروہ ہوگا، اور اگر شرط نہ ہو تو گنجائش ہوگی۔ یہ توجیہ بظاہر قواعد کے موافق ہے، اور بہت سے علماء نے اس تفصیل کو قبول کیا ہے؛ لیکن علامہ شامی نے بعض فقہاء کے حوالہ سے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ چونکہ متعارف یہی ہے کہ مرہن شئی مرہون سے نفع اٹھاتا ہے، اور اگر کسی مرہن کو یہ پتہ چل جائے کہ اسے مرہون سے نفع کی اجازت نہ ملے گی تو وہ ہرگز قرض دینے پر آمادہ نہ ہوگا؛ لہذا ”المعروف كالمشروط“ کے ضابطہ سے یہاں بھی ممانعت ہی کو ترجیح ہوگی۔

علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں:

”قلت: وهذا مخالف لعامة المعتمرات من أنه يحل بالإذن، إلا أن يحمل على الديانة وما في المعتمرات“ على الحكم، ثم رأيت في جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطاً صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا، وإلا فلا بأس بالخ، ما في المنح ملخصاً. وأقره ابنه الشيخ صالح. وتعقبه الحموي، بأن ما كان رباً لا يظهر فيه فرق بين الديانة والقضاء. وعلى أنه لا حاجة إلى التوفيق بعد أن الفتوى على ما تقدم: أي من أنه يباح.

أقول: ما في الجواهر يصلح للتوفيق وهو وجيه، وذكروا نظيره فيما لو أهدى المستقرض للمقرض: إن كانت بشرط كره، وإلا فلا. وما نقله الشارح عن الجواهر أيضاً من قوله: لا يضمن يفيد أنه ليس بربا؛ لأن الربا مضمون فيحمل على غير المشروط، وما في الأشباه من الكراهة على المشروط، ويؤيده قول الشارح لا آتي آخر الرهن: إن التعليل بأنه ربا يفيد أن الكراهة تحريمية، فتأمل. وإذا كان مشروطاً ضمن كما أفتى به في الخيرية فيمن رهن شجر زيتون على أن يأكل المرتهن ثمرته نظير صبره بالدين.

قال: قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع، والله تعالى أعلم.

فائدة: قال في التاترخانية ما نصه: ولو استقرض دراهم وسلم حماره إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين حتى يوفيه دينه أو داره ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعليه أجر مثله ولا يكون رهنًا الخ. وقدمناه في الإجازات، فتنبه“ (شامی بیروت ۲۰۱۰-۷۱-۷۱).

”وقد علمت ترجيح القول بأنه رهن، وأنه لا تصح إجارته من البائع“ (شامی بیروت ۲۰۱۰-۷۱-۷۱)

اور ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی اس بحث کا خلاصہ درج ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے، جو قابل لحاظ ہے:

”وإذا أذن الرهن للمرتهن في الانتفاع بالمرهون، جاز مطلقاً عند بعض الحنفية. ومنهم من منعه مطلقاً؛ لأنه ربا أو فيه شبهة الربا، والإذن أو الرضا لا يحل الربا ولا يبيح شبهته. ومنهم من فصل فقال: إن شرط الانتفاع على الرهن في العقد، فهو حرام؛ لأنه ربا، وإن لم يشرط في العقد، فجائز؛ لأنه تبرع من الرهن للمرتهن. والاشتراط كما يكون صريحاً، يكون متعارفاً، والمعروف كالمشروط.“

وهذا التفصيل هو المتفق من روح الشريعة، والغالب من أحوال الناس أنهم عند دفع القرض إنما يريدون الانتفاع، ولو لاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط، وهو مما يُعَيَّن المنع، كما قال ابن عابدين.

وأرى أن الاحتياط في الدين أمر واجب، وكل قرض جر نفعاً مشروطاً أو متعارفاً فهو عند الحنفية ربا، وقد صرح ابن نجيم في الأشباه أنه يكره (أي تحريماً) للمرتهن الانتفاع بالرهن. وقال في التاترخانية ما نصه: ولو استقرض دراهم، وسلم حمارة إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين، حتى يوفيه دينه، أو داره ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعليه أجر مثله، ولا يكون رهناً. وعليه نرى أن ما اعتاده الناس في زماننا من رهن الدور على أن يسكنها المرتهن، ربما يرد إلى الرهن دينه، وهو قرض، غير جائز باتفاق المذاهب، وليس العقد من قبيل بيع الوفاء، لعدم انصراف مقاصد الناس إلى البيع“ (الفقه الإسلامي وأدلته ۱۳۶/۵-۱۳۷-۱۳۷)

اور علامہ عبدالرحمن الجزیری نے اس مسئلہ کی تلخیص درج ذیل عبارت میں فرمائی ہے:

”أما المرتهن بأن في جواز انتفاعه بالمرهون بإذن الرهن خلافاً: فبعضهم يقول: لا يحل الانتفاع بالمرهون ولو أذنه الرهن، سواء كان سبب الدين بيعاً أو قرضاً، لأنه يستوفي دينه كاملاً. فتبقى له المنفعة زيادة بدون مقابل، وهذا هو عين الربا، ولكن الأكثر على أنه يجوز انتفاع المرتهن بالمرهون إذا أذنه الرهن بشرط أن لا يشترط ذلك في العقد؛ لأنه إذا شرطه يكون قرضاً جر نفعاً وهو ربا. ونظير هذا ما لو افترض من شخص مالا ثم أهدى له هدية، فإن كانت الهدية مشروطة، فإنها تكون مكروهة، أما إذا كانت بدون شرط، فإنها جائزة له، وإذا أذنه فليس له الرجوع، فإذا استعمل المرتهن المرهون بإذن الرهن وهلك أثناء استعماله، فإنه يهلك أمانة، فلا شيء على المرتهن ويبقى دينه، أما إذا هلك بعد استعماله أو قبله، فإنه يهلك بالدين“ (الفقه على المذاهب الأربعة كمل بيروت ۵۸۲-).

اس سب تفصیل کا خلاصہ یہی نکلا کہ مرتہن کے لئے مرہون سے انتفاع شبہ سے خالی نہیں ہے اور اس سے احتراز لازم ہے۔

گویا کہ راہن اگر قرض لینے میں مجبور ہو تو اس کے لئے تو گنجائش نکل سکتی ہے؛ لیکن مرتہن کے لئے انتفاع بہر حال مشتبہ ہوگا، اکثر محققین علماء و مفتیان کی رائے یہی ہے۔

جواب (۲) ب:- مرتہن کا شئی مرہون کو کرایہ پر لینا عقد رہن کو باطل کر دیتا ہے؛ لہذا ایسی صورت میں رہن کا معاملہ ختم ہو جائے گا، صرف قرض اور کرایہ داری کا معاملہ باقی رہے گا، اور یہ کرایہ راہن کا حق ہوگا۔ اور مردجہ صورت میں چونکہ کرایہ کی کمی کی بنیاد قرض پر ہے، اس لئے قرض پر نفع اٹھانے کا محظور پایا جائے گا اور یہ بھی ممنوع ہے۔

”قال في الشامي: وأما إذا آجره المشتري وفاءً بإذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتهن بذلك، وحكمه أن الأجرة للراهن الخ. قلت: وإذا آجره بإذنه يبطل الرهن، كما ذكره في حاشيته على الفصولين. (شامی بیروت ۲۷/۷۷۷)“

قال الشيخ عبد الرحمن الجزيري: الحالة الثانية أن يكون المستأجر هو المرتهن ووجد استلام المرهون بالإجارة أو يكون المستأجر أجنبياً عنهما بإذنهما، وفي هذه الحالة يبطل عقد الرهن، وتكون الأجرة للراهن“ (الفقه على المذاهب الأربعة بمجلد ۵۸۳)

جواب (۲) ج:- اس جزء کا جواب [۲] الف میں آچکا ہے۔

جواب (۲) د:- مرتہن کو عام حالات میں شئی مرہون کو فروخت کرنے کا حکم نہیں ہے؛ لیکن اگر راہن اجازت دیدے تو اس کی بیع نافذ ہو جائے گی اور وہ شئی مرہون کو بیچ کر اپنا قرض وصول کر کے مابقیہ رقم راہن کو لوٹا سکتا ہے، قرض سے زائد رقم وصول کرنا درست نہ ہوگا۔

”ليس للمرتهن بيع ثمرة الرهن (درمختار) وفي الشامي: أي إذا لم يبحها له الراهن“ (شامی بیروت ۱۰/۹۳)۔

”ولا يملك راهن ولا مرتهن بيعه بغير رضی الآخر“ (تنوير الألبان مع الدر المختار ۱۰/۹۷)۔

کرایہ داری کے معاملہ میں زرضمانت کا حکم:

جواب (۳):- یہاں اصل معاملہ کرایہ داری کا ہے، اور اس پر جو رقم ضمانت دی جاتی ہے، یہ ابتداء امانت ہوتی

ہے، جس میں اصولاً مالک مکان کو تصرف کا حق نہیں ہوتا؛ لیکن آج کل عمل اور عرف یہ ہے کہ مالک مکان کرایہ دار سے بڑی رقم لے کر اس میں بلا تکلف تصرف کرتا ہے، جس کی کرایہ داری کی طرف سے دلالت اجازت بھی ہوتی ہے، اس صورت حال کی بنا

پر یہ رقم امانت بالآ خردین مضمون بن جاتی ہے، اب اگر باقاعدہ شرط لگا کر اس دین کی بنیاد پر مکان یا دوکان کے کرایہ میں کمی کی جائے گی تو یہ قرض پر نفع ہی کی ایک شکل قرار پائے گی، جو ممنوع ہے؛ لہذا جواز کی شکل سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ کرایہ داری کے معاملہ کو زرضمانت کے ساتھ مشروط نہ قرار دیا جائے، اور زرضمانت کے تناسب سے کرایہ متعین نہ ہو؛ بلکہ اجرت مثل متعین کی جائے، خواہ ضمانت کی رقم کتنی ہی کیوں نہ ہو؛ تاکہ قرض پر نفع کا شبہ نہ رہے۔ ”لأن كل قرض جر نفعاً فهو ربا“ (فتح القدر کتاب الحوائج ۳۵۵/۶، مصنف ابن ابی شیبہ بیروت ۳/۳۳۳)۔

واضح ہو کہ اس معاملہ کو رہن کے درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا؛ کیونکہ اگر کرایہ دار کو مرتہن مانا جائے گا تو عقد اجارہ ہوتے ہی عقد رہن خود بخود باطل ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

”قال في الشامى: وأما إذا آجره المشتري وفاءً بإذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتهن بذلك، وحكمه أن الأجرة للراهن الخ. قلت: وإذا آجره بإذنه يبطل الرهن، كما ذكره في حاشيته على الفصولين“ (شامی بیروت ۷/۴۲۷)۔

”قال الشيخ عبد الرحمن الجزيري: الحالة الثانية أن يكون المستأجر هو المرتهن ووجد استلام المرهون بالإجارة أو يكون المستأجر أجنبياً عنهما بإذنهما، وفي هذه الحالة يبطل عقد الرهن، وتكون الأجرة للراهن“ (الفتاوى المذاهب الأربعة ج ۱ ص ۵۸۳)۔



بیع و فاء کے احکام اور متبادل کی تلاش

ڈاکٹر مفتی محمد شاجہاں ندوی ☆

سوال نمبر (۱) کا جواب:

یہ معاملہ جو ”بیع و فاء“ کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، میرے نزدیک شرعاً منعقد اور درست نہیں ہے، کیونکہ یہ نہ ہر پہلو سے بیع صحیح ہے، اور نہ رہن ہے، بلکہ اس کے اندر بیع مطلق کی بھی کچھ مشابہت ہے، اور بیع فاسد کی بھی مشابہت ہے اور رہن کی بھی مشابہت ہے، اور جو عقد ایسا ملعوبہ ہو، وہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ جہاں یہ عقد بیع کرنے والا بائع سودی قرض سے بچنا چاہتا ہے، وہیں مشتری اپنے قرض پر نفع حاصل کرنا چاہتا ہے، اور بائع کی حاجتمندی کا خوب فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یہ استحصال کی بدترین شکل ہے، کیونکہ عام طور سے ”بیع و فاء“ میں فروخت ہونے والی چیز کی قیمت کم رکھی جاتی ہے، نیز اس کی شاعت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے، جب مشتری بائع ہی کو خرید کر دہ مکان یا جائیداد کرایہ پردے کر معمولی کرایہ سے بڑھ کر اس پر کرایہ عائد کرتا ہے، چنانچہ ان قباحتوں کو دیکھتے ہوئے یہ بیع میرے نزدیک شرعاً منعقد اور درست ہی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بیع کے عام اصول کے خلاف ہے، اور اس میں سود کا شائبہ ہے، اور نبی کریم ﷺ نے صرف سود ہی سے منع نہیں فرمایا ہے، بلکہ سود کے ذریعہ اور دھویں سے بھی ممانعت فرمائی ہے۔

نیز مقاصد شریعت کا بھی تقاضا ہے کہ ہر ایسے عقد کو جو کسی بھی شکل میں سود یا سود کے شائبہ پر مبنی ہو درست نہ قرار

دیا جائے۔

بعض حضرات نے لوگوں کے غیر معمولی تعامل کے پیش نظر ”بیع و فاء“ کو رہن قرار دے کر خریدار مرتہن کے لئے اس سے استفادہ کو درست قرار نہیں دیا ہے، لیکن میرے نزدیک، خواہ عملاً اس کی صورت بالکل رہن کی سی ہو چونکہ ”بیع و فاء“ کرنے والے کا مقصد وفائی بیع سے فائدہ اٹھانا ہے، لہذا یہ معاملہ سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے درست ہی نہیں ہے، چنانچہ خود شیخ مصطفیٰ احمد زرقاء کو اعتراف تھا کہ عام طور سے بیع و فاء میں ثمن بیع کی قیمت سے بہت کم ہوتا ہے، اور اکثر وفائی خریدار سود خوروں میں سے ہوتے ہیں، اور مصر میں عام طور سے ”بیع و فاء“ میں یہ شرط لگائی جاتی تھی کہ اگر بائع ایک معینہ مدت تک

شمن واپس نہیں کرے گا، تو بیع قطعی ہو جائے گی، اور اس طرح قلیل رقم دے کر لوگوں کی جائیداد ہڑپ کر لی جاتی تھی، اسی لئے ۱۹۴۹ھ میں جدید مصری سول قانون نے ”بیع و فاء“ کو باطل قرار دیا، تاکہ وفائی سود خوروں کے مظالم سے محتاج مقروض محفوظ رہیں، اگرچہ فقہاء احناف نے بیع کے قطعی ہونے کی شرط باطل قرار دی تھی (دیکھئے: شرح باز دفعہ ۳۹۶ کے ذیل میں)، لیکن عام لوگ کسی چیز کے رائج ہونے کی صورت میں دقیق فقہی فرقوں کا خیال نہیں رکھتے ہیں، لہذا بیع و فاء کو باطل قرار دینا ہی شریعت کی روح سے ہم آہنگ اور بیع کے عام اصول کے موافق ہے، تاکہ سماج میں نفع خوری کے جذبہ کی بجائے ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پروان چڑھے۔

عقد بیع سے پہلے یا بعد کی شرط کی تفصیل:

واضح رہے کہ متاخرین حنفیہ کی ایک جماعت نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی وعدہ عقد بیع سے بالکل جدا ہو، چاہے وہ عقد بیع سے پہلے کیا جائے یا بعد میں کیا جائے، دونوں صورتوں میں وہ وعدہ اصل عقد بیع کے ساتھ ملحق نہیں ہوگا، اور اس وعدہ کی وجہ سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ یہ بیع شرط کے ساتھ ہوئی ہے، اور نہ یہ لازم آئے گا کہ یہ ”صفقة فی صفقة“ (عقد در عقد) ہے، چنانچہ ابن قاضی سماوہ حنفی رقمطراز ہیں:

”شرطاً شرطاً فاسداً قبل العقد، ثم عقداً لم يبطل العقد، ويبطل لو تقاربا“ (جامع الفصولین ۲/۲۳۷)

(عاقدين نے عقد بیع سے پہلے یا ہم کوئی شرط فاسد کر لی، اس کے بعد آپس میں عقد بیع کیا، تو اس صورت میں (سابق شرط کی بنا پر) عقد باطل نہ ہوگا، البتہ اگر وہ شرط عقد بیع کے اندر ہوتی تو عقد بیع باطل ہو جاتا)۔

خاص بیع و فاء کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں: ”وکذا لو تواضعا الوفاء قبل البيع، ثم عقداً بلا شرط الوفاء، فالعقد جائز، ولا عبرة بالمواضعة السابقة“ (جامع الفصولین ۲/۲۳۷) (ایسے ہی اگر عاقدين عقد بیع سے پہلے قیمت واپس دینے کی صورت میں بیع کے لوٹانے کا وعدہ کر لیں، پھر وفاء کی شرط کے بغیر عقد بیع کر لیں، تو یہ عقد جائز ہے، اور سابقہ اتفاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے)۔

میرے نزدیک یہ موقف درست نہیں ہے، کیونکہ سابقہ وعدہ اور اتفاق کی صورت میں اگرچہ عقد کے اندر کوئی شرط نہیں لگائی گئی ہے، لیکن یہ بلا شرط عقد کا وجود سابقہ وعدہ پر مبنی ہے، جو اگر نہ ہوتا تو بائع یہ عقد بیع نہیں کرتا، چنانچہ علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں: ”وینبغی الفساد لو اتفقا علی بناء العقد علیہ، كما صرحوا به فی بیع الهزل“ (رد المحتار ۲/۲۸۲) (اگر عاقدين سابقہ شرط کی بنیاد پر اس عقد کو انجام دیں تو اس صورت میں یہ عقد فاسد ہونا چاہئے، جیسا کہ ”بیع الهزل“ کی صورت میں فساد کی صراحت فقہاء نے کی ہے)۔

اگرچہ علامہ محمد خالد الاتاسی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ بیع الهزل میں بیع مقصود ہی نہیں ہوتی، لہذا اس عقد کی

بنیاد پر دوسرا عقد کرنا گویا اصلاً بیع نہ کرنا ہے (دیکھئے: شرح المجملہ لآتاسی ۶۱۲/۲) جبکہ بیع وفاء میں یہ صورت نہیں پائی جاتی ہے، لیکن میرے نزدیک رائج علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی بات ہے، کیونکہ سابقہ وعدہ پر یہ بلا شرط عقد یعنی ہے، جو اگر نہ ہوتا تو اس عقد کا وجود نہ ہوتا، لہذا یہ ایک عقد میں دوسرے عقد کی شرط کے درجہ میں اگرچہ حقیقتاً نہیں ہے، لیکن حکماً ضرور ہے، اسی لئے زیادہ تر فقہاء عظام نے عقد کے بعد وفاء کی شرط لگانے کی بات تحریر کی ہے، چنانچہ علامہ قاضی خاں تحریر فرماتے ہیں:

”وان ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع، وبلزومه الوفاء بالوعد، لأن المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (التاوی الخانی، فصل فی الشروط المفسدة فی البیع ۱۳۸/۲) (اگر شرط کے بغیر بیع کی جائے اور اس کے بعد بطور وعدہ شرط کو بیان کر دیا جائے تو بیع جائز رہے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لئے کہ باہمی وعدہ کبھی لازم بھی ہوتا ہے، لہذا اس وعدہ کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم قرار دیا جائے گا)، اور علامہ شامی رقم طراز ہیں:

”وفی جامع الفصولین أيضاً: لو ذکر البیع بلا شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه العدة جاز البیع، ولز الوفاء بالوعد، إذ المواعید قد تكون لازمة، فيجعل لازماً لحاجة الناس“ (رد المحتار باب البیع الفاسد مطلب فی الشرط الفاسد؛ إذ ذکر بعد العقد أوقبله ۲۸۱/۷) (جامع الفصولین میں یہ عبارت بھی موجود ہے کہ اگر عاقدین کسی شرط کے بغیر بیع کریں، اور بعد میں شرط کو بطور وعدہ ذکر کریں، تو بیع جائز رہے گی، اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، اس لئے کہ باہمی وعدے کبھی لازم ہو جاتے ہیں، لہذا یہاں بھی لوگوں کی ضرورت کی بنیاد پر لازم قرار دیا جائے گا)۔ اور ”الدر المختار“ میں ہے:

”ثم إن ذکر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً، ولو بعده علی وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به؛ لأن المواعید قد تكون لازمة لحاجة الناس“ (الدر المختار بہاش رد المحتار کتاب البیوع باب الصرف مطلب فی بیع الوفاء، ۵۳۶/۷) (پھر اگر عاقدین بیع کے اندر یا بیع سے پہلے فسخ کا ذکر کریں، یا بیع کو غیر لازم سمجھیں تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر عقد بیع کے بعد بطور وعدہ ذکر کریں، تو یہ جائز ہے، اور اس کو پورا کرنا لازم ہے، اس لئے کہ وعدے کبھی لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہوتے ہیں)۔

مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ اگر بیع شرط کے بغیر منعقد ہو جائے، پھر اس کے بعد خریدار فروخت کنندہ سے یہ وعدہ کر لے کہ جب وہ قیمت واپس لائے گا، اس وقت وہ اس کو واپس بیچ دے گا، اس صورت میں یہ وعدہ درست ہو جائے گا، اور خریدار کو یہ وعدہ پورا کرنا لازم ہوگا، چنانچہ علامہ حطاب ربیعنی مالکی تحریر کرتے ہیں:

”قال فی معین الحکام: ویجوز للمشتري أن يتطوع للبائع بعد العقد بأنه إن جاءه بالثمن إلى

أجل كذا، فالمبيع له، ويلزم المشتري متى جاء بالثمن في خلال الأجل أو عند انقضائه، أو بعده على القرب منه، ولا يكون للمشتري تفويت في خلال الأجل، فإن فعل بيع أو هبة أو شبه ذلك، نقض إن أراد البائع ورد إليه“ (خطاب ربحی تحریر الکلام ص ۲۳۹، مواہب الجلیل ۲۴۴/۶)۔

(”معین الحکام“ میں فرمایا کہ خریدار کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ عقد ہونے کے بعد بائع کو بطور احسان یہ کہے کہ اگر وہ اتنی مدت تک ثمن لے آئے گا، تو یہ بیع اس کی ہو جائے گی، چنانچہ اگر مدت کے اندر اندر یا مدت پوری ہونے پر یا مدت پوری ہونے کے کچھ بعد فروخت کنندہ ثمن لے آئے، تو خریدار کو اپنا وعدہ پورا کرنا لازم ہوگا، اور خریدار کے لئے جائز نہیں کہ وہ مدت کے اندر بیع کو فوت کر دے، سو وہ اگر دوسرے سے بیع یا ہبہ وغیرہ کر دے، تو اگر بائع چاہے تو خریدار کا کیا ہو معاملہ توڑ دیا جائے گا، اور بیع اسے قیمت کی واپسی کے بعد لوٹا دی جائے گی)۔

لیکن اس عقد بیع کے بعد ہونے والے وعدہ کی حیثیت میرے نزدیک ادبی اور اخلاقی نوعیت کی ہوگی، قانونی حیثیت نہ ہوگی۔

جوابات:

اب سوال میں فرض کی گئی شقوں کا جواب اپنی رائے اور بعض دیگر فقہاء کے مسلک کے مطابق اختصار کے ساتھ درج ہے:

الف - یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے میرے نزدیک شرط فاسد ہے، اس لئے کہ ہر وہ شرط جو تقاضائے عقد کے خلاف ہو اور اس میں عاقدین میں سے کسی کا نفع ہو، اور اس کے ساتھ تعامل بھی جاری نہ ہو، اور نہ ہی شریعت اس کے جواز کے ساتھ وارد ہو، وہ شرط فاسد ہے، ”الدر المختار“ میں ہے:

”لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ، وفیہ نفع لأحدہما، أو فیہ نفع لمبیع ہو من أهل الاستحقاق للنفع، بأن یکون آدمیاً، ولم یجر العرف به، ولم یرد الشرع بجوازہ“ (تنویر الابصار مع الدر المختار کتاب البیوع باب البیع الفاسد ۲۸۲/۷-۲۸۳)۔

(ایسی شرط جو عقد کے تقاضے کے مطابق نہ ہو اور نہ اس کے مناسب ہو اور اس میں عاقدین میں سے کسی کا نفع ہو یا اس میں بیع کا نفع ہو، جبکہ وہ نفع کا استحقاق رکھنے والوں میں سے ہو، جیسا کہ وہ آدمی ہو، اور اس کا رواج بھی نہ ہو اور نہ اس کے جواز کے ساتھ شریعت وارد ہو (وہ شرط فاسد ہے، اس سے عقد بیع فاسد ہو جائے گا)۔

جبکہ بعض وہ فقہاء جو ”بیع وفاء“ کو حکماً بیع مانتے ہیں، جیسا کہ ”الدر المختار“ میں ہے:

”وقیل: بیع یفید الانتفاع به“ (حکمی: الدر المختار کتاب البیوع باب البیع الفاسد ۵۴۶/۷)۔

(اور کہا گیا ہے کہ یہ بیع ہے جو بیع سے فائدہ اٹھانے کو مفید ہے)۔

ان کے نزدیک یہ شرط درست ہے اور خریدار کو دوسرے سے بیچنے کا اختیار نہیں ہے، چنانچہ ”ردالمحتار“ میں ہے:

”إلا أنه لا يملك بيعه“ (ابن عابدین، ردالمحتار کتاب البیوع ۵۳۶/۷) (مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے)۔

ب۔ میرے نزدیک تو یہ بیع درست ہی نہیں ہے، لہذا یہ حکم مرتب ہی نہیں ہوگا۔

البتہ ان بعض فقہاء کے مسلک کے اعتبار سے جو ”بیع وفاء“ کو بعض احکام کے سلسلہ میں صحیح مانتے ہیں، مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہ ہوگا، کیونکہ مشتری فروخت شدہ سامان کی ذات کا مالک نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف اس کی منفعت کا مالک ہوتا ہے، اسی لئے مشتری اس کے اندر کوئی ایسا تصرف نہیں کر سکتا ہے جو اسے کلی یا جزئی طور پر ختم کر دے، کیونکہ وہ بیع کی ذات کا مالک نہیں ہے، اسی وجہ سے حق شفعہ بائع کو حاصل ہوگا، نہ کہ مشتری کو۔

ج۔ میرے نزدیک یہ بیع درست ہی نہیں ہے، لہذا وفاقی بیع سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔

البتہ بعض وہ فقہاء جو بیع وفاء کو بعض احکام کے حق میں مفید مانتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق خریدار کے پاس جب تک وہ سامان رہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، ”المحرر“ میں ہے:

”وذكر الزيلعي أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا

يملك بيعه للغير“ (ابن نجيم، البحر الرائق کتاب البيع، باب خيار الشرط ۱۲/۶)۔

(امام زیلیبی نے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ بیع وفاء جائز اور اپنے بعض احکام کے لئے مفید ہے، یعنی بیع سے

فائدہ اٹھانا حلال ہے، البتہ خریدار دوسرے سے بیچ نہیں سکتا ہے)۔

د۔ خریدار کو کسی دوسرے سے بیچنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع میرے نزدیک درست ہی نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ وہ بعض فقہاء جو ”بیع وفاء“ کو بعض احکام کے حق میں مفید مانتے ہیں، ان کے نزدیک بھی خریدار کو کسی دوسرے سے بیچنے کا حق نہیں ہے، اور نہ ہی مزید قیمت لینے کا حق ہے، اس کی بیع توڑ دی جائے گی، اور بائع یا اس کے ورثہ کو قیمت لوٹا کر بیع واپس لینے کا حق ہوگا، ”الدر المختار“ میں ہے:

”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد“ (الدر المختار ۵۳۸/۷) (اور اگر خریدار سے بیچ دے

تو بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا حق ہے)۔

۲۔ میرے نزدیک ”بیع وفاء“ ہر صورت میں درست نہیں ہے، کیونکہ عقد ”بیع“ کے نام سے ہوا ہے، نہ کہ رہن کے

طور پر، تو پھر کھینچ تان کر اسے ”رہن“ قرار دینا عاقدین کے لفظ اور مقصود کو نظر انداز کر کے عقد کو ایک فرضی شکل دینا ہے، اس

کی اصل اور حقیقی شکل ایک عارضی اور موقت بیع کی ہے جو بیع کے عام اصول کے خلاف ہونے اور سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے۔ البتہ بیع و فاء کو رہن قرار دینے والے فقہاء کی اکثریت ہے، چنانچہ علامہ شامی تحریر کرتے ہیں:

”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی: هو أن يقول: بعث منك علی أن تبعه منی متی جنت بالضمن، فهذا البیع باطل، وهو رهن، وحكمه حکم الرهن، وهو الصحيح“ (رد المحتار ۷/۵۲۶)۔

(جامع الفصولین کے حاشیہ پر جواہر الفتاوی کے حوالہ سے بیع و فاء کی تعریف اس طرح درج ہے کہ وہ، یعنی بیع و فاء یہ ہے کہ آدمی کہے کہ میں نے تجھ سے بیجا بشرطیکہ تم مجھ سے بیع دو جب میں قیمت لے آؤں، تو یہ بیع باطل ہے، اور وہ رہن ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے، اور یہی صحیح ہے)۔

آگے تحریر کرتے ہیں:

”قال فی الخیرية: والذی علیہ الأكثر أنه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام، قال السید الإمام: قلت للإمام الحسن الماتریدی: قد فشا هذا البیع بین الناس، وفیه مفسدة عظيمة، وفتواک أنه رهن، وأنا أيضاً علی ذلك، فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق علی هذا، ونظهره بین الناس، فقال: المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذلك بین الناس، فمن خالفنا فلیبرز نفسه ولیقم دلیله اه، قلت: وبه صدر فی جامع الفصولین فقال رامزاً لفتاوی النسفی: البیع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالاً للربا، وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة، لا یملکه ولا ینتفع به إلا بإذن مالک، وهو ضامن لما أکل من ثمره، وأتلف من شجره، ویسقط الدین بهلاکة لو بقی، ولا یضمن الزیادة، وللبائع استردادہ إذا قضی دینہ، لا فرق عندنا بینہ وبين الرهن فی حکم من الأحکام“ (مرجع سابق ۷/۵۲۶)۔

(الخیرية نامی کتاب میں درج ہے کہ جس موقف پر اکثر فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ بیع و فاء رہن ہے، رہن سے کسی حکم میں جدا نہیں ہے، سید امام نے کہا کہ میں نے امام حسن ماتریدی سے عرض کیا کہ یہ بیع و فاء لوگوں میں عام ہوگئی ہے، اور اس میں بڑا بگاڑ ہے، اور آپ کا فتویٰ ہے کہ یہ رہن ہے، اور میں بھی اسی کا قائل ہوں، چنانچہ درست طریقہ یہ ہے کہ ہم ائمہ کو جمع کریں، اور اس پر اتفاق کر لیں، اور لوگوں کے درمیان اس کا اعلان کر دیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ آج کے دور میں ہمارے فتویٰ کا اعتبار ہے، اور یہ لوگوں کے درمیان ظاہر ہو گیا ہے، سو جو ہمارا مخالف ہو، اسے خود کو ظاہر کرنا چاہئے، اور اپنی دلیل قائم کرنی چاہئے (الخیرية کی عبارت مکمل ہوئی)۔

میں (یعنی علامہ شامی) کہتا ہوں کہ جامع الفصولین میں اس کے رہن ہونے کی صراحت کے ساتھ ہی آغاز کیا ہے، اور فتاویٰ النسفی کی طرف رمز و اشارہ کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ وہ بیع جو سود سے بچنے کے حیلہ میں ہمارے زمانہ کے لوگوں

میں رائج ہے، اور اس کا نام وہ بیع و فاء رکھتے ہیں، وہ حقیقت میں رہن ہے، خریدار اس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور اس کے پھل سے جو کھائے اور اس کے درخت سے جو ضائع کرے، وہ اس کا ضامن ہوگا، اور اس کی ہلاکت سے دین ساقط ہو جائے گا، اگر دین باقی ہو اور دین سے زائد قیمت کا ضامن نہ ہوگا، اور بائع کو واپس لینے کا حق ہوگا، جبکہ اس کا دین ادا کر دے، ہمارے نزدیک اس کے اور رہن کے درمیان کسی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس اس تفصیل کے بعد سوال نمبر (۲) کے تحت مذکور شقوں کا جواب درج ہے:

الف- شی مرہون سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا یغلق الرهن من صاحبه الذی رهنه، له غنمه، و علیہ غرمه“ (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۵۹۳۴، اور اس کی سند صحیح ہے)۔
(شی مرہون کو چھڑانے کا حق اس کے گروی رکھنے والے مالک سے ختم نہیں ہو سکتا ہے، اس کے منافع اور زوائد گروی رکھنے والے مالک کے ہیں، اور اس کی ہلاکت اور نقصان بھی اسی کے ذمہ ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ رہن کے منافع راہن کی ملکیت ہیں، لہذا خریدار مرہن کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ فرمان نبی کریم ﷺ: ”کل قرض جو منفعة فهو ربا“ (مسند الحارث، حدیث نمبر: ۴۳۷، اور اس کی سند ضعیف ہے، البتہ حضرت ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس سے موقوفاً صحیح سند سے ثابت ہے، اور صحابہ اور سلف صالحین کا اسی پر عمل ہے، نیز یہ مفہوم آپ ﷺ سے بہت سی روایتوں میں ثابت ہے) (ہر قرض جو نفع اٹھانے کا سبب بنے تو وہ سود ہے)، میں داخل ہے۔
چونکہ مرہن کا شی مرہون سے فائدہ اٹھانا دین پر ایسی زیادتی ہے، جو عوض سے خالی ہے، لہذا یہ ربا میں داخل ہو کر ممنوع ہوگا، اور اس میں مالک کی اجازت اور عدم اجازت کا کوئی اثر نہ ہوگا، خواہ فائدہ اٹھانے کی شرط صلب عقد میں ہو، یا بعد میں لگائی گئی ہو، یا عقد سے پہلے مشروط ہو، یا مالک نے خود ہی اجازت دی ہو، یہی شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ اور مقاصد شریعت کا تقاضا ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی رقمطراز ہیں:

”والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط، وهو مما يعين المنع“ (رد المحتار کتاب الرهن بحث لا تکل الانتفاع بالرهن ۱۰/۸۳) (لوگوں کے عام حالات یہ ہیں کہ وہ کچھ دے کر نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ طالب قرض کو درہم نہ دیں، اور یہ شرط کے درجہ میں ہے، کیونکہ رواج شرط کے درجہ میں ہے، اور یہ چیز اس صورت (اجازت والی صورت) کے ممنوع ہونے کو متعین کر دیتی ہے)۔ دراصل دین اسلام شفقت و مرحمت کا دین ہے جو لوگوں کو تعاون اور باہمی امداد پر ابھارتا ہے، لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر غلط طریقے سے ان کے مال کھانے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

جبکہ متاخرین فقہاء احناف کے قول جامع کے مطابق وفاقی خریدار وفاقی بیع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اسی طرح بعض فقہاء احناف کے نزدیک راہن کی اجازت سے مرہن مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، کیونکہ راہن شیئی مرہون کے تمام منافع کا مالک ہے تو وہ دوسرے کو مالک بھی بنا سکتا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ استدلال قوی نہیں ہے، کیونکہ مشروع اور درست ہے وہ ہے جو مالک اپنے خالص اختیار اور خوش دلی سے کرے، جبکہ یہ ظاہر راہن حاجتمندی کی مارکی وجہ سے ایسا کرتا ہے، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه“ (مسند احمد حدیث نمبر: ۱۵۲۸۸، مسند ابی یعلیٰ حدیث نمبر: ۱۵۷۰، سنن الدارقطنی، حدیث نمبر: ۲۸۸۵، ۲۸۸۶، اور یہ حدیث حسن لغیرہ ہے) (کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں ہے)۔

لہذا ایسی اجازت عدم اجازت کے درجہ میں ہے۔

ب- اگر وفاقی خریدار مکان یا زمین کا کرایہ مروجہ کرایہ سے بہت کم دے، تو یہ بھی درست نہیں ہے، اور قرض دے کر اس سے فائدہ اٹھانا ہے، اور لوگوں کی مجبوری کا ناجائز استحصال ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین تحریر فرماتے ہیں:

”وفی الخانیة: رجل استقرض دراهم وأسکن المقرض فی داره، قالوا: یجب أجر المثل علی المقرض؟ لأن المستقرض إنما أسکنه فی داره عوضاً عن منفعة القرض لا مجاناً، وكذا لو أخذ المقرض من المستقرض حماراً لیستعمله إلى أن یرد علیه الدرهم ۵، وهذه كثيرة الوقوع“ (رد المحتار کتاب الاجارة مطلب: أسکن المقرض فی داره بحجب أجر المثل، قبیل باب ضمان الأجير ۸۷/۹)۔

(اور فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ ایک شخص نے کچھ درہم قرض لئے، اور قرض دہندہ کو اپنے گھر میں ٹھہرایا، تو فقہاء کہتے ہیں کہ قرض خواہ پر اجرت مثل واجب ہوگی، اس لئے کہ مقروض نے اسے اپنے گھر میں قرض کے نفع کے طور پر ٹھہرایا ہے، مفت نہیں، اور ایسے ہی قرض خواہ (قرض دہندہ) مقروض سے گدھا استعمال کے لئے لے، یہاں تک کہ وہ درہم لوٹا دے (تو اجرت مثل واجب ہوگی) اور اس جیسی صورتیں بکثرت پیش آتی رہتی ہیں)۔

البتہ متاخرین احناف کے قول جامع کے مطابق وفاقی خریدار ہی وفاقی بیع کے منافع کا مالک ہے، لہذا اسے کرایہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وفاقی بائع اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر وفاقی بیع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔

ج- اس عرصہ میں وفاقی خریدار اس شیئی سے کاشت یا اجارہ داری وغیرہ کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ہے، کیونکہ یہ لوگوں کی مجبوری کا استحصال اور قرض پر منفعت حاصل کرنا ہے، اس سلسلہ میں فقہی نقول پیچھے گزر چکی ہیں، لہذا اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ متاخرین فقہاء احناف کے قول جامع کے مطابق وفاقی خریدار کاشت یا اجارہ داری وغیرہ کا فائدہ اٹھا سکتا ہے،

بلکہ استعمال اور فائدہ اٹھانے کے لحاظ سے وفائی بیع سے ہر طرح کا انتفاع کر سکتا ہے، ہاں صرف کلی یا جزئی طور سے وفائی بیع کو ختم نہیں کر سکتا ہے۔

اسی طرح وفائی خریدار اس قول جامع کے مطابق وفائی بائع کو بھی وفائی جائیداد اجرت معلومہ کے بدلہ کرایہ پر دے سکتا ہے، کیونکہ وفائی بیع کے منافع وفائی خریدار کی ملکیت میں، جسے وہ خود بھی استعمال کر سکتا ہے، اور وفائی بائع یا دوسرے کے ساتھ اجارہ کا بھی معاملہ کر سکتا ہے، چنانچہ اگر وفائی مشتری وفائی بائع کو ہی وفائی بیع کرایہ پر دے دے، تو اسے ”بیع الاستعمال“ کہتے ہیں (علی حیدر، درر الاحکام شرح مجلۃ الاحکام ۱/۹۸)۔

لیکن میرے نزدیک یہ موقف کمزور ہے، کیونکہ بیع و فاء ایک عارضی اور موقت بیع ہے جو بیع کے عام اصول کے خلاف ہونے کی وجہ سے درست ہی نہیں ہے، پھر اس شئی سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟
د- خریدار شئی مرہون کا مالک نہیں ہوتا ہے، لہذا اس کو بیچنا اس کے لئے درست نہیں ہے، رہن کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر میعاد مکمل ہونے پر راہن دین ادا نہ کر سکے، تو دیگر قرض خواہوں کے مقابلہ میں شئی مرہون کے ثمن سے مرہون کا دین ادا کیا جائے گا، اور اسے ترجیح حاصل رہے گی۔

اسی طرح متاخرین فقہاء احناف کے قول جامع کے مطابق بھی وفائی خریدار کو بیچنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ وفائی بیع کی ذات کا وہ مالک نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ بدستور وفائی بیع کی ملکیت میں رہتی ہے، لہذا وفائی بائع کو ہی حق شفعہ حاصل ہوگا، اور وفائی بیع میں شفعہ جاری نہ ہوگا، کیونکہ وہ بائع کی ملکیت پر باقی ہے، مجلۃ الاحکام (دفعہ ۳۹۷) میں ہے:

”لیس للبائع ولا للمشتري بيع مبيع الوفاء لشخص آخر“ (نہ ہی وفائی بائع اور نہ ہی وفائی خریدار کو دوسرے شخص سے وفائی بیع کو بیچنے کا حق ہے)۔

اور علی حیدر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

”فليس لأحد من البائع والمشتري أن يبيع مبيع الوفاء من آخر بدون إذن الآخر“ (علی حیدر، درر الاحکام ۱/۳۶۵) (وفائی بائع اور وفائی خریدار میں سے کسی کو حق نہیں کہ وفائی بیع کو دوسرے شخص سے دوسرے فریق کی اجازت کے بغیر بیچ دے)۔

اس سے پتہ چلا کہ بیع و فاء متاخرین احناف کے نزدیک ہر پہلو سے رہن کی طرح نہیں ہے۔

اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ بیع و فاء کی اصل حقیقت ایک عارضی اور موقت بیع کی ہے جو بیع کے عام اصول کے خلاف ہونے اور سود کا ذریعہ بننے کی وجہ سے میری ناقص رائے میں درست نہیں، لہذا اصل بحث اس کے درست ہونے یا نہ ہونے کے سلسلہ میں ہونی چاہئے، نہ کہ پہلے سے کچھ شقیں فرض کر کے ان کا جواب طلب کیا جانا چاہئے۔

متبادل (Alternate):

۱- اگر حاجت مند تاجر ہے اور تجارت کی غرض سے قرض لینا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ شرکت (Partnership) کے طریقے سے مال حاصل کرے، چونکہ یہ دور مادیت اور خود غرضی کا ہے، لہذا لوگ نفع و نقصان کی بنیاد پر مال نہیں لینا چاہتے ہیں، بلکہ قرض طلب کرتے ہیں تاکہ دوسرے کا فائدہ نہ ہو، پھر یہ شکوہ کیا جاتا ہے کہ قرض ملتا نہیں۔

۲- اگر گھر یا شادی بیاہ کے مقصد سے قرض لینا مقصود ہو، اور غیر سودی قرض نہ ملے، تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ دولت ہمیشہ ایک آدمی کے پاس نہیں رہتی ہے، آج میں ضرورتاً اپنی جائیداد بیچ رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس سے بہتر جائیداد اللہ تعالیٰ مجھے حاصل کر دے، اس مقصد کے پیش نظر اسے قطعی بیچ کرنی چاہئے، تاکہ اس کے نیکی کے قصد میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

۳- زر ضمانت کی حیثیت:

زر ضمانت (Money of Scurity) کی حیثیت قرض کی ہے، کیونکہ وہ مضمون ہوتا ہے، یعنی مالک مکان یا دکان اس کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور وہ اس کے رسک (Risk) پر ہوتا ہے، ساتھ ہی زر ضمانت دینے والے کی طرف سے اجازت ہوتی ہے کہ وہ اس رقم کو جہاں چاہے اپنی مرضی کے مطابق اپنی ضروریات میں خرچ کر سکتا ہے، بشرطیکہ دکان یا مکان کی کرایہ داری کا معاملہ ختم ہونے پر اس مال کے مثل اس کو واپس کر دے گا، اور یہ سب عقد قرض کی خصوصیات (Characteristics) ہیں، البتہ احناف کے مسلک کے مطابق اس میں صرف یہ قباحت ہے کہ ان کے نزدیک قرض ایک عقد تبرع اور احسان ہے، اس میں تا جیل درست نہیں ہے، جبکہ جمہور فقہاء کے نزدیک قرض میں تا جیل صحیح ہے، لہذا زمانہ کے تعامل اور عرف و عادت کے پیش نظر جمہور فقہاء کی رائے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ تمام دیون بہ شمول قرض میں تا جیل کے معتبر ہونے کی تائید آیت مدینت: ”یا ایہا الذین آمنوا إذا تداینتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه“ (البقرہ: ۲۸۲) (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقررہ مدت کے لئے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو) سے ہوتی ہے۔

دوسری قباحت یہ ہے کہ مالک دکان یا مکان کرایہ دار سے اس قرض کو مشروط کر دیتا ہے، لہذا یہ ایک شرط فاسدہ ہے، اور اجارہ شرط فاسدہ سے فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس شرط نے رواج کا درجہ اختیار کر لیا ہے، اور جو شرط رواج کا درجہ اختیار کر لے، وہ درست ہو جاتی ہے، نیز یہ باعث نزاع بھی نہیں ہے، اس لئے اس شرط سے اجارہ فاسد نہ ہوگا، چنانچہ فقہاء نے شرط مفسدہ سے اس شرط کو خارج کیا ہے جس کے ساتھ تعامل جاری ہو، جیسا کہ علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

”ولا مما جرى به التعامل بين الناس“ (البدائع، كتاب البيوع، فصل في شرائط الصحة في البيوع ۱۶۹/۵) (اور نہ وہ شرط ایسی ہو جس کے ساتھ لوگوں کے درمیان تعامل جاری ہو)۔

اور فقیہ ابواللیث رحمۃ اللہ علیہ نے تعامل اور عرف کے مد نظر غلام کی خوراک کی ذمہ داری کرایہ دار پر مشروط کرنے کو جائز ٹھہرایا ہے، جیسا کہ ”ہندیہ“ میں ہے:

”رجل استأجر عبداً كل شهر بكذا على أن يكون طعامه على المستأجر، أو دابة على أن يكون علفها على المستأجر، ذكر في الكتاب أنه لا يجوز، قال الفقيه أبو الليث: في الدابة نأخذ بقول المتقدمين، أما في زماننا، فالعبد يأكل من مال المستأجر عادة، كذا في الظهيرية“ (عائلیہ ۴۳۲/۴)۔

(کسی شخص نے ماہانہ ایک متعین رقم کے بدلہ غلام کرایہ پر لیا، اس شرط کے ساتھ کہ اس کا کھانا کرایہ لینے والے پر ہوگا، یا جانور کرایہ پر لیا، اس شرط کے ساتھ کہ اس کا چارہ کرایہ لینے والے پر ہوگا، تو کتاب ”مبسوط“ میں مذکور ہے کہ یہ جائز نہیں، البتہ فقیہ ابواللیث نے کہا کہ جانور میں ہم متقدمین کے قول پر عمل کریں گے، رہا ہمارے زمانہ میں تو غلام کرایہ دار کے مال سے عادتاً کھاتا ہے، ایسا ہی ”الظہیریہ“ میں ہے)۔

اور جب یہ بات متفق ہوگئی کہ زرضمانت کی حیثیت قرض کی ہے، تو مکان یا دکان کے کرایہ کا معاملہ اس شہر یا بازار کے مروجہ کرایہ کے مطابق ہونا چاہئے، چنانچہ مروجہ کرایہ سے کم دینا، خواہ مالک کی رضامندی سے ہو قرض پر نفع اٹھانے کے مرادف ہے جو ”کل قرض جر نفعاً فہو ربا“ (ہر قرض جو نفع کا سبب بنے تو وہ سود ہے) کے قاعدہ میں داخل ہو کر ممنوع ہے، جیسا کہ علامہ کاسانی رقمطراز ہیں:

”وأما الذي يرجع إلى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة، فإن كان لم يجز نحو ما إذا أقرضه دراهم غلة على أن يرد عليه صحاحاً، أو أقرضه وشرط له فيه منفعة، لما روى عن رسول الله ﷺ أنه نهى عن قرض جر نفعاً، ولأن الزيادة المشروطة تشبه الربا؛ لأنها فضل لا يقابله عوض، والتحرز عن حقيقة الربا وعن شبهة الربا واجب“ (کاسانی، البدائع، کتاب القرض ۳۹۵/۷ بیروت، دارالکتب العلمیہ ط: ۲۰۶، ۱۳۰۶ھ-۱۹۸۶ء)۔

(اور رہی وہ شرط جس کا تعلق ذات قرض سے ہے، تو وہ یہ ہے کہ اس میں منفعت کا سبب نہ ہو، تو اگر منفعت کا سبب ہو تو جائز نہیں، جیسے کھوٹ دار درہم قرض دے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ اسے کھرے درہم واپس کرے، یا قرض دے اور ایسی شرط لگائے، جس میں اس کی منفعت ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے قرض سے منع فرمایا جو نفع کا سبب بنے، اور اس لئے کہ ایسی زیادتی جو مشروط ہو، وہ ربا کے مشابہ ہے، اس لئے کہ وہ ایسی زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں

کوئی عوض نہیں، اور حقیقت ربا اور شبہ ربا سے بچنا واجب ہے۔

خلاصہ بحث:

- ۱- بیع و فاء میرے نزدیک نہ بیع صحیح ہے اور نہ رہن، بلکہ اس کی حقیقت ایک عارضی اور موقت بیع کی ہے، جو بیع کے عام اصول کے خلاف ہونے اور ربا یا کم از کم شبہ ربا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہے۔
- ۲- شیخی مرہون یا وفائی بیع سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کرنا درست نہیں ہے، خواہ مالک کی اجازت سے ہو، کیونکہ وہ فائدہ شبہ ربا میں داخل ہے جس میں اجازت کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی ہے۔
- ۳- شیخی مرہون یا وفائی بیع میں خرید و فروخت کا تصرف درست نہیں ہے۔
- ۴- زر ضمانت کی حیثیت میرے نزدیک قرض کی ہے۔
- ۵- قرض کی وجہ سے کرایہ میں کمی درست نہیں ہے، اس جگہ کے مروجہ کرایہ کے مطابق کرایہ مقرر کرنا لازم ہے۔

☆☆☆

بیع و فاء - احکام و مسائل

مولانا خورشید انور اعظمی ☆

علامہ ابن نجیم نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف ”البحر الرائق“ میں بیع و فاء کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:
 ”صورتہ أن يقول البائع للمشتري: بعك منك هذا العين بدین لك علی علی أنى متی
 قضیت الدین فهو لی أو يقول البائع: بعك هذا بكذا علی أنى متی دفعت لك الثمن تدفع العين
 إلي“ (البحر الرائق ۷۶)۔

(اس کی صورت یہ ہے کہ بائع، مشتری سے کہے کہ میں نے تمہیں یہ سامان تمہارے اس قرض کے عوض جو مجھ پر
 ہے اس طور پر فروخت کیا کہ میں جب تمہیں یہ قرض ادا کروں تو وہ سامان میرا ہو جائے گا، یا بائع کہے کہ میں نے تم کو یہ سامان
 اتنے میں اس طور پر فروخت کیا کہ جب میں تمہیں اس کی قیمت ادا کروں گا تو تم مجھے یہ سامان دیدینا)۔

بیع و فاء کا شرعی حکم:

بیع و فاء کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں، علامہ ابن نجیم نے ”البحر الرائق“ (۷۶) میں آٹھ اقوال
 ذکر کئے ہیں، بعض حضرات نے اسے رہن، بعض نے بیع فاسد، بعض نے غیر صحیح، اور بعض نے بیع صحیح، بلکہ جائز و مفید قرار دیا
 ہے، لیکن بیع و فاء کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بظاہر بیع ہے، لیکن فی الواقع وہ رہن ہے، جو سود سے
 بچنے کی ایک تدبیر کے طور پر رواج پاگئی، اس لئے یہ شرعاً درست نہیں ہے، علامہ شامی نے اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کرتے
 ہوئے واضح فرمایا ہے کہ بیع و فاء درحقیقت رہن ہے، اور اس پر رہن کے سارے احکام جاری ہوں گے، چنانچہ ”جواہر
 الفتاویٰ“ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

”هو أن يقول: بعك منك علی أن تبعه منى متی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل، وهو
 رهن، وحكمه حکم الرهن، وهو الصحيح“ (رد المحتار ۷۵۵)۔

(یہ کہے کہ میں نے تم کو اس طور پر فروخت کیا کہ جب میں تمہیں اس کی قیمت دوں تو اسے مجھے بیع دو، یہ بیع باطل

ہے، اور وہ رہن ہے، اس کا حکم رہن کا حکم ہے، یہی صحیح ہے۔
 ”فتاویٰ عالمگیری“ (۲۰۸/۳) میں ہے:

”البيع الذى تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بيع الوفاء، هو فى الحقيقة رهن، وهذا البيع فى يد المشتري كالرهن فى يد المرتهن لا يملكه ولا يطلق له الانتفاع إلا بإذن مالكة“ -
 (وہ بیع جو ہمارے زمانہ میں ربا سے حیلہ کے طور پر متعارف ہے اور لوگ اسے بیع وفاء کہتے ہیں، درحقیقت وہ رہن ہے اور یہ بیع مشتری کے ہاتھ میں ایسا ہے، جیسے مرہن کے ہاتھ میں رہن کہ نہ وہ اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ اس کے مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔)
 علامہ شامی نے قائلین جواز کے موقف کی تشریح کرتے ہوئے بیع وفاء کو رہن قرار دینے کی وجہ ترجیح بھی بتائی ہے،
 تحریر فرماتے ہیں:

”لأن صاحب المال لا يقرض إلا بِنفع والمستقرض محتاج، فأجازوا ذلك لينتفع المقرض بالمبيع وتعارفه الناس، لكنه مخالف للنهي عن بيع وشرط، فلذا رجحوا كونه رهنا“ (رد المحتار ۷/۵۵۱)۔
 (اس وجہ سے کہ صاحب مال فائدہ کے بغیر قرض نہیں دیتا اور قرض لینے والا ضرورت مند ہوتا ہے، اس لئے فقہاء نے اس کی اجازت دی، تاکہ قرض دینے والا فروخت شدہ سامان سے نفع اٹھاسکے، اور لوگوں میں اس کا رواج ہو گیا، لیکن یہ ”بیع وشرط کی ممانعت کے خلاف ہے، اس لئے فقہاء نے اس کے رہن ہونے کو راجح قرار دیا)۔
 برصغیر ہندوپاک کے اصحاب فقہ وفتاویٰ نے بھی عام طور پر اسے رہن ہی قرار دیا ہے، مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی
 ”تظہیر الاموال فی حکم الحرام والحلال“ (ص: ۶۴) میں تحریر فرماتے ہیں:
 ”یہ معاملہ صحیح احکامہ رہن ہے، اور انتفاع حرام، یہی قول بعد بحث مقبول ہے“۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

”راقم الحروف کا نقطہ نظر یہی ہے کہ اس صورت کو ناجائز ہونا چاہئے، یہ رہن کے حکم میں ہے، قرض دینے والا اپنے قرض کی ضمانت کے طور پر اس شے کو اپنی تحویل میں رکھ سکتا ہے، لیکن اس کی مناسب اجرت ادا کئے بغیر اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا، تعامل کی وجہ سے نفع اٹھانا سود کے دائرہ میں آتا ہے، اور تعامل کی وجہ سے سود اور محرمات منصوصہ میں کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی“ (قاموس الفقہ ۲/۳۶۷)۔

اس سلسلہ میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کا فتویٰ نہایت جامع اور بصیرت افروز ہے، لکھتے ہیں:
 ”رہن قصداً و بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سواصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے

حرام ہے، اور اگر وہ بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے، تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، بس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری اضطرار نہیں، (امداد الفتاویٰ ۱۰۷/۳)۔

الف- بیع قرار دینے کی صورت میں شرط لگانے کا مسئلہ:

اگر بیع و فاء کو معاملہ بیع قرار دیا جائے تو اس میں اس بات کی شرط لگانا کہ یہ سامان کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائے، بائع کے ہاتھ ہی اسے فروخت کیا جائے، صحیح نہیں ہے، نبی اکرم ﷺ نے بیع میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے:

”روى أن النبي ﷺ نهى عن بيع و شرط“ (رواه الطبرانی فی المعجم الوسيط، نصب الراية للزيلعي ۱۷/۳) (روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بیع و شرط سے منع فرمایا ہے)۔

اسی وجہ سے فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر بیع میں ایسی شرط لگا دی جائے جو منافی عقد ہو اور اس میں عاقدین میں سے کسی ایک کا فائدہ ہو تو وہ بیع فاسد ہوگی۔

”تنویر الابصار“ میں ہے:

”ولا بيع بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه، وفيه نفع لأحدهما“ (رد المحتار ۲۸۱/۷)۔

(وہ بیع درست نہیں ہے جس میں ایسی شرط لگا دی جائے جو نہ عقد کے موافق ہو اور نہ مناسب اور اس میں عاقدین میں سے کسی ایک کا فائدہ ہو)۔

”مجمع البحرین“ میں ہے:

”ويفسد بشرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد“ (مجمع البحرین ۲۹۴) (بیع ایسی شرط سے فاسد ہو جاتی ہے جو موافق عقد نہ ہو اور اس میں کسی ایک کی منفعت ہو)۔

ب- بیع و فاء میں مالک اول کو سابقہ قیمت پر بیچنے کا مسئلہ:

بیع و فاء کو بیع ماننے کی صورت میں اگر مشتری نے وہ سامان مالک اول کے ہاتھ فروخت کر دیا تو سابقہ قیمت ہی ادا کرنا لازم ہوگی، اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا درست نہ ہوگا، اس لئے کہ بیع فاسد کے حکم میں ہے، اور بیع فاسد میں سامان کا بائع کے پاس کسی بھی صورت میں پہنچ جانا گویا کہ سابقہ بیع کو ختم کر دینا ہے۔

”در مختار“ میں ہے:

”كل مبيع فاسد رده المشتري على بائعه بهبة أو صدقة أو ببيع أو بوجه من الوجوه كإعارة وإجارة وغضب ووقع في يد بائعه فهو مشاركة للبيع“ (رد المحتار ۲۹۱/۷)۔

(بیع فاسد کے جس سامان کو مشتری، ہبہ یا صدقہ یا بیع یا کسی بھی طرح مثلاً اعارہ، اجارہ اور غصب کے ذریعہ بائع کے پاس لوٹا دے اور بائع کے ہاتھ میں چلا جائے تو اس سے بیع ختم ہو جاتی ہے)۔

ج- خریدار عین مملوک سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا:

بیع فاسد میں اگر خریدار نے سامان پر بائع کی اجازت سے قبضہ کیا ہے تو وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ ”در مختار“ میں ہے:

”وَإِذَا قَبِضَ الْمُشْتَرِي الْمَبِيعَ بِرِضَا بَائِعِهِ صَرِيحاً أَوْ دَلَالَةً فِي الْبَيْعِ الْفَاسِدِ وَلَمْ يَنْهَهُ مَلِكُهُ“

(در مختار ۷/۲۸۷)۔

(اگر مشتری، بیع فاسد میں بائع کی رضا سے خواہ صراحتاً ہو یا دلالتاً بیع پر قبضہ کر لے اور بائع اسے نہ روکے تو وہ اس

کا مالک ہو جائے گا)۔

”فتح القدیر“ میں ہے:

”الْفَاسِدُ يَفِيدُ الْمَلِكَ عِنْدَ اتِّصَالِ الْقَبْضِ بِهِ إِذَا كَانَ الْقَبْضُ بِإِذْنِ الْمَالِكِ“ (فتح القدیر ۶/۳۵۶)۔

(بیع فاسد سے، قبضہ پائے جانے کی صورت میں ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، بشرطیکہ قبضہ مالک کی اجازت سے

ہو)۔

لیکن مشتری مالک ہونے کے باوجود عین مملوک سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

شامی میں ہے:

”مَلِكُهُ أَيْ مَلِكًا خَبِيثًا حَرًّا فَلَا يَحِلُّ أَكْلُهُ وَلَا لِبَسِهِ“ (رد المحتار ۷/۲۸۸) (یعنی خبیث و حرام ملکیت کے

طور پر مالک ہو جائے گا، لہذا نہ اس کا کھانا درست ہوگا اور نہ پہننا)۔

”بدائع الصنائع“ میں ہے:

”أَمَّا التَّصَرُّفُ الَّذِي فِيهِ انْتِفَاعٌ بِعَيْنِ الْمَمْلُوكِ كَأَكْلِ الطَّعَامِ وَلِبَسِ الثَّوْبِ وَرُكُوبِ الدَّابَّةِ

وَسُكْنَى الدَّارِ، وَالِاسْتِمْتَاعُ بِالْجَارِيَةِ، فَالْصَّحِيحُ أَنَّهُ لَا يَحِلُّ؛ لِأَنَّ الثَّابِتَ بِهَذَا الْبَيْعِ مَلِكٌ خَبِيثٌ،

وَالْمَلِكُ الْخَبِيثُ لَا يَفِيدُ إِطْلَاقَ الْإِنْتِفَاعِ؛ لِأَنَّهُ وَاجِبُ الرِّفْعِ“ (بدائع ۴/۵۹۰)۔

(رہا وہ تصرف جس میں عین مملوک سے فائدہ اٹھانے کی بات ہو، جیسے کھانا کھانا، کپڑا پہننا، جانور پر سوار ہونا، گھر

میں رہنا، اور باندی سے استمتاع کرنا تو صحیح یہ ہے کہ وہ حلال نہیں ہے، اس وجہ سے کہ اس بیع سے ملک خبیث حاصل ہوتی ہے

اور ملک خبیث سے فائدہ اٹھانے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، اس وجہ سے کہ اس کا ختم کرنا واجب ہے)۔

د- خریدار سے بیچ سکتا ہے:

بیچ فاسد میں عین مملوک سے انتفاع تو درست نہیں ہے، لیکن اس کے علاوہ دیگر امور میں مشتری تصرف کر سکتا ہے، اور اگر ایسے سامان کو کسی دوسرے سے بیچ دے تو درست ہوتا ہے۔

”بدائع الصنائع“ (ص: ۵۹۰) میں ہے:

”إن هذا الملك يفيد المشتري انطلاق تصرف ليس فيه انتفاع بعين الملك بلا خلاف

بين أصحابنا كالبيع والهبة والصدقة والاعتاق والتدبير والكتابة والرهن والإجارة ونحو ذلك“۔

(اس ملکیت سے مشتری کے لئے ایسے تصرف کا ثبوت ہو جاتا ہے جس میں عین ملک سے فائدہ اٹھانے کی بات نہ

ہو، ہمارے اصحاب کے درمیان اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جیسے بیع، ہبہ، صدقہ، اعتاق، تدبیر، کتابت، رهن و اجارہ وغیرہ)۔

”عنایہ شرح ہدایہ“ میں ہے:

”فإن باع المشتري المقبوض بالشراء الفاسد نفذ بيعه، لأنه ملكه بالقبض وكل من ملك

بالقبض شيئاً يملك التصرف فيه“ (عنایہ علی ہاشم الفتح ۶/۹۷)۔

(اگر مشتری نے فاسد طور پر خریدے ہوئے سامان کو قبضہ کے بعد فروخت کر دیا تو اس کی بیع نافذ ہو جائے گی، اس

وجہ سے کہ قبضہ سے وہ اس کا مالک ہو گیا، اور جو شخص قبضہ سے کسی چیز کا مالک ہوتا ہے، اس میں تصرف کا بھی مالک ہو جاتا ہے)۔

”ہدایہ“ میں ہے:

”فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه“ (ہدایہ ۶/۶۳)۔

(اگر مشتری نے اس کو فروخت کر دیا تو اس کی بیع نافذ ہو جائے گی اس وجہ سے کہ وہ اس کا مالک ہو گیا، لہذا اس

میں تصرف کا بھی مالک رہے گا)۔

لیکن خریدار کو چاہئے کہ اس سامان کو سابقہ قیمت پر فروخت کرے، اور اگر اس سامان کو سابقہ سے زیادہ قیمت پر

فروخت کرتا ہے تو اس نفع کو صدقہ کر دے، جیسا کہ علامہ بابر تہی نے ”عنایہ“ میں اس سلسلے میں ”ہدایہ“ کے ایک جزئیے کی توضیح کے لئے ایک اصول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اعلم أن الأموال على نوعين نوع لا يتعين في العقد كالدراهم والدنانير ونوع يتعين

كخلافها، والخبث أيضاً على نوعين خبث لفساد الملك وخبث لعدم الملك، وإذا ظهر هذا فمن

اشتری جاریۃ بیعاً فاسداً و تقابضاً فباعها و ربح فیها تصدق بالربح“ (عناہ ۱۰۳/۶)۔
 (جاننا چاہئے کہ اموال کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ قسم جو عقد میں متعین نہ ہو، مثلاً دراہم و دنانیر دوسری وہ قسم جو متعین ہو، مثلاً ان دونوں کے علاوہ اشیاء اسی طرح خبث کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک فساد ملک کے سبب، دوسرے عدم ملک کے سبب، جب یہ واضح ہو گیا تو جس نے ایک باندی بیع فاسد کے طور پر خریدا اور دونوں نے قبضہ کر لیا پھر مشتری نے اسے فروخت کر کے نفع اٹھایا تو نفع کا صدقہ کر دے)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خریدار اس سامان کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے، مگر سابقہ قیمت سے زائد پر اس کا فروخت کرنا درست نہیں ہے، اور اگر زائد قیمت پر فروخت کرے تو اس نفع کو صدقہ کر دے)۔
 ۲- مذکورہ تفصیلات بیع و فاء کو بیع فاسد ماننے کی صورت میں ہیں، اور اگر اسے رہن قرار دیا جائے تو اس کی تفصیلات حسب صراحت ذیل ہیں:

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، اس لئے کہ مرتہن، شیئی مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، کیونکہ اسے ملکیت جس حاصل ہے، نہ کہ ملکیت انتفاع، علامہ کا سانی لکھتے ہیں:

”لیس للمرتہن أن ینتفع بالمرہون حتی لو کان الرهن عبداً لیس له أن یرتفع منه، وإن کان دابة لیس له أن یركبها وإن کان ثوباً لیس له أن یرتفع منه، وإن کان داراً لیس له أن یرتفع منه، وإن کان مصحفاً لیس له أن یرتفع منه؛ لأن عقد الرهن یفید ملک الحبس لا ملک الانتفاع“ (بدائع الصنائع ۲۱۵/۲)۔
 (مرتہن کے لئے مرہون سے نفع اٹھانا درست نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر رہن غلام ہو تو اس سے خدمت لینا، اور اگر جانور ہو تو اس پر سوار ہونا اور اگر کپڑا ہو تو اس کا پہننا، اور اگر گھر ہو تو اس میں سکونت اختیار کرنا اور اگر قرآن ہو تو اس کا پڑھنا درست نہیں ہے، اس وجہ سے کہ عقد رہن سے ملک جس کا ثبوت ہوتا ہے، نہ کہ ملک انتفاع کا)۔

لیکن اگر رہن، مرتہن کو شیئی مرہون سے نفع اٹھانے کی اجازت دیدے تو اس صورت میں فقہاء احناف کے تین اقوال ہیں، اول یہ کہ مطلقاً جائز ہے، دوم یہ کہ مطلقاً ناجائز ہے، سوم یہ کہ اگر عقد میں نفع حاصل کرنے کی شرط لگائی گئی تو ناجائز اور اگر عقد میں شرط انتفاع نہیں لگائی گئی تو جائز ہے، علامہ شامی کا رجحان عدم جواز کی جانب معلوم ہوتا ہے، جبکہ عام طور پر کتب فقہ میں بصورت اجازت اس کے جواز کی بات کہی گئی ہے۔

ب- بیع و فاء میں اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے تو درست ہوگا، اس وجہ سے کہ مرتہن کے شیئی مرہون کو رہن سے کرایہ پر لینے کی صورت میں رہن باطل اور جارہ ثابت ہو جاتا ہے۔

”ردالمحتار“ میں ہے:

’فالمستاجر ... إن كان هو المرتهن و جدد القبض للإجارة أو أجنبياً بمباشرة أحدهما العقد
بإذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن وولاية القبض للعاقدة“ (ردالمحتار ۱۰/۱۳۰)۔
(کرایہ پر لینے والا اگر مرتهن ہو اور اجارہ کے لئے قبضہ کی تجدید کی ہو یا کسی اجنبی سے راہن و مرتهن دونوں میں
سے کسی ایک نے دوسرے کی اجازت سے عقد اجارہ کیا ہو تو رهن باطل ہو جائے گا اور کرایہ راہن کا ہوگا، اور قبضے کا حق عاقد
کو)۔

”ولو استاجر المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض للإجارة“ (عالمگیری
۲۵۶/۵)۔

(اگر مرتهن نے رهن کو کرایہ پر لے لیا تو اجارہ صحیح ہو گیا اور رهن باطل، بشرطیکہ اجارہ کے لئے قبضہ کی تجدید کی
ہو)۔

”بدائع الصنائع“ میں ہے:

”لو آجره من المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض للإجارة“ (بدائع ۲۱۲/۵)۔
(اگر راہن نے مرتهن کو کرایہ پر دیدیا تو اجارہ صحیح اور رهن باطل ہو گیا، بشرطیکہ اجارہ کے لئے نئے سرے سے قبضہ
کیا ہو)۔

جب اجارہ صحیح ہو گیا تو عاقدین کرایہ کی جو بھی شرح مقرر کریں درست ہوگی، اس لئے کہ اسے مرتهن کی جانب سے
نئے سرے سے اجارہ کا معاملہ تصور کیا جائے گا۔

ج- بیع و فاء کورہن ماننے کی صورت میں اس عرصہ میں خریدار اس شئی سے کسی طرح کا فائدہ مثلاً کاشت کاری یا
اجارہ داری وغیرہ کا حاصل نہیں کر سکتا۔
”البحر الرائق“ میں ہے:

”ولیس للمرتهن ولا للراهن أن يزرع الأرض ولا أن يؤجرها؛ لأنه ليس له الانتفاع بالرهن“
(البحر الرائق ۸/۴۴۱)۔

(مرتهن اور راہن دونوں کے لئے زمین میں کاشت کرنا اور اس کا کرایہ پر دینا درست نہیں ہے، اس وجہ سے کہ
اسے رهن سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل نہیں ہے)۔

مفتی کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں:

”بیع و فاء فی الحقیقت رہن کی صورت ہے، اور رہن میں مرہن کو شیئی مرہون سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں“
(کفایت المفتی ۱۵۶/۸)۔

البتہ اگر رہن اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدے تو مرہن کو اس سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا، علامہ ابن نجیم نے ”مبسوط“ کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے:

”لیس للمرتہن أن ینتفع بالمرہون إلا بإذن الراهن، فإذا أذن له جاز أن یفعل ما أذن له فیہ“
(البحر ۴۳۹/۸)۔

(مرہن کے لئے مرہون سے رہن کی اجازت کے بغیر فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، اور اگر وہ اجازت دیدے تو جس کی بھی مرہن کو اجازت ملی ہے وہ کر سکتا ہے)۔
”بدائع“ (۲۱۳/۵) میں ہے:

”ولیس له أن یؤاجرہ من غیر الراهن بغیر اذنه“ (مرہن کے لئے رہن کی اجازت کے بغیر غیر رہن کو کرایہ پر دینا درست نہیں ہے)۔

”ردالمحتار“ میں ”فتاویٰ خیریہ“ کے حوالے سے ایک جزئیہ موجود ہے:

”أما إذا آجره المشتري و فاء بإذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتہن بذلك و حکمه أن الأجرة للراهن وإن كان بغیر اذنه یتصدق بها أو یردها علی الراهن المذكور وهو أولى صرح به علمائنا“ (ردالمحتار: ۵۳۹)۔

(اگر بیع و فاء کے طور پر خریدنے والا سامان کو بائع کی اجازت سے کرایہ پر دیدے تو وہ مرہن کو رہن کی اجازت کے مثل ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ کرایہ رہن کا ہوگا، اور اگر اس کی اجازت کے بغیر ہو تو کرایہ کو صدقہ کردے یا رہن مذکور کو لوٹادے، یہی بہتر ہے، ہمارے علماء نے اس کی صراحت کی ہے)۔

اور اگر مرہن نے مرہونہ زمین کو بطور مزارعت لے لیا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس میں بیع مرہن کا ہے یا رہن کا، اگر مرہن کا ہے تو رہن باطل ہو جائے گا، اور رہن کا ہے تو نہیں، جیسا کہ ”ردالمحتار“ میں ”بزازیہ“ کے حوالے سے ہے:

”وإن أخذ المرتہن الأرض مزارعة بطل الرهن، ولو البذر منه، ولو من الراهن ل“ (رد المحتار ۱۳۰/۱۰)۔

(اگر مرہن نے زمین کو مزارعت پر لے لیا تو اگر بیع اس کا ہے تو رہن باطل ہو جائے گا اور اگر رہن کا ہے تو نہیں)۔

لیکن محتاط قول یہ ہے کہ رہن کی زمین سے انتفاع درست نہیں ہے، علامہ شامی کا یہی خیال ہے، نیز عصر حاضر کے

اصحاب فقہ و فتاویٰ کا یہی رجحان ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

”فی زمانہ رہن کی زمین کی کاشت و پیداوار اور مکان کی رہائش وغیرہ سے انتفاع کا جو رواج ہو گیا ہے وہ قطعاً ناجائز، خلاف شریعت اور سود میں داخل ہے“ (حلال و حرام: ۳۷۳)۔

د- بیع و فاء میں خریدار شیئی مرہون کو راہن کی اجازت کے بغیر فروخت بھی نہیں کر سکتا۔

”بدائع الصنائع“ میں ہے:

”ولیس له أن یبیع الرهن بغير إذن الراهن، لأن الثابت له لیس إلا ملک الحبس، فأما ملک العين فللراهن والبیع تملیک العين فلا یملکه المرتهن من غیر إذن الراهن“ (بدائع الصنائع ۵/۲۱۲)۔

(مرتهن، رہن کو راہن کی اجازت کے بغیر فروخت نہیں کر سکتا، اس وجہ سے کہ اس کو صرف ملک جس حاصل ہے، رہی ملک عین تو وہ راہن کی ہے، چونکہ بیع میں عین شیئی کا مالک بنانا ہوتا ہے، اس لئے مرتهن، راہن کی اجازت کے بغیر اس کا مالک نہیں ہوگا)۔

اور اگر راہن نے مرتهن کو شیئی مرہون کے فروخت کرنے کی اجازت دیدی تو وہ اسے فروخت کر سکتا ہے، یہ بیع درحقیقت راہن کی جانب سے مانی جائے گی، اور مرتهن اس کی مقررہ قیمت سے اپنے دین کے بقدر لینے کا مجاز ہوگا، جیسا کہ ہدایہ کے ایک جزئیے سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

”وان کان أمره الراهن أن یبیعه فباعه بمائة وقبض المائة قضاء من حقه فی جمع بتسع مائة؛ لأنه لما باعه بإذن الراهن صار کان الراهن استرده باعه بنفسه، ولو کان كذلك یبطله الراهن ویبقی الدين إلا بقدر ما استوفی“ (ہدایہ ۴/۵۳۵)۔

(اور اگر راہن نے مرتهن کو غلام فروخت کرنے کا حکم دیا، اور اس نے سو روپے میں اسے فروخت کر کے اپنے حق کی ادائیگی کے لئے اس پر قبضہ کر لیا تو بعد میں نوسو کا مطالبہ کرے گا، اس وجہ سے کہ جب اس نے راہن کی اجازت سے فروخت کیا تو گویا اس نے اسے واپس لے کر از خود فروخت کیا، اور اگر ایسا ہو تو راہن باطل ہو جاتا ہے اور دین بجز وصول کردہ مقدار کے باقی رہتا ہے)۔

۳- زر ضمانت کا مسئلہ:

آج کل بڑے شہروں میں کرایہ پر دکان و مکان کے حصول کے لئے کرایہ دار کو زر ضمانت کا ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ دکان یا مکان کا مالک اپنے طور پر مطمئن رہے کہ اگر میری دکان یا مکان کرایہ دار کے تصرف میں ہے تو اس کی بھی ایک بڑی رقم میرے پاس ہے، پھر جب کرایہ دار دکان یا مکان خالی کرتا ہے تو مالک اس ضمانت

کی رقم کو واپس لوٹا دیتا ہے، یہ زر ضمانت ”قرض“ ہے، جیسا کہ قرض کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے، ”ردالمحتار“ میں قرض کی تعریف ہے:

”ہو عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لآخر لیرد مثله“ (ردالمحتار ۷/۳۸۸)۔

(وہ ایک عقد مخصوص ہے، جو دوسرے کو مثلی مال دینے پر واقع ہوتا ہے، تاکہ وہ بھی اس کے مثل واپس کرے)۔

اور اگر اس زر ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کمی کی جائے تو درست ہے، اسے قرض پر فائدہ اٹھانا تصور نہیں کیا

جائے گا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

”آج کل صاحب مکان کرایہ دار سے کچھ رقم بطور زر ضمانت حاصل کرتے ہیں، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے، تاکہ

کرایہ دار کے ضرر سے خود کو محفوظ رکھا جاسکے، یہ ایک طرح کرایہ کے ساتھ شرط ہے، جو رواج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے،

اور اگر کوئی شرط رواج کا درجہ اختیار کر لے تو پھر وہ جائز اور درست ہو جاتی ہے، اس لئے جائز ہے“ (حلال و حرام: ۴۰۴)۔



بیع و فاء اور اس کا شرعی حکم

مولانا عبدالقیوم پالنپوری ☆

بیع و فاء کی تعریف:

کسی چیز کو دین یا نقد کے عوض اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا کہ جب بائع دین کی رقم یا ٹمن واپس کرے گا تو اسے بیع لوٹا دی جائے گی، ”بدرالمتقی“ میں لکھا ہے:

”إن صورة بیع الوفاء أن يقول البائع للمشتري بعث منك هذا العين بألف علی أنى لو دفعت إليك ثمنك تدفع العين إلي“ (بدرالمتقی شرح اللمتقی علی ہاشم مجمع الانہر ۲/۲۵۷)۔

(بیع الوفاء کی صورت یہ ہے کہ بیچنے والا خریدار سے کہے کہ یہ چیز میں نے تجھ سے اس شرط کے ساتھ بیچا کہ اگر میں تجھ کو تیرا ٹمن لوٹا دوں، تو وہ چیز تو مجھے واپس کرے گا)۔

صاحب ”کفایہ“ نے ”محیط“ سے یہ تعریف نقل کی ہے:

”بیع الوفاء وهو أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا بما لك علی من الدین علی أنى متى قضيته فهو لی“ (رد المحتار ۳/۲۷۶)۔

(بیع الوفاء یہ ہے کہ بیچنے والا خریدار سے کہے کہ یہ چیز میں نے تجھ سے اس دین کے بدلہ میں بیچی جو تیرا میرے ذمہ ہے اس شرط کے ساتھ کہ جب میں دین ادا کر دوں تو وہ چیز میری ہوگی)۔

ان تعریفوں سے معلوم ہوا کہ بیع الوفاء میں کسی چیز کو چاہے دین کے عوض میں فروخت کیا جائے یا نقد کے ذریعہ کوئی فرق نہیں ہے۔

بیع و فاء کے بارے میں فقہاء کے اقوال:

بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں جس کو صاحب ”فتاویٰ بزازیہ“ نے بسط کے ساتھ بیان کئے

ہیں جس کا اختیار حسب ذیل ہے:

☆ جامعہ نذیریہ کاکوٹی، شمالی گجرات۔

۱- پہلا قول: ابو الحسن ماتریدی، علی سعیدی بخاری، وامام ابو شجاع اور اکثر فقہاء کا ہے کہ بیع باطل ہے (کبیح البہازل) اور تمام احکام میں رہن ہے۔

”وفی جواهر الفتاوی: فهذا البیع باطل وهو رهن، وحکمہ حکم الرهن، وهو الصحیح ۵“
(ردالمحتار ۲۷۶/۳)۔

(جو اہر الفتاوی میں ہے کہ یہ بیع و فاء باطل اور وہ رہن ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے اور یہی صحیح ہے اھ)۔
۲- دوسرا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء صحیح ہے، بعض احکام میں یہ بیع مفید ہے، مشائخ، عرف خاص کی بنیاد پر اس کے صحیح ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔
علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”وقیل هو بیع یفید الانتفاع به، وهذا محتمل لأحد الأمرین، الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملکہ بیعہ قال الزیلعی فی الإکراه: وعلیہ الفتوی“ (ردالمحتار ۲۷۶/۳)۔

(اور کہا گیا ہے کہ بیع و فاء جسے فائدہ اٹھانا میں مفید ہے اور اس میں سے دو میں سے ایک کا احتمال ہے، اول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے اور بعض احکام میں مفید ہے، یعنی مشتری کے لئے اسے فائدہ اٹھانا حلال ہے، مگر یہ کہ مشتری اس کے بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے، علامہ زیلعی نے باب الاکراه میں لکھا ہے کہ اس پر فتویٰ ہے)۔

۳- تیسرا قول قاضی خان وغیرہ کا ہے یہ معاملہ رہن کے لفظ سے ہوا ہے تو رہن ہے۔ لیکن اگر بیع کے لفظ کے ساتھ ہو اور شرط صلب عقد میں یا اسے پہلے ہو یا عقد غیر لازم کے ارادے و نیت سے بیع جائز کے الفاظ سے ہو تو یہ بیع فاسد ہے (دیکھئے: بزازیہ علی العالمگیریہ ۴۰۶/۳)۔

۴- چوتھا قول یہ ہے کہ بیع و فاء جس میں شرط اقالہ عقد بیع کے وقت ہو تو وہ بیع فاسد ہے، ”بزازیہ“ میں ہے:
”القول الرابع ما قال فی العدة واختاره الإمام ظہیر الدین: أنه بیع فاسد، أما لو شرطاه فی البیع یفسد“ (بزازیہ عالمگیری ۴۰۷/۳)۔

(چوتھا قول جس کا ذکر عدۃ میں ہے اور اس سے امام ظہیر الدین نے اختیار کیا ہے کہ یہ بیع فاسد ہے... اگر شرط فسخ عقد بیع میں ہو تو بیع فاسد ہے)۔

۵- پانچواں قول ائمہ خوارج کا اختیار کردہ ہے کہ بیع و فاء بعض صورتوں میں رہن ہے اور بعض صورتوں میں بیع نافذ ہے۔ اور اس قول کی وضاحت میں جو صورتیں رہن کی اور جو صورتیں بیع نافذ کی بیان کی ہیں وہ سب اس صورت کی ہیں، جب کہ معاملہ بیع فسخ کی شرط کے بغیر ہوا ہے اس کے مفہوم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر شرط اقالہ و فسخ صلب عقد میں ہوگی تو اس قول

کے اعتبار سے وہ رہن ہی ہوگی (دیکھئے: بزازیہ علی ہاشمی ہندیہ ۴/۲۰۷)۔

۶- چھٹا قول یہ ہے کہ عقد بیع میں شرط و فاء کا تذکرہ نہ ہو تو یہ معاملہ بیع صحیح اور رہن سے مرکب معاملہ ہے اس قول میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر شرط فسخ کا عقد میں ذکر نہ ہو تو وہ بیع ورہن سے مرکب ہے، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر عقد بیع میں شرط اقالہ و فسخ کا ذکر ہوگا تو وہ مرکب عقد نہ رہے گا، بلکہ رہن ہوگا (دیکھئے: بزازیہ، عالمگیریہ ۴/۲۰۷)۔

ساتواں قول یہ ہے کہ بیع و فاء صحیح نہیں بیع مکروہ کی طرح (اس کو بیع فاسد سے تعبیر نہیں کیا، اس لئے کہ اس میں حق مالک کی وجہ سے، یعنی بائع کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے مشتری کے لئے دوسرے کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں ہے، اور بیع فاسد میں بیع پر قبضہ کے بعد مشتری کے لئے دوسرے کے ہاتھ کراہت کے ساتھ بیچنا جائز ہے اور یہ دوسری بیع نافذ ہوتی ہے) اور مشتری کے لئے اس قول کے اعتبار سے بیع دوسرے کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں ہے، یہ قول علاء الدین بدر، صاحب ہدایہ امام مرغینانی اور الصدر الشہید تاج الاسلام کا ہے (بزازیہ علی ہاشمی ہندیہ ۴/۲۰۸)۔

آٹھواں قول جو بعض محققین کا ہے:

”القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل واحد منهما الفسخ، صحيح في بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في بعض الأحكام حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة... جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما، وقال في البحر: ينبغي أن لا يعدل في الإفناء عن القول الجامع“ (رد المحتار ۵/۲۷۷)۔

(بعض محققین کا قول جامع یہ ہے کہ بیع و فاء فاسد ہے بعض احکام میں یہاں تک کہ ہر ایک کو فسخ کا اختیار ہوگا، اور بعض احکام میں صحیح، جیسے بیع کے منافع اور آمدنی و پیداوار کا حلال ہونا اور بعض احکام میں رہن ہے حتی کہ مشتری اس کی بیع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ اس کے رہن رکھنے کا اور بیع کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائیگا، پس یہ عقد تین عقود سے مرکب ہے، دونوں بدل ان کے مالکوں کے لئے سلامتی و محفوظ رہنے کی شرط کے ساتھ لوگوں کی حاجت کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے)۔

”بزازیہ“ میں اس کے صحیح ہونے کو راجح قرار دیا ہے:

”فإلحاقه بالصحيح أولى قليلاً للفساد وترجيحاً لقول الإمام، فيعتبر المذكور ثمناً“ (بزازیہ،

ہندیہ ۴/۲۱۰)۔

(اس قول پر اس بیع کو صحیح کے ساتھ لاحق کرنا زیادہ اولیٰ ہے، فساد کو کم کرنے کے لئے اور امام صاحب کے قول کو ترجیح دینے کی وجہ سے پس مذکور ثمن مانا جائے گا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ بیع جس میں شرط اقالہ صلب عقد میں موجود و مذکور ہو اس کو تیسرے اور چوتھے قول میں بیع فاسد، ساتویں قول میں بیع غیر صحیح، آٹھویں قول میں عقد جائز (جو مرکب ہے صحیح فاسد اور رہن سے)، دوسرے قول میں بیع صحیح اور پانچویں، چھٹے اور پہلے قول (جو اکثر فقہاء کا قول ہے) میں رہن قرار دیا ہے۔

بیع و فاء کے متعلق اکیڈمی کے ارسال کردہ سوالات کے جوابات:

سوال بیع و فاء درست ہے اور کیا حکماً بیع ہے؟

جواب: ۱- بیع و فاء صورت بیع بشرط اقالہ ہے پس اس عقد میں بیع اور شرط جمع ہو رہے ہیں اور حضور اقدس ﷺ نے بیع و شرط سے منع فرمایا ہے، یہ نص عام ہے اور بیع میں شرط اقالہ کا عرف، عرف خاص ہے، اصل مذہب کے اعتبار سے عرف خاص سے نص عام کی تخصیص جائز نہیں ہے، پس یہ عقد خلاف مقضی عقد بشرط جس کو عرف عام حاصل نہیں کی وجہ سے فاسد ہوگا اور معنی رہن ہے، اس لئے فاسد قرار دینے کے بجائے اکثر فقہاء کرام نے اس کو رہن قرار دیا ہے، بندہ کے نزدیک بھی راجح یہی ہے کہ اس کو رہن قرار دیا جائے، ہاں اگر اس عرف کا عرف عام ہونا طے ہوتا تو یہ صحیح قرار دی جاسکتی تھی اور شرط بھی معتبر مانی جاتی۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”إن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص إنما هو فيما إذا عارض النص الشرعي، فلا يترك به القياس ولا يخص به الأثر بخلاف العرف العام“ (رسائل ابن عابدین ۱۳۱/۲)۔

(بیشک عرف خاص کے عدم اعتبار کا مذہب صرف اس صورت میں ہے، جبکہ وہ نص شرعی (قرآن و حدیث) سے معارض ہو، پس اس کی وجہ سے قیاس نہیں چھوڑا جائے گا اور اس سے نص کی تخصیص نہیں کی جاسکتی، برخلاف عرف عام کے) بیع ہونے پر شرط کا کیسا حکم ہے؟

الف۔ بعض فقہاء کرام اس کو بیع قرار دے رہے ہیں، پھر ان میں سے بعض بیع فاسد، بعض غیر صحیح، بعض صحیح، فاسد و رہن سے مرکب عقد جائز اور بعض صحیح قرار دیتے ہیں۔

جو فقہاء کرام بیع غیر صحیح یا تین سے مرکب یا بیع صحیح قرار دیتے ہیں ان کے اقوال میں ”لا يملك المشتري بيعه“ (مشتري کو اس کے بیچنے کا اختیار نہیں) کی صراحت ہے، پس ان کے یہاں شرط کے موافق مشتری کو دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا اختیار نہیں ہے (ہندیہ ۲۰۶/۴-۲۰۹)۔

البتہ جو فقہاء اس کو بیع فاسد مان رہے ہیں، ان کے نزدیک بیع فاسد کے اصول کے مطابق متعاقدين میں سے ہر ایک پر اس کو فسخ کرنا واجب ہے، اگر کوئی مشتری فسخ کرنے کے بجائے اسے دوسرے کے ہاتھ قبضہ کے بعد بیچ دیتا ہے تو یہ

مکروہ ہے، مگر بیع صحیح اور نافذ ہوگی، ”بزازیہ“ میں لکھا ہے:

”فإن باعه المشتري من غيره أجاوا سوى علاء الدين بدر صحة البيع الثاني؛ لأنه سلمه

البائع الأول برضاہ“ (ہندی علی ہامشہا بزازیہ ۴۰۸/۳)۔

(پس اگر بیع وفاء میں بیع کو مشتری نے بائع کے علاوہ کو بیچا تو علاء الدین بدر کے علاوہ فقہاء نے بیع ثانی کے صحیح

ہونے کا جواب دیا، اس لئے کہ بائع اول نے بیع اپنی رضامندی سے مشتری کو سونپی ہے)۔

اور ”عالمگیری“ میں لکھا ہے:

”ویکره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراءً فاسداً بتمليك أو انتفاع لكن مع هذا لو

تصرف فيه تصرفاً فأنفذ تصرفه، ولا ينقض تصرفه ويبطل به حق البائع في الاسترداد“ (ہندیہ ۱۳۷/۳)۔

(اور مشتری کے لئے بیع فاسد میں مالک بنانے یا فائدہ اٹھانے کا کوئی تصرف کرنا مکروہ ہے، لیکن اس کے باوجود

اس میں اس نے کوئی تصرف کر دیا تو اس کا تصرف نافذ ہوگا اور اس کا تصرف توڑا نہیں جائے گا اور اس سے بائع کے واپس

لینے کا حق باطل ہو جائے گا)۔

سوال: کیا مالک کو بیچنے پر زائد قیمت لے سکتا ہے؟

جواب: ب۔ اگر مشتری نے مالک اول کو بیچا ہے تو سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اسے زائد کا مطالبہ کرنا

درست نہیں ہے، اس لئے بیع فاسد والے قول میں یہ عقد واجب الفسخ تھا، پس مشتری جس ثمن کے عوض مالک سے فروخت

کرے گا وہ شرعاً بیع اول کا نقض و فسخ قرار دیا جائے گا، اس کو بیع جدید نہیں قرار دیا جاسکتا۔

علامہ حصفی در مختار میں تحریر فرماتے ہیں:

”كل مبيع فاسد رده المشتري على بائعه بهبة أو صدقة أو بيع أو بوجه من الوجوه، ووقع في

يد بائعه، فهو مشاركة للبيع ويرى المشتري من ضمانه“ (رد المحتار ۱۷۳/۳)۔

(ہر بیع فاسد کہ جس کو مشتری نے اپنے بائع کو ہبہ، صدقہ، بیع یا کسی عقد سے لوٹا دیا، اور اس پر بائع کا قبضہ ہو گیا تو یہ

معاملہ بیع اول کو ترک و ختم کرنا ہے اور مشتری اب بیع فاسد کے ضمان سے بری ہو جائے گا)۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”فلو باع منه كان نقضاً بالأول“ (رد المحتار ۱۷۴/۳) (بیع فاسد کو اگر بائع سے بیچا تو بیع اول کو ختم اور فسخ کرنا

ہوگا)۔

جو فقہاء کرام بیع غیر صحیح یا صحیح فی بعض الأحكام یا مرکب من الصحیح والفساد والربہن قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی

مشتری کو انتفاع کا حق ہے، بائع کے ثمن واپس کرنے کی صورت میں اس کے لئے بیع لوٹانا ضروری ہے، پس ان اقوال کے اعتبار سے بھی سابق ادا کردہ قیمت ہی بائع پر لازم ہوگی، زیادتی کا مطالبہ کرنا درست نہ ہوگا۔

سوال: کیا خریدار کے لئے اسے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

جواب: ج- بیع غیر صحیح یا بیع صحیح یا تین سے مرکب عقد قرار دینے والوں کے نزدیک اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے،

بیع سے فائدہ اٹھانے کے مانند، جیسا کہ ان اقوال میں صراحت ہے:

”إنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به“ (شامی ۲/۵۷۷) (یہ بیع صحیح ہے اس کے بعض

احکام میں مفید ہے، یعنی بیع سے فائدہ اٹھانے کا حلال ہونا)۔

اسی طرح بیع غیر صحیح کے قول میں یملکہ انتفاعاً کی صراحت ہے (ہندیہ ۲/۴۰۸)۔

قول جامع جو تین سے مرکب ہے کی وضاحت میں لکھا ہے:

”صحیح فی بعض الأحكام كحل الإنزال و منافع المبیع الخ“ (ہندیہ ۲/۴۰۹)۔

(بیع و فاء بعض احکام میں صحیح، جیسے بیع کے منافع اور آمدنی کا حلال ہونا)۔

البتہ جو فقہاء اس کو بیع فاسد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بیع میں تصرف اور اس سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے (ہندیہ

۱۳۷۳)۔

”ہندیہ“ میں لکھا ہے:

”ویکره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراءً فاسداً بتملیک و انتفاع“ (ہندیہ ۱۳۷۳)۔

(اور مشتری کے لئے اس چیز میں جس کو شراءً فاسد کے ساتھ خریدا ہو مالک بنانے اور فائدہ اٹھانے کا تصرف کرنا

مکروہ ہے)۔

سوال: خریدار کا اس سے فائدہ اٹھانا کیسا ہے؟

د- مشتری کا دوسرے کے ہاتھ بچنا اسی ثمن یا زیادہ قیمت کے عوض میں مکروہ، مگر نافذ ہوگا۔ یہ حکم بیع فاسد قرار دینے

کے قول پر ہے۔ اور مشتری پر بیع کی قیمت کا ضمان واجب ہوگا اور جو زیادتی اس کو حاصل ہوگی اس کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔

علامہ حنفی فرماتے ہیں:

”لا يطيب للمشتري ما ربح في مبيع يتعين بالتعيين، بأن باعه بأزيد، لتعلق العقد ببعينه

فتمكن الخبث في الربح فيتصدق به“ (درمختار)۔

(بیع فاسد میں) مشتری کے لئے اس بیع میں جو متعین کرنے سے متعین ہو جاتی ہے جو نفع کمایا ہے وہ اس کے لئے

حلال نہ ہوگا۔ اس طور پر کہ زیادہ قیمت سے بیچا ہوا عقد کے عین کے ساتھ متعلق ہونے کی وجہ سے پس نفع میں خبث پیدا ہو گیا پس وہ اس کا صدقہ کرے گا۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”لتعلق العقد بمال غیرہ“ (رد المحتار ۱۷۹/۳) عقد کے دوسرے کے مال کے ساتھ متعلق ہونے کی وجہ

سے۔

”فتاویٰ عالمگیری“ میں ہے:

”ویکره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراءً فاسداً بتميلك أو انتفاع لكن مع هذا لو

تصرف فيه نفذ تصرفه“ (ہندیہ ۱۳۷/۳)۔

(مشتري کے لئے بیع فاسد میں مالک بنانے یا انتفاع کا کوئی تصرف مکروہ ہے اس کے باوجود اس کا تصرف اس

میں نافذ ہوگا)۔

وفی درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام:

”کان تصرفاً نافذاً ویضمن المشتري بدله (أی قیمتہ فی ذوات القیم ومثلہ فی المثلیات إلی

البائع“ (درر الحکام ۳۱۰)۔

(بیع فاسد میں مشتری نے قبضہ کے بعد بیع میں تصرف کر دیا) تو یہ تصرف نافذ ہوگا اور مشتری بائع کے لئے اس کے

بدل (یعنی ذوات القیم میں قیمت اور مثلیات میں مثل) کا ضامن ہوگا)۔

بیع وفاء کو غیر صحیح یا صحیح یا تین سے مرکب قرار دینے کے قول پر مشتری کے لئے دوسرے کے ہاتھ اس بیع کو بیچنا جائز

نہیں ہے، اس لئے کہ دو قولوں میں مشتری کے لئے صرف انتفاع کا حق ہے، دوسرے کو بیچنے کا حق نہیں اور مرکب والے قول

میں تو بیع رہن ہے بعض احکام میں اور مرتہن کے لئے مرتہن کا بیچنا صحیح نہیں ہے، اگر مشتری نے دوسرے کے ہاتھ بیع دیا ہے تو

بائع یا اس کے ورثاء کے لئے واپس لوٹانے کا حق ہے۔ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد“ (رد المحتار ۲۷۸/۵)۔

(اگر مشتری نے دوسرے کے ہاتھ بیع دیا تو بائع یا اس کے ورثاء کے لئے واپس لینے کا حق ہوگا)۔

سوال ۲- اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو کیا حکم ہوگا؟

جواب: الف- اگر بیع وفاء کو رہن قرار دیا جائے (جیسا کہ اکثر فقہاء کا قول ہے اور ہمارے اکابر میں سے بھی بعض

کے نزدیک راجح یہی ہے اور بندہ بھی اسی کو راجح سمجھتا ہے) تو خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا (جو مشروط یا معروف

ہے) جائز نہیں ہے، مکروہ تحریمی ہے۔

علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”وقیل: لا یحل للمرتہن؛ لأنه ربا وقیل: إن شرطه كان ربا وإلا لا، (الدر المختار)، فی جواهر الفتاوی: إذا كان مشروطاً صار قرضاً فیہ منفعۃ وهو ربا، وإلا فلا بأس“ (رد المحتار ۶/۲۸۲)۔
(ایک قول یہ ہے کہ مرتہن کے لئے رہن سے فائدہ اٹھانا حلال نہیں، دوسرا قول یہ کہ عقد مد میں اس کی شرط ہو تو ربا ہے ورنہ نہیں، ”جواہر الفتاوی“ میں ہے: اگر انتفاع عقد میں مشروط ہے تو ایسا قرض ہے جس میں منفعت (نفع اٹھانا) ہے اور وہ ربا ہے، ورنہ یعنی مشروط نہ ہو تو) کوئی حرج نہیں ہے۔

”ویکفرہ للمرتہن أن ینتفع بالرهن وإن أذن له الراهن“ (الدر المختار مع الرد ۶/۵۲۲)۔

(مرتہن کے لئے شئی مرہون سے فائدہ اٹھانا مکروہ تحریمی ہے اگرچہ اس کی راہن نے اجازت دی ہو)۔

”قال الطحطاوی: قلت: والغالب من أحوال الناس إنما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما یعین المنع“ واللہ اعلم۔
(طحطاوی نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ غالب لوگوں کے احوال میں یہ کہ وہ دراہم کے دیتے وقت رہن سے انتفاع کا ارادہ و نیت رکھتے ہیں اور اگر یہ انتفاع کی اجازت نہ ہوتی تو اس کو دراہم نہ دیتے، اور یہ بمنزلہ شرط کے ہے، معروف مشروط کی طرح ہے، یہ ان میں سے ہے جو ممانعت کو متعین کر دیتا ہے)۔

”والتعلیل بأنه ربا ینفید أن الکراهة تحریمیة فتأمل“ (رد المحتار ۶/۲۸۲)۔

(اور علت بیان کرنا کہ یہ ربا ہے فائدہ دیتا ہے کہ (اس میں انتفاع کی کراہت) کراہت تحریمیہ ہے، پس تو غور

کر لے)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ (شرط) بیع کے اصول و تقاضوں کے خلاف ہے اس لئے بیع درست نہیں ہے، البتہ عملاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز کہا ہے.... اور (خریدار کے لئے جو مرتہن ہے) اس سے استفادہ کا کوئی حق نہیں ہوگا (کتاب الفتاوی ۵/۲۸۰)۔

سوال: ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے

بہت ہی کم ہو تو کیا کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

جواب- جب بیع و فاء رہن کے حکم میں ہے تو اس میں عقد رہن کے بعد اجارہ کا معاملہ ہوا اور عقد رہن کے بعد

اجارہ کا معاملہ کیا جائے گا تو عقد رہن عقد اجارہ سے فسخ ہو جائے گا اور وہ اجارہ ہی رہے گا (دیکھئے: رد المحتار ۶/۵۲۴)۔
 اگر بیع و فاء اور اجارہ کا معاملہ ایک ساتھ ہوا ہے تو بھی عقد میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے اس لئے یہ عقد رہن نہ رہے گا، بلکہ معنی یہ اجارہ بشرط اقراض ہوگا۔ حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں یہ اجارہ بشرط اقراض ہوگا۔
 اور اجارہ میں قرض دینے کی شرط مقتضی عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ اجارہ فاسد ہوگا جس کو فسخ کرنا واجب ہے، اور مروجہ کرایہ سے کم کرایہ مقرر کرنا یہ قرض ہی کی وجہ سے ہے اس لئے ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ کا مصداق ہوگا، اور ربا مضمون ہوتا ہے۔ اس لئے جتنی مدت اس زمین یا مکان کو کرایہ دار استعمال کرے گا اتنے دنوں کی اجرت مثل کی تکمیل لازم ہوگی، رہن کے باب میں علامہ شامی نے ”رد المحتار“ میں نقل کیا ہے:

”إذا كان مشروطاً صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا“ (جواہر الفتاویٰ)۔

(جب عقد میں انتفاع مشروط ہوگا تو ایسا قرض ہوگا جس میں منفعت ہے اور وہ سود ہے)۔

”وإذا كان (الربا والمنفعة في القرض) مشروطاً ضمن كما أفتى به في الخيرية“ (رد المحتار

۶/۴۸۲)۔

(اور اگر ربا عقد میں مشروط ہو تو انتفاع کا ضمان واجب ہوگا، جیسا کہ اس کے مضمون ہونے کا خیر یہ میں فتویٰ دیا

ہے)۔

البتہ اگر اجارہ میں قرض اور ڈپازٹ دینے کے غیر معمولی تعامل اور عرف کو ”عرف عام“ قرار دیا جائے اور اس

اجارہ میں کرایہ مکمل اور اجرت مثل مقرر کیا جائے تو یہ عقد اجارہ شرعاً صحیح ہوگا، استسناً للتعامل۔

”تفسد الإجارة بشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما أفسد البيع مما مر يفسدها“ (الدر

المختار ۵/۳۹)۔

(کرایہ داری کا معاملہ بھی مقتضی عقد کے خلاف شرائط کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے۔ پس مذکورہ شرط میں سے ہر وہ

شرط جو بیع کو فاسد کر دیتی ہیں وہ اجارہ کرایہ داری کا معاملہ) کو بھی فاسد کر دیتی ہیں)۔

سوال: ج- اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت یا اجارہ داری کا) حاصل کر سکتا

ہے یا نہیں؟

جواب: جب بیع و فاء کے ساتھ کرایہ کا بھی معاملہ کیا ہے تو یہ عقد رہن باطل ہو کر اجارہ ہو گیا ہے یا معنی یہ عقد اجارہ

ہے اور مقتضی عقد کے خلاف شرط یا اقراض کی وجہ سے فاسد ہے، اور اجارہ فاسد کا حکم یہ ہے کہ اس کو فسخ کرنا واجب ہے، اس

زمین یا مکان سے فائدہ اٹھانا یا کرایہ پردے کر فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اگر استعمال کرے یا کرایہ پردے گا تو اصل

مالک کو اجرت مثل دینا واجب ہوگا، (اس صورت میں اجرت مثل اصل کرایہ سے زیادہ ہو تو بھی اجرت مثل واجب قرار دیا جائے گا تا کہ ”کل قرض جر نفعاً فهو ربا“ کا مصداق نہ ہو)۔
علامہ حنفی تحریر فرماتے ہیں:

”ولا تملك المنافع بالاجارة الفاسدة بالقبض بخلاف البيع الفاسد، فإن المبيع يملك فيه بالقبض بخلاف فاسد الاجارة، حتى لو قبضها المستأجر ليس له أن يؤجرها، ولو آجرها وجب أجر المثل ولا يكون غاصباً“ (رد المحتار مع الدرر ۴۶۶/۶)۔

(اجارہ فاسدہ کی وجہ سے شئی مؤجر قبضہ کی وجہ سے اس کے منافع مستاجر کے مملوک نہ ہوں گے برخلاف بیع فاسد کے اس لئے کہ اس میں بیع قبضہ کی وجہ سے مملوک ہوتی ہے برخلاف اجارہ فاسدہ کے، حتیٰ کہ اگر مستاجر نے اس پر قبضہ کیا تو اس کے لئے جائز نہیں کہ کرایہ پردے اور اگر دیا تو اجرت مثل واجب ہوگی وہ غاصب شرعاً نہ ہوگا)۔

”حکم الفاسد وجوب أجر المثل بالاستعمال“۔

(فاسدہ اجارہ کا حکم استعمال کی وجہ سے اجرت مثل کا وجوب ہے)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں؟ اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

جواب: خریدار کو اس کے بیچنے کا حق و اختیار نہیں ہے، بائع کی اجازت سے بیچا ہے تو جائز ہے اور جو قیمت وصول ہوگی اس کا بائع راہن ہی حقدار ہوگا، اس لئے کہ یہ اس کی مملوک ہے۔

۳- سوال یہ ہے کہ زرضمانت (ڈپازٹ) کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت و رہن کی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی کرنا جائز ہوگا یا اس سے قرض سے فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

جواب: کرایہ دار سے زرضمانت یا ڈپازٹ کے نام سے مالک مکان یا دکان رقم لیتا ہے وہ امانت یا رہن نہیں ہے، بلکہ قرض ہے۔

یہ رقم امانت اس لئے نہیں ہو سکتی ہے کہ امانت ہونے کی صورت میں مالک مکان کو اس رقم میں کسی طرح کے تصرف کا اختیار نہیں ہونا چاہئے، جبکہ بحالت موجودہ ڈپازٹ کی رقم سے مالکان مکان فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کو اپنے کاروبار میں لگا کر تصرف کرتے ہیں اس سے لامحالہ اس رقم کی حیثیت قرض کی ہو جاتی ہے (فتاویٰ محمودیہ مولانا احمد خانپوری ۹۰/۳)۔

اس رقم کی ابتداء اگرچہ زرضمانت یا رہن کے طور پر ہوئی ہو، مگر اس دور میں اب رہن یا ضمانت کا پہلو مغلوب ہو گیا ہے، اب مالکان مکان یا دکان کا مقصد بڑی رقم حاصل کر کے کاروبار میں لگانا ہے یا اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، لہذا یہ رہن نہیں ہے قرض ہی ہے، مفتی احمد صاحب خانپوری نے بھی اپنے ایک مفصل و طویل فتویٰ میں اس رقم کو قرض قرار دیا ہے۔

مفتی محمد تقی صاحب عثمانی نے بھی اس کو قرض ہی کہا ہے (فتاویٰ عثمانی ۳/۲۲۰-۲۲۱)۔
اب یہ سوال کہ ڈپازٹ کی وجہ سے کرایہ میں کمی کرنا ناجائز ہے، بلکہ سود کی صورت ہو کر حرام ہے، اور یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہے، اگر ڈپازٹ کی وجہ سے کرایہ بالکل ساقط کر دیا ہے تو کرایہ دار پر اجرت مثل واجب ہے۔
”فتاویٰ عالمگیری“ میں لکھا ہے:

”ولو استقرض دراهم وسلم حماره الى المقرض ليستعمل الى شهرين حتى يوفيه دراهم او داراً ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعليه أجر مثله ولا يكون رهنًا“ (ہندیہ ۵/۳۳۴)۔
(اگر دراهم قرض لئے اور مقرض کو اپنا گدھا دو ماہ تک استعمال کے لئے دیا یہاں تک کہ وہ اس کے دراهم ادا کر دے، یا گھر دیا تاکہ وہ اس میں رہے، پس یہ بمنزلہ اجارہ فاسدہ کے ہے اگر اس کو استعمال کرے گا تو اس پر اس کی اجرت مثل واجب ہوگی اور یہ رهن نہ ہوگا)۔

اور اگر ڈپازٹ کی وجہ سے کرایہ میں کمی کی ہے تو کرایہ دار پر مکمل کرایہ دینا واجب ہوگا، اس لئے ربا عقد میں مشروط ہوتو مضمون ہوتا ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”وفي جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطاً صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا... وإذا كان مشروطاً ضمن“ (رد المحتار ۶/۳۸۲)۔

مذکور پہلی صورت بمنزلہ اجارہ فاسدہ کے ہے اور دوسری صورت اجارہ فاسدہ کی ہے، دونوں میں متعاقدین پر واجب ہے کہ اس کو فسخ کر کے از سر نو اجارہ صحیحہ کریں۔

بیع و فاء کی شرعی حیثیت

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی ☆

دنیا کے مختلف ملکوں میں بیع کی ایک خاص قسم رائج ہے، جس میں مبادلتہ المال بالمال بالتراضی اس شرط کے ساتھ ہوتا ہے کہ مشتری بیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کرے گا؛ بلکہ جب بائع وصول کردہ ثمن واپس کر دے تو مشتری بیع واپس کر دے گا۔ گویا اس میں ایک معاملہ بیع کا ہوتا ہے اور ایک شرط یا معاہدہ کا۔ بیع کی اس شکل کو مختلف ملکوں میں ”بیع الوفاء، بیع الأمانة، الرهن المعاد، بیع المعاملة، بیع الإطاعة، بیع الجائز“ اور ”بیع میعاد“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ”رد المحتار“ میں ہے:

”تسمية بیع الوفاء أن فيه عهدا بالوفا من المشتري بأن يرد المبيع على البائع حين رد الثمن وسماه الشافعية بالرهن المعاد، ويسمى بمصر بیع الأمانة وبالشام بیع الإطاعة وبعض الفقهاء يسميه البيع الجائز لعله مبني على أنه بيع صحيح لحاجة التخلص من الربا حتى يسوغ للمشتري أكل ربحه، وبعضهم يسميه بیع المعاملة، ووجهه أن المعاملة ربح الدين، وهذا يشترطه الدائن لينتفع به بمقابلة دينه“ (رد المحتار ۲/۲۳۶-۲۳۷)۔

بیع و فاء کے نام کی وجہ اس میں مشتری سے عہد و فاء ہے کہ جب ثمن لوٹا دے گا تو بیع بائع کو لوٹا دے گا..... اور شواہد نے اس کا نام ”الرهن المعاد“ رکھا ہے اور مصر میں ”بیع الأمانة“ اور شام میں ”بیع الإطاعة“ سے جانا جاتا ہے..... بعض فقہاء اس کا نام ”البيع الجائز“ رکھتے ہیں، شاید ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے، ربو اسے بچنے کے لیے؛ تاکہ مشتری کے لیے اس کے نفع کا استعمال درست ہو جائے اور بعض فقہاء اسے ”بیع المعاملة“ کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قرض سے نفع اٹھانے کا معاملہ ہے، قرض دینے والا خریداری کرتا ہے، تاکہ قرض کے مقابلے میں بیع سے نفع اٹھائے، قرض کے مقابلے میں نفع اٹھانا ہے۔

فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں اس بیع کا تذکرہ چوتھی صدی ہجری سے ملتا ہے۔ امام محمد بن الفضل بخاری

(م ۳۸۱ھ) نے بیع وفا پر بیع باطل کا حکم لگایا ہے؛ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں بیع کی یہ شکل مروج تھی (جو اہر مضمین ۱۰۸/۲، فوائد البیہ ۱۸۴) اس کے بعد زبلیعی نے ”تبيين الحقائق“ میں اس بیع کا ذکر کیا ہے، اسی طرح امام علی (م ۳۶۱ھ) بن الحسین، رکن الاسلام ابو الحسن السندي، امام شجاع محمد بن احمد بن حمزہ اور امام قاضی حسن الماتریدی نے بھی بیع وفا کے مسئلہ پر کلام کیا ہے، ان سب کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے۔

فقہاء نے اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ بیچنا کہ جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو بیع اسے واپس مل جائے گا: ”أن صورته أن يقول البائع للمشتري: بعت منك بألف على أن لو دفعت إليك ثمنك تدفع العين اليّ“ (الدر المنثور على ہاشم مجمع الأثر ۲/۲۵)۔

(اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں اس کو ایک ہزار میں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ جب ثمن لوٹا دوں، تو تم مجھے بیع لوٹا دو گے)۔

”در مختار“ میں ہے:

”و صورته ان يبيعه العين بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين“ (الدر المنثور على ہاشم مجمع الأثر ۲/۲۵)۔

اس کی شکل یہ ہے کہ ہزار میں کسی چیز کو اس شرط پر بیچے کہ جب ثمن لوٹا دے گا تو مشتری بیع بھی لوٹا دے گا۔ ابن قاضی سماوة (م ۸۱۸ھ) جامع الفصولین میں لکھتے ہیں:

”بيع الوفا أن يقول: بعت منك على أن تبعه مني متى جئت بالثمن“ (جامع الفصولین ۱/۲۳۳)۔

بیع وفا یہ ہے کہ کہے: میں تمہیں اس شرط پر بیچ رہا ہوں کہ جب میں ثمن لے کر آؤں تو تم میرے ہاتھ بیچو گے۔ فقہاء کے یہاں بیع وفا کی ایک دوسری قسم یہ بھی منقول ہے کہ کسی نے قرض لیا اور وہ ابھی قرض کی ادائیگی نہیں کر سکتا ہے، اس لیے قرض لینے والے نے قرض کے عوض کوئی سامان قرض دینے والے کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا کہ جب وہ اس کا قرضہ ادا کر دے گا تو وہ اس بیع کو قرض دار کے ہاتھ اسی قیمت پر بیچ دے گا۔ ”عنايہ“ میں ہے:

”و صورته أن يقول البائع للمشتري: بعت منك هذا العين بما لك على من الدين على أني

متى قضيت الدين فهو لي“ (عنايہ علی ہاشم تكملة فتح القدير ۱/۲۴۱)۔

اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں اس چیز کو تم سے تمہارے اس مال کے بدلے فروخت کرتا ہوں جو میرے اوپر قرض ہے، اس شرط پر کہ جب قرض ادا کر دوں تو وہ چیز میری ہے۔

علامہ ابن نجيم نے البحر الرائق (۱/ البحر الرائق ۶/۷) اور ابن عابدین نے رد المحتار (رد المحتار ۳/۲۴۶) میں دونوں

صورتوں کا ذکر کیا ہے۔

چونکہ اس صورت میں مشتری کو ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی، اس لئے وہ بیع کو نہ تو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے اور نہ ہی کرایہ پر دے سکتا ہے، ہبہ بھی نہیں کر سکتا، بیع کی عام صورتوں میں بیع سے بائع کا فروختگی کے بعد کوئی واسطہ اور تعلق باقی نہیں رہتا، جبکہ بیع وفا کا معاملہ اس سلسلے میں مختلف ہے۔ اسی لیے فقہاء نے اس بیع کی شرعی حیثیت پر تفصیلی بحث کی ہے اور جس کا جو نقطہ نظر ہے اس کے تحت الگ الگ ابواب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ابن قدامہ نے ”المغنی“ میں قرض سے انتفاع کے لیے بطور حیلہ خیار اس کا ذکر کیا ہے، جبکہ علامہ ابن حجر پیشی شافعی نے ”الفتاویٰ الکبریٰ“ میں ”بیع الناس“ کے تحت ایک صورت وہ ذکر کی ہے، جو بیع الوفا کی ہے۔

علامہ طاہر بن احمد بن عبدالرشید البخاری (م ۵۴۲ھ)، محمد بن محمد البرزازی (م ۸۲۷ھ) نے بیع فاسد کے تحت اس عقد کا ذکر کیا ہے۔ ”فتاویٰ ہندیہ“ کے مرتبین نے اسے ”باب البيعات المکروهة والارباح الفاسدة“ کے تحت رکھا ہے اور شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی (م ۵۹۲ھ) نے ”کتاب الاکراه“ کے تحت اس صورت کا ذکر کیا ہے، درمختار میں ”باب الکفالة“ سے پہلے تذبذب کے عنوان کے تحت بیع الوفا مذکور ہے، جبکہ امام حسن بن منصور قاضی خان (م ۵۹۲ھ) اور علامہ علاء الدین حصکفی نے ”الدر المننتقی شرح ملتقی الابرار“ میں بیع کی اس صورت کو ”باب الخيارات“ میں ذکر کیا ہے اور علامہ ابن نجیم (م ۹۷۰ھ) نے ”باب الخيارات“ میں اس کا ذکر مناسب قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ویدکر ونه فی موضع من ثلثة: فمنهم کالبرازی من ذکره فی البیع الفاسد، ومنهم من ذکره هنا عند الکلام علی خیار النقد کقاضی خاں ومنهم من ذکره فی الاکراه کالزیلعی، و ذکره هنا أنسب؛ لأنه من أفراد خیار النقد“ (البحر الرائق ۸/۶)۔

فقہاء نے اس کا ذکر تین جگہوں پر کیا ہے: ان میں سے بعض بزازی کی طرح ہیں، جنہوں نے اس کا ذکر بیع فاسد میں کیا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں؛ جنہوں نے خیار نقد کے حوالہ سے کلام کیا ہے، جیسے قاضی خاں اور بعض وہ ہیں جنہوں نے اکراه کے تحت اس کا ذکر کیا ہے، حالانکہ اس کا ذکر خیار کے تحت مناسب ہے، کیونکہ یہ خیار نقد کی ہی ایک شکل ہے۔

۱۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ بیع وفا کی شرعی حیثیت فقہاء کے یہاں مختلف فیہ ہے۔ اور فاسد، باطل، مکروہ، جائز سبھی اقوال موجود ہیں اور ہر ایک کے پاس اس کے دلائل ہیں، جن کے تفصیلی ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے، مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ بیع وفا کی وہ صورت جس میں قرض کا وجود نہ ہو، بلکہ معاملہ بیع کا ہو، اور نفس بیع مشروط نہ ہو، بلکہ انعقاد بیع کے بعد بائع نے مشتری سے یہ وعدہ لے لیا ہو کہ جب ثمن واپس کر دے گا تو بیع اسے لوٹادی جائے گی، یہ صورت عرف و حاجت کی بنیاد پر استسماً درست ہے اور یہ رہن کے حکم میں نہیں ہے۔ علامہ ابن نجیم ”البحر الرائق“ میں لکھتے ہیں:

”انہ بیع صحیح باتفاق مشائخ الزمان للعرف“ (المحرر الرائق ۸/۶)۔
 (عرف کا اعتبار کرتے ہوئے مشائخ زمان کے نزدیک بالاتفاق صحیح ہے)۔
 ”بزازیہ“ میں علامہ سمرقندی کے حوالہ سے قول ثانی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”أنه قال: اتفق مشائخ الزمان على صحة هذا البيع؛ لانهما تلفظ بلفظ البيع ولا عبرة بمجرد النية بلا لفظ“ (بزازی علی البہاش ۴/۳۰۵)۔

(انہوں نے فرمایا کہ مشائخ زمان اس بیع کی صحت پر متفق ہیں؛ اس لیے کہ ان دونوں نے بیع کے لفظ سے معاملہ کیا ہے اور بغیر لفظ کے محض نیت کا اعتبار نہیں ہوتا)۔

صاحب ”ہدایہ“ نے مشائخ سمرقندی کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے اسے ”بیع الجائز“ قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے اس سے انتفاع جائز ہوگا؛ البتہ اس کا بیچنا اور ہبہ کرنا درست نہیں ہوگا۔ امام اکمل الدین محمد الباہر قتی (م ۸۶۷ھ) نے عنایہ میں تحریر فرمایا ہے:

”ومشائخ سمرقند جعلوه بيعا جائزا مفيدا لبعض الأحكام وهو المعتاد بين الناس للحاجة إليه واختاره المصنف رحمه الله وأشار إليه بقوله البيع الجائز المعتاد“ (عنایہ علی تاملتہ فتح القدير ۲۳۱/۹)۔
 اور مشائخ سمرقندی نے اسے بیع جائز قرار دیا ہے؛ جو بعض احکام کے لئے مفید ہے اور وہ اس کے منافع کا حصول ہے، البتہ اس کی بیع اور ہبہ درست نہیں ہے؛ جیسا کہ لوگوں کے درمیان اس کی حاجت کی وجہ سے رائج ہے، اور صاحب ”ہدایہ“ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اپنے قول ”بیع الجائز المعتاد“ سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ اس شکل میں ہے جب شرط وفا کے بغیر بیع کا انعقاد کیا جائے اور عقد کے بعد بطور وعدہ شرط وفا لگائی جائے تو یہ بیع درست ہوگی اور وعدہ کی وفا لازم ہوگی، ابن نجیم لکھتے ہیں:

”وان ذكر البيع بلا شرط ثم شرطه على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء“ (المحرر الرائق ۶/۸)۔

(اگر شرط وفا کے بغیر بیع کا ذکر کیا، پھر وعدہ کے طور پر دونوں شرط پر متفق ہو گئے تو بیع جائز ہوگی اور وعدہ کا ایفاء لازم ہوگا)۔

”فتاویٰ بزازیہ“ میں ہے:

”وان ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد، فيجعل هنا لازما لحاجة الناس إليه“ (بزازی علی البہاش ۴/۳۰۴)۔

اگر بلا شرط بیع کا ذکر کیا اور شرط کا بعد میں وعدہ کے طور پر ذکر کیا تو بیع جائز ہوگی اور ایفائے عہد لازم ہوگا، اس لیے کہ کبھی وعدہ پورا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، یہاں لوگوں کی حاجت کا اعتبار کرتے ہوئے اسے لازم قرار دیا جائے گا۔ صاحب رد المحتار نے الحاوی زاہدی سے اسی پر فتویٰ نقل کیا ہے کہ اگر بیع بغیر شرط وفا اور فسخ کے تذکرے کے بغیر مطلقاً ہوئی ہے اور مشتری نے ثمن مثل ادا کرنے پر بیع کے فسخ کرنے کا وعدہ کیا ہے تو یہ بیع نافذ ہوگی:

”ونص فی الحاوی الزاہدی أن الفتویٰ فی ذلک أن البیع إذا اطلق ولم یدکر فیہ الوفا إلا أن المشتري عهد إلى البائع أنه إن أدنی مثل ثمنه، فإنه یفسخ معه البیع یكون باتا“ (رد المحتار ۳/۲۳۷-۲۳۸)۔

(حاوی زاہدی میں صراحت ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ اگر بیع مطلقاً ہوئی اور وفا کا ذکر نہیں کیا گیا البتہ مشتری نے بائع سے وعدہ کیا کہ جب وہ ثمن مثل ادا کرے گا تو وہ اس بیع کو فسخ کر دے گا تو یہ بیع لازم ہوگی)۔

(الف، ج) اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مشتری کے ذمہ وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوگا اور اسے بائع کے ہاتھ ہی فروخت کرنا ہوگا اور یہ معاملہ احکام خداوندی ”واوفا بالعہد“ (بنی اسرائیل: ۳۴) کے تحت آئے گا۔ بائع کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ وعدہ وفا سے دستبردار ہو جائے، زلیعی نے فتویٰ اسی پر نقل کیا ہے کہ انتفاع تو جائز ہوگا؛ لیکن وہ دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا حقدار نہیں ہے:

”و ذکر الزلیعی أن الفتویٰ علی أنه بیع جائز مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعه للغير“ (البحر الرائق ۸/۶)۔

(زلیعی نے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ یہ بیع جائز ہے، بعض احکام کے جاری ہونے میں مفید ہے؛ یعنی اس سے انتفاع جائز ہے، لیکن وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوگا)۔

البتہ اگر شرط کا ذکر نفس عقد میں کیا ہے، یا دونوں نے فسخ کی شرط ذکر نہیں کیا، مگر شرط وفا کے ساتھ عقد بیع کیا ہے، یا ”البیع الجائز“ کہہ کر عقد کیا اور ان کے نزدیک اس سے مراد عقد غیر لازم ہوتا ہے تو اس صورت میں یہ بیع شرط فاسد کے نفس عقد میں موجود ہونے کی وجہ سے بیع فاسد کے حکم میں ہوگا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک عقد بیع کے بعد بھی یہ شرط لگا یا تو بیع فاسد ہوگی، کیونکہ ان کے نزدیک بعد میں لگائی جانے والی شرط بھی عقد بیع سے لاحق ہو جاتی ہے۔ ”البحر الرائق“ میں ”عدہ“ کے حوالہ سے اسے امام ظہیر الدین کا قول مختار قرار دیا ہے:

”ما قاله فی العدة واختار ظہیر الدین أنه بیع فاسد، ولو التحق بالبیع التحق وأفسده، ولو بعد المجلس علی الصحيح“ (البحر الرائق ۸/۶)۔

(عدہ میں جو کہا اور ظہیر الدین نے اسے اختیار کیا کہ یہ بیع فاسد ہے، اگر بیع سے شرط کو ملحق کیا تو شرط ملحق ہو جائے

گی اور صحیح قول کے مطابق بیع کو فاسد کر دے گی اگرچہ مجلس کے بعد ہو۔

(ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، زائد کا مطالبہ وعدہ کے خلاف ہوگا۔

(د) اس بیع میں خریدار کی ملکیت اس قدر قوی نہیں ہے کہ وہ اس کو بیچ سکے، اس لیے مشتری کا کسی دوسرے کے ہاتھ بیع کا بیچنا جائز نہیں ہوگا اور یہ بیع، بیع اکراہ کی طرح نافذ نہیں ہوگا، نیز بیع کا لوٹنا بائع اول کی طرف ضروری ہوگا؛ اس لئے کہ بیع وفا میں بیع کا لوٹنا ناحق عہد ہے، اور اس معاملے میں مشتری ثانی اور بائع اول کا حق برابر ہے تو پہلے کا حق دوسرے کے حق کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا۔ ”عنایۃ“ میں ہے:

”لان الفساد فی البیاعات الفاسدة لحق الشرع، وقد علق بالبیع الثانی حق العبد وحقه مقدم علی حق اللہ تعالیٰ لحاجته، أما ههنا فالرد لحق العبد وهما سواء فلا یبطل حق الأول لحق الثانی“ (عنایۃ علی تلمیذ فتح القدیر ۲۴۱/۹)۔

(اس لیے کہ بیوع فاسدہ میں فساد حق شرع کی وجہ سے ہے اور ثانی (وفا، مکروہ) میں حق عہد کی وجہ سے ہے اور بندے کے حاجت مند ہونے کی وجہ سے اس کا حق، اللہ کے حق پر مقدم ہے، بہر حال موجودہ شکل میں بیع کا لوٹنا نافذ نہ ہونے کا حق ہے اور دونوں اس میں برابر ہیں، اس لیے پہلے کا حق دوسرے کے حق کی وجہ سے باطل نہیں ہوگا)۔

اور بائع سے مزید قیمت کا مطالبہ بھی صحیح نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ بیع ثانی نہیں ہے، جس میں اختیار ہوتا ہے، یہ تو وعدہ کے مطابق متعینہ ثمن واپس کرنے کی صورت میں بیع کا لوٹنا دینا ہے۔

اب اگر مشتری کے بجائے بائع نے ہی بیع وفا کو دوسرے کے ہاتھ بیع لازم کے طور پر بیچ دیا تو یہ بیع مشتری اول کی اجازت پر موقوف ہوگی اور محض مشتری اول کو ثمن واپس کرنا کافی نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کی اجازت بھی ضروری ہوگی:

”فإن المبیع وفاء إذ باع البائع باتا حتی توقف علی إجازة المشتري وفاء فقضى ثمن مشتری الوفا والفسخ ذلک انعقد بقضاء الثمن لا یصیر البیع الموقوف جائزاً، الا أنه العقد موقوفاً علی إجازة مشتری فلا یجوز إلا بإجازته“ (جامع الفصولین ۲۴۰/۱)۔

(جب بیع وفا کو بائع نے بیع لازم کے طور پر بیچ دیا تو یہ بیع مشتری وفا کی اجازت پر موقوف ہوگی، مشتری وفا کو ثمن ادا کر دیا تو ثمن کی ادائیگی سے بیع وفا فسخ نہیں ہوگا اور بیع موقوف جائز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ عقد مشتری کی اجازت پر موقوف تھا تو بغیر اس کی اجازت کے درست نہیں ہوگا)۔

بیع وفا کی دوسری صورت یہ ہے کہ بیع کو دین کے بدلے اس شرط پر بیچا جائے کہ جب وہ دین واپس کر دے گا تو مشتری اسے بیع واپس کر دے گا، یہ واضح طور پر رہن ہے، اور اس پر رہن کے احکام نافذ ہوں گے۔ یعنی مشتری بیع کا مالک

نہیں ہوگا اور فروخت کرنے والے کی اجازت کے بغیر مشتری بیع سے نفع نہیں حاصل کر سکتا، اگر بیع ہلاک ہو گیا تو بائع سے دین ساقط ہو جائے گا۔ اور مشتری پر تاوان لازم نہیں آئے گا، کیونکہ بیع اس کے پاس امانت تھی۔ علامہ ابن نجیم نے ”البحر الرائق“ میں بزازیہ کے حوالہ سے اس مسئلہ میں آٹھ اقوال نقل کیے ہیں، جن میں پہلا قول جسے صاحب ”المنظومة“ نے اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے:

”أنه رهن حقيقة فلا يملكه المشتري ولا ينتفع به إلا بإذن البائع ويضمن ما أكل من نذله وما اتلف من الشجر ويسقط الدين بهلاكه ولا يضمن ما زاد كالأمانة ويسترد عند قضاء الدين“ (البحر الرائق ۸/۶)۔
(یہ حقیقتاً رهن ہے، اس لیے مشتری، بیع وفا کا مالک نہیں ہوگا اور بائع کی اجازت کے بغیر اس سے نفع نہیں حاصل کرے گا اور ضامن ہوگا جو کچھ بیع کے ثمرات سے کھالیا یا درخت تلف ہو گیا، تو دین بیع کی ہلاکت کی وجہ سے ساقط ہو جائے گا اور مالیت زائد ہونے کے باوجود امانت کی طرح تاوان نہیں دینا ہوگا اور قرض کی ادائیگی کے بعد بیع واپس کر دینا ہوگا)۔
”عنایہ“ میں ہے:

”لا فرق بیننا بینہ وبين الرهن“ (عنایہ علی تاملہ فتح القدر ۲۴۱/۹)۔

(ہمارے نزدیک بیع وفا اور رهن کے درمیان فرق نہیں ہے)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ معاملہ اگرچہ بظاہر بیع کا ہے؛ لیکن دونوں کا مقصود ”رهن“ ہی ہے، فرق اتنا ہے کہ جو غرض ہے اس کو دونوں زبان پر نہیں لاتے ہیں اور جو ذکر کرتے ہیں، وہ مقصود نہیں ہے، یعنی الفاظ اور صیغہ تو بیع سے متعلق ہے اور مقصود بیع کو ”رهن“ رکھنا ہے، اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ تصرفات میں اعتبار معانی و مقاصد کا ہوتا ہے الفاظ اور ظاہری شکل و صورت کا نہیں۔ اس کی مثالیں فقہ میں بہت ساری ہیں۔ اس کی وجہ سے حوالہ عدم برأت کی شرط کے ساتھ کفالت کے حکم میں چلا جاتا ہے اور کفالت پر برأت کی شرط کے ساتھ حوالہ کے احکام جاری ہوتے ہیں، مہر مسمی کے ذکر کے ساتھ دو گواہوں کی موجودگی میں عورت کا نفس ہبہ کرنا نکاح قرار پاتا ہے اور استصناع فاسد بیان مدت کی وجہ سے سلم بن جاتا ہے۔ ”جامع الفصولین“ میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

”والعبرة في التصرفات للمقاصد والمعاني لا للالفاظ والمباني، فإن الحوالة بشرط أن لا

يرأه كفالة والكفالة بشرط البراءة حوالة وهبة الحرة نفسها بحضور الشهود مع تسمية المهر نكاح والاستصناع الفاسد إذا ضرب فيه الأجل سلم، نظائره كثيرة“ (جامع الفصولین ۲۳۵/۱)۔

(تصرفات میں مقاصد و مطلوب کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ اور ظاہری مفہوم معتبر نہیں ہوتا؛ اسی لیے حوالہ عدم براءت کی شرط کے ساتھ کفالت ہے اور کفالت براءت کی شرط کے ساتھ حوالہ، آزاد عورت کا مہر کے ذکر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں

نفس کا ہبہ کرنا نکاح ہے اور استصناع فاسد میں جب مدت ذکر کردی جائے تو مسلم ہے اور اس کی نظیریں بہت ہیں)۔

(الف، ج) فقہاء کی جو عبارتیں اوپر ذکر کی گئیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع وفا میں جب تک بیع مشتری کے پاس رہے گا، اس سے انتفاع جائز ہوگا؛ کیونکہ رہن یہ صرف بائع کے حق میں ہے، اگر عقد بیع میں شرط وفا کا ذکر نہ ہو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، تو مشتری کے حق میں یہ بیع صحیح ہے، لہذا اسے بیع سے انتفاع کا پورا حق ہے، وہ ثمن کی واپسی تک اس پر کاشت کر سکتا ہے، اسے اجارہ پردے سکتا ہے، کیونکہ یہ بھی منافع کے حصول کی ایک شکل ہے؛ البتہ اگر بائع نے ثمن واپس کر دیا تو مشتری کو بیع کے لوٹانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے؛ اور ثمن کی واپسی کے ساتھ ہی اجارہ بھی باطل ہو جائے گا۔ اس کی نظیر فقہاء کے یہاں ”ہبہ بشرط العوض“ اور ”ہبہ فی مرض الموت“ کی ہے جس میں دو احکام جاری ہوتے ہیں، اسی طرح بیع وفا میں بھی بائع اور مشتری کے اعتبار سے اس عقد کا الگ الگ حکم ہوگا، بائع کے حق میں رہن ہونے کی وجہ سے مشتری کے لیے اس کا فروخت کرنا نہ تو موجودہ ثمن پر اور نہ ہی زائد قیمت پر جائز ہوگا۔ اور مشتری کو ثمن قبول کرنے اور بائع کی طرف بیع کو لوٹانے پر مجبور کیا جائے گا، اور عقد بیع میں شرط وفا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے مشتری کے حق میں یہ بیع ہوگا اور اسے بیع سے انتفاع کا حق ہوگا۔ سود کی لعنت سے بچنے اور لوگوں کی حاجت کا خیال کرتے ہوئے یہ جائز قرار پائے گا۔ جامع الفصولین میں ہے:

”بعض مشائخ زماننا قالوا الشرط لو لم یکن فی العقد جعلناہ بیعاً صحیحاً فی حق مشتری حتی ینتفع بالمبیع کسائر أملاکہ وجعلناہ رہناً فی حق البائع حتی لم یجز بیعہ ویجبر مشتری علی قبول الثمن ورد المبیع علی بائعہ، لأن هذا البیع مرکب منہما کھبۃ بشرط عوض وھبۃ فی المرض وکتیر من الأحکام یکون لہ حکمان وانا جعلناہ کذالک لحاجۃ الناس حذراً عن الربا“ (جامع الفصولین ۱/۲۳۷)۔

(ہمارے زمانے کے بعض مشائخ کا قول ہے کہ شرط وفا کا ذکر عقد میں نہ ہو تو مشتری کے حق میں ہم اسے بیع صحیح قرار دیں گے، وہ بیع سے تمام املاک کی طرح نفع حاصل کر سکتا ہے اور بائع کے حق میں اسے رہن قرار دیں گے، تو مشتری کے لیے بیع کا بیچنا جائز نہیں ہوگا اور مشتری پر ثمن کے قبول کرنے اور بیع کے لوٹانے کے لیے جبر کیا جائے گا، اس لیے کہ یہ بیع دونوں سے مرکب ہے جیسے ہبہ بشرط عوض اور ہبہ فی مرض الموت اور بہت سارے مسائل کے دو احکام الگ الگ ہوتے ہیں اور ہم نے اسے لوگوں کی حاجت اور ربوا سے بچنے کے لیے اختیار کیا ہے)۔

(ب) ہندوستان کے بعض شہروں میں خریداری کا یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ قیمت مکمل ادا کرنے کے بعد مشتری بطور کرایہ کی مختصر سی رقم ماہ ب ماہ ادا کرتا ہے اور مشتری کی ملکیت اس قدر تام ہوتی ہے کہ اسے مالکانہ تصرفانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، یہ صورت بیع وفا کی نہیں ہے۔ بیع وفا میں بیچنے کا حق مشتری کو نہیں ملتا، اس لیے کرایہ کے طور پر دی جانے والی رقم اصلاً کرایہ نہیں، بلڈنگ کا منتسب ہے جو عمارت کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے لیا جاتا ہے اور بعض شہروں میں منتسب کے نام

سے ہی لیا جاتا ہے، بعض حضرات جو قیمت لی گئی اسے عمارت کی قیمت قرار دیتے ہیں اور جو کرایہ لیا جاتا ہے، اسے زمین کا کرایہ مانتے ہیں؛ اس صورت میں عمارت کے منہدم ہونے کی صورت میں کرایہ دار کا زمین پر کوئی حق باقی نہیں رہے گا۔ اس رائے کو تقویٰ اس سے بھی ملتی ہے کہ کبھی اصل عمارت کا وجود نہیں ہوتا اور مالک زمین پیشگی قیمت لے کر اسی رقم سے عمارت تیار کرتا ہے، اس طرح عمارت تو کرایہ دار کی ہو جاتی ہے اور زمین مالک کی باقی رہتی ہے۔

(۳) اگر خریداری میں حق ملکیت نہیں حاصل ہوا اور دی گئی رقم مکان یا زمین چھوڑتے وقت واپس مل جائے گی تو یہ زر ضمانت ہے، شمن نہیں، اور اس زر ضمانت کی حیثیت قرض اور رہن دونوں کی ہو سکتی ہے، لیکن قرض ماننے میں دشواری یہ ہے کہ جو قرض مشروط بالمعاملہ ہو وہ ریلا ہو جاتا ہے اور رہن ماننے میں یہ اشکال ہے کہ امانات اور جس چیز کو اجرت پر لیا جائے اس کے عوض رہن رکھنا درست نہیں ہے (فتاویٰ قاضی خاں ۵۹۶/۳) ممنوعات دونوں طرف ہیں؛ لیکن اسے رہن قرار دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہ رقم اسی لیے لی جاتی ہے، تاکہ کرایہ دار مکان و دوکان وغیرہ پر غاصبانہ قبضہ نہ کر سکے، فقہی نقطہ نظر سے اس پر رہن کی تعریف بھی صادق آتی ہے:

”حبس شئی بحق استیفاءہ ای استیفاء الحق من ذلک الشئی“ (مجمع الا نہر ۵۸۳)۔

(کسی حق کے بدلے کسی چیز کو مجبوس کرنا کہ اس چیز کے ذریعہ حق کی ادائیگی کی جاسکے)۔

لغوی اعتبار سے دیکھیں تو رہن کی تعریف اس پر کچھ زیادہ ہی صادق آتی ہے:

”الرهن هو لغة حبس الشئی مطلقا بأی سبب كان ذکر فی الاشباہ فی بحث الدین

إن حمل الرهن علی المعنی اللغوی غیر بعید“ (شامی ۵/۳۱۷)۔

(رہن کے لغوی معنی کسی بھی سبب سے کسی چیز کا مجبوس کرنا ہے اشباہ میں دین کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ معنی لغوی پر

رہن کو مجبوس کرنا مستبعد نہیں ہے)۔

رہ گئی بات امانات کے عوض رہن رکھنے کی تو صاحب ”المحرر الرائق“ علامہ ابن نجیم نے لغوی معنی پر مجبوس کرتے

ہوئے امانت کے عوض رہن رکھنے کی اجازت دی ہے، شامی کی تصریحات سے بھی اس کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے، گواصل

مذہب یہی ہے کہ امانات کے بدلے میں رہن نہیں رکھا جاسکتا، مگر عرف و عادات اور احوال کے تغیرات سے احکام بدلتے ہیں

اور کبھی اصل مسلک و مذہب سے عدول کی بھی اجازت دی جاتی ہے۔ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

”ثم اعلم أن کثیرا من الأحکام التي نص علیہ المجتهد صاحب المذہب بناء علی ما كان فی

عرفه وزمانه قد تغیر بتغییر الأزمان بسبب فساد أهل الزمان أو عموم الضرورة“

(جاننا چاہئے کہ بہت سارے احکام جس پر صاحب مذہب مجتہد کی صراحت عرف اور زمانہ کی بنا ہے پر زمانہ کے

تغیر سے بدل جاتے ہیں، اہل زمانہ کے بگاڑ اور عمومی ضرورتوں کے سبب)۔

یہاں ایک اشکال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اسی رقم سے دوکان و مکان کی تعمیر ہوتی ہے تو حق و جوب سے پہلے ہی رہن رکھنا لازم آتا ہے، فقہاء احناف نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور یہ بھی صراحت مذکور ہے کہ اثمان اور اموال نقدیہ کو بھی رہن رکھا جاسکتا ہے۔ ”البحر الرائق“ میں ہے:

”وصح رهن الحجرین والمکیل والموزون، المراد بالحجرین الذهب والفضة وانما جاز رهن هذه الأشياء لامکان الاستيفاء منها، فكانت محلا للرهن“ (البحر الرائق ۲۸۲/۸)۔

(حجرین، مکیلی اور موزونی اشیاء کا رہن رکھنا صحیح ہے۔ مراد حجرین سے سونا اور چاندی ہے، ان اشیاء کے رہن کو جائز قرار دیا؛ کیونکہ ان کے ذریعہ نقصانات کی تلافی ممکن ہے؛ اس لئے یہ رہن کے قابل ہیں)۔

ضمانت کی اس رقم کو رہن ماننے میں ایک دشواری یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مالک مکان کے لیے شئی مرہونہ سے انتفاع کا کیا ہوگا، اگر کرایہ دار خوشی سے اجازت دیدے تو اس کی گنجائش سمجھ میں آتی ہے، جیسا کہ اسی مقالہ میں درج بعض فقہی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے، اس کے علاوہ یہ رہن ”کل قرض جو نفعاً فہو حرام“ کے ذیل میں نہیں آتا ہے۔ نیز امانت ہونے کے باوجود چونکہ نقد کے مالی قدر میں فرق نہیں ہوتا؛ اس لیے یہ قید نہیں لگائی جائے گی کہ وہی نوٹ واپس کرے، بلکہ کوئی بھی نوٹ جو رہن رکھے ہوئے نوٹ کی مالیت کے بقدر ہو، ادا کر سکتا ہے، اگر یہ رقم ضائع ہو جائے تو اسے ضامن قرار دیا جائے گا۔ اس طرح یہ معاملہ ”الغرم بالغنم“ کا بنتا ہے، اس اصول کی روشنی میں کرایہ دار سے لی جانے والی رقم سے مصرف لینا جائز ہوگا اور اسے قرض پر فائدہ اٹھانا نہیں سمجھا جائے گا۔

بیع الوفاء فقہاء کی تشریحات کی روشنی میں

مولانا خورشید احمد اعظمی ☆

بیع الوفاء:

بیع الوفاء کا معاملہ جو خاص قید و بند کے ساتھ بیع کے عنوان سے طے کیا جاتا ہے اس کے بارے میں فقہاء کی آراء

مختلف ہیں:

۱- یہ عقد رہن ہے، علامہ شامی نے ”جواہر الفتاویٰ“ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

”هو أن يقول: بعت منك على أن تبعه مني متى جئت بالثمن فهذا البيع باطل، وهو رهن، وحكمه حكم الرهن، وهو الصحيح، ۵۱، فعلم أنه لا فرق بين قوله على أن ترده على أو على أن تبعه مني“ (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۵۳۵)۔

(بیع وفاء یہ ہے کہ وہ (بالع) کہے میں نے تم کو یہ اس شرط پر فروخت کیا کہ تم اسے مرے ہاتھ فروخت کر دو گے جب میں ثمن لاؤں گا، تو یہ بیع باطل ہے اور یہ رہن ہے، اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے، اور یہی صحیح ہے، لہذا یہ معلوم ہوا کہ کوئی فرق نہیں ہے اس کے اس قول میں کہ تم مجھے واپس کر دو گے یا تم میرے ہاتھ فروخت کر دو گے)۔

۲- یہ عقد بیع ہے، چنانچہ در مختار کی عبارت ”وقیل: إن بلفظ البيع لم يكن رهنا“ کے تحت علامہ شامی نے لکھا ہے: ”لأن كلا منهما عقد مستقل شرعاً، لكل منهما أحكام مستقلة“ (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۵۳۶) (اس لئے کہ (رہن و بیع) ان دونوں میں ہر ایک شرعاً ایک مستقل عقد و معاملہ ہیں، ان دونوں میں ہر ایک کے لئے مستقل احکام ہیں)۔

اور ”فتاویٰ بزازیہ“ جس میں بیع وفاء سے متعلق نواتوا ل ذکر کئے ہیں، تیسرا قول ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”والقول الثالث ما ذكره القاضي: قال: الصحيح أنه إذا جرى بلفظ البيع لا يكون رهنا“ (فتاویٰ بزازیہ علی العالمگیریہ) (اور تیسرا قول جس کو قاضی نے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا: صحیح یہ ہے کہ جب وہ عقد لفظ بیع سے

جاری ہوا ہے تو رہن نہیں ہوگا۔

اس قول کی تفصیل میں یہ بھی صراحت ہے کہ شرط وفا عقد میں مذکور ہو تو یہ بیع فاسد ہوگی (ہاش فتاویٰ عالمگیریہ

۴/۲۰۵)۔

۳۔ مجموعہ عقود ہے، یعنی بعض لحاظ سے بیع صحیح، بعض احکام کے اعتبار سے بیع فاسد اور بعض کے اعتبار سے رہن ہے، چنانچہ درمختار کی عبارت: ”وقیل: بیع یفید الإنتفاع بہ“ (اور کہا گیا ہے کہ یہ بیع ہے، اس سے نفع حاصل کرنے کا فائدہ دے گی) کے تحت تفصیل کرتے ہیں:

”هذا محتمل لاحد قولین: الاول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الإنتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعه، قال الذیلعی فی الاکراه: وعلیه الفتوی، الثانی القول الجامع لبعض المحققین أنه فاسد فی حق بعض الأحکام حتی ملک کل منهما الفسخ، صحیح فی حق بعض الأحکام کحل الأنزال و منافع البیع، و رہن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعه من آخر ولا رہنه وسقط الدين بهلاکة فهو مرکب من العقود الثلاثة کالزرافة فیها صفة البعیر والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلین لصاحبهما قال فی البحر: وینبغی أن لا یعدل فی الإفتاء عن القول الجامع“ (شامی ۷/۵۴۶، البحر الرائق ۶/۱۳)۔

(دوسرا بھی محققین کا قول جامع ہے کہ یہ عقد بیع بعض احکام میں بیع فاسد ہے، دونوں میں سے ہر ایک فسخ کا مالک ہے، بعض احکام میں بیع صحیح ہے جیسے بیع کے منافع اور اس کے زوائد کا حلال ہونا، اور بعض احکام میں رہن ہے، مشتری اسے دوسرے کے ہاتھ بیچنے یا رہن رکھنے کا مالک نہیں ہوگا، اور اگر بیع ہلاک ہوگئی تو دین (ثمن) ساقط ہو جائے گا، چنانچہ یہ عقود ثلاثہ کا مرکب ہے، زرافہ (شترگاؤ) کی طرح جس میں اونٹ، گائے اور چیتا تینوں کی صفات پائی جاتی ہیں، یہ بیع جائز کی گئی ہے لوگوں کے نزدیک اس کی ضرورت کی وجہ سے، بدلیں کی سلامتی کی شرط کے ساتھ)۔

برصغیر کے اہل فتاویٰ کے مابین بھی اس کے رہن یا بیع ہونے میں اختلاف ہے، مفتی محمود الحسن گنگوہی نے رہن قرار دیا ہے، ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا بیع فاسد ہے، بلکہ یہ رہن کے حکم میں ہے اس کو بیع الوفاء کہتے ہیں وہ مکان رہن ہوگا (فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۲۶۳)، مفتی عزیز الرحمن عثمانی نے بیع ہونے کو ترجیح دیا ہے، فرماتے ہیں: بیع بالوفاء میں اختلاف ہے کہ یہ بیع ہے یا رہن؟ اور بیع ہے تو بیع صحیح ہے یا فاسد؟ اور صحیح یہ ہے کہ اگر بوقت بیع واپسی کی شرط کی تو بیع فاسد ہے (فتاویٰ دارالعلوم ۱۴/۳۲۳)، صاحب احسن الفتاویٰ نے بھی بیع قرار دیا ہے، اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہیں تو یہ بیع فاسد ہے (احسن الفتاویٰ ۷/۵۰۷)۔

الف- بیع فاسد میں بائع کی اجازت سے بیع پر مشتری کا قبضہ اس کی ملکیت کا فائدہ دیتا ہے۔

”والفاسد یفید الملک عند اتصال القبض به ویكون المبیع مضمونا فی ید المشتري فیہ“ (ہدایہ ۳/۳۳) (اور بیع فاسد قبضہ ہونے پر ملک کا فائدہ دیتی ہے، اور بیع مشتری کے ہاتھ میں مضمون ہوگی، یعنی وہ اس کا ضامن ہوگا)۔

”البیع الفاسد یصیرنا فذا عند القبض، یعنی أن تصرف المشتري فی المبیع یصیر جائزا حینئذ“ (شرح الحلیۃ مادہ ۳۶۶) (بیع فاسد قبضہ سے نافذ ہوجاتی ہے، یعنی بیع میں مشتری کا تصرف تب جائز ہوجاتا ہے)۔ لہذا اب مشتری اس کا پابند نہیں ہوگا کہ وہ بائع کے ہاتھ ہی فروخت کرے، اگر بائع کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو یہ فسخ بیع کے مرادف ہوگا، اور سابقہ ٹرن کا ہی مستحق ہوگا۔

”وکل مبیع بیع فاسد ردالمشتري علی البائع بهیة أو صدقة أو بیع أو بوجه من الوجوه کالودیعة والإجارة والإعارة و الغصب والشراء ووقع فی ید البائع فهو متاركة للبیع وبرئ المشتري من ضمانه“ (البحر الرائق ۶/۱۵۳) (اور بیع فاسد کے ذریعہ ہر بیع جس کو مشتری بائع کی طرف واپس کرے، بہہ کے ذریعہ یا صدقہ یا بیع یا کسی بھی طرح سے جیسے ودیعت اجارہ، اعارہ، غصب، خرید کے ذریعہ اور بائع کے ہاتھ میں چلی جائے تو وہ سابقہ بیع کو ترک کرنا ہے اور مشتری اس کے ضمان سے بری ہوجائے گا۔

بیع فاسد میں بائع کی اجازت سے قبضہ کے بعد مشتری بیع کا مالک ہوجاتا ہے، لہذا وہ اس بیع کو بائع کے علاوہ دوسرے کے ہاتھ بھی بیچ سکتا ہے، بیع ثانی کے بعد فسخ کا اختیار ختم ہوجاتا ہے۔

”إلا أن یبیع المشتري أی فلیس لکل منهما فسخه، و إنما نفذ بیعه؛ لأنه ملکہ یملک التصرف فیہ وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثانی“ (البحر الرائق ۶/۱۵۶) (مگر یہ کہ مشتری فروخت کر دے، یعنی اب دونوں میں سے کسی کو فسخ بیع کا حق نہیں رہ جاتا، بیع ثانی اس لئے نافذ ہوگی کہ مشتری اس میں تصرف کی ملکیت کا مالک ہو گیا اور حق واپس لینے کا اس لئے ساقط ہو گیا کہ دوسری بیع سے بندہ کا حق متعلق ہو گیا)۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، زائد کا مطالبہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ فسخ بیع ہے، لہذا مشتری اپنے ادا کردہ ٹرن کا ہی مستحق ہوگا، جیسا کہ اوپر ”البحر الرائق“ کی عبارت سے واضح ہوا کہ کسی بھی صورت سے بائع کے ہاتھ میں پہنچ جائے تو وہ فسخ بیع ہوگا۔

”وعن محمد شراہ بدر اہم فاسدا ثم باعه بدنانیر من باعه یكون فسخا إذا قبض لا قبلہ“ (البحر الرائق ۶/۱۵۳) (امام محمد سے منقول ہے کہ بیع کو در اہم کے ذریعہ بیع فاسد کے طور پر خرید پھر اسے بائع کو ہی دیناروں میں

فروخت کیا تو یہ فسخ ہوگا جبکہ اسے قبضہ کر لیا ہو نہ کہ قبضہ سے پہلے)۔

اور فسخ کی تعریف میں مذکور ہے: ”الفسخ شرعاً رفع العقد على وصف كان قبله بلا زيادة ونقصان“ (التعريفات الفقہیہ ص ۲۱۲) (شرعی طور پر فسخ یہ ہے: عقد کو سابقہ وصف پر اٹھالینا ختم کرنا بغیر اضافہ اور نقص کے)، لہذا بائع سے زیادہ کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

۲- اگر بیع و فاء کو رہن قرار دیا جائے:

کچھ فقہاء نے بیع و فاء جس میں واپس کرنے کی شرط عقد بیع میں شامل ہوتی ہے، اس کو رہن کا معاملہ قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ شامی نے نقل کیا ہے:

”وفي حاشية الفصولين عن جواهر الفتاوى: هو أن يقول بعت منك على أن تبعه منى متى جئت بالثمن، فهذا البيع باطل وهو رهن وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح“ (رد المحتار ۷/۵۲۵) (جواہر الفتاویٰ سے حاشیہ الفصولین میں منقول ہے کہ بیع و فاء یہ ہے کہ بائع کہے کہ میں نے تمہارے ہاتھ فروخت کیا اس شرط پر کہ جب میں ثمن لاؤں گا تو تم اسے میرے ہاتھ فروخت کر دو گے، تو یہ باطل بیع ہے اور یہ رہن ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے، اور یہی صحیح ہے)۔

الف- مشتری کا فائدہ اٹھانا:

رہن قرار دینے کی صورت میں جب تک بائع بیع کو واپس نہ لے مشتری کے لئے اس سے استفادہ و انتفاع میں تفصیل ہے۔

۱- اگر بائع (رہن) نے اجازت نہیں دیا ہے تو مشتری (مرتہن) کے لئے بیع (مرہون) سے انتفاع درست نہیں ہے)۔

”وكذا ليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون..... لأن عقد الرهن يفيد ملك الحبس لا ملك الانتفاع“ (بدائع الصنائع ۵/۲۱۲) (جیسے راہن کو مرہون سے انتفاع جائز نہیں ویسے ہی مرتہن کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ مرہون سے منفعت حاصل کرے..... کیونکہ عقد رہن ملک حبس کا فائدہ دیتا ہے، نہ کہ ملک انتفاع کا)۔

بلکہ علامہ شامی نے عبد اللہ محمد بن اسلم سمرقندی جو کبار علماء سمرقند سے ہیں ان کا قول نقل کیا ہے:

”أنه لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الرباء؛ لأنه يستوفي دينه كاملاً، فبقي له المنفعة فضلاً، فيكون رباء، وهذا أمر عظيم“ (رد المحتار ۱۰/۸۳) (کہ مرتہن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ مرہون سے کسی صورت بھی نفع حاصل کرے، اگرچہ راہن اس کو اجازت دے، کیونکہ اس نے ربا

کی اجازت اس کو دیا ہے، کیونکہ وہ اپنا قرض تو پورا وصول کرے گا، تو یہ منفعت زائد رہ جائے گی جو ربا ہوگی، اور یہ بڑی مصیبت ہے۔

لیکن یہ اجازت اگر شرط کے طور پر نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ عقد و معاملہ سودی نہیں ہوا ہے، قرطبی علیہ الرحمہ نے تفسیر میں امام شعبیؒ کا بھی یہ قول نقل کیا ہے کہ: ”وقد قال الشعبي: لا ينتفع من الرهن بشئ“ (تفسیر قرطبی ۴/۱۲۳) (رہن سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھائے گا)۔

۲- نیز اگر مذکورہ عقد میں انتفاع کی شرط کی گئی ہو تب بھی مشتری (مرہن) کے لئے انتفاع جائز نہ ہوگا، بلکہ قرض مشروط بالنتفع کے تحت سود قرار پائے گا، علامہ شامیؒ نے ”جواہر الفتاویٰ“ کے حوالہ سے لکھا ہے:

”ثم رأيت في جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطاً، صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا، وإلا فلا بأس“ (پھر میں نے جواہر الفتاویٰ میں دیکھا کہ جب (انتفاع) مشروط ہو تو وہ (ثمن) ایسا قرض ہو جائے گا جس میں منفعت (مشروط) ہے، اور وہ سود ہے، اور اگر مشروط نہ ہو تو کوئی حرج نہیں)۔

احادیث میں قرض کی ادائیگی میں احسان کی ترغیب بھی وارد ہے، رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے: ”إن خياركم أحسنكم قضاء“ (صحیح بخاری مع الفتح ۵/۵۹)۔
نیز حضرت جابرؓ سے منقول ہے:

”وكان لي عليه دين فقضاني وزادني“ (آپ ﷺ کے ذمہ میرا قرض تھا تو آپ نے ادا کیا اور زائد دیا)۔
اور راجح قول یہ ہے کہ راہن کی حسب اجازت مرہن رہن سے نفع حاصل کر سکتا ہے، ”قال في المبسوط: وليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون، إلا بإذن الراهن، فإذا أذن له جاز أن يفعل ما أذن له فيه“ (البحر الرائق ۴/۸۳۹) (مبسوط میں ہے: اور مرہن کے لئے جائز نہیں کہ مرہون سے نفع حاصل کرے مگر راہن کی اجازت سے، تو جب اسے اجازت دے دے، تو جائز ہوگا کہ وہ مرہون میں وہ تصرف کرے جسکی اس نے اجازت دیا ہے)۔
نیز رہن سے متعلق حدیث کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث منقول ہے:

”الظهر يركب بنفقته إذا كان مرهوناً ولبن الدر يشرب بنفقته إذا كان مرهوناً وعلى الذي يركب ويشرب النفقة“ (صحیح بخاری مع الفتح ۵/۱۳۳، ت ۵۳۶۳، ابن ماجہ ۸۱۶۲، سل السلام ۳/۸۶۹) (سواری پر جبکہ وہ مرہون ہو سواری ہو جائے گا اس کے نفقہ سے اور دودھ والے جانور کا دودھ پیا جائے گا، جبکہ وہ مرہون ہو اس کے نفقہ کے سبب اور نفقہ اسی پر ہے جو سواری ہو اور پئے)۔

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

”وفيه حجة لمن قال: يجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته ولو لم يأذن له

المالك، وهو قول احمد واسحاق..... وذهب الجمهور إلى أن المرتهن لا ينتفع من المرهون بشئ، وتأولوا الحديث لكونه ورد على خلاف القياس..... وقد ذهب الأوزاعي والليث وأبو ثور على حملة إذا امتنع الراهن من الإنفاق على المرهون، فيباح حينئذ للمرتهن الإنفاق على الحيوان حفظاً لحايته ولإبقاء المالية، وجعل له في مقابلة نفقته الإنفاق بالركوب أو بشرب اللبن بشرط أن لا يزيد قدر ذلك..... الخ“ (فتح الباری ۵/۱۴۴)۔

(اور اس میں دلیل ہے ان کے لئے جنہوں نے کہا کہ مرتهن کے لئے رہن سے انتفاع جائز ہے، جبکہ وہ اس کی مصلحت کو پورا کرے اگرچہ مالک نے اس کو اجازت نہ دیا ہو، اور یہ امام احمد اور اسحاق کا قول ہے..... اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ مرتهن مرہون سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھائے گا ان لوگوں نے حدیث کے خلاف قیاس وارد ہونے کی وجہ سے اس کی تاویل کیا ہے (مزید لکھتے ہیں) اور امام اوزاعی، لیث اور ابو ثور نے اس کو محمول کیا ہے کہ جب راہن مرہون پر خروج نہ کرے تو مرتهن کے لئے جانور یا اتفاق مباح ہوگا اس کی زندگی کی حفاظت اور اس کی مالیت کو باقی رکھنے کے لئے، اور اس کے نفقہ کے مقابل میں سواری یا دودھ کے استعمال کے انتفاع کو رکھا گیا ہے، بشرطیکہ نفقہ کی مقدار سے زیادہ نہ ہو)۔

اس پوری بحث کا خلاصہ راقم کی نظر میں یہی ہے کہ بلا اجازت مرتهن کے لئے رہن سے انتفاع جائز نہیں، نیز ”الأصل فيه أن ما يحتاج إليه لمصلحة الرهن لنفسه وتبقيته فهو على الراهن“ (اصل اس باب میں یہ ہے کہ نفس رہن کی مصلحت اور اس کی بقا کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے وہ راہن کے ذمہ ہے)۔

کیونکہ عین رہن اور اس کے منافع کا مالک وہی ہے، اب اگر وہ اس کے لازم نفقات کو پورا نہیں کر رہا ہے تو مرتهن قاضی کی اجازت سے اگر ممکن ہو تو اس کے نفقات پورا کرے گا، اور قاضی راہن سے دلوائے گا، ورنہ مرتهن اپنے نفقات کے بقدر اس سے نفع حاصل کریگا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مرتهن، راہن کی اجازت سے رہن سے انتفاع حاصل کر سکتا ہے، بیع و فاء کی صورت میں بائع کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی ثمن واپس کرے وہ بیع اس کو مل جائے اس لئے اگر اس کی طرف سے انتفاع کی ممانعت صراحتاً نہ ہو تو صورت عقد کو حکماً اجازت پر محمول کرتے ہوئے ایسے انتفاع کی اجازت ہونی چاہئے جس میں استہلاک بیع نہ ہو۔

ب- خریدار کا اس طور پر خریدنا کہ وہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے گا:

اگر خریدار کسی مکان یا زمین کو اس طور پر خریدے کہ وہ اس کا کرایہ ادا کرے گا، یا بائع اس طور پر بیچے کہ بیع مشتری کے پاس بطور اجارہ ہوگی، اور جب وہ ثمن واپس کرے گا تو بیع واپس لے لے گا، یہ معاملہ درست نہیں، کیونکہ یہ بیع مع الاجارہ صفتتین ہے، نیز یہ بیع مع شرط لا بتفضیہ العقد ہے، اور اس میں منفعت لاحد العاقدین ہے، ”ونہی رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرط“ ہدایہ میں ہے:

”و کذلک لو باع عبدا علی أن یستخدمه البائع شهرا أو دار اعلی أن یسکنها أو علی أن یقرضه المشتري درهما أو علی أن یهدی له هدیة؛ لأنه شرط لا یقتضیه العقد، وفیه منفعة لأحد المتعاقدين، ولأنه علیه السلام نهی عن بیع و سلف، ولأنه لو کان الخدمة والسکنی یقابله شیء من الثمن یكون إجارة فی بیع، ولو کان لا یقابله یكون اعادة فی بیع، وقد نهی النبی ﷺ عن صفقتین فی صفقة“ (ہدایہ ۳/۳۳۳)۔

(اور ایسے ہی اگر غلام کو اس شرط پر بیچا کہ بائع اس سے ایک ماہ خدمت لے گا یا گھر کو اس شرط پر کہ اس میں رہے گا یا اس شرط پر مشتری اس کو درہم قرض دے گا، یا اس شرط پر کہ اسے کوئی ہدیہ دے گا، کیونکہ یہ ایسی شرط ہے جسے عقد نہیں چاہتا اور اس میں عاقدین میں سے ایک کا نفع ہے، اور اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع مع سلف سے منع کیا ہے اور اس لئے کہ اگر خدمت و سکنی کے مقابل میں ثمن سے کچھ ہو تو اجارہ فی البیع ہوگا اور اگر اس کے مقابل میں کچھ نہ ہو تو اجارہ فی البیع ہوگا اور رسول اللہ ﷺ نے صفقتین فی صفقة (ایک ہی معاملہ دو معاملہ) سے منع کیا ہے۔)

لہذا اگر نفس بیع میں اجارہ کا عقد بھی شامل ہے تو جائز نہیں ہونا چاہئے، اور اگر عقد بیع کے بعد اجارہ کا معاملہ ہو رہا ہو تو تجد قبضہ لازم ہے، چنانچہ شامی میں وضاحت ہے:

”وأما الإجارة فالمستاجر إن كان هو الراهن فهی باطله و كانت بمنزلة ما إذا اعار منه أو أودعه، وإن كان هو المرتهن و جدد القبض للإجارة، أو أجنبیا بمباشرة أحدهما العقد بإذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن، وولاية القبض للعاقده، ولا یعود رهننا إلا بالاستئناف“ (رد المحتار ۱۰/۱۳۰)

(بہر حال اجارہ تو اجرت پر لینے والا اگر راہن ہی ہے تو یہ باطل ہے اور یہ بمنزلہ اجارہ یا ودیعت کے ہوگا، اور اگر مستأجر مرتهن ہے اور اجارہ کے لئے قبضہ کی تجدید کیا ہے یا مستاجر کوئی اجنبی ہے اور دونوں میں سے کسی ایک نے دوسرے کی اجازت سے عقد کیا ہے تو رہن باطل ہوگا، اجرت کا مستحق راہن ہوگا اور قبضہ کی ذمہ داری عاقد کے لئے ہے، اور یہ رہن نہ ہوگا مگر از سر نو کرنے سے)۔

اگر اس صورت میں کرایہ، مروجہ کرایہ سے کم ہو تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ عقد آخر ہے، باہمی رضا مندی سے جو کرایہ چاہیں متعین کر لیں، البتہ اگر مشتری کی طرف سے ادا کردہ ثمن کے حوالہ سے اجرت میں مروجہ کرایہ سے کم پر معاملہ کیا تو یہ قرض مشروط بالنفع کے مرادف ہونے کی وجہ سے سود ہوگا اور اس وقت درست نہ ہوگا کم کرایہ پر اجارہ کا معاملہ۔

ج۔ خریدار کا بطور کاشت یا اجارہ داری نفع حاصل کرنا:

رہن سے انتفاع کرنا بلا اجازت آخر نہ تو راہن کے لئے درست ہے اور نہ مرتهن کے لئے، راہن کو اس لئے

درست نہیں کہ ”لأن حق الحبس ثابت للمرتهن على سبيل الدوام وهذا يمنع الاسترداد والانتفاع“ (حق حبس علی سبیل الدوام مرتہن کے لئے ثابت ہے، اور یہ واپس لینے یا نفع حاصل کرنے کے لئے مانع ہے)۔ اور مرتہن اس لئے انتفاع نہیں کر سکتا کہ وہ محض حبس کا مالک ہے، اور ملک عین راہن کو حاصل ہے، مرتہن انتفاع کا مالک نہیں، البتہ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کو انتفاع کی اجازت دیتا ہے تو دوسرے کے لئے انتفاع درست ہوتا ہے، اسی بنا پر مرتہن کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ شی مرہون کسی کو اجارہ پردے۔

”ولیس له أن یؤجره من غیر الراهن بغير إذنه، لأن الإجارة تمليک المنفعة والثابت له ملک الحبس لا ملک المنفعة، فكيف يملكها من غیره، فان فعل وقف على إجازة الراهن، فإن أجاز، جاز وبطل الرهن“ (بدائع الصنائع ۲۱۳/۵)۔

(اور مرتہن کے لئے جائز نہیں کہ راہن کی اجازت کے بغیر راہن کے علاوہ کسی دوسرے کو شی مرہون اجرت پر دے، کیونکہ اجارہ منفعہ کا مالک بنانا ہے، اور مرتہن کے لئے ثابت ملک حبس ہے، نہ کہ ملک منفعہ، پھر وہ دوسرے کو انتفاع کا مالک کیسے بنائے گا، اور اگر اس نے اجارہ پردے دیا تو راہن کے نافذ کرنے پر موقوف رہے گا، اگر راہن نے نافذ کر دیا تو نافذ ہو جائے گا، اور راہن کا معاملہ باطل ہو جائے گا)۔

”لا تصح إجارته من الراهن ولو استأجره لا تلزمه الأجرة، وأما إذا آجره المرتهن من أجنبي فإن كان بإذن الراهن بطل الرهن والأجرة للراهن، وإن كان بغير إذنه يتصدق المرتهن بها، أو يردها على الراهن، وهو أولى (خیر یہ)“ (شرح المجلیہ ص ۴۱۵)۔

(رہن کا اجارہ راہن سے صحیح نہیں ہے، اور اگر راہن نے اجرت پر مرہون کو لیا تو اجرت لازم نہیں ہوگی، اور جبکہ مرتہن نے کسی اجنبی کو اجرت پر دیا ہو تو اگر راہن کی اجازت سے ہو تو راہن باطل ہوگا اور اجرت راہن کے لئے ہوگی، اور اگر اس کی اجازت نہ ہو تو مرتہن اجرت کا صدقہ کرے گا یا اسے راہن کو لوٹائے گا، اور یہ زیادہ بہتر ہے)۔

لہذا راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن شی مرہون سے اجارہ داری وغیرہ کا انتفاع حاصل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر شی مرہون زر زمین ہے تو مرتہن، راہن کی اجازت کے بغیر اس پر کاشت کرنے کا فائدہ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔

”زرع المرتهن أرض الرهن، إن أبيع له الإنتفاع لا يجب شيء، وإن لم يبيع لزمه نقصان الأرض..... الخ“ (الدر المختار ۱۰/۱۳۹) (مرتہن نے رهن کی زمین پر کاشت کیا، اگر اس کے لئے انتفاع مباح کیا گیا ہو تو اس پر کوئی ضمان نہیں ہوگا، اور اگر مباح نہ کیا گیا ہو تو زمین کے نقص کا ضامن ہوگا)۔

اور اگر ارض مرہونہ کو راہن سے مزارعت کے طور پر لیا ہے تو اگر بیج مرتہن کا ہوگا تو رهن باطل ہوگا، مزارعت کا

معاملہ درست ہوگا، اور بیچ راہن کا ہوگا تو رہن باطل نہیں ہوگا۔

”وإن أخذ المرتهن الأرض مزارعة بطل الرهن إن البذر من المرتهن، وإن من الراهن لا يبطل“ (فتاویٰ بزازی علی باش الفتاویٰ العالمگیریہ ۷۴/۶) (اگر مرتهن نے زمین کو مزارعت کے طور پر لیا تو اگر بیچ مرتهن کا ہو تو رہن باطل ہو جائے گا، اور اگر راہن کا ہو تو رہن کا معاملہ باطل نہیں ہوگا)۔

اس کی بنیاد یہ ہے کہ بیچ کا مالک ہی مستأجر ہوتا ہے، لہذا اگر وہ مرتهن ہے تو اس نے زمین کو اجرت پر لیا، اور اگر بیچ کا مالک راہن ہو تو اس نے مرتهن کو بطور عامل اجرت پر لیا ہے، یعنی زمین کا مالک راہن ہے، جو بطور رہن مرتهن کے پاس ہے، اور مرتهن راہن کے اجیر کے طور پر اس سے انتفاع کر رہا ہے۔

”إن الأصل أن رب البذر هو المستأجر، فإن كان هو العامل كان مستأجراً للأرض، وإن كان هو رب الأرض كان مستأجراً للعامل“ (رد المحتار ۱۰/۱۳۰) (اصل یہ ہے کہ بیچ کا مالک بھی مستأجر ہوتا ہے، لہذا اگر وہ عامل ہے تو وہ زمین کو اجرت پر لینے والا ہوگا، اور اگر وہ زمین کا مالک ہے تو عامل کو بطور اجرت لینے والا ہوگا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ راہن کی اجازت کے بغیر مرتهن ارض مرہونہ کو نہ بطور کاشت کسی اجنبی کو دے سکتا ہے اور نہ خود کاشت کر سکتا ہے، اجازت ہونے پر حسب اجازت انتفاع کر سکتا ہے۔

د- خریدار (مرتهن) کا رہن کو بیچنا:

گذشتہ عبارات سے یہ صاف واضح ہے کہ رہن کی صورت برقرار رہتے ہوئے راہن یا مرتهن میں سے کوئی بھی دوسرے کی اجازت کے بغیر رہن سے استفادہ و انتفاع نہیں کر سکتا، بیچ و فاء کی صورت میں جبکہ وفا کی شرط عقد بیچ میں داخل ہو اس کو رہن کا معاملہ قرار دینے کی صورت میں خریدار مرتهن اور بائع راہن قرار پائے گا، اور اس عقد پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، جیسا کہ شامی (۵۴۵/۷) کے حوالہ سے جواہر الفتاویٰ کی عبارت گزر چکی ہے ”وہو رهن وحكمه حكم الرهن“، نیز لکھا ہے:

”قال في الخيرية: والذي عليه الاكثر انه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام“ (رد المحتار ۷/۵۴۶) (اور اکثر لوگ اس رائے پر ہیں کہ وہ (بیچ و فاء) رہن ہے، کسی بھی حکم میں رہن سے مختلف نہیں ہے)۔ لہذا خریدار بغیر بائع کی اجازت کے رہن کو فروخت نہیں کر سکتا۔

”وليس له أن يبيع الرهن بغير إذن الراهن، لأن الثابت له ليس إلا ملك الحبس، فأما ملك العين فللراهن، والبيع تمليك العين فلا يملكه المرتهن من غير إذن الراهن“ (بدائع الصنائع ۵/۲۱۲) (اور مرتهن کے لئے جائز نہیں کہ راہن کی اجازت کے بغیر رہن کو فروخت کرے، کیونکہ عقد رہن سے ثابت اس کے لئے ملک حبس

ہے، اور ملک عین راہن کے لئے ہے، اور بیع عین کا مالک بنانا ہے، لہذا مرہن، راہن کی اجازت کے بغیر اس کا مالک نہیں ہوگا۔

اور اگر اس نے بلا اجازت فروخت کر دیا تو یہ بیع بائع یعنی راہن کی اجازت پر موقوف ہوگا، اس کو اختیار ہوگا چاہے تو اس بیع ثانی کو نافذ کر دے چاہے تو منسوخ کر دے، اگر یہ اجازت دے دے گا تو مرہن کا فروخت کرنا درست ہو جائے گا، اور ثمن رہن ہوگا۔

”البيع الموقوف يفيد الحكم عند الإجازة“ (شرح المجلد مادہ ۷۷۳) (بیع موقوف اجازت کے بعد حکم کا فائدہ دیتی ہے)۔

”ولو باع من غير إذنه وقف على إجازته، فإن أجازته جاز، وكان الثمن رهنا، وكذا إذا باع باذنه جاز وكان ثمنه رهنا“ (بدائع الصنائع ۲۱۲/۵) (اور اگر راہن کی اجازت کے بغیر بیچ دیا تو اس کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر اس نے اجازت دے دیا تو نافذ ہوگی، اور ثمن رہن ہوگا ایسے ہی اگر اس کی اجازت سے بیچا تو نافذ ہوگی اور اس کا ثمن رہن ہوگا)۔

اجازت کی صورت میں اگر بائع (راہن) کی اجازت سے کم قیمت پر فروخت کرے گا تو مرہن پر کوئی ضمان نہیں ہوگا، اور یہ اپنے پورے دین یعنی ثمن کا مستحق ہوگا، اور زیادہ ثمن پر بیچنے کی صورت میں، یہ ثمن اس کے پاس رہن ہوگا، اور یہ اپنے دین (ثمن) کی بقدر اس کا مستحق ہوگا۔

اور اگر اس نے راہن کی اجازت کے بغیر فروخت کیا اور کم قیمت پر فروخت کیا تو یہ مرہن کی طرف سے تعدی ہوگی، اور رہن میں تعدی کی صورت میں مرہن رہن کی قیمت کا ضامن ہوتا ہے۔

”فإن فعل كان متعديا ولا يبطل عقد الرهن بالتعدى..... وإذا تعدى المرتهن فى الرهن ضمنه ضمان الغصب بجميع قيمته، لأن الزيادة على مقدار الدين أمانة والأمانات تضمن بالتعدى“ (ہدایہ ص ۵۰۶ کتاب الرهن) (یعنی اگر مرہن نے راہن کی تسلیط (اذن) کے بغیر بیع و اعارہ یا اجارہ کا تصرف کیا تو تعدی کرنے والا ہوگا، اور تعدی سے عقد رہن باطل نہیں ہوتا، اور جب مرہن رہن میں تعدی کرے تو وہ ضمان غصب کا ضامن ہوگا، اس کی پوری قیمت کے ساتھ، کیونکہ دین کی مقدار پر زائد امانت ہوتا ہے، اور امانات تعدی سے مضمون ہوتی ہیں)۔

۳- رقم ضمانت اور کرایہ میں کمی:

آج کل عموماً یہ رواج ہے کہ مکان یا دوکان کو کرایہ پر دیتے وقت کرایہ دار سے ایک کثیر رقم پیشگی وصول کی جاتی ہے، اس رقم کو فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے دوسرے سمینار میں کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دستبرداری کا عوض قرار دیا

ہے، اس صورت میں مالک مکان یا دوکان کرایہ دار سے اجرت کا جو بھی معاملہ طے کرتا ہے اگرچہ مروجہ کرایہ سے کم ہو تو یہ اجارہ کا معاملہ الگ ہوگا، اور جائز ہوگا، اس صورت میں زر ضمانت نہ قرض ہوگا اور نہ امانت و رہن، بلکہ دستبرداری کا عوض ہوگا۔

اسی لئے اگر صاحب مکان یا دوکان کرایہ دار سے خالی کرانا چاہے تو جب تک وہ پیشگی ادا کردہ رقم واپس نہ کرے کرایہ دار خالی کرنے کا پابند نہیں ہوگا، اگرچہ علامہ شامی نے اس کو مقید قرار دیا ہے، جبکہ کرایہ دار اجرت مثل دے رہا ہو۔
”وہو مقید ایضا بما قلنا بما اذا كان يدفع أجر المثل، والا كانت سکناء بمقابله ما دفعه من الدرہم عین الربا“ (رد المحتار ۷/۴۰۷) نیز وہ مقید ہے اس سے جو ہم نے کہا کہ جبکہ وہ اجرت مثل دے رہا ہو، ورنہ اس کی رہائش دیئے ہوئے دراہم کے بالمقابل عین سود ہوگا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ پیشگی رقم کو قرض قرار دیا جائے، اور جبکہ کرایہ دار (زر ضمانت دینے والے کی طرف سے) یہ شرط ہو کہ اس زر ضمانت کی بنا پر کرایہ میں کمی کی جائے، اور اگر اس کی طرف سے شرط نہ ہو تو اسے (کرایہ کی کمی کو) ربا پر محمول نہ کرنا چاہئے، جیسا کہ نقد اور ادھار بیع میں ٹن میں کمی و زیادتی ہوتی ہے، حالانکہ بالکل واضح ہے کہ ادھار بیع میں ٹن کی زیادتی اجمل (وقت) کے بدل میں ہوتی ہے، اسی طرح کثیر زر ضمانت اور اسی نسبت سے کرایہ میں کمی کو سود اور قرض پر فائدہ اٹھانے پر محمول نہ کرنا چاہئے۔

امانت کہنا اس لئے درست نہیں معلوم ہوتا کہ امانت اگر بغیر تعدی ہلاک ہو جائے تو امین ضامن نہیں ہوتا اور صاحب مال اس طور پر دیتا ہے کہ جب کبھی دوکان خالی کرے تو وہ رقم اسے واپس مل جائے۔

بیع الوفاء اور بیع سے انتفاع کا حکم

☆ مفتی عبدالرزاق قاسمی امر وہی

وفاغت میں غدر کی ضد ہے، کہا جاتا ہے: ووفی بالوعد والعهد وفاءً: پورا کرنا اور ”أوفى الرجل حقه و وفاه إياه“ کا معنی ہے: اس نے اس کا حق مکمل اور پورا پورا دے دیا۔

اصطلاح فقہاء میں ”بیع الوفاء“ اس شرط پر بیچنا ہے کہ جب فروخت کرنے والا شخص مشتری کو ثمن واپس کر دے گا تو خریدار اس کو فروخت شدہ چیز (بیع) لوٹا دے گا۔ اور اس کو بیع الوفاء اس لیے کہا جاتا ہے کہ خریدار پر اس شرط کی وفاداری اور تکمیل لازم ہوتی ہے (الموسوعة الفقهية ۲۸۳/۹)۔

اس کے علاوہ فقہاء احناف کے یہاں اس کی اور بھی متعدد تعریفات ملتی ہیں جو الفاظ میں تو مختلف ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے متحد ہیں، علامہ زیلیلی فرماتے ہیں: ”هو أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بدین لك عليّ عليّ أنى متى قضيت الدين فهولي“ (تبيين الحقائق للزيلي ۱۸۳/۵) علامہ زیلیلی نے اس تعریف میں بیع کی واپسی کے لیے قضاء دین کی تعبیر کو اختیار کیا ہے۔

قاضی خاں اپنے فتاویٰ میں یہ تعریف کرتے ہیں: ”بعث منك هذا بكذا عليّ أنى متى دفعت لك الثمن تدفع العين إليّ“ (فتاویٰ بزازیہ حاشیہ فتاویٰ ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

انہوں نے قضاء دین کی جگہ دفع ثمن کی تعبیر اختیار کی ہے۔ علامہ ابن نجیم نے بھی اسی تعریف کو اختیار کیا ہے۔ ”جامع الفصولین“ کے حاشیہ پر صاحب ”جواہر الفتاویٰ“ سے یہ تعریف نقل کی گئی ہے: بیع الوفاء هو أن يقول: بعث منك عليّ أن تبعه منى متى جئت بالثمن“ (جامع الفصولین ۲۳۴/۱)۔

اس تعریف میں بیع کی واپسی کے لیے بیع کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی تحریر فرماتے ہیں: ”أن يبيعه العين بألف عليّ أنه إذا ردّ عليه الثمن ردّ عليه العين“ (رد المحتار ۲۷۶/۵)۔

علامہ شامیؒ اس تعریف میں قضاء دین، دفع ثمن، بیع وغیرہ کی تعبیرات کو چھوڑ کر بیع کی واپسی کے لیے ”رد“ کی تعبیر استعمال کر رہے ہیں۔

”مجلۃ الاحکام العدلیہ“ میں بیع الوفاء کی تعریف یہ کی گئی ہے: ”بیع الوفاء هو بیع المال بشرط أن البائع متی رد الثمن یرد المشتري إليه المبیع“ (مجلۃ الاحکام العدلیہ دفعہ ۱۸۸)۔

ان تمام تعریفات میں اگر غور کیا جائے تو صرف الفاظ کا اختلاف نظر آتا ہے معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب کا حاصل یہی ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز ایک متعین رقم میں فروخت کرے اور دونوں میں یہ بات طے پائے کہ بیچنے والے کے پاس اگر وہ متعین رقم ہو جائے اور وہ یہ رقم خریدار کو ادا کر دے تو خریدار وہ سامان اسے واپس کر دے گا، گو مقصد ایک کا دوسرے سے قرض لینا ہے؛ لیکن اگر یہ رقم قرض کے عنوان سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کے عوض وہ (بیع) چیز رہن رکھی جاتی ہے تو اس شی مرہون سے مرہن کے لیے نفع اٹھانا جائز نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرض دینے والا رہن سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ورنہ یہ سود میں شمار ہوگا۔ اس لیے اس معاملہ کو بیع کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیع الوفاء کا حکم شرعی:

بیع الوفاء کے حکم شرعی کے بارے میں حضرات فقہاء کرام کے مابین شروع سے ہی اختلاف رہا ہے، اور اس اختلاف کا بنیادی سبب اس کی حقیقت کا غیر واضح ہونا ہے، کیونکہ یہ معاملہ ظاہراً تو بیع ہے، لیکن اس کے پیچھے جو مقاصد ہیں کہیں وہ حرام رہا تک پہنچنے کا ذریعہ تو نہیں، اجمالی طور پر بیع الوفاء کے سلسلے میں جو رجحانات سامنے آتے ہیں وہ دو طرح کے ہیں، ایک یہ کہ یہ عقد عقد صحیح ہے۔ پھر قائلین عقد صحیح کی دو آراء ہیں: (۱) بیع الوفاء رہن صحیح ہے۔ (۲) بیع الوفاء بعض احکام کے حق میں صحیح ہے اور بعض کے حق میں فاسد۔ اور دوسرا یہ کہ یہ عقد عقد غیر صحیح ہے۔ اور بیع الوفاء بیع فاسد ہے۔ ہم دونوں رجحانوں کو تفصیل و ترتیب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

پہلا نقطہ نظر: بیع الوفاء رہن صحیح ہے:

حنفیہ میں سے ابوشجاع، علی السعدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی کی رائے ہے کہ بیع الوفاء رہن ہے، بیع نہیں ہے، پس اس کے لیے رہن کے سارے احکامات ثابت ہوں گے، لہذا خریدار اس کا مالک نہ ہوگا اور نہ ہی اس سے انقاع کرے گا اور اگر اس کو اجرت پر لے لے تو اس کی اجرت اس پر لازم نہ ہوگی، جبکہ اگر رہن مرہون کو مرہن سے اجرت پر لے لے، اور اس کے پاس ہلاک ہو جائے تو ہلاک ہونے کی وجہ سے دین ساقط ہو جائے گا اور اس میں ہونے والی زیادتی کا وہ ضامن نہ ہوگا اور اگر رہن مر جائے تو مرہن اس کا لقیہ قرض خواہوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہوگا۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ عقد میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ اور کلمات کا نہیں، اسی وجہ سے بہہ بشرط عوض

بیع ہوتا ہے، اور کفالہ بشرط براءۃ اصیل حوالہ ہوتا ہے۔ اس بیع میں چونکہ ثمن لوٹانے کے وقت فروخت شدہ چیز لینے کی شرط ہے، لہذا یہ رہن ہے، اس لیے کہ دین کی ادائیگی کے وقت رہن ہی کو لیا جاتا ہے (فتاویٰ بزازیہ ۴/۲۰۵، جامع الفصولین ۱/۲۳۴، رد المحتار ۵/۲۷۶، تبیین الحقائق ۵/۱۸۳)۔ اس رائے میں محض مقاصد اور معانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، الفاظ کو بالکل تیز کر دیا گیا ہے، گویا الفاظ کے ذکر میں کوئی فائدہ ہی نہیں، حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں کہ الفاظ کو عبث اور بے فائدہ قرار دیا جائے، نیز عرف بھی اس کا مخالف ہے۔

دوسرا نقطہ نظر: بیع الوفاء عقد مرکب ہے بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے:

جو حضرات بیع الوفاء کو صحیح قرار دیتے ہیں ان میں سے بعض متاخرین حنفیہ اور شوافع کی رائے یہ ہے کہ بیع الوفاء جائز ہے اور بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے خریدار کا فروخت شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا اور بعض احکام کا فائدہ نہیں دیتی، جیسے دوسرے کے ہاتھ بیچنا۔

قاضی خاں علیہ الرحمہ اس عقد کی صحت کی صورت یہ بیان فرماتے ہیں کہ متعاقدین کے درمیان جو عقد جاری ہوتا ہے اگر وہ لفظ ”بیع“ کے ساتھ ہے تو رہن نہیں ہو سکتا، بلکہ بیع ہی ہے، پھر اگر متعاقدین فسخ کی شرط کو عقد کے دوران کرتے ہیں تو یہ بیع فاسد ہوگی اور اگر عقد میں شرط فسخ کا کوئی ذکر نہ کیا، بلکہ یہ کہا کہ ہم ”بیع الوفاء“ یا ”البيع الجائز“ کا عقد کرتے ہیں تو بھی یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر بیع مطلق کی، کوئی شرط فسخ کی دوران عقد ذکر نہیں کی، پھر عقد ختم ہونے کے بعد وعدہ کے طور پر شرط فسخ کو ذکر کیا تو یہ بیع جائز ہوگی اور ہر ایک پر وعدہ کا پورا کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ وعدہ کی تکمیل بھی ضروری ہوا کرتی ہے؛ بالخصوص لوگوں کی ضرورت کے وقت تو اس وعدہ کی تکمیل کو لازم قرار ہی دیا جائے گا (فتاویٰ خانہ ۲/۱۶۵)، علامہ قاضی خاں کی عبارت ملاحظہ فرمائیں: ”والصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهناً، ثم ينظر إن ذكر شرط الفسخ في البيع، فسد البيع وإن لم يذكر ذلك في البيع و تلفظا بلفظة البيع بشرط الوفاء أو تلفظا بالبيع الجائز و عندهما هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك، و إن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع و يلزمه الوفاء بالوعد، لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس“ قاضی خان کی یہ عبارت اس عقد کی صحت کی کیفیت کو بیان کرتی ہے، اور درحقیقت یہ وہی بات ہے جس کو علامہ شامی ”بعض محققین کا قول بتا رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ یہ بیع تین عقود سے مرکب ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ شامی کی عبارت کا خلاصہ: ”بعض محققین کا جامع قول یہ ہے کہ یہ بیع بعض احکام کے حق میں (۱) فاسد ہے، حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک فسخ کرنے کا مالک ہوتا ہے۔ اور بعض احکام کے حق میں صحیح ہے، جیسے فروخت شدہ چیز کو اپنے پاس اتارنا اور اس کے منافع کا حلال ہونا اور بعض احکام کے حق میں (۳) رہن ہے حتیٰ کہ خریدار اس کو دوسرے

کے ہاتھ فروخت کرنے اور اس کو رہن رکھنے کا مالک نہیں ہوتا۔ اور اس کی ہلاکت سے دین ساقط ہو جاتا ہے، لہذا یہ تینوں عقود سے مرکب ہے، جیسا کہ زرافہ میں اونٹ، گائے اور چیتے کی صفات اکٹھا ہوتی ہیں۔ اس بیع کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اپنے مالکین کے لیے دونوں بدل کے محفوظ و سالم رہنے کی شرط پر جائز قرار دیا گیا ہے۔ ”البحر المرقب“ میں کہا: مناسب ہے کہ فتوے میں جامع قول سے عدول نہ کیا جائے اور ”النہر“ میں ہے کہ ہمارے دیار میں عمل زلیعی کی ترجیح پر ہے، (ردالمحتار ۴/۲۳۶ طبع احیاء التراث)۔

پھر ان حضرات فقہاء نے عقد بیع الوفاء کی چار صورتیں بیان کی ہیں، جن میں سے بعض جائز اور بعض ناجائز ہیں:

۱- متعاقدین بغیر کسی شرط کے عقد کریں، البتہ دل میں یہ بات ہو کہ بائع جب ثمن واپس کر دے گا تو مشتری بیع کو بائع کی طرف لوٹا دے گا اور اپنے ادا کیے ہوئے ثمن کو لے لے گا، اس صورت کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ معاملات میں نیت کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ اصل اعتبار ارکان و شروط کے پورے طور سے پائے جانے کا ہے، اور ارکان بیع یہاں پر پورے طور سے پائے جا رہے ہیں۔

۲- متعاقدین عقد کریں اور صلب عقد ہی میں یہ شرط لگا دیں کہ جب بائع فروخت کردہ چیز کا ثمن مشتری کو واپس کر دے گا تو مشتری بیع کو مالک، یعنی بائع کی طرف واپس کرے گا، تو یہ صورت بیع فاسد کی ہوگی۔

۳- متعاقدین نے عقد کیا اور صلب عقد میں کوئی شرط نہیں لگائی، بلکہ عقد کے مکمل ہونے کے بعد وعدہ کے طور پر بیع کی واپسی کی شرط لگائی، اس صورت میں بھی بیع جائز ہوگی، اور دونوں کو وعدہ کا پورا کرنا ضروری ہوگا، اور یہ کہا جائے گا کہ عقد کی تکمیل کے بعد جو بیع کی واپسی کی شرط لگی ہے یہ عقد کے ساتھ لاحق نہیں ہوگی، جیسا کہ حنفیہ کا راجح مذہب ہے۔ اور چونکہ شریعت میں وعدہ کی تکمیل پر بہت زور دیا گیا ہے، اس لیے دیانہ بھی اور قضاء بھی اس وعدہ کو پورا کیا جائے گا۔ جس کی تفصیل ہم آگے بھی ذکر کریں گے۔

۴- بائع اور مشتری نے عقد سے پہلے ہی ”بیع الوفاء“ پر اتفاق کر لیا تھا، یعنی باہمی گفتگو کر لی تھی کہ ہم دونوں جو عقد کریں گے اس کی صورت یہ ہوگی..... پھر دوسری مجلس میں دونوں نے بیع مطلق کی جس میں کوئی شرط ذکر نہیں کی، اس صورت میں بھی بیع جائز ہوگی اور وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا رجحان بھی یہی ہے، حضرت تھانویؒ نے اس سلسلہ میں شامی کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:

”وقد سنل الخیر الرملي عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل العقد، و عقدا البیع خالیاً عن شرط، فأجاب بأنه صرح في الخلاصة والفیض و التتار خانية و غیرها بأنه یکون علی ما تواضعا“

(ردالمحتار ۵/۸۴)۔

اسی طرح ایک دوسری عبارت پیش کی ہے: ”انہ صحیح لحاجة الناس، فراراً من الربا و قالوا: ماضاق علی الناس أمر الماتسع حکمه“ (امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۳)۔

تیسرا نقطہ نظر بیع الوفاء، بیع فاسد ہے:

جو حضرات اس عقد کو غیر صحیح مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع فاسد ہے، مالکیہ اور حنابلہ کی طرف اسی قول کی نسبت کی جاتی ہے، اسی طرح متقدمین شوافع اور حنفیہ کی رائے بھی یہی ہے کہ بیع الوفاء فاسد ہے، اس لیے کہ ثمن خریدار کو لوٹانے پر فروخت شدہ چیز کے لینے کی بائع کی طرف سے شرط لگانا بیع کے تقاضہ اور حکم کے خلاف ہے، بیع کا تقاضہ ہے کہ استقرار و دوام کے طور پر بیع پر خریدار کی ملکیت ہو، نیز اس واپسی کی شرط میں بائع کا فائدہ ہے اور ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو اور اس میں احد المتعاقدین کا فائدہ ہو وہ بیع کو فاسد کر دیتی ہے اور اس کے جواز کے اوپر کوئی نص بھی موجود نہیں ہے، چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ”کل شرط لایقتضیہ العقد و فیہ منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود علیہ و هو من أهل الاستحقاق یفسده کشرط أن لا یبیع المشتري العبد المبیع.....“ (فتح القدير مع الهدایہ ۴۰۶/۶)۔

لہذا بائع کی جانب سے بیع کی واپسی کی شرط لگانا شرط فاسد ہے اور بیع میں اس کی شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جائے گی، نیز یہ کہ اس طریقہ پر بیع کا مقصد حقیقتہً بیع بشرط الوفاء نہیں ہوتا، بلکہ حرام ربا تک پہنچنا ہے، یعنی مال کو ایک مدت تک کے لیے دینا اور فروخت شدہ چیز کا نفع ربا ہے، جو تمام حالات میں باطل ہے۔

اس رائے کا حاصل یہ ہے کہ جو شرائط مقتضائے عقد میں شامل ہوں، یا مقتضائے عقد کے مناسب ہوں یا ان کے قبول کرنے کا عرف جاری ہو یا وہ شرائط مخالف شرع نہ ہوں تو وہ جائز ہیں اور جن عقود میں وہ شرائط پائی جائیں وہ بھی صحیح ہیں، اور جو شرائط اس کے خلاف ہوں تو وہ جواز بیع سے مانع ہیں، بیع الوفاء میں جو شرط فسخ عقد کی لگائی جاتی ہے وہ مقتضائے عقد کے منافی ہے لہذا یہ عقد جائز نہ ہوگا اور بیع الوفاء فاسد ہوگی (مصادر الفقہ الاسلامی ۱۵۱/۳)۔

لیکن مذکورہ بالا تفصیل میں فقہاء مالکیہ اور فقہاء حنابلہ کا جو نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے، اس میں نظر ہے؛ کیونکہ مالکیہ و حنابلہ کی کتب فقہ کی عبارات سے ان کا مسلک اور رائے ایسی معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ متاخرین احناف کی، جس کی تفصیل ہم عنقریب نقل کریں گے۔

اقوال ثلاثہ میں سے راجح کی تعیین:

بیع الوفاء کے بارے میں حضرات فقہاء کی تین رائیں مذکور ہوئیں، ان میں سے پہلی اور دوسری رائے میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیع الوفاء حقیقت میں تو رہن ہی تھی، لیکن الفاظ اور تعبیرات کے پیش نظر یہ کہنا بھی بجا ہے کہ

بیع الوفاء بیع ہی ہے، اسی کو قاضی خاں نے بھی ترجیح دی ہے اور بعض متاخرین احناف نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

ہماری رائے میں بھی دوسرا نقطہ نظر جو کہ تفصیلی ہے، ہی راجح ہے، اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

۱- ”جامع الفصولین“ میں ابن قاضی سماوہ نے ذکر کیا ہے کہ امام نسفی فرماتے ہیں: کہ ہمارے زمانہ کے مشائخ اس کے بیع صحیح ہونے پر متفق ہیں، اس وجہ سے کہ بعض سلف بھی اسی کے قائل تھے؛ اس لیے کہ متعاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے اور دوران عقد کوئی شرط اس میں ذکر نہیں کی۔ ”والعبرة للملفوظ دون المقصود“ کہ الفاظ کا اعتبار ہے مقاصد کا اعتبار نہیں، چنانچہ اگر کسی نے کسی عورت سے اس مقصد اور نیت سے نکاح کیا کہ صحبت کرنے کے بعد وہ اس کو طلاق دے دے گا تو عقد صحیح ہو جائے گا (جامع الفصولین ۱/۲۳۵)۔

اسی قول کی ترجیح بیان کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابو عبد اللہ محمد بیرم الثانی متوفی (۱۲۴۷ھ) رقم طراز ہیں: ”و علی هذا استقر عمل شیوخ النسفی علی ما نقله عنه الزیلعی، وقال العمادی: و فتویٰ جدی شیخ الاسلام برهان الدین و اولادہ و مشائخ زمانہم علی أن الملک یثبت للمشتري شراءً جائزاً فی زوائد المبیع و لا یغرم لو استهلکها، و علیہ استقر قول أئمة زماننا و استاذینا رحمہ اللہ تعالیٰ“

یعنی بیع الوفاء کے جواز پر شیخ الاسلام برهان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی صاحب الہدایہ اور ان کی اولاد کا فتویٰ ہے اور صاحب ہدایہ اہل ترجیح میں سے ہیں، جیسا کہ علامہ ابن کمال پاشا نے نقل کیا ہے۔

اور بیع الوفاء کے جواز پر سب سے بڑی دلیل لوگوں کی ضرورت اور ان کا تعامل ہے، لوگوں نے اس پر عمل کیا ہے، اپنی ضرورت کی وجہ سے، تاکہ وہ حرام ربا سے بچ سکیں، اور قواعد کو کبھی کبھی تعامل کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ استصناع میں ہے، یعنی آرڈر پر صانع سے کوئی چیز بنوائی اس میں بیع معدوم ہوتی ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے اس کو بھی جائز رکھا گیا ہے، درحقیقت لوگوں کی ضرورت اور ان کا تعامل بھی بڑی دلیل ہے، اسی وجہ سے علامہ ابن نجیم نے ”الاشباہ والنظائر“ کے قاعدہ: ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة“ کے تحت لکھا ہے: ”و منها الافتاء بصحة بیع الوفاء حین کثر الدین علی اهل بخاری، و هكذا بمصر، و سموه بیع الأمانة والشافعية یسمونه الرهن المعاد و هكذا سماه فی الملتقط“

نیز آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے حضرات فقہاء نے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس بیع کو جائز قرار دیا تھا تو آج کے زمانہ میں تو لوگوں کو اس کی طرف احتیاج زیادہ ہے اور دنیا بھر میں اس کا تعامل بھی ہے تو اب بھی جواز کا فتویٰ دینا چاہئے (العادۃ حکمۃ واستعمال الناس حیۃ، احمد الزرقاء ص ۳۷)۔

۲- علامہ علاء الدین حصکفیؒ ”در مختار“ میں تحریر فرماتے ہیں: ”قیل: إن بلفظ البیع لم یکن رهنًا، ثم إن ذکرنا

الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً ولو بعده على وجه الميعاد جاز لزوم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمةً لحاجة الناس وهو الصحيح كما في الكافي والخانية و أقره خسرو هنا والمصنف في باب الاكراه و ابن الملك في باب الاقالة بزيادة“ (الدر المختار ۵/۲۷۷)۔

علامہ حصكفیؒ کی یہ عبارت بیع الوفاء کی جائز صورت پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے۔

۳- ”مجلة الاحكام العدلية“ میں ہے: ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة، و من هذا القبيل تجویز بیع الوفاء، فإنه لما كثرت الديون على أهالي بخارى مست الحاجة إلى ذلك فصار مرعياً“ (مجلة الاحكام العدلية دفعه ۳۲)۔

یعنی ضرورت شدیدہ کی وجہ سے بیع الوفاء کی اجازت ہے۔

۴- ہمارے اکابر علماء میں سے بھی بعض اکابر نے بیع الوفاء کو ضرورت شدیدہ کے وقت جائز قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ، ”امداد الفتاویٰ“ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”بعض متأخرین نے بیع الوفاء کی اجازت دی ہے پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متأخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں (امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۳)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: کثیر من المتأخرین کا فتویٰ ہے کہ قبل عقد ذکر کی ہوئی شرط بھی معتبر اور عقد جائز ہے لضرورة الناس اسی صفحہ پر آگے فرماتے ہیں کہ نقلی دلیل اس (بیع الوفاء کے جواز) کی دوسری روایات فقیہہ ہیں، جن کی طرف لضرورة الناس میں اشارہ ہو گیا (امداد الفتاویٰ ۱۰۹/۳)۔

اسی طرح حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی ”امداد المفتیین“ میں بیع الوفاء کے جواز کی بات کہی ہے، نیز حضرت مفتی محمود حسن صاحب کارجمان بھی اسی طرف ہے، چنانچہ فرماتے ہیں اگر بیع بلا شرط کر لی جائے اس کے بعد دوسری مجلس میں پھر واپسی کا معاہدہ کر لیا جائے تو بیع درست ہو جائے گی اور مدت معینہ میں رقم ادا کرنے پر حسب معاہدہ مکان واپس کرنا اخلاقاً لازم ہوگا (فتاویٰ محمودیہ ۲۷۶/۲۳)۔

ان وجوہات کی وجہ سے دوسری رائے کہ بیع الوفاء جائز ہے اور بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے خریدار کا فروخت شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا اور بعض احکام کا فائدہ نہیں دیتی، جیسے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا، رائج معلوم ہوتی ہے۔

بیع الوفاء کے جواز پر شبہات کا ازالہ:

بیع الوفاء کو جائز قرار دینے پر یہ شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ بیع حرام ربا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، جس سے بچنا شرط ہے، لیکن جب ہم بیع الوفاء کی حقیقت اور مقصد پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ یقین ہوتا ہے کہ مذکورہ شبہ غلط ہے؛ اس لیے کہ اگر مرتہن

راہن سے شی مرہون کو لے اور اس سے نفع اٹھائے تو یقیناً حرام رہا ہوگا اور فرمان خداوندی ”حَرَمَ الرِّبَا“ میں داخل ہوگا، اس لیے کہ ہر وہ قرض جو نفع کھینچے وہ رہا ہی ہے۔ مگر یہاں صورت دوسری ہے، کہ ایک شخص دوسرے سے کوئی شی خریدتا ہے اور خرید کے ذریعہ وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ درحقیقت بیع ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ”أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ“ (البقرہ: ۲۷۵) کا مصداق ہوئی۔

اور جہاں تک اس شبہ کا تعلق ہے کہ یہ ایک حیلہ ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر حیلہ ممنوع نہیں، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ”بیان القرآن“ میں سورہ ص کی آیت نمبر (۴۴) کے تحت رقم طراز ہیں: کہ اس میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس حیلہ سے کسی حکمت شرعیہ و غرض شرعی کا ابطال مقصود ہو وہ حرام ہے، اور جس میں یہ نہ ہو، بلکہ کسی امر مطلوب شرعی کی تحصیل مقصود ہو وہ جائز ہے (بیان القرآن ۲۷۸/۳ طبع اتحاد یونین)۔

علامہ سرخسیؒ مبسوط کی ”کتاب الحیل“ میں تحریر فرماتے ہیں: ”فالحاصل أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن، وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق الرجل حتى يبطله أو في باطل حتى يموهه أو في حق حتى يدخل فيه شبهة، فما كان على هذا السبيل فهو مكروه، وما كان على السبيل الذي قلنا أولاً فلا بأس به“ (المبسوط للسرخسی ۲۰/۲۱۰)۔

نیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ”وَحُذِّبِيكَ ضِعْفًا فَاصْرَبْ بِهِ وَلَا تَحْنُثْ“ (سورہ ص: ۴۴) میں حیلہ کی ہی تعلیم ہے، اسی طرح آیت: ”فَلَمَّا جَهَرَهُمْ بِجَهَارِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رِجْلِ أَخِيهِ“ (سورہ یوسف: ۷۰) میں بھی حیلہ ہی کا بیان ہے۔ علامہ سرخسیؒ نے تو متعدد احادیث اور آثار کو نقل کیا ہے کہ حیلہ شرعی جائز ہے اور ہر حیلہ کو ناجائز نہیں سمجھنا چاہئے۔

حیلہ شرعیہ کے جواز کے سلسلہ میں مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ”تکمیل فتح الملہم“ میں صحیحین کی وہ حدیث بھی پیش کی ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے، جس میں نبی علیہ السلام نے عمدہ کھجوروں کے ایک صاع کو گھٹیا کھجوروں کے دو صاع کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا اور پھر اس کا حیلہ یہ بتایا کہ اولاً گھٹیا کھجوروں کو دراہم کے بدلہ بیچ دو پھر ان دراہم سے عمدہ کھجوریں خرید لو، یہ ایک حیلہ ہی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

”عن أبي سعيد و أبي هريرة رضي الله عنهما أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استعمل رجلاً على خيبر فجاءهم بتمرٍ جنيبٍ، فقال: أكلت تمر خيبر هكذا؟ قال: إنا لناخذ الصاع بالصاعين والصاعين بالثلاث، قال: لا تفعل، بع الجمع بالدرهم ثم ابتع بالدرهم جنيباً“ (بخاری، کتاب البیوع، باب اذا بیع تمر بتمر خیر منہ ۳۳۳/۲، مسلم، کتاب المساقات، باب: بیع الطعام مثلاً بمثل حدیث ۱۵۹۳)۔

اس حدیث میں عامل خیبر کو رہا سے بچنے کے لیے ایک تدبیر اور حیلہ بتلایا گیا ہے، لہذا اس طرح کا حیلہ جائز ہوگا۔

اس کے برخلاف حدیث: ”قاتل الله اليهود، حرم الله عليهم الشحوم فحملوها فباعوها و أكلوا أثمانها“ (متفق علیہ اغاثة اللہ فان ۴۳۴) میں یہود کے جس حیلہ کی مذمت اور قباحت بیان کی گئی ہے وہ ایسا حیلہ تھا کہ اس میں حکمت شرعیہ کا ابطال لازم آ رہا تھا، کہ شریعت نے ان کو اکل شحوم اور بیع شحوم سے منع کیا تھا، لیکن انھوں نے وہ کام کیا جس سے حقیقت ہی بیع شحوم اور اکل شحوم لازم آیا۔ انھوں نے محض تعبیر ہی کو تو بدلہ تھا، جبکہ تعبیر کے بدلنے سے حکم کی حرمت و حلت پر فرق نہیں پڑتا۔

”نعمۃ المنعم“ میں مولانا نعمت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ چربی پگھلائے جانے سے پہلے اس کو شحم کہتے ہیں اور پگھلائے جانے کے بعد اس کو دودک کہتے ہیں، اس طرح یہود نے حیلہ کیا کہ چربی کو پگھلا لیا اور نام کی تبدیلی سے فائدہ اٹھانا چاہا، جبکہ اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوئی، اس طرح کا حیلہ جو حکمت شرعیہ کو باطل کرے بالاتفاق علماء کے ناجائز ہے، اور اگر آدمی ایسی تدبیر کرتا ہے جس سے اپنے اوپر سے یا دوسرے سے مضرت کو دفع کرے اور حرام سے بچے یا حلال تک پہنچے، اور اس کے لیے جائز طریقہ استعمال کرے تو صحیح ہے، خود نبی کریم ﷺ نے اس کی تدبیر بتلائی ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں گزرا کہ عامل خیبر نے کہا کہ دو صاع خراب کھجور دے کر ایک صاع اچھی کھجور خریدتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا

”لا تفعل بع الجمع بالدر اہم ثم ابتع بالدر اہم جنیباً“ (نعمۃ المنعم ص ۱۱۸)۔

مولانا نعمت اللہ صاحب دوسری جگہ حیلہ شرعی پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”حیلہ شرعی، جائز تدبیر کر کے حرام سے بچنا، ”قصد التوصل الی تحویل حکم لآخر بواسطۃ مشرورۃ فی الأصل“ ایک حکم کو بدل کر دوسرے حکم حاصل کرنے کا قصد کرنا ایسے واسطہ سے جو فی نفسہ جائز ہو، عام حالات میں اس واسطہ کو جن اغراض کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اس کے علاوہ کسی دوسری غرض کو حاصل کرنے کے لیے اس واسطہ کو استعمال کرنا۔

قصد کی قید ہم نے اس لیے لگائی کہ اس کا اگر قصد نہیں ہے تو اس کو اصطلاح میں حیلہ نہیں کہا جائے گا، جیسے کسی نے مطلقہ ثلاثہ سے شادی کی پھر اتفاق سے اس کو طلاق دے دی پہلے سے کوئی تحلیل کی نیت نہیں تھی تو اب یہ بیوی سابق شوہر کے لیے حلال ہوگئی، اور یہ حکم کی تبدیلی خالص شرعی تاثیر کی بنا پر ہے، کسی دوسری چیز کا شائبہ نہیں ہے۔

اور جائز واسطہ کی قید اس لیے لگائی ہے کہ اگر حکم کے بدلنے کا قصد کرتا ہے ناجائز واسطہ سے تو بالاتفاق یہ حیلہ حرام ہے، اس کی کسی فقیہ نے اجازت نہیں دی ہے، جیسے عورت معاذ اللہ اسلام سے مرتد ہو جائے، تاکہ نکاح فسخ ہو جائے اور شوہر سے چھٹکارا حاصل ہو جائے، بنی اسرائیل کا حیلہ اسی قبیل سے تھا۔

تیسری قید لگائی کہ فی نفسہ واسطہ جائز ہو اس لیے کہ حکم شرعی کی تبدیلی کے لیے جب واسطہ کو استعمال کیا جائے۔ یہی محل بحث ہے۔ کہ اب وہ جائز رہا یا نہیں؟ (اس کی تفصیل یہ ہے کہ) جن احکامات کا تعلق خدا اور بندے کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس سے مقصود دنیاوی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ صرف اخروی فائدہ مقصود ہوتا ہے، جیسے عبادات، تو اس میں نیت کو دخل ہوتا

ہے، اور اس کی صحت کے لیے نیت شرط ہوتی ہے، اور جن احکام کا تعلق باہم بندوں سے ہوتا ہے، اس میں دنیاوی فائدہ مقصود ہے اس کے صحیح اور فاسد ہونے میں نیت کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ اس میں ارکان و شروط کا پورے طور سے پایا جانا صحت کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جیسے بیع و شرائط اور عام معاملات اور اس تفریق کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی دل کے احوال سے واقف ہے اس کو ظاہری دلیل کی ضرورت نہیں؛ اس لیے جو معاملہ بندے اور اللہ کے درمیان ہے اس میں اس کی نیت کا اعتبار ہے اور جو معاملات باہم بندوں کے درمیان ہوتے ہیں اس کا مدرا ظاہری دلیل پر ہے، آدمی کے مقاصد اور نیتوں کے جاننے کا وہی واحد ذریعہ ہے، اس لیے احکام کے صحیح اور فاسد ہونے میں نیت اثر انداز نہیں ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ جن احکام میں دنیاوی فائدہ ہوتا ہے صحت و بطلان میں نیت کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ارکان و شرائط کو دخل ہوتا ہے تو جب کوئی شخص اس جائز واسطہ کو استعمال کرے گا کسی حکم شرعی کو حاصل کرنے کے لیے اور اس کے تمام ارکان و شرائط پائے جا رہے ہیں تو اس پر لازمی نتیجہ مرتب ہوگا، زیادہ سے زیادہ یہ بات ہوئی کہ عام حالات میں جن مقاصد کے لیے اس کو استعمال کیا جاتا ہے اس کے سوا کے لیے استعمال کر رہا ہے؛ مگر جب اس کی نیت کا کوئی اثر نہیں ہے تو اس سے وہ حکم صحیح رہے گا فاسد نہیں ہوگا، جیسا کہ اس حدیث (سابق) میں بیع کو عام طور سے جس غرض سے مشروع کیا گیا ہے اس کے سوا دوسری غرض کے لیے اس کو استعمال کیا جا رہا ہے، اور آپ ﷺ نے خود اس واسطہ کو دوسری غرض میں استعمال کرنے کی رہنمائی فرمائی اور فرمایا: ”ثم ابتع بالدر اہم جنیبا“ اس حدیث میں یہ دلیل بالکل واضح ہے۔

اسی طرح کمزور بدن کے آدمی پر حد جاری کرنے کے لیے آپ نے تدبیر بتلائی کہ ایک گچھا جس میں سوشا خضیں ہوں لے کر ایک مرتبہ مار دو، اس لیے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ اگر ہم اس کو سومرتبہ مار دیں گے تو مر جائے گا تو آپ ﷺ نے اس کی رہنمائی فرمائی، یہ بھی جائز واسطہ ہوا آدمی سے اصلی حد ساقط کرنے کا اس پر حیلہ کی تعریف صادق آ رہی ہے۔ حد کے ساقط ہونے کی علت گچھے سے مارنا ہی ہے، ضرورت تو سبب ہے۔ اگر جسم کا متحمل نہ ہونا حد کو ساقط کر دیتا تو البتہ یہ کہنا صحیح تھا کہ ضرورت اس کی علت ہے، لیکن حدیث اس واسطہ کے استعمال کو ضروری قرار دے رہی ہے۔

اور کسی حکم کو ساقط کرنے یا بدلنے کے لیے آدمی حیلہ کو استعمال کرتا ہے، تو ضرورت و حاجت ہی کی وجہ سے استعمال کرتا ہے، لوگوں کو اچھی کھجور کھانے کی ضرورت تھی آپ نے اس کے لیے جائز واسطہ کی راہ نمائی فرمائی، تاکہ سود کے بغیر ان کی ضرورت پوری ہو جائے۔

ان تمام باتوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ پہلے ایک چیز حرام تھی اس کو مباح کر لینا، ایک چیز واجب تھی اس کو ساقط کر دینا جائز واسطہ کے ذریعہ سے صحیح اور درست ہے۔ معاملات کے اندر صحت کا مطلب ہوتا ہے کہ ظاہر فتویٰ اور قضاء کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے، جس کو عبادات میں کہا جاتا ہے کہ وہ فعل قضاء کو ساقط کرنے والا ہے، اور معاملات میں کہا جائے کہ

اس پر نتیجہ مرتب ہوگا۔ رہا دینا صحیح ہونا یعنی آخرت میں اس عمل پر آثار کا مرتب ہونا، ثواب کا پانا، سزا سے بچنا یا اس پر گناہ کا مرتب ہونا، اس کا تعلق نیت سے ہے (عمدة المنعم از ص ۱۳۶ تا ص ۱۳۹)۔

خلاصہ:

حضرت والا کی بیان کردہ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ضرورت کی وجہ سے قصداً جائز واسطہ کو استعمال کرتے ہوئے کسی حکم کو بدلنا حیلہ شرعی ہے اور جائز ہے، اور زیر بحث مسئلہ بیع الوفاء میں بھی ایسا ہی ہے؛ کیونکہ بیع الوفاء کی حقیقت رہن تھی، اس رہن کو بیع سے تبدیل کر دیا گیا اور بیع ایک جائز واسطہ ہے، لہذا جائز واسطہ کے ذریعہ ایک حکم کو بدلنا جاہل ہے جو کہ جائز ہے۔

رہا مسئلہ یہ کہ بیع الوفاء میں بیع کی واپسی کی ایک شرط لگی ہوئی ہے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے مفسد بیع ہے، اور جب اس شرط کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوگئی تو واسطہ جائز کہاں رہا؟ تو اس کی تفصیل ہم ماقبل میں لکھ چکے ہیں کہ بیع الوفاء کی وہی شکل تو جائز ہے جس میں صلب عقد میں شرط نہ لگی ہو، بلکہ عقد کے تام ہونے کے بعد ثمن کی واپسی پر بیع کو واپس لینے کا معاملہ وعدہ کے طور پر کیا جائے، اور اس وعدہ کو پورا کرنا دینا قضاء ضروری قرار دیا جائے، لہذا ایسی صورت میں جائز واسطہ کا استعمال ہوگا۔

البتہ اس پر ایک دوسرا اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اصل عقد بیع کی واپسی کی شرط سے خالی تھا بعد میں وعدہ کے طور پر شرط لگی تو بعد میں لگنے والی یہ شرط بھی تو اصل عقد کے ساتھ لاحق ہو جائے گی، لہذا ایسا ہو گیا جیسا کہ صلب عقد ہی میں شرط لگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عقد کے بعد میں لگنے والی شرط اصل عقد کے ساتھ لاحق ہوتی ہے یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت ہے، ورنہ صاحبین کا اصل مذہب اور دوسری روایت امام ابوحنیفہؒ کی یہ ہے کہ عقد کے تام ہونے کے بعد جو شرط طے ہوگی وہ اصل عقد کے ساتھ لاحق نہ ہوگی، اور احناف کے نزدیک یہی راجح ہے، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”قیل: يلتحق عند أبي حنيفة و قيل: لا و هو الأصح كما في جامع الفصولين، لكن في الأصل أنه يلتحق عند أبي حنيفة و إن كان الإلحاق بعد الافتراق عن المجلس، و تمامه في البحر، قلت: هذه الرواية الأخرى عن أبي حنيفة، و قد علمت تصحيح مقابلهما وهي قولهما“ (شامی رد المحتار ۵/۸۴)۔

پھر جاننا چاہئے کہ عقد کے تام ہونے کے بعد جو شرط وعدہ کے طور پر لگی تھی اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ وعدہ کی تکمیل تمام ادیان ہی میں مامور بہ ہے۔ حضرات انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام نے ہمیشہ اس کی پابندی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و إبراهيم الذي و في“ (سورہ نجم: ۷۷) دوسری جگہ وعدہ پورا کرنے کو مدح کے طور پر اس طرح ذکر کیا

ہے: ”إنه كان صادق الوعد“، تیسری جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”وَأوفوا بالعهد إن العهد كان مسؤولاً“ (سورہ اسراء: ۳۴) یہ حکم تو دیا ہے لیکن فقہاء نے قضاء بھی وعدہ پورا کرنے کو لازم کہا ہے، چنانچہ ما قبل میں قاضی خاں کے حوالہ سے یہ عبارت گزر چکی ہے کہ: ”وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع و يلزم الوفاء بالوعد؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (الفتاویٰ الثانیہ ۱۶۵/۲)۔

اسی طرح علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ: ”و في جامع الفصولين أيضاً: لو ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه العقد جاز البيع و لزم الوفاء بالوعد إذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس“ (رد المحتار ۵/۸۴)۔

بیع الوفاء پر مرتب ہونے والے اثرات:

بیع الوفاء کے تعلق سے ہمارے سامنے اجمالی طور پر تین قول آئے ہیں: (۱) بیع الوفاء رہن ہے۔ (۲) بیع الوفاء عقد مرکب ہے، بیع صحیح، رہن اور بیع فاسد سے۔ (۳) بیع الوفاء بیع فاسد ہے۔

ہماری درج ذیل گفتگو قول ثانی کے پیش نظر ہوگی، اس لیے کہ رائے اول کے مطابق تو اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، اور رائے ثالث مرجوح ہے۔

لہذا ہم جن احکام و اثرات کو نقل کریں گے وہ اس صورت کے مطابق ہیں کہ بیع الوفاء بیع صحیح، رہن اور بیع فاسد سے مرکب ہے، اب اس صورت میں بیع الوفاء پر جو احکام و اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اجمالی طور پر یہ ہیں:

۱- بیع الوفاء مشتری کے لیے کسی ایسے تصرف کا جواز پیدا نہیں کرتی جو ملکیت کو منتقل کرے، چنانچہ بیع الوفاء میں فروخت شدہ چیز کی بیع بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ نافذ نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ یہ رہن کی طرح ہے اور رہن کی بیع ناجائز ہے (شامی ۱۴/۲۴)۔

۲- بیع الوفاء میں خریدار کے لیے حق شفعہ نہیں ہے، حق شفعہ فروخت کرنے والے کے لیے باقی رہے گا (الفتاویٰ الہندیہ ۱۰۹/۳)۔

۳- بیع الوفاء کے طور پر فروخت شدہ زمین کا خراج فروخت کرنے والے پر ہوگا (معین الحکام ص ۱۸۳)۔
۴- اگر فروخت شدہ چیز خریدار کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو فروخت کرنے والے اور خریدار میں سے کسی کے لیے دوسرے پر کچھ نہیں ہوگا (حوالہ سابق)۔

۵- فروخت شدہ چیز وراثت کی وجہ سے فروخت کرنے والے کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جائے گی، لہذا اگر کسی نے اپنا باغ دوسرے کے ہاتھ بیع الوفاء کے طور پر فروخت کیا اور دونوں نے قبضہ کر لیا پھر خریدار نے اس کو دوسرے کے ہاتھ

قطعاً بیع کے طور پر فروخت کر دیا اور سپرد کر دیا اور پھر غائب ہو گیا تو فروخت کرنے والے یا اس کے ورثاء کو حق ہے کہ دوسرے خریدار سے مقدمہ لڑیں اور باغ واپس لے لیں (فتاویٰ ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

۶- بیع الوفاء میں فروخت کرنے والے کو حق ہے کہ اپنی فروخت کردہ چیز ثمن واپس کر کے مشتری سے واپس لے لے (معین الاحکام ص ۱۸۲)۔

۷- بیع الوفاء میں منافع مشتری کے لیے ہوں گے اور استدلال اس عبارت سے ہے۔ جو ماقبل میں گزری ہے: ”صحيح في بعض الأحكام كحل الإنزال و منافع المبيع“

بعض حضرات کو ”مجلۃ الاحکام العدلیہ“ کی عبارت: ”إذا شرط في الوفاء أن يكون قدر من المنافع للمشتري صح ذلك“ سے یہ وہم پیدا ہوا کہ بیع کے منافع مشتری کے لیے اس وقت حلال ہوں گے جب بائع کی طرف سے اجازت ہو یا عقد میں منافع حاصل کرنے کی شرط لگا دی جائے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر صورت میں منافع مشتری ہی کے لیے ہوں گے (الفقہ الاسلامی فی ثوبہ المجدید ۱۵۲/۴)۔ مجلہ کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگر مشتری کے لیے بعض منافع کی شرط نہ لگی تو سارے منافع مشتری ہی کو ملیں گے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر شرط نہ لگی تو مشتری کو منافع نہیں ملیں گے۔ چونکہ ”مجلۃ الاحکام“ اصل میں ترکی زبان میں ہے، اس لیے اس کی تعبیر کو سمجھنے میں لوگوں سے چوک ہو گئی ہے (شرح المجلہ ۴۲۱/۲)۔

۸- بیع الوفاء میں اگر فروخت شدہ چیز مشتری کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے اور اس کی قیمت ثمن کے برابر ہو تو اس کے مقابلہ میں ثمن ساقط ہو جائے گا اور اگر مقدار ثمن سے زیادہ ہو تو اس کی قیمت میں سے ثمن کے بالمقابل مقدار ساقط ہو جائے گی؛ کیونکہ وہ اس باب میں رہن کی طرح ہے (شامی ۲۴۷/۲)۔

خلاصہ:

مذکورہ احکام کا خلاصہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ بیع الوفاء عقد غیر لازم ہے، ایسا عقد ہے جو نقل ملکیت سے مانع ہے، عقد منفعت ہے، اور عقد ضمان ہے۔

بیع الوفاء کن چیزوں میں جائز ہے؟

جو حضرات بیع الوفاء کو جائز کہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جن چیزوں کو بیع الوفاء کے طور پر فروخت کیا جاتا ہے وہ دو قسم کی ہوتی ہیں ایک اشیاء منقولہ اور دوسری اشیاء غیر منقولہ۔ اگر وہ اشیاء غیر منقولہ ہیں تو ان کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ اشیاء غیر منقولہ مکلف کی ہوں گی، یعنی عاقل بالغ کی، دوسری یہ کہ وہ غیر مکلف، یعنی صبی یا مجنون کی ہوں گی۔ اس طرح کل تین صورتیں ہوتی ہیں:

۱- اشیاء منقولہ کی بیع الوفاء

۲- مکلف کی اشیاء غیر منقولہ کی بیع الوفاء

۳- غیر مکلف کی اشیاء غیر منقولہ کی بیع الوفاء

تینوں صورتوں کا حکم درج ذیل ہے:

مکلف کی اشیاء غیر منقولہ جیسے زمین، مکان اور دوکان وغیرہ کی بیع الوفاء صحیح ہے، کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے: البتہ غیر مکلف کی اشیاء غیر منقولہ کی بیع الوفاء میں اختلاف ہے، ائمہ سمرقند اس کو ناجائز کہتے ہیں، اس لیے کہ اس میں مشتری کو بیع کے جو منافع حاصل ہوں گے وہ صبی کے ولی کی جانب سے تبرع کی حیثیت رکھیں گے، حالانکہ صبی کے ولی کو صبی کے مال میں سے تبرع کرنے کا اختیار نہیں ہے، لہذا صبی و مجنون جو کہ شرعاً غیر مکلف ہیں ان کے اموال میں بیع الوفاء جائز نہ ہوگی۔

جبکہ صاحب ہدایہ اور ابن قاضی سماوہ ولی کو ضرورت شدیدہ کے وقت اجازت دیتے ہیں کہ وہ صبی کی زمین جائداد کو بیع الوفاء کے طور پر دے دے، اس لیے کہ اگر ضرورت شدیدہ میں ولی کو اپنی ذات پر صبی کا مال خرچ کرنا پڑے تو وہ بھی تو جائز ہے۔ لہذا بشرط حاجت و ضرورت اجازت ہونی چاہئے۔ رہا مسئلہ اشیاء منقولہ کی بیع الوفاء کا تو ”فتاویٰ بزازیہ“ کے کلام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اشیاء منقولہ کی بیع الوفاء جائز نہیں ہے، فرماتے ہیں: ”وإذا جمع في البيع الجائز بين العقار والمنقول الذي ليجوز فيه البيع الجائز، بأن لم يكن تبعاً للعقار حتى فسد في المنقول الذي لا يتعدى إلى العقار بل يجوز فيه، وهذا إشارة إلى أنه ليجوز الوفاء في المنقول.“ اور عدم جواز کی علت یہ بیان کی جاتی ہے کہ بیع الوفاء میں بدلیں کی سلامتی ضروری ہے، اور اشیاء منقولہ میں عقد کے فسخ کے وقت بیع عامۃً سلامت نہیں رہتی، لیکن اس علت پر نقد کرتے ہوئے ابو عبد اللہ بیروم الثانی لکھتے ہیں کہ اس کو من کل الوجوه تسلیم نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ بہت سی اشیاء منقولہ بھی ایسی ہیں جن میں عقد کے فسخ کے وقت بیع سالم رہتی ہے، جیسا کہ غلام ہے، دابہ ہے۔ البتہ کچھ اشیاء منقولہ ایسی ہیں جن میں بیع ہلاک ہو جاتی ہے، جیسا کہ اشیاء خوردنی، یعنی پھل وغیرہ۔ لہذا ان اشیاء منقولہ میں بیع الوفاء کے عدم جواز کی بات کہی جائے جن میں بیع سے انتفاع ان کے ہلاک کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے، اور وہ اشیاء منقولہ جن میں بیع عامۃً سلامت رہتی ہے، ان میں بیع الوفاء کو جائز کہنا چاہئے۔

اس تفصیل کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کاروں، ٹرکوں، جہازوں وغیرہ اشیاء منقولہ میں بیع الوفاء جائز ہوگی اور نوازل کی روایت کو اسی قسم کی اشیاء منقولہ پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ ”أنه جاء في النوازل جواز الوفاء في المنقول“ (فتاویٰ بزازیہ ۴/۳۰۹، ۴۱۶)۔

خاتمہ:

ہم نے ماقبل میں مذاہب اربعہ کے اجلہ فقہاء کی جو تحریرات پیش کی ہیں اور ان میں غور و خوض کیا ہے تو ہم اس نتیجے

پر پہنچے ہیں کہ اگر صلب عقد میں ثمن کی واپسی پر فروخت شدہ چیز کو واپس لینے کی شرط نہیں لگی ہے تو عقد بیع الوفاء جائز ہوگا، اور اگر بیع کی واپسی کی شرط نفس عقد میں ہو تو احناف، مالکیہ اور شوافع کے نزدیک بیع فاسد ہوگی اور حنابلہ کے نزدیک یہ بھی جائز ہوگی، البتہ حنابلہ کے نزدیک شرط فاسد ہو جائے گی، پھر اگر بیع بیع کی واپسی کی شرط سے تو خالی تھی، لیکن عقد کے مکمل ہونے کے بعد یا عقد کے شروع کرنے سے پہلے ہی متعاقدین نے بطور وعدے کے ثمن کی واپسی پر بیع کو واپس کرنے پر اتفاق کر لیا تو راجح قول کے مطابق عقد صحیح رہے گا اور بائع پر ثمن کا واپس کرنا اور مشتری پر بیع کا واپس کرنا واجب ہوگا۔ کیونکہ متعاقدین کا باہمی اتفاق ایک وعدہ ہے جس کا پورا کرنا دیانۃً و قضاءً ضروری ہے۔ دیانۃً تو وعدے کی تکمیل فرمان خداوندی ”وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا“ (سورہ اسراء: ۳۴) کی وجہ سے ہے، اور ان نصوص صحیحہ کی وجہ سے ہے جن میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وعدہ کو پورا کرنے کی تاکیدات فرمائی ہیں۔ اور جہاں قضاء وعدہ کی تکمیل کا لازم ہونا ہے تو وہ لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر ہے۔

لہذا مذکورہ بالا تمام تفصیلات کی روشنی میں اس شرط کے ساتھ بیع الوفاء کے جواز کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے کہ صلب عقد شرط فسخ سے خالی ہو اور لوگوں کی ضرورت بھی ہو۔

بیع و فاء - چند جدید فقہی مسائل

مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی ☆

بیع و فاء بحیثیت بیع میں فروخت کنندہ ہی سے بیچے جانے کی شرط کا حکم:

۱- الف: بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اسے کا

کیا حکم ہوگا؟

اس سلسلہ میں صراحت کردہ فقہاء کی تفصیلات کی روشنی میں غور کیا جائے تو بیع و فاء کے بیع فاسد کے قائلین کے قول کے مطابق خریدار کے لئے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ جتنی جلدی ممکن ہو بیع بائع کے حوالہ کر دے، البتہ بیع فاسد میں بیع پر قبضہ کی صورت میں خریدار کے لئے ملکیت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے جب خریدار اس پر قبضہ کر لے تو اس کی ملکیت ثابت ہوگی، گو یہ ملکیت خبیث ہوگی۔

بیع صحیح کے قائلین کے مذہب کے مطابق حکم یہ ہوگا کہ خریدار کو اس سے انقاع کا حق ہوگا، وہ کسی دوسرے کو بیچ سکتا ہے، ہبہ کر سکتا ہے اور اللہ کے راستہ میں صدقہ کر سکتا ہے، بغیر دونوں عاقدین کی رضامندی کے بہ صورت اقالہ بیع فسخ نہیں ہوگی، اور دوسرے سے نہ بیچے جانے کی شرط فاسد ہوگی۔

قول جامع کی رو سے دیکھا جائے تو بیع فاسد ہونے کے اعتبار سے دونوں فریقین میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہوگا کہ جب چاہے اس معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے، اور ہر ایک دوسرے سے جو اس نے دیا ہے واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے، اور چونکہ ایک اعتبار سے بیع صحیح ہے، اس لئے خریدار کے لئے اس سے انقاع درست ہوگا، کسی اور سے بیچنا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ بائع کی طرف سے کسی اور سے نہ بیچے جانے کی شرط کو پورا کرنا خریدار پر لازم ہے، کیونکہ مواعید کا پورا کرنا دیا نہ ہر حال میں لازم ہے، اور قضاء اس وقت لازم ہوتے ہیں جبکہ وہ لوگوں کی ناگزیر ضرورت بن جائیں، ”المواعید قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح“ (در مختار رد المحتار ۷/ ۵۴) اور یہاں ایسا ہی ہے، اس لئے کہ بیع و فاء کا وجود ایک ناگزیر ضرورت ہی کی بنا پر ہوا ہے۔

غرض یہ کہ قول جامع (جس پر بہت سے معاصر علماء اور ماضی قریب کے علامہ شامی اور ان کے بعد کے علماء نے فتویٰ دیا ہے) کی اساس پر خریدار کو خود انقاع کا حق حاصل ہوگا، لیکن نقل ملکیت کا حق حاصل نہیں ہوگا، اگر وہ بائع کی اجازت کے بغیر کسی سے فروخت کیا یا کسی کو ہبہ وغیرہ کیا تو یہ تصرف نافذ نہیں ہوگا، اور معاملہ فاسد ہوگا۔

مالک اول کو بیچنے کی صورت میں قیمت کی مقدار:

ب۔ مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟ شرط کے مطابق بائع کو واپس کرنا اور ثمن مشتری کے حوالہ ہونا درحقیقت یہ اقالہ کی صورت ہے، اور اقالہ درست ہونے کے لئے عاقدین کی رضامندی، اتحاد مجلس، بدلیں پر قبضہ، بیع محل فسخ ہو، اقالہ کے وقت بیع کا اپنی حالت پر باقی رہنا، شرطیں ہیں، لہذا زیر بحث مسئلہ میں یہ شرطیں پائی جائیں گی تب اقالہ درست ہوگا، ورنہ نہیں۔

چونکہ بیع و فاء تین عقود (بیع صحیح، بیع فاسد اور عقد رہن) سے مرکب ہے، لہذا اگر بیع فاسد کی رو سے دیکھا جائے تو دریافت کردہ صورت میں مالک اول جو کہ بائع ہے، پر سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، آسمیں کمی بیشی درست نہیں ہوگی، خریدار کی طرف سے پہلی قیمت سے زائد کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ بیع فاسد کا حکم ہے، اس لئے کہ بیع فاسد میں جو فساد عقد میں سرایت کر گیا ہے اس کو دور کرنا اللہ کا حق ہونے کی وجہ سے لازم ہے، ”انما استحق الفسخ حقاً لله عزوجل لما في الفسخ من رفع الفساد، ورفع الفساد حق الله تعالى على الخلوص“ (بدائع ۳/۵۸۲)۔

یعنی صحیح کی رو سے مالک اول سے بیچنا دراصل اقالہ ہے، اور اقالہ کے بارے میں ائمہ مجتہدین کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک عاقدین کے حق میں فسخ ہے، دوسروں کے حق میں جدید بیع ہے، اس لئے ثمن اول یعنی سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، صاحبین کے نزدیک عاقدین کے حق میں بھی بیع ہے، اس وجہ سے ثمن اول پر اضافہ درست ہوگا، یعنی سابق ادا کردہ قیمت سے زائد کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے (دیکھئے: مختصر القدوری ص ۱۱۰، بدائع ۳/۵۹۳، ۵۹۴، رد المحتار ۷/۳۳۰، ۳۳۱)۔

”قال في الفتح: والأصل في لزوم الثمن أن الإقالة فسخ في حق العاقدین، وحقيقة الفسخ ليس إلا رفع الأول، كان لم يكن فيثبت الحال الأول وثبوته برجوع عين الثمن إلى مالكة كأن لم يدخل في الوجود وغيره، هذا يستلزم تعين الأول ونفي غيره من الزيادة والنقص وخلاف الجنس“ (رد المحتار ۷/۳۳۹)۔

رد المحتار کی تحقیق و تعلق کرنے والے شیخ عادل احمد عبدالوجود اور شیخ علی محمد معوض نے بھی اسی قول کو اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے: ”فلا يزداد عليه أو ينقص منه، لأن حقيقتها هي المبادلة بالثمن الذي اتفق عليه

اولاً، (رد المحتار) حاشیہ از محقق (۳۳۰/۳)۔

چونکہ اقالہ نام ہی ہے سابق عقد کو ختم کرنے کا، گویا کہ وہ عقد ہوا ہی نہیں، لہذا یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جبکہ ثمن اول ہی لازم ہو، پس ثمن اول مالک اول کے حوالہ ہوگا، نہ اس میں کمی ہوگی اور نہ ہی اس پر زیادہ کیا جائے گا، اور کیونکہ شرط ایفاء ثمن اول ہی ہے جس پر دونوں عاقدین کا اتفاق ہوا تھا (رد المحتار ۷/۳۳۹)۔

خریدار کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

۱- ج: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

بیع وفاء کے حکم کے بارے میں پیچھے فقہاء کا اختلاف گذر چکا ہے، اور قول جامع کے اعتبار سے عقود ثلاثہ (بیع صحیح، فاسد، رہن) سے عبارت و مرکب ہے، لہذا بیع فاسد کی رو سے جب تک خریدار کے پاس بیع رہے گی اس سے خریدار کے لئے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہوگا، بلکہ فاسد کی وجہ سے جو فساد سرائت کر گیا ہے، اس کا ازالہ خریدار پر لازم ہے (بدائع الصنائع ۴/۵۸۴)، اور ظاہر ہے کہ بیع کو بائع کے حوالہ کرنے کے بعد بھی فساد کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

اور بیع صحیح کی رو سے دیکھا جائے تو خریدار کے لئے بائع کی اجازت کے بغیر بیع سے انتفاع کا حق ہوگا (جامع الفصولین ۱/۲۳۵، تبیین الحقائق ۵/۱۸۴، البرازیہ بہامش البندیہ ۴/۴۰۶، معین الحکام ۴/۱۴۲، در مختار و رد المحتار ۷/۵۴۶)، لہذا جب تک اس کی ملکیت میں بیع رہے گی اس سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔

خریدار کا دوسرے سے بیچنے اور مزید قیمت لینے کا حکم:

۱- د: خریدار اگر دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں خواہ بیع فاسد ہو یا بیع صحیح بہر حال خریدار کے لئے کسی دوسرے سے بیچنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ بیع فاسد کی صورت میں کسی اور سے بیچنا خریدنا جہت و فساد کو تقویت پہنچانا اور مستحکم کرنا لازم آئے گا، اور بیع صحیح کے اعتبار سے، جیسا کہ گذر چکا ہے کہ خریدار خود فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن کسی دوسرے سے بیچنے کا مالک نہیں ”حل الانتفاع به إلا أنه لا يملك بيعه، قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى“ (رد المحتار ۷/۵۴۶)، لہذا اگر خریدار کسی دوسرے سے بیچ دے تو یہ بیع فضولی کے حکم میں ہوگا اور بائع (مالک اول) کی اجازت پر موقوف ہوگی، پس اگر وہ اجازت دے دیتا ہے تو بیع نافذ ہو جائے گی، اور اگر اجازت نہیں دیتا ہے تو بیع نافذ نہیں ہوگی (الوفاء فيما يتعلق ببيع الوفاء لأبي عبد الله محمد: بیروم الثانی، مطبوع مع مجلہ مجمع الفقہ الاسلامی، العدد السابع: ۲۷۱-۲۷۲)۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر خریدار بیع کر غائب ہو گیا تو وہ عدالت میں دوسرے خریدار سے مخاصمت کر سکتا

ہے (جامع الفصولین ۱/۲۳۵، معین الحکام ص ۱۴۳)۔

جب کسی دوسرے سے بیچنا جائز نہیں، اور اگر بیچ دے تو بائع اول (مالک) کی اجازت پر موقوف ہوگی، ایسی صورت میں اگر خریدار نے اول قیمت سے زیادہ پر بیچا اور اس پر قبضہ بھی کر لیا، تو یہ مزید قیمت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، کیونکہ از روئے شرع وہ بیع سے انتفاع کا مالک ہے، نہ کہ عین بیع کا، اسی وجہ سے فقہاء نے کہا وہ بیچنے کا مالک نہیں ہوگا (رد المحتار ۷/۵۳۶)، اس مزید قیمت کا مالک بائع اول (مالک) ہوگا، جبکہ وہ بیع کی اجازت دے، اور اگر اجازت نہ دے تو بیع قابل فسخ ہوگی۔

۲- رہن کی صورت میں اس سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عین رہن اور اس کی منفعت کا مالک بائع ہے، خریدار اپنے دین کا مالک ہے، دین کی ادائیگی کا وقت پورا ہو جائے، اور بائع (مالک) دین کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو خریدار (مرہن) اپنے دین کے بقدر مال مرہون کے ثمن میں حقدار ہوگا، اور دیگر غرماء کے مقابلہ میں اس کا حق مقدم ہوگا، جیسا کہ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرہن، یعنی خریدار کے لئے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا حلال نہیں ہے، جبکہ بائع راہن کی طرف سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ ہو، اور نہ ہی مال، مرہون سواری، یا دودھ دہی جانور، یا وہ خدمت لئے جانے کے لائق ہو۔ فقہاء کا اختلاف دو جگہوں میں ہے:

اول: راہن جب مال مرہون سے انتفاع کی اجازت دیدے تو آیا مرہن کے لئے مال مرہون سے انتفاع حلال ہوگا یا نہیں۔

دوم: جب راہن مال مرہون سے انتفاع کی اجازت نہ دے دے درانحالیکہ مال مرہون کوئی سواری، یا دودھ دہی جانور، یا قابل استخدا م ہو۔

راہن کی اجازت سے مال مرہون سے انتفاع کا حکم:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ مال مرہون سے انتفاع کے بارے میں فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر راہن مال مرہون سے انتفاع کی اجازت مرہن کو دے دے، تو مرہن کے لئے آیا مال مرہون سے انتفاع حلال ہوگا یا نہیں ہوگا، کے بارے میں فقہاء کے تین اقوال ہیں؛

پہلا قول: مطلق جائز ہے، خواہ دین قرض ہو یا غیر قرض، خواہ انتفاع کی شرط عقد کے اندر داخل ہو یا داخل نہ ہو، یہ حنفیہ کی رائے ہے (رد المحتار ۷/۵۳۶، جامع الفصولین ۱/۲۳۴)۔

دوسرا قول: مطلق ناجائز ہے، خواہ انتفاع عقد میں مشروط ہو، یا مشروط نہ ہو، خواہ دین قرض ہو یا غیر قرض، یہ امام

شافعیؒ کی رائے ہے (کتاب الأم)، اور حنفیہ کا بھی ایک قول ہے۔

تیسرا قول: جب رہن دین قرض کے عوض ہو تو ناجائز اور اگر قرض کے علاوہ جیسے بیع کا ثمن اور گھر کا کرایہ وغیرہ دین کے عوض ہو تو جائز، یہ مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ کا مذہب ہے، البتہ مالکیہ اور شافعیہ نے جواز کو دو شرطوں کے ساتھ مقید کیا ہے۔

اول: انتفاع کی شرط صلب عقد میں ہو۔

دوم: منفعت کی مدت معلوم ہو۔

مجوزین کی دلیل اور اس کا جائزہ:

راہن مال مرہون کی تمام تر منفعت کا مالک ہے، اس کو پورا اختیار ہے کہ وہ دوسرے کو منفعت کا مالک بنائے، لہذا اگر وہ مرہن کو مال مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دیتا ہے تو مرہن انتفاع کا مالک ہو جائیگا، اور اس کے لئے انتفاع حلال ہوگا، گویا بالفاظ دیگر راہن نے مرہن کو منفعت کا ہبہ کرنا شرعاً ثابت ہے۔

یقیناً منفعت کا ہبہ مشروع اور ثابت ہے، لیکن زیر بحث مسئلہ میں مالک نے اپنے پورے اختیار و رضا سے طیب خاطر سے ہبہ نہیں کیا ہے، بلکہ دین کے احسان و حاجت کے دباؤ میں منفعت کے ہبہ کرنے پر مجبور ہوا ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ کسی دوسرے کا مال بلا اس کی مکمل رضا اور طیب خاطر کے لینا شرعاً ناحق طریقہ پر مال لینا اور کھانا ہے، چونکہ ایک طرح کا غضب ہے اور قرآن نے اس سے منع کیا ہے: ”ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل“ (بقرہ: ۱۸۸) اسی وجہ سے رضا کو عقد کا رکن قرار دیا گیا ہے ”القاعدة: الرضا رکن للعقد وليس سببا للحل“ اس قاعدہ کی اصل قرآن مجید کی آیت ”عن تراض منکم“ (نساء: ۲۹) ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء میں مہر کے ہبہ کی بابت فرمایا: ”فإن طبن لکم عن شیء منہ نفسا فکلوه.....“ (نساء: ۴)۔

عدم جواز کے قائلین کی دلیل اور اس کا جائزہ:

جن فقہاء نے مطلق انتفاع کو ناجائز قرار دیا ہے، ان کی بنیادی دلیل حدیث مرفوع ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لا یغلق الرهن ممن رهنه، له غنمه، وعلیه غومہ“ (المستدرک للحاکم بیوع: ۵۱/۲، سنن الدارقطنی، ص ۳۰۳، حاکم کا بیان ہے: ہذا حدیث صحیح، اعلیٰ الإسناد علی شرط الشیخین ولم یخرجاہ)، اس حدیث پاک سے وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”له غنمه وعلیه غومہ“ مرہون کے زوائد اور اس کے منافع راہن کی ہیں، اور اس کے نقصان کی ذمہ داری و ضمان بھی اس پر ہے: ”له غنمه وعلیه غومہ، معناه: للراهن زوائد المرهون و منافعه، وعلیه نقصانہ وھلاکہ“ (دیکھئے: المنہجی و شرح نیل الأوطار ۱۰۳/۵، لہذا اس میں سے مرہن

کے لئے کچھ بھی حلال نہیں، اور اس کے حق میں حلت پر کوئی دلیل صحیح بھی موجود نہیں۔

جہاں تک راہن کی طرف سے اجازت کی بات ہے تو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ کمال اختیار کے ساتھ اس کی طرف سے اجازت نہیں ہوتی ہے، بلکہ سخت حاجت دین کے حصول کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

نیز صورتِ مسئلہ میں مرتہن کا مال مرہون سے فائدہ اٹھانا اپنے قرض سے فائدہ اٹھانا ہے، اور حدیث شریف میں اس کو سود سے تعبیر کیا گیا ہے: ”کل قرض جو منفعة فہو ربا“ (مصنف ابن ابی شیبہ حدیث نمبر: ۲۰۶۹۰، السنن الکبریٰ للبیہقی، بیوع، حدیث نمبر: ۱۱۲۵۲)۔

تیسرے قول کی دلیل اور اس کا جائزہ:

تیسرے قول کے قائلین مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ نے قرض دین کی صورت میں مرتہن کے لئے مال مرہون سے انتفاع کے عدم جواز پر سابق حدیث سے استدلال کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب قرض دین ہو، اس میں رہن رکھا گیا ہو، تو مرتہن کا مال مرہون سے فائدہ اٹھانا ایک ایسا اضافہ ہے جو عوض سے خالی ہے، لہذا فائدہ اٹھانا سود ہوگا، اور سود حرام ہے۔

دوسرے اور تیسرے قول کے قائلین کا استدلال حدیث پاک: ”کل قرض جو منفعة فہو ربا“ سے محل نظر ہے، کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی متروکین میں سے ہے، صنعانی کا بیان ہے: اس کی سند ساقط ہے (الجامع الصغیر للسیوطی ۱۲۹/۳، نمبر: ۶۳۳۶، فیض القدر للہناوی ۲۸/۵، الإروا للہبانی ۲۳۵/۵)۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ حدیث الفاظ کے اعتبار سے ضعیف ہے، لیکن اس کے معانی مختلف مرفوع اور موقوف روایات سے ثابت ہیں اس پر صحابہ اور سلف صالح کا عمل رہا ہے۔

صاحب ”معنی المحتاج“ (۸۷/۳) کا بیان ہے: ”وہو وإن كان ضعيفا فقد روى البيهقي معناه عن جميع ان الصحابة“ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”إذا أقرض أحدكم قرضا فأهدى له أو حملة على الدابة، فلا يركبها ولا يقبله، إلا أن يكون جرى بينه وبينه قبل ذلك“ (ابن ماجہ، صدقات، باب القرض ۲۴۳۲)، حضرت عبد اللہ بن سلام نے بردہ سے فرمایا: ”إنك في أرض - العراق - الربا فيها فاش، إذا كان لك على رجل حق، فأهدى إليك حمل تبن أو حمل شعير أو حمل قت، فإنه ربا“ (بخاری، مناقب الانصار، باب مناقب عبد اللہ بن سلام ۳۸۱۴)، علامہ ابن قدامہ نے حضرت ابی بن کعب سے روایت کی، حضرت ابن عباسؓ، اور حضرت ابن مسعودؓ سے آثار نقل کئے ہیں (المغنی ۲۱۱/۴)، نیز مصنف عبد الرزاق (۸/۱۴۳-۱۴۴) میں بھی حضرت ابن عباسؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ کے آثار نقل کئے گئے ہیں، ڈاکٹر وہب زحیلی نے لکھا ہے: ”..... نہیہم مستمد امن السنة النبوية وهو أن النبي ﷺ نهى عن سلف وبيع، والسلف هو القرض في لغة الحجاز“ (الفقه

الإسلامی وادلتہ ۵/۴۶ طبع دارالفکر۔

اس اعتبار سے اس پر اجماع ہو گیا، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا کہ اس مسئلہ پر اجماع سے استدلال زیادہ قوی ہے (موسوعہ فقہیہ المنظمۃ للمعاملات المالیۃ الاسلامیۃ از عطیہ عدلان ص ۳۰۲)۔

مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ نے اپنے قول: جب رہن کے علاوہ بیع کے ثمن وغیرہ دین کے بدلہ ہو تو اس سے انتفاع مرتہن کے لئے جائز ہے، پر حدیث بالا ”کل قرض جرم منفعۃ فهو ربا“ کے مفہوم سے استدلال کیا ہے کہ غیر قرض جب منفعت کے حصول کا ذریعہ بنے تو یہ سود میں داخل نہیں ہے۔

اس استدلال پر نقد کیا گیا کہ حدیث کا مفہوم یہ نہیں ہے، کیونکہ یہاں قرض کا ذکر اعلیٰ کے قبیل سے ہے، یعنی عہد رسالت میں عام طور پر قرض ہی کے مقابلہ میں رہن رکھنے اور لینے کا رواج تھا، اور اسی کے ذریعہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے خصوصیت سے اس کا ذکر کر کے منع فرمایا ہے، لہذا اس کے علاوہ سے حکم کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”یا ایہا الذین آمنوا لا تأکلوا الربا أضعافاً مضاعفة“ (آل عمران: ۱۳۰) ہے۔

مالکیہ اور شافعیہ نے انتفاع کے جواز کو دو شرطوں (صلب عقد میں انتفاع کی شرط اور منفعت کی مدت کی وضاحت کے ذریعہ معلوم ہو) کے ساتھ مقید کرنے پر استدلال کیا ہے کہ صلب عقد میں مشروط ہونے سے بیع اور اجارہ دونوں ہو جاتے ہیں، اور یہ جائز ہے، اور منفعت کی مدت متعین و معلوم ہونے کی وجہ سے معاملہ اس جہالت سے خارج ہو جاتا ہے جو کہ اجارہ کے لئے مفسد ہے۔

اس استدلال کی تردید کی گئی، اور وہ اس طرح کہ ان کا انتفاع کے جواز کو دو شرطوں کے ساتھ مقید کرنا اجارہ کو فاسد ہونے سے روک نہیں پاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں اجرت مجہول رہتی ہے، اسی طرح بیع جہالت ثمن کی وجہ سے فاسد ہے، اس لئے کہ دین اجرت اور ثمن دونوں کے درمیان شائع و مشترک ہے، دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اجارہ کا معاملہ خوش دلی سے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ مجبوری کے تحت ہو رہا ہے، اور جو معاملہ خوشدلی اور رضا مندی سے نہ ہو وہ فاسد ہو جاتا ہے، جیسا کہ تفصیل پیچھے آچکی ہے۔

راہن کی اجازت کے بغیر مال مرہون سے انتفاع کا حکم:

مال مرہون جب مرکوب (سواری)، یا مخلوب (دودھ دینے والا جانور) یا قابل استخداً ہو، تو آیا راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن کے لئے مال مرہون سے استفادہ جائز ہوگا، اس سلسلہ میں فقہاء کے چار اقوال ہیں، پہلا قول مطلق عدم جواز کا ہے، یہ جمہور فقہاء بشمول حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ کا مذہب ہے، امام احمد بن حنبل سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے۔

اسی قول کی دلیل اور دوقدح کے ذکر نے پراکتفا کرتا ہوں، بقیہ اقوال کو ترک کیا جاتا ہے، کیونکہ اس مسئلہ کا راست سوالنامہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس قول پر حدیث اور قیاس دونوں طرح کی دلیلوں سے استدلال کیا گیا ہے:

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لا یغلق الرهن ممن رهنه، له غنمه وعلیہ غرمه" (مستدرک حاکم، بیوع ۵۱/۲، دارقطنی ص ۳۰۳) رسول اللہ ﷺ نے غنم اور غرم راہن کے حق میں قرار دیا، منافع رہن کے غنم میں سے ہے، پس مرہن کے لئے اس میں کچھ بھی انتفاع کا حق راہن (مالک) کی اجازت کے بغیر نہیں ہوگا، حدیث عام ہے، مرکوب اور محبوب وغیرہ اور دوسری چیزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

گو یہ حدیث سند کے اعتبار سے مضطرب ہے، متصل، مرسل، موقوف اور مرفوع ہر طرح مروی ہے، لیکن یہ اضطراب مضراس لئے نہیں ہے کہ رواۃ ثقافت ہیں، اور ثقہ راوی کی زیادتی ارسال کے بجائے اتصال اور موقوف کے بجائے مرفوع مقبول ہے، اور حدیث سے صحت استدلال کے لئے مانع نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن اصم انطاکی ہیں جس کے بارے میں ابن عدی نے کہا ہے: "له أحادیث منکرة" اور منکر احادیث میں اس حدیث کو بھی شمار کیا ہے، لیکن معلوم ہونا چاہئے اس حدیث کی صرف ایک ہی سند نہیں ہے، بلکہ دوسری کئی معتبر سند ہیں جن میں عبد اللہ بن اصم انطاکی راوی نہیں آیا ہے۔

متن حدیث: "له غنمه وعلیہ غرمه" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مشہور تابعی سعید بن مسیب کا ادراج ہے، کلام رسول نہیں ہے، جیسا کہ امام ابو داؤد نے اپنی کتاب مراسیل میں ذکر کیا ہے، لیکن سعید بن مسیب کی جگہ پر معمر نے ابن شہاب زہری کے واسطے سے مرفوعاً نقل کیا ہے، اور معمر ابن شہاب زہری کے شاگردوں میں اثبت الناس (یعنی سب سے زیادہ قابل اطمینان ہے) (دیکھئے: نصب الراية للربیع ص ۳۲۰، ۳۲۱)۔

قیاس: مال مرہون راہن کی ملکیت ہے، مرہن کو صرف اپنے دین وصول کرنے کے لئے مال مرہون کو جس کا حق ہے، اور جبکہ راہن نے مرہن کو مال مرہون سے انتفاع کی اجازت نہیں دی اور نہ ہی اس پر خرچ کرنے کے لئے کہا ہے، لہذا مرہن کو مال مرہون سے استفادہ کا حق نہیں ہوگا، جس طرح راہن کے دوسرے مال سے انتفاع کا حق اسے اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ راہن اس کو اجازت نہ دے۔

جہاں تک یہ حدیث: "الظہر یرکب ویشرب النفقۃ إذا کان مرہونا، ولبن الدر یشرب بنفقته إذا کان مرہونا، وعلی الذی یرکب ویشرب النفقۃ" (رواہ البخاری وابدوؤد و الترمذی، نیل الأوطار للشوکانی ۱۰۲/۵) تو سود کی حرمت سے پہلے کی ہے، پھر آپ ﷺ کا ارشاد "کل قرض جو منفعة فہو ربا" سے منسوخ ہوگئی (المبسوط للسرخسی ۱۰۸/۲۱)۔

نیز اصول ترجیح میں سے ایک یہ ہے کہ اگر دو حدیثوں کے درمیان تعارض ہو، ان دونوں میں سے جس حدیث کے مطابق اصل عام ہو تو اس کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، یہاں پہلی حدیث کے موافق اصل عام ہے، یعنی دوسرے کا مال اس کی اجازت و رضامندی کے بغیر لینا، فائدہ اٹھانا اور کھانا ناجائز و ناحق کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ“ (بقرہ: ۱۸۸)۔

اگر مرتہن مال مرہون پر راہن کی اجازت کے بغیر خرچ کرتا ہے، یہ اس کی طرف سے تطوع سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ اس پر خرچ کرنے کا مکلف نہیں ہے، اگر بالفرض مال مرہون ہلاک ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار راہن ہوگا، نہ کہ مرتہن جیسا کہ اوپر حدیث گذر چکی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عدم جواز کا قول راجح معلوم ہوتا ہے، یعنی مرتہن کے لئے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہوگا، خواہ انتفاع کی شرط صلب عقد میں ہو یا نہ ہو، خواہ رہن دین قرض یا دین غیر قرض جیسے بیع کا ثمن اور گھر کا کرایہ وغیرہ کے عوض رکھا گیا ہو، خواہ راہن مال مرہون سے انتفاع کی اجازت دے یا اجازت نہ دے، کیونکہ حدیث پاک: ”کل قرض جو منفعة فهو ربا“ قرض اور غیر قرض، اسی طرح اجازت اور بلا اجازت، مال مرہون مرکوب، مخلوب، یا قابل استخدا ام کے قبیل سے ہو یا کوئی دوسری شئی سب کو عام ہے، جیسا کہ پیچھے سے بات آچکی ہے۔

نیز یہ واضح رہے کہ شرط انتفاع فاسد شرط ہے، اس کی رعایت ویسے بھی نہیں کی جائے گی، کیونکہ یہ شرط حدیث بالا اور تقاضائے رہن کے خلاف ہے، ”ان اشترط في الرهن أن ينتفع به فالشرط فاسد؛ لأنه ينافي مقتضى الرهن“ (المغنی ۴/۳۴۵)، البتہ اگر عقد رہن میں مال مرہون سے انتفاع کی شرط لگائی گئی تو شرط فاسد ہو جائے گی اور عقد رہن فاسد نہیں ہوگا، اس لئے کہ عقد رہن ان عقود میں سے ہے جو فاسد شرطوں سے فاسد نہیں ہوتے ہیں۔

”هو مما لا يبطل بالشروط الفاسدة كالقرض والهبة والصدقة وغيرها“ (شرح الحجلیہ: م: ۸۳،

ص ۵۵-۵۶، الوفاء بما يتعلق ببيع الوفاء مع مجلیہ مجمع الفقہ الاسلامی شمارہ ۷، جز ۲۰۱/۳)۔

خریدار کا مروجہ کرایہ سے کم ادا کرنے کی صورت میں شرعی حکم:

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت کم ہو

تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

خریدار کا اس طریقہ پر خریدنا دراصل عقد رہن ہے، اس لئے یہ صورت جائز نہیں ہوگی۔

”الإقدام على الإجارة بعد البيع دل على أنهما قصدا بالبيع الرهن لا البيع، فلا يحل للمشتري

الانتفاع به“ (رد المحتار ۷/۵۴، بزازیہ بہائش الہندیہ ۴/۴۱۹)۔

کیونکہ مروجہ کرایہ سے جتنا کم ہوگا وہ سود یا مشابہ سود ہوگا، بائع (مالک) مروجہ کرایہ سے کم لینے پر تیار دین کی مجبوری کی وجہ سے ہوا ہے، نہ کہ بطیب خاطر، اور حدیث شریف میں اس طرح کے دین سے فائدہ اٹھانے کو سود کہا گیا ہے، ”کل قرض جو منفعة فهو ربا“ (تخریج گزرچکی)۔

خریدار کا بیع سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا:

ج- اس عرصہ میں خریدار اس شئی سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا

نہیں؟

اس عرصہ میں خریدار اس شئی سے کس طرح کا فائدہ جیسے کاشت کاری یا اجارہ داری وغیرہ کا حاصل کرنا چاہے تو شرعا نہیں کر سکتا ہے، خواہ کرایہ پر مالک کو دے یا کسی اور کو دے، بہر حال یہ مال مرہون سے فائدہ اٹھانا ہوگا جو کہ حرام ہے، کیونکہ اس میں سود قرض پایا جا رہا ہے، اور حدیث میں آیا ہے: ”کل قرض جو منفعة فهو ربا“، نیز مال مرہون سے فائدہ اٹھانا تقاضائے قرض کے منافی عمل ہے، کیونکہ قرض دراصل کسی مال کا مالک بنانا اس شرط پر کہ وہ صرف اسی کے مثل و برابر واپس کرے گا، اور اس عمل کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید کرنا ہے۔

علامہ ابن رشد نے لکھا ہے: جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرہون کے لئے مال مرہون سے فائدہ

اٹھانا بالکل جائز نہیں ہے (رد المحتار ۷/۵۴۹)۔

”فتاویٰ بزازیہ“ میں لکھا ہے کہ بیع و فاء رہن کے حکم میں ہے، اس میں خریدار کے لئے تصرف کا حق نہیں ہے، جیسا

کہ مرہون کے لئے مال مرہون میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے (بزازیہ بہامش الہندیہ ۴/۴۲۰)۔

اگر بالفرض خریدار نے مثلاً مکان کو کرایہ پر دے دیا، تو اس کی دو صورتیں ہوں گی، بائع کی اجازت سے یا

بلا اجازت، اگر اجازت سے دیا ہے تو عقد رہن باطل ہو جائے گا اور کرایہ کا مالک بائع ہوگا نہ خریدار، اور اگر بلا اجازت دیا تو

ایک قول کے مطابق کرایہ کا صدقہ کر دینا واجب ہوگا، دوسرے قول کے مطابق بائع راہن کے حوالہ کر دے گا، یہی اولیٰ و بہتر

ہے، جیسا کہ علماء نے صراحت کی ہے (رد المحتار ۷/۵۴۹)۔

زیر بحث مسئلہ میں جمہور علماء بشمول امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ کی رائے اور ایک قول امام احمد بن حنبل کے

مطابق جب تک بیچنے والا اس شئی (بیع) کو واپس نہ لے، اس درمیان خریدار اس سے کاشت کاری یا اجارہ داری وغیرہ کسی

طرح کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا (المغنی ۴/۳۴۵، نیز دیکھئے: بدایۃ المجتہد ۲/۲۷۳)، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لا

یغلق المرهن ممن رهنه، له غنمه وعلیہ غرمه“ (حدیث کی تخریج گزرچکی) اور چونکہ خریدار حقیقت میں اس مال

مرہون کا مالک نہیں ہے تو مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ کیسے اٹھا سکتا ہے (المغنی ۴/۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷) بلکہ اجازت

کے بعد بھی اس سے فائدہ اٹھانا اس کے لئے حلال نہیں، جیسا کہ تفصیل سے بات پیچھے آچکی ہے۔
کیا خریدار اس کو بیچ کر قیمت لے سکتا ہے؟

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

پیچھے بیان آچکا ہے کہ جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مرتہن مال مرہون سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتا ہے، اس کے لئے شرعاً فائدہ اٹھانا جائز نہیں، اور بیچنا بھی ایک انتفاع ہے، اس لئے خریدار کے لئے اس کو بیچنے کا حق نہیں ہوگا، فقہاء نے مذکورہ بالا حدیث ”لا یغلق الرهن النخ“ کی روشنی میں صراحت کی ہے کہ بیع و فاء میں خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا ہے، ”وله حکم الرهن في حق أنه لا يتمن من التصرف كالمرتهن ولا يملك ببعه من غیره“ (بزازیہ بہاش الہندیہ ۲۰۱۲)۔

بیع و فاء چونکہ حقیقت میں عقد رہن ہے، اس اعتبار سے اس کے اور عقد رہن کے احکام یکساں ہوں گے، اس لئے اس کا مال مرہون (جو کہ بیع و فاء کے اعتبار سے بیع ہے) کے روکنے کا حق ہے، تاکہ اس کا دین آسانی سے وصول ہو جائے، عام حالات میں بیچنے کا حق نہیں ہے، ہاں اگر دین کی ادائیگی کا وقت آ گیا، یا بیع و فاء میں بیع واپس لینے کی مقررہ تاریخ آ گئی، اور بائع (راہن) کے لئے ثمن ادا کر کے بیع کو واپس لینا دشوار ہو جائے ایسی صورت میں خریدار اس کو بیچ کر کے اپنے ثمن (جو کہ دین ہے) کے بقدر قیمت رکھ لے گا اور بقیہ زائد قیمت بائع کو واپس کر دے گا، کیونکہ یہ زائد قیمت اس کے لئے حلال نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقہ پر مت کھاؤ، اگر خریدار زائد قیمت بائع کو واپس نہیں کرتا ہے، بلکہ کھالیتا ہے تو وہ ضامن ہوگا، کیونکہ وہ ایسی صورت میں غاصب قرار پائے گا، اور غاصب مال منسوب کا ضامن ہوتا ہے مالک نہیں ہوتا ہے۔

اگر بیع و فاء کے معاہدہ میں ثمن کی واپسی کی تاریخ متعین نہ ہو یا مقرر ہو تو اس سے پہلے خریدار کے لئے اس شئی (بیع) کا بیچنا صحیح نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ اس عمل کے خلاف معاہدہ ہوگا، جس سے بائع کو نقصان پہنچے گا، فقہاء نے معاہدے کی پابندی والی آیتوں اور حدیثوں کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر معاہدہ تعلق کی صورت میں ہو، اور اس کی خلاف ورزی کی وجہ سے فریق مخالف نقصان و خسارہ میں مبتلا ہو جائے تو اس معاہدہ کا پورا کرنا قضاء لازم ہوتا ہے (القاعدہ:

المواعید بصورت التعلیق تكون لازمة، موسوعہ فقہیہ القواعد والضوابط الفقہیہ للندوی (۵۸۸)۔

زر ضمانت کے نام پر کثیر رقم لینا اور اسی تناسب سے کرایہ کم طے کیا جانا:

۳- زر ضمانت کے نام پر لی جانے والی اڈوائس کثیر رقم قریب قریب اس شئی کی قیمت کے ہوتی ہے، اس کی وجہ سے اس شئی کے مروجہ کرایہ سے کم کرایہ لیا جاتا ہے، یہ آج کل پوری دنیا کا عرف عام ہے، جس کو دوسرے الفاظ میں پگڑی کہا جاتا

ہے، اور پگڑی ایک حق ہے، جس کو عرف کی وجہ سے مال تصور کر لیا گیا ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے کرایہ دار کے لئے دوسرے شخص سے پگڑی کی رقم زیادہ بھی وصول کرنے کا حق دیا ہے، لہذا زیر بحث مسئلہ میں زرضمانت کے نام لی جانے والی خطیر رقم کو پگڑی کا حکم دے دیا جائے تو بہتر ہوگا، ایسی صورت میں اس کی حیثیت قرض یا امانت ورہن کی نہیں ہوگی، بلکہ پگڑی جو کہ ایک حق مالی ہے، کے ثمن کی حیثیت ہوگی، اور کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی اور اسے قرض پر فائدہ اٹھانا متصور نہیں ہوگا۔

آج کل کرایہ کے علاوہ زرضمانت کے نام پر لی گئی رقم مالک دکان یا مکان کے پاس رکھی نہیں رہتی ہے، بلکہ مالک اس کو اپنے استعمال میں لے آتا ہے، گو یا اس وقت یہی لوگوں کا عرف ہے، لہذا اگر زرضمانت کی رقم قرض مانا جاتا ہے تو مالک کے لئے اس میں تصرف حلال ہوگا۔ البتہ اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی کیا جانا قرض پر فائدہ اٹھانا متصور ہوگا، اس وجہ سے یہ فائدہ حلال نہیں ہوگا، کیونکہ حدیث گذر چکی ہے ”کل قرض جو منفعۃ فہو ربا“، لہذا یہ فائدہ انجام کے اعتبار سے سود کے حکم میں داخل ہو جائے گا۔

اور اگر زرضمانت کے نام پر لی گئی پیشگی رقم کو امانت مان لیا جائے تو مالک مکان یا دکان کے لئے اس امانت کی رقم سے استفادہ حلال نہیں ہوگا، کیونکہ یہ خیانت شمار ہوگی، اور خیانت حرام ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو پسند نہیں کرتا ہے (سورۃ انفال ۵۸، نساء: ۱۰۷)، اور حدیث شریف: ”وإذا أنتمن خان“ (بخاری، ایمان، حدیث نمبر: ۳۳، مزید دیکھئے: ۲۶۸۲، ۲۷۴۹، ۲۷۹۵) میں منافقت کی علامت بتائی گئی ہے، پس اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی امانت پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا، اور امانت پر فائدہ اٹھانا درست نہیں، کیونکہ مشابہ بہ سود ہو جائے گا، اس لئے کہ سود بلا عوض استفادہ کا نام ہے۔

بیع و فاء - شرعی نقطہ نظر

مولانا راشد حسین ندوی ☆

بیع و فاء میں بیع سے استفادہ:

جن حضرات نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے، یا مجموعہ عقود قرار دیا ہے انہوں نے اس کی اجازت دی ہے کہ خریدار بیع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ”ومشائخ سمرقند جعلوه بیعا جائزا مفیدا لبعض الاحکام“ اور اس کی شرح کرتے ہوئے صاحب عنایہ فرماتے ہیں:

”وهو الانتفاع به دون البيع والهبة على ما هو المعتاد بين الناس للحاجة اليه“ (ہدایہ و عنایہ مع تکرار فتح القدر ۱۶۹/۸، ۱۷۰) (صاحب ہدایہ کا قول کہ بیع و فاء بیع کے بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے سے مراد بیع اور ہبہ کے علاوہ اس سے نفع حاصل کرنا ہے، جیسا کہ حاجت کے سبب لوگوں کا عرف ہے)۔

مجموعہ عقود قرار دینے والے فرماتے ہیں:

”صحيح في بعض الأحكام كحل النزال و منافع المبيع“ (شامی ۲۷۴/۳) (بعض احکام میں بیع صحیح ہے، جیسے پیداوار اور منافع بیع کی حلت)۔

معلوم ہوا کہ بیع قرار دینے پر اس سے نفع اندوز ہونا جائز ہے، اس لئے کہ بیع ماننے والے اسے اقلہ یا خیار شرط سے ملحق قرار دیتے ہیں، اور دونوں میں سے کچھ بھی قرار دیں فائدہ اٹھانا دونوں میں جائز ہوتا ہے، ہاں اگر خیار بائع کو ہو تو اس کی اجازت درکار ہوتی ہے جو کہ یہاں حاصل ہے۔

د- بیع دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا حکم:

اس عقد کو خواہ رہن قرار دیا جائے یا بیع یا مجموعہ عقود دوسرے کے ہاتھ اس کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ رہن قرار دینے کی صورت میں بائع کی اجازت سے فروخت کرنے کی اجازت ہوگی، اس صورت میں فروخت کردہ سامان رہنیت سے نکل جائے گا، بلا اجازت بیع کرنے پر بائع کو اختیار ہوگا، نیز بلا اجازت بیع کرنے پر بائع کو اختیار ہوگا کہ بیع

ثانی کو فتح قرار دے کر سامان واپس لے لے۔

”ومشائخ سمر قند جعلوه بیعا جائزا مفیدا لبعض الأحكام دون البیع والہبۃ“ (شرح العنایہ مع التکملہ ۱۷۰/۸) (مشائخ سمر قند نے اس کو بیع جائز قرار دیا ہے جو بیع اور ہبہ کے بجائے بعض جائز احکام کا فائدہ دیتی ہے)۔

”ولو باعہ المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد، علی القول بأنه رهن، وكذا علی القولین القائلین: بأنه بیع یفید الانتفاع به، فإنه لا یملک بیعہ“ (شامی ۲۷۵/۴) (اگر مشتری اس کو بیع دے تو بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا حق ہوگا، یعنی یہ مان کر کہ وہ رہن ہے، اسی طرح ان دونوں قولوں پر جو اسکے قائل ہیں کہ وہ بیع ہے جو انتفاع کا فائدہ دیتی ہے، اس لئے کہ وہ اس کی فروخت کا حق نہیں رکھتا ہے)۔

مزید قیمت لینے سے مراد اگر مشتری ثانی سے مزید قیمت لیتا ہے تو جب یہ بیع ہی باطل ہے تو جواب بالکل واضح ہے کہ یہ قیمت واپس کر کے سامان واپس لیا جائے گا، اور اگر رہن مان کر بائع کی اجازت سے بیع کی گئی ہے تو ظاہر ہے زیادہ قیمت پر سامان فروخت کیا جاسکتا ہے، اور اس کا مالک بائع اول ہوگا، بائع ثانی صرف اپنی رقم اس سے منہا کر سکتا ہے۔

اور اگر زیادہ قیمت لینے سے مراد یہ ہے کہ بیع و فاء کرنے کے بعد بائع کے پاس سامان واپس کرتے وقت زیادہ قیمت لی جائے تو اوپر گزر چکا ہے کہ یہ کھلا ہوا سود ہے، لہذا اس کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جاسکتی۔

۲- الف: رہن ماننے کی صورت میں اس سے انتفاع کا حکم:

جن حضرات نے بیع و فاء کو رہن قرار دیا ہے، انہوں نے مالک کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع کو ناجائز قرار دیا ہے، عبارت اوپر گزر چکی ہیں۔

”ولا یطلق له الانتفاع، إلا بإذن مالکہ..... لا فرق عندنا بینہ و بین الرهن“ (شرح العنایہ مع التکملہ ۱۷۰/۸) (مالک کی اجازت کے بغیر اس کو انتفاع کی اجازت نہیں ہوگی..... ہمارے نزدیک اس میں اور رہن میں کوئی فرق نہیں ہے)۔

”هو رهن فی الحقیقۃ لا یملکہ ولا ینتفع به إلا بإذن مالکہ“ (شامی ۲۷۴/۴) (وہ درحقیقت رہن ہے، نہ وہ اس کا مالک ہوگا نہ مالک کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع کرے گا)۔

ان عبارات میں مالک کی اجازت سے انتفاع کی تصریح ہے۔

لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اس کو پوری طرح رہن ماننے کے بعد انتفاع کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے، رہن سے مرہن کے انتفاع پر تو روک لگائی گئی ہے، اور رہن اجازت دے دے تب بھی اس کی ممانعت یہ کہہ کر نقل کی گئی ہے کہ یہ سود ہے، اور سود اجازت کے باوجود حرام ہوتا ہے (بدائع الصنائع ۲۱۲/۵)۔

اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

”وقیل: لا یحل للمرتہن، لأنہ ربا (قولہ وقیل: لا یحل للمرتہن) قال فی المنع..... لأنہ أذن له فی الربا، لأنہ یستوفی دینہ كاملا فتبقى له المنفعة فضلا، فیکون ربا، وهذا أمر عظیم“ (شامی ۳۴۳/۵ طبع مکتبہ فیض القرآن) (ایک قول یہ ہے کہ مرتہن کے لئے ناجائز ہے، اس لئے کہ وہ سود ہے (قولہ مقیل) مخ میں فرماتے ہیں:..... اس لئے کہ اس نے سود میں اجازت دی ہے، اس لئے کہ وہ اپنا پورا دین وصول کرے گا تو منفعت فضل میں شمار ہوگا اور سود ہوگا اور یہ سنگین معاملہ ہے)۔

اس اشکال کے دو جوابات دیئے جاسکتے ہیں:

۱- جن حضرات نے اسے رہن قرار دیا ہے، ان کے ذہن میں بھی کسی نہ کسی جگہ یہ بات موجود ہے کہ اس میں عقود تلاش کا شبہ پایا جا رہا ہے، صاحب بحر کی رائے بھی یہی ہے کہ اس سے متعلق فتویٰ دیتے وقت تینوں شبہوں پر نظر رکھنا ضروری ہے، اسی لئے جن حضرات نے رہن قرار دیا انہوں نے مالک کی اجازت سے انتفاع کو جائز قرار دیا۔

۲- خود رہن میں بھی اکثر حضرات نے مالک کی اجازت سے انتفاع کی اجازت دی ہے، چنانچہ علامہ شامی مندرجہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”وقلت: وهذا مخالف لعامة المعتمرات من أنه یحل بالاذن إلا أنه یحمل علی الدیانة، وما فی المعتمرات علی الحکم، ثم رأیت فی جواهر الفتاوی: إذا کان مشروطا صار قرضا فیہ منفعة وهو ربا والافلا بأس ۵“ (ایضا) (میں کہتا ہوں: یہ قول عام معتبر کتابوں کے مخالف ہے جن میں ہے کہ اجازت سے جائز ہے، الا یہ کہ اس روایت کو دیانت پر محمول کیا جائے اور معتبرات کی روایت کو حکم پر، پھر میں نے جواہر الفتاویٰ میں دیکھا: جب انتفاع مشروط ہو تو وہ ایسا قرض ہو جائے گا جس میں منفعت ہے اور سود یہی ہے، ورنہ کوئی حرج نہیں ہوگا)۔

لیکن اس دوسری توجیہ پر ایک قوی اشکال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ اس سے انتفاع معروف ہے، انتفاع کی لالچ نہ ہو تو شاید بیع و فاء کرنے والا قرض دینے پر راضی ہی نہ ہو، لہذا ”المعروف عرفا كالمشروط شرطا“ کے تحت اس کو ممنوع ہونا چاہئے، چنانچہ علامہ شامی فتاویٰ خیر یہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

”والغالب من أحوال الناس أنہم یریدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما اعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما یعین المنع“ (شامی ۳۴۳/۵) (لوگوں کا زیادہ تر حال یہ ہے کہ ان کا مقصد قرض دے کر نفع اٹھانا ہوتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو وہ دراہم نہ دیتا اور یہ شرط کے مرتبہ میں ہے، اس لئے کہ معروف مشروط کی طرح ہوتا ہے اور یہ چیز ممانعت کو طے کر دیتی ہے)۔

موجودہ دور کے اکابر اصحاب فتاویٰ نے بھی رہن سے استفادہ کو ناجائز قرار دیا ہے، ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی (فتاویٰ رشیدیہ ۴۴۸ تا ۴۵۰)، مفتی کفایت اللہ (کفایت المفتی ۸/۱۳ تا ۱۵۴) اور مولانا اشرف علی تھانوی (امداد الفتاویٰ ۳/۴۵۴، نیز دیکھئے: فتاویٰ محمودیہ ۱۱/۲۸۴) جیسے اساطین امت بھی شامل ہیں۔

پوری بحث سے راقم کے نزدیک یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اگر عقد ہی میں انتفاع کی شرط لگا دی گئی تب تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ہوگی، لیکن اگر اس وقت انتفاع کی شرط نہیں گائی، مرتہن کو اس کی امید بھی نہیں تھی کہ اس کی اجازت ملے گی، بعد میں مالک نے انتفاع کی اجازت دے دی تو انتفاع جائز ہوگا، علامہ شامی اور عصر حاضر کے اصحاب فتاویٰ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، لہذا یہی بات راجح ہے۔

ب- بیع کو کرایہ پر لینا:

رہن کو اگر مرتہن کرایہ پر لے لے تو سامان رہنیت سے نکل جاتا ہے، چونکہ بیع و فاء کو رہن قرار دینے والے حضرات اس کو پوری طرح رہن کے حکم میں قرار دیتے ہیں، لہذا اس کا بھی یہی حکم ہوگا، سامان یا مکان رہن سے نکل کر اجارہ میں داخل ہو جائے گا، علامہ شامی فرماتے ہیں:

”قوله بخلاف الاجارة) وفي البزازیة: وان استاجرها المرتهن فاسدا، ووصل إليها ومضى زمان مقدار ما يجب فيه شيء من الأجرة بطل الرهن اه وفيها: وان أخذ المرتهن الأرض مزارعة بطل الرهن لو البذر منه، ولو من الراهن فلا اه لما قدمناه في كتاب المزارعة أن الأصل أن رب البذر هو المستاجر، فإن كان هو العامل كان مستاجر الأرض، وان كان هو رب الأرض كان مستاجر للعامل“ (شامی کتاب الرهن ۵/۳۶۴، فتاویٰ بزازیہ علی ہاشم البندیہ ۶/۷۴)۔

(قوله بخلاف الاجاره) بزازیہ میں ہے: اگر مرتہن اس کو فاسد طور پر کرایہ پر لے لے، اور اس تک پہنچ جائے اور اتنا عرصہ گزر جائے جس میں کچھ کرایہ واجب ہو جاتا ہے تو رہن باطل ہو جائے گا، اسی میں ہے: اگر مرتہن زمین بٹائی پر لے لے تو اگر بیع مرتہن ہی کی طرف سے ہوں تو رہن باطل ہو جائے گا، ورنہ نہیں، اس لئے کہ ہم کتاب المزارعہ میں بیان کر چکے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ صاحب بذر ہی مستاجر ہوتا ہے اگر وہ عامل ہو تو زمین کرایہ پر لینے والا ہوگا، اگر وہ زمین کا مالک ہو تو عامل کو مزدور رکھنے والا ہوگا) بزازیہ میں اس سے پہلے یہ بات کہی گئی کہ اجارہ صحیح ہو تو رہن فوراً باطل ہو جائے گا۔

اس عبارت میں صرف یہ بات کہی گئی ہے کہ رہن باطل ہو جائے گا، اور اجارہ ہو جائے گا، اجرت کم یا زیادہ ہونے کی بحث نہیں چھیڑی گئی ہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں سود کا شبہ موجود ہے جس سے بچنے کی حدیث میں تاکید کی گئی ہے، اس طرح کہ اس نے قرض دے کر اس کے دباؤ کے تحت کم کرایہ پر مکان حاصل کر لیا ہے، جو ”کحل

قرض جو نفعاً فہو ربا“ (شامی کتاب البیوع باب المرابحہ مطلب کل قرض جو نفعاً فہو حرام، یہ اصول اس حدیث سے ماخوذ ہے: ”عن انس بن مالک قال: قال رسول اللہ ﷺ: إذا أقرض أحدكم قرضاً فأهدى له أو حمله على الدابة، فلا يركبها ولا يقبله الحدیث“ (ابن ماجہ، صدقات باب القرض ۲۴۳۲)) کے عموم میں داخل ہے، اسی طرح حضور ﷺ نے ایک معاملہ میں دو معاملہ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے، اور اس میں دو معاملہ جمع ہو گئے ہیں ایک قرض دوسرے اجارہ، اس لئے یہ شکل کراہت سے خالی نہیں ہے:

”عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة“ (ابوداؤد رقم الحدیث ۳۳۶۱، والترمذی رقم ۱۲۳۱، النسائی رقم ۴۶۳۲)۔

”وقال: لا يحل سلف وبيع“ (ابوداؤد رقم ۲۵۰۴، ترمذی ۱۲۳۴، نسائی ۳۶۱۱، عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده) (حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے)، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: قرض اور بیع (ایک ساتھ) جائز نہیں ہے۔

ج- انتقال کا حکم:

رہن ماننے کی صورت میں بائع کی اجازت کے بغیر اس میں کاشت کرنا، کرایہ پر دینا، یا کسی اور طرح کا فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، دلائل (۲- الف) کے تحت گزر چکے ہیں (شامی ۴/ ۲۷۷)۔

(خیر یہ میں فرماتے ہیں: جب بیع و فاء کا خریدار بائع کی اجازت سے اس کو کرایہ پر دے دے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے راہن مرتہن کو اس کی اجازت دے دے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اجرت راہن کی ہوگی اور اگر اس کی اجازت کے بغیر ہو تو اجرت کو صدقہ میں دے دیے یا راہن مذکور کو لوٹا دے، اور یہ زیادہ بہتر ہے، ہمارے علماء نے اس کی تصریح کی ہے، میں کہتا ہوں، جب اس کی اجازت سے کرایہ پر دے تو راہن باطل ہو جائے گا جیسا کہ فصولین کے حاشیہ میں بیان کیا ہے)۔

د- بیع کی فروخت کا حکم:

مالک کی اجازت کے بغیر خریدار کو اس کے بیچنے کی اجازت نہیں ہوگی، اجازت کے بغیر بیچ دے تو بیع بائع کی اجازت پر موقوف ہوگی، صاحب ”ہدایہ“ فرماتے ہیں:

”وليس للمرتهن أن يبيعه إلا برضاء الراهن، لأنه ملكه و ما رضى ببيعه“ (ہدایہ ۴/ ۵۲۸ کتاب الرهن) (مرتہن کو راہن کی رضامندی کے بغیر رهن کو بیچنے کی اجازت نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ اس کی ملکیت ہے اور اس کی بیع سے راضی نہیں ہے)۔

یہ بات صاحب ”ہدایہ“ نے رهن کے متعلق کی ہے، جو لوگ بیع و فاء کو رهن قرار دیتے ہیں وہ تمام احکام میں اس کو

رہن کے احکام دیتے ہیں، لہذا بیع و فاء کی بیع پر بھی یہ حکم صادق آئے گا، علامہ شامی خود بیع و فاء کی بیع کے بارے میں صراحت فرماتے ہیں:

”ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر“ (شامی ۲/۴۷۲) (بعض احکام میں رہن ہے حتیٰ کہ مشتری کو دوسرے سے بیچنے کا اختیار نہیں ہے)۔

”ولو باعه المشتري، فللبائع أو ورثته حق الاسترداد“ (ایضاً ص ۲۷۵) (اگر مشتری اسے بیچ دے، تو بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا اختیار ہوگا)۔

حاشیہ ہدایہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مشتری بائع کی اجازت کے بغیر بیع کر ڈالے تو اس کی حیثیت بیع فضولی جیسی ہوگی، اور یہ بیع بائع کی اجازت پر موقوف ہوگی وہ اجازت دے دے تو بیع صحیح ہو جائے گی اور ثمن بطور رہن رکھ لی جائے گی، ”وان باع بغير اذنه توقف على اِجازة صاحبه، فإن اِجازة جاز، ويكون الثمن رهنا، وان لم يجزه لا يجوز البيع، وله أن يبطله ويفيده رهنا“ (ہدایہ حاشیہ ۵۲۸/۴ کتاب الرهن)۔

معلوم ہوا کہ مالک کی اجازت سے بیچ سکتا ہے، اور اس میں کم یا زیادہ ثمن کی کوئی تفصیل نہیں ہے، اجازت کے بعد وہ وکیل بالبیع ہے، اور وکیل بالبیع کم اور زیادہ قیمت پر بیچ سکتا ہے، صاحبین کے نزدیک ثمن کثیر سے نہیں بیچ سکتا:

”والوكيل بالبيع يجوز بيعه بالتعليل والكثير والعرض عند أبي حنيفة، وقال: يجوز بيعه بنقصان لا يتغابن الناس فيه“ (ہدایہ ۱۸۹/۳ کتاب الوکالۃ فی البیع)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے:

”وبه يفتى بزازية (قوله بزازيه) قال العلامة قاسم في تصحيحه على القدرى الخ“ (ہندیہ ۴۳۵/۵ کتاب الرهن الفصل الثالث فيما يجوز الارتهان به وما لا يجوز)۔

بہر حال مالک کی اجازت سے بیع جائز ہوگی، لیکن چونکہ یہ بیع بائع کی ملک کی ہے، لہذا ملنے والی ثمن کا مالک بائع ہوگا، ہاں خریدار اس کو بطور رہن روک سکتا ہے۔

۳۔ پگڑی کے انداز میں زر ضمانت:

سوال میں اس رقم کی فقہی حیثیت کے بارے میں سوال کرتے ہوئے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ زر ضمانت کی اس رقم میں قرض امانت اور رہن کا شبہ پایا جاتا ہے۔

رہن قرار دیں تو اوپر تفصیلات گذر چکی ہیں کہ اس سے انتفاع ناجائز ہوتا ہے، جبکہ اس رقم سے انتفاع کا عام عرف ہے، یک لخت اس کو رہن قرار دے کر انتفاع کو ناجائز کہنا بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا، اگرچہ فقہاء نے اجرت کے بدلہ میں

رہن کو جائز قرار دیا ہے، ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”ولو استاجر داراً، أو شینا وأعطی بالأجر رہنا جاز“ (اگر کرایہ پر گھریا کوئی چیز لی اور کرایہ کے بدلہ رہن دے دیا تو جائز ہے)۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو قرض قرار دیا جائے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اسی کے قائل ہیں، وہ لکھتے

ہیں:

”میرا خیال ہے کہ اس طرح زرضمانت کی رقم حاصل کرنے میں مضائقہ نہیں ہے، اور اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے“ (جدید فقہی مسائل ۱۳۰۴)۔

پھر بتایا کہ اس کو قرض قرار دینے پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں:

۱- اول یہ کہ قرض میں تاویل نہیں ہوتی ہے، اور ہمارے یہاں کے عرف و رواج کے مطابق زیر بحث مسئلہ میں فریقین اجل کے پابند ہوتے ہیں۔

۲- دوسرے یہ کہ مالک مکان کرایہ دار سے اس قرض کو مشروط کر دیتا ہے، پس یہ شرط فاسد ہے، اور شرط فاسد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے۔

پھر پہلے اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ حنفیہ کے یہاں قرض میں تاویل درست نہیں ہے، لیکن جمہور کے یہاں اس کی گنجائش ہے، پس ہمارے زمانہ کے تعامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں جمہور کی رائے کو قبول کر لیا جائے تو مضائقہ نظر نہیں آتا۔

دوسرے اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ اجارہ اسی شرط پر فاسد ہوتا ہے جس میں متعاقدین کا فائدہ ہو، مفضی الی النزاع ہو، وہ شرط راجح نہ ہوگی، اس کے لئے مختلف دلائل دینے کے بعد لکھتے ہیں:

”قرض کی یہ شرط مفضی الی النزاع نہیں ہے، یہ بات تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے، اور اب اس شرط نے رواج کا بھی درجہ حاصل کر لیا ہے، اس لئے اس شرط کو شرط فاسد کے درجہ میں رکھنا صحیح نہیں ہوگا (ایضاً ص ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲)۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو امانت قرار دیا جائے، فقہ اکیڈمی کی تجویز میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے، چنانچہ فقہ اکیڈمی کے فیصلہ میں ہے:

”مالک مکان زرضمانت وڈپازٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے، بہتر ہے کہ اس کو بیعینہ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کر دے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کر دے“ (فقہ اکیڈمی کے فیصلے بعنوان پگڑی کی شرعی حیثیت)۔

اس عبارت کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو امانت قرار دیا جا رہا ہے۔
لیکن اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس رقم کا لین دین ہمیشہ استعمال کے لئے ہوتا ہے، جبکہ امانت اور ودیعت کا حکم یہ ہے کہ اسے اپنے استعمال میں نہ لے۔
پھر ودیعت اور امانت کا حکم یہ ہے کہ مالک کے طلب کرنے پر بلا تاخیر واپس کر دی جائے اور یہاں غالباً ایسا نہیں ہے۔

”وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع، وصيرورة المال أمانة في يده ووجوب أدائه عند طلب مالكة كذا في الثمن“ (ہندیہ ۲۳۸/۴، کتاب الودیعة الباب الاول فی تفسیر الایداع) (رہا اس کا حکم تو وہ مودع پر حفاظت کا وجوب ہے اور مال کا اس کے پاس امانت کے طور پر ہو جاتا ہے، اور مالک کے مطالبہ پر اس کو ادا کر دینے کا وجوب ہے)۔

پہلے اشکال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ مالک کی اجازت سے تصرف کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔
”رجل أودع عند انسان الف درهم، ثم إن صاحب الودیعة أقرض الودیعة من الذي في يده، قال أبو حنيفة رحمه الله: لا يخرج الالف من الودیعة حتى يصير في يد المودع..... وكذلك لو قال المودع بصاحبها: انذن لي إن اشترى..... بالودیعة شينا وأبيع؛ لأنه موتمن كذا في فتاوى قاضی خان“ (ایضاً ص ۳۶۰ الباب العاشر فی المتفرقات)۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صاحب ودیعت کی اجازت سے بیع و شراہ کرنے پر اسے غاصب نہیں سمجھا جائے گا، اور نفع اس کے لئے جائز ہوگا۔

رہا دوسرا اشکال تو اس کی ضرورت عام طور سے نہیں پڑتی ہے، اس لئے کہ کرایہ دار مکان کا حاجت مند ہوتا ہے، اور وہ اپنی رقم لینا چاہے تو مالک مکان واپس کر کے مکان دوسرے کو دے دیتا ہے۔

لیکن اگر اسے محض امانت قرار دیا جائے تو ایک قومی اشکال یہ ہوگا کہ معاملہ اس پر مشروط کیوں ہے؟ لہذا امانت قرار دینے پر بھی اسے رہن جیسی ہی حیثیت دینی ہوگی، عام ودیعت یا امانت ہوتی تو معاملہ اس پر مشروط نہ ہوتا، اور رہن سے انتفاع کا عدم جواز اوپر گزر چکا ہے، لہذا سب سے آسان شکل یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسے قرض قرار دیا جائے، لیکن اس پر بھی یہ اشکال باقی رہے گا کہ قرض دے کر کم کرایہ پر مکان حاصل کرنا گویا قرض دے کر فائدہ اٹھانا ہے، جس کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے، جیسے مرتہن رہن کو کم کرایہ پر لے جس کی تفصیلات (سوال ۲-ب) کے تحت اوپر گزر چکی ہے، وہاں شامی اور بزاز یہ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ مرتہن رہن کو کرایہ پر لے تو وہ رہنیت

سے نکل جائے گا اور اجارہ میں داخل ہو جائے گا، فقہاء کے ظاہر عبارات سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، کراہیہ کم اور زیادہ ہونے کی فقہاء نے کوئی تفصیل نہیں کی ہے، البتہ شبہ ربوا کے سبب راقم نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔

راقم کے خیال میں وہی شکل یہاں بھی ہے، وہاں اجارہ انتہاء تھا یہاں ابتداء ہے، لہذا شبہ ربا تو ہے، لیکن دو

وجوہات سے یہ معاملہ جائز ہوگا:

۱- ایک صاع کھجور کے بدلہ دو صاع کھجور فروخت کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا، اور ایک صاع کھجور بیچ کر اس کی ثمن سے دو صاع کھجور لینے کو جائز قرار دیا گیا (بخاری کتاب الوکالۃ باب الوکالۃ فی الصرف والمیزان ص ۲۳۰۲، ۲۳۰۳، و مسلم کتاب المساقاة باب بیع الطعام مثلاً بمثل ص ۹۶، ۹۷ عن ابی سعید و ابی ہریرہؓ)، جبکہ صورت دونوں ایک جیسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن دونوں کی حقیقت بدل گئی تھی، اس لئے جائز قرار دیا گیا، یہاں بھی صورت بدلی ہوئی ہے، لہذا اسے جائز قرار دیا جائے۔

۲- بیع و فاء کی بحث میں گذر چکا ہے کہ اصلاً اسے جائز نہ ہونا چاہئے، لیکن لوگوں کی حاجت کے سبب اسے جائز

قرار دیا گیا، یہ بات یہاں بھی موجود ہے، لہذا لوگوں کی حاجت اور عرف پائے جانے کے سبب اسے جائز قرار دیا جائے۔

بیع الوفاء اور اس کے احکام

مولانا محمد منصف بدایونی ☆

سب سے پہلے بیع الوفاء کی تعریف اور اس کی حقیقت نقل کی جاتی ہے، پھر اس سے متعلق فقہاء کرام کی آراء اور احکام نقل کئے جائیں گے۔

الوفاء: وفا بعہدہ، یعنی وفاء لغت میں وعدہ اور عہد کو پورا کرنے کے معنی میں آتا ہے (المجم الوسیط: ۱۰۴)۔

بیع الوفاء: اصطلاح میں وہ بیع کہلاتی ہے جس میں بائع مشتری سے کہے کہ میں اپنی یہ چیز (مکان یا زمین) تمہارے ہاتھ اتنے ثمن کے بدلے بیچ رہا ہوں اس شرط پر کہ جب میں وہ ثمن واپس کروں تو تم وہ چیز اتنے ہی ثمن کے بدلے مجھے دیدو گے، ”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی: وهو أن یقول: بعت منك علی أن تیبعه منی متی جئت بالثمن“ (ردالمحتار ۵۳۵/۷، مکتبہ زکریا، دیوبند، فتاویٰ ہندیہ ۲۰۹/۳، مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

احکام:

بیع الوفاء سے متعلق فقہاء کرام کے دو نقاط نظر سامنے آتے ہیں، بعض فقہاء کرام اس کو رہن قرار دیتے ہیں اور دوسرے بعض اس کو ضرورت ناس کی وجہ سے بیع قرار دیتے ہیں، پہلے ان فقہاء کرام کی رائے لکھی جاتی ہے جو اس کو رہن قرار دیتے ہیں، علامہ شامی نے ”حاشیة الفصولین“ کی عبارت ”جواهر الفقہ“ کے حوالہ سے اور ”فتاویٰ خیریہ“ اور ”فتاویٰ نسفی“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ رہن ہے، اور اس کا حکم بھی وہی ہے جو رہن کا ہوتا ہے۔

”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی ... فهذا البیع باطل وهو رهن وحکمه حکم الرهن وهو الصحیح... قال فی الخیریة: والذی علیہ الأكثر أنه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام... قلت: وبه صدر فی جامع الفصولین فقال رامزاً لفتاویٰ النسفی: البیع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة“ (شامی ۵۳۶/۷، مکتبہ زکریا)۔

۲- الف: جب اس کو رہن قرار دیا گیا تو اب خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، مگر مالک کی اجازت

سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اگر مالک فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدے تو مشتری کے لئے فائدہ اٹھانا تو جائز ہو جائے گا، البتہ دوران استعمال عقد رہن کا حکم ختم ہو کر بیع اعارہ کے حکم میں آجائے گی، لہذا دوران استعمال اگر شیئی مرہون ہلاک ہو جائے تو بغیر ضمان کے ہلاک ہوگی، کیونکہ شیئی مستعار مستعیر کے قبضہ میں امانت ہوتی ہے اور امانت کے ہلاک ہونے پر ضمان واجب نہیں ہوتا۔

”هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكة“ (شامی ۵۳۶/۷، مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

”والعارية توجب سقوط الضمان سواء كان المستعير هو الراهن أو المرتهن إذا هلك حالة الاستعمال أو أجنبياً ولا ترفع عقد الرهن، ولو هلك في حالة العمل والاستعمال هلك أمانة لثبوت يد العارية حينئذ“ (شامی ۱۳۰/۱۰-۱۳۱ باب التصرف في الرهن مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اور اگر شیئی مرہون استعمال سے پہلے یا استعمال کے بعد ہلاک ہو یا مرہن راہن کی اجازت کے بغیر رہن کو استعمال کرے اور وہ ہلاک ہو جائے، ان تینوں صورتوں میں ضمان واجب ہوگا، پہلی دو صورتوں میں تو اس لئے کہ وہ رہن کے حکم میں ہے، عاریت صرف استعمال کے وقت میں ہے اور تیسری صورت میں اس لئے کہ اس میں مرہن کی جانب سے رہن پر جنایت اور تعدی ہے، ”فهلك الرهن قبل أن يشرع في العمل أو بعد الفراغ منه هلك بالدين لبقاء عقد الرهن“ (شامی ۱۳۱/۱۰ باب التصرف في الرهن مکتبہ زکریا دیوبند)۔

”وجناية الراهن على الرهن كلاً أو بعضاً مضمونة كجناية المرتهن عليه، ويسقط من دينه أى دين المرتهن بقدرها“ (شامی ۱۳۰/۱۰ باب التصرف في الرهن مکتبہ زکریا دیوبند)۔

ب۔ اگر مرہن اس طرح خریدے ہوئے مکان یا زمین کو کرایہ پر لیتا ہے اور اس وقت جو اجرت بھی طے ہو جائے کم ہو یا زیادہ، تو یہ جائز ہے، اس شرط کے ساتھ کہ بیع الوفاء کے وقت اجارہ کا کوئی تذکرہ نہ کیا جائے اس وقت خریدار بائع کو ثمن ادا کرے اور بائع بیع کو مشتری کے حوالے کر دے، پھر بعد میں خریدار بائع سے اجارہ کا معاملہ کرے جس اجرت پر بھی ہو اور بائع اس کو قبول کر لے تو یہ اجارہ جائز اور صحیح ہوگا، کیونکہ بائع (راہن) کو اختیار ہے کہ وہ بیع (شیئی مرہون) کے استعمال کی مشتری (مرہن) کو عاریت کے طور پر (یعنی بغیر اجرت کے) استعمال کی اجازت دے تو اسے اجرت کم کرنے کا اختیار بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

”وكل ما صلح ثمناً أى بدلاً فى البيع صلح أجره... وشرطها أى الإجارة قول الأجرة

والمنفعة معمولتين“ (شامی ۶۹/۷، کتاب الاجارہ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

”كل قرض جرّ نفعاً حرام أى إذا كان مشروطاً.... وإن لم يكن النفع مشروطاً فى القرض

فعلى قول الكرخى، لا بأس به... ثم رأيت فى جواهر الفتاوى: إذا كان مشروطاً صار قرضاً فيه منفعة وهو رباً والافلا بأس به“ (شامی ۳۹۵/۷ مکتبہ زکریا، دیوبند)۔

اور اگر بیع الوفاء کا معاملہ کرتے وقت ہی یہ شرط لگا دے کہ تم مجھے اپنا مکان کم کرایہ پر اجرت پر دو گے تو پھر یہ اجارہ ناجائز ہوگا کیونکہ یہ ایک صفقہ میں دوسرے صفقہ کو داخل کرنا ہے جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے: ”نہی رسول اللہ ﷺ عن بیعتین فى بیعة“ (سنن ترمذی ۲۳۳۱، سنن ابوداؤد ۲/۴۹۰)، وفى رواية: ”عن صفقتین فى صفقة“ (ہدایہ ۶۰۳)۔

ج۔ جب اس کو رہن قرار دیا گیا تو جب تک بیچنے والا (راہن) اس کو واپس نہ لے خریدار (مرتہن) اس زمانہ میں اس شہین مرہون سے اجارہ داری کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اور اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو کرایہ پر دے، اگر کسی دوسرے اجنبی شخص کو راہن کی اجازت سے اجارہ پر دے بھی دے گا تو اجرت راہن کی ہوگی اور عقد رہن باطل ہو جائے گا۔

”والإجارة... إن كان المستاجر... أجنبياً بمباشرة أحدهما العقد بإذن الآخر بطل الرهن والأجرة للرهن“ (رد المحتار ۱۰/۱۳۰ باب التصرف فى الرهن، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اور ”فتاویٰ خیریہ“ میں جن لوگوں نے بیع الوفاء میں بیع کو رہن قرار دیا ہے تو انہوں نے اس پر رہن کے ہی تمام احکامات جاری کئے ہیں اور کسی ایک حکم میں بھی اس کو الگ نہیں مانا ہے، ”والذى عليه الأكثر أنه رهن لا يفتقر عن الرهن فى حكم من الأحكام“، اور ”جامع الفصولین“ میں بھی تقریباً یہی عبارت نقل کی گئی ہے، ”لا فرق عندنا بينه وبين الرهن فى حكم من الأحكام“ (شامی ۵۴۶/۷ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اور رہا زمین مرہون میں کاشت کرنے کا مسئلہ تو خریدار (مرتہن) بائع (راہن) کی اجازت سے اگر اس میں از خود کاشت کرے تو اس کی دو شکلیں ہیں، یا تو عاریت پر کرے گا یا اجارہ پر، اگر عاریت پر کرتا ہے تو اس کا جواب (الف) کے تحت گذر گیا، اور اگر کرایہ پر لے کر کرتا ہے تو اس کا جواب (ب) کے ضمن میں آچکا ہے اور اگر مرتہن کاشت کسی دوسرے سے اجارہ پر دے کر کرائے تو اس کا جواب یہی ہے جو ابھی (ج) کے تحت لکھا گیا ہے۔

د۔ خریدار اس شہین کو رہن ماننے کی صورت میں دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا حق نہیں رکھتا، اگر بیچ بھی دے گا تو بائع (راہن) یا اس کے وارثوں کو اس کے لوٹانے کا حق حاصل ہے، ”وهذا البيع فى يد المشتري كالرهن فى يد المرتهن لا يملكه“ (فتاویٰ ہندیہ ۲۰۹/۳ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد أى على القول بأنه رهن“ (شامی ۵۴۸/۷ مکتبہ

زکریا دیوبند)۔

۳- زر ضمانت کے نام پر لی جانے والی رقم اگر واپس نہ لی جائے اور وہ موجر کی ملکیت اور اس کا حق سمجھا جائے تو اس کو اجرت معجلہ کہا جائے گا تو اگر مثلاً دس لاکھ روپے زر ضمانت کے نام سے لے اور ہر ماہ کی اجرت ایک ہزار مقرر کی گئی تو یہ کہا جائے گا کہ پہلے مہینہ کی اجرت دس لاکھ اور ایک ہزار روپے ہے اور ماہ ب ماہ حاصل ہونے والی اجرت اجرت مؤجلہ ہے، تو اس طرح سے یہ معاملہ اجارہ کا ہوگا اور بیٹگی دی ہوئی رقم اجرت مثل کی تلافی مانی جائے گی اور یہ جائز ہوگا۔

”نعم جرت العادة أن صاحب الخلو حين يستأجر الدكان بالأجرة اليسيرة يدفع للناظر دراهم تسمى خدمة هي في الحقيقة تكملة أجرة المثل أو دونها، فهذه تحصل من الأجرة أيضاً“۔
اور اگر وہ زر ضمانت واپسی کی شرط پر دی گئی ہے تو پھر اس کو قرض کہا جائے گا، لہذا قرض (زر ضمانت) دیتے وقت یہ شرط لگائی گئی ہو کہ تم مجھے اپنا مکان یا دوکان اجرت مثل سے کم مثلاً پانچ سو روپے اجرت کے بدلے کرایہ پر دو گے تو اس کو قرض پر منفعت حاصل کرنا کہا جائے گا جو ناجائز اور حرام ہے، یا ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ میں داخل کرنا شمار کیا جائے گا جس کو اصطلاح میں ”صفقة فی صفقة“ کہا جاتا ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، ”نہی النبی ﷺ عن صفقتین فی صفقة“ (ہدایہ ۶۰/۳)، ”وفی روایة عن بیعتین فی بیعة“ (سنن ترمذی ۲۳۲/۱، وسنن ابوداؤد ۲/۲۹۰)۔
”کل قرض جرّ نفعاً حرام ای إذا کان مشروطاً کما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة“
(شامی ۳۹۵/۷ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

اور اگر قرض کا معاملہ پہلے کر لیا گیا اور مقرض سے مستقرض کو قرض دیدیا اور اس کے حوالہ کر دیا اس وقت اجارہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا اور پھر بعد میں مقرض قرض دار سے مکان یا زمین کرایہ پر لے تو جو بھی کرایہ طے ہو جائے وہ جائز ہوگا، شرط یہ ہے کہ اجرت متعین ہو تو یہ شکل جائز ہے، ”وفی الذخیرة: وإن لم یکن النفع مشروطاً فی القرض فعلی قول الکرخی لا بأس به... ثم رأیت فی جواهر الفتاوی إذا کان مشروطاً صار قرضاً فیہ منفعة، وهو ربا، وإلا فلا بأس به“ (شامی ۳۹۵/۷ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

بیع بالوفاء سے متعلق دوسری رائے:

جن فقہاء کرام نے اس کو بیع قرار دیا ہے، صاحب ”البحر الرائق“ نے اس سلسلے میں آٹھ اقوال نقل کئے ہیں اور یہ آٹھوں ان تمام بحثوں کا خلاصہ ہے جو بیع بالوفاء سے متعلق فقہ و فتاویٰ کی متداول کتابوں میں ملتی ہے، پہلے ہم ان آٹھ اقوال کو نقل کرتے ہیں، پھر سو نامہ میں مذکور سوالات کے جوابات لکھے جائیں گے اور اخیر میں ان شرائط کے ساتھ بیع بالوفاء کو انجام دینا بہتر و افضل ہے اس کو واضح کیا جائے گا۔

ابن نجیم نے جو آٹھ اقوال نقل کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

۱- مشائخ زمانہ نے عرف کی بنا پر بیع بالوفاء کو بالاتفاق بیع صحیح قرار دیا ہے، ”وأنه بيع صحيح باتفاق مشائخ الزمان للعرف“۔

۲- علامہ زبیلی نے بعض احکامات میں (انتفاع کے جواز میں) اس کو بیع جائز قرار دیا ہے۔ لیکن مشتری کو دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا اختیار نہیں ہے اور اسی پر فتویٰ نقل کیا ہے۔

”ذکر الزبیلی أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير“۔

۳- قاضی خان کا مختار مذہب یہ ہے کہ اگر بیع بالوفاء مطلقاً لفظ بیع سے کی جائے اور عقد میں فسخ کو شرط قرار نہ دیا جائے اور نہ بیع بالوفاء کے الفاظ سے بیع کی جائے اور نہ ہی بیع کے مطلق لفظ کو استعمال کرتے وقت بائع اور مشتری کے نزدیک (ان دونوں کے ذہنوں میں) یہ بات طے نہ ہو کہ یہ بیع لازم ہے، ان تین شرطوں کے ساتھ یہ بیع صحیح ہے، پھر بیع کرنے کے بعد وفاء کو وعدہ کے طور پر دونوں نے شرط قرار دیا ہو تو بیع علی حالہ صحیح رہے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا دونوں کے ذمہ ضروری ہوگا۔

اور اگر دونوں نے عقد میں فسخ کو شرط قرار دیا ہو یا لفظ بیع کا تلفظ وفاء کی شرط کے ساتھ کیا ہو یا بیع کا تلفظ کیا ہو اور ان دونوں کے نزدیک طے ہے کہ یہ بیع لازم نہیں ہے تو پھر یہ بیع فاسد ہوگی۔

”الثالث ما اختاره قاضيخان وقال: الصحيح أنه إن وقع بلفظ البيع لا يكون رهناً، ثم إن شرطاً فسخه في العقد أو تلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء أو تلفظاً بالبيع عندهما هذا البيع غير لازم، فالبيع فاسد، وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطه على وجه الموعودة جاز البيع ولزم الوفاء“۔

۴- چوتھا قول یہ ہے کہ بیع کے بعد وعدہ کے طور پر شرط لگانے سے بھی بیع فاسد ہوگی، کیونکہ شرط لاحق اصل عقد کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے، لہذا وہ بیع کو فاسد کر دے گی، البتہ اگر شرط پہلے لگائی جائے اور معاملہ کرتے وقت اس شرط کا بالکل ذکر نہ آئے، یعنی عقد کی بنا اس پہلے وعدہ کی ہوئی شرط پر نہ ہو تو بیع جائز ہوگی، کیونکہ سابق شرط کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

”الرابع ما قاله في العدة واختاره ظهير الدين أنه بيع فاسد، ولو ألحقاه بالبيع التحق وأفسده ولو بعد المجلس على الصحيح وشرطه ثم عقداً مطلقاً إن لم يقرأ بالبناء على الأول، فالعقد جائز ولا عبرة بالسابق“۔

۵- پانچواں قول ائمہ خوارج کا ہے کہ بیع مطلقاً کی جائے اور ثمن مثل کے بدلے میں ہو یا عین بیسیر کے ساتھ اور یہ

وعدہ لے لیا جائے کہ جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو مشتری بیع واپس کر دے گا تو یہ بیع لازم ہوگی اور اگر بیع غبن فاحش کے ساتھ ہو یا مشتری اصل مال پر نفع کو رکھ دے، مثلاً یہ کہے کہ ہر سو روپے پر مزید بیس روپے دینا ہوں گے تو پھر اس کو بیع نہیں رہن قرار دیا جائے گا۔

”الخامس ما اختاره أئمة خوارج أنه إذا أطلق البيع لكن ... عهد أنه إذا أوفاه يفسخ البيع والتمن لا يعادل المبيع وفيه غبن فاحش أو وضع المشتري على أصل المال ربحاً، بأن وضع على مائة عشرين ديناراً فرهن، والافييع بات“۔

۶- چھٹا قول امام زہد کا ہے اگر بیع میں شرط کا تذکرہ نہ کیا جائے تو مشتری کے حق میں بیع صحیح ہوگی اور وہ منافع اور انزال کا مالک ہوگا اور بائع کے حق میں رہن ہوگا، لہذا مشتری نہ دوسرے کے قبضہ میں دینے کا مالک ہوگا اور نہ دوسرے کو مالک بنانے کا اور اس کو ثمن کی واپسی پر بیع کے لوٹانے پر مجبور کیا جائے گا۔

”السادس ما اختاره الإمام الزاهد أن الشرط إذا لم يذكر في البيع كان بيعاً صحيحاً في حق المشتري حتى ملك الإنزال ورهنًا في حق البائع فلم يملك المشتري تحويل يده ومملكه إلى غيره، وأجبر على الرد إذا حضر الدين“۔

اس قول کے مطابق ایک شیئی کے دو حکم ہو رہے ہیں، مشتری کے حق میں بیع اور بائع کے حق میں رہن تو فرماتے ہیں کہ ایک شیئی کے دو حکم ہو سکتے ہیں مثلاً حالت مرض میں بہہ بہہ بھی ہے اور حکم کے اعتبار سے وصیت ہے اور بہہ بشرط عوض کہ یہ بہہ بھی ہے اور حکم کے اعتبار سے بیع ہے۔

”لكثير من الأحكام له حكمان كالهبة حال المرض وبشرط العوض“۔

۷- ساتواں قول بیع کے بعد مشتری کے بیع کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ بیچنے سے متعلق ہے، کہ مشتری بیع بالوفاء کے طور پر خریدی ہوئی بیع کو بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچنے کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ مشتری کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ بیع کو بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچے۔

”السابع أنه غير صحيح واختاره صاحب الهداية وأولاده ومشائخ زماننا، وعليه الفتوى أعني

لا يملك المشتري بيعه من الغير، كما في بيع المكروه لا كالباع الفاسد بعد القبض“۔

۸- آٹھواں قول بعض محققین کا ہے جو جامع ہے وہ یہ ہے کہ بعض احکام میں یہ بیع فاسد ہے، جیسے بائع اور مشتری ہر ایک بیع کو فسخ کرنے کا مالک ہے اور بعض احکام کے حق میں صحیح ہے جیسے مکان میں رہائش اختیار کرنا اور دیگر منافع بیع کا حلال ہونا اور بعض احکام کے حق میں یہ رہن ہے، مثلاً مشتری دوسرے کے ہاتھ بیچنے یا دوسرے کے پاس رہن رکھنے اور تعمیر کو

گرانے اور درختوں کو کاٹنے کا مالک نہیں ہے اور اگر بیع ہلاک ہو جائے تو دین ساقط ہو جائے گا یا بیع میں عیب پیدا ہو جائے تو نقصان عیب کے برابر دین ساقط ہو جائے گا، ابن نجم فرماتے ہیں کہ فتویٰ دینے میں اس قول جامع سے عدول نہیں کرنا چاہئے۔

”الثامن: الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل واحد منهما الفسخ وصحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه ولم يملك قطع الشجرة ولا هدم البناء وسقط الدين بهلاكه وانقسم المثلث إن دخله نقصان كما في الرهن، وينبغي أن لا يعدل في الإفناء عن القول الجامع“ (البحر الرائق ۶/۱۲، ۱۳ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

الف- بیع قرار دینے کی صورت میں بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ اس کو بیچنا جائز نہیں ہے بائع کو ہی لوٹانا ضروری ہوگا۔

”ذکر الزیلعی: أن الفتوی علی أنه بیع جائز مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملك بیعه للغير“۔

”القول السابع: أنه غير صحيح واختاره صاحب الهداية وأولاده ومشائخ زماننا وعليه الفتوى أعني لا يملك المشتري بيعه من الغير كما في بيع المكروه لا كالبيع الفاسد بعد القبض“ (البحر الرائق ۶/۱۲، ۱۳ باب خيار الشرط)۔

ب- ثمن اول پر ہی واپس کرنا لازم ہوگا زیادتی کا مطالبہ کرنے کا مشتری کو اختیار نہیں ہے، کیونکہ معاہدہ ثمن اول ہی پر واپسی کا ہوا ہے، معاہدہ کے الفاظ یہ ہیں:

”متی دفعت لك الثمن تدفع العين إلي“ یا یہ کہتا ہے، ”متی قضيت الدين فهو لي“ یہ عہد عقد میں ہو یا عقد کے بعد یا عقد سے پہلے، جن فقہاء کرام نے اس کو بیع قرار دیا ہے انہوں نے وفاء عہد کو لازم کہا ہے، قاضی خان کا قول ہے: ”جاء البيع ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس“ کہ بیع جائز ہے اور وفا لازم ہے اور کبھی وعدہ ضرورت ناس کی وجہ سے لازم ہو جایا کرتا ہے، ربا سے بچنے کے لئے (البحر الرائق ۶/۱۲ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

ج- جب تک بیع مشتری کے قبضہ میں رہے گی اس سے فائدہ اٹھانا مشتری کے لئے جائز ہوگا، کیونکہ فقہاء کرام نے جب اس کو ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ربا سے بچنے کے لئے تو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہو گیا، کیونکہ اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو ربا کا تحقق ہی کہاں ہوگا، جس سے بچنے کے لئے ضرورتاً بیع کو جائز کہا جائے اس کے ساتھ ساتھ بعض محققین،

امام زاہد اور زلیعی رحمہم اللہ نے اس سے فائدہ اٹھانے کے جائز ہونے کی صراحت بھی کی ہے اور زلیعی نے کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے، ”ذکر الزیلعی: أن الفتوی علی أنه بیع جائز مفید لبعض أحكامه“ (البحر الرائق ۱۲/۶ مکتبہ زکریا دیوبند، شامی ۵۳۶/۷ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

”السادس: ما اختاره إمام الزاهد كان بيعاً صحيحاً في حق المشتري حتى ملك الإنزال قال بعض المحققين: إنه صحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع“ (البحر الرائق ۱۲/۶، ۱۳، ۱۴ مکتبہ زکریا دیوبند، شامی ۵۳۶/۷ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

د: ۱- خریدار اگر کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دے تو یہ دوسری بیچ جائز نہ ہوگی اور بائع یا اس کے وارثوں کو لوٹانے کا حق حاصل ہوگا، ”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد أي على القول بأنه رهن، وكذا على القولين قائلين: بأنه بيع يفيد الانتفاع به، فإنه لا يملك بيعه كما قدمنا“ (شامی ۵۳۸/۷ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

”وعليه الفتوى أعني لا يملك المشتري بيعه من الغير كما في بيع المكره لا كالبیع الفاسد بعد القبض“ (البحر الرائق ۱۳/۶ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

مشتري اگر ثمن اول سے زیادہ قیمت لے تو یہ زیادتی اس کے لئے جائز نہیں ہوگی، ثمن اول پر ہی واپس کرنا لازم ہوگا، کیونکہ ثمن اول پر ہی واپسی کا وہ عہد کر چکا ہے جس کو پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہے۔

۲- خریدار اگر کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دے ثمن اول پر یا اس سے زیادہ قیمت پر اور بائع اس کی اجازت دیدے تو یہ بیچ صحیح ہو جائے گی، اگر ثمن اول کی جنس کے بدلے میں بیچا ہے تو اس سے اپنا دین وصول کر لے گا، اگر برابر برابر ہے تو فیہا اور اگر دین باقی رہ جاتا ہے تو راہن سے اس کو وصول کرے اور اگر زیادہ ہو تو راہن کو لوٹا دے اور اگر ثمن ثانی ثمن اول کی جنس سے نہ ہو تو ثواب یہ (ثمن ثانی) مشتری کے قبضہ میں رہے ہوگی۔

”وان هلك وساوت قيمته الدين صار مستوفياً دينه حكماً أو زادت كان الفضل أمانة أو نقصت سقط بقدره ورجع المرتهن بالفضل“ (شامی ۸۱/۱۰ کتاب الرهن مکتبہ زکریا دیوبند)۔

بیع بالوفاء کا بہتر و افضل طریقہ:

ان تفصیلات سے احقر اس نتیجہ تک پہنچا کہ بیع بالوفاء میں فتویٰ قول جامع پر (جس کو صاحب ”البحر الرائق“ نے آٹھویں نمبر پر ذکر کیا ہے) دینا چاہئے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ۔

۱- بیع مطلقاً کی جائے بیع کرتے وقت کوئی شرط نہ لگائی جائے۔

۲- بیع سے پہلے یا بیع کے بعد مشتری سے بائع بیچ کو ثمن اول پر واپس کرنے کا وعدہ اور عہد کرا لے۔

- ۳- بیع ثمن مثل یا غبن یسیر کے ساتھ کی جائے، چاہے ثمن کے بعض حصہ کو موبل (ادھار) لیکن غبن فاحش کے ساتھ نہ کی جائے خصوصاً اس بدعہدی کے دور میں، تاکہ اگر مشتری و فاء عہد نہ کرے تو بائع کا کوئی بڑا نقصان نہ ہو۔
- ۴- واپسی کے وقت تک بدلیں کا صحیح سالم محفوظ رہنا یہ چوتھی شرط ’القول الجامع‘ میں بھی مذکور ہے۔



بیع و فاء جواز و عدم جواز کی تفصیلات

مفتی عبدالرشید قاسمی ☆

بیع و فاء سے متعلق قدیم اور جدید کتب فقہیہ میں بہت تفصیل موجود ہیں، دور حاضر کے ارباب افتاء نے بھی سیر حاصل بحث کی ہوئی ہے۔ فتاویٰ کی مراجعت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزید لکھنے کے لئے کچھ خاص ضرورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ بیع و فاء کے مجوزین اور مانعین کے درمیان یہ تجزیہ کیا جائے کہ ان حضرات کے اختلاف جواز و عدم جواز میں کس حد تک فرق ہے؟

بیع و فاء کے تفصیلی احکام کتب فتاویٰ خصوصاً ”مباحث فقہیہ“ (حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی) میں موجود ہیں اس لئے بیع و فاء کی تعریف اس کی شکلیں، اختلافات اور جملہ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف ان نکات (Point) پر بحث کی کوشش کی جائے گی جن سے سوالنامہ میں مذکور کچھ نئے سوالات کا حل نکل سکے، اس کے لئے پہلے ہم علماء دیوبند کے فتاویٰ کا مختصر جائزہ لیتے ہیں، پھر آگے مجوزین و مانعین کے درمیان فرق کا تجزیہ کریں گے۔

”فتاویٰ محمودیہ“ (۲۶۹/۲۴-۲۹۰ مطبع محمودیہ مرتب جدید از مفتی فاروق صاحب) میں کئی سوالات کے جوابات میں یہی مذکور ہے کہ بیع و فاء اصلاً رہن ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

الجواب حامداً: ”بیع و فاء کا نام اگرچہ بیع ہے، مگر وہ درحقیقت رہن ہی ہے، مرتہن کوشی مرہون سے انتفاع ناجائز ہے، بیع بالوفاء کو سود کا حیلہ نہ بنایا جائے“ (اکیڈمی کے شرعی فیصلے: ۲۱۰)۔

”اکیڈمی نے طے کیا ہے کہ:

اول: یہ معاملہ درحقیقت ایسا قرض ہے جس میں نفع حاصل کیا جاتا ہے، لہذا یہ سودی معاملہ کا ایک حیلہ ہے اور اکثر علماء کی رائے مطابق درست نہیں۔

دوم: اکیڈمی کی رائے میں بھی یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے“ (کفایت المفتی ۱۵۵/۸)۔

”بیع بالوفاء فی الحقیقت رہن کی ایک صورت ہے اور رہن میں مرتہن کوشی مرہون سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز

نہیں۔“

کتاب الفتاویٰ (۲۷۹/۵) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

”جواب: یہاں بیع کی جو صورت بیان کی گئی ہے فقہاء کے یہاں اسے ”بیع وفاق“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ شریعت کا اصول ہے کہ بیع کے معاملہ کے ساتھ اگر کوئی شرط لگا دی گئی جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو تو درست نہیں ہوگی۔“

امداد الفتاویٰ (۱۰۶/۳-۱۰۹) میں حضرت تھانوی بھی بیع وفاق کو رہن ہی کے حکم میں رکھتے ہیں۔

الموسوعۃ الفقہیہ (۲۸۳/۹-۲۸۷) ”بیع وفاق“ کو رہن ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

”فتاویٰ عثمانی“ میں مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

”یہ بیع وفاق ہے اور اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے، اکثر فقہاء کرام اس عقد (مسئلہ) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں۔ اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیع دے اور ”ردالمحتار“ میں اس کے متعلق کئی اقوال نقل کئے گئے ہیں لیکن جو قول جامع ہے اس کو باس طور ذکر کرتے ہیں:

”قوله (وقیل: بیع یفید الانتفاع بہ) هذا محتمل لأحد القولین: الأول: أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع بہ، إلا أنه لا یملک بیعہ قال الزیلعی فی الإکراه: وعلیہ الفتوی، الثانی: القول الجامع لبعض الحقیقین: أنه بیع فاسد فی حق بعض الأحکام حتی ملک کل منہما الفسخ.... (در المختار باب الصرف ۳۲۲/۳، شامی ۲۷۶/۵ طبع سعید، والبحر الرائق ۸/۶، تبیین الحقائق ۱۸۳/۵)۔“

اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ”بیع وفاق“ میں مشتری کو بیع، رہن، وقف وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں۔ اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہذا جن حضرات نے اسے عقد رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک تو مشتری کو فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف کرنا وغیرہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں“ (فتاویٰ عثمانی ۱۰۸/۳)۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ بسط و تفصیل سے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے مباحث فقہیہ میں (۵۶۳-۶۰۷) اس بحث کو ذکر فرمایا کہ اور فقہاء کے تمام اقوال جمع فرمادیے ہیں، قاضی صاحب نے اس موقع پر آٹھ اقوال تقابلی جائزے کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں، ہم یہاں پر نہ ہی ان تمام اقوال کو ذکر کریں گے اور نہ ہی ان کے مابین تفصیلی تقابلی جائزہ لیں گے، بلکہ فقط اس قدر عرض کریں گے کہ ان اقوال میں امتیازی فرق واضح ہو جائے۔

چنانچہ جن حضرات نے ”بیع وفاء“ کو عقد رہن قرار دیا ہے اور یہ قاضی صاحب کے بیان کردہ اقوال میں قول اول ہے وہ حضرات اس بیع کو باطل مانتے ہیں اور اگر کسی نے ”بیع وفاء“ کو بھی لیا تو وہ خود بخود ”عقد رہن“ بن جائے گا، اور رہن کے تمام احکام اس بیع پر جاری ہوں گے، اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے، ان کے نزدیک مشتری کے لئے انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، اور بعض حضرات اسے بیع اور رہن کا مجموعہ مانتے ہیں اور اسی اعتبار سے بیع اور رہن دونوں کی رعایت کرتے ہوئے حکم لگاتے ہیں۔

ان سب میں معتدل رائے وہی ہے جو قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”مناسب یہ ہے کہ فتویٰ دینے میں جامع قول سے عدول نہ کیا جائے، فقہ حنفی کے مراجع اور کتب میں ”بیع الوفاء“ کے سلسلہ میں بکھری ہوئی تفصیلات و مشتملات کا یہ خلاصہ ہے جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ”بیع الوفاء“ کے بارے میں فقہاء حنفیہ کے اقوال مختلف ہیں، نیز قول راجح اور مفتی بہ ہونے کے بارے میں بھی ان کے اقوال مختلف ہیں، لیکن اکثر فقہاء اس کے رہن ہونے کے قائل ہیں، اور بعض فقہاء نے بعض احکام کے حق میں اس کے جائز اور بعض میں فاسد ہونے کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔“

”بیع الوفاء“ بیع باطل ہے اور حقیقت میں رہن ہے، اس کا حکم وہی ہے جو رہن کا ہے اور یہی صحیح ہے.... خلاصہ یہ کہ اکثر فقہاء اس عقد کو باطل کہتے ہیں اور اسے تمام احکام میں رہن قرار دیتے ہیں“ (مباحث فقہیہ ص: ۵۸۵، ۵۷۴، ۵۷۵)۔

دیگر ائمہ کے یہاں بھی رجحان یہی ہے کہ ”بیع الوفاء“ کو رہن مانا جائے دیکھئے (مباحث فقہیہ ص: ۵۸۵-۵۸۸) اور اگر اسے بیع مانا بھی گیا ہے تو مطلقاً نہیں، بلکہ قیود اور شرائط کے ساتھ، یعنی مشتری کو بیع سے انتفاع کے حق میں یہ بیع کی طرح ہے، بقیہ احکام میں نہیں۔

ان تمام معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی نے بھی ”بیع وفاء کو تمام احکام میں عقد بیع تسلیم نہیں کیا۔ پھر جو حضرات اسے درست قرار دیتے ہیں وہ ایک تفصیل اور بیان کرتے ہیں، اور وہ یہ کہ اس بیع میں فسخ کی شرط ہے یا نہیں؟ اور شرط قبل عقد ہے یا نفس عقد میں ہے یا بعد میں ہے، اگر فسخ کی شرط نہیں لگائی گئی تب تو یہ بیع درست ہوگی، اور اگر صراحتاً اس میں فسخ کی شرط لگائی تو شرط فاسد کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی۔ اسی طرح اگر نفس عقد میں قبل عقد شرط لگائی گئی تب بھی بیع فاسد ہوگی، کیونکہ یہ ایک بیع اور شرط کو شامل ہے اور جناب نبی کریم ﷺ نے ایک ساتھ بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے، ”نہی عن بیع و شرط“ (مشکوٰۃ شریف ۸۶۷/۳، حدیث نمبر: ۲۸۷۰ تحقیق ناصر الدین البانی)۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب فرماتے ہیں:

”اور جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ اگر ”بیع الوفاء“ بیع کے لفظ کے ساتھ لگئی تو بیع صحیح قرار پائے گی اور اگر

صراحتاً اس میں ”فسخ“ کی شرط لگائی گئی، یا بوقت عقد و فاء ”بیع جائز“ کا تلفظ کیا گیا، مگر بیع جائز سے مراد متعاقدین کے نزدیک اس بیع کا عدم لزوم تھا تو ان دونوں صورتوں میں بیع فاسد قرار پائے گی، کیونکہ شرط فاسد کی وجہ سے بیع فاسد قرار پاتی ہے، لیکن اس صورت میں جبکہ صلب عقد میں شرط و فاء کا تذکرہ نہیں ہوا، اور عقد کے تمام ہونے کے بعد فریقین نے اس پر اتفاق کر لیا کہ ثمن کی واپسی کے وقت بیع واپس کر دی جائے گی، اس میں بیع جائز ہوگی اور اس نے عقد کے بعد جو ”وفاء“ کا وعدہ کیا ہے وہ لازم قرار پائے گا، اس لئے کہ ایفاء وعدہ لازم ہے ہوتا ہے، پس بیع الوفاء میں لوگوں کی حاجت کے پیش نظر اس وعدہ کے ایفاء کو لازم قرار دیا جائے گا، لزوم وعدہ کا قول حاجت پر مبنی ہے“ (مباحث فقہیہ ص: ۵۹۲)۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ”بیع و فاء“ وہ شکل جس میں صلب عقد یا قبل عقد شرط و فاء کا تذکرہ نہ ہو، بلکہ عقد تمام ہونے کے بعد شرط و فاء کا ذکر ہو اور فریقین نے اس پر اتفاق کر لیا کہ ثمن کی واپسی کے وقت بیع واپس کر دی جائے گی یہ وہ شکل ہے جو بالاتفاق جائز ہے، کیونکہ یہ ایک وعدہ ہے جو بیع تمام ہونے کے بعد کیا گیا، بیع اور شرط ایک ساتھ شامل نہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے مقصد حاصل ہوتا نظر نہیں آتا، کیونکہ ایفاء وعدہ اگرچہ شرعاً و اخلاقاً لازم ہے، لیکن قانوناً اسے پابند نہیں کر سکتے، لہذا اگر مشتری بیع کو کسی دوسرے شخص سے فروخت کر دے تو بائع قانوناً اسے پابند نہیں کر سکتا اور اس طرح ”بیع الوفاء“ کا جو اصل مقصد تھا کہ بیع محفوظ رہے وہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔

مذکورہ اقوال کے درمیان خلاصہ اختلاف یہ نکلا کہ اکثر فقہاء کے نزدیک ”بیع و فاء“ یہ عقد رہن ہے، اور جن لوگوں کے نزدیک یہ بیع عقد ہے ان کے یہاں صرف بیع سے انتفاع کے حق میں یہ بیع کے حکم میں ہے بقیہ دیگر تصرفات مثلاً اسے بیچنا، یا دوسرے کو رہن میں دے دینا، وقف وغیرہ کر دینا ان فقہاء کے یہاں بھی جائز نہیں ہے، اب اگر ”شرط و فاء“ صلب عقد میں یا قبل عقد ہے تو بیع و فاء کو عقد رہن تسلیم کرنے کی صورت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ عقد رہن میں شرط صلب عقد ہی میں ہوتی ہے، اور انتفاع جس طرح رہن میں ممنوع تھا یہاں بھی ممنوع رہے گا، اور اگر عقد بیع تسلیم کر لیا جائے تو ان علماء کے نزدیک یہ بیع باطل ٹھہرے گا جو اسے رہن مانتے ہیں اور ان علماء کے نزدیک یہ بیع درست قرار پائے گی جو اسے بیع سے انتفاع کے حق میں عقد بیع تسلیم کرتے ہیں۔ ایک صورت اتفاقی ہے اور وہ یہ کہ عقد کے بعد شرط و فاء کا تذکرہ ہو، لیکن اس صورت میں شرط کا ایفاء اخلاقاً ہوگا۔

قرض کے سلسلہ میں ہمیں غور کرنا ہوگا کہ مزاج شریعت کیا ہے، دراصل قرض نقصان کا سودا ہوتا ہے اور اسی لئے شریعت نے قرض دینے کے بڑے فضائل بیان کئے ہیں، یہ فضیلت اسی لئے ہے کہ مقرض اپنا نقصان کر کے ایک مجبور شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے اور انسانی ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے، جبکہ مشتری کے لئے ایسے کوئی فضائل بیان نہیں کئے گئے، کیونکہ بیع میں ہمدردی کا عنصر نہیں ہوتا، بلکہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کا پناہ اپنا نفع چاہتا ہے، لیکن قرض کے معاملہ میں مقرض کو دنیاوی

اعتبار سے سراسر نقصان اور گھانا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اب یہ نقصان دو طرح سے ہوتا ہے، ایک نقصان تو یہ کہ اس کی رقم کی ویلو (Value) کم ہوتی ہے، اور دوسرا نقصان یہ کہ اس رقم سے مقرض نفع اٹھا سکتا تھا، کاروبار کر سکتا تھا اور رقم میں اضافہ کر سکتا تھا، لیکن انسانی ہمدردی اور ثواب کی امید میں اس نے یہ دہرا خسارہ برداشت کیا، اسی لئے احادیث میں قرض دینے اور اس پر مہلت دینے کے بے پناہ فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ”بیع الوفاء“ کا مقصد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ”بیع وفاء“ کا مقصد یہی ہے کہ بائع اپنے سامان کا تحفظ (Security) چاہتا ہے تو یہی چیز تو رہن میں بھی ہوتی ہے، نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب منطقی طور پر نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ مشتری یعنی مقرض جو سامان خرید رہا ہے یا بالفاظ دیگر قرض دے رہا ہے تو اس کا منشاء کیا ہے؟ قرض دینا ہے یا سامان خریدنا؟ اگر وہ قرض دے رہا ہے تو نقصان اٹھانے کو تیار رہنا چاہئے، کیونکہ قرض دینے میں تو نقصان ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے، اور اگر سامان بحیثیت مشتری خرید رہا ہے تو پھر بیع کا نام ہونا چاہئے اور جملہ احکام بیع کے لاگو ہونا چاہئے، اسی لئے اکثر فقہاء کرام اور دور حاضر کے ارباب افتاء نے ”بیع وفاء“ میں بیع کو رہن قرار دیا ہے، تاکہ اس دور فساد میں فتنہ کا دروازہ نہ کھل جائے اور اس حیلہ سے لوگ سود کھانے والے نہ بن جائیں، کیونکہ عام رواج ہو جانے کے بعد بسا اوقات شرائط کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ انسان طبعاً حریص واقع ہوا ہے اس کی توجہ قرض دینے میں انسانی ہمدردی سے ہٹ کر اس طرف چلی جائے گی اور وہ سوچے گا کہ جب بیع سے (جو درحقیقت رہن ہے) نفع اٹھا سکتے ہیں تو پھر کیوں نہ اٹھائیں۔

ہاں ”بیع وفاء“ کی ایک شکل ضرور ایسی ہے کہ اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں اور وہ یہ کہ ”شرط وفاء“ عقد کے تام ہونے کے بعد ہو، اور یہ ایفاء عہد اخلاقی ہو، لیکن اس سے بائع کا مقصد تو حل نہ ہوگا، کیوں کہ بائع کا مقصد اپنے سامان کی حفاظت تھی لیکن بیع تام ہونے کے بعد مشتری اس میں من چاہا تصرف کر سکتا ہے، بائع قانوناً اسے پابند نہیں کر سکتا، ممکن ہے کچھ لوگ ایفاء وعدہ کر لیں اور بیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کریں لیکن اکثر لوگ تو وہ ہوں گے جو اسے حیلہ بنا کر سود کھانے والے بن جائیں گے یا پھر مصنوعی مجبوری دکھا کر من چاہا تصرف کریں گے اور ایفاء وعدہ نہ کر کے اپنا الو سیدھا کریں گے۔

رہا عرف کا مسئلہ کہ ملک کے بعض خطوں میں اس کا کافی رواج پایا جاتا ہے تو آج کے دور فساد میں نہ جانے کن کن چیزوں کا عرف ہو گیا ہے اور نام بدل بدل کر لوگ سود کھانے کے عجیب عجیب طریقے اختراع کر رہے ہیں، مثلاً کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ لوگ مکان کرایہ پر اٹھاتے ہیں، گاڑی کرایہ پر چلاتے ہیں، اگر ہم روپیہ اور سونا و چاندی کرایہ پر چلائیں تو کیا مضائقہ ہے، انسان فطری طور پر مال کا لالچی ہے، ذرا اجازت ملنے پر وہ موقع تلاشنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح پھر وہ

غریبوں کا استحصال کرتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ”بیع و فاء“ کی عام اجازت کے بعد رہن کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا، ”بیع و فاء“ کی شکل میں جب بندہ نفع اٹھا سکتا ہے تو رہن رکھ کر اور رہن نام دے کر مرہن اپنا نقصان کیوں کرے گا؟ وہ تو یہی چاہے گا کہ اسے ”بیع و فاء“ قرار دے اور بیع سے خوب نفع اٹھائے۔ اس لئے وہی رائے راجح معلوم ہوتی ہے جو جمہور کی ہے اور وہ یہ کہ ”بیع و فاء“ باطل و فاسد ٹھہرے اور اسے رہن قرار دیا جائے۔

بہر حال اس دشواری کے پیش نظر انتہائی مخصوص حالات میں اگر ان حضرات کی رائے قبول کر لی جائے جو صرف انتفاع کے حق میں اسے عقد بیع کی طرح تسلیم کرتے ہیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ گنجائش ایک شرط کے ساتھ مشروط ہو اور وہ یہ کہ مشتری کے نفع اٹھانے کا تناسب فقط اسی قدر ہو جتنی اس کی رقم کی ویلو گھٹی ہو، تاکہ یہ معاملہ سود کھانے کا ذریعہ نہ بن سکے۔ اور یہ گنجائش ان حضرات کے نزدیک بھی ہو سکتی ہے جو اسے رہن قرار دیتے ہیں وہ اس طرح کہ راہن (بائع) مرہن (مشتری) کو شہی مرہون (بیع) سے انتفاع کی بخوشی اجازت دیدے اور مرہن (مشتری) بھی فقط اتنا ہی نفع اٹھائے جتنی اس کی رقم کی ویلو گھٹی ہے (اگرچہ بہتر یہ بھی نہیں ہے) اور باقی نفع بائع کو واپس کر دے، تاکہ اس معاملہ کو سود کھانے کا حیلہ نہ بنایا جاسکے۔

شہی مرہون سے نفع اٹھانے کے سلسلہ میں ایک سوال کے جواب میں مولانا عبدالرحمن فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں:

”سوال: شہی مرہون کے منافع کا حق دار کون ہے؟“

جواب: منافع کا مالک راہن ہے، لیکن اگر راہن بخوشی اجازت دیدے تو مرہن بھی انتفاع کر سکتا ہے، لیکن اس کی شرط کرنا رہا میں شامل ہے۔ ہدایہ میں ہے:

”ولیس للمرتهن أن ینتفع بالرهن لا بالاستخدام ولا سکنی ولا لبس، إلا أن یأذن المالك،

انتہی“ (فتاویٰ مولانا عبدالرحمن اردوس: ۲۹۹-۳۰۰)۔

جملہ معروضات سے معلوم ہوا کہ بیع الوفاء جو درحقیقت رہن ہے اگر اس سے مع الأذن بھی نفع اٹھایا جائے تو یہ مکروہ تحریمی ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ جب سے کرنسی کا نقد کی ہوگی اور مقرض کو دہرا نقصان ہونے لگا، ایک نقصان نفع نہ اٹھا سکنے کا اور دوسرا نقصان ویلو کم ہونے کا تو اگر وہ اپنی رقم گھٹنے کے مطابق اجازت کے ساتھ نفع اٹھالے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

زر ضمانت کا مسئلہ:

دوکان یا مکان کرایہ پر لینے سے پہلے پیشگی جو رقم دی جاتی ہے اس کے کئی نام ہیں، ڈپازٹ (Deposit)

اڈوانس (Advance) سیکورٹی (Security)، پگڑی، زر ضمانت۔ ان میں بعض الفاظ کے درمیان کہیں کہیں پر لوگ فرق بھی کرتے ہیں، مثلاً اڈوانس کا لفظ تو عام ہے، لیکن سیکوریٹی اور پگڑی میں ہمارے عرف میں تھوڑا سا فرق کیا جاتا ہے۔ پگڑی عموماً اس رقم کو کہتے ہیں جس میں مالک مکان اپنے حق خلو سے دست بردار ہو جاتا ہے، جبکہ سیکوریٹی اس رقم کو کہا جاتا ہے جو کسی مکان وغیرہ میں ٹوٹ پھوٹ، نقصان یا بقایا جات مثلاً بجلی بل وغیرہ کے عوض پیشگی طور پر مالک لے لیتا ہے، تاکہ اگر کرایہ دار کسی طرح کا نقصان پہنچائے تو مالک اس رقم سے وصول کر لے، کہیں پر اسے پیشگی کرایہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ بسا اوقات کرایہ دار وقت معینہ پر خالی کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے تو مالک اس رقم سے اپنا کرایہ وصول کر لیتا ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اس رقم کا حکم کیا ہوگا؟ قرض کا، امانت کا یا رہن کا؟ تو یہ رقم امانت تو اس لئے نہیں ہے کہ امانت کا استعمال درست نہیں ہوتا اور یہاں مقصد ہی اس کا استعمال ہوتا ہے نیز امانت کے ضیاع پر تاوان نہیں ہوتا، لیکن یہاں فریقین سے یہ شرط ہوتی ہے کہ یہ رقم ہلاک یا استہلاک بہر صورت مالک کرایہ دار کو واپس کرے گا۔ اسی طرح یہ رقم رہن بھی نہیں بن سکتی کیونکہ شیئ مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے، جبکہ یہاں اس رقم کو لیا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس سے انتفاع کیا جائے، اس لئے رہن ماننے کی صورت میں قلب موضوع لازم آئے گا۔

بے غبار شکل یہی ہے کہ اسے قرض مان لیا جائے، لیکن قرض ماننے کی صورت میں دو باتیں حل طلب رہ جاتی ہیں اول یہ کہ قرض میں تاخیر نہیں ہوتی، جبکہ یہاں عرف و رواج کے مطابق زیر بحث مسئلہ میں فریقین ”اصل“ کے پابند ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مالک مکان کرایہ دار سے اس قرض کو مشروط کر دیتا ہے، پس یہ ایک شرط فاسد ہے اور شرط فاسد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے، ان دونوں باتوں کا جواب ہم مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کے اس اقتباس سے دیتے ہیں۔

”ان کا حل اس طرح ہے کہ قرض میں تاخیر کا گواحناف کے یہاں اعتبار نہیں، اس لئے کہ قرض تبرعات کے قبیل سے ہے، ”ولا یثبت الأجل فی القروض عندنا“ تاہم امام شافعی کے یہاں تاخیر کا اعتبار ہے، اور امام مالک کے یہاں نہ صرف اس کا اعتبار ہے، بلکہ قرض میں ”تاخیر“ واجب ہے..... اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ احناف کے نزدیک ”قرض“ کا درست نہ ہونا عام قواعد فقہیہ سے مستنبط ہے، کسی نص صریح سے نہیں، جبکہ آیت مدانیت (البقرہ) بظاہر جمہور کی تائید میں ہے، اور تمام دیون بہ شمول ”قرض“ میں تاخیر کے معتبر ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ پس ہمارے زمانے کے تعامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں جمہور کی رائے کو قبول کر لیا جائے تو مضائقہ نظر نہیں آتا۔

”اجارہ“ جس شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ:

الف- اس میں عاقدین میں سے کسی ایک کے لئے منفعت ہو۔

ب- وہ شرط رواج کا درجہ نہ اختیار کر چکی ہو۔

ج- شرط ایسی ہو کہ اس کی وجہ سے آئندہ نزاع پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہو۔
چنانچہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں: ”وکل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين يفضي إلى المنازعة، فيفسد الإجارة“، اسی طرح کوئی شرط رواج کا درجہ لے لے تو پھر وہ اجارہ کی صحت میں مانع نہیں ہوتی۔
”عالمگیری“ میں ہے:

”رجل استاجر عبداً كل شهر هكذا على أن يكون طعامه على المستاجر أو دابة على أن يكون علفها على المستاجر، ذكر في الكتاب أنه لا يجوز قال الفقيه أبو الليث في الدابة: نأخذ بقول المتقدمين، أما في زماننا فالعبد يأكل من مال المستاجر عادة، كذا في الظهيرية“، غرض ابو الليث نے تعامل اور عادت ہی کے پیش نظر غلام کی خوراک کی ذمہ داری کر ایہ دار پر مشروط کرنے کو درست قرار دیا ہے، قرض کی یہ شرط مفوضی الی النزاع نہیں ہے، یہ بات تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے اور اس شرط نے رواج کا درجہ حاصل کر لیا ہے، اس لئے اس شرط کو شرط فاسد کے درجہ میں رکھنا صحیح نہیں ہوگا“ (جدید فقہی مسائل ۱۳۰۲-۱۳۲-۱۳۲)۔

مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

”لیکن ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا... ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کر ایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا، محض محتمل ہوتا ہے لہذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے، یہ قرض ہی ہے، اور مشروط بحکم العرف ہے“ (فتاویٰ عثمانی ۲۲۰/۳-۲۲۱)۔

۲- حنفیہ نے ممنوع شرط کے لئے جو عقد کو فاسد کر دیتی ہے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے: ہر ایسی شرط کا جس کا عقد متقاضی نہیں اور نہ ہی وہ عقد کے مناسب ہے، اور اس میں متعاقدين میں سے کسی ایک کے لئے یا اجنبی کے لئے یا فروخت شدہ چیز کے لئے جو اہل استحقاق میں سے ہو، نفع ہو اور اس کا عرف و رواج نہ ہو، اور شریعت میں اس کا جواز وارد نہ ہو۔
۳- اگر شرط ایسی ہے جس کا عقد متقاضی ہے یعنی وہ عقد کی وجہ سے بلا شرط واجب ہوتی ہے تو وہ شرط صحیح ہوگی، مثلاً اس شرط پر خریدار کہ خریدار بیع کا مالک ہو جائے گا)۔

حتی کہ عرف و رواج کی وجہ ان شرائط کو بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے جن میں متعاقدين میں سے صرف ایک کو نفع ہو، جیسا کہ ”الموسوعة الفقهية“ (۲۴۶/۹) میں تحریر ہے:

حاصل یہ کہ اڈوانس کی رقم کو اگر قرض مان لیا جائے تو بہتر ہے، اور قرض ماننے کی صورت میں جو اشکال ہوتا ہے کہ پھر یہ اجارہ مشروط بشرط قرض ہو جائے گا اس کا جواب دیا جا چکا۔

رہن ماننے کی صورت میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ایک شخص کے پاس زمین ہے، لیکن تعمیر کے پیسے نہیں ہیں، اب اس کے پاس لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سے رقم لے لو اور بنوانا شروع کرو، اس کو سیکورٹی، زر ضمانت، پگڑی سمجھ لینا، رہن ماننے میں دشواری یہ ہے کہ رہن تو محفوظ رکھنے کے لئے ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ عین کو باقی رکھتے ہوئے مشروط نفع اٹھا لینا، یہاں تو عین ہی فنا ہو گیا، اس لئے زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کو قرض تسلیم کیا جائے۔

قاضی مجاہد الاسلام صاحب نے اس رقم کے بارے میں رہن ہونے کی تائید کی ہے اور رہن سے نفع اٹھانے کا جواب یہ دیا ہے کہ کرنسی نوٹ، درہم و دنانیر کی طرح متعین نہیں ہوتے اس لئے یہ رقم مالک کے ذمہ واجب الادا ہوگی، جب بھی کرایہ دار مکان خالی کر کے اس رقم کا مطالبہ کرے، مالک کو دینا پڑے گا، اس لئے اس رقم کو استعمال میں لانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ رقم رکھے رکھے گھٹتی رہتی ہے، اگر اس کا استعمال نہ کیا جائے تو یہ اس رقم پر ظلم ہوگا۔

سوالات کے جوابات:

مذکورہ معروضات کی روشنی میں سوالات کے جوابات اس طرح ہوئے:

- ۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ کیا گیا ہے قول راجح کے مطابق رہن ہی ہے۔
- الف- اس معاملہ کو بیع قرار دینے کی صورت میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، کیوں کہ جن فقہاء نے اسے بیع قرار دیا ہے وہ صرف انتفاع کے حق میں بیع قرار دیتے ہیں، کسی اور تصرف میں نہیں، اور انتفاع کی گنجائش صرف اتنی ہی مقدار میں ہو جتنی اس رقم کی مالیت گھٹی ہو کیونکہ اصلاً یہ رہن ہی ہے اور اسی میں احتیاط ہے۔
- ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہ ہوگی۔
- ج- اصلاً تو یہ رہن ہے لیکن دور حاضر میں مستقرض (یعنی مدیون) کی قرضوں کی ادائیگی میں ٹال مٹول اور اس کی وجہ سے مقرض (یعنی خریدار) کی رقم کی ویلو (Value) گھٹ جانے کا مزید نقصان، اس کی وجہ سے نفع اٹھانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن اسے سود حاصل کرنے کا حیلہ نہ بنایا جائے، بائع بخوشی اجازت دیدے اور مشتری بھی نفع اتنا ہی اٹھائے جتنی اس کی رقم کی حیثیت گھٹی ہے۔

د- زر ضمانت کی رقم کی حیثیت قرض کی ہوگی اور چونکہ اصل معاملہ اجارہ کا ہے اور یہ قرض بعض مصلحتوں مثلاً مکان کی ٹوٹ پھوٹ یا کسی نقصان کی تلافی کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اس قرض کی وجہ سے کرایہ کی کمی کو ”کل قروض جو نفعاً فہو ربا“ کی قبیل سے شمار نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ اجارہ قرض کے ساتھ مشروط بحکم العرف ہوگا۔

بیع و فاء شریعت کی نظر میں

مفتی محمد عارف باللہ قاسمی ☆

بیع الوفاء کے سلسلہ میں فقہاء کی آراء:

۱- اس عقد کا تذکرہ فقہاء حنفیہ کے یہاں ملتا ہے اور اس کے بارے میں اصل مذہب اور اکثر فقہاء کی رائے تو یہ ہے کہ یہ بیع صحیح نہیں ہے، اور یہ رہن کے حکم میں ہے اور مشتری کے لئے کسی دوسرے سے بیع کو بیچنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ شامی میں ہے:

”أن يقول البائع للمشتري: بعث منك على أن تبعه مني متى حئت بالثمن، فهذا البيع باطل، وهو رهن، وهو الصحيح“ (شامی ۲۷۶/۵)۔

(بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تم سے یہ چیز اس شرط پر بیچی کہ جب کبھی میں قیمت لے کر آؤں گا تو تم اس چیز کو پھر مجھ سے بیجو گے، یہ بیع باطل ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ عقد رہن ہے)۔
علامہ برہان الدین محمود احمد مازہ لکھتے ہیں:

”أن البيع الذي تعارف (عليه) أهل سمرقند وسموه بيع الوفاء تحرزا عن الربا في الحقيقة رهن، والمبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن لا يملكه ولا يحل الانتفاع به، إلا بإذن الراهن،..... لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم أن يبيعه العين بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين“ (رد المحتار ۲۷۶/۵)۔

(ایک ہزار کے بدلے کوئی چیز اس شرط پر بیچے کہ جب وہ بائع قیمت واپس کرے گا تو مشتری اس چیز کو واپس کر دے گا)۔

”بعث هذا بكذا على أني إن دفعت إليك الثمن تدفع العين لي“ (الفتاویٰ الہندیہ ۲۰۹/۳)۔
(میں نے تم سے یہ چیز اتنے میں اس شرط پر بیچی کہ اگر میں تمہیں قیمت واپس کروں تو تم مجھے یہ چیز واپس کر دو گے)۔

بسا اوقات واپسی کی شرط اس طور پر بھی ذکر کی جاتی ہے کہ مشتری اس کو اپنے پاس رکھے اور جب میں اتنی اسے قیمت دوں تو پھر وہ اس چیز کو مجھ سے ہی فروخت کر دے۔

الفاظ و تعبیر جو بھی ہوں اس عقد میں تین باتیں مذکور یا ملحوظ ہوتی ہیں:

۱- مشتری اس کو کسی دوسرے سے نہ بیچے۔

۲- اور جب بائع اسے قیمت واپس کرے تو وہ مشتری وہ چیز اس کے حوالے کر دے۔

۳- جب تک مشتری اس کو اپنے قبضہ میں رکھے اس سے فائدہ و منفعت حاصل کرے۔

ان ہی شرطوں کی وجہ سے فقہاء نے اس کو ایک مستقل نام ”بیع و فاء“ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ عام عقد بیع کے پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو اس میں کئی ممنوع امور جمع ہو جاتے ہیں:

۱- اس میں کسی دوسرے سے نہ بیچنے کی شرط مقتضائے عقد کے خلاف شرط ہے، اور ایسی بیع جس میں مقتضائے عقد کے خلاف کوئی شرط ہو تو وہ فاسد ہو جاتی ہے اور اس کو فسخ کرنا واجب ہو جاتا ہے، صاحب ”ہدایہ“ لکھتے ہیں:

”وکل شرط لا یقتضیہ العقد، و فیہ منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود علیہ، وهو من أهل

الاستحقاق یفسده كشرط أن لا یبیع المشتري العبد المبیع“ (ہدایہ ۴۸۳)۔

(ہر وہ شرط جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا ہے اور اس میں متعاقدين میں سے کسی ایک کا فائدہ ہو یا معقود علیہ کا فائدہ ہو اور معقود علیہ منفعت کا اہل ہو، تو وہ شرط بیع کو فاسد کر دیتی ہے، جیسے کہ یہ شرط کہ مشتری عبد بیع کو نہ بیچے)۔

۲- قیمت کی واپسی کے وقت بیع کی واپسی کی شرط درحقیقت عقد بیع میں اقالہ کی شرط لگانا ہے، اور اگر عقد بیع میں ”اقالہ“ کی شرط ہو تو بیع باطل ہو جاتی ہے، تو اس اعتبار سے اس معاملہ کو باطل ہونا چاہئے۔

”من الأحكام و علیہ فتویٰ السيد الإمام أبو شجاع السمرقندی، و فتویٰ القاضي الإمام علی

السغدی بخاری، و کثیر من الأئمة علی هذا“ (الھیط البرہانی ۱۳۹/۷)۔

(وہ بیع جو کہ اہل سمرقند کے مابین متعارف ہے اور جس کو انہوں نے بیع الوفاء کا نام سود سے بچنے کے لئے دیا ہے، وہ درحقیقت رہن ہے، اور بیع مشتری کے قبضہ میں ایسی ہی رہے گی جیسے کہ مرہن کے پاس مال رہن رہتا ہے، یعنی وہ اس کا مالک نہیں ہوگا اور رہن کی اجازت کے بغیر اس کے لئے اس سے منفعت حاصل کرنا حلال نہ ہوگا، ہمارے نزدیک بیع الوفاء اور رہن کے مابین کسی بھی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، سید امام ابو شجاع سمرقندی اور بخاری میں قاضی امام علی سغدی اور بہت سے ائمہ کا فتویٰ اسی پر ہے)۔

لیکن اس کو خالص رہن قرار دینے کی صورت میں مشتری کے لئے منفعت کا جواز قابل نظر ہے، چاہے اصل مالک

کی اجازت ہی سے کیوں نہ ہو، اسی لئے علامہ زبیلی لکھتے ہیں:

”فإذا كان رهنا لا يملكه ولا ينتفع به، وأي شيء أكل من زوائده يضمن ويستردده عند قضاء

الدين“ (تمییز الحقائق ۵/۱۸۳)۔

(اگر یہ رہن ہے تو پھر وہ اس کا مالک نہیں ہوگا اور وہ اس سے فائدہ بھی حاصل نہیں کر سکتا، اور اس کے زوائد میں

سے اس نے اگر کچھ کھالیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا، اور دین کی واپسی کے وقت بائع اس کو واپس لے گا)۔

۲- قاضی خان وغیرہ کی رائے ہے کہ اگر لفظ بیع کے ذریعہ معاملہ کیا گیا ہے تو یہ رہن کے حکم میں تو نہیں ہوگا، البتہ

اس عقد میں یہ دیکھا جائے گا کہ اگر واپسی کی شرط عقد بیع میں ذکر کی گئی ہے تو یہ عقد فاسد ہوگا، اور اگر بغیر کسی شرط کے عقد بیع ہو اس کے بعد وعدہ کے طور پر واپسی کی بات طے ہوئی تو پھر یہ بیع درست ہوگی اور وعدہ کی وجہ سے اس پر اس شے کی واپسی لازم ہوگی، علامہ ہسکلی لکھتے ہیں:

”قيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهنا، ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان

بيعا فاسدا، ولو بعده على وجه الميعاد جاز لزوم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس“ (شامی ۵/۲۷۷، مجمع الضمانات ۱/۲۴۲)۔

(کہا گیا ہے کہ اگر یہ عقد لفظ بیع کے ذریعہ ہوا تو پھر رہن نہیں ہوگا، (پھر یہ دیکھا جائے) کہ اگر فسخ کا ذکر اس عقد

میں کیا گیا ہے، یا اس سے پہلے کیا گیا ہے یا ان دونوں نے اس عقد کو غیر لازم سمجھا ہے تو پھر یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر فسخ کا ذکر بطور وعدہ کے بعد ہوا ہے تو بیع جائز ہوگا، اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وعدے بسا اوقات لوگوں کی حاجت کے پیش نظر لازم ہو جاتے ہیں)۔

۳- بعض فقہاء اس عقد کو بیع جائز قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مشتری کے لئے اس سے منفعت حاصل کرنا

جائز ہوگا، لیکن اسے کسی دوسرے سے اس کو بیچنے کا اختیار نہ ہوگا، علامہ زبیلی لکھتے ہیں:

”من مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه منهم الإمام نجم الدين النسفي

فقال: اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا، بعض أحكامه وهو الانتفاع به، دون البعض وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل وجوز الاستصناع لذلك وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تمییز الحقائق ۵/۱۸۳)۔

(بعض مشائخ سمرقند نے اس کو بیع جائز مانا ہے اس طور پر کہ اس سے بیع کے بعض فوائد ہی حاصل ہوتے ہیں، ان

مشائخ میں امام نجم الدین نسفی بھی ہے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہمارے مشائخ کا اس پر اتفاق ہے اور انہوں

نے اس کو بیع جائز مانا ہے، اس طور پر کہ اس سے بیع کے بعض فوائد ہی حاصل ہوتے ہیں، جیسے کہ اس کی منفعت حاصل کرنا، جبکہ بیع کے بعض فوائد حاصل نہیں ہوتے ہیں، جیسے کہ اس کو کسی سے بیچنا، ان مشائخ نے اس کو اس لئے بیع جائز مانا ہے کہ لوگوں کو اس کی حاجت ہے اور اس کا تعامل بھی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ بسا اوقات تعامل کی وجہ سے قواعد کو ترک کر دیا جاتا ہے، اسی لئے استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے، صاحب نہایہ فرماتے ہیں کہ فتویٰ اسی پر ہے۔

علامہ زلیعیؒ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: ”قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى“ اور صاحب نہر اسی قول کے بارے میں لکھتے ہیں:

”والعمل في دييارنا على ما رجحه الزيلعي“ (شامی ۲۷۷/۵)۔

(ہمارے دیار میں عمل اسی پر ہے جسے علامہ زلیعی نے ترجیح دی ہے)۔

۴- علامہ حصفی کی نقل کردہ متعدد اقوال کی تشریح کے بعد علامہ شامی لکھتے ہیں:

”القول الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد في حق بعض الأحكام، حتى ملك كل منها الفسخ صحيح في حق بعض الأحكام: كحل الإنزال ومنافع المبيع، رهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما: قال في البحر: وينبغي أن لا يعدل في الإفتاء عن القول الجامع“ (شامی ۲۷۷/۵)۔

(بعض محققین کا قول جامع یہ کہ بعض احکام کے حوالہ سے یہ تو بیع فاسد ہے، اسی لئے ان دونوں میں سے ہر کوئی کا حق حاصل ہے، اور یہ عقد بعض احکام میں صحیح ہے، جیسے کہ منافع بیع کا حلال ہونا، اور بعض احکام میں یہ رہن کے حکم میں ہے، اسی لئے مشتری کو دوسرے سے بیچنے یا کسی دوسرے کو رہن پر دینے کا حق نہیں رکھتا ہے، اور اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں دین ساقط ہو جاتا ہے، گویا یہ تین عقود سے مرکب ہے، جیسے کہ ”زرافۃ“ کہ اس میں اونٹ، گائے اور چیتا تینوں کی صفت ہے، اس عقد کو لوگوں کی حاجت کے پیش نظر جائز قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ دونوں بدل صحیح سالم ہوں، بحر میں ہے: بہتر ہے کہ افتاء میں قول جامع سے عدول نہ کیا جائے)۔

ان اقوال کی روشنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقد جسے ”بیع وفاء“ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، نہ تو خالص عقد بیع ہے اور نہ ہی خالص عقد رہن ہے، اس لئے اس پر نہ تو بیع کے احکام مکمل جاری ہوں گے اور نہ ہی رہن کے سارے احکام کا اس پر انطباق ہوگا، جیسا کہ قول ثالث اور قول جامع میں اس کی صراحت موجود ہے، اور ان اقوال سے یہ باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ منعقد ہوتا ہے شرعاً درست ہے، اور ضرورت کی وجہ سے اس کو بیع جائز مانا گیا، اور اصل مذہب میں اس کے عدم جواز کے قول کے باوجود بوجہ ضرورت اس کے جواز کا قول اختیار کیا گیا ہے۔

”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة أو خاصة، ومن هذا القبيل تجويز بيع الوفاء، فإنه لما كثر الدين على أما لي بخارى مست الحاجة إلى ذلك فصار مرعياً“ (مجلد الاحکام العدلیہ: مادہ ۳۲)۔

(حاجت کو ضرورت کا درجہ دیا جاتا ہے، چاہے وہ عام ہو یا خاص ہو، اور اسی قبیل سے بیع و فاء کو جائز قرار دینا ہے، کیونکہ جب بخاری کے لوگوں پر دیون کی کثرت ہو گئی تو اس کی حاجت درپیش ہوئی، اس لئے اس کا اعتبار کر لیا گیا)۔

۲- فروخت کنندہ کا یہ شرط لگانا معتبر ہوگا کہ مشتری اس کو کسی سے نہ بیچے اور بعد میں جب فروخت کنندہ قیمت واپس کرے تو یہ اسے وہی واپس کر دے اور مشتری اس کو کسی دوسرے سے بیچنے کا مجاز نہ ہوگا، اور شرط کے مطابق اس پر لازم ہوگا کہ قیمت کی واپسی کے وقت اس شی کو واپس کرے، جیسا کہ قول ثالث اور قول جامع میں یہ صراحت ہے۔

۳- رجوع کے وقت مشتری کے لئے یہ درست نہ ہوگا کہ مالک اول سے زائد قیمت کا مطالبہ کرے، کیونکہ بیع و فاء میں درحقیقت رہن کا پہلو غالب ہے، اور متعاقدین کے ذہن میں بھی رہن ہی ایک گونہ تصور ہوتا ہے، اور عقد رہن میں یہ جائز نہیں ہوتا کہ مرتہن راہن سے زائد رقم کا مطالبہ کرے، زیادہ قیمت پر بیع واپس کرنے کی شرط کے بارے میں مفتی رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

(یہ صریح رہا ہے، بیع بالوفاء میں اس لئے داخل نہیں ہے کہ اس میں ثمن کی زیادتی نہیں ہوتی) (حسن الفتاویٰ

۶/۵۲۴)۔

نیز عقد رہن میں مال مرہون کے مقابل میں حاصل کی گئی رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور قرض دے کر زائد واپسی کا مطالبہ سود ہے۔

”لا خلاف بین الفقهاء فی أن اشتراط الزيادة فی بدل القرض للمقرض مفسد لعقد القرض، سواء أكانت الزيادة فی القدر، بأن یرد المقترض أكثر مما أخذ من جنسه، أو بأن یریدہ هدیة من مال آخر، أو كانت فی الصفة، بأن یرد المقترض أجدد مما أخذ، وإن هذه الزيادة تعد من قبیل الربا“ (الموسوعة الفقہیہ ۱۳۰/۳۳)۔

(اس بات میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرض دہندہ کے لئے بدل قرض میں زیادتی کی شرط عقد قرض کو فاسد کر دیتی ہے، چاہے وہ زیادتی مقدار میں ہو، کہ قرض گیرندہ جتنی مقدار میں قرض لیا ہے اس سے زیادہ اس جنس میں واپس

کرے، یا اصل قرض کے ساتھ کوئی دوسرا مال بطور ہدیہ دے، یا وہ زیادتی صفت میں ہو، کہ قرض گیرندہ نے جیسا مال لیا ہے اس سے عمدہ واپس کرے، اور یہ زیادتی سود شمار کی جائے گی۔

۴- خریدار کے لئے اس شیء سے استفادہ جائز ہوگا، جیسا کہ سابقہ ذکر کردہ عبارتوں میں اس کی صراحت ہے۔

۵- خریدار کو اس چیز کے بیچنے کا حق اس عقد سے حاصل نہ ہوگا۔

”لم یملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه“ (شامی ۲۷۷/۵)۔

(مشتري اس کو کسی دوسرے سے فروخت کرنے یا اس کو رهن پر دینے کا مالک نہیں ہوگا)۔

زر ضمانت کی حیثیت:

۶- موجودہ زمانہ میں مکان یا دکان پر حاصل کی جانے والی رقم ضمانت کی حیثیت قرض کی ہے، لیکن اس میں مدت ادا نیگی کی تعیین اور تا جیل احناف کے نقطہ نظر کے مطابق محل نظر ہے، کیونکہ قرض از قبیل تبرعات ہے، اور تبرعات میں تا جیل کا عند الحفیہ کوئی اعتبار نہیں ہے۔

”ولا یثبت الأجل فی القروض عندنا“ (الفتاویٰ الہندیہ ۳۸۶/۵)۔

(ہمارے نزدیک قرضوں میں مدت ثابت نہیں ہوتی ہے)۔

قاضی ثناء اللہ پانی پٹی لکھتے ہیں:

”أما فی القرض فلا یلزم الأجل بالتأجیل؛ لأن الشرع اعتبره عاریة..... کیلا یلزم ربوا

النساء“ (تفسیر مظہری ۴۱۴)۔

(بہر حال قرض تو اس میں مدت کی تعیین سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی ہے؛ کیونکہ شریعت نے اسے عاریت کا درجہ

دیا ہے..... تاکہ ربا النسئہ لازم نہ آئے)۔

تاہم امام شافعی کے یہاں تا جیل کا اعتبار ہے، اسی لئے اگر قرض کی مدت متعین ہو تو اس سے قبل مطالبہ ان کے

نزدیک درست نہیں ہے، علامہ ابو الحسنین شافعی لکھتے ہیں:

”إذا کان علی الرجل دین، فإن کان مؤجلاً..... لم تجز مطالبته به قبل حلول

الأجل“ (البیان فی مذہب الامام الشافعی ۱۳۱/۶)۔

(اگر کسی کا کسی پر قرض ہو، پس اگر وہ مؤجل ہو تو اجل کے آنے سے قبل اس کا مطالبہ جائز نہیں ہے)۔

علامہ نووی لکھتے ہیں:

”إذا کان علی رجل دین، فإن کان مؤجلاً لم یجز مطالبته لأ نالو جوزنا مطالبته سقطت فائدة

التأجيل“ (المجموع ۱۳/۲۶۹)۔

(اگر کسی کا کسی پر قرض ہو، اور وہ مآجل ہو تو اس کا مطالبہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اگر ہم اس کے (قبل از وقت) مطالبہ کو جائز قرار دے دیں تو تا جیل کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا)۔

اسی طرح امام مالکؒ بھی قرض میں تا جیل کے اعتبار کے قائل ہیں، علامہ ابن بطلانؒ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قال مالک وأصحابه: من أقرض رجلاً دنانیر أو دراهم أو شینا مما یکال أو یوزن أو غیر ذلك حالاً، ثم طاع له فأخروه به إلی أجل، ثم أراد الانصراف عن ذلك، وأخذہ قبل الأجل لم یکن ذلك“ (شرح ابن بطلان ۶/۵۲۷)۔

(امام مالک اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں: کسی نے کسی کو دینار، درہم یا کوئی مکلی یا موزونی چیز وغیرہ قرض دیا جس کی ادائیگی فی الفور کرنی تھی، پھر اس نے ہمدردی میں اس کو مدت کی مہلت دے دی، پھر وہ چاہتا ہے کہ اس سے لوٹ جائے اور اجل سے پہلے قرض لے لے، تو اسے اس کا اختیار نہ ہوگا)۔
خطاب مالکی لکھتے ہیں:

”من أقرض رجلاً شینا إلی أجل، فلیس له مطالبته به قبل الأجل“ (موابہ الجلیل ۴/۵۴۵)۔
(کسی نے ایک شخص کو کوئی چیز متعینہ وقت تک کے لئے قرض دیا تو اجل سے پہلے اسے اس کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا)۔

اور یہ حقیقت ہے کہ آیت مدایت میں ”إذا تداینتم بدین إلی أجل مسمى“ (سورہ بقرہ: ۲۸۲) سے بظاہر جمہور حضرات کی تائید بھی ہوتی ہے کہ جو کہ تا جیل کے اعتبار کے قائل ہیں، اور موجودہ زمانہ میں یہ تا جیل ایک ضرورت بھی بن چکی ہے، اس لئے اس مسئلہ میں حنفیہ کے قول کے بجائے جمہور کے قول کو اختیار کر کے تا جیل کا اعتبار کیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

”احناف کے نزدیک ”قرض“ میں تا جیل کا درست نہ ہونا عام قواعد فقہیہ سے مستنبط ہے، کسی نص صریح سے نہیں، جبکہ آیت مدایت بظاہر جمہور کی تائید میں ہے اور تمام دیون بشمول قرض میں تا جیل کے معتبر ہونے کو ظاہر کرتی ہے، پس ہمارے زمانے کے تعامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں جمہور کی رائے کو قبول کیا جائے تو مضائقہ نظر نہیں آتا“ (جدید فقہی مسائل ۸/۷۸)۔

رقم ضمانت کو پیشگی کرایہ کے بجائے قرض ماننے کی صورت میں ایک دشواری اس اعتبار سے پیش آتی ہے کہ مالک کی

جانب سے اس قرض کی شرط ہوتی ہے کہ کرایہ دار لازمی طور پر مالک کو یہ قرض دے، اور یہ ایک شرط فاسد ہے، اور عقد اجارہ شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عقد اجارہ اس شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہوتا ہے جس میں عاقدین میں سے صرف کسی ایک کے لئے منفعت ہو، اور اس شرط کی وجہ سے آئندہ نزاع کا امکان ہو، اور اس شرط کو رواج کا درجہ حاصل نہ ہو، علامہ ابن عابدین نجیم مصری لکھتے ہیں:

”وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين يفضى إلى المنازعة، فيفسد الإجارة“ (البحر الرائق ۱۱۹/۸)۔

(ہر وہ شرط جو کے مقتضائے عقد کے خلاف ہو اور اس میں عاقدین میں سے کسی ایک کے لئے منفعت ہو وہ نزاع کا باعث بنتی ہے اور وہ اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے)۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ ضمانت کے مطالبہ کا رواج ہو گیا اور یہ ایک ایسی مروج شرط ہے جو مستقبل میں نزاع کا باعث بھی نہیں ہے، اس لئے یہ شرط عقد اجارہ کو فاسد نہیں کرے گی، اور اس شرط کے ساتھ عقد اجارہ صحیح ہو جائے گا، اور رقم ضمانت مالک کے پاس بطور قرض کے موجود رہے گی اور کرایہ دار کو مکان یا دکان پر بحیثیت کرایہ دار تصرف کا اختیار ہوگا، جس کا عوض وہ کرایہ کی شکل میں ادا کرے گا۔

البتہ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس رقم ضمانت کی وجہ سے اس دکان یا مکان کے کرایہ میں کافی حد تک کمی ہو جاتی ہے تو کیا یہ کمی حدیث نبوی: ”كل قرض جبر منفعة فهو ربا“ (البدرا لمیر ۶۲۱/۶، عن علی بن ابی طالب عن النبی ﷺ) کی وجہ سے ممنوع ہوگی یا آپسی رضاندی کی وجہ سے جائز ہوگی؟

مروج صورت حال یہ ہے کہ زر ضمانت ادا کرنے کی صورت میں کرایہ مثل سے بہت ہی کم کرایہ پر دکان یا مکان حاصل ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر مکان یا دکان کی مروج قیمت ۱۰ ہزار ہے تو صرف ہزار، بلکہ اس سے بھی کم کرایہ میں مکان حاصل ہو جاتا ہے، ظاہری بات ہے کہ یہ کمی اس زر ضمانت کی بنیاد پر ہے، گویا قرض کی وجہ سے اس کو یہ منفعت حاصل ہوتی ہے، بلکہ بعض جگہوں پر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ زر ضمانت کی قلت و کثرت کی بنیاد پر کرایہ کا تعین ہوتا ہے، چنانچہ اگر کوئی زیادہ سے زیادہ زر ضمانت دینے پر آمادہ ہوتا ہے تو اس کو کم سے کم کرایہ میں مکان حاصل ہو جاتا ہے، گویا کرایہ میں کمی کی منفعت زر ضمانت (قرض) کی وجہ سے مل رہی ہے، اور ارشاد نبوی ﷺ: ”كل قرض جبر منفعة فهو ربا“ (البدرا لمیر ۶۲۱/۶، عن علی بن ابی طالب عن النبی ﷺ) کی وجہ سے قرض سے کسی بھی قسم کا نفع حاصل کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ وہ منفعت اگر یقینی طور پر سود نہ بھی ہو تب بھی سود کا شبہ تو اس میں پایا ہی جاتا ہے، اور حقیقی سود اور شبہ سود دونوں سے بچنا واجب ہے، ”التحرز عن

حقیقۃ الربا، وعن شبهة الربا واجب“ (بدائع ۳۹۵/۷) اس لئے زرضانت کی وجہ سے مروجہ کرایہ میں کمی شبہ سود کی وجہ سے درست نہ ہوگی۔

مفتی انور شاہ (مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان) ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

”بکر کا زید کو تین ہزار روپیہ پیشگی بطور قرض دے کر پچاس روپیہ ماہوار کرایہ کی دکان دس روپیہ ماہوار کرایہ کے حساب سے لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ قرض سے نفع حاصل کرنا ہے، اور قرض پر نفع حاصل کرنا ناجائز اور سود ہے“ (فتاویٰ محمودیہ ۳۲۲/۹)۔

ہاں اگر کمی اس حد تک ہے جو کہ مروجہ کرائے سے قریب قریب ہی ہے تو پھر اس کی اجازت ہوگی، کیونکہ کرایہ میں عاقدین باہمی رضامندی سے کمی زیادتی کرنے کا حق رکھتے ہیں، اور کرایہ کے مروجہ کرایہ سے قریب تر ہونے کی وجہ سے قرض سے منفعت کے حصول کا شبہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

”أحمد الحجی بن محمد المهدی الحنفی“ (خبیر فی الموسوعۃ الفقہیہ وعضو پیۃ الافاء، کویت) اسی طرح کے ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

”فلا مانع من ذلك إذا كنت تدفع أجرة المثل لا أقل منها“ (Islamic-fatwa.net فتویٰ

نمبر: ۵۷۷۵۸)۔

(اس میں کوئی ممانعت نہیں، جبکہ اجرت مثل سے کم دینے کے بجائے اجرت مثل دیا جائے)۔



بیع و فاء - احکام و مسائل

مولانا محمد مغفور باندوی ☆

بیع کی اصطلاحی تعریف:

صاحب اقتاع بیع کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”وہو مبادلة المال ولو في الذمة أو منفعتہ مباحة“ (الاقتاع: ۵۱/۲)۔

(بیع نام ہے مال کے تبادلہ کا اگرچہ وہ ذمہ میں باقی ہو یا مباح نفع کا)۔

اور ابن قدامہ فرماتے ہیں: ”البيع مبادلة المال بالمال تملیكا و تملکا“ (المغنی لابن قدامہ: ۵/۶)۔

(بیع وہ نام ہے مال کے تبادلہ کا مالک بنانے یا مالک بننے کے مقصد سے)۔

اور صاحب تاتارخانیہ فرماتے ہیں: ”البيع مبادلة في المال بالتراضی“ (الفتاوی التاتارخانیہ: ۸/۲۱۲)۔

(بیع وہ مبادلہ ہے مال میں رضامندی کے ساتھ)۔

علامہ شامی اور علامہ کاسانی اپنی معرکتہ الآراء تصانیف میں رقم طراز ہیں: ”شرعا هو مبادلة شیء مرغوب فیہ

بمثله“ (رد المحتار: ۹/۷)۔

(بیع وہ شیء مرغوب کسی شیء مرغوب سے تبادلہ ہے)۔

مناقشہ:

تمام تعریفات سے یہ دو باتیں واضح ہوتی ہیں (۱) کسی چیز کا تبادلہ بیع میں شرط ہے چاہے وہ مال ہو یا کوئی نفع، یا کوئی ایسی چیز جس میں بائع اور مشتری کو دلچسپی ہو (۲) ابن قدامہ کی تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تبادلہ کی شکل میں مالک بننا جائزین سے پایا جانا چاہئے۔

بیع کا حکم:

تمام مذاہب فقہیہ اس امر پر متفق ہیں کہ بیع کا نتیجہ جائین سے ملکیت کا ثبوت ہے اور یہی بیع کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔

چنانچہ علامہ مرغینانی فرماتے ہیں: ”و حکمہ ثبوت الملک“ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۷/ ۱۲)۔
 اور علامہ شامی اس عبارت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”(و حکمہ ثبوت الملک) ای فی
 البدلین لكل منهما فی بدل، وهذا حکمہ الاصلی“ (رد المحتار ۷/ ۱۲)۔
 مشہور عرب فقیر ڈاکٹر وہبہ زہیلی فرماتے ہیں: ”وملکیۃ المبیع للمشتری و ملکۃ الثمن للبائع“ (الفقه
 الاسلامی وادلتہ ۵/ ۳۳۶۷)۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”فهو ثبوت الملک للمشتري فی المبيع و للبائع فی الثمن للحال“
 (بدائع الصنائع ۴/ ۴۸۲)۔

خلاصہ:

ان تمام عبارات سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ بیع کا حکم اور اس کا حتمی نتیجہ عاقدین میں سے ہر ایک کیلئے
 ملکیت کا ثبوت ہے۔

بیع و فاء کی شکل:

علامہ شامی بیع و فاء کی شکل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”وفی الکافی عن المحیط وهو أن يقول البائع
 للمشتري: بع منک هذا العین بمالک علی من الدین علی أنى متی قضیتہ فهو لی“ (رد المحتار: ۷/ ۴۱۳)۔
 (کافی میں محیط کے حوالہ سے ہے کہ بیع و فاء کی شکل یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں تم کو یہ سامان اپنے اس
 قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں جو تمہارا میرے ذمہ باقی ہے اس شرط پر کہ جب میں تمہارے قرض کی ادائیگی کروں تو تم میرا
 یہ سامان مجھے لوٹا دو گے)۔

نیز علامہ شامی بیع و فاء کی دوسری شکل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”وفی حاشیۃ الفصولین عن جواهر
 الفتاوی : وهو أن يقول: بع منک علی أن تبعه منى متی جئت بالثمن“ (رد المحتار: ۷/ ۴۱۳)۔
 (جواہر الفتوی کے حوالہ سے حاشیۃ الفصولین میں ہے کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں یہ سامان تم سے اس شرط پر
 بیچتا ہوں کہ جب میں اس کی قیمت ادا کروں تو یہ سامان مجھے واپس کر دینا)۔

”ہندیہ“ میں بھی اسکی دو شکلیں مذکور ہیں: ”وصورته أن يقول البائع للمشتري: بع منک هذا العین
 بدین لك علی أنى متی قضیت الدین فهو لی، أو يقول البائع: بع منک هذا بكذا علی أنى متی
 دفعت لك الثمن تدفع العین إلى - كذا فی البحر الرائق“ (الفتاوی الہندیہ: ۳/ ۲۰۹)۔

(اسکی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں یہ سامان تم کو اس قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں جو تمہارا

میرے اوپر ہے اس شرط پر کہ جب میں تمہارا قرض واپس کر دوں تو تم یہ سامان میرے حوالہ کر دو گے، یا وہ کہے کہ میں تم یہ سامان اتنی قیمت میں فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ جب میں تمہارا قرض واپس کر دوں تو تم میرا یہ سامان مجھے واپس کر دو گے۔

صاحب ائقاع فرماتے ہیں: ”قال الشيخ: بيع الأمانة الذي مضمونة اتفاقهما على أن البائع إذا جائه بالثمن أعاد عليه ملكه ذلك ينفع به المشتري بالإجارة والسكنى و نحو ذلك“ (لائقاع طالب اللئقاع ۲/۱۵۴)۔

شیخ فرماتے ہیں کہ: بیع امانہ جس کا مطلب عاقدین کا اس بات پر اتفاق کر لینا کہ بائع جب اس شیء کا ثمن ادا کر دیگا تو مشتری اس کو وہ سامان واپس کر دیگا اور مشتری اس سامان سے فائدہ اٹھائے گا، کرائے پر لگا کر یا اس میں رہائش وغیرہ اختیار کر کے۔

مناقشہ:

ہندیہ اور ردالمحتار میں دو شکلیں اگرچہ بظاہر ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتی ہیں کہ ایک میں قرض کو عوض قرار دیا گیا ہے اور دوسرے میں اس شیء کی قیمت کو اس کا عوض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انجام کے اعتبار سے دونوں شکلیں یکساں ہیں، اس لئے کہ پہلی شکل میں بائع مشتری کا پہلے سے مقروض ہے اور دوسری شکل میں اس سامان کے ذریعہ مشتری سے قرض حاصل کر رہا ہے اور دونوں شکلوں میں رقم کی ادائیگی کے بعد مشتری پر شیء کی واپسی کو لازم کر رہا ہے۔

بیع وفاء کا حکم:

صاحب ائقاع تحریر فرماتے ہیں: ”وهو عقد باطل بكل حال و مقصودهما إنما هو الرباء و باعطاء دراهم بدراهم إلى أجل و منفعة الدار هي الربح“ (لائقاع طالب اللئقاع ۲/۱۵۴)۔
(یہ عقد باطل ہے ہر حال میں اس لئے کہ ان دونوں کا اس بیع سے درہم کا تبادلہ درہم سے ہے، متعینہ مدت تک اور ربا گھر میں سکونت یا اس کا کرایہ پر لگانا ہے)۔

اور ہندیہ میں ہے: ”البيع الذي تعارف اهل زماننا احتیالا للرباء و سموه ببيع الوفاء هو في الحقيقة رهن“ (الفتاویٰ الہندیہ ۳/۲۰۸-۲۰۹)۔

(اور یہ بیع جو ہمارے زمانے میں بیع وفاء کے نام سے رائج ہے اور جسکو لوگوں نے ربا سے بچنے کیلئے اختیار کیا ہے، یہ درحقیقت رهن ہے)۔

اور شامی میں ہے: ”فهذا البيع باطل و حكمه حکم الرهن و هو الصحيح“ (ردالمحتار ۷/۴۲۴)۔

(یہ بیع باطل ہے اور اس کا حکم رہن کا ہے اور یہی صحیح ہے)۔

بیع کی شکل میں سوالات کے جوابات:

الف: اگر بائع اول مشتری کو اس بات کا پابند بناتا ہے کہ مشتری اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے، بلکہ بائع اول کے ہاتھ ہی اس کو فروخت کرے تو اس کی یہ شرط مقتضائے عقد بیع و فاء کے مطابق ہوگی اور مشتری کو اس کے بیچنے کا اختیار نہ ہوگا۔

”حتی لم یملک المشتري بیعه من اخر ولا رهنه“ (رد المحتار کتاب البیوع ۱۰/۴۲۵)۔

ب: مالک اول کو فروخت کرنے کی صورت میں قیمت اول ہی لازم ہوگی زیادتی حرام ہوگی اسکی چند وجوہات ہیں (۱) زیادتی بیع و فاء کی صورت کے خلاف ہوگی، کیونکہ بیع و فاء کی صورت کچھ ان الفاظ میں کی گئی ہے: ”و صورته ان یقول البائع للمشتري: بع منک هذا العین بدین لک علی علی انی متی قضیت الدین فهو لی“ (الفتاویٰ الہندیہ ۳/۲۰۹)۔

(۲) بیع حقیقی میں مراہجہ کی شکل جائز اور درست ہوتی اور یہ عقد بیع من کل الوجوہ بیع نہیں ہے، بلکہ یہ قرض کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے: ”الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به“ (رد المحتار کتاب البیوع ۷/۴۲۵)۔

(۳) قیمت اول سے زیادہ لینے کی صورت میں ربا کا امکان یقین میں بدل جائے گا اور زیادتی بلا کسی شبہ کے ربا الفضل کے قبیل سے ہو جائے گی۔

ج: اس شئی سے فائدہ اٹھانے اور نہ اٹھانے کے سلسلہ میں دونوں طرح کے قول موجود ہیں، ایک قول فائدہ اٹھانے کے جواز کا ہے اور ایک قول عدم جواز کا ہے، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں: ”الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به“ (رد المحتار کتاب البیوع ۷/۴۲۵) نیز علامہ شامی ہی فرماتے ہیں: ”قال الزیلعی: فی الاکراه: وعلیه الفتوی“ (حوالہ سابق)، راقم کی رائے میں فائدہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے (۱) وہ فائدہ جو مالی منفعت پر مشتمل ہو (۲) وہ فائدہ جو مالی منفعت پر مشتمل نہ ہو، مثلاً مکان کی رہائش وغیرہ بیع و فاء میں پہلے قسم کا فائدہ جائز نہ ہوگا، یعنی مشتری کیلئے اس بات کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ بیع (اگر مکان ہے) کو کرائے پر لگا دے یا کھیت ہے تو اس میں کاشتکاری کے ذریعہ مالی منفعت حاصل کرے، البتہ دوسرے قسم کے فائدہ کی اجازت ہونی چاہئے، یعنی مشتری کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ بیع (اگر مکان ہے) کو اپنے ذاتی مصرف میں استعمال کر لے اس سے زیادہ کی صورت میں عین ربا لازم آجائے گا۔

د: مشتری (خریدار) کو اس بیع کو کسی تیسرے آدمی کے ہاتھوں فروخت کرنے کا اختیار نہ ہوگا، اس کے باوجود وہ کسی تیسرے فرد سے عقد بیع کا معاملہ کرتا ہے تو اس بیع کو باطل قرار دیا جائے گا اور بائع کو اس بیع کے اس تیسرے آدمی سے لینے کا پورا اختیار ہوگا۔

”باع كرمه من آخر بيع الوفاء وتقابضا، ثم باعه المشتري من آخر بيعا تاما، و سلم و عاب، فللبائع أن يخاصم المشتري الثاني و يسترد منه الكرم“ (الفتاوى الهندية ۳/۲۰۹)۔

سوال ۲- رہن قرار دینے کی صورت میں

رہن قرار دینے کی صورت میں سب سے اہم مسئلہ اس شے مبیعہ سے انتفاع کا ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے مال مرہون میں انتفاع کے جواز کی کوئی شکل موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر اس عقد و فاء کو رہن قرار دیا جائے تو مرہن (مشتری) کیلئے اس مال سے انتفاع جائز نہ ہوگا، چنانچہ صاحب ”الدر المختار کتاب الرهن“ میں تحریر فرماتے ہیں: ”(لا الانتفاع به مطلقا) لا باستخدام و لا سكنی و لا لبس و لا اجارة و لا اعارة سواء كان من مرتهن او راھن“ (الدر المختار علی باش رد المختار کتاب الرهن ۱۰/۷۰)۔

(مال مرہون سے انتفاع مطلقا جائز نہ ہوگا نہ غلام سے خدمت کے ذریعہ اور نہ مکان میں رہائش کے ذریعہ اور نہ لباس میں پہننے کے ذریعہ اور نہ زمین یا مکان کو کرایہ کے ذریعہ اور نہ راہن کیلئے اور نہ مرہن کیلئے۔ کیونکہ اب اس مال مرہون سے دونوں کے حقوق متعلق ہو گئے ہیں)۔

البتہ ہر ایک دوسرے کو اجازت دے دے تو راہن اور مرہن میں سے ہر ایک کیلئے افادہ کی گنجائش ہے۔

” (الا باذن) كل للاخر“ (حوالہ سابق)۔

اسی طرح صاحب الدر المختار نے انتفاع کے تعلق سے ایک مسئلہ ذکر کیا ہے: ”قال فی الجوهر: رجل رهن دارا و أباح له السكنی فوقع بسكناه خلل و خرب البعض لا يسقط شئ من الدين ، لأنه لما أباح له السكنی أخذ حكم العارية حتى لو أراد منعه كان له ذالك، وفي المضمرة لو رهن شاة، فقال له الراهن كل ولدها واشرب لبنها فلا ضمان عليه، وكذا لو أذن له في الثمرة البستان، فصار أكله كأكل الراهن“ (الدر المختار کتاب الرهن ۱۰/۱۱۸)۔

(جوہر میں ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا مکان رہن پر رکھا اور اس میں رہائش کی اجازت دے دی اور اس کے رہنے کی وجہ سے اس مکان میں کچھ خرابی واقع ہوگئی تو اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا، اس لئے کہ راہن نے جب اس میں رہنے کی اجازت دے دی تو اس کی حیثیت عاریت کی ہوگئی اور اگر راہن چاہے تو مرہن کو رہائش سے منع کر سکتا ہے۔ مضمرة میں

ہے کہ اگر کسی نے اپنی بکری رہن پر رکھی اور راہن نے مرتہن سے کہا کہ اس سے پیدا ہونے والے بچے کا گوشت استعمال کرو اور اس بکری کا دودھ پیو تو اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر باغ کے پھلوں کے کھانے کی اجازت دے دی اور اس نے کھا لیئے تب بھی اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا۔

ان دونوں عبارات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فائدہ اٹھانے کا جواز اجازت پر موقوف ہے۔

ب: یہ مسئلہ ہے رہن کے ساتھ اجارہ کا تو اس تعلق سے صاحب الدر المختار تحریر فرماتے ہیں: ”و لو ارتهن ثم

أجره من رهنه، فالإجارة باطلة“ (الدر المختار کتاب الرهن ۱۰/۱۱۸)۔

(اگر کسی نے رہن پر کوئی چیز رکھی اور پھر اس کو اجارہ پر لگا دیا تو اجارہ باطل ہوگا۔)

نیز علامہ شامی اس مسئلہ کو اور وضاحت سے ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”وأما الإجارة فالمستاجر إن

كان هو الراهن فهي باطلة فكان بمنزلة ما إذا أعار منه أو أودعه، وإن كان هو المرتهن وجد القبض

للإجارة أو اجنبيا بمباشرة أحدهما العقد باذن الآخر بطل الرهن والأجرة للراهن وولاية القبض

للعاقده، ولا يعود رهناء إلا بالاستيناف“ (رد المختار کتاب الرهن ۱۰/۱۰۳)۔

(اگر مستاجر راہن ہے تو یہ اجارہ باطل ہے اور اسکی حیثیت مرتہن سے عارت لینے کی ہوگی اور اگر مستاجر مرتہن ہے

اور اجارہ کا قبضہ پایا گیا یا کوئی تیسرا شخص ہے اور اجارہ کا معاملہ راہن یا مرتہن میں سے کسی ایک نے انجام دیا ہے تو رہن باطل

ہو جائے اور اجرت راہن کو ملے گی اور قبضہ عاقد کا ہوگا البتہ رہن کا معاملہ از سرے نو کرنا ہوگا۔)

”ہندیہ“ میں ہے: ”وفى النسفية: سئل عمن باع دار من آخر بضمن معلوم ببيع الوفاء و تقابضا

ثم استاجرها من المشتري مع شرائط صحة الإجارة و قبضها و مضت المدة هل يلزم الأجر؟ قال: لا،

كذا فى التاتار خانية“ (الفتاوى الہندیہ ۳/۲۰۹)۔

راقم کی رائے میں رہن ماننے کی صورت میں اس مکان یا دکان کا کرایہ پر لینا یا کسی اور کو دینا جائز نہ ہوگا۔ اور

مرتہن کو کرایہ پر دے دینے کی صورت میں اس کا کرایہ (اجرة) لازم نہ ہوگی۔

ج: اگر بیع کوئی زمین یا کھیت وغیرہ ہے تو اس پر کھیتی کرنا یا اس سے کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھانا بائع کی اجازت پر

موقوف ہوگا ”(لا الانتفاع به مطلقا) لا باستخدام و لا سكنى و لا لبس و لا إجارة و لا إعارة سواء كان من

مرتهن أو راهن“ (الدر المختار علی حاشی رد المختار کتاب الرهن ۱۰/۷۰)۔

”زرع المرتهن أرض الرهن إن أبيع له الانتفاع لا يجب شيء، إن لم يبح لزمه نقصان الأرض

و ضمان الماء لو من قناة مملوكة“ (الدر المختار کتاب الرهن ۱۰/۱۱۸)۔

د: مشتری کیلئے اس بیع کا بچنا جائز نہ ہوگا اور بیچنے کی صورت میں بیع کو باطل قرار دیا جائے گا۔

”حتی لم یملک المشتري بیعہ من آخر و لا رهنہ“ (ردالمحتار ۷/۴۵۲)۔

سوال ۳ زر ضمانت کے طور پر دی گئی رقم امانت کے قبیل سے ہوگی۔ اور مستاجر کے اس دکان کو خالی کرنے کی صورت میں آجر پر لازم ہوگا کہ وہ پورا زر ضمانت واپس کر دے۔ اور جہاں تک اس زر ضمانت کی وجہ سے کرایہ کم کرنے کی بات ہے تو کسی بھی مالک کو اپنی مملو کہ شے کا کرایہ متعین کرنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو عام کرایہ سے زیادہ لے لے اور چاہے تو کم۔

خلاصہ

مذکورہ سوالات کے جوابات کے درمیان یہ بات واضح ہوگئی کہ نفعہ خفی میں راجح قول بیع و فاء کو رہن قرار دینے کا ہے

”و حکمہ حکم الرهن و هو الصحيح“ (ردالمحتار ۷/۴۲۴)۔

”ولا فرق عندنا بینہ و بین الرهن فی حکم من الأحکام، کذا فی الفصول العمادیة و علیہ

الفتوی السید ابی شجاع السمرقندی و فتوی القاضی علی السعدی بخاری، و کثیر من الائمة علی

هذا کذا فی المحيط“ (الفتاوی الہندیہ ۳/۲۰۹)۔

”قال فی الخیریة: علیہ الأكثر أنه رهن لا یفبرق عن الرهن فی حکم من الأحکام“ (ردالمحتار

۷/۴۲۴)۔ ان تمام عبارات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیع و فاء اگرچہ لفظ بیع کے ذریعہ منعقد ہو رہا ہے لیکن یہ بیع نہیں ہے

”ان العبرة فی العقود للمعانی لا للألفاظ و المعانی“ (الموسوعة الفقہیہ ۹/۲۶۱)۔

راقم السطور کی رائے میں اس کو بیع ہی قرار دیا جائے اور علامہ شامی کی اس عبارت کو دلیل قرار دیا جائے ”انہ بیع

صحيح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا لا یملک بیعہ“ (ردالمحتار ۷/۴۲۵)۔

بیع الوفاء ایک تحقیقی جائزہ

مولانا محمد عظمت اللہ ہدایت اللہ میر ☆

وفاء کے لغوی معنی:

اداء کرنا جیسے کہا جاتا ہے: ”وفاء بالواجب“ (فرض کی ادائیگی) ”وفاء الدین“ (قرض کی ادائیگی) (القاموس

الجدید)۔

اصطلاحی معنی:

عقد بیع میں ایسی شرط لگانا جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو۔ چونکہ بیع الوفاء میں بائع بیع کو ایسی شرط کے ساتھ مقید کرتا ہے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً بائع مشتری سے بیع اس شرط کے ساتھ فروخت کر رہا ہے کہ جب کبھی بائع بیع کی قیمت واپس لا کر دے تو مشتری اس کو یہی چیز واپس فروخت کریگا۔ اس صورت کو خفیہ ”بیع الوفاء“، مالکیہ ”بیع الثنیاء“، شافعیہ ”رهن المعاد“ کہتے ہیں۔ مصر میں یہ معاملہ ”بیع الامانة“ اور شام میں ”بیع الطاعة“ سے مشہور ہے۔ لیکن بعض فقہاء اس کو ”بیع الجائز“ اور بعض اس کو ”بیع الماملة“ سے تعبیر فرماتے ہیں۔

صاحب در لکھتے ہیں: و صورته: أن یبیعه العین بألف علی أنه إذا رد علیه الثمن رد علیه

العین، و سماه الشافعیة بالرهن المعاد، ویسمی بمصر بیع الامانة، وبالشام بیع الطاعة۔

علامہ شامی اسی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”وبعض الفقهاء یسمیہ البیع

الجائز، ولعله مبنی علی أنه بیع صحیح لحاجة التخلص من الربا حتی یسوغ للمشتري أكل

ربعه، وبعضهم یسمیہ بیع المعاملة. ووجهه أن المعاملة ربح الدین، وهذا یشتریه الدائن لینتفع به

بمقابلة دینه۔ قوله: (و صورته الخ) کذا فی العنایة. وفی الکفاية عن المحیط: هو أن یقول البائع

للمشتري بعث منک هذا العین بما لک علی من الدین علی أنى متى قضیته فهو لی ۱۵۔ وفی حاشیة

الفصولین عن جواهر الفتاوی: هو أن یقول بعث منک علی أن تبیعه منى متى جئت بالثمن، فهذا البیع

باطل و هو رهن، و حکمہ حکم الرهن و هو الصحيح“ (شامی ج ۷، ۲۲۴)۔
بیع الوفاء: کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ بات سمجھنی ضروری ہے کہ اگر بیع کے اندر کوئی ایسی شرط لگائی جائے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے۔

اس بارے میں چار مسلک سامنے آتے ہیں:

(۱) جمہور فقہاء کا مسلک (۲) امام احمد کا مسلک (۳) علامہ ابن شبرمہ کا مسلک (۴) امام ابن ابی لیلیٰ کا مسلک۔
(۱) جمہور فقہاء امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک فرماتے ہیں کہ ایسی شرط لگانے سے ”شرط“ بھی فاسد ہو جاتی ہے اور ”بیع“ بھی فاسد ہو جاتی ہے، البتہ ان تینوں اماموں کے آپس کے موقف میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ہے۔
(الف) امام اعظم ابوحنیفہ کا موقف:

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیع کے اندر ایسی شرط لگائے جو ”مقتضائے عقد“ کے خلاف ہو اور اس میں ”احد العاقدین“ یا ”معتقود علیہ“ کا نفع ہو یا وہ ملائم عقد (مناسب عقد) نہ ہو یا لوگوں میں متعارف نہ ہو تو ایسی شرط لگانے سے ”شرط“ بھی فاسد ہو جاتی ہے اور اور ”بیع“ بھی فاسد ہو جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مستدل وہ مشہور حدیث ہے جس کو خود بھی امام اعظم نے روایت کیا ہے ”وقد حدثنی عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ٓ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرط۔ (مسند ابی حنیفہ) بشرح القاری ص (۵۴۶) بحوالہ بدائع الصنائع (کتاب البیوع ج ۴ ص ۳۸۷)

علامہ کاسانی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ومنها: الخلو عن الشروط الفاسدة وهي أنواع: ومنها شرط لا يقتضيه العقد، وفيه منفعة للبائع، أو للمشتري، أو للمبيع إن كان من بنى آدم كالرفيق، وليس بملائم للعقد، ولا مما جرى به تعامل الناس، نحو ما إذا باع دارا على أن يسكنها البائع شهرا ثم يسلمها إليه، أو أرضا على أن يزرعها سنة، أو دابة على أن يركبها شهرا، أو ثوبا على أن يلبسه أسبوعا، أو على أن يقرضه المشتري قرضا، أو على أن يهب له هبة، أو يزوج ابنته منه، أو يبيع منه كذا ونحو ذلك، أو اشترى ثوبا على أن يخيطة البائع قميصا، أو حنطة على أن يطحنها، أو ثمرة على أن يجذها، أو رطوبة قائمة على الأرض على أن يجذها، أو شيئا له حمل و مئونة على أن يحمله البائع إلى منزله ونحو ذلك، فالبيع في هذا كله فاسد۔“

آگے وجہ فساد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: عقد بیع میں زیادت منفعت کی شرط ”ربا“ ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی زیادتی ہے جس کے مقابلے میں کوئی عوض نہیں پایا جا رہا ہے، یہی ربا کی تفسیر ہے، اور ہر وہ بیع جس میں ربا پایا جاتا ہو یا اس میں شبہ ربا ہو تو وہ بیع فاسد ہو جاتی ہے۔

”لأن زيادة منفعة مشروطة في البيع تكون ربا، لأنها زيادة لا يقابلها عوض في عقد البيع، وهو تفسير الربا، والبيع الذي فيه الربا فاسد، أو فيه شبهة الربا، وأنها مفسدة للبيع كحقيقة الربا“ (بدائع الصنائع، كتاب البيوع وشروط صحة البيع، ص ۷۷۳ ج ۴)۔

معقود علیہ کا نفع ہو رہا ہو تو اس بارے میں علامہ کا سائی تحریر فرماتے ہیں۔

”و كذا لو باع جارية على ان يدبرها المشتري، أو على أن يستولدها، فالبيع فاسد؛ لأنه شرط فيه منفعة للمبيع، وأنه مفسد، وكذا لو باعها بشرط أن يعتقها المشتري، فالبيع فاسد في ظاهر الرواية عن اصحابنا“ (بدائع الصنائع، كتاب البيوع وشروط صحة البيع، ص ۷۷۳ ج ۴)۔

(ب) امام شافعی کا موقف:

امام شافعیؒ کا مسلک تقریباً وہی ہے جو امام اعظمؒ کا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں امام اعظمؒ تعامل الناس کی صورت میں شرط کو جائز قرار دیتے ہیں وہیں امام شافعیؒ شرط کے متعارف ہونے کے باوجود اس کو ناجائز کہتے ہیں دلیل ان کی بھی وہی حدیث ہے جس کو امام اعظمؒ نے مستدل بنا یا ہے۔

علامہ وہب زحیلیؒ: ”حکم البيع و شرط عند غير الحنفية“ کے عنوان کے تحت ”أما تفصيل مذهب الشافعية فهو ما يأتي“ (مغنی المحتاج: ۳۱/۲، المحذب: ۲۶۵، ۲۶۸) کے حوالہ سے لکھتے ہیں: اذا شرط في البيع شرط، فإن كان شرطاً يقتضيه العقد كتسليم المبيع والرد بالعيب ونحوهما، صح العقد، لأن شرط المذكور مبين لما يقتضيه العقد. وكذا الك يكون العقد صحيحاً إن شرط شرطاً لا يقتضيه العقد، ولكن فيه مصلحة لأحد العاقدين كالخيار والأجل والرهن والضمان أو الكفالة؛ لأن شرع ورد بجوازه؛ ولأن الحاجة تدعو إليه. فإن شرط ما سواه من الشروط التي تنافي مقتضى البيع كان اشترط البائع على المشتري لا يبيع المبيع، أو ألا يهبه، أو أن يبيعه شيئاً أو يقرضه مبلغاً من المال أو اشترط أن يسكن الدار مدة، أو اشترط المشتري على البائع أن يخيط له الثوب الذي اشتراه منه، أو يحصد له الزرع الذي اشتراه منه، أو يحذو له قطعة الجلد التي اشتراها، ففي كل هذه الحالات يكون البيع باطلاً، لما روى عن النبي ﷺ أنه نهى عن بيع و شرط“ (الفقه الاسلامي وادلتج ص ۷۷۳ ج ۴)۔

(ج) امام مالک کا موقف:

امام مالکؒ کے یہاں اس مسئلہ میں تھوڑی سی تفصیل ہے وہ فرماتے ہیں کہ (۱) ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف بھی ہو اور منقض عقد بھی ہو تو بیع بھی باطل اور شرط بھی باطل ہو جاتی ہے (۲) ہر وہ شرط جو مقتضائے عقد کے خلاف تو

ہے، لیکن منقوض عقد نہیں ہے یا شرط مخل بالثمن (یعنی ایسی شرط جس سے ثمن مجہول ہوئی ہو) ہو تو بیع جائز ہو جائیگی اور شرط باطل ہو جائیگی (۳) اور اگر ایسی شرط ہے جو نہ مقتضائے عقد کے خلاف ہے، نہ ہی منقوض عقد ہے اور نہ ہی ایسی شرط ہے جس سے ثمن مجہول ہو جائے تو بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

علامہ وہبہ زحیلیؒ: البدایة المجتہد: ۲/۱۵۹، القوانین الفقہیة: ص ۲۵۹، الشرح الكبير للدردير (۶۵/۳) کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ”وقال المالکيہ: في المذهب تفصيل: فإن كان الشرط يقتضي منع المشتري من تصرف خاص وعام، فيبطل الشرط والبيع، مثل ألا يبيع المبيع أو لا يهبه، فلا يجوز؛ لأنه من الثنبا، وقد نهى النبي ﷺ عن الثنبا إلا أن تعلم، فإن اسقط هذا الشرط عن المشتري، جاز البيع. وإن اشترط البائع منفعة لنفسه كر كوب الدابة، أو سكنى الدار مدة معلومة يسيرة كشهر وقيل: سنة، جاز البيع والشرط، عملاً بحديث جابرؓ وإن اشترط البائع شرطاً يعود بخلل في الثمن، فيجوز البيع ويبطل الشرط مثل أن يشترط: ((إن لم يأت به بالثمن إلى ثلاثة أيام، فلا يبيع بينهما))، فإن قال البائع للمشتري: (متى جئتك بالثمن رددت إلى المبيع، وهو المعروف ببيع الوفاء عند الحنفية، لم يجز البيع“۔

(۲) امام احمد کا مسلک:

(۱) امام احمد فرماتے ہیں کہ بیع میں اگر ایک ایسی شرط لگائی جائے جو منقوض عقد نہ ہو، چاہے مقتضائے عقد کے خلاف ہو، تو ایک شرط لگانا جائز ہے، اس صورت میں شرط بھی جائز ہے اور بیع بھی جائز ہے (۲) لیکن اگر ایسی ہی دو شرطیں لگا دیں تو اس صورت میں شرطیں بھی باطل اور بیع بھی باطل ہے (۳) اور ایک شرط لگانے میں (یعنی اگر شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے) تو پھر وہی موقف ہے جو مالکیہ کے یہاں ہے۔

مستدل امام احمد ابن حنبلؒ:

مستدل ترمذی کی وہ روایت ہے جس کو خود بھی امام احمد نے روایت کیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے بیع میں دو شرطیں لگانے سے منع فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ دو شرطیں لگانا جائز ہے اور اگر ایک شرط لگائے تو اس میں تفصیل ہے۔

”عن عبد الله عمرؓ ان رسول الله ﷺ قال: لا يحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا ربح ما لم يضمن، ولا بيع ما ليس عندك“ (باب ما جاء في كراهية بيع ما ليس عندك، ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۳۳)۔

علامہ وہبہ زحیلیؒ: المغنی (۴/۲۲۴، ۲۲۶، ۲۳۵)، اور غایة المنتهی (۲/۲۳) کے حوالے سے لکھتے ہیں: ”وقال الحنابلة: يبطل البيع إذا كان فيه شرطان، ولا يبطله شرط واحد؛ لأن النبي ﷺ قال: ((لا

یحل سلف وبيع، ولا شرطان في بيع، ولا بيع ما ليس عندك)) رواه ابو داود والترمذی۔
 آگے علامہ ”والشروط عندهم أربعة اقسام“ کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:
 ”احدها: ما هو من مقتضى العقد كاشتراط التسليم، وخيار المجلس، والتقابض في الحال،
 فهذا وجوده كعدمه لا يفيد حكما معينا، ولا يؤثر في العقد۔

الثاني: ما تتعلق به مصلحة لأحد العاقدين أو لكليهما، كالأجل والخيار والرهن والضمين أي الكفيل، والشهادة على البيع، أو اشترط صفة مقصودة في المبيع، فهذا شرط جائز يلزم الوفاء به۔ قال ابن قدامة: ولا نعلم في صحة هذين القسمين خلافا۔

الثالث: ما ليس من مقتضى العقد، ولا من مصلحته، ولا ينافي مقتضاه، وهو نوعان:
 الف۔ اشترط منفعة للبائع في المبيع، فان كان شرطا واحدا فلا بأس به كاشتراط المشتري على البائع أن يخيط له الثوب المشتري، أو اشترط حمل حزمة الحطب إلى موضع معلوم، أو سكنى الدار مدة شهر مثلا، أو حملانه على الدابة إلى محل معين۔ والدليل على الجواز حديث جابر، وهو أن النبي ﷺ اشترى من جابر بغيرا، واشترط حملانه عليه إلى أهله في المدينة۔ (تيل الاوطار: ۱۷۸/۵)۔

ب۔ ان يشترط عقد في عقد، نحو أن يبيعه شيئا آخر، أو يشتري منه، أو يؤجره، أو يزوجه، أو يسلفه، أو يصرف له الثمن أو غيره، فهذا شرط فاسد يفسد به البيع، للنهي عن بيعتين في بيعة۔
 الرابع: اشترط ما ينافي مقتضى البيع، مثل أن يشترط ألا يبيع المبيع أو ألا يهبه، أو يشترط عليه أن يبيعه أو يقفه، ففي هذا روايتان عن احمد، أصحهما أن البيع صحيح، والشرط باطل۔

متقدمین فقہاء میں سے امام ابن شبرمہ اور امام ابن ابی لیلیٰ کا مسلک:
 (۳) علامہ ابن شبرمہ کا مسلک:

علامہ فرماتے ہیں کہ بیع کے اندر ایسی شرط لگانا جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو ایسی شرط کا لگانا بھی درست ہے اور بیع بھی درست ہے اور ایسی شرط لگانے سے بیع کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

علامہ ابن شبرمہ کا استدلال:

علامہ فرماتے ہیں کہ شرط بھی صحیح ہے اور بیع بھی صحیح ہے، دلیل میں حضرت جابرؓ کی روایت کو پیش کرتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے حضور ﷺ کو اونٹ فروخت کیا اور یہ شرط لگائی کہ میں مدینہ منورہ تک سواری کروں گا، چنانچہ حضرت جابرؓ مدینہ منورہ تک اس پر سواری کر کے آئے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ بیع بھی صحیح ہے اور شرط بھی صحیح ہے۔

اس حدیث شریف کو امام ترمذی نے اپنی جامع ترمذی میں ”باب ما جاء فی اشتراط ظهر الدابة عند البيع“ کے تحت ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے: ”عن جابر بن عبد الله أنه باع من النبي ﷺ بعيرا واشترط ظهره إلى أهله. هذا حديث صحيح قد روى من غير وجه عن جابر“ (ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۳۶، ۲۳۷)، نیز اسی روایت کو امام ابوداؤد نے ”باب فی شرط فی بیع“ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے: ”عن جابر بن عبد الله قال بعته یعنی بعیرہ من النبی ﷺ واشترطت حملانه إلى أهلی قال فی آخره: ترانی انما ما کستک لاذهب جملک خذ جملک و ثمنه فهما لک“ (ابوداؤد کتاب البیوع ج ۲ ص ۴۹۵)۔

حدیث کی پوری تفصیل یہ ہے: حضور ﷺ جب غزوہ بنی المصطلق سے واپس تشریف لارہے تھے تو حضرت جابرؓ بھی ساتھ تھے۔ حضرت جابرؓ کے پاس ایک سست اور اڑیل قسم کا اونٹ تھا جو چلتا نہیں تھا۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا تو آپ نے ایک ٹہنی توڑ کر اس اونٹ کو ماری تو وہ تیز دوڑنے لگا، اور سب قافلہ والوں سے آگے نکل گیا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے حضرت جابرؓ سے فرمایا کہ تمہارا اونٹ تو بہت تیز رفتار ہو گیا، تم یہ اونٹ مجھے بیچ دو۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا: یا رسول اللہ ﷺ آپ یہ اونٹ میری طرف سے ویسے ہی رکھ لیجئے، آپ نے فرمایا میں ویسے نہیں لوں گا، بلکہ قیمت سے لوں گا، حضرت جابرؓ نے عرض کیا کہ آپ اس کی کیا قیمت دیں گے؟ آپ نے فرمایا تم بتاؤ اس کی کیا قیمت لو گے؟ حضرت جابرؓ نے کہا کہ میں ایک اوقیہ چاندی کے عوض فروخت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ مزا احا جواب میں فرمایا کہ ایک اوقیہ چاندی میں تو بہت سارے اونٹ آجاتے ہیں۔ پھر آپ نے وہ اونٹ ان سے خریدا۔ حضرت جابرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس اور کوئی تو سواری نہیں ہے، اس لئے میں اس اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ طیبہ تک جاؤں گا۔ وہاں جا کر آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے اس کو منظور فرمایا (ترمذی)۔

اس واقعے سے علامہ ابن شبرمہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے حضور ﷺ کو اونٹ بیچا، لیکن ساتھ میں یہ شرط لگا دی مدینہ منورہ تک میں اس پر جاؤں گا اور وہاں آپ کے حوالے اونٹ کروں گا۔ اگرچہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف تھی، لیکن اس کے باوجود اللہ کے نبی ﷺ نے اس عقد کو بھی اور شرط کو بھی باقی رہنے دیا اس سے معلوم ہوا کہ مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانے سے بیع فاسد نہیں ہوتی ہے۔

۴- امام ابن ابی لیلیٰ کا مسلک:

امام فرماتے ہیں کہ اگر بیع میں کوئی ایسی شرط لگائی جائے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو تو وہ شرط فاسد ہو جائیگی بیع فاسد نہیں ہوگی۔

مستدل امام ابن ابی لیلیٰ:

ابن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت بریرہؓ کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم ان سے ولاء کی شرط لگا لو، لیکن

شرط لگانے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بعد میں ولاء آزاد کرنے والے ہی کو ملے گی۔ تو حضرت بریرہؓ والے مسئلہ میں اللہ کے نبی ﷺ نے بیع کو تو درست قرار دیا اور شرط کو فاسد قرار دیا۔

امام بخاریؒ نے یہ حدیث: ”باب اذا اشترط فی البیع شروطا لا تحل“ کے عنوان کے تحت بیان فرمائی ہے۔ ”ما كان من شرط ليس في كتاب الله فهو باطل، وان كان مائة شرط قضاء الله أحق وشرط الله أوثق، وانما الولاء لمن اعتق“ (بخاری ج ۲ ص ۲۹۰)۔

اسی روایت کو امام نسائیؒ نے اپنی سنن میں عبارت کے اختلاف کے ساتھ یہ عنوان دیکر ”البيع يكون فيه الشرط الفاسد، فيصح البيع ويبطل الشرط“ نقل فرمایا ہے۔ (نسائی شریف کتاب البیع ج ۲ ص ۱۹۸) اور امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں ”باب ما جاء في اشتراط الولاء والزجر عن ذالك“ کے عنوان سے نقل فرمایا ہے (ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۳۸)۔

اس پوری تفصیل کو مد نظر رکھتے ہوئے ”بیع الوفاء“ سے متعلق تین اقوال سامنے آرہے ہیں:

(۱) بیع الوفاء، عقد رہن ہے اور اس پر وہ تمام احکامات مرتب ہونگے جو عقد رہن ہی سے تعلق رکھتے ہیں کہ نہ تو مشتری شئی مرہون کو فروخت کر سکتا ہے نہ ہی اجرت پردے سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس قول کے قائل بقول عالمگیریؒ کے جہاں بخاری کے اکثر علماء تو تھے ہی خصوصاً ”علامہ سید ابوشجاع سمرقندیؒ اور علامہ قاضی علی سعیدیؒ ہیں۔ اور علامہ شامیؒ کے بقول ”علامہ امام حسن ماتریدیؒ“ بھی اسی پر فتویٰ دیتے تھے، بلکہ علامہ شامیؒ اس سلسلے میں علامہ ماتریدیؒ کا مشہور قول نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا تھا: ”المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذالك بين الناس، فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله“۔

نیز علامہ شامیؒ نے ”بحر“ کے حوالے سے یہ بات بھی نقل فرمائی ہے کہ ”بیع الوفاء“ کے معاملے میں ”جامع الفصولین“ کے قول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی فتویٰ دینا بہتر اور انسب ہے (شامی ج ۷ ص ۴۲۲، ۴۲۵)۔

(۲) بیع الوفاء ایسا عقد بیع ہے جس میں مشتری کی ملکیت صرف منافع تک محدود رہتی ہے، یعنی وہ بیع سے تو فائدہ اٹھا سکتا ہے، البتہ اس کو فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔ علامہ شامیؒ ”الاکراہ“ کے حوالے سے علامہ زبیلیؒ کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”قال الزبيلي في الاكراه: وعليه الفتوى۔ نیز علامہ شامیؒ نے ”نہر“ کے حوالے سے یہ بات بھی نقل فرمائی ہے کہ ”بیع الوفاء“ کے معاملے میں صاحب ”بحر“ کا کہنا ہے کہ ہمارے دیار میں اسی قول پر فتویٰ دیا جاتا تھا اور اسی قول پر عمل تھا جس کو علامہ زبیلیؒ نے راجح قرار دیا ہے۔ وفي ”النهر“: والعمل في ديارنا على ما رجحه الزبيلي (شامی ج ۷ ص ۴۲۵)۔

(۳) بیع الوفاء میں اگر الفاظ بیوع کا استعمال کیا گیا ہو تب تو ”عقد بیع“ ہے اور اگر الفاظ بیع کا استعمال نہ کیا گیا ہو

”تو عقد رہن“ شمار ہوگا، پھر ”عقد بیع“ ماننے کی صورت میں یا تو عقد ”عقد صحیح“ مانا جائے گا اگر عاقدین نے ”شرط فاسد“ کا تذکرہ بطور وعدہ بعد میں الگ سے کیا ہو۔ اور اگر ”شرط فاسد“ کا تذکرہ ”عین عقد“ میں یا اس سے پہلے کیا ہو تو ”بیع فاسد“ ہوگی۔

فقہ حنفی کی کتب میں یہ مسئلہ کہ اگر عاقدین ”عقد بیع“ اولاً بغیر کسی ”شرط فاسد“ کے کریں پھر دوسری مجلس میں ”شرط فاسد“ کا تذکرہ یا معاہدہ کر لیں تو اس سے پہلے والے عقد پر کوئی اثر نہیں پڑیگا وہ عقد درست مانا جائیگا اور شرط فاسد کا الحاق اس پہلے والے عقد سے نہیں کیا جائیگا۔ اگرچہ اس میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف بھی نقل کیا گیا ہے کہ امام صاحب ”شرط فاسد کو“ ملحق بالعقد الأول“ مانتے ہیں اور صاحبین ”ملحق بالعقد الأول“ نہیں کرتے ہیں۔

علامہ شامی نے ”مطلب فی البیع بشرط فاسد“ کے عنوان کے تحت اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے جامع الفصولین، بحر، ہدایہ، نہر اور خیر یہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس معاملہ میں صاحبین کا قول زیادہ راجح اور صحیح ہے، اس لئے کہ ”الشرط الفاسد یتحقق عند ابی حنیفہ“ والا قول امام صاحب کا دوسرا قول ہے اور ان کا اصل قول وہی ہے جو صاحبین کا قول ہے۔

”قلت وفي (الجامع الفصولین) ایضاً: لو ذكر البیع بلا شرط ثم ذكر الشرط علی وجه العقد جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد، اذا المواعید قد تكون لازمة فیجعل لازماً لحاجة الناس تبايعا بلا ذكر شرط الوفاء ثم شرطه یكون بیع الوفاء، اذا الشرط اللاحق یتحقق بأصل العقد عند ابی حنیفہ ۱۵۔ وبه افتی فی (الخیرية) وقال: فقد صرح علماؤنا بأنهما لو ذكر البیع بلا شرط، ثم ذكروا الشرط علی وجه العدة جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد“ (رد المحتار علی الدر المختار ج ۷ ص ۲۰۶، ۲۰۷)۔

علامہ وہبہ زحیلی نے بھی ”بدائع (۱۷۶/۵)، فتح القدر (۲۲۷/۵)“ کے حوالہ سے ”البیع بشرط فاسد“ کے باب میں ”ثالثاً: الشرط اللغو أو الباطل“ کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

”اما الشرط الفاسد: فقرانه بالعقد والحاقه به سواء عند ابی حنیفہ..... وقال صاحبان: لا یتحقق به ولا یفسد العقد ویلغو الشرط..... والأصح هو قول الصاحبین، كما ذكر ابن عابدين نقلاً عن جامع الفصولین“ (الفتاویٰ اسلامیة وادلتها ج ۵ ص ۳۳۷، ۳۳۸)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے ”بیع الوفاء“ سے متعلق کئی سوالات کے جوابات دیتے ہوئے استفتاء نمبر (۸۹۰۸، ۸۹۱۰) کے متعلق جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

الجواب حامداً ومصلياً:

اگر یہ شرطیں ایجاب و قبول سے پہلے کی گئی ہیں یا بیع کے ساتھ کی گئی ہیں تو ان دونوں کا ایک حکم ہے، اور اگر پہلے بیع

قطع کی گئی اور پھر شرطیں لگا دی گئیں، تب بھی امام اعظمؒ کے نزدیک ان شرطوں کا حال ایسا ہی ہے، جیسا کہ نفس بیع میں لگائے سے ہوتا ہے، اور صاحبین فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بیع قطعی ہوگی، اور یہ اقرار نامہ علیحدہ ہے، اس کا پورا کرنا دیانہ ضروری ہے، اگر پورا نہیں کرے گا تو وعدہ خلاف کہلائے گا، اس سے بیع پر کوئی اثر نہیں پڑیگا، علامہ شامی نے صاحبین کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

”لو ذکر الشرط بعد العقد يلتحق بالعقد عند أبي حنيفة ۵۱ در مختار۔“

علامہ شامی اسی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فیصیر بیع الوفاء کانہ شرط فی العقد ذکر الشرط وقد منافی البیع الفاسد ترجیح قولہما لعدم التحاق الشرط المتأخر عن العقد به ۵۱“ (شامی ج ۴ ص ۳۷۵) (بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ترتیب جدید ج ۲۲ ص ۲۷۹، ۲۸۰)۔ اس خلاصہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ”بیع الوفاء“ کا یہ مسئلہ پہلے سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے، جس سے یہی سمجھ میں آجاتا ہے کہ جن علماء اور فقہاء کرام نے اس کو ”عقد رہن، عقد بیع، عقد صحیح یا فاسد، کہا ہے وہ شرعی دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اشد ضرورت کی بنا پر ہی کہا ہوگا۔

احقر بھی یہی کہتا ہے کہ موجودہ وقت کی ضرورت اور سودی قرضوں سے بچنے کے لئے بیع الوفاء سے متعلق ائمہ کے تین اقوالوں میں ”علامہ زلیعیؒ“ کے قول پر عمل کیا جائے، تاکہ امت سودی قرضوں کے لینے سے بچ جائے۔ میرے خیال میں یہ صورت ”أهون البلیتیین“ ہے۔ جس سے ایک ضرورت مند اپنی ضرورت کو بھی پورا کر سکتا ہے اور شہی فروختہ کو بھی بازیاب کر سکتا ہے اور چونکہ علامہ شامیؒ نے اس قول کے متعلق کہا ہے ”قال الزلیعی فی ”الاکراہ“: وعلیہ الفتویٰ“ اور صاب ”نہر“ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ ”والعمل فی دیارنا ما رجحہ الزلیعی“۔ تو اس اعتبار سے بھی اس قول پر عمل کرنا انسب معلوم ہوتا ہے۔

علامہ زلیعیؒ کے اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ ”بیع الوفاء“ کا معاملہ ایسا عقد ہے جو عقد صحیح ہے جس میں مشتری کو تمام مالکانہ حقوق ملتے ہیں جو کہ شریعت نے اس کو دیئے ہیں وہ اس خرید کردہ شہی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کا عقد تقاضا کرتا ہے۔ اب وہ صرف ایک چیز اپنے اوپر یہ لازم کرتا ہے کہ اپنے آپ کو کسی عہد کا پابند بنا دیتا ہے جو کہ خود اس نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے، حالانکہ قضاء اس پر وہ لازم نہیں ہے کہ وہ کئے ہوئے وعدہ کو نبھائے، البتہ دیانہ وہ اپنے آپ کو پابند کر لیتا ہے اور دیانہ اس وعدہ کا پورا کرنا اس پر لازم ہو جاتا ہے بایں معنی کہ وہ خود صرف منافع کے حصول پر راضی ہو جاتا ہے اور ”البیع باخر“ سے اپنے آپ کو دستبردار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۶۴، باب الوعد الفصل الثانی) میں حضرت زید بن ارقمؓ کی حدیث کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے

فرمایا: ”جب کوئی آدمی اپنے کسی بھائی سے کوئی وعدہ کر لے اور اس کی نیت اس وعدہ کو پورا کرنے کی ہو پھر وہ اپنے وعدہ کو عذر کی وجہ سے پورا نہ کر پائے اور اسی طرح بائع کسی مانع کی وجہ سے رقم وقت میعاد تک ادا نہ کر سکے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔“

”عن زید بن ارقم ^{رضی اللہ عنہ} قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نيته أن يفئ له فلم يف (ای بعدن) ولم يجئ للميعاد (ای لمانع) فلا إثم عليه“ (مرقاۃ مع مشکوٰۃ، باب الوعد، الفصل الثانی ج ۴ ص ۶۴)۔

۱۔ لہذا معلوم ہوا کہ بیع الوفاء کا یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے اور حکماً بھی یہ بیع صحیح مانی جائیگی۔ اس لئے کہ بعض محققین کا قول یہ ہے کہ اگر ایسا معاملہ الفاظ بیوع کے ذریعے کیا گیا ہو تو اس وقت یہ عقد رہن شمار نہ ہوگا، بلکہ عقد بیع ہی شمار ہوگا، پھر الگ بات ہے کہ بعض صورتوں میں ”بیع فاسد“ کہا گیا اور بعض صورتوں میں ”بیع صحیح“ قرار دیا گیا، الغرض عقد بیع اس کو تسلیم کیا گیا اور جب حقیقتاً اس کو عقد بیع مانا گیا تو حکماً بدرجہ اولیٰ مانا جائیگا۔ اور علامہ زبیلیؒ کے قول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ معاملہ از اول تا آخر بیع صحیح ہے۔

(الف) بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے بلکہ فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، تو یہ محض ایک وعدہ ہے اس کا دیا نہ پورا کرنا لازم ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ”اوفوا اذا وعدتم“ وعدہ کرو تو اس کو پورا کرو۔ ”لا ایمان لمن لا عهد له“ اس شخص کا ایمان مکمل نہیں جو وعدہ کی پاسداری نہ کرے۔

(ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ زیادتی منفعت کا پایا جانا سود کی ایک قسم ہے جس سے شرعاً منع کیا گیا ہے اور یہاں اگر زائد رقم بائع لینا چاہے تو وہ مقصود فوت ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ عقد صحیح قرار دیا گیا اور وہ سودی قرض لینے سے بچانے کے لئے ایک ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا ہے اور جب مقصود فوت ہو جائے تو عقد صحت سے فساد کی طرف عود کریگا۔ اس لئے کہ تمام فقہاء کے یہاں یہ بات مسلم ہے کہ اگر عقد میں ”منفعة لاحد العاقدین“ پایا جائے تو اس سے عقد فاسد ہو جاتا ہے۔

(ج) خریدار جب تک بیع کو اپنے پاس رکھے تو وہ اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے سوائے بیچنے کے باقی اجرت پر دینا، عاریت پر دینا وغیرہ سب درست ہوگا، اس لئے کہ شرعاً یہ چیز اس کی ملکیت ہے اور مالک اپنی ملکیت میں جس طرح کا فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا سکتا ہے اس میں وہ کسی بھی چیز کا پابند نہیں ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ ”تصح اجارة أرض للزراعة“ (شامی زکریا ج ۷ ص ۳۹، کتاب الاجارة، باب ما يجوز من الاجارة)۔

(د) ”قیل: هو رهن“ جیسا کہ وہ علامہ امام حسن ماتریدیؒ کا قول ہے کہ اعتبار سے نہ تو دوسرے کو بیچا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی طرح کا نفع اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور ”قیل: بیع يفيد الانتفاع به“ جو کہ علامہ زبیلیؒ کا بھی قول ہے اور صاحب ”نہر“ نے اس کے متعلق لکھا ہے: ”والفتوى في زماننا ما رجحه الزيلعي“ بیچنے کے علاوہ ہر طرح کا نفع

اٹھانا درست ہوگا بیچنا جائز نہ ہوگا، اور جب بیچنا جائز نہ ہو تو مزید قیمت کا لینا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا اور عقد صحت سے فساد کی طرف عود کریگا۔ اس لئے کہ اس صورت میں یہ: ”کل قرض جر نفعاً فهو حرام“ کے زمرے میں داخل ہو جائے گا جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔

(۲) اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو اس صورت میں کسی بھی اعتبار سے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، اس لئے کہ شریعت نے شیئی مرہون سے نفع اٹھانے کو سود بتایا ہے جو کہ ممنوع ہے اور اس میں ائمہ کا اتفاق بھی ہے۔



بیع و فاء سے متعلق مسائل و احکام

قاضی وصی احمد قاسمی ☆

بیع و فاء کے نام مختلف ہیں:

دیگر بیوع لازمہ کے برعکس بیع و فاء کی نوعیت مختلف ہے، اس لیے فقہاء کرام نے اس بیع کے مختلف نام رکھے ہیں، عام طور پر فقہاء کرام نے اسے بیع و فاء کا نام دیا ہے کیوں کہ خریدار پر لازم ہوتا ہے کہ بائع سے کیے ہوئے وعدہ کو وہ پورا کرے۔ صاحب ”رد المحتار“ فرماتے ہیں:

”و وجه تسمیة بیع الوفا أن فیہ عهداً بالوفاء من المشتري، بأن یرد المبیع علی البائع حین رد الثمن“ (رد المحتار ۲/۲۴۶)۔

علامہ زیلعی نے لکھا ہے کہ بیع کی ایسی صورت کو قاہرہ میں ”بیع الامانة“ کہا جاتا ہے، گویا بیع خریدار کے پاس بطور امانت محفوظ ہے۔

”ثم اعلم أن بالقاهرة بیعاً یسمى بیع الأمانة كما ذكره الزیلعی“ (البحر الرائق ۸/۶۸)۔

علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے کہ اس خاص قسم کی بیع کو ”رهن معاد“ کہا جاتا ہے۔ ”ویسمى أيضاً الرهن المعاد كما فی الملتقط و سماه الفقهاء بیع الوفاء“ (البحر الرائق ج ۸/۶۸)۔

صاحب در مختار نے لکھا ہے کہ شوافع اس کو ”رهن معاد“ اور بعض ائمہ نے ”بیع الاطاعة“ نام رکھا ہے۔ ”و سماه الشافعية بالرهن المعاد و یسمى بمصر بیع الأمانة وبالشام بیع الإطاعة“ (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۲/۲۴۶)۔

صاحب ہدایہ نے اس بیع کا نام بیع جائز رکھا ہے، ممکن ہے کہ بیع جائز کہنے کی حکمت یہ ہو کہ سود سے بچنے کے لیے بیع صحیح پر مبنی قرار دیا جائے، تاکہ مشتری کے لیے بیع سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہو جائے۔ ”و بعض الفقهاء یسمیہ البیع الجائز ولعله مبنی علی أنه بیع صحیح لحاجة التخلص من الربا حتی یسوغ للمشتري أكل ربحة“ (رد المحتار ۲/۲۴۶)۔

بہر کیف فقہاء کرام نے گرچہ بیع وفا کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے، لیکن اتنی بات قدرے مشترک ہے کہ بیع کی یہ صورت ربا اور سود سے بچنے کی ایک شکل اور تدبیر ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے اپنی مشہور کتاب ”المغنی“ میں گرچہ بیع وفا کے نام کا ذکر نہیں کیا، مگر قرض سے انتفاع کے لیے بطور حیلہ خیاری کی ایک صورت ذکر کی ہے کہ اس میں شرط لگائی گئی ہو، تا کہ مشتری بیع سے غلہ اور نفع حاصل کرتا رہے اور جب ثمن اسے واپس کر دیا جائے تو وہ بھی بیع اسے لوٹا دے، یہی صورت بیع وفا کی ہے۔ بیع وفا کے سلسلہ میں فقہاء احناف کی کتابوں میں تو تفصیل کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے، مگر دیگر فقہاء شوافع و حنابلہ کی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ اس عقد کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔

بیع الوفا کی لغوی تعریف:

بیع کا لغوی معنی ”مبادلة المال بمال“ ہے، وفا غدر کی ضد ہے اس کا معنی وعدہ پورا کرنا اور بہترین اخلاق ہے۔
 ”وفی ، الوفاء: ضد الغدر، يقال: وفی بعهدہ و أوفی بمعنی معنی الوفاء فی اللغة الخلق الشریف العالی الرفیع من قولهم: وفی الشعر فهو وافٍ إذا زاد“ (لسان العرب ۶/۳۸۸)۔

بیع الوفا کی اصطلاحی تعریف:

بیع الوفاء کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب بائع خریدار کو ثمن لوٹا دے گا تو بیع اسے لوٹا دی جائے گی۔ ”و نقل أن صورته أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بألف على أني لو دفعت إليك ثمنك تدفع العين اليّ۔“ (الدر المختار علی ہاشم مجمع الانہر ۲/۲۵)۔

جامع الفصولین میں ابن قاضی ساوہ نے فرمایا کہ بیع الوفاء کی صورت یہ ہے کہ بیچنے والا خریدار سے کہے کہ میں تم سے یہ سامان اس شرط پر بیچ رہا ہوں کہ جب میں قیمت واپس کر دوں تو تم مجھے سامان میرے ہاتھ فروخت کر دینا۔ ”بیع الوفاء أن يقول: بعث منك على أن تبيعه مني متى جئت بالثمن“ (ہاشم جامع الفصولین ص ۲۳۴)۔

صاحب ”عنايہ“ نے بیع الوفاء کی دو صورتیں بیان کی ہیں، اول یہ کہ فروخت کنندہ خریدار سے یہ کہے کہ میرے ذمہ جو تمہارا قرض ہے میں نے اس قرض کے بدلہ اس بیع کو فروخت کیا بشرطیکہ جب میں قرض ادا کر دوں تو تم یہ بیع مجھے واپس کر دینا۔ ”و صورته أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بمالك على من الدين على أني متى قضيت الدين فهو لي۔“

اور دوسری شکل یہ ہے کہ فروخت کنندہ خریدار سے یوں کہے کہ میں نے تم سے اس عین کو اس شرط پر فروخت کیا کہ جب میں ثمن واپس کر دوں تو بیع مجھے واپس کر دی جائے گی۔ ”أ و يقول: بعث منك هذا العين بكذا على أني ان دفعت اليك ثمنك تدفع العين اليّ“ (عنايہ علی ہاشم فتح القدير ۹/۲۴۱)۔

بہر حال خواہ بائع اپنے ذمہ قرض کے بدلہ بیع کو فروخت کر کے قرض کی ادائیگی کے وقت بیع کو واپس کرنے کی شرط لگائے یا بلا قرض کے وہ اس بیع میں ثمن کی واپسی کی صورت میں بیع واپس کرنے کی شرط کا ذکر کرے، دونوں صورتیں بیع وفا کی ہیں۔

بیع الوفا کا حکم:

بیع الوفا کے سلسلہ میں فقہاء احناف کے مابین بھی آراء کا اختلاف ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے اس نوعیت کے بیع کو رہن قرار دیتے ہوئے کہا کہ رہن اور بیع وفا کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، بعض فقہاء نے اس کو بیع جائز کہتے ہوئے عرف زمانہ کا اعتبار کیا، اسی طرح بعض نے اس کو رہن اور بیع دونوں مانتے ہوئے اسی انداز کا حکم لگایا ہے۔ بہر کیف بیع وفا کے سلسلہ میں فقہاء کے اقوال باہم متعارض و متضاد نظر آتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، چنانچہ ”فتاویٰ بزازیہ“ میں تمام اقوال کو علامہ بزازی نے شرح و بسط کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، اسی طرح ابن قاضی ساہو نے بھی ”جامع الفصولین“ میں تمام اقوال اور وجوہات کا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے، لہذا کتب فقہ میں مذکورہ اقوال درج ذیل ہیں:

۱- بیع الوفا کے متعلق قول اول یہ ہے کہ وہ حقیقی طور پر رہن ہے، اس اعتبار سے اس پر رہن کے جملہ احکامات جاری ہوں گے، مثلاً مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا، بائع کی اجازت کے بغیر خریدار بیع سے انتفاع کا حقدار و مجاز نہیں ہوگا، اگر بلا اجازت منافع کو استعمال کرے یا بیع کو ضائع کر دے تو مشتری ضامن ہوگا، بیع کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں بائع کے ذمہ سے دین ساقط ہو جائے گا، اسی طرح بیع کی مالیت دین کی مقدار سے زیادہ ہو تو بیع کے ضائع ہونے کی صورت میں اس پر تاوان واجب نہیں ہوگا، جس طرح امانت کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں تاوان واجب نہیں ہوتا، اور جس وقت بائع قرض واپس کر دے گا تو بیع اسے لوٹادی جائے گی۔

”الأول: ما اختاره صاحب المنظومة أنه رهن حقيقة، فلا يملكه المشتري و لا ينتفع به، إلا بإذن البائع و يضمن ما أكل من نزهه و ما أتلف من الشجرة و يسقط الدين بهلاكه و لا يضمن ما زاد كالأمانة و يسترد عند قضاء الدين“ (البحر الرائق ۸/۶)۔

صاحب عنایہ نے تحریر فرمایا ہے کہ بعض لوگوں نے اس بیع کو متعاقدین کے قصد و ارادہ کا اعتبار کرتے ہوئے رہن قرار دیا ہے، گرچہ وہ لفظ بیع کا استعمال کرتے ہیں، مگر ان کا مقصد و ارادہ رہن ہے اور اعتبار معانی و مقاصد کا ہوتا ہے، الفاظ کا نہیں، اس لیے بیع و فارہن ہے اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، لہذا بائع کی اجازت کے بغیر مشتری کے لیے انتفاع درست نہیں ہوگا۔ ”و منهم من جعله رهناً لقصد المتعاقدين، لأنهما، وإن سمياً بيعاً لكن غرضهما الرهن و العبرة للمقاصد و المعانى۔“ (عنایہ علی تلمیح فتح القدير ۲/۲۳۸)۔

صاحب ”بزازیہ“ نے ”فتاویٰ بزازیہ“ میں بیع وفا کو بیع فاسد کے تحت ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ صاحب منظر نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ بیع وفادر حقیقت رہن ہے، امام سید ابوشجاع، امام علی السعدی، قاضی ابوالحسن ما تریدی، اور ابن قاضی سماوہ صاحب جامع الفصولین کی یہی رائے ہے۔ جامع الفصولین میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ وہ بیع جس کا رواج ہمارے زمانہ والوں نے ربا سے بچنے کے لیے ڈالا ہے اور اس کا نام بیع وفادر رکھا ہے وہ درحقیقت رہن ہے، مشتری اس کا مالک نہیں ہوگا اور بائع کی اجازت کے بغیر بیع سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ہے وغیرہ۔

”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للرباء و سموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا باذن مالكة و هو ضامن لما أكل من ثمره و أتلف من شجره و يسقط الدين بهلاكه و لا يضمن الزيادة و للبائع استردادده إذا قضى دينه - لا فرق بينه و بين الرهن في حكم من الأحكام؛ لأن المتعاقدين و إن سمياه البيع و لكن عرفهما الرهن و الاستيثاق بالدين“ (جامع الفصولین ۱/۲۳۵)۔

”حاشیہ جامع الفصولین“ میں ”جواہر الفتاویٰ“ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام محمد بن الفضل البخاری کی رائے بھی یہی ہے کہ بیع وفاء بیع باطل ہے اور حقیقت میں رہن ہے اور اس کا حکم وہی ہے جو رہن کا ہے۔

”اقول: وفي جواهر الفتاوى في الباب الأول: بيع الوفاء أن يقول: بع منك علي أن تبعه مني متى جئت بالثمن قال رضي الله عنه: هذا البيع باطل، و هو رهن، و حكمه حكم الرهن هكذا ذكر، و هو الصحيح، و ذكر الإمام محمد بن الفضل البخاري هكذا“ (حاشیہ جامع الفصولین ۱/۲۳۳)۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے مشائخ زمانہ نے عرف و رواج کی بناء پر اسی پر اتفاق کیا ہے، اس قول کی رو سے درج ذیل احکام جاری ہوں گے:

(الف) بائع کو تعمیراتی کام اور ٹیکس وغیرہ کی ادائیگی کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہوگا۔

(ب) بائع کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ ترک و فاکر کے بیع کو حتمی اور لازم قرار دے، نیز مشتری کو بائع سے ثمن کے مطالبہ کا حق ہوگا۔

(ج) اگر بیع مکان کی صورت میں ہو اور منہدم ہو جائے تو ثمن لوٹانے پر بائع کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح بیع اگر سامان کی شکل میں ہو اور وہ ہلاک ہو جائے تو یہ معاملہ مکمل ہو جائے گا اور متعاقدین میں سے کسی کو ایک دوسرے پر کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

علامہ زلیعی نے غالباً اسی قول کے متعلق ذکر کیا ہے کہ یہ بیع جائز ہے جو بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، یعنی مشتری

کے لیے بیع سے انقاع جائز ہے البتہ اسے بیع کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا حق نہیں ہے۔
 علامہ ابن نجیم نے ”المحرر“ میں یوں لکھا ہے: ”أنه بيع صحيح باتفاق مشايخ الزمان للعرف و ما يفعله
 البائع من التعمير و أداء الخراج فهو بطريق الرضاء لا الجبر كما لا يجبر على ترك الوفاء، و جعله
 باتا للمشتري المطالبة بالثمن فإن انهدم الدار لا يجبر البائع على رد الثمن، و كذا إذا كان المبيع
 عيناً هلك، فإنه يتم الأمر و لا سبيل لأحدهما على الآخر، و ذكر الزيلعي أن الفتوى على أنه بيع جائز
 مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير.“ (البحر الرائق ۸/۶)۔

علامہ بزازی نے اپنے فتاویٰ میں بیان کیا ہے کہ صاحب منظومہ علامہ نجم الدین عمر بن محمد نسفی نے فرمایا کہ بیع وفا
 کے صحیح ہونے پر مشائخ زمانہ کا اتفاق ہے، اس لیے کہ متعاقدین نے لفظ ”بیع“ کا تلفظ کیا ہے اور لفظ کے استعمال کے بغیر محض
 نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، جیسے کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کی نیت ہو کہ ایک سال کے بعد طلاق دے
 دے گا تو محض نیت کی وجہ سے ”متعہ“ نہیں ہوگا۔ اسی طرح علامہ نجم الدین نسفی سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے اپنی
 دوکان فروخت کر دی، اس کے بعد مشتری کا دعویٰ ہے کہ وہ بیع وفا ہے اور ثمن کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے، حالانکہ میں بیع بات
 کا دعویٰ دار ہوں، تو کیا ایسی صورت میں میرے لیے حلف کی گنجائش ہے، جبکہ میرا ارادہ یہ تھا کہ قیمت واپس کر کے بیع لوٹا لوں گا
 اور مشتری کا بھی ارادہ تھا کہ ثمن وصول کر کے بیع لوٹا دے گا، انہوں نے فرمایا کہ تمہاری بات معتبر ہے کیونکہ بیع وفا کا تذکرہ
 عقد سے پہلے ہوا تھا، عقد سے پہلے ہونے کی وجہ سے عقد بیع میں اس کا اعتبار نہیں ہوگا، عقد کے وقت بیع الوفا کا ذکر نہیں آیا
 ہے، اس لیے لفظ الوفاء کے ذکر کے بغیر اسے بیع وفا نہیں مانا جائے گا۔

”والقول الثاني : ما ذكر عن علامة سمر قند مولانا صاحب المنظومة أنه قال اتفق مشايخ
 الزمان على صحة هذا البيع، لأنهما تلفظا بلفظ البيع و لا عبرة بمجرد النية بلا لفظ، فإن من تزوج
 امرأة بنية أن يطلقها إذا مضى سنة لا يكون متعاً و جاء صاحب الحادثة إلى العلامة و قال: بعث حانوتي
 ثم ادعى المشتري أنه وفاء و طلب مني نقد الثمن و تسليم الحانوت و ادعى أنه باتاً، قال: القول
 لك، قال: كان من عزمي إن انقد و استرد و من عزمه الرد حين انقد فهل لي أن احلف، قال: كان
 ذلك قبل العقد باللفظ و لا عبرة بالسابق و حال العقد في القلب و لا عبرة بلا لفظ.“ (بزازی علی الهاشمی
 ۲۰۵/۲، جامع الفصولین ۲۳۵/۱)۔

صاحب ہدایہ امام برہان الدین علی المرغینانی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، جیسا شارح ہدایہ نے عنایہ میں تحریر فرمایا
 ہے کہ صاحب ہدایہ کے نزدیک مشائخ سمرقند کا قول مختار ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ”اور مشائخ سمرقند نے اس کو ”بیع جائز“

(الف) بیع کو مطلق رکھا جائے، مگر مشتری کسی کو وکیل بنا دے کہ اگر بائع اسے ثمن واپس کر دے گا تو وہ بیع کو فسخ کر دے گا۔

(ب) دوسری شکل یہ ہے کہ مشتری وعدہ کرے کہ جب اسے ثمن واپس کر دی جائے گی تو وہ بیع کو فسخ کر دے گا اور حالت یہ ہو کہ بیع کی مالیت میں غبن فاحش ہو ثمن بیع کی مالیت کے مساوی نہ ہو۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ مشتری اصل مال پر نفع رکھے، بائیں طور کہ اصل قیمت اگر ایک ہزار روپے ہے تو اس میں دوسرو روپے مزید بڑھا دے۔

مذکورہ تینوں صورتوں میں یہ عقد ”رہن“ کہلائے گا علاوہ ازیں دیگر تمام صورتوں میں بیع نافذ کا اعتبار کیا جائے گا، ائمہ خوارج نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

”والقول الخامس: ما اختاره ائمة خوارج ما إذا اطلق البيع لكن وكل المشتري وكيلا بفسخ البيع إذا حضر البائع الثمن أو عهدا على أنه إذا أوفاه فسخ البيع و الثمن لا يعادل المبيع، وفيه غبن فاحش أو وضع المشتري على أصل المال ربحاً، بأن وضع على مائة وعشرين ديناراً فوهن، وإن كان بلا وضع ربح بمثل الثمن أو بغبن يسير باتاً“ (بزاز علی الباش ۴۰۶، ۴۰۷ وکذا فی البحر)۔

۶- چھٹا قول یہ ہے کہ بیع و فسخ اور رہن دونوں سے مرکب ہے اور اس پر دونوں کے احکام جاری ہوں گے، مشتری کے حق میں وہ بیع صحیح ہے، لہذا وہ بیع سے فائدہ حاصل کرنے کا حقدار اور انتفاع کا مالک ہوگا اور بائع کے حق میں رہن ہے، اس لیے جب وہ ثمن واپس کر دے گا تو مشتری سے بیع کے مطالبہ کا اس کو حق ہوگا، رہن ہونے کا ثمرہ یہ ظاہر ہوگا کہ مشتری بیع کو فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوگا اور بیع ہونے کا فائدہ یہ ہوگا بائع نفع حاصل کرنے سے مشتری کو روک نہیں سکتا ہے۔ فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے کہ کتب فقہ میں اس طرح کے مرکب عقود کی کئی مثالیں ملتی ہیں، جن میں دو طرح کے احکام جاری ہوتے ہیں، جیسے مرض الوفات میں کیا ہوا ہبہ اور ہبہ بشرط العوض، امام فخر الزاہد نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، عقد بیع کا حکم لوگوں کی حاجت اور سود (ربا) سے بچنے کے لیے لگایا گیا، کیونکہ بیع کے لوگ دین اور طویل اجارہ کے عادی ہیں حالانکہ انگور کے بیلوں میں ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ اور بخاری کے لوگ لمبے اجارہ کے عادی ہیں جبکہ درختوں میں یہ معاملہ ناممکن ہے، اس لیے وہ لوگ بیع و فسخ کی طرف مجبور ہوئے۔

”السادس: ما اختاره الإمام الزاهد أن الشرط إذا لم يذكر في البيع كان بيعاً صحيحاً في حق المشتري حتى ملك الإنزال ورهنماً في حق البائع فلم يملك المشتري تحويل يده و ملك الي غيره واجبر على الرضا إذا حضر الدين، لأنه كزرافة مركب من البيع و الرهن ككثير من الأحكام له

حکمان کالہبہ حال المرض و بشرط العوض؛ فجعلناه كذلك لحاجة الناس إليه فرارا من الرباء فبلخ اعتاد والدين و الإجارة وهي لا تصح في الكروم، و أهل بخارى اعتاد و الإجارة الطويلة و لا تمكن في الأشجار فاضطروا إلى بيعها و فاء و ما ضاق على الناس أمر الال اتسع حكمه“ (البحر الرائق ۹/۶)۔

علامہ بزازی فرماتے ہیں کہ اگر متعاقدین باہم قول قرار کر لیں کہ ثمن کی واپسی کے وقت بیع لوٹادی جائے گی تو ایسی صورت میں صاحب ہدایہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ مشتری بیع کا مالک ہوگا، صدر الشہید تاج الاسلام کی بھی یہی رائے ہے، لہذا اگر مشتری بیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے تو بیع ثانی صحیح ہے، کیونکہ بائع اول نے اپنی رضامندی سے بیع مشتری کے سپرد کیا ہے، البتہ علامہ علاء الدین المعروف بدر فرماتے ہیں کہ مشتری انتفاع کا مالک ہوگا، مگر اسے فروخت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

”بزازیہ“ میں یوں ہے: ”و اختار الصدر الشهيد تاج الاسلام والامام المرغيناني أن البيع بشرط الرد عند نقد الثمن أن المشتري يملكه، وقال الإمام علاء الدين بدر: يملكه انتفاعاً، فإن باعه المشتري من غيره أجابوا سوى علاء الدين بدر بصحة البيع الثاني؛ لأنه سلمه البائع الأول إلى المشتري برضاہ“ (بزازیہ ص ۴۰۷)۔

۷۔ ساتواں قول یہ ہے کہ بیع الوفاق صحیح نہیں ہے اور مشتری بالوفاء کے لیے بیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، امام علاء الدین بدر کا فتویٰ یہی ہے۔

”والقول السابع: أجاب علاء الدين بدر أنه لا يصح“ (بزازیہ ص ۴۰۹)۔

۸۔ آٹھواں قول یہ ہے کہ بیع وفاتین چیزوں سے مرکب ہے، یعنی بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن تینوں کے احکام جاری ہوں گے۔

(الف) بعض احکام کے اعتبار سے بیع صحیح ہے، اس لیے کہ مشتری کو اس سے منافع حاصل کرنا جائز ہوگا۔

(ب) بعض احکام میں بیع فاسد ہے، لہذا دونوں فریق فسخ عقد کے مالک ہوں گے۔

(ج) بعض احکام کے حق میں رہن ہے، اس لیے کہ مشتری کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے شخص کو فروخت کر دے

یارہن رکھ دے۔

”القول الثامن: الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما

الفسخ و صحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال و منافع المبيع و رهن في حق البعض حتى لا

يملك المشتري بيعه من آخر و لا رهنه“ (البحر ۹/۶)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ بعض محققین کا جامع قول یہ ہے کہ بیع وفا بعض احکام کے حق میں بیع فاسد اور بعض احکام کے حق میں بیع صحیح اور رہن ہے، مگر بحر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ مناسب ہے کہ جامع قول سے عدول نہ کیا جائے، وہ یہ ہے جس قول کو علامہ زیلیعی نے ترجیح دی ہے، ہمارے دیار میں عمل اسی قول پر ہے۔

”قال فی البحر: وینبغی أن لا يعدل عن القول الجامع فی النهر العمل فی دیارنا علی ما رجحه الزیلیعی“ (رد المحتار ۴/۲۴۷-۲۴۸)۔

گو یا علامہ شامی کا رجحان یہ ہے کہ قول ثانی جسکو علامہ زیلیعی نے ترجیح دی وہی قول جامع ہے اور اس سے عدول کرنا مناسب ہے۔

حاصل بحث: اصولی طور پر تو بیع وفاء درست نہیں ہے، بلکہ وہ رہن کی صورت ہے، جیسا کہ فقہاء احناف کی ایک جماعت کی رائے ہے، مگر سود سے احتراز اور عوام الناس میں عرف عام ہو جانے کی وجہ سے مشائخ متاخرین نے بیع الوفاء کو جائز و درست قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ بیع وفا بعض احکام کے اعتبار سے مفید ہے، بایں طور کہ مشتری کے لیے نفع حاصل کرنا درست ہوگا، البتہ مشتری اس شئی کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا، پھر غور طلب امر یہ ہے کہ ہر دور میں فقہاء کرام نے عرف اور حاجت کے پیش نظر سود سے بچنے کی راہ ہموار کی ہے اور بیشتر مسائل کو عرف و حاجت کی وجہ سے جائز و درست قرار دیا ہے، شارح ہدایہ امام اکمل الدین محمد الباقری نے بھی ”عنایہ“ میں لکھا ہے کہ صاحب ”ہدایہ“ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور ”البیع الجائز المعتمد“ سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

شریعت اسلامیہ میں چند شرائط کے ساتھ عرف کا معتبر ہونا معروف ہے، جیسا کہ بیع استصناع (آرڈر دے کر کوئی چیز بنوانا) کے بارے میں عرف عام کا اعتبار کیا گیا ہے، کیونکہ بیع استصناع بنیادی طور پر معدوم کی بیع ہے اور حضور ﷺ نے اس طرح کے عقد سے منع فرمایا ہے ”نہی النبی ﷺ عن بیع ما لیس عندک، لیکن استصناع کے باب میں عہد نبوی سے لے کر تا ہنوز اس کے جواز کا تعامل جاری ہے، اس لیے اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔

عرف کی دو قسمیں ہیں ۱۔ عرف عام، ۲۔ عرف خاص:

۱۔ عرف عام وہ ہے جس کا تعامل عہد صحابہ سے موجودہ عہد تک ہو اور مجتہدین نے عرف و عادت پر محمول کرتے ہوئے اس پر عمل کیا ہو خواہ وہ قیاس کے خلاف ہو، بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔

۲۔ عرف خاص وہ ہے جس کا تعامل و رواج بعض شہر کے لوگوں کے درمیان ہو۔

عرف کے صحیح ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ عرف غالب ہو، عرف عام ہو اور اس میں بعض فقہاء کا اختلاف ہے، عرف کتاب و سنت کے متضاد نہ ہو، انشاءً تصرف کے وقت عرف قائم ہو، عرف کے خلاف کوئی صراحت موجود نہ ہو اور عرف

کی وجہ سے کوئی چیز لازم ہوتی ہو۔

احمد بن علی نے اپنی کتاب ”العرف“ میں ان شرائط کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

أولاً: ”أن يكون العرف مطرداً أو غالباً“۔

ثانياً: ”أن يكون العرف عاماً و نازع فيه بعضهم“۔

ثالثاً: ”أن لا يخالف العرف نصاً شرعياً من كتاب أو سنة“۔

رابعاً: ”أن يكون العرف موجوداً أو قائماً عند انشاء التصرف“۔

خامساً: ”أن لا يعارضه تصريح بخلافه“

سادساً: ”أن يكون العرف ملزماً“۔

علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں کہ عرف عام اگر مکمل طور پر نص کے مخالف ہو جس سے نص شرعی کا ترک ہونا لازم آتا ہو تو اس عرف کے رد ہونے پر کوئی شبہ نہیں ہے، جیسے سود، شراب وغیرہ۔ اور اگر بالکل نص کے مخالف نہ ہو اس طور پر کہ دلیل عام ہو اور اس کے بعض افراد سے عرف متصادم ہو تو ایسی صورت میں عرف کا اعتبار کیا جائے۔

”إذا خالف العرف الدليل الشرعي، فإن خالف من كل وجه، بأن لزم منه ترك النص فلا شك في رده كتعارف الناس كثيراً من المحرمات من الرباء و شرب الخمر و لبس الحرير و الذهب وغير ذلك مما ورد تحريمه نصاً وإن لم يخالفه من كل وجه، بأن ورد الدليل عاماً و العرف خالفه في بعض أفراده أو كان الدليل قائماً“، فإن العرف معتبر“ (رسائل ابن عابدین ۱۱۶/۲)۔

عرف عام کے متعلق فقہاء کا اتفاق ہے کہ وہ مخصوص نص ہے، مگر عرف خاص کے مخصوص نص ہونے کے باب میں

فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ عرف عام بلاشبہ مخصوص نص بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسکی وجہ سے قیاس متروک ہو جاتا ہے، جیسا کہ استصناع، دخول حمام اور مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پینے کے مسئلہ میں فقہاء نے صراحت کی ہے، اور اگر عرف خاص ہو تو اسکا اعتبار نہیں ہوگا، جیسا کہ ”الاشباه والنظائر“ میں مذکور ہے، لیکن مشائخ کی ایک بڑی جماعت نے عرف خاص کے معتبر ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

فان العرف إن كان عاماً فإن العرف العام يصلح مخصصاً كما مر عن التحرير و يترك به

القياس كما صرحوا به في مسألة الاستصناع و دخول الحمام و الشرب من السقاء (رسائل ابن عابدین

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بہت سے مشائخ نے عرف خاص کے معتبر ہونے کا فتویٰ دیا ہے، جیسے پگڑی پردینے کا مسئلہ جو کہ عرف خاص تھا، کیونکہ پگڑی کا رواج قاہرہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں نہیں تھا، اسی طرح مال کے عوض وظائف سے دستبردار ہونے کا مسئلہ اور مکان کی فروختگی میں مکان کی سیڑھیوں کا مکان کی بیچ میں داخل ہونے کا مسئلہ، یہ سب عرف خاص کی قبیل سے ہیں، لیکن فقہاء کرام نے اس کے معتبر اور جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ یہ سب نص عام کے متضاد ہیں۔

چنانچہ اپنی مشہور و معروف کتاب ”الاشاہ والنظار“ میں لکھتے ہیں:

”والحاصل أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، ولكن افتى كثير من المشايخ باعتباره ينبغي أن يفتى بأن ما يقع في بعض أسواق القاهرة من خلوات الحوانيت لازم و يسير الخلو في الحانوت حقاله، فلا يملك صاحب الحانوت اخراجه منها ولا اجارتها لغيره و لو كانت وقفا، وقد وقع في حوانيت الجمولون بالغورية ان السلطان الغوري لما بناها اسكنها للتجار بالخلو وجعل لكل حانوت قدراً أخذه منه، و كتب ذلك بمكتوب الوقف. و كذا أقول على اعتباره العرف الخاص، تدرتعارفوا الفقهاء بالقاهرة النزول عن الوظائف بمال يعطى لصاحبها وتعارفوا ذلك فينبغي الجواز“ (الاشاہ والنظار ۸/۱۲۷)۔

مذکورہ عبارتوں سے معلوم ہوا کہ بعض فقہاء نے عرف خاص کا بھی اعتبار کیا ہے اور موجودہ دور میں جبکہ سودی نظام معیشت مکمل شباب پر ہے ایسی صورت میں امت کو سود جیسی لعنت سے بچانے کی یہی شکل ہے کہ عرف کا اعتبار کرتے ہوئے لوگوں کی حاجت و ضرورت کے پیش نظر بیع الوفاء کو جائز قرار دیا جائے۔

علامہ تھانویؒ نے بھی ضرورت شدیدہ کی بنیاد پر بیع وفاء کے جواز کی طرف اپنے رجحان کا اظہار فرمایا ہے۔ بیع وفاء سے متعلق لکھتے ہیں: ”لیکن بعض متأخرین نے اجازت دی ہے پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متأخرین پر عمل کرے اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں“ (امداد الفتاویٰ ۳/۱۰۸)۔

مذکورہ مباحث شرعیہ کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ بیع وفاء بعض احکام میں مفید ہے اور بعض احکام کے اعتبار سے غیر مفید، لہذا مشتری پر لازم و ضروری ہے کہ وہ خرید کردہ شے کو دوبارہ فروخت کنندہ سے بیچے، مالک اول سے سابق ادا کردہ قیمت سے زیادہ قیمت کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا۔

اسی طرح خریدار کو بیع سے فائدہ اٹھانے کا مکمل حق حاصل ہوگا، البتہ مشتری کو یہ حق و اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ وہ بیع کسی دوسرے شخص کو فروخت کرے، کیونکہ مالک اول کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے بیچنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی مناسبت سے کم کرایہ طے ہوتا ہے، اس کی دو شکلیں ہیں اول یہ ہے کہ دکان یا مکان کا کرایہ تو معمول سے کم نہیں ہوتا، مگر کرایہ دار سے بطور ضمانت کے خطیر رقم حاصل کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ جب کرایہ دار مکان یا دکان خالی کر دیتا ہے تو حسب معاہدہ مالک مکان و دکان وصول کردہ رقم کرایہ دار کو ادا کر کے بری الذمہ ہو جاتا ہے اس صورت میں خطیر رقم کی حیثیت صرف زرامانت کی ہوتی ہے وہ قرض یا رہن نہیں ہے، لہذا مالک کے لئے مذکورہ رقم سے بلا اجازت انتفاع کرنا درست نہیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مکان یا دکان کے عوض ایک خطیر رقم وصول کی جاتی ہے جس کو پگڑی کہا جاتا ہے اور مکان و دکان کا کرایہ معمول کے کرایہ سے بہت کم وصول کیا جاتا ہے، اس صورت میں مالک مکان و دکان اپنے حق انتفاع کو کرایہ دار سے فروخت کر دیتا ہے، البتہ مکان و دکان کو اپنی ملکیت میں رکھتا ہے، گویا مالک کرایہ دار کو قبضہ اور حق انتفاع کا اختیار دے دیتا ہے، لہذا وصول کردہ خطیر رقم کی حیثیت زر ثمن کی ہوتی ہے اور ماہانہ معمولی کرایہ قرض سے انتفاع کی وجہ سے نہیں، بلکہ حق ملک کے بقاء و دوام کے عوض کی وجہ سے ہے۔

اس رو سے کرایہ کی رقم کو قرض سے انتفاع قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔



بیع الوفاء کی حقیقت اور حکم

مولانا محمد یاسر قاسمی ☆

بیع الوفاء کا حکم ثبوت ملک ہے (در مختار رد المحتار ۱۶/۷) اور ملکیت کا تقاضا یہ ہے کہ مالک اس میں خصوصی طور پر تصرف کر سکے۔

”فقہی رد المحتار: لأن الملك ما من شأنه أن يتصرف فيه بوصف الاختصاص“ (رد المختار علی الدر ۱۰/۷)۔

نیز ایجاب و قبول کے بعد بیع لازم اور تام ہو جاتی ہے، بیع حتمی طور پر خریدار کی ملکیت میں آ جاتی ہے، الا یہ کہ بیع میں خیار کی شرط پائی جائے تو حکم بیع موقوف ہو جاتا ہے: ”فقہی الدر المختار: وإذا وجدنا لزوم البيع بلا خيار العيب أو رؤية“ (رد المختار علی الدر ۳۷/۷) نفاذ بیع کے بعد مشتری کو بیع میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو جاتا ہے۔

بیع وفاء میں بھی بظاہر بائع اور مشتری لفظ بیع کا اطلاق کرتے ہیں جس کا مقتضی یہ ہے کہ بائع ثمن کا، اور مشتری بیع کا یقینی طور پر مالک ہو جائے اور ہر ایک کو اس میں تصرف کرنے کا اختیار کلی مل جائے، مگر بیع وفاء میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بائع کہتا ہے کہ جب میں تجھے ثمن ادا کروں، تو تم بیع واپس کر دینا اس اثناء میں مشتری کو انتفاع کا تو حق حاصل ہوتا ہے، جیسے بیع سے انتفاع کا حق مشتری کو حاصل ہوتا ہے، مگر مشتری اگر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے، یا ہبہ کرنا چاہے، یا رہن پر رکھنا چاہے، یا اجارہ پر دینا چاہے وغیرہ تو خریدار کو اس کا اختیار نہیں رہتا، اور اس اعتبار سے تو بیع رہن کے حکم میں ہے، جب اسے ثمن مل جائے بیع کو واپس کرنا لازم ہوگا۔

بیع وفاء کے مختلف نام اور ان کی وجہ:

بیع الوفاء اپنی صورت کے حوالہ سے مختلف معاملات سے مشابہت کی حامل ہے، اس لئے فقہاء مختلف نام سے اسے موسوم کرتے ہیں، عام طور پر ”فقہاء“ بیع الوفاء کا نام دیتے ہیں، اس لئے کہ اس میں مشتری یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ جب بائع ثمن واپس کرے گا تو وہ بیع واپس کر دے گا، بعض فقہاء نے اس کا نام ”بیع جائز“ رکھا ہے، جیسے ”صاحب ہدایہ“ شاید اس کی

وجہ یہ ہے کہ سود سے بچنے کی ضرورت سے یہ بیع صحیح ہے، یہاں تک کہ مشتری کے لئے اس کے منافع کا استعمال جائز ہے۔ بعض فقہاء نے اس کو ”بیع معاملہ“ کے نام کے ساتھ موسوم کیا ہے، اس نام کی وجہ یہ ہے کہ معاملہ سے مراد دین کا نفع ہے، قرض دہندہ اس لئے اس کو خریدتا ہے، تاکہ اپنے دین کے مقابلہ میں اس سے فائدہ اٹھاسکے، شافعیہ اسے ”رہن معاد“ کہتے ہیں، جبکہ مصر میں اسے بیع الامانہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مشتری کے پاس بیع بطور رہن کے امانت ہوتی ہے، ملک شام میں اس کا نام ”بیع الاطاعتہ“ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض دہندہ دین کے بدلہ میں مدیون کو مثلاً اپنا گھر بیچنے کا حکم دیتا ہے تو مدیون اس کی اطاعت کرتا ہے (درمختار و ردالمختار ۷/۵۴۵)۔

بیع الوفاء کی تعریف:

بیع الوفاء کی صورت یہ ہے کہ کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب بائع ثمن واپس کر دے تو مشتری بیع واپس کر دے (درمختار و ردالمختار ۷/۵۴۵)۔

علامہ ابن عابدینؒ نے ”ردالمختار“ میں نقل کیا ہے کہ کفایہ میں محیط کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ بیع وفاء یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تیرے ہاتھ یہ سامان اس دین کے بدلہ میں فروخت کیا جو تیرا میرے ذمہ ہے، اس شرط کے ساتھ کہ جب میں دین ادا کر دوں گا تو یہ سامان تم کو واپس کرنا ہوگا (ردالمختار علی الدرر ۷/۵۴۵)۔

دونوں تعریفوں سے یہ مستفاد ہوا کہ بیع وفاء میں کبھی تو بائع پہلے سے مدیون ہوتا ہے، اور کبھی پہلے سے مدیون نہیں ہوتا، نیز اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ بائع یہ کہے کہ ”اس شرط پر کہ تم مجھے عین کو واپس کر دینا“ یا ”تم عین میرے ہاتھ فروخت کر دینا“ (ردالمختار علی الدرر ۷/۵۴۵)۔

بیع الوفاء کا حکم:

بیع الوفاء کے سلسلہ میں فقہاء کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ ”البحر الرائق“ میں باب خیار الشرط میں علامہ ابن نجیمؒ نے آٹھ اقوال ذکر کئے ہیں جو درحقیقت علامہ بزازی کے بیان کردہ نو اقوال کی تلخیص ہے، جامع الفصولین میں قاضی ابن ساوہ نے ایک مستقل فصل اس کے لئے قائم کیا ہے، یعنی اٹھارویں فصل، جبکہ فصول عمادی میں انیسویں فصل بیع الوفاء کے مسائل واحکام اور شروط واقسام کے تحت مذکور ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے ”البحر الرائق“ میں ذکر کیا ہے کہ فقہاء کے بیع الوفاء کے سلسلہ میں آٹھ اقوال ہیں جو بزازی میں

مذکور ہیں:

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء درحقیقت رہن ہے، اس پر درج ذیل احکام مرتب ہوں گے:

(الف) ”فلا یملکہ المشتري“ (مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا)۔

(ب) ”ولایتفیع بہ إلا بإذن البائع“ (بائع کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع بھی نہیں کر سکتا)۔
 (ج) ”ویضمن ما أكل من نزلہ وما أتلف من الشجرة“ (اگر مشتری اس کے منافع کو کھاجائے یا درخت کو تلف کر دے تو اس کا ضامن ہوگا)۔

(د) ”ویسقط الدين بهلاکة“ (بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا)۔
 (ه) ”ولایضمن ما زاد کالأمانة“ (اگر بیع ہلاک ہو جائے جبکہ اس کی مالیت مقدار دین سے زائد ہو تو زائد کا تاوان اس پر واجب نہیں ہوگا جیسے امانت کا تاوان واجب نہیں ہوتا)۔

(و) ”ویسترد عند قضاء الدين“ (بائع دین ادا کرتے وقت بیع کو واپس لے لیگا) (الجر الرائق ۱۱۶)۔
 بیع الوفاء کو رہن قرار دینے پر مرتب ہونے والے احکام درحقیقت رہن کے احکام ہیں، رہن کے احکام سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں، چنانچہ مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا، اس لئے کہ مرتہن شی مرہون کا مالک نہیں ہوتا، ”ففی البدائع: وکون المرتهن أحق بحبس المرهون علی سبیل اللزوم إلی وقت الفکاک“۔
 مشتری بائع کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع نہیں کر سکتا، جیسے مرتہن راہن کی اجازت کے بغیر شی مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، ”ففی الدر المختار: لا انتفاع به مطلقا لباستخدام ولاسکنی ولالبس ولا إجارة ولا إعارة سواء کان من مرتهن أو راهن إلا بإذن کل للآخر وقیل: لایحل للمرتهن؛ لأنه ربا وقیل: إن شرطه کان ربا وإلا لا“۔

علامہ ابن عابدین شامی: ”لایحل للمرتهن الخ“ کے تحت ارقام فرماتے ہیں کہ: منخ میں بیان کیا گیا ہے کہ عبد اللہ محمد بن اسلم سمرقندی سے مروی ہے، جن کا شمار سمرقند کے بڑے علماء میں ہوتا ہے کہ مرتہن کے لئے کسی بھی طریقہ پر اس سے انتفاع حلال نہیں ہے، اگرچہ راہن اس کو اجازت دیدے، اس لئے کہ اس نے سود کی اجازت دیا ہے، کیونکہ مرتہن اس سے مکمل دین وصول کرے گا، تو منفعہ اس کے لئے بلا عوض رہ جائے گی اور یہ ربا ہے جس کی حرمت بہت شدید ہے۔

صاحب منخ نے فرمایا کہ یہ عام معتبرات کے خلاف ہے، اس لئے کہ ان میں یہ مذکور ہے کہ اجازت کے ساتھ فائدہ اٹھانا حلال ہے الا یہ کہ اس کو دیانت پر محمول کیا جائے اور معتبرات کی بیان کردہ حلت کو قضاء پر محمول کیا جائے، پھر میں نے ”جوہر الفتاویٰ“ میں دیکھا کہ جب نفع کی شرط لگا دی جائے تو یہ ایسا قرض بن جائے گا، جس میں قرض دہندہ کا فائدہ ہے اور یہ سود ہے، ورنہ تو کوئی حرج نہیں ہے، صاحب منخ کے فرزند شیخ صالح نے اس کی توثیق کی ہے، علامہ جوہی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا کہ ربوی معاملہ میں دیانت اور قضاء کے اعتبار سے کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا، علاوہ ازیں جب یہ بیان کر دیا گیا کہ فتویٰ اباحت پر ہے تو تطبیق کی کوئی حاجت نہیں رہ جاتی، علامہ شامی نے فرمایا کہ جوہر کی عبارت تطبیق کی صلاحیت

رکھتی ہے، فقہاء نے اس کی نظیر یہ بیان کی ہے کہ اگر قرض لینے والے نے قرض دہندہ کو ہدیہ شرط کے ساتھ دیا تو مکروہ ہے، ورنہ نہیں۔

آگے علامہ شامی ارتقام فرماتے ہیں کہ علامہ طحاوی نے طحاوی علی الدر میں بیان فرمایا ہے کہ عام طور پر لوگ قرض دے کر نفع اٹھانے کی نیت رکھتے ہیں، اگر یہ نیت نہ ہو تو درہم ہی نہ دیں اور یہ نفع بدرجہ شرط کے ہے، اس لئے کہ معروف مشروط کے درجہ میں ہوتا ہے اور یہ وہ پہلو ہے جو اجازت کے باوجود مال رہن سے انتفاع کے ناجائز ہونے کو متعین کرتا ہے (رد المحتار علی الدر ۱۰/۸۳)۔

اس عبارت سے علامہ شامی کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ اجازت کے باوجود شی مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، جو کہ مذکورہ بالا حکم بیع الوفاء کے خلاف ہے۔

تیسرا حکم یہ بیان کیا گیا تھا کہ اگر مشتری بیع کے منافع کو کھا جائے یا درخت کو تلف کر دے تو اس کا ضامن ہوگا، جیسے مرتہن شی مرہون کا ضامن ہوتا ہے: ”ففي البدائع: وكذا ليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون حتى لو كان الرهن عبداً ليس له أن يستخدمه، وإن كان دابة ليس له أن يركبها، وإن كان ثوباً ليس له أن يلبسه، وإن كان داراً ليس له أن يسكنها، وإن كان مصحفاً ليس له أن يقرأ فيه، لأن عقد الرهن يفيد ملك الحبس لاملِك الانتفاع، فإن انتفع به فهلك في حال الاستعمال يضمن كل قيمته، لأنه صار غاصباً“ (۲۱۲/۵)۔

چوتھا حکم یہ تھا کہ بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا، جیسے راہن سے ساقط ہو جاتا ہے۔ ”ففي رد المحتار: قال في الخلاصة: وحكم الرهن أنه لو هلك في يد المرتهن أو العدل ينظر إلى قيمته يوم القبض، وإلى الدين، فإن كانت قيمته مثل الدين سقط الدين بهلاكه“ (رد المحتار ۱۰/۸۰)۔

پانچواں حکم یہ تھا کہ اگر بیع ہلاک ہو جائے جبکہ اس کی مالیت مقدار دین سے زیادہ ہو تو زائد کا تاوان اس پر واجب نہیں ہوگا، جیسے امانت کا تاوان واجب نہیں ہوتا، یہی حکم راہن کا بھی ہے۔

چنانچہ ”در مختار“ میں ہے: ”فإن هلك وسأوت قيمة الدين صار مستوفياً دينه حكماً أو زادت كان الفضل أمانة فيضمن بالتعدى أو نقصت سقط بقدره ورجع المرتهن بالفضل، لأن الاستيفاء بقدر المالبة“۔ علامہ شامی کفایہ کے حوالہ سے اس کی مثال دیتے ہیں کہ اگر کپڑا رہن پر رکھا دس درہم کے عوض جس کی قیمت دس درہم ہے تو مرتہن کے پاس اگر کپڑا ہلاک ہو جائے تو اس کا دین ساقط ہو جائے گا اور اگر کپڑے کی قیمت پانچ درہم ہے تو راہن پر دوسرے پانچ درہم رجوع کریگا اور اگر پندرہ درہم ہے، تو زائد امانت ہے، کفایہ (رد المحتار علی الدر ۱۰/۸۱)۔

چھٹا حکم یہ تھا کہ: بائع دین ادا کرتے وقت بیع واپس لیگا، جیسے راہن دین ادا کرتے وقت شیء مرہون واپس لیتا ہے، ”ففى الدر المختار: فإن أحضر سلم له كل دينه أولاً، ثم سلم المرتهن رهنه تحقيقاً للتسوية“ (رد المحتار علی الدر ۱۰/۸۸)۔

علامہ ابن عابدین بیع الوفاء کا حکم بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ ایک قول یہ بیان کیا ہے کہ رہن ہے اور یہی صحیح ہے (جوہر الفتاویٰ)۔

”خیر یہ“ میں یہ بیان کیا ہے کہ اکثر حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ یہ رہن ہے کسی بھی حکم میں رہن سے مختلف نہیں ہے، سید امام کا بیان ہے کہ میں نے امام حسن ماتریدی سے عرض کیا کہ لوگوں کے درمیان یہ بیع عام ہو چکی ہے، حالانکہ اس میں بڑی خرابی ہے، اور آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ رہن ہے، اور میرا بھی یہی فتویٰ ہے، تو درست معلوم ہوتا ہے کہ ہم ائمہ کو جمع کریں اور اس فتویٰ پر اتفاق رائے کر کے لوگوں میں منتشر کر دیں، تو امام ماتریدی نے فرمایا کہ آج ہمارا فتویٰ ہی معتبر ہے، اور یہ لوگوں میں پھیل بھی چکا ہے، تو جو ہماری مخالفت کرتا ہے، وہ اپنے آپ کو پیش کرے اور اپنے موقف پر دلیل لائے۔

”صاحب خیر یہ“ رقم طراز ہیں کہ ”جامع الفصولین“ میں اسی عبارت سے گفتگو کا آغاز کیا ہے، اور ”فتاویٰ نسفی“ کے حوالہ سے بیان کیا ہے سود سے بچنے کا حیلہ کرتے ہوئے ہمارے اہل زمانہ کے مابین جس بیع کا عرف ہے جس کو ان حضرات نے ”بیع الوفاء“ کے نام سے موسوم کیا ہے، درحقیقت یہ رہن ہے، اس کے مالک کی اجازت کے بغیر نہ تو اس کا مالک ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور جو کچھ اس نے اس کا پھل کھایا اور اس کے درختوں کو تلف کیا ہے، وہ اس کا ضامن ہے اور اگر وہ باقی رہا تو اس کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائے گا، اور زیادتی کا ضامن نہیں ہوگا اور بائع جب اپنا دین ادا کرے تو اس کو واپس مانگنے کا اختیار ہے، ہمارے نزدیک اس کے اور رہن کے درمیان کسی بھی حکم میں فرق نہیں ہے۔

”جامع الفصولین“ میں ہے کہ اگر انگور کی بیل کو اس انگور کی بیل کی بغل میں فروخت کیا گیا تو شفعۃ بائع کے لئے ہوگا، نہ کہ مشتری کے لئے، اس لئے کہ بیع معاملہ اور تاجر کا حکم رہن کا حکم ہے اور شیء مرہون اگرچہ مرہون کے ہاتھ میں ہو شفعۃ راہن کو ملتا ہے (رد المحتار علی الدر ۷/۵۳۶)۔

فصول عمادی میں انیسویں فصل بیع الوفاء کے احکام و شرائط اور اس کے احکام کے بیان میں ہے، اس میں بھی بیع الوفاء کے رہن ہونے کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ شیخ امام خم الدین نسفی نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ وہ بیع جس کا عرف ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کیلئے پایا جاتا ہے جس کا نام لوگوں نے بیع الوفاء رکھا ہے، درحقیقت یہ رہن ہے، اور یہ بیع مشتری کے ہاتھ میں ایسے ہی ہے

جیسے شیء مرہون مرتہن کے ہاتھ میں، نہ تو وہ اس کا مالک ہوگا نہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کے لئے انتفاء کی اجازت ہوگی، اگر اس کا پھل کھا جائے، یا اس کے درخت کو تلف کر دے تو وہ اس کا ضامن ہوگا، مشتری کے ہاتھ میں شیء مرہون کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائے گا، بشرطیکہ بیع دین کی مقدار ہو، اگر بیع مشتری کے تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے اور بیع کی مقدار دین سے زائد ہو تو مشتری پر زیادتی کا تاوان لازم نہیں ہوگا، جب بائع دین کو ادا کر دے تو بیع کو اسے واپس لینے کا اختیار ہوگا، ہمارے یہاں بیع و فاء اور رہن کے درمیان کسی بھی حکم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، اسلئے کہ متعاقدین نے اگرچہ اس کا نام بیع رکھا ہے، مگر ان دونوں کا مقصد رہن اور دین کا وثیقہ ہے، اسلئے کہ اس عقد کے بعد بائع ہر ایک سے یہی کہتا ہے کہ میں نے فلاں کے پاس اپنی ملک رہن پر دے دیا، اور مشتری یہ کہتا ہے کہ میں نے فلاں کی ملک رہن پر لے لیا، اور تصرفات میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ اور مباحثی کا، اسلئے کہ ہمارے علماء رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے کہ کفالہ اصیل کی برأت کی شرط کیساتھ حوالہ ہے، اور حوالہ عدم برأت کی شرط کیساتھ کفالہ ہے، آزاد عورت کا گواہوں کی موجودگی میں مہر کی تعیین کے ساتھ اپنے آپ کو ہبہ کر دینا نکاح ہے، استصناع فاسد میں اگر مدت کو بیان کر دیا جائے تو مسلم ہے اور اس کے نظائر بہت ہیں (فصول عمادی ۱/۴۰۹)۔

نیز فصول عمادی میں یہ بھی صراحت ہے کہ سید امام ابو شجاع نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹے سید امام محمد کو یہ وصیت کیا کہ وہ ان کے فتویٰ کی مخالفت نہ کریں، چنانچہ ان کی اولاد نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا (فصول عمادی ۱/۴۱۰)۔

قاضی امام علی سعدیؒ جب بخارا سے سمرقند تشریف لائے تو اس مسئلہ کی بابت ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے یہ تحریر فرمایا کہ یہ رہن ہے بیع نہیں ہے، تو سید امام ابو شجاع اس سے بہت مسرور ہوئے (فصول عمادی ۱/۴۱۰)۔

حاصل یہ ہے کہ بیع الوفاء اپنے تمام احکام میں رہن کے حکم میں ہے اس کے درمیان اور رہن کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اکثر فقہاء اس کو بیع باطل قرار دیتے ہیں۔

۲-..... دوسرا قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے، مشائخ زمانہ کا عرف کی بنیاد پر اس پر اتفاق ہے، اس قول پر درج ذیل

احکام مرتب ہوں گے۔

(۱) بائع تعمیر اور ادائیگی خراج بطریق رضا کرے گا، نہ کہ بطریق جبر۔

(۲) نیز بائع کو ترک و فاء اور اسے بیع قطعی قرار دینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) مشتری کو ثمن کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

(۴) اگر گھر منہدم ہو جائے تو بائع کو ثمن کے لوٹانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اگر بیع کوئی سامان ہو اور

ہلاک ہو جائے تو معاملہ تام ہو جائے گا اور کسی کو دوسرے پر کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

علامہ زلیعی نے بیان کیا ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ یہ بیع جائز ہے، بعض احکام کے لئے مفید ہے، یعنی مشتری کے لئے اس سے انتفاع حلال ہے، مگر دوسرے کو بیچنے کا مالک نہیں (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

علامہ عثمان بن علی زلیعیؒ ”تبيين الحقائق“ کے ”کتاب الاکراه“ میں بیع الوفاء کا حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے

ہیں کہ:

بعض مشائخ سمرقند نے اس کو بیع جائز قرار دیا ہے، اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے، ان میں سے امام نجم الدین نسفیؒ ہیں انھوں نے فرمایا کہ اس زمانہ میں ہمارے مشائخ کا اتفاق ہے کہ بیع جائز ہے اور بعض احکام کے لئے مفید ہے، یعنی بیع سے انتفاع، اور بعض احکام میں مفید نہیں ہے یعنی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا، اس بیع کا جواز لوگوں کی حاجت اور ان کے تعامل کی بنیاد پر ہے اور قواعد کبھی تعامل کی بنیاد پر ترک کئے جاتے ہیں، چنانچہ استصناع کو تعامل کی بنیاد پر ہی جائز قرار دیا گیا ہے، صاحب ”نہایہ“ نے فرمایا کہ اسی پر فتویٰ ہے (تبيين الحقائق للزلیعی ۲۳۷/۶)۔

صاحب ”ہدایہ“ علامہ برہان الدین المرغینانی تحریر کرتے ہیں کہ:

جس نے بیع جائز معتاد..... قرار دیا ہے..... اور مشائخ سمرقند نے اس کو بیع جائز قرار دیا ہے اور بعض احکام کے

لیے مفید قرار دیا ہے عرف کی بنیاد پر لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے (ہدایہ ۳۷۳/۳)۔

صاحب ”ہدایہ“ کے نزدیک بیع وفاء کا بیع جائز ہونا ہی قول مختار ہے، چنانچہ صاحب ”عنایہ“ نے صراحت

کیا ہے: ”واختاره المصنف رحمه الله وأشار إليه بقوله: ”البيع الجائز المعتاد“ (عنایہ علی ہاشم فتح القدر ۱۶۹/۸)۔

(مصنف نے اسی کو اختیار کیا ہے اس کی طرف انھوں نے اپنے قول: ”البيع الجائز المعتاد“ سے اشارہ

کیا ہے)۔

نجم الدین نسفیؒ نے فرمایا کہ امام علی رامینیؒ زاہدیؒ یہ فتویٰ دیتے تھے کہ یہ بیع جائز ہے اور مشتری وعدہ کو پورا کرے

گا، اس سلسلہ میں وہ قاضی امام اسمعیلیؒ کی تقلید کرتے تھے (فصول عمادی ۴۱۰/۱)۔

۳-..... تیسرا قول جسے قاضی خان نے اختیار کیا ہے اس قول میں تفصیل یہ ہے کہ:

صحیح قول یہ ہے کہ اگر لفظ بیع سے عقد واقع ہوا تو رہن نہیں ہو سکتا؟ اس لئے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک عقد

مستقل ہے اور دونوں کے مستقل احکام ہیں (مطھادی ۱۴۳/۳)۔

پھر دیکھا جائے گا کہ عقد میں فسخ کی شرط ذکر کیا ہے، یا نہیں، مگر ان دونوں نے شرط وفاء کے ساتھ لفظ بیع کا تلفظ

کیا ہوگا، یا ان دونوں نے بیع جائز کا تلفظ کیا ہوگا، اور انکا گمان یہ ہو کہ یہ عقد غیر لازم ہے، تو ان تینوں صورتوں میں یہ بیع فاسد

ہوگی۔

اور اگر ان دونوں نے شرط وفاء کے بغیر لفظ بیع کا ذکر کیا، پھر بطور وعدہ کے شرط وفاء کا ذکر کیا تو بیع جائز ہو جائے گی اور ایفاء وعدہ لازم ہوگا، کیونکہ وعدے کبھی کبھی لازم ہوا کرتے ہیں، تو اسے رہن لازم قرار دیا جائے گا، لہذا لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے سود سے بچنے کی غرض سے اسے لازم قرار دیا جائے گا (البحر الرائق ۱۲/۶، الفتاویٰ الہدویہ علی ہاشم الہندیہ ۴۰۷/۲، فصول عمادی ۱/۲۱۳)۔

”در مختار“ میں ہے: ”وہو الصحيح كما في الكافي والخانية وأقره خسرو هنا، والمصنف في باب الإكراه وابن الملك في باب الإقالة بزيادة، وفي الظهيرية الخ“۔
یہی صحیح ہے، جیسا کہ کافی اور خانیہ میں ہے، اور خسرو نے یہاں اس کی توثیق کی ہے، اور مصنف نے ”باب الاکراہ“ میں اور ابن الملک نے ”باب الاقالة“ میں اس کی توثیق کی ہے (ردالمحتار علی الدرر ۷/۵۴)۔

۴-..... چوتھا قول جسے عدہ میں بیان کیا ہے، اور امام ظہیر الدین نے اسے اختیار کیا ہے، کہ یہ بیع فاسد ہے، سو اگر ان دونوں نے بیع کیا پھر عقد کے بعد شرط وفاء کو لاحق کر دیا تو عقد بیع فاسد ہو جائے گا، اگرچہ مجلس عقد کے بعد لاحق کیا گیا ہو قول صحیح کے مطابق، اور اگر عقد سے پہلے شرط کو ذکر کیا پھر شرط کے بغیر مطلق عقد کیا تو اگر وہ پہلے عقد پر بناء کا اقرار نہ کریں تو عقد جائز ہوگا اور شرط سابق کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، جیسا کہ بیع تلخیصہ میں امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے (البحر الرائق ۱۲/۶، الہدویہ ۴۰۷/۲)۔

۵-..... پانچواں قول وہ ہے جس کو ائمہ خوارج نے اختیار کیا ہے، کہ جب بیع کو مطلق رکھا، مگر مشتری نے ایک شخص کو وکیل بنا دیا کہ جب بائع ثمن کو حاضر کرے تو وہ بیع کو فسخ کر دے، یا خود مشتری نے یہ عہد کیا کہ جب بائع ثمن لایگا تو وہ بیع کو فسخ کر دے گا، اور صورت حال یہ ہے کہ ثمن بیع کے برابر نہیں ہے، بلکہ اس میں غبن فاحش ہے، یا مشتری نے اصل مال پر نفع متعین کر لیا ہے، مثلاً سودینار پر بیس دینار کا نفع رکھ لیا، تو یہ رہن ہے اور اگر نفع لئے بغیر مثل ثمن یا غبن لیسر کے بدلہ میں عقد کیا تو بیع لازم ہوگی، بشرطیکہ بائع کو غبن فاحش کا علم بھی ہو، البتہ اگر بائع کے گمان میں بیع ثمن مثل سے واقع ہوئی، مگر درحقیقت وہ غبن فاحش کے ساتھ واقع ہوئی ہے تو یہ بیع قطعی اور لازم ہوگی، کیونکہ ہم محض رہن اسی وجہ سے قرار دیں گے کہ بائع کا ظاہر حال یہ ہے کہ غبن کو جانتے ہوئے اسے بیع لازم نہیں قرار دے سکتا (بزاز علی ہاشم الہندیہ ۴۰۷/۲)۔

”ردالمحتار“ میں ہے کہ اگر بیع مطلق پائی گئی اور شرط وفاء کا ذکر نہیں کیا گیا، البتہ مشتری نے یہ عہد کیا کہ اگر بائع نے ثمن مثل ادا کر دیا تو بیع کو فسخ کر دے گا تو یہ بیع قطعی اور لازم ہوگی، زاہدی نے صراحت کی ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے، حامد یہ میں بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے (ردالمحتار علی الدرر ۷/۵۴)۔

۶-..... چھٹا قول جسے امام فخر الزاہد نے اختیار کیا ہے کہ اگر بیع میں وفاء کی شرط کا ذکر نہیں کیا گیا تو مشتری کے حق

میں یہ بیع صحیح ہوگی یہاں تک وہ اس سے انتفاع کا مالک ہوگا، جب کہ بائع کے حق میں رہن ہوگی، لہذا مشتری کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ اپنا قبضہ یا ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے اور جب بائع دین ادا کرے تو بیع کے واپس کرنے پر اسے مجبور کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ زرافہ کی طرح بیع اور رہن سے مرکب ہے، اس لئے کہ بہت سے احکام کے دو حکم پائے جاتے ہیں جیسے مرض وفات میں کیا ہوا ہبہ، یا ہبہ بشرط العوض، لوگوں کی حاجت کے پیش نظر رہا سے بچنے کے لئے اسے بیع وفاء قرار دیا، چنانچہ بیع میں لوگ دین اور اجارہ کے عادی ہیں حالانکہ وہ انگور میں صحیح نہیں ہے، اور بخاری میں اجارہ طویلہ کا عرف ہے حالانکہ درختوں میں یہ ممکن نہیں ہے، تو اس کی بیع وفاء پر وہ لوگ مجبور ہوئے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہوتی ہے، اس میں وسعت آجاتی ہے (الفتاویٰ الہیہ از یتیم علی ہاشم البندیہ ۲/۴۰۸، البحر الرائق ۱۲/۶، فصول عمادی ۱/۴۱۳)۔

۷۔..... ساتھ تو اس قول یہ ہے کہ بیع وفاء صحیح نہیں ہے، یعنی مشتری اس کو دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مالک نہیں ہے، جیسا کہ بیع مکرمہ میں ہوتا ہے، اس کا حکم قبضہ کے بعد بیع فاسد کی طرح نہیں ہے، صدر الشہید تاج الاسلام، برہان الدین مرغینانی اور ان کی اولاد کا اور دیگر مشائخ کا یہی قول مختار ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، صدر الشہید سے دریافت کیا گیا کہ اس کا حکم بیع فاسد کی طرح ہوگا اور دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کے بعد اگرچہ بائع دین ادا کر دے قبضہ کے بعد بیع فاسد کی طرح مشتری سے واپس لینے کا اختیار نہیں ہوگا؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مکرمہ سے خریدنے والے کی طرح ہے، تو ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر مشتری انگور کے بیل، زمین اور درخت کی آمدنی کو استعمال کرے (تو کیا حکم ہوگا؟) تو انھوں نے فرمایا کہ اس کا حکم بیع فاسد کے زوائد کا حکم ہے، یعنی اگر ہلاک کر دیا تو ضامن ہوگا اور اگر ہلاک ہو جائے تو ضامن نہیں ہوگا جیسے مغضوب کے زوائد (البحر الرائق ۱۲/۶، الہیہ از یتیم علی ہاشم البندیہ ۲/۴۰۸، فصول عمادی ۱/۴۱۵، ۴۱۶)۔

۸۔..... آٹھواں بعض محققین کا ”قول جامع“ ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض احکام میں ”فاسد“ ہے، لہذا دونوں فسخ کے مالک ہونگے بعض احکام کے حق میں بیع صحیح ہے، اس لئے مشتری کیلئے اس سے انتفاع اور بیع کے منافع کا استعمال کرنا جائز ہوگا، اور بعض احکام کے حق میں ”رہن“ ہے، اس لئے مشتری دوسرے کے ہاتھ اس کو بیچنے کا مالک نہیں ہوگا، اور نہ ہی اس کو رہن رکھنے کا مالک ہوگا، اور نہ ہی درخت کو کاٹنے کا مالک ہوگا، اور نہ ہی عمارت کو منہدم کرنے کا مالک ہوگا، اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں بائع کے ذمہ سے دین ساقط ہو جائے گا اور اگر مشتری کے پاس بیع میں عیب پیدا ہو گیا تو بقدر نقصان ثمن میں کمی کی جائے گی، جیسا کہ رہن میں ہوتا ہے، علامہ بزاز فرماتے ہیں کہ یہ عقد تینوں عقود (بیع فاسد، بیع صحیح، رہن) سے مرکب ہے تو یہ زرافہ کی طرح ہے جو اونٹ، گائے اور چیتا تینوں سے مرکب ہے، لوگوں کی حاجت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے جائز قرار دیا گیا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ عوضین بائع اور مشتری کے لئے سالم ہوں، صاحب بحر علامہ ابن نجیم نے فرمایا کہ مناسب ہے کہ فتویٰ دینے میں اس قول جامع سے عدول نہ کیا جائے (البحر الرائق ۱۳/۶، رد المحتار علی الدرر ۷/۵۴۶، الہیہ از یتیم علی ہاشم

الہندیہ ۴/۲۰۰۹۔

۹۔..... علامہ بزازی نے نواں قول یہ بیان کیا ہے کہ بیع کے زوائد میں مشتری کے لئے ملکیت ثابت ہو جائے گی اور زوائد کو تلف کرنے کی وجہ سے اس کا ضامن نہیں ہوگا، اس پر صاحب ”ہدایہ“ علامہ مرغینانی کی اولاد اور مشائخ زمانہ کا فتویٰ ہے (بزازیہ ۴/۲۰۱۰)، پھر علامہ بزازی نے مختلف فروعات کو بیان کیا ہے طوالت کے اندیشہ سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اقوال فقہاء کا خلاصہ:

(۱) اکثر حضرات فقہاء اسی کے قائل ہیں کہ بیع الوفاء رہن ہے، کسی بھی حکم میں اس سے مختلف نہیں ہے، جس کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء بیع جائز ہے، علمائے سمرقند کا یہی قول مختار ہے، امام زلیعی نے اس کے مفتی بہ ہونے کی صراحت کی ہے، جب کہ امام رامینی زاہدی بھی اسی پر فتویٰ دیتے تھے، قاضی اسپجانی کا یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ صاحب ”ہدایہ“ کا بھی یہی رجحان ہے۔

(۳) تیسرا قول قاضی خان کا ہے، کہ اگر لفظ بیع سے عقد واقع ہو تو رہن نہیں ہو سکتا، اب اگر عقد میں فسخ کی شرط ذکر کی گئی تو بیع فاسد ہوگی اور اگر عقد میں تو نہیں ذکر کی گئی، بلکہ بعد میں بطور وعدہ کے شرط وفا کا ذکر کیا گیا تو یہ بیع جائز ہوگی اور ایفاء وعدہ لازم ہوگا، کافی اور خانیہ میں اسی قول کی تصحیح کی گئی ہے، ملا خسرو، مصنف اور ابن الملک نے اس کی توثیق کی ہے۔

(۴) چوتھا قول یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے، جس کی تفصیل ”عُدّہ“ میں بیان کی گئی ہے، ظہیر یہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۵) پانچواں قول ائمہ خوارزم کا قول مفصل ہے کہ بیع مطلق پائی گئی، مگر مشتری نے فسخ کرنے کا کسی کو وکیل بنا دیا یا خود عہد کیا کہ اگر ثمن حاضر کی گئی تو میں بیع کو فسخ کر دوں گا، مگر صورت حال یہ ہے کہ ثمن اور بیع میں بڑا فرق پایا جاتا ہے تو یہ اس کے رہن ہونے کی دلیل ہے اور اگر فرق کم ہے یا برابر ہے تو بیع قطعی اور لازم ہوگی، زاہدی نے اس کے مفتی بہ ہونے کی صراحت کی ہے، نیز حامد یہ میں بھی اسی پر فتویٰ دیا گیا ہے۔

(۶) چھٹا قول امام فخر الزاہد کا ہے کہ اگر بیع میں وفاء کی شرط لگائی گئی تو مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے جبکہ بائع کے حق میں رہن ہے، لوگوں کی حاجت کے مد نظر یہ موقف اختیار کیا گیا ہے۔

(۷) ساتواں قول یہ ہے کہ بیع وفاء بیع مکہ کی طرح بیع فاسد ہے، صدر الشہید تاج الاسلام، برہان الدین مرغینانی انکی اولاد اور دیگر مشائخ کا یہی قول مختار ہے۔

(۸) آٹھواں قول ”قول جامع“ ہے یعنی بیع وفاء بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن تینوں سے مرکب ہے، علامہ ابن نجیم نے فرمایا کہ فتویٰ دینے میں ”قول جامع“ سے عدول کرنا مناسب نہیں ہے۔

(۹) نواں قول علامہ بزازی نے بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ بیع کے زوائد میں مشتری کی ملکیت ثابت ہوگی اور تلف کرنے سے اس کا ضامن نہیں ہوگا، صاحب ”ہدایہ“ علامہ مرغینانی و دیگر مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

بیع کو اجارہ پر دینا:

”در مختار“ میں ہے کہ اگر بائع نے بیع و فاء کو اجارہ پر لیا تو اس پر اجرت لازم نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ حکماً رہن ہے، اس لئے اس سے انتفاع حلال نہیں ہے، الخ۔

علامہ ابن عابدین ”لائلزم الأجر الخ“ کے تحت ارقام فرماتے ہیں کہ ”خیر یہ“ کی اتباع میں ”حامد یہ“ میں بھی اجرت کے لازم نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے، اس لئے کہ علامہ خیر المللی نے ”خیر یہ“ میں صراحت کیا ہے کہ: مذکورہ اجارہ صحیح نہیں ہے، اور مفتی بہ قول کے مطابق اس پر اجرت لازم نہیں ہوگی، خواہ مشتری کے دار پر قبضہ کرنے کے بعد اجارہ پایا گیا ہو، یا اس سے پہلے۔

نیز نہایہ میں فرمایا: کہ قاضی امام حسن ماتریدی سے اس شخص کی بابت دریافت کیا گیا جس نے بیع و فاء کے طور پر اپنا گھر دوسرے کے ہاتھ متعین ثمن کے بدلہ فروخت کیا اور دونوں نے قبضہ کر لیا، پھر بائع نے اجارہ کی صحت کے شرائط کے ساتھ مشتری سے اجارہ پر لے لیا، اور مکان پر قبضہ بھی کر لیا تو کیا مدت کے گزرنے کے بعد اجرت لازم ہوگی، تو قاضی امام نے عرض کیا کہ لازم نہیں ہوگی، اس لئے کہ بیع و فاء ہمارے نزدیک رہن ہے، اور راہن اگر شئی مرہون کو مرہن سے اجارہ پر لے تو اجرت لازم نہیں ہوگی۔

نیز ”بزازیہ“ میں ہے کہ: اگر بیع و فاء بائع کو بطور اجارہ کے دیا تو جن حضرات نے اس کو بیع فاسد قرار دیا تو ان کا کہنا ہے کہ نہ تو اجارہ صحیح ہے اور نہ ہی اجرت واجب ہوگی، اور جن حضرات نے رہن قرار دیا ان کے یہاں بھی یہی حکم ہے، اور جس نے بیع و فاء کو بیع جائز قرار دیا تو بائع اور اس کے علاوہ کے ہاتھ اجارہ کو صحیح قرار دیا، اور اجرت کو بھی لازم قرار دیا، اور اگر مشتری نے قبضہ کرنے سے پہلے بائع کو اجارہ پر دیا تو صاحب ”ہدایہ“ نے یہ جواب دیا کہ یہ صحیح نہیں ہے، دلیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے غلام کو خریدنا اگر قبضہ کرنے سے پہلے اجارہ پر دیا تو اجرت واجب نہیں ہوگی، صاحب ہدایہ نے فرمایا جب بیع یقینی اور لازم میں یہ حکم ہے تو بیع جائز میں تمہارا کیا گمان ہے۔

اس سے پتہ یہ چلا کہ قبضہ سے پہلے اجارہ پر دینا تینوں اقوال میں سے کسی کے مطابق صحیح نہیں ہے، خیر یہ کی بات ختم

ہوئی۔

خیر یہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر مشتری و فاء نے بائع کی اجازت سے اجارہ پر دیا تو اس کا حکم ایسے ہی ہے جیسے راہن مرہن کو اجارہ کی اجازت دیدے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اجرت کو یا تو صدقہ کر دے یا مذکورہ راہن کو واپس کر دے

اور یہی بہتر ہے، ہمارے علماء نے اس کی صراحت کیا ہے:

علامہ شامی نے فرمایا کہ جب بائع کی اجازت سے اجارہ پر دیا تو رہن باطل ہو جائے گا (جامع الفصولین، رد المحتار علی

الدرر ۵۴۸/۷۷۹)۔

نیز علامہ بزاز نے بیان کیا کہ اگر مشتری نے بائع کو اجارہ پر دیا تو صاحب ہدایہ کا بیان ہے کہ بیع کے بعد اجارہ پر اقدام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بیع سے ان دونوں کا مقصد رہن ہے، نہ کہ بیع، لہذا مشتری کے لئے اس سے انتفاع حلال نہیں ہے (شرح المجلد ۱/۲۲۳)۔

”الفقه الحنفی فی ثوبہ الجدید“ میں عبد الحمید محمود بیع و فاء کی بیع صحیح کے ساتھ مشابہت بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ: بیع الوفاء کی بیع صحیح کے ساتھ ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ قبضہ کرنے کے بعد بائع کو اس کو اجارہ پر دینا جائز ہے اور اس پر اجرت لازم ہوگی، البتہ اگر قبضہ کرنے سے پہلے بائع کو اجارہ پر دیا تو اس میں فقہاء کے دو قول ہیں، اصح عدم جواز ہے اور یہی مفتی بہ ہے، مگر یہ کہ قبضہ کرنے سے پہلے بائع کو اجارہ پر دینے کا آج کل عرف جاری ہے، لہذا اگر کوئی مفتی جواز کا فتویٰ دیدے تو یہ بہتر ہوگا، اس لئے کہ یہ قول ضعیف نہیں ہے، اس لئے کہ یہ اصح کا قول مقابل ہے جو کہ صحیح ہوتا ہے، نیز عرف ایسے حالات میں شرعاً مخصوص بننے کی صلاحیت رکھتا ہے (الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید ۳۳۵/۴)۔

مذکورہ بالا صراحت سے علامہ عبد الحمید محمود کے رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ اگر قبضہ کرنے سے پہلے بائع کو اجارہ پر دیا تو قول اصح اور مفتی بہ عدم جواز اجارہ ہے، مگر عرف کی بنیاد پر قول مرجوح پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

مگر واضح رہے کہ خیر یہ اور حامد یہ میں مطلقاً عدم جواز کو راجح قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ بیع و فاء کا رہن ہونا ہی قول راجح ہے اور شئی مرہون سے الاستعمال جائز نہیں ہے، نیز خیر یہ کے حوالہ سے یہ بھی تصریح گزری ہے کہ قبضہ سے پہلے اجارہ تینوں اقوال میں سے کسی پر صحیح نہیں ہے۔

نیز صاحب در مختار نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر بائع کے ہاتھ مدت گزر جائے تو علماء روم نے اجرت مثل کے لزوم کا فتویٰ دیا ہے اور اس کا نام بیع الاستعمال رکھتے ہیں، مگر علامہ ابن عابدین نے یہ صراحت کر دیا کہ ”وعلی کل، فہذا مبنی علی خلاف الراجح کما علمت الخ“ بہر حال یہ (بیع استعمال) خلاف راجح پر مبنی ہے (رد المحتار علی الدرر ۵۴۹/۷)۔

نیز واضح رہے کہ اگر عرف خاص نص کے معارض ہو تو نص کے لئے مخصوص بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لہذا قبضہ کرنے سے پہلے بائع کو اجارہ پر دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

مانعین جواز بیع الوفاء کے دلائل:

بیع الوفاء کے جواز و عدم جواز کے بارے میں تمام اقوال تفصیلاً اور اجمالاً بیان کئے جا چکے ہیں کہ بعض اسے بیع صحیح

قرار دیتے ہیں، بعض رہن مانتے ہیں، بعض بیع باطل، تو بعض بیع فاسد کا اطلاق کرتے ہیں، جبکہ بعض بیع صحیح اور رہن سے مرکب مانتے ہیں اور بعض بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن تینوں سے مرکب مانتے ہیں۔

جو حضرات اس کو بیع باطل قرار دیتے ہیں، اس کو بیع ہازل پر قیاس کرتے ہیں، جیسے بیع ہازل میں بائع اور مشتری عقد کی تحقیق کا ارادہ نہیں رکھتے، بلکہ محض لفظ بیع کا تلفظ کرتے ہیں، چنانچہ ”در مختار“ میں ہے: ”ولم ینعقد مع الہزل لعدم الرضا بحکمہ معہ“ (ہزل کے ساتھ بیع منعقد نہیں ہوتی، اس لئے کہ ہازل اس کے ساتھ حکم بیع پر راضی نہیں ہوتا) (در مختار علی رد المحتار ۱۹۷۷)۔

اسی طرح بیع وفاء میں مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا، اس لئے کہ دونوں وقتی طور پر بیع کا تلفظ کرتے ہیں، مگر حقیقت مراد نہیں لیتے، چنانچہ علامہ زبلی فرماتے ہیں ومن المشائخ من جعله باطلا اعتبره بالہازل (تبيين الحقائق ۶/۲۳۷)۔ قائلین فساد بیع یا توفیح کی شرط کے ذکر کرنے کی وجہ سے بیع وفاء کو بیع فاسد قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ بیع کا مقتضی تاقیت نہیں ہوا کرتا، بلکہ دوام وبقا ہوتا ہے، اس لئے عقد وفاء میں فسخ کی شرط لگانا مقتضائے عقد کے خلاف ہے، لہذا یہ بیع فاسد ہوگی، بعض حضرات بیع وفاء کے فساد کا بیع مکہ کے رنگ میں مشاہدہ کرتے ہیں، چنانچہ بیع مکہ میں مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوتا، اگر فروخت کر دیا تو بائع کو اس عقد کو توڑنے کا پورا حق ہوتا ہے، اسی طرح بیع وفاء میں بھی مشتری کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، چنانچہ علامہ عثمان زبلی فرماتے ہیں: ”من جعل بیع الوفاء کبیع المکرہ، منهم الإمام ظہیر الدین والصدر الشہید حسام الدین والصدر السعید تاج الاسلام الخ“ (۲۳۷، ۲۳۷)۔

قائلین رہن بیع الوفاء اور رہن کے درمیان کچھ فرق محسوس نہیں کرتے، جو احکام رہن کے ہیں وہی بیع الوفاء پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ تصرفات میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ و مبنائی کا اعتبار نہیں ہوتا، تو باوجودیکہ عاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے، مگر مقصود رہن ہی ہے، چنانچہ عقد کے بعد جب بائع سے کسی کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے اپنا سامان رہن پر دے دیا اور مشتری کہتا ہے کہ میں نے فلاں کا سامان دین کے عوض میں رہن پر لے لیا، لہذا بیع الوفاء کے احکام کو دیکھتے ہوئے رہن اور بیع الوفاء میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جو حضرات بیع الوفاء کو بیع صحیح قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ عاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے، ہر چند کہ ان کی نیت بقاء و دوام نہیں ہے، تاہم عقود کے اندر محض نیت و ارادہ کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ الفاظ کا بھی اعتبار ہوتا ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے اس نیت سے نکاح کرے کہ ایک سال کے بعد میں اسے چھوڑ دوں گا، تو باوجودیکہ اس کے دل میں ہے کہ ایک مدت کے بعد فائدہ اٹھا کر اسکو چھوڑ دے گا، نکاح صحیح ہے، حالانکہ نکاح موقت باطل ہے، تو پتہ چلا کہ عقود کے اندر

صرف نیتوں کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ الفاظ کی بھی کچھ حقیقت ہوتی ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ بے شک محض نیتوں کا اعتبار نہیں الفاظ کا بھی کچھ نہ کچھ اعتبار ہے، مگر واضح رہے کہ کچھ عقود وہ ہیں جن میں الفاظ کے ساتھ معانی و مقاصد کا بھی ان میں اعتبار ہوتا ہے، جیسے بیع اجارہ، حوالہ، وغیرہ اور بعض عقود وہ ہیں جن میں محض الفاظ کا ہی اعتبار ہے نیتوں اور مقاصد کا کچھ بھی اعتبار نہیں، جیسے نکاح، طلاق اور رجعت، چنانچہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ثلاث جدهن جد، وهزلهن جد، النكاح والطلاق، والرجعة“ (رواہ الترمذی و ابوداؤد، مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۸۴ / باب الخلع والطلاق) (تین چیزیں ان کی حقیقت تو حقیقت ہے ہی، انکا مذاق بھی حقیقت ہے، نکاح طلاق اور رجعت)، لہذا تاقیت کے ارادہ کے باوجود نکاح کی صحت اسی استثناء پر مبنی ہوگی، اس لئے بیع الوفاء کی صحت کے لئے مسئلہ نکاح بنیت تاقیت سے استدلال درست نہیں ہے۔

چنانچہ ”شرح الحجۃ“ (مادہ: ۳) میں ہے: ”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی لا للألفاظ والمبانی، ولذا یجری حکم الرهن فی بیع الوفاء، أى أن العقود المبنیة علی الأغراض والمقاصد لا علی الألفاظ کالبیع والجارا والحوالة تعتبر فیها المقاصد والمعانی ولاعبرة للألفاظ، ولہذا جری حکم الرهن فی البیع بالوفاء وان كان منعقدا بلفظ البیع: لأنه لم یقصد به تملیک المبیع للمشتري بل تأمینہ علی دینہ ۱۵“ (شرح الحجۃ ۱۹/۱)۔

(عقود میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ اور مبانی کا نہیں ہوتا، اس لئے بیع الوفاء میں رہن کا حکم جاری ہوگا، یعنی وہ عقود جو کہ اغراض و مقاصد پر مبنی ہیں نہ کہ الفاظ پر جیسے بیع اجارہ اور حوالہ ان میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ کا کوئی اعتبار نہیں، اسی لئے بیع و فاء میں رہن کا حکم جاری ہوا ہر چند کہ وہ لفظ بیع سے منعقد ہوئی ہے، اس لئے کہ بائع نے مشتری کو بیع کا مالک بنانے کا قصد نہیں کیا، بلکہ اس کے دین پر اطمینان دینا چاہتا ہے)۔

تاکلین جواز و فاء نے لوگوں کی حاجت اور ان کے عرف کو مدد و صحت قرار دیا کبھی کبھی تعامل کی بنیاد پر ناجائز چیزوں کو بھی جواز کے دائرہ میں لایا جاتا ہے، جیسے استصناع کا جواز، مگر قابل غور یہ ہے کہ بیع الوفاء کا عرف، عرف قدیم ہے یا حادث، اگر حادث ہے تو عام ہے یا مشترک یا خاص، اگر خاص ہے تو نص کے معارض ہے یا نہیں؟

تو واضح رہے کہ بیع الوفاء کا مسئلہ متاخرین احناف کے درمیان پانچویں صدی میں زیر بحث آیا، اس سے پہلے اس مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا، امام نجم الدین نسفی متوفی ۵۳۷ھ، امام علی السغدی م ۴۶۱ھ، سید ابوشجاع اور امام حسن ماتریدی، دونوں امام علی السغدی سمرقندی کے معاصر ہیں، ان چاروں فقہاء کے یہاں بیع الوفاء کے مسائل اور فروعات کا تذکرہ ملتا ہے، ان فقہاء کا تعلق سمرقند سے رہا ہے اور یہ تمام فقہاء پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں، اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے

کہ مصر، بخارا و سمرقند میں پانچویں صدی کے اوائل یا اواخر میں اس بیع کا رواج ہوا، پتہ یہ چلا کہ بیع الوفاء کا مسئلہ عرف خاص حادث کا مسئلہ ہے، نیز نص کے معارض بھی ہے، اس لئے کہ ایک طرف تو اس میں بیع اور شرط کا اجتماع لازم آتا ہے، جبکہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ”بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے“ (مشکوٰۃ المصابیح ۲۳۸، باب المبی عنہما من البیوع)، اور دوسری طرف احکام میں بیع الوفاء کے درمیان اور رہن کے درمیان کچھ بھی فرق معلوم نہیں ہوتا ہے اور شی مرہون سے انتفاع ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ کے زمرہ میں آتا ہے، اس لئے بیع الوفاء میں بیع سے فائدہ اٹھانا بھی ربا پر مشتمل ہے، تو عرف خاص حادث اگر نص کے مصادم ہے تو اس عرف کا کچھ بھی اعتبار نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ رسائل میں تحریر کرتے ہیں کہ: جب عرف دلیل شرعی کے بالکلیہ اس طرح مخالف ہو جائے کہ عرف پر عمل کرنے کی صورت میں نص کو ترک کرنا لازم آتا ہو تو اس کو رد کرنے میں کوئی شک نہیں ہے جیسے ربا، شراب نوشی، ریشمی لباس اور سونے کا مرد کیلئے استعمال نص قطعی سے حرام ہے اگر لوگوں کا عرف ان کی حلت پر ہو جائے تو اس عرف کو ترک کر دیا جائے گا اور اگر من کل وجوہ مخالف نہ ہو مثلاً دلیل عام ہو اور عرف اس کے بعض افراد میں مخالف ہو یا دلیل قیاس ہو تو اگر عرف عام ہوگا تو وہ معتبر ہے، اس لئے کہ عرف عام نخص بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، جیسا کہ،، تحریر،، کے حوالہ سے گذرا، اور اس کے ذریعہ قیاس کو ترک کیا جائے گا، جیسا کہ مسئلہ،، استصناع،،، دخول حمام،، اور مشکیزہ سے پانی استعمال کرنے میں فقہاء نے یہی صراحت کی ہے اور اگر عرف خاص ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہے، یہی مذہب ہے، جیسا کہ اشباہ میں بیان کیا ہے کہ حاصل یہ ہے کہ مذہب عرف خاص کا اعتبار نہ کرنا ہے، لیکن بہت سے مشائخ نے اس کے اعتبار کا فتویٰ دیا ہے (رسائل ابن عابدین)۔

خلاصہ یہ کہ بیع الوفاء کا مسئلہ بھی عرف خاص حادث کا مسئلہ ہے، نیز نص شرعی کے مصادم ہے، اس لئے یہ عرف خاص متروک ہوگا اور بیع الوفاء پر بطلان کا حکم لگا کر اس کو رہن کے حکم میں قرار دیا جائے گا، جیسا کہ اکثر فقہائے امت اسی کے قائل رہے ہیں اور بیع الوفاء پر احکام کو مرتب کرنے میں ہم رہن کے پہلو کا ہی خیال رکھیں، البتہ اضطرار شدیدا اور ضرورت کے مسائل جدا ہیں، ضرورت کے وقت بیع الوفاء پر بیع کا حکم لگایا جاسکتا ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ ”امداد الفتاویٰ“ میں (سوال ۱۳۴) کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

الجواب: صورت مسئلہ مندرجہ سوال اول ظاہراً بیع و قصد رہن ہے اور صورت مندرجہ سوال ثانی صریح رہن ہے، سورہن صریح میں تو اگر انتفاع مرتہن کا مشروط یا معروف ہو، بلا اختلاف حرام ہے، ”فی الدر المختار: ثم نقل عن التہذیب: أنه یکرہ للمرتہن أن ینتفع بالرهن وإن أذن له الراهن، قال المصنف: وعلیہ یحمل ما عن محمد بن اسلم من أنه لا یحل للمرتہن ذلك ولو بالاذن، لأنه ربو، قلت: وتعلیلہ یفید أنها تحریمیة،

فتأملہ ۱۵ قلت: هذا في المشروط، وقد تقرر أن المعروف كالمشروط،، اور رہن قصداً و بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سو اصل تو اعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے، تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے، اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں (والتفصیل فی الدار المختار قبیل کتاب الکفالة) (امداد الفتاویٰ ۳/۷۰۷/۱۰۸)۔

حضرت تھانویؒ کے اس فتویٰ میں مذکورہ اضطراب شدید کو حاجت کے معنی میں لیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ فقہی اضطراب تو تقریباً معدوم ہے اس کے تحقق کا امکان بھی بہت کم ہے اور حاجت کو کبھی ضرورت کے درجہ میں اتار لیا جاتا ہے۔ چنانچہ شرح المجملہ میں ہے:

حاجت کو کبھی ضرورت کے درجہ میں اتار لیا جاتا ہے، عام ہو یا خاص، اسی قبیل سے بیع الوفاء کا جواز ہے، اس لئے کہ جب باشندگان بخارا پر دیون زیادہ ہو گئے تو اس بیع کی ضرورت پڑی، لہذا اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ بیع الوفاء درحقیقت جائز نہیں، جیسا کہ عنقریب اس کے باب میں آئے گا، لیکن جب اہل بخارا کے دیون زیادہ ہوئے تو وہ اس سے متعارف ہوئے وہ لوگ مشتری کے لئے بعض منافع کی شرط لگاتے تھے، جیسے بیع کی اجرت اور اس کی آمدنی، اس سے ان کا مقصد لوگوں کو قرض دینے میں راغب کرنا تھا باوجودیکہ یہ بھی مشروع نہیں ہے، فقہاء نے حاجت کے پیش نظر اس کو جائز قرار دیا، جیسا کہ عنقریب مادہ ۳۹۸ میں آئے گا، باوجودیکہ یہ حاجت عام نہیں، بلکہ باشندگان بخارا کے ساتھ خاص ہے (شرح المجملہ ۱/۳۳)۔

جوابات بابت سوالات بیع الوفاء:

اصل تو اعد مذہب کی رو سے بیع الوفاء قصداً رہن ہے، احکام رہن کے درمیان اور احکام بیع الوفاء کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور اگر عقد میں فسخ کی شرط مذکور ہو تو بیع فاسد ہے، جو تو اعد مذہب کی رو سے واجب الفسخ ہے، بیع الوفاء میں بظاہر دونوں لفظ بیع کا تلفظ کرتے ہیں، مگر ان دونوں کا مقصد بیع نہیں ہوتا چنانچہ مشتری بیع کا مالک نہیں ہوتا، جیسے بیع ہزل میں مشتری بیع کا مالک نہیں ہوتا۔

نیز بیع الوفاء میں بیع مکروہ کی بھی جھلک نمایاں ہے، چنانچہ بیع مکروہ میں مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوتا، اگر فروخت کر دیا تو بائع کو فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، یہی صورت حال بیع الوفاء میں بھی پائی جاتی ہے، مشتری نے اگر فروخت کر دیا تو بائع کو بیع فسخ کرنے کا اختیار کلی حاصل ہوتا ہے، لہذا بیع الوفاء بھی یا تو بیع فاسد ہے، جس سے انتفاع حرام ہے، یا بیع ہازل یا بیع مکروہ کی طرح بیع باطل ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیع الوفاء رہن ہے، بخاری وغیرہ میں جب لوگ

قرض دینے سے گریز کرنے لگے تو لوگوں کو قرض دینے پر راغب کرنے کے لئے فقہاء نے اس کی اجازت دی کہ قرض دہندہ شئی مرہون کو بیع الوفاء کے طور پر خریدے اور اس سے اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے فائدہ اٹھائے اور جب راہن دین ادا کرے تو شئی مرہون اسے واپس کر دی جائے، پس بلا ضرورت اس عقد کی کوئی گنجائش نہیں اور شئی مرہون سے انتفاع جائز نہیں۔

علامہ زلیعی تحریر کرتے ہیں: ”ومن مشائخ بخاری من جعل بیع الوفاء کبیع المکره، منهم الإمام ظہیر الدین والصدر الشہید حسام الدین والصدر السعید تاج الإسلام، وصورته أن یقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العین بدین لك علی أنى متی قضیت الدین فهو لی، فجعلوه فاسدا باعتبار شرط الفسخ عند القدرة علی ایفاء الدین، یفید الملک عند اتصال القبض به، وینقض بیع المشتري کبیع المکره الخ..... ومنهم من جعله رهنا منهم السید الإمام أبوشجاع والإمام علی السغدی والإمام القاضی الحسن الماتریدی قالوا: لما شرط علیه أخذه عند قضاء الدین أتى بمعنی الرهن، لأنه هو الذى یؤخذ عند قضاء الدین، والعبرة فی العقود للمعانی دون الألفاظ..... ومن المشائخ من جعله باطلا اعتبره بالهزل“ (تبيين الحقائق ۶/۲۳۷)۔

وفی الموسوعة الفقهية: ”ولأن البیع علی هذا الوجه لایقصد منه حقيقة البیع بشرط الوفاء، وإنما یقصد من ورائه الوصول إلى الربا المحرم وهو اعطاء المال إلى أجل ومنفعة المبیع هی الربح والربا باطل فی جمیع حالاته“ (الموسوعة الفقهية ۹/۲۶۰)۔

”وفی المحيط البرهانی: ۱۳۰۵۰۔ وفی فتاوی النسفی: إن البیع الذى تعارفوه أهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزا عن الربا فی الحقيقة رهن والمبیع فی ید المشتري كالرهن فی ید المرتهن،..... وعلیه فتوی السید الإمام أبی شجاع السمرقندی، وفتوی القاضی الإمام علی السغدی ببخارى وكثیر من الأئمة علی هذا“ (المحیط البرهانی ۱۰/۳۶۹، رد المحتار علی الدرر ۷/۵۴۶ ط زکریا، فصول عمادی ۱/۴۰۹، الفتاوی البرازیة علی ہاشم البندیہ ۴/۴۰۵، شرح المجلة ۱/۳۳)۔

الف: قواعد مذہب کی رو سے یہ شرط لگانا کہ مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے عقد کو فاسد کر دے گا، اس لئے کہ خرید و فروخت کے بعد بائع اور مشتری کو شمن اور بیع میں تصرف کا کلی اختیار ہوتا ہے، ”رد المحتار“ میں ہے: ”لأن الملک ما من شأنه أن یتصرف فیہ بوصف الاختصاص“ (رد المحتار علی الدرر ۷/۱۰)۔

لہذا یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے جو فساد عقد کو مستلزم ہوگی، تاہم جن حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے وہ

مشتری کو انتفاع کی تو اجازت دیتے ہیں، مگر دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔
بعض مشائخ سمرقند نے اس کو بیع جائز قرار دیا ہے اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے، ان میں سے امام نجم الدین نسفی ہیں، انھوں نے فرمایا کہ اس زمانے میں ہمارے مشائخ کا اتفاق ہے کہ بیع جائز ہے اور بعض احکام کے لئے مفید ہے، یعنی بیع سے انتفاع اور بعض احکام میں مفید نہیں، یعنی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا (تبيين الحقائق للزليعي ۱۲/۶، البحر الرائق ۲۳۷، البحر الرائق ۱۲/۶، ہدایہ ۳۴۷/۳)۔

فصول عمادی میں ہے:

قال نجم الدين: "وكان الإمام علي الراميتي الزاهدي يفتي بأنه بيع جائز ويوفى بالوعد ويتبع في ذلك القاضي الإمام الإسبجاني" (فصول عمادی ۱۰۱، البرازيية علی ہاشم الہندیۃ ۴۰۵/۳)۔
ب: جو حضرات بیع الوفاء کو بیع جائز قرار دیتے ہیں، وہ بھی رہن کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے، بلکہ جس طرح مرتہن کو دین کے مطالبہ کا اختیار ہے اسی طرح یہ حضرات مشتری کو بھی ثمن کے مطالبہ کا اختیار دیتے ہیں، لہذا اگر بیع و فاء دار ہو اور وہ ہلاک ہو جائے تو بائع کو ثمن کے لوٹانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اگر بیع کوئی سامان ہو اور وہ ہلاک ہو جائے تو معاملہ تام ہو جائے گا اور دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر کوئی راہ نہیں ہوگی، جیسا کہ شیء مرہون اگر دین کے برابر ہو تو مرتہن کے ہاتھ میں ہلاک ہونے کی صورت میں دین بالکل ساقط ہو جاتا ہے، لہذا جس طرح مرتہن کو دین سے زیادہ مطالبہ کا حق نہیں ہوتا، تو مشتری و فاء کو بھی ادا کردہ قیمت سے زیادہ مطالبہ کا اختیار نہیں ہوگا۔

ففي البحر: "وللمشتری المطالبة بالثمن فإن انهدمت الدار ليجبر البائع على رد الثمن، وكذا إذا كان المبيع عيناً هلك، فإنه يتم الأمر ولا سبيل لأحد هما على الآخر" (البحر الرائق ۱۲/۶)۔
وفي البزازیة: "ويكون للمشتری حق المطالبة في الثمن، فإن انهدمت الدار المبيعة ليجبر البائع على رد الثمن؛ لأنه بمنزلة بيع جديد" (البرازيية علی ہاشم الہندیۃ ۴۰۶/۳)۔
تاہم اگر بیع اول کو بیع قطعی اور لازم قرار دیں تو یہ عقد ثانی بیع جدید ہوگا، جس کا سابقہ عقد سے کوئی تعلق نہیں ہوگا تو مشتری کے لئے نفع لینا بھی جائز ہوگا۔

ج: جو حضرات اسے بیع جائز قرار دیتے ہیں تو خریدار کے لئے اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے انتفاع کی اجازت دیتے ہیں، تاہم اگر اسے رہن قرار دیا جائے تو انتفاع جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ شیء مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے۔
"البحر الرائق" میں ہے: "وذكر الزليعي: أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير" (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

د: جو حضرات بیع الوفاء کو بیع جائز قرار دیتے ہیں، چونکہ وہ رہن کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں، اس لئے جس طرح مرتہن کو شئی مرہون میں تصرف کا اختیار نہیں بیع و فاء کے خریدار کو بھی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔
۲: بیع الوفاء کو اگر رہن تسلیم کر لیا جائے اور یہی صحیح بھی ہے۔

(الف) تو خریدار کے لئے بیع و فاء سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ مرتہن کے لئے رہن کی اجازت کے باوجود شئی مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

ففى الدر المختار: ”ثم نقل عن التهذيب: أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن، وإن أذن له الراهن قال المصنف: وعليه يحمل ما عن محمد بن اسلم من أنه لا يحل للمرتهن ذلك ولو بالإذن، لأنه ربه، قلت: وتعليقه يفيد أنها تحريمية، فتأمله“ (رد المحتار على الدر المختار ۱۰/۱۳۸ ط ۱۳۸۷)۔

”وفى تبين الحقائق للزيلعي: فإذا كان رهنا لا يملكه ولا ينتفع به وأى شئ أكل من زوائده يضمن ويستردده عند قضاء الدين، ولو استأجره البائع لا يلزم أجرته كالراهن إذا استأجر المرهون وانتفع به، ويسقط الدين بهلاكه، فيثبت فيه جميع أحكام الرهن“ (تبين الحقائق ۶/۲۳)۔

ب: جب بیع الوفاء کو رہن مان لیا گیا تو مرتہن کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں خواہ فائدہ اٹھانا بالعموم ہو یا بلا عوض اور اگر رہن شئی مرہون مرتہن کے ہاتھ اجارہ پر دے تو عقد رہن منسوخ ہو جاتا ہے اور کرایہ رہن کے لئے جائز ہوتا ہے، لہذا صورت مسئلہ میں رہن اور اجارہ دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

چنانچہ رد المحتار میں ہے: ”وأما عكسه: وهو ما إذا أجر الراهن الرهن من المرتهن يفسخ بمجرد عقد الإجارة“ (رد المحتار على الدر المختار ۱۰/۱۵۰)۔

نیز اگر بائع شئی مرہون کو مشتری سے اجارہ پر لے تو یہ اجارہ باطل ہے اور اس پر اجرت لازم نہیں ہوگی۔
چنانچہ ”رد المحتار“ میں ہے:

”قال فى النهاية: سئل الإمام أبو الحسن الماتريدى عن باع داره من آخر بضمن معلوم بيع وفاء وتقابضا ثم استأجرها من المشتري مع شرائط صحة الإجارة وقبضها ومضت مدة، هل تلزمه الأجرة؟ قال: لا، فإنه عندنا رهن والراهن إذا استأجر الرهن من المرتهن لا تجب الأجرة اه خيرية، ثم نقل فيها عن البرازية مايوافقه، وافتى به غير مره، والكل فى فتاواه المشهورة حامدية“ (رد المحتار على الدر المختار ۱۰/۱۵۰)۔

علامہ شامی ایک دوسرے مقام پر تحریر کرتے ہیں:

کہ شئی مرہون کو اجارہ پر دینے کے بارے میں عرض ہے کہ اجارہ پر لینے والا یا تو راہن ہی ہوگا تو یہ باطل ہے اور یہ راہن کو شئی مرہون عاریت پر دینے اور ودیعت پر دینے کے درجہ میں ہے اور اگر اجارہ پر لینے والا مرہن ہے اور اجارہ کے لئے قبضہ کی تجدید بھی کیا..... تو راہن باطل ہو جائے گا اور اجرت راہن کو ملے گی (ردالمحتار علی الدر ۱۰/۱۳۰)۔

ج: بیع الوفاء در حقیقت رہن ہے، لہذا خریدار کے لئے بیع و فاء سے کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ کا فائدہ اٹھانے کا اختیار نہیں ہوگا۔

”ففى الدر المختار: ثم نقل عن التهذيب: أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن، وإن أذن له الراهن، قال المصنف: وعليه يحمل ما عن محمد بن اسلم من أنه لا يحل للمرتهن ذلك ولو بالإذن، لأنه ربا قلت: وتعليقه يفيد أنها تحريمية، فتأمله“ (ردالمحتار علی الدر ۱۰/۱۳۸)۔

”وفى التبیین: فإذا كان رهنا لا يملكه ولا ينتفع به وأى شئ أكل من زوايده يضمن ويستردده عند قضاء الدين، ولو استأجره البائع لايئزمه أجرته كالراهن إذا استأجر المرهون وانتفع به، ويسقط الدين بهلاكه، فيثبت فيه جميع أحكام الرهن“ (تبیین الحقائق للربيعي ۶/۲۳۷)۔

قال: قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما اعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط، وهو مما يعين المنع والله تعالى اعلم

۵۱“ (ردالمحتار علی الدر ۱۰/۸۳)۔

د: بیع الوفاء در حقیقت رہن ہے، لہذا خریدار کے لئے اس کو بیچنے کا اختیار نہیں اور اگر بیچ دیا تو بائع کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر اجازت دیدیا تو جائز ہوگی، ورنہ نہیں، جیسا کہ شئی مرہون کو بیچنے کا بھی یہی حکم ہے۔

”و کذا توقف على إجازة الراهن بيع المرتهن، فإن أجازه جاز، وإلا فلا، وله أن يبطله ويعيده رهناً الخ“ (ردالمحتار علی الدر ۱۰/۱۲۵)۔

جواب ۳: بڑے یا چھوٹے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کرنا درحقیقت پگڑی کی مروجہ صورت ہے جس میں کرایہ دار مالک دکان یا مکان کو کثیر رقم بطور ضمانت کے دیتا ہے، اگر اس کو قرض قرار دیا جائے تو اجرت کے ساتھ قرض بھی لینے میں مالک مکان کا فائدہ ہے، اس لئے کہ قرض کی رقم وہ استعمال کرتا ہے اور اجارہ میں اگر احد المتعاقدين کا فائدہ ہو تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے، نیز قرض قرار دینے کی صورت میں تا جیل قرض لازم آتی ہے جو کہ عند الاحناف جائز نہیں، لہذا قواعد شرعیہ کی رو سے ضمانت کو قرض قرار دینا درست نہیں، نیز اس کو رہن قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ اگر مالک مکان کرایہ دار سے کوئی چیز اس لئے مانگے، تاکہ اسے استعمال کرے تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے اور وہ شئی

رہن نہیں رہتی، چنانچہ مالک مکان یا دکان پر اس شی کی اجرت مثل لازم ہوتی ہے، غرض زر ضمانت پر لیجانے والی رقم کسی اصل شرعی پر منطبق نہیں ہوتی، اسلئے پگڑی کی مروجہ شکل جائز نہیں ہونا چاہئے، مگر اس کا رواج عام طور پر پایا جاتا ہے، لوگوں کے لئے اس سے کوئی مفر نہیں ہے، اس لئے فقہاء نے بیع الوفاء پر قیاس کرتے ہوئے اسے جائز قرار دیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ پگڑی پر مکان یا دکان لینے والے پر اجرت مثل واجب ہوگی، اگر اجرت مثل میں کوئی کمی کی تو قرض سے فائدہ اٹھانے کو مستلزم ہوگا جو کہ رہا ہے۔

فقہی مقالات میں مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ: ہم نے اوپر جو بحثیں کی ہیں ان سے یہ بات محقق ہوگئی کہ ہمارے زمانے کی موجودہ پگڑی جو مالک مکان کرایہ دار سے لیتا ہے جائز نہیں ہے اور پگڑی کے نام پر لیجانے والی یہ رقم شریعت کے کسی قاعدہ پر منطبق نہیں ہوتی، لہذا یہ رقم رشوت اور حرام ہے، البتہ پگڑی کے مروجہ نظام میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ممکن ہیں:

(۱) مالک مکان و دکان کے لئے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں ایک مٹت رقم لے لے جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ ایک مٹت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس یک مٹت لی ہوئی رقم پر اجارہ کے سارے احکام جاری ہوں گے، اگر اجارہ کسی وجہ سے طے شدہ مدت سے پہلے فسخ ہو جائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ اجارہ کی باقی مدت کے مقابل میں ایک مٹت رقم کا جتنا حصہ آ رہا ہے اسے واپس کر دے (فقہی مقالات ۱/۲۱۷)۔

”فقہی رد المحتار: وممن افتي بلزوم الخلو الذي يكون بمقابلة دراهم يدفعها للمتولى أو المالك العلامة المحقق عبد الرحمن افندي العمادى صاحب هدية ابن العماد وقال: فلا يملك صاحب الحانوت إخراجہ ولا إجارته لغيره مالم يدفع له المبلغ المرقوم، فيفتى بجواز ذلك للضرورة قياساً على بيع الوفاء الذي تعارفه المتأخرون احتيلاً على الربا الخ۔

قلت: وهو أيضا بما قلنا بما إذا كان يدفع أجراً لمثل، وإلا كانت سكناه بمقابلة مادفعه من الدراهم عين الرباء كما قالوا: فيمن دفع للمقرض داراً ليسكنها أو حماراً ليركبه إلى أن يستوفى قرضه أنه يلزمه أجره الدار أو الحمار“ (رد المحتار على الدرر ۷/۳۰۷)۔

وفيه أيضاً (رد المحتار على الدرر ۹/۳۵)۔

”وفيه أيضاً: فائدة: قال في التاتر خانية مانصه: ولو استقرض دراهم وسلم حماره إلى المقرض ليستعمله إلى شهرين حتى يوفيه دينه أو داره ليسكنها فهو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله، فعليه أجر مثله ولا يكون رهنًا“ (رد المحتار على الدرر ۱۰/۸۷)۔

بیع و فاء پر احکام رہن کا ترتب

مفتی محمد زاہد گڑھی سلیم پوری ☆

بیع الوفاء کی تعریف:

تتبع و تلاش کے بعد کتب فقہ کی تصریحات اور اقوال فقہاء سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع الوفاء کی تعریفات اور صورتیں تین

ہیں:

۱- کسی آدمی کے ذمہ کسی شخص کا قرض ہو اور قرض دار اپنے قرضے کی ادائیگی پر قرض خواہ کو بھروسہ و اطمینان دلانے کے لئے یہ کہے کہ میں اپنی یہ فلاں چیز آپ کو فروخت کرتا ہوں اُس قرض کے بدلے جو آپ کا مجھ پر لازم ہے اس شرط پر کہ میں جب قرض ادا کروں گا تو یہ چیز میری ہوگی، چنانچہ بیع الوفاء کی یہ صورت علامہ نضر الدین زلیعی (متوفی ۷۴۳ھ) نے تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ذکر کی ہے: ”و صورته أن يقول البائع للمشتري: بع منک هذا العین بدین لک علیّ علیّ انّی متی قضیت الدین فہولی“ (تبیین الحقائق، کتاب الاکراه، ۵/۸۳ - مطبوعۃ المطبعۃ الکبریٰ، قاہرہ)۔

یہ ہی تعریف و صورت الفاظ مذکورہ کے ساتھ علامہ عبدالرحمان بن محمد شیخی زادہ معروف بہ داماد افندی (متوفی ۱۰۷۸ھ) نے بھی ”مجمع النہر فی شرح ملتقی الباحر“ (کتاب الاکراه، ۲/۴۳۰ دار احیاء التراث العربی) میں تحریر کی ہے۔

علامہ ابن مازہ بخاری الحنفی (متوفی ۶۱۶ھ) نے ”المیظ البرہانی“ میں اگرچہ صراحتاً یہ تعریف و صورت تحریر نہیں کی ہے، لیکن اسلوب عبارت سے مذکورہ تعریف ہی مفہوم ہوتی ہے، کیونکہ احکام کے ذیل میں وہ لکھتے ہیں کہ مشتری کے قبضہ میں بیع کے ہلاک ہونے سے اس کا دیا ہوا قرض ساقط ہو جائیگا بشرطیکہ بیع ہالک کی قیمت قرض کے برابر ہو اور بائع (قرضدار) جب قرضہ ادا کر دے تو اسکو بیع کی واپسی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ ”والدین ساقط بھلاکہ فی یدہ، اذا کان فیہ و فاء بالدین، وللبيع استردادہ اذا قضی الدین“ (الفصل الخامس والعشرون جی البيعات)۔

(۲) دوسری تعریف و صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں اپنی فلاں چیز آپ کو فروخت کرتا ہوں اتنے

روپے میں اس شرط پر کہ اگر میں آپ کی دی ہوئی قیمت کی رقم آپ کو واپس کر دوں تو آپ یہ چیز مجھے واپس کر دیں گے، چنانچہ اسی طرح کی تعریف و صورت علامہ علاؤ الدین حصکفی دمشقی (متوفی ۱۰۸۸ھ-۱۶۷۷ء) نے ”در مختار“ میں نقل کی ہے: ”و صورتہ أن یبیعہ العین بالف علی أنه إذا رد علیہ الثمن رد علیہ العین“ (در مختار مطبوعہ زکریا پونہ ۵۷/۲)۔

”مجلة الاحکام العدلیة“ کے مرتبین نے بھی یہی تعریف ذکر کی ہے، چنانچہ (المادة ۱۱۸) کی عبارت اس طرح ہے: ”بیع الوفاء هو البیع أن البائع متى رد الثمن یرد المشتري إلیه المبیع“ البتہ ایک دوسری جگہ یہ صراحت کی ہے کہ بیع الوفاء میں جس طرح بائع کو یہ حق ہے کہ جب وہ قیمت واپس کر دے تو بیع واپس لے لے، اسی طرح مشتری کو بھی حق ہے کہ بیع واپس کر دے اور قیمت کی واپسی کا مطالبہ کرے، چنانچہ ”المادة ۳۹۶“ میں مذکور ہے: ”كما أن البائع وفاء له أن یرد الثمن و یاخذ المبیع، کذا لک للمشتري أن یرد المبیع ویستر الثمن“

تنبیہ:- مذکورہ دونوں صورتیں محض اسلوب بیان میں مختلف ہیں حکم مسئلہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، خواہ بائع اپنی چیز کو اپنے ذمہ پر لازم شدہ قرض کے عوض فروخت کرے یا نقد روپے کے ذریعے دونوں کا حکم یکساں ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے دونوں صورتوں کو ذکر کیا ہے جیسا کہ اکمل الدین ابو عبد اللہ رومی الباہرتی شارح ہدایہ (متوفی ۷۸۶ھ) نے ”عنا یہ شرح ہدایہ“ میں دونوں صورتوں کو ذکر کیا ہے: ”و صورتہ أن یقول البائع للمشتري: بعث منک هذا العین بمالک علی من الدین علی أنى متى قضیت الدین فھولی، أو یقول بعث منک هذا العین بکذا علی أنى إن دفعت الیک ثمنک تدفع العین الی“

اسی طرح علامہ بدر الدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ) نے ”بنایہ شرح ہدایہ“ میں دونوں صورتیں تحریر کی ہیں: ”و صورتہ أن یقول البائع للمشتري: بعث هذا منک بمالک علی من الدین علی أنى متى قضیت الدین فھولی“ دوسری صورت کو تاج الشریعہ (متوفی ۶۷۲ھ) کی طرف منسوب کر کے تحریر کیا ہے چنانچہ فرمایا: ”وقال تاج الشریعہ: صورتہ أن یقول البائع للمشتري بعث منک هذا العین بکذا علی أنى لو دفعت الیک الثمن تدفع العین الی“۔

اسی طرح مذکورہ دونوں صورتیں علامہ ابن نجیم حنفی (متوفی ۹۷۰ھ) نے ”البحر الرائق شرح کنز الدقائق“ میں تحریر کیا ہے: بعینہ مذکورہ الفاظ کے ساتھ دونوں صورتوں کو ”فتاویٰ ہندیہ“ کے مرتبین نے بھی ذکر کیا ہے

۳- تیسری صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں اپنی یہ چیز تم کو فروخت کرتا ہوں اتنے روپے کے بدلے میں اس شرط پر کہ جب میں تمہارا ثمن لے آؤں تو تم مجھے یہ فروخت کر دینا (یعنی تم مجھے واپس کر دینا کے بجائے یہ کہا کہ مجھے فروخت کر دینا)۔

تنبیہ: یہ تیسری صورت ماسبق دونوں صورتوں سے محض بعض الفاظ میں مختلف ہے، کیونکہ تینوں صورتیں حکم کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، چنانچہ ابن عابدین شامی (متوفی ۱۲۵۲ھ) نے شامی میں تینوں صورتوں کو بیان کیا ہے اور واضح کیا کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ پہلی صورت کو عنایہ، اور کفایہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور تیسری صورت کو سلیمان بن علی القرمانی (متوفی ۹۲۴ھ-۱۵۱۸ء) کی کتاب حاشیہ الفصولین کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی هو أن يقول: بعث منك علی أن تبعه منی متی جئت بالثمن“ اس کے بعد دوسری اور اس تیسری صورت کے درمیان عدم فرق کو واضح کیا ”أنه لافرق بین قوله علی أن ترده علی أو علی أن تبعه منی“۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ”بیع الوفاء“ میں بائع اپنی شئی کو قرض کے بدلے فروخت کرے یا نقد کے بدلے بیچے اور یہ کہے کہ جب میں قیمت لوٹا دوں تو مجھے یہ چیز واپس کر دینا یا یہ کہے کہ جب میں قیمت واپس کر دوں تو آپ میرے ہاتھ اسکو فروخت کر دینا تینوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے۔

بیع الوفاء کا حکم:

بیع الوفاء کی حیثیت کے تعیین کے سلسلے میں فقہاء احناف کے مختلف اقوال کتب فقہ میں منقول ہیں، نیز اقوال مختلفہ میں سے مفتی بہ اور راجح قول کے متعین کرنے میں بھی اختلاف آراء ثابت ہے، چنانچہ کتب فقہ کے اوراق گردانی کے بعد راقم السطور کے علم کے مطابق ”بیع الوفاء“ کی حیثیت کی بابت کتب فقہ میں فقہاء احناف سے دس اقوال ثابت ہیں۔ چنانچہ ابن البرزاز الکردری (متوفی ۸۲۷ھ) نے ”فتاویٰ بزازیہ“ میں کتاب البیوع کے تحت ”نوع فیما يتصل بالبيع الفاسد“ عنوان کے ذیل میں نو اقوال ذکر کئے ہیں چنانچہ ”درر الحکام“ کے حاشیہ میں علامہ حسن بن عمار الشرنبلالی (۱۰۶۹ھ) نے بھی نو کی تعداد ذکر کی ہے: ”وقد ذکر فی البزازیة تسعة اقوال فی بیع الوفاء یجب مراجعتها“ (درر الحکام ۲۰۷/۲-دارالکتب العلمیہ) لیکن ابن نجیم مصری (متوفی ۹۷۰ھ) نے ”بحر الرائق“ میں ”باب خيار الشرط“ کے تحت بیع الوفاء کے بیان میں آٹھ تعداد بیان کی ہے ”فقد اختلفوا فیہ علی ثمانية اقوال مذکورة فی البزازیة“ (البحر ۱۱۶/۱-زکریا دیوبند) جبکہ ابن عابدین دمشقی علامہ شامی نے، فتاویٰ شامی میں بزازیہ کے حوالہ سے نو تعداد لکھی ہے ”ذکره فی البزازیة فی الباب الرابع، فی البیع الفاسد، و ذکر فیہ تسعة أقوال“ (شامی ۵۳۵/۷، ذکر یا دیوبند)، نیز بزازیہ سے مراجعت سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ شرنبلالی اور علامہ شامی کا بیان درست ہے اور شامی نے بحر اور بزازیہ کے اختلاف تعداد کو بھی ذکر کیا ہے۔

الغرض نو اقوال فتاویٰ بزازیہ سے ثابت ہے اور دسواں قول صاحب ہدایہ نے ”و منهم من جعله باطلاً اعتباراً بالهازل“ (ہدایہ ۳۷۷/۳) سے بیان کیا ہے اسی طرح علامہ زلیعی نے تمیین الحقائق (کتاب الاکراه) میں ذکر کیا ہے۔

اختلاف اقوال:

اولاً اجمالی طور پر جملہ دس اقوال کو ذکر کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

(۱) بیع الوفاء بمنزلہ رہن ہے۔ (۲) بیع صحیح ہے۔ (۳) من وجہ بیع فاسد اور من وجہ بیع جائز ہے۔ (۴) بیع فاسد ہے۔ (۵) من وجہ بمنزلہ رہن ہے اور من وجہ بیع نافذ ہے۔ (۶) بیع اور رہن سے مرکب عقد ہے خریدار کے حق میں بیع صحیح اور فروخت کنندہ کے حق میں رہن ہے۔ (۷) بیع غیر صحیح ہے جو کہ بیع المکرہ کے مانند ہے کہ قبضہ کے بعد مشتری کے عقد بیع کو روکنے والی ہے۔ (۸) تینوں امور، یعنی بیع صحیح، بیع فاسد، رہن سے مرکب ایک عقد ہے کہ بعض امور کے اعتبار سے بیع صحیح کے احکام ثابت ہوں گے اور بعض کے اعتبار سے فاسد کے احکام ثابت ہوں گے اور بعض امور کے اعتبار سے رہن کے احکام ثابت ہوں گے۔ (۹) زوائد بیع کے ظہور کے بعد بیع لازم ہے کہ زوائد میں مشتری کے لئے مفید ملک ہے اور اسکا اتلاف موجب ضمان نہیں ہے، اس صورت کے تحت تین اقوال مذکور ہیں کہ مشتری و فاء کے قبضہ میں بائع کے مال و فاء یعنی بیع کی ثمن ادا کرنے سے قبل بیع کی پیداوار رونما ہوئی اس کے بعد بائع مال و فاء کو ادا کر کے بیع فسخ کرنا چاہتا ہے تو کیا مشتری کو اس کے قبول کرنے اور فسخ بیع پر مجبور کیا جائیگا یا نہیں، چنانچہ اس سلسلے میں عماد الدین عبدالوہاب سے فتویٰ طلب کیا گیا تو جواب دیا نہیں، یعنی مجبور نہیں کیا جائیگا۔ امام علاء الدین بدر نے فتویٰ دیا کہ اگر بائع نے مشتری کو پیداوار میں سے اسکا حصہ دیدیا تو مجبور کیا جائیگا، منہاج الشریعت نے فتویٰ دیا کہ بہر صورت مجبور کیا جائیگا اور پیداوار بائع کے حوالے کی جائیگی۔

(۱۰) بیع باطل ہے بیع الہازل کے مانند کہ قطعاً مفید ملک نہ ہوگی۔

اختلاف ترجیح:

تتبع و تلاش کے بعد معلوم ہوا ہے کہ مذکورہ اقوال عشرہ مختلفہ میں سے جسکو راجح اور مفتی بہ قول قرار دیا گیا ہے وہ بھی کتب فقہ میں اختلاف کے ساتھ منقول ہے اور وہ چار ہیں۔ (۱) رہن ہے۔ قول رہن کو ذکر کرنے کے بعد علامہ ابن مازہ نے ”الھیط البرہانی“ میں نقل کیا ہے کہ اسی پر سید امام ابو شجاع سمرقندی کا فتویٰ ہے اور قاضی امام علی السعدی اور ائمہ میں سے بہت سوں کا اسی پر فتویٰ ہے۔ شیخ امام نجم الدین نسفی نے بھی ”فتاویٰ نسفیہ“ میں اسکو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ اور علامہ شامی نے حاشیہ الفصولین کے واسطے سے ”جواهر الفتاویٰ“ سے نقل کیا ہے کہ رہن ہونا صحیح ہے: ”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاویٰ..... و حکمہ حکم الرهن و هو الصحیح“ (شامی۔ مطلب فی بیع الوفاء) اور علامہ شامی نے خیر الدین بن احمد بن علی الرطبی (مولود ۹۹۳ھ۔ متوفی ۱۰۸۱ھ) کے ”فتاویٰ الخیریہ“ کے حوالے سے نقل کیا ہے، رہن ہونے پر اکثر فقہاء کا قول ہے کسی بھی حکم میں رہن سے مختلف نہیں ہے: ”قال فی الخیریة، والذی علیہ الاکثرأنه رهن لایفترق عن الرهن فی حکم من الاحکام“ (حوالہ بالا) اور امام ابن عابدین دمشقی شامی کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ رہن کے مانند

ہے اور اس پر دلیل شامی کی کتاب الزکاة کا یہ جزئیہ ہے کہ ”مطلب فی زکاة ثمن المبیع وفاءً عنون کے ذیل میں اس بابت اختلاف نقل کیا ہے کہ بیع وفاء کے ثمن میں زکاة کس پر لازم ہوگی مشتری پر یا بائع پر، تو بقول بعض بائع پر واجب ہے، بشرطیکہ ایک سال تک اس کے پاس باقی رہا ہو، کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اور بقول بعض مشائخ کہ مشتری پر لازم ہے، کیونکہ بائع کے پاس بطور امانت رکھا ہوا مال ہے اور ”الذخیرة“ میں ہے کہ بائع اور مشتری دونوں پر لازم ہے، مذکورہ دونوں علتوں کا اعتبار کرتے ہوئے۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ ”شرح الجامع“ میں امام فخر الدین بزدوی نے بھی اسی طرح اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے اور ”فتاویٰ بزازیہ“ میں بھی یہی ہے اس کے بعد ”قلت“ فرما کر اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ صرف مشتری پر لازم ہو اس قول پر عمل کرتے ہوئے جس پر اب عمل ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع الوفاء رہن کے درجہ میں ہے: ”قلت: ینبغی لزومها علی المشتري فقط علی القول الذی علیہ العمل الآن، أن بیع الوفاء منزل منزلة الرهن“ (شامی۔ کتاب الزکاة، مطلب فی زکاة ثمن المبیع وفاءً)، نیز علامہ شامی نے اپنی رائے کا اظہار ”العقود الدراییة فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیة“ میں تین مختلف مقامات پر فرمایا ہے۔ ۱۔ کتاب النکاح میں باب الولی کے ذیل میں (۱۹/۱) کتاب البیوع کے تحت اور ”فتاویٰ خیریہ“ اور ”الحاوی الراہدی“ کا حوالہ دے کر فرمایا یہی صحیح ہے، جیسا کہ ”جواہر الفتاویٰ“ میں ہے اور بزدوی نے بھی اسکو مفصلاً ذکر کیا ہے۔ کتاب الرهن میں ہے۔

(۲) بیع جائز ہے بعض احکام میں مفید ہے۔ امام فخر الدین زلیعی نے ”تبيين الحقائق“ میں اس قول کو مشائخ سمرقندی طرف منسوب کیا ہے اور امام نجم الدین نسفی کو اسی زمرہ میں شمار کیا ہے اور امام نسفی کا قول ذکر کیا ہے کہ ہمارے مشائخ عظام نے اس زمانے میں اتفاق کر لیا ہے کہ بیع الوفاء بیع جائز اور بعض احکام میں مفید ہے اور جواز کی دلیل پیش کی ہے کہ لوگوں کی حاجت اور ان کا تعامل ہے اور تعامل کی وجہ سے بہت سے قواعد کو ترک کر دیا جاتا ہے اور تعامل الناس کو مدار حکم قرار دیا جاتا ہے، ”ومن مشائخ سمرقند من جعله بیعاً جائزاً مفیداً بعض أحكامه منهم الامام نجم الدين النسفی فقال: اتفق مشائخنا فی هذا الزمان فجعلوه بیعاً جائزاً مفیداً بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض وهو البیع لحاجة الناس، ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل“ (تبيين الحقائق۔ کتاب الاکراه) اس کے بعد صاحب ”نہایہ“ کا قول نقل فرمایا کہ اسی پر فتویٰ ہے، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى۔ امام زلیعی کے بیان مذکور کو علامہ شامی نے بھی ذکر کیا ہے، ”قال الزلیعی فی الاکراه: وعليه الفتوى“ (شامی۔ مطلب مسائل المتاصفة) شیخ زادہ داماد افندی نے مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر میں نہایہ کے قول کو ذکر کیا ہے ”وهو البیع وفي النهاية: وعليه الفتوى“ (مجمع الأنهر۔ کتاب الاکراه) اور زلیعی نے اپنا فیصلہ بھی یہی ظاہر کیا ہے کہ یہ بیع ہے، لوگوں کی حاجت و تعامل کی وجہ سے اور تعامل الناس کی بناء پر قواعد کو ترک کر دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ ”وهو البیع

لحاجة الناس و لتعاملهم فيه و القواعد قد تترك بالتعامل و جُوزا الاستصناع لذلك“ (تبيين الحقائق كتاب الاكراه) اور ابن نجيم مصری نے زلیعی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ یہ بیع جائز ہے۔ بعض احکام میں مفید ہے۔ ”و ذکر الزلیعی أن الفتوى على أنه بیع جائز مفیداً لبعض أحكامه“ (البحر الرائق باب خيار الشرط)۔

اور ملا خسر نے ”درر الحکام شرح غرر الاحکام“ میں ”مجموع النوازل“ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ اس زمانے میں ہمارے مشائخ کا اتفاق ہے کہ بیع الوفاء کا بیع ہونا صحیح ہے، جیسا کہ بعض سلف کا یہ ہی مذہب تھا ”ذکر فی مجموع النوازل: اتفق مشائخنا فی هذا الزمان على صحته ببعاً على ما كان عليه بعض السلف“ (درر الحکام۔ بیع الوفاء)۔

”مجموع النوازل“ کے مذکورہ بیان کو ابن عابدین شامی نے فتاویٰ شامی میں ”كتاب الجارة، مطلب فی المرصد والقيمة و مشهد المسكة“ عنوان کے ذیل میں بیان کیا ہے، چنانچہ فرمایا کہ اس زمانے میں ہمارے مشائخ نے بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے پر اتفاق کر لیا ہے، اسکی طرف لوگوں کے اضطراب اور حاجت کی وجہ سے ”قال فی مجموع النوازل: اتفق مشائخنا فی هذا الزمان على صحته ببعاً لضرار الناس الى ذالك“۔

شبه: ابھی ماسبق میں ”تبيين الحقائق“ کی جو عبارت ذکر کی گئی اس سے معلوم ہوا کہ امام نجم الدین نسفی کے نزدیک بیع الوفاء کا بیع جائز ہونا راجح ہے، کیونکہ زلیعی نے اس قول کو مشائخ سمرقند کی طرف منسوب کیا ہے اور ان ہی میں سے امام نجم الدین نسفی کو شمار کیا ہے۔ لیکن ”درر الحکام“ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ امام نجم الدین نسفی کے نزدیک رہن ہونا راجح ہے ”قال الشيخ الامام نجم الدين النسفي في فتاواه: البيع الذي تعارفه اهل زماننا احتيالا للربا وسموه بيع الوفاء هو في الحقيقة رهن“ اسی طرح علامہ شامی نے مذکورہ عبارت کو (امام نسفی کا بیان) جامع الفصولین کے حوالے سے ذکر کیا ہے ”قلت: وبه صدر في جامع الفصولين فقال رامزاً لفتاوى النسفي: البيع الذي تعارفه اهل زماننا الخ“

الغرض: مذکورہ عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ بیع جائز ہونا قول راجح ہے۔

(۳) بیع الوفاء، بیع المکرہ کے مانند ہے کہ جس طرح بیع مکرہ کے مشتری کے لئے جائز نہیں کہ اپنے غیر کے ہاتھ اسکوفر وخت کرے اگر ایسا کیا تو عقد باطل ہے، اسی طرح بیع الوفاء کا حکم ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری نے اس قول کو صاحب ہدایہ، اور ان کی اولاد اور اپنے زمانے کے مشائخ کا مختار قول قرار دیتے ہوئے مفتی بہ ہونا بھی بیان کیا ہے ”واختاره صاحب الهداية و اولاده و مشائخ زماننا و عليه الفتوى أعني لا يملك المشتري بيعه من الغير كما في بيع المکره“ (البحر الرائق۔ تعلق خيار الشرط بالشرط)۔

(۴) بیع الوفاء عقود ثلاثہ، یعنی بیع فاسد، بیع صحیح، رہن سے مرکب عقد ہے کہ بعض احکام کے حق میں بیع فاسد

ہے، بعض احکام کے حق میں بیع صحیح ہے اور بعض احکام کے حق میں رہن ہے، ابن نجیم مصریؒ اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں، بلکہ اہل افتاء کو اسکی دعوت بھی دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ فتویٰ دینے میں اس قول جامع سے اعراض نہ کیا جائے ”وینبغي أن لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع“ (البحر الرائق ۶/۱۳)۔

اختلاف نظریات فقہاء مع دلائل و تنقیدات:

پہلا نظریہ: بیع الوفاء در حقیقت رہن ہے۔ عمر بن محمد النفشی صاحب منظومہ (مولود۔ ۴۶۱ھ۔ متوفی ۵۳۷ھ) نے اسی کو اختیار کیا ہے اور شیخ بدر الدین محمود بن اسرائیل بن عبدالعزیز معروف بابن قاضی سماوہ (متوفی ۸۲۳ھ) نے ”فتاویٰ خیریہ“ میں اسی پر فتویٰ دیا ہے اور ابوالرجاء نجم الدین مختار بن محمود بن محمد الزاهدی (متوفی ۶۵۸ھ۔ ۱۲۶۰ء) نے ”الحوای الزاہدی“ میں اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ اور ابوبکر رکن الدین ابن ابی المغافر الکرمانی (متوفی ۵۶۵ھ) نے ”جواہر الفتاویٰ“ میں اسی کو ترجیح دی ہے، اور ابوالحسن فخر الاسلام علی بن محمد بن الحسین البرزوی (متوفی ۴۸۲ھ۔ ۱۰۸۹ء) نے شرح الجامع میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اسی کو ترجیح دی ہے اور ابو محمد غانم بن محمد البغدادی (متوفی ۱۰۳۰ھ) نے ”مجمع الضمانات“ میں کہا ہے کہ اکثر مشائخ نے یہی کہا ہے کہ یہ رہن ہے، اسی پر سید امام ابو شجاع اور قاضی امام ابوالحسن علی السغدی کا فتویٰ ہے۔ اور امام قاضی حسن ماتریدی کی رائے بھی یہ ہے اور اسی پر ان کا فتویٰ ہے۔ بلکہ بڑی سختی اور شد و مد کے ساتھ اس پر قائم تھے، جیسا کہ شامی وغیرہ نے واقعہ تحریر کیا ہے کہ سید امام ابو شجاع نے امام حسن ماتریدی سے کہا کہ یہ بیع (بیع الوفاء) لوگوں کے درمیان رواج پانچکی ہے اور اس میں بڑا مفسدہ ہے اور آپ نے فتویٰ دیا کہ یہ رہن ہے اور میں بھی اسی پر قائم ہوں۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ ہم اماموں کو جمع کر لیں اور اس پر (ان کی تائیدات لے کر) اتفاق کر لیں اور اسکولوگوں کے درمیان ظاہر کریں۔ تو امام حسن ماتریدی نے جواب دیا: ”المعتبر اليوم فتوانا وقد ظهر ذالك بين الناس، فمن خالفنا فليؤثر بنفسه وليقم دليله“ (شامی ۷/۵۳۹۔ ذکر یاد یوبند) (آجکل ہمارا فتویٰ معتبر ہے اور وہ لوگوں کے درمیان ظاہر ہو گیا ہے، پس اب جو ہماری مخالفت کرے تو وہ میدان میں اترے اور دلیل قائم کرے)۔

بیع الوفاء پر احکام رہن کا ترتب:

(۱) اس نظریہ کے اعتبار سے بائع بحیثیت راہن ہے اور مشتری بحیثیت مرہن ہے۔

لہذا مشتری بیع کا مالک نہ ہوگا، جیسا کہ مرہن شی مرہون کا مالک نہیں ہوتا ہے، بلکہ مرہن کو صرف ملک جس حاصل ہوتی ہے، تا آنکہ راہن دین ادا کر دے۔ یعنی اس کو ملک عین حاصل نہیں ہوتی۔

(۲) بائع کی اجازت کے بغیر مشتری کے لئے اس سے انتفاع جائز نہیں، کیونکہ انتفاع، ملک کے ذریعہ حلال

ہوتا ہے، خواہ ملک عین ہو، جیسا کہ بیع، ہبہ میں ہوتی ہے، یا ملک منافع ہو، جیسا کہ اجارہ، اعارہ میں ہوتی ہے اور رہن اس

سے خارج ہے۔

(۳) اور بائع کے لئے بھی جائز نہیں کہ بیع سے انتفاع کرے، کیونکہ اس پر حق جس مشتری کو حاصل ہے، جب تک بائع دین ادا نہ کرے اور بائع کا انتفاع کرنا غیر کے حق (یعنی مشتری کے حق جس) کو باطل کرنا ہے اور حق الغیر کا ابطال بدون اجازت شرعاً جائز نہیں ہے ”لیس للراهن أن ينتفع بالمرهون..... لأن حق الحبس ثابت للمرتهن على سبيل الدوام، وهذا يمنع الاسترداد و الانتفاع“ (البدائع ۲۱۱/۵۔ دارالکتب دیوبند)۔

(۴) اگر مال بیع و فاء کی قیمت مشتری کے ثمن دین کے مساوی ہے اور مشتری کے قبضہ میں بیع ہلاک ہوگئی تو اس کے مقابل میں بائع سے دین ساقط ہو جائیگا۔

(۵) اور اگر مال بیع و فاء کی قیمت دین سے کم ہوئی اور بیع، مشتری کے قبضے میں ہلاک ہوئی تو اس کے بقدر دین ساقط ہو جائے گا۔

(۶) اور اگر مال بیع و فاء کی قیمت، دین سے زائد ہو اور بیع مشتری کے قبضے میں ہلاک ہوگئی تو بائع سے دین ساقط ہو جائیگا اور رہا بیع و فاء کی قیمت کا مقدار دین سے زائد حصہ تو اس پر امانت کا حکم جاری ہے کہ اگر مشتری کی جانب سے اسکی ہلاکت میں تعدی پائی گئی ہے تو مشتری پر ضمان لازم ہوگا۔ اور اگر تعدی نہیں پائی گئی ہے تو کوئی ضمان لازم نہیں ہوگا۔

(۷) اور بیع و فاء زمین میں بیع الوفاء کی وجہ سے شفعہ حاصل نہ ہوگا، جس طرح رہن کی وجہ سے مرہونہ زمین میں نہیں ہوتا۔

(۸) اور اگر بیع و فاء زمین کے جو اردو پڑوس میں کوئی زمین فروخت کی گئی تو اس میں حق شفعہ مالک، یعنی بائع و فاء کو حاصل ہوگا، مشتری کو نہیں۔

(۹) اور اگر بائع و فاء کا انتقال اداء دین سے قبل ہو جائے اس حال میں کہ اس پر دیگر حضرات کے بھی دیون و حقوق لازم ہیں تو بیع و فاء سے دیگر قرض خواہوں کے لئے تعرض کرنا جائز نہیں، جب تک مشتری اپنے دین ثمن کو وصول نہ کر لے (ماخوذ از شرح القواعد الفقہیہ لاحمد الزرقاء)۔

(۱۰) اگر بیع و فاء عمارت و مکان ہے اور مشتری کے مدت قبضہ میں اس سے بعض عمارت منہدم ہوگئی تو اس کا ملکہ و میٹریل اسی طرح اگر بیع و فاء باغ ہے تو مدت قبضہ مشتری میں اس کے سوکھنے والے درخت اور لکڑیاں مالک کے لئے ہیں مشتری کے لئے نہیں، کیونکہ مالک ہی کو اس کے جملہ اجزاء کے ساتھ اس پر ملک عین حاصل ہے۔

(۱۱) اگر مشتری نے عمارت کو منہدم کیا یا درخت کو تلف کیا یا اس کے پھل کھائے تو بمنزلہ غاصب ہوگا اور اس پر ضمان لازم ہوگا۔

(۱۲) اگر بائع و فاء کا انتقال ہو گیا اداء دین سے قبل تو اس کے ورثہ کو حق استرداد حاصل ہوگا ایفاء دین کی شرط کے

ساتھ۔

(۱۳) اگر مشتری و فاء کا انتقال ہو گیا دین وصول کرنے سے قبل تو تمام احکام میں اس کے ورثہ اس کے قائم مقام ہوں گے، پس اگر بائع و فاء دین ادا کرتا ہے، یا اس کے ورثہ ادا کرتے ہیں تو مشتری و فاء کی موت کے بعد اس میں تقسیم میراث جاری نہ ہوگی۔

(۱۴) اگر بائع و فاء اداء دین سے قبل مشتری سے بیع و فاء کو اجارہ پر لے تو مشتری کے لئے بائع و فاء پر کوئی اجرت لازم نہیں ہوگی، کیونکہ اس نے اپنی مملوک سے انتفاع کیا ہے اور مملوک سے انتفاع کی اجرت شریعت میں نہیں ہے: ”فلا أجر له كراهن استأجر الرهن من المرتهن فإنه لا أجر له لنفعه بملكه“ (العقود الدرر ایۃ تنقیح فتاویٰ حامدیتہ)۔

(۱۵) اگر بائع و فاء نے دین کی ادائیگی کی مدت مقرر کی تھی اور مدت مقررہ گزر گئی اور مشتری و فاء کو دین ثمن بغیر کسی وجہ شرعی ادا نہیں کی تو مشتری کے لئے بیع کو فروخت کر کے ثمن وصول کرنا جائز ہے (ماخوذ از فتاویٰ حامدیتہ)۔

(۱۶) بائع جب مشتری و فاء کو اس کا ثمن ادا کر دے تو مشتری پر بیع و فاء کو واپس کرنا واجب ہے۔

دوسرا نظریہ:

دوسرا نظریہ بیع الوفاء کی بابت یہ ہے کہ یہ بیع ہے، بایں طور کہ بعض احکام میں مفید اور درست ہے۔ اس نظریے کو اختیار کرنے والے مشائخ سمرقند ہیں، ان ہی میں امام نجم الدین نسفی ہیں، جیسا کہ امام فخر الدین زلیعی نے صراحت کی ہے اور امام نجم الدین کا یہ قول بیان کیا ہے کہ ”ہمارے مشائخ نے اس زمانے میں (پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں) اتفاق رائے کیا ہے کہ بیع الوفاء بیع ہے جو بعض احکام میں جائز اور مفید ہے۔ ”ومن مشائخ سمرقند من جلعہ بیعاً جائزاً مفیداً لبعض أحكامه“ (تبيين الحقائق کتاب الاکراه) اور صاحب نہایہ کا بیان ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے، چنانچہ نہایہ کے اس بیان کو زلیعی نے ”تبيين الحقائق“ میں اور شیخی زادہ داماد افندی نے ”مجمع الانهر“ میں تحریر کیا ہے اور علامہ شامی نے زلیعی کے حوالے سے ”مطلب مسائل المتقاصہ“ کے ذیل میں ذکر کیا ہے ”قال الزلیعی فی الاکراه: و علیہ الفتوی“ اور مشائخ سمرقند کے اس اتفاق رائے کو ملا خسرو نے ”درر الحکام“ میں احمد بن موسیٰ بن عیسیٰ بن مأمون الکشی الحنفی (متوفی: ۵۵۰ھ-۱۱۵۵ء) کی کتاب ”مجموع النوازل والحوادث والواقعات“ کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور علامہ کشی صاحب ”مجموع النوازل“ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ بعض سلف کا بھی یہی مذہب تھا (کہ بیع الوفاء بیع صحیح ہے) ”ذکر فی مجموع النوازل: اتفق مشائخنا فی هذا الزمان علی صحته بیعاً علی ما کان علیہ بعض السلف“ (درر الحکام- بیع الوفاء) اور علامہ کشی کے مذکورہ بیان (کہ مشائخ زمانہ نے اس کے بیع صحیح ہونے پر اتفاق کر لیا ہے) کو ابن البرز از الکردری نے ”فتاویٰ بزازیہ“ میں عمر

بن محمد ابو حفص امام نجم الدین النسفی صاحب منظومہ (مولد: ۴۶۱ھ - متوفی ۵۳۷ھ = ۱۰۶۸ء - ۱۱۴۲ء) کے حوالے سے ذکر کیا ہے ”والقول الثانی ما ذکر الکشی عن علامة سمرقند مولانا صاحب المنظومة: أنه قال: إتفق مشائخ الزمان علی صحة هذا البیع“ (فتاویٰ البرازی علی باش الہندیہ - نوع فیما ینصل بالبیع الفاسد) اور ابن عابدین شامی نے مذکورہ بیان کو مجموع النوازل کے حوالے سے ”کتاب الاجارہ، مطلب فی المرصد والقیمۃ الخ“ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

اور ملا خسرو نے ”در الاحکام شرح غرر الاحکام“ میں بیع الوفاء کے بیان میں فقہاء کے تین اقوال ذکر کرنے کے بعد واضح طریق پر اور پر وثوق انداز میں اس کی صحت کا حکم تحریر کیا ہے، چنانچہ فرمایا کہ اراضی میں بیع الوفاء درست ہے استثنائاً تعامل کی وجہ سے ”صع بیع الوفاء فی العقاد استحساناً للتعامل“ (در الاحکام - کتاب البیوع، بیع الوفاء)۔

اور علامہ بدر الدین عینی شارح ہدایہ نے ”البنایۃ“ میں ”کتاب الاکراہ“ ”اکرہ الرجل علی بیع مالہ أو علی شراء سلعة“ کے تحت شیخ الاسلام برہان الدین المرغینانی صاحب ہدایہ کی طرف بھی اس نظریہ کو منسوب کیا ہے۔ ”واختار المصنف هذا القول، و اختیار علیہ بقوله البیع الجائز المعتاد“ اور جمال الدین رومی الباہررتی نے بھی ”عنایۃ شرح الہدایۃ“ میں یہ تحریر کیا ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

اور زیلعی نے اسی کو ترجیح دی ہے جیسا کہ ماسبق میں بیان ہوا اور امام ابن نجیم مصری نے ”بجر“ میں زیلعی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ بیع الوفاء، بیع ہے جائز ہے، مفید ہے، بعض احکام میں ”ذکر الزیلعی: أن الفتوی علی أنه بیع جائز مفید بعض أحكام“ (البحر الرائق باب خیار الشرط)۔

تیسرا نظریہ:

تیسرا نظریہ: یہ ہے کہ بیع الوفاء من وجہ بیع فاسد اور من وجہ بیع جائز ہے جس میں تفصیل یہ ہے کہ اس میں وجود شرط کے اعتبار سے اسکی چار صورتیں ہیں جن میں تین صورتیں فساد کی ہیں اور ایک صورت جواز کی ہے۔ جیسا کہ امام زیلعی نے ”تنبیین“ میں حافظ الدین ابوالبرکات النسفی (المتوفی - ۷۱۰ھ) کی ”الکافی“ کے حوالے سے ذکر کیا ہے، اور ابن البرزازی الکردری نے اس نظریہ کو حسن بن منصور معروف قاضی خاں (متوفی - ۵۹۲ھ) کی طرف منسوب کیا ہے اور علامہ بدر الدین عینی شارح ہدایہ نے ”بنایۃ“ میں قاضی خاں کے علاوہ ظہیر الدین کی طرف بھی اس نظریہ کو منسوب کیا ہے، اور غیاث الدین بغدادی نے ”مجمع الضمانات“ میں کہا ہے کہ فتاویٰ قاضی خاں میں بیع فاسد کے احکام سے کچھ پہلے مذکور ہے کہ علماء نے اختلاف کیا ہے اس بیع میں جس کا نام لوگوں نے ”بیع الوفاء“ رکھا ہے، اس کے بعد قائلین رہن کے قول کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ عقد جو لفظ بیع کے ذریعہ منعقد کیا گیا، رہن نہیں ہو سکتا ہے، پھر دیکھا جائے گا کہ اگر بیع الوفاء میں

شرط فسخ کو ذکر کیا، یعنی یہ کہا جب بائع و فاء، ثمن کو ادا کر دیا تو بیع فسخ ہو جائیگی، تو بیع الوفاء فاسد ہوگی، کیونکہ یہ شرط فاسد ہے اور اگر بوقت عقد شرط فسخ کو ذکر نہیں کیا، لیکن بیع کا تلفظ شرط و فاء کے ساتھ کیا، یعنی یہ کہا کہ میں تمہارے ہاتھ فلاں چیز بیع الوفاء کے طور پر فروخت کرتا ہوں تو یہ بھی بیع فاسد ہے، کیونکہ یہ شرط بھی مفسد عقد ہے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ عاقدین نے بیع جائز کہہ کر عقد کیا اس گمان پر یہ عقد غیر لازم ہے، یعنی دونوں کے نزدیک اسکو عقد غیر لازم سمجھا گیا ہو تو بھی بیع فاسد ہے ان کے ظن اور گمان پر عمل کرتے ہوئے اور چوتھی صورت، صورت جواز یہ ہے کہ اگر عاقدین نے بیع کرتے وقت کسی طرح کی شرط کا، یعنی شرط فسخ یا شرط و فاء کا ذکر نہیں کیا اور عقد کے بعد شرط لگائی وعدہ کے طور پر، لہذا بیع جائز ہوگی، کیونکہ اس وقت بیع ہر طرح کی شرط مفسد سے خالی ہے اور اس شرط کا پورا کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وعدے بسا اوقات لازم ہوتے ہیں، پس اس وعدے کو لوگوں کی حاجت کی بناء پر لازم قرار دیا جائیگا یعنی اس کا پورا کرنا لازم ہوگا۔

چنانچہ ”درالحکام“ میں ہے ”قائلہ قاضی خان (الصحيح أنه) أي العقد الذي جرى بينهما (ان كان بلفظ البيع لا يكون رهناً) لأن كلاً منهما عقد مستقل شرعاً، لكل منهما أحكام مستقلة، بل يكون بيعاً (فان شرطاً) أي العاقدان (الفسخ فيه) أي في العقد (فسد) لأن البيع يفسد به (كذا) أي يفسد أيضاً (ان لم يشترطاه) أي الفسخ، ولكن (تلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء) لأن هذا الشرط مفسد له (أو تلفظاً) (بالبيع الجائز وعندهما) أي والحال أن في زعمهما (هو بيع غير لازم) فإنه أيضاً يفسد حينئذ عملاً بزعمهما، (وان ذكر) أي العاقدان (البيع من غير شرط ثم ذكر) أي الشرط (على وجه الميعاد جاز) أي البيع لخلوه عن المفسد (ويلزم الوفاء به) لأن المواعيد قد تكون لازمة فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس“ (درالحکام شرح غرر الاحکام، بیع الوفاء ۲۰۷/۲)۔

اور ”البحر الرائق“ میں علامہ ابن نجیم مصری نے چوتھی صورت، یعنی صورت جواز ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ بعد عقد شرط بطور موعده ہے، پس بیع جائز ہے اور شرط کو پورا کرنا لازم ہے، اس پر دلیل ذکر کی کہ بعض وقت وعدوں کا پورا کرنا لازم ہوتا ہے لوگوں کی حاجت کی وجہ سے اور حاجت عقد مذکور میں رہا سے چمنا ہے، کیونکہ اہل بلخ قرض و دین لینے و دینے اور اشیاء کو اجارہ پر لینے و دینے کے عادی تھے اور وہاں انگوروں کی پیداوار ہوتی ہے اور انگوروں میں اجارہ شرعاً درست نہیں، یعنی اگر کوئی شخص انگور کے درختوں اور بیلوں کا عقد اجارہ کرے، تاکہ ان سے انگور حاصل کرے تو شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اجارہ نام ہے عقد المنفعة بالعوض کا، نہ کہ بیع العین کا اور صورت مذکورہ میں بیع العین ہونا لازم آ رہا ہے، لہذا انگوروں کی بیلوں کا اجارہ درست نہیں اس وجہ سے وہ مجبور ہوئے ان کی بیع و فاء کے طور پر فروخت کرنے کی طرف، تاکہ مالک، یعنی بائع و فاء اپنے مشتری سے ثمن وصول کر کے حاجت کو پورا کرے اور مشتری اداء ثمن تک بیع و فاء سے فائدہ حاصل کرتا رہے، یعنی انگوروں کی

فصل حاصل کرتا ہے کہ اگر یہ معاملہ بطور رہن کرتا تو قرض سے نفع حاصل کرنا لازم آتا جو رہا ہے اور اہل بلخ کے پاس عموماً انگور کے باغات کے علاوہ دیگر ذرائع معاش نہ تھے، اس لیے حاجت ہوئی کہ بیع و فاء کے طور پر معاملہ کیا جائے..... اسی طرح اہل بخاری عادی تھے طویل مدت تک کے لیے اجارے کے معاملات طے کرنے کے اور درختوں کو بیع الوفاء کے طور پر فروخت کرنے کے لیے اور درختوں میں اس طرح کا اجارہ شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے وہ بھی مجبور ہوئے اپنے باغات اور درختوں کو بیع و فاء کے طور پر فروخت کرنے پر، اور لوگوں پر جس معاملے میں تنگی ہو جاتی ہے تو شرعاً اس کے حکم میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے، لوگوں سے رفع حرج کے لیے۔

پس اگر بیع الوفاء کی پہلی صورت اختیار کی جائے کہ جس میں عقد بیع سے قبل یا بوقت عقد شرط فسخ ذکر کی تو اس کا فاسد ہونا ظاہر ہے، اسی طرح اگر دوسری صورت اختیار کی جائے کہ جس میں بیع و فاء کے ساتھ تلفظ کے ذریعے عقد کیا تو وہ بھی بیع و شرط ہے، لہذا وہ بھی فاسد ہے، پس دونوں صورتیں شرط مفسد پائے جانے کی وجہ سے فاسد تھیں۔ اور تیسری صورت میں عقد غیر لازم قرار دینے کی وجہ سے بیع ہی منعقد نہیں تو وہ بھی فاسد ہے، لہذا مذکورہ تینوں صورتیں شرعاً ناجائز ہیں۔ پس باقی ایک صورت رہی کہ اگر بغیر شرط ذکر کئے عقد کیا پھر اس کے بعد شرط ذکر کی تو عقد جائز ہے، کیونکہ بعد العقد شرط مفسد نہیں ہے اور اس پر بطور استنبہ امام صاحبؒ کی ایک غریب روایت کا حوالہ دیا کہ بیع تلجیہ نہیں ہوتی جب تک کہ عقد میں اسکی صراحت نہ کر دی جائے اور بیع تلجیہ اور بیع و فاء دونوں ایک ہی ہیں، لہذا بیع و فاء بھی فاسد اسی وقت ہوگی جب کہ شرط، عقد میں مذکور ہو اور اگر بعد العقد مذکور ہو تو مفسد عقد نہیں ہے، البتہ اس شرط کا پورا کرنا قضاءً لازم قرار دیا جائے گا حاجت الناس کی بناء پر کیونکہ اس شرط کو حاجت کی بناء پر اس وعدے کے مانند قرار دیا جائے گا جس کا پورا کرنا قضاءً لازم ہوتا ہے۔

بحر کی عبارت ملاحظہ ہو: ”وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا، فبلخ اعتادوا الدين والجاراة وهي لا تصح في الكروم، وبخارى الجارة الطويلة ولا يكون ذالك في الاشجار فاضطر والى بيعها وفاء وماضاق على الناس أمر الاتسع حكمه، وقد نص في غريب الرواية عن الامام أن البيع لا يكون تلجنة حتى ينص عليها في العقد، وهي والوفاء واحد“ (البحر الرائق ۸/۶)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان عبارات میں غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریے کی بناء تین امور پر ہے، (۱) عقد میں شرط ہے تو عقد فاسد ہے (۲) بعد العقد شرط مذکور ہوئی تو عقد جائز ہے (۳) بعد العقد مذکور شرط، بمنزلہ وعدہ ہے اور بعض وقت مواعید کو پورا کرنا لازم ہوتا ہے، چنانچہ اس مقام پر شرط بیع اور مواعید کی شرعی حیثیت کیا ہے اس پر کلام کرنا بھی مناسب ہے، تا کہ بصیرت کے ساتھ فیصلہ کیا جاسکے۔

چوتھا نظریہ:

چوتھا نظریہ ہے کہ بیع الوفاء، بیع فاسد ہے اس کو امام ظہیر الدین نے اختیار کیا ہے اور عدہ میں مذکور ہے۔ اور اس نظریہ

کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ اس میں شرط و فاء شرط فاسد ہے اور شرط فاسد جب صلب عقد میں موجود ہو تو بیع فاسد ہوتی ہے۔
بیع میں الحاق شرط فاسد کی صورتیں:

شرط فاسد کا الحاق بیع کے ساتھ تین طرح ہو سکتا ہے۔

پہلی صورت: بوقت عقد شرط و فاء کو ذکر کیا ہو، مثلاً بائع نے کہا کہ جب میں ثمن واپس کر دوں تو آپ بیع میری طرف واپس کر دیں اس شرط پر میں عقد کرتا ہوں۔ یا بوقت عقد شرط فسخ کو ذکر کیا ہو، مثلاً مشتری نے کہا کہ اس شرط پر معاملہ کرتا ہوں کہ جب میری طرف ثمن لوٹ کر آجائے گی تو بیع فسخ کر دی جائے گی تو اس سے عقد فاسد ہو جائیگا۔

دوسری صورت: اور اگر عقد کے بعد شرط کو ذکر کیا ہے تو اصل عقد کے ساتھ لاحق ہو کر مفسد عقد ہوگی یا نہیں اس میں دو طرح سے اختلاف واقع ہوا ہے، ایک یہ ہے کہ اگر ذکر شرط کے وقت تک مجلس عقد باقی تھی، اصل عقد کے ساتھ لاحق ہو کر مفسد بیع ہوگی اور اگر مجلس عقد ختم ہو گئی تھی اس کے بعد شرط کو ذکر کیا ہے تو اب اصل عقد کے ساتھ لاحق نہ ہوگی، بلکہ یہ شرط لغو ہوگی اور عقد جائز ہوگا، چنانچہ شمس الائمہ سرخسی اور ابوالیسر نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ الحاق شرط کے لیے مجلس عقد شرط ہے اور ابوالفضل کرمانی (متوفی ۵۴۳ھ) کی ایضاً سے ثابت ہے کہ مجلس عقد شرط نہیں اور ابن عابدین شامی نے اصل کے حوالے سے ذکر کیا ہے ”لکن فی الأصل أنه یلتحق عند أبي حنیفة وإن كان اللاحق بعد الافتراق عن المجلس“ (شامی کتاب البیوع، مطلب فی البیع بشرط فاسد) کہ اصل میں ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک شرط اصل عقد کے ساتھ لاحق ہوگی اگرچہ مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد شرط کو لاحق کیا ہو۔ نیز جامع الفصولین اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ صحیح یہ ہے کہ الحاق شرط کے لیے مجلس عقد شرط نہیں ہے: ”وفی جامع الفصولین اختلف فیہ المشائخ والصحيح أنه لا یشتراط ومثله فی البزازیة“ (شامی ۲۷۸/۵)۔

شرط لاحق کی بابت امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف:

چنانچہ شمس الائمہ سرخسی نے ”مبسوط“ کی کتاب الصرف، میں ”باب الاجارة فی عمل التمیویة“ کے ذیل میں اختلاف ذکر کیا ہے کہ بیع میں شرط فاسد جب بعد العقد ذکر کی جائے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ شرط اصل عقد کے ساتھ لاحق ہوگی اور شامی میں ہے کہ اگرچہ وہ شرط فاسد مجلس عقد سے جدا ہونے کے بعد لاحق کی ہو تو اس سے عقد فاسد ہو جائیگی ”وعند أبي حنیفة یلتحق ذالک بأصل العقد حتی یفسد العقد“ اور صاحبین کے نزدیک شرط باطل ہوگی اور عقد جائز ہوگا ”وعندهما یبطل هذا الشرط“ اور صاحبین کی اس پر دو دلیل ہیں، چنانچہ پہلی دلیل ہے کہ شرط بھی ایک طرح بیع ہی ہے اور یہ بات جائز نہیں کہ ایک شئی بیع ہو اور وہ بیع کے لیے مبطل ہو، یعنی شرط گویا کہ جزء بیع ہوتی ہے اور ایسا نہیں ہوتا ہے کہ جزء بیع، خود بیع ہی کے لیے مبطل ہو، بلکہ وہ خود ہی باطل ہوگا، لہذا شرط لاحق باطل اور عقد جائز ہوگا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ شرط لاحق کا اثبات، خود شرط لاحق کے ابطال کو مستلزم ہے، کیونکہ شرط کی صحت عقد کی صحت پر موقوف ہے اور جب ہم اصل عقد کے ساتھ التحاق کے طور پر اس شرط کو ثابت کریں تو اس سے عقد باطل ہو جائیگا اور بطلان عقد سے وہ شرط بھی باطل ہو جائے گی پس اب بھی اُس شرط لاحق کا ابطال ہی لازم آیا، لہذا اصل عقد کے ساتھ التحاق کرنا غیر مفید اور لایعنی امر میں مشغول ہونا ہے اور ایسے امر میں اشتغال سے اجتناب شرعاً محمود و مقصود ہے، اس لیے اس سے اجتناب کے طور پر ہم نے کہا کہ شرط لاحق ہی باطل ہے، قبل ازیں مفسد سے خالی ہو کر منعقد ہوا تھا وہ جائز ہے ”و حجتہما فی ذالک، أن الشرط بیع فی العقد، ولایجوز أن یکون البیع فی الشی مبطلاً لأصله، ولأن فی اثبات الشرط المذكور إبطاله؛ لأن صحة ذالک بصحة العقد، فإذا أثبتنا ذالک علی سبیل الالتحاق بأصل العقد یطل العقد به، وببطلان العقد تبطل، فیکون هذا اشتغالا بمالا یفید“ اور امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ جس معنی کی وجہ سے شرط صحیح کا التحاق اصل عقد کے ساتھ ہوتا ہے وہ معنی شرط فاسد میں بھی موجود ہیں اور وہ معنی ہیں وصف عقد کی تغیر کا قصد کرنا کہ شرط صحیح عقد خاص کو راجح اور لازم کو غیر لازم کر دیتی ہے اور عقد میں یہ تصرف دونوں فریق کی ہی طرف منسوب ہوتے ہیں کہ عقد کو فسخ کرنے اور اس کو باقی رکھنے کا اختیار دونوں ہی کو ہوتا ہے، پس اسی طرح تغیر وصف کا اختیار بھی دونوں کو ہوگا۔ یعنی جب عاقدین فسخ عقد اور ابقاء عقد کے مالک ہیں تو اس کے وصف کی تغیر کے بھی مالک ہیں، کیونکہ صفت شئی پر ملک اصل شئی پر ملک حاصل ہونے سے ہوتی ہے۔ اور یہ معنی یہاں یعنی شرط فاسد میں بھی موجود ہیں، کیونکہ عاقدین نے وصف عقد کو جواز سے فساد کی طرف متغیر کر دیا ہے اور تغیر کا تصرف دونوں ہی کی طرف منسوب ہے، گویا کہ ایسا امر ہو گیا کہ جس پر عاقدین کا اتفاق ہو گیا ہو اور بعد العقد جس امر پر اتفاق واقع ہو جاتا ہے تو وہ اس امر کے مانند قرار دیا جاتا ہے جو اصل عقد میں مذکور ہو اور وہ امر ایسا ہو کہ اگر اصل عقد میں ذکر کیا جاتا تو وہ ثابت ہوتا اور عقد اس سے فاسد ہو جاتا تو پس اسی طرح جب وہ بعد العقد ذکر کیا جائے تو عقد فاسد ہو جائے گا، ”و أبو حنیفة یقول، المعنی الذی لأجله یتحقق الشرط الصحیح بأصل العقد موجودہنا، و ذالک المعنی هو، أنہما قصداً تغیر وصف العقد، یجعل الخاسر رابحاً، واللزام غیر لازم، والتصرف فی العقد وإیہا، ألتری أنہما یملکان فسخه و ابقاءه، فکذا لک یملکان تغیر وصفه، لأن صفة الشئی تملک بملک أصله، و هذا المعنی موجودہنا، فانہما غیرا وصف العقد من الجواز إلی الفساد، وإیہما ذالک، فمواقع علیہ الاتفاق بعد العقد، یجعل کالمذکور فی أصل العقد، ولو ذکر فی أصل العقد ثبت، وإن فسد به العقد، فکذا لک إذا ذکر بعد العقد“ (مبسوط السرخسی، کتاب الاجارہ، باب الاجارۃ فی عمل التمیۃ ۸۲/۱۳)۔

اور علامہ کاسانی نے ”البدائع الصنائع“ میں ذکر کیا ہے کہ عقد کے ساتھ شرط فاسد کا قرآن اور الحاق امام ابوحنیفہ کے

نزدیک برابر ہے حتی کہ اگر بیع صحیح کی تھی پھر اس کے ساتھ شرط مفسدہ میں سے کوئی شرط لاحق کر دی عقد کے ساتھ تو وہ عقد کو فاسد کر دے گی۔

اور صاحبین کے نزدیک وہ شرط لاحق نہ عقد کے ساتھ لاحق ہوگی اور نہ اس سے عقد فاسد ہوگا اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر عقد صحیح کے ساتھ شرط صحیح لاحق کی جیسا کہ بیع بات اور اس جیسی بیوع میں اختیار صحیح کی شرط تو وہ شرط عقد کے ساتھ لاحق ہو جاتی ہے۔

صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ عقد کے ساتھ شرط فاسد کا الحاق عقد کو صحت سے فساد کی طرف بدل دیگا، لہذا شرط صحیح نہیں ہے باطل ہے۔ پس عقد جو صحت کے ساتھ واقع ہوا تھا وہ ایسا ہی رہے، جیسا تھا، اس لیے کہ عقد (ایجاب و قبول کا نام ہے اور وہ) کلام ہے اور کلام کے لیے تکلم کے بعد بقاء نہیں رہتی ہے، بلکہ معدوم ہو جاتا ہے، پس اس کے ساتھ الخاق کرنا معدوم کے ساتھ الخاق کرنا ہے اور یہ جائز نہیں ہے اور رہی یہ بات کہ شرط صحیح کا الخاق کیونکر صحیح ہوتا ہے اس میں معدوم کے ساتھ الخاق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مناسب تو یہی تھا کہ عقد کے ساتھ کسی بھی طرح کی شرط کا الخاق قطعاً نہ ہوتا، مگر اصل عقد کے ساتھ شرط صحیح کا الخاق شریعت سے ثابت ہے بر بناء حاجت یہی وجہ ہے کہ شرط صحیح کا قرآن عقد کے ساتھ شرعاً درست ہے تو اس کا الخاق بھی حاجت کی بناء پر شرعاً درست ہے اور شرط فاسد کے الخاق کی طرف کوئی حاجت نہیں ہے، تا کہ وہ عقد کو فاسد کرے یہی وجہ ہے کہ شرط فاسد کا قرآن عقد کے ساتھ درست نہیں ہے، لہذا الخاق بھی درست نہیں ہے: ”وجہ قولہما، أن الحاق الشرط الفاسد بالعقد یغیر العقد من الصحة إلى الفساد فلا یصح، فبقی العقد صحیحاً کماکان، لأن العقد کلام لا بقاء له، واللاحق بالمعدوم لا یجوز، فکان ینبغی أن لا یصح اللاحق أصلاً، إلا أن الحاق الشرط الصحیح بأصل العقد ثبت شرعاً للحاجة إلیه حتی صح قرآنه بالعقد، فیصح إلیه، فلا حاجة إلی الحاق الشرط الفاسد لیفسد العقد، ولہذا لا یصح قرآنه بالعقد“۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ تصرف کا اعتبار اسی طریق پر واجب ہے جس پر متصرف نے اس کو واقع کیا ہے، جبکہ متصرف اس کا اہل ہو اور محل قابل ہو اور اس نے شرط کو مفسد عقد بنا کر واقع کیا ہے، اس لیے کہ الخاق فساد عقد کے لیے ہے تو پس اس کا اعتبار واجب ہے اسی طرح کہ جس طرح اس وقت تھا جب کہ وہ شرط فاسد کو اصل عقد میں واقع کرتا۔

اور رہا صاحبین کا یہ کہنا کہ الخاق عقد میں کیا تغیر کرنا ہے؟

ہم اس کا جواب دیں گے کہ اگر وہ تغیر ہے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ عاقدین کو ولایت تغیر حاصل ہے، کیا یہ نہیں دیکھا کہ شمن و بیع میں زیادتی کے ذریعے اور شمن سے کمی کرنے کے ذریعے تغیر کی ولایت ان دونوں کو حاصل ہے اور شرط صحیح

کے ذریعہ بھی تغیر ہے اور ولایت و تغیر کا حصول اس لیے ہے کہ وہ دونوں فتح کے مالک ہیں تو تغیر کے بدرجہ اولیٰ مالک ہوں گے، کیونکہ تغیر تو صرف وصف کو تبدیل کرنا ہے اور فتح تو اصل عقد اور وصف عقد دونوں کو ختم کر دیتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: البدائع الصنائع، کتاب البیوع، فصل فی شرائط الصحۃ فی البیوع ۴/۳۸۸)۔

ترجیح:

علامہ ابن نجیم مصریٰ نے ”البحر الرائق“ میں فرمایا ہے کہ شرط فاسد کا اگر عقد کے بعد الحاق کیا تو کہا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اصل عقد کے ساتھ لاحق ہو جائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہیں لاحق ہوگی۔ اور اصح قول یہی ہے، جیسا کہ جامع الفصولین کی انتالیسویں فصل میں مذکور ہے۔ ”أن الشرط الفاسد لو التحق بعد العقد قيل: يلتحق عند أبي حنيفة؛ وقيل: لا، وهو الأصح كما في جامع الفصولين في الفصل التاسع والثلاثين“ (البحر، باب البيع الفاسد ۶/۹۴)، مذکورہ عبارت میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں قول امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہیں کیونکہ کہا گیا ”قيل يلتحق عند أبي حنيفة، وقيل لا“ تو گویا کہ ناقلین کا اختلاف ہے کہ بعض نے قول اثبات کو ترجیح دی اور بعض نے قول نفی کو ترجیح دے کر بیان کیا ہے۔ اور علامہ شامی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ عدم الحاق کا قول امام صاحب سے دوسری روایت ہے چنانچہ مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں: ”قلت هذه الرواية الاخرى عند أبي حنيفة“ (شامی، کتاب البیوع، مطلب فی البيع بشرط فاسد)۔

میں نے کہا کہ یہ (قول نفی) امام ابوحنیفہؒ سے دوسری روایت ہے۔ حالانکہ ماسبق میں مبسوط السرخسی اور البدائع الصنائع کی عبارات مذکورہ سے ثابت ہے کہ قول الحاق امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے اور قول عدم الحاق صاحبین کا قول ہے اور شامی نے ”جامع الفصولین“ کی جو عبارت پیش کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے ”ثم رمز أنه يلتحق عنده لا عندهم“ (حوالہ بالال) اور علامہ حسکلی نے بھی ”نہر“ کے حوالے سے یہی اختلاف بیان کیا ہے۔ ”الشرط الفاسد يلتحق بأصل العقد عنده خلافا لهما، نہر“ (شامی، باب الصرف، فرع) اور ابن نجیم مصریٰ کی بھی عبارت سے دوسرے مقام پر ثابت ہے کہ الحاق قول امام ہے اور عدم الحاق قول صاحبین ہے ”فمن أصل أبي حنيفة التحاقه ويفسد العقد، ومن أصلهما عدم التحاقه“ (البحر الرائق، کتاب الصرف ۶/۲۰۹)۔

لہذا معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہؒ سے دو روایتیں ثابت ہیں، لیکن ظاہر الروایہ قول الحاق ہے، جیسا کہ ”جامع الفصولین“ میں اسکی صراحت مذکور ہے: ”ولكن في الأصل إذا ألحق بالبيع شرطا فاسدا يلتحق عند أبي حنيفة، وإن كان الحاق بعد الافتراق عن المجلس“ (البحر الرائق، باب البيع الفاسد ۶/۹۴)۔

اور قول عدم الحاق غیر ظاہر الروایہ ہے، لیکن صاحبین نے اسی کو اختیار کیا ہے، کیونکہ اس میں توسع ہے حاجتہ الناس کی

رعایت ہے، اور ان سے رفع حرج کی صورت ہے، اسی لیے ”جامع الفصولین“ میں اس کو اس طرح قرار دیا ہے۔
 تنبیہ: زیر بحث نظریے کی بناء ظاہر الروایۃ یعنی قول الحاق پر ہے، لہذا یہ دوسری صورت کہ بعد العقد شرط وفاء یا شرط فسخ کا ذکر کیا گیا تو یہ بھی فاسد ہے۔

تیسری صورت:۔ عقد کے ساتھ شرط فاسد کے موجود ہونے کی تیسری صورت یہ ہے کہ عاقدین قبل العقد شرط کا ذکر کریں، پھر مطلقاً عقد کریں، یعنی بوقت عقد شرط کو دوبارہ ذکر نہیں کیا تو اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ شرط متقدم پر عقد کی بناء کا اگر عاقدین کو اقرار نہیں ہے تو عقد جائز ہے، کیونکہ سابق کا اعتبار نہیں ہوتا، جیسا کہ بیع تلجہ میں ہوتا ہے امام صاحب کے نزدیک۔ اور بیع تلجہ یہ ہے کہ کسی خوف کی وجہ سے عاقدین خفیہ طور پر اس بات پر اتفاق کر لیں کہ وہ بیع ظاہر کریں گے، لیکن حقیقتاً وہ بیع نہیں ہوگی محض ریا کاری اور دکھلاوا ہوگا مثلاً آدمی کسی سے کہے کہ میں یہ ظاہر کروں گا کہ میں نے اپنا گھر تیرے ہاتھ فروخت کیا اور وہ درحقیقت بیع نہیں ہوگی تو یہ بیع تلجہ کہلاتی ہے، پس اس کے بعد عاقدین نے بیع کی تو اس کے بارے میں امام صاحب سے دو روایتیں منقول ہیں ایک یہ کہ بیع باطل ہے اور صاحبین کا یہ ہی قول ہے اور اس قول پر دلیل یہ ہے کہ عاقدین نے صیغہ بیع کا کلمہ کیا ہے حقیقت بیع کا قصد کئے بغیر اور یہ ہی معنی ہزل کے ہیں اور ہزل جواز بیع سے مانع ہوتا ہے، کیونکہ اس میں رضا مفقود ہوتی ہے جو انعقاد بیع کے لیے شرط ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ بیع جائز ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ خفیہ طور پر جو شرط ٹھہرائی تھی بوقت عقد انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ شرائط صحت کے ساتھ عقد صحیح کیا ہے، لہذا شرط متقدم اس میں مؤثر نہیں ہوگی اسی طرح کہ عاقدین جب اس امر پر اتفاق کر لیں کہ بیع کے وقت وہ شرط فاسد لگائیں گے پھر بغیر شرط کے بیع کی تو اس میں شرط متقدم کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے ”لأنهما شرطاه فی السر لم یدکراہ فی العقد، وإنما عقدا عقدا صحیحاً بشرائطه فلا یؤثر فیہ ما تقدم من الشرط، کما إذا اتفقا علی أن یشترطا شرطاً فاسداً عند البیع ثم باع من غیر شرط“ (البدائع، فصل فی شرائط الصیغۃ فی البیوع ۱۷۶/۵)۔

پس زیر بحث صورت کہ جب قبل عقد شرط کا ذکر کیا اور بوقت عقد ذکر نہیں کیا اور شرط متقدم پر بناء کا اقرار بھی نہیں تو بیع تلجہ کی صورت مذکورہ پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہے کہ شرط متقدم اس میں مؤثر نہ ہوگی۔ اور اگر شرط متقدم پر بناء کا اقرار ہے تو بیع فاسد ہے اور اس کا فساد واضح ہے۔

پانچواں نظریہ:

پانچواں نظریہ ہے کہ بیع الوفاء من وجہ رہن ہے اور من وجہ بیع نافذ ہے۔ اور یہ ائمہ خواریزم کا مختار مذہب ہے۔ اس میں تفصیل یہ ہے کہ رہن تسلیم کریں یا بیع نافذ، بہر صورت لازم ہے کہ عقد بیع کو مطلق رکھا جائے، اس میں وفاء کی شرط نہ لگائیں، کیونکہ اگر وفاء کی شرط عقد میں لگائی گئی تو شرط مفسد پائے جانے کی وجہ سے عقد فاسد ہوگا۔ اس لیے علماء خواریزم نے

شرط لگائی کہ عقد کو مطلق رکھا جائے اس میں کسی طرح کی شرط ذکر نہ کی جائے، یعنی بائع یہ نہ کہے کہ میں تمہارے ہاتھ فلاں چیز اتنے روپیے کے بدلے میں یا یہ کہے کہ اس قرض کے بدلے میں جو تمہارے لیے جو مجھ پر ہے فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ جب آپ کا ثمن ادا کر دوں یا یہ کہے کہ جب میں آپ کا قرض ادا کر دوں تو بیع فسخ ہو جائے گی یا یہ کہے کہ میری بیع مجھے واپس کر دینا۔ بلکہ بائع شرط و فاء یا شرط فسخ سے سکوت اختیار کرے اسی طرح مشتری یہ نہ کہے کہ اس شرط پر خریدتا ہوں کہ جب تم ثمن واپس کر دو گے یا یہ کہے کہ جب تم میرا قرض ادا کر دو گے تو میں یہ بیع فسخ کر دوں گا یا یہ کہے کہ تمہاری بیع تم کو واپس کر دوں گا۔ بلکہ مشتری اسی طرح کی شرط سے سکوت اختیار کرے۔

پس جب بیع کو عاقبتین نے مطلق رکھا ہے تو اب حکم جواز پر باقی رہتے ہوئے معاملہ و فاء کی چند صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں رہن کا حکم ہے اور بعض میں بیع نافذ کا حکم ہے۔

رہن کی صورتیں:

اس نظر یہ کے اعتبار سے رہن کی تین صورتیں مذکور ہیں۔

پہلی صورت: یہ ہے کہ مشتری کسی غیر کو وکیل بنا دے بعد العقد کہ اگر بائع ثمن لے کر آئے تو بیع فسخ کر دینا، لہذا یہ رہن ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشتری کا وکیل بائع قریبہ ہے اس امر پر کہ انہوں عقد سابق سے بیع لازم کا قصد نہیں کیا تھا۔

دوسری صورت: یہ ہے کہ عقد کے بعد مشتری خود بائع سے اس امر پر عہد کرے کہ جب وہ ثمن ادا کر دے گا تو وہ بیع فسخ کر دے گا پس اب اس معاملے کی دو صورتیں ہیں منجملہ ایک یہ کہ مشتری نے جو ثمن دی ہے وہ بیع کی ثمن مثل کے برابر ہے تو بیع نافذ ہے، کیونکہ اشیاء عموماً اپنی ثمن مثل پر ہی فروخت کی جاتی ہے، لہذا ثمن کا ثمن مثل کے معادل ہونا بیع نافذ پر قریبہ ہے اور اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری کی ثمن کی مقدار بیع کی ثمن مثل کی مقدار سے کم ہے تو اس کی دو حالتیں ہیں کہ مذکورہ قلت میں غبن لیسر لازم آئے گا یا غبن فاحش، اگر غبن لیسر لازم آ رہا ہے تو یہ بھی بیع نافذ ہے، کیونکہ اتنے غبن میں تسامح اختیار کیا جاتا ہے، لہذا یہ بھی ثمن مثل کے معادل ہونے کی مانند ہے اور اگر غبن فاحش لازم آ رہا ہے تو اس کی بھی دو حالتیں ہیں یا تو بائع کو غبن فاحش کا علم نہیں ہے یا علم ہے، اگر علم نہیں ہے تو بھی بیع نافذ ہے، کیونکہ عموماً بیع خاص میں ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ بیع خاص ہوگی اور بیع خاص بھی بیع نافذ ہے اور اگر بائع کو غبن فاحش کا علم ہے تو یہ رہن ہے، کیونکہ غبن فاحش پر علم کے باوجود عموماً بیع نہیں کی جاتی ہے، لہذا غبن فاحش معلوم ہونے کے باوجود عقد پر اقدام کرنا اس امر پر قریبہ ہے کہ بائع نے بیع لازم کا قصد نہیں کیا ہے اور اگر بیع لازم کا قصد کرتا تو غبن فاحش پر راضی نہ ہوتا، کیونکہ بیع میں غبن فاحش پر تسامح اختیار نہیں کی جاتی ہے تو گویا کہ رہن کی دوسری صورت یہ ہوئی کہ مشتری نے بائع سے عقد کے بعد اس امر پر عہد کیا کہ جب وہ ثمن واپس کر دے گا تو یہ بیع فسخ کر دے گا اور ثمن مشتری، بیع کی ثمن مثل سے بائیس طور کم ہے کہ اس میں غبن فاحش ہے اور بائع کو معلوم ہے، لہذا یہ رہن ہے۔

تیسری صورت: یہ ہے کہ عقد کے بعد مشتری نے بائع سے اس امر پر عہد کیا کہ اگر ثمن کو واپسی کے وقت بطور نفع مقدار معین کے ساتھ زائد رقم دے تو وہ بیع کو فسخ کر دیگا، یعنی مثلاً مشتری نے ایک ہزار روپے بائع کو بطور ثمن دیئے تھے بعد میں اس سے عہد کیا کہ جب وہ بیع کو واپس لینے کے لیے ثمن ادا کریگا تو مثلاً پانچ سو روپے زائد مقدار بطور نفع دے گا، لہذا یہ بھی رہن ہے، کیونکہ بطور نفع مقدار زائد کو لازم کرنا ثمن فاحش کے مانند ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں نے عقد سابق سے بیع لازم مراد نہیں لیا ہے، لہذا رہن ہے کیونکہ بیع نافذ میں اصل ثمن پر پہلے سے نفع معہود نہیں ہوتا ہے۔

چھٹا نظریہ:

چھٹا نظریہ ہے کہ بیع الوفاء بیع صحیح اور رہن سے مرکب ایک عقد ہے کہ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اور بائع کے حق میں رہن ہے۔ اور اس نظریے کو امام الزاهد الصفا ابو اسحاق البخاری (متوفی ۵۳۴ھ) نے اختیار کیا ہے اور ان کے علاوہ دیگر بعض فقہاء نے بھی اختیار کیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ بیع میں جب کوئی شرط مذکور نہ ہو تو وہ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہوگی۔ اور وہ اس سے انتفاع کا مالک ہوگا۔ اور بائع کے حق میں رہن ہوگا، کیونکہ بیع وفاء میں اداء ثمن کے وقت ر بیع کے معنی ملحوظ رہتے ہیں، لہذا بائع کے حق میں رہن تسلیم کیا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ مشتری کو اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنا قبضہ یا اپنی ملک انتفاع کسی غیر کے طرف منتقل کرے، کیونکہ بیع اس کے پاس مثل امانت اور شئی مرہون کے ہے، اس پر دوسرے کی تسلیط، تعدی شمار ہوگی جو جائز نہیں ہے، اسی لیے یہ بھی حکم ہے کہ بائع جب ثمن واپس کر دے تو مشتری کو بیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا۔ پس اس میں دو عقد کی مشابہت ہے، جیسا کہ زرافہ جانور میں کئی جانوروں کی مشابہت ہے، چنانچہ ابن قتیبہ دینوری (متوفی ۲۷۶ھ) فرماتے ہیں: ”الزرافة وله خطم طويل كخطم الجمل و جلد النمر والرأس والأظلاف للبقر والذنب للظبي“ (الجرام، کتاب النعم والجهنم والوش والاسباع ۲۴۶/۲) کہ زرافہ جانور کی گردن لمبی ہوتی ہے اونٹ کی گردن کی مانند اور کھال چیتے کے مانند اور سر اور کھر گائے کے مانند اور دم ہرن کے مانند ہوتی ہے۔

پس اسی طرح بیع الوفاء دو عقدوں کی مشابہت رکھتی ہے اور ایسے بہت سے احکام ہیں کہ ان کے لیے دو عقد کا حکم ثابت ہے، جیسا کہ مرض الوفا میں ہبہ یا موصوب لہ سے شئی موصوب کے بدلے عوض کی شرط کے ساتھ کیا گیا ہبہ کہ اپنی لفظی حقیقت کے اعتبار سے ہبہ ہے اور معنوی اعتبار سے بیع کا حکم بھی ہے۔

اور ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ بیع الوفاء اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو ممنوع ہے، لیکن لوگوں کی اس کی طرف حاجت کی بناء پر اور رہا سے بچنے کے لیے بطور حیلہ ہم نے ایسا کیا ہے، کیونکہ اہل بلخ قرض اور اجارہ کے عادی تھے اور ان کے یہاں انگور کی پیداوار ہوتی ہے اور انگور کی بیلوں میں اجارہ شرعاً درست نہیں اور اہل بخاری طویل اجارہ کے عادی تھے اور اجارہ طویلہ درختوں میں ممکن نہیں، اس لیے وہ مجبور ہوئے کہ بیع الوفاء کے طور پر معاملہ طے کریں، کیونکہ اس کے علاوہ دوسری تدبیر

نہیں، پس اگر مطلقاً اس کو جائز قرار دیا جائے تو ربا اور سود کے معنی لازم آتے ہیں، یعنی قرض سے نفع حاصل کرنا اور اگر مطلقاً ممنوع قرار دیں تو لوگ تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں، اس لیے بر بناء حاجت مشتری کے حق میں بیع قرار دی، تاکہ وہ اس سے انتفاع کر سکے اور قرض سے نفع حاصل کرنے کے معنی پیدا نہ ہوں۔ اور بائع کے حق میں رہن قرار دی، تاکہ اس کی مملوک اس کے پاس بھی رہے اور حاجت بھی پوری ہو جائے اور تنگی سے نکل جائے۔ اور شریعت نے ایسے موقع پر کہ جب لوگوں کو تنگی لاحق ہو تو اس امر میں تخفیف و توسع کو اختیار کیا ہے، پس یہ حکم بھی توسع پر محمول ہے، لیکن یہ تمام تقریر، یعنی مشتری کے حق میں بیع صحیح ہونا اور بائع کے حق میں رہن ہونا اس وقت صحیح ہوگا، جبکہ بیع میں شرط و فاء یا شرط فسخ ذکر نہ کی جائے اور یہ شرط اس لیے لگائی ہے کہ امام صاحب سے غریب الروایۃ میں صراحۃً منقول ہے کہ بیع تبجہ نہیں ہوتی ہے، تا آنکہ عقد میں اس کی صراحت کر دی جائے اور بیع تبجہ اور بیع الوفاء حکم میں ایک ہیں کہ دونوں میں حکم بطلان ہے، پس جب بیع میں شرط و فاء یا شرط فسخ مذکور نہ ہو تو وہ بیع باطل نہ ہوگی۔

تنقیدات:

نقد اول:۔ بیع الوفاء کا رہن ہونا باطل ہے، جیسا کہ ماسبق میں اس کو دلائل کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے، پس بائع کے حق میں بھی رہن ہونا باطل ہے، کیونکہ اس نے یہ معاملہ لفظ بیع کے ذریعے کیا ہے۔

نقد دوم:۔ بیع صحیح افادۃً ملک میں بائع و مشتری دونوں کے لیے برابر ہے کہ اس کے ذریعے مشتری کو بیع پر حق ملک حاصل ہوتا ہے اور بائع کو ٹمن پر حق ملک حاصل ہوتا ہے، پس مشتری کے حق میں جب بیع ہونا ثابت ہے تو بائع کے حق میں بھی بیع ہی ہے، ورنہ اثر کا مؤثر سے تخلف لازم آئیگا۔

نقد سوم:۔ ”یأبہا الذین امنوا التاأکلوا أموالکم بینکم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منکم“ (النساء، ۲۹)، آیت کریمہ کا تقاضہ ہے کہ بیع صحیح کے بعد مشتری کے لیے بیع مملوک ہو جاتی ہے جس کی بناء پر اس میں اس کا ہر مباح تصرف نافذ ہوتا ہے، لہذا جب حق انتفاع حاصل ہے تو حق تملیک بھی حاصل ہو پس حق تملیک کا منع اقتضاء بیع اور قاعدہ وقانون کے خلاف ہے۔

نقد رابع:۔ اگر بیع و فاء کے عقد کے وقت شرط مذکور نہیں، لیکن اس کے مفہوم میں شرط و فاء معروف ہے، لہذا ”المعروف بالمشروط“ کی بناء پر شرط و فاء یا شرط فسخ کے ذکر کا حکم، یعنی حکم فساد لاحق ہوگا اور مشتری کے حق میں بھی بیع صحیح نہ ہوگی۔

ساتواں نظریہ:

ساتواں نظریہ یہ ہے کہ بیع الوفاء صحیح نہیں ہے، بیع المکرہ کے مانند ہے اور بیع المکرہ کا حکم یہ ہے کہ اس سے

مشتری کے لیے بعد القبض ملک حاصل ہو جاتی ہے اور اگر یہ مشتری بائع کے علاوہ کے ہاتھ بیع مکروہ کو فروخت کرے تو یہ بیع ثانی واقع نہ ہوگی، بائع مکروہ کے لیے حق استرداد حاصل رہے گا، اگرچہ یکے بعد دیگر بہت سے ہاتھوں میں خرید و فروخت کی جا چکی ہو برخلاف بیع فاسد کے کہ اس میں مشتری کو حق ملک کے ساتھ حق تصرف بھی حاصل ہوتا ہے، بایں طور کہ بیع فاسد کا مشتری اگر بیع کو کسی غیر کے ہاتھ فروخت کرے یا ہبہ کرے گا تو بائع کو حق استرداد حاصل نہ ہوگا، جیسا کہ علامہ فخر الدین زبیلی نے بیان کیا ہے: ”إنه لا ينقطع به حق استرداد المبيع وإن تداولته الأيدي بخلاف البيعات الفاسدة“ (التبيين، کتاب الاکراه ۵/ ۱۸۳)۔ پس بیع المکرہ میں بائع کو مشتری کے جمیع تصرفات کو توڑنے اور باطل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور بیع فاسد میں بائع کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اور وجہ فرق یہ ہے کہ بیوع فاسدہ میں فساد حق اللہ کی وجہ سے ہے نص شرعی کے خلاف ہونے کی بناء پر اور بیع المکرہ میں فساد حق العبد کی وجہ سے ہے اور وہ مکروہ کی عدم رضا ہے اور حق العبد حق اللہ پر مقدم ہوتا ہے حاجت کی بناء پر یعنی محتاجی محبت کی وجہ سے ہے، پس بیع فاسد میں اگر بائع مشتری کے تصرفات کا نقض کرے تو حق العبد کا نقض لازم آئے گا، کیونکہ اس کے ساتھ اب دوسرے بندے کا حق وابستہ ہو گیا ہے کہ اگر مشتری نے بیع کی تو مشتری ثانی کا حق وابستہ ہو اور اگر ہبہ کیا تو موهوب لہ کا حق وابستہ ہو اور مشتری کے تصرف کرنے سے بندے کے حق کا نقض نہیں ہے، بلکہ حق اللہ کا نقض ہے اور ایک بندے کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی حق اللہ کی وجہ سے کسی حق العبد کو توڑے اور اس کا ابطال کرے، اس لیے بیع فاسد میں بائع مشتری کے تصرفات کا نقض نہیں کرے گا اس کو حق استرداد حاصل نہیں ہے۔

اور بیع المکرہ کی صورت میں مشتری اگر تصرف کرتا ہے تو بائع مکروہ کے حق کا نقض کرتا ہے، یعنی حق العبد کا نقض ہے اور بائع مکروہ جب مشتری کے تصرفات کو توڑے تو یہ بھی حق العبد کا نقض ہے، پس حق العبد ہونے میں دونوں برابر ہیں تو حق ثانی کی رعایت میں حق اول کو نہیں توڑیں گے، لہذا حق مشتری کی وجہ سے حق بائع جو کہ مکروہ و مظلوم ہے اس کو نقض نہیں کیا جائے گا ”لأن الفساد فيها لحق الله تعالى وقد تعلق بالبيع الثاني حق العبد، وحقه مقدم لحاجته بإذنه، أما هنالرد لحق العبد، وهما سواء، فلا يبطل حق الأول لحق الثاني“ (حوالہ بالا)۔

پس بیع المکرہ میں مشتری مکروہ کو قبضہ کی وجہ سے ملک کا حصول تو ہوگا، لیکن بیع میں کسی طرح کے تصرف کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا اور اس کی وجہ ”حاشیہ چلپی“ میں یہ بیان کی ہے کہ بیع المکرہ کو دو طرح کی مشابہت حاصل ہے ایک بیع موقوف یعنی بیع الفضولی سے مشابہت ہے کہ جس طرح اس میں رضائے مالک موجود نہیں اسی طرح بیع المکرہ میں رضائے مالک نہیں ہوتی ہے اور دوسری مشابہت بیع فاسد سے ہے کہ جس طرح وہ مالک کی جانب سے صادر ہوتی ہے، اسی طرح بیع المکرہ بھی مالک کی جانب سے صادر ہوتی ہے لیکن رضائے مالک ہوتی ہے پس بیع فاسد سے مشابہت کی وجہ سے اس کا ایک حکم ثابت کیا کہ مشتری کو قبضہ کے بعد ملک حاصل ہو جاتی ہے اور بیع الفضولی سے مشابہت کی وجہ سے مالک کی طرف بائع مکروہ جو کہ مالک بھی

ہے اس کو مشتری مکہ کے تصرفات کے حق میں اجازت اور فسخ کا اختیار دیا کہ اگر رضاء کا اظہار کر دے تو مشتری کے تمام تصرفات نافذ اور صحیح ہو جائیں گے اور اگر چاہے تو فسخ کر دے ”قلت، ان بیع المکرہ لہ شبه بالبیع الموقوف، وشبه بالبیع الفاسد، أما الأول فلأنه لم يوجد رضا المالك..... وأما الثاني فلأنه صدر من المالك الخ“ (حاشیہ چلپی، برتیبین ۱۸۳/۵)، پس اسی طرح بیع الوفاء ہے کہ اس میں مشتری کو حق انتفاع حاصل ہے حصول ملک کی وجہ سے، لیکن دوسرے کے ہاتھ بیع، ہبہ، اجارہ کرنے کے تصرف کا حق نہیں ہے اگر مشتری نے ایسا کیا تو بائع و فاء کو حق استرداد اور حق نقض حاصل ہوگا اور زوائد بیع کا حکم بیع فاسد کی بیع کے زوائد کے حکم کی طرف ہے کہ مشتری کی جانب ان کا استہلاک پایا گیا تو ضامن ہوگا اور اگر وہ خود ہلاک ہوئے تو زوائد مغضوب کا حکم ہے، یعنی ضامن نہ ہوگا، چنانچہ الصدر الشہید تاج الاسلام سے جب مسئلہ معلوم کیا گیا کہ اگر بیع و فاء کا مشتری انگور کی پیداوار یا زمین کا غلہ کھالے تو کیا حکم ہے تو انہوں نے یہ ہی جواب دیا تھا (فتاویٰ بزازیہ برہندیہ ۴/۲۰۸)۔

اس نظریے کو بعض مشائخ بخاری نے اختیار کیا ہے انہیں میں سے امام ظہیر الدین المرغینانی اور صدر شہید حسام الدین اور صدر سعید تاج الاسلام اور امام علاؤ الدین بدر ہیں اور علامہ کردری نے بزازیہ میں کہا ہے کہ یہ ہی نظریہ صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور ہمارے زمانے کے مشائخ عظام کا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

آٹھواں نظریہ:

آٹھواں نظریہ یہ ہے کہ بیع الوفاء تین طرح کے عقود سے مرکب عقد ہے اور وہ بیع فاسد اور بیع صحیح اور رہن ہے کہ ان تینوں سے مرکب ہے یہ نظریہ بعض محققین کا ہے کہ بیع الوفاء بعض احکام میں بیع فاسد ہے، لہذا عاقدین میں سے ہر ایک حق فسخ کا اختیار رکھتا ہے، اور بعض احکام میں بیع صحیح ہے کہ اسکی وجہ سے مشتری کو حق انتفاع حاصل ہوتا ہے اور بعض احکام کے حق میں رہن ہے کہ مشتری بیع و فاء کو دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کریگا، نہ اس کو بطور رہن دے گا، نہ ہبہ کریگا اور اگر وہ درخت ہے اس کو قطع کا اختیار نہیں اور اگر مکان ہے تو عمارت کے انہدام کا اختیار نہیں اور اگر مشتری کے پاس وہ ہلاک ہو گیا تو بائع سے دین ساقط ہو جائے گا جو اس کے عوض لیا گیا تھا اور اگر کوئی نقصان لاحق ہو تو اس کی بقدر ثمن یعنی دین سے کمی ہو جائے گی، جیسا کہ رہن میں ہوتا ہے۔ صاحب بحر کہتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ یہ عقد تین عقود سے مرکب ہے، جیسا کہ زرافہ جانور کہ اس میں اونٹ، گائے، چیتے کی صفت و مشابہت ہوتی ہے اور اس کی طرف لوگوں کی حاجت کی بناء پر جائز قرار دیا گیا ہے بدلیں کی ان کے صاحب کے لیے سلامتی کی شرط کے ساتھ ”قلت: هذا العقد مرکب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر، والنمر، يجوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما“ (البحر، خيار الشرط بالشرط ۸/۱) اس کے بعد اخیر میں لکھتے ہیں کہ مناسب ہے کہ فتویٰ دینے میں قول جامع سے اعراض نہ کیا جائے ”وینبغي أن لا

يعدل في اللفاء عن القول الجامع“ (حوالہ بالا)۔

نواں نظریہ:

نواں نظریہ، ساتواں نظریہ کے قریب ہے جسکے بارے میں بیان کیا گیا کہ صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد نے اختیار کیا ہے اور مشائخ زمانہ کا اسی پر فتویٰ ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع و فاء صحیح نہیں ہے، البتہ بعد القبض مشتری و فاء کو انتفاع کا اختیار ہے، لیکن اس کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا یا بہہ کرنے کا اختیار نہیں ہے، نیز اگر زوائد بیع کا استہلاک پایا گیا تو مشتری ضامن ہے، کیونکہ اس پر مشتری کو ملک حاصل نہیں اور اگر خود ہلاک ہو جائے تو زوائد معصوب کی طرف ضمان لازم نہ ہوگا۔

پس نواں نظریہ اس امر میں مشترک ہے کہ بیع الوفاء صحیح نہیں ہے، لیکن اگر مشتری نے قبضہ کر لیا تو حق انتفاع حاصل ہے، مگر دوسرے کے طرف ملک منتقل کرنے کا اختیار نہیں ہے، اگر کیا تو بائع کو حق استرداد حاصل ہوگا اور وہ مشتری کی جملہ تصرفات کا نقض کر دے گا، البتہ زوائد بیع کے حق میں مختلف ہے کہ مشتری و فاء کو حق انتفاع کے ساتھ اس کے زوائد پیداوار پر بھی حق ملک حاصل ہے، لہذا اگر اس سے استہلاک و اتلاف ہو تو ضامن نہ ہوگا چنانچہ فقہ عماد الدین عبدالوہاب سے فتویٰ طلب کیا گیا اس بابت کہ بیع و فاء میں بائع و فاء کے اداء دین سے قبل بیع و فاء میں غلہ پیدا ہوا اس کے بعد بائع نے مشتری کو مال و فاء واپس کیا تو کیا مشتری کو اس کے قبول کرنے اور بیع فسخ کرنے پر مجبور کیا جائے گا، یہاں تک وہ پیداوار بائع کے حوالے کر دے؟ تو انہوں نے جواب دیا نہیں ”استفتی عماد الدین عبدالوہاب فیما اذا نقد البائع و فاء الممال بعد خروج الغلة قبل الدفع هل یجبر المشتري علی قبوله و فسخ البیع حتی یسلم النزل للبائع، قال: لا“ (فتاویٰ بزازیہ برہندیہ ۴/۴۱۰)۔

دسواں نظریہ:

دسواں نظریہ یہ ہے کہ بیع الوفاء بیع باطل ہے بیع الہازل کے مانند ہے۔

اس نظریے کو صاحب ”ہدایہ“ نے ذکر کیا ہے کہ مشائخ میں سے بعض حضرات وہ ہیں جو بیع الوفاء کو باطل قرار دیتے ہیں بیع الہازل پر قیاس کرتے ہوئے ”و منهم من جعله باطلا اعتبارا بالہازل“ اور بیع الہازل کے مانند ہونے کی وجہ شیخ اکمل الدین رومی الباہر ترقی صاحب ”عنایہ“ نے اور علامہ بدر الدین عینی صاحب ”بنایہ شرح ہدایہ“ نے یہ ذکر کیا ہے کہ عاقدین نے اگرچہ لفظ بیع کا تکلم کیا ہے، لیکن ان دونوں کا قصد بیع نہیں ہے جس طرح ہازل کا قصد بیع نہیں ہوتا ہے، چنانچہ شیخ الائمہ سرخسی فرماتے ہیں کہ ہازل اصل بیع سے راضی نہیں ہوتا ہے، کیونکہ بیع اُس حقیقت کا نام ہے جس کے لیے شرع میں حکم ہے اور ہزل ”جد“ یعنی حقیقت کی ضد ہے، پس جب دونوں نے اتفاق کر لیا اس امر پر کہ وہ دونوں اس بیع کا ارتکاب نہیں کریں گے جو سبب ملک ہے تو ان دونوں کے درمیان بیع منعقد نہ ہوگی کہ جو موجب ملک ہو ”الہازل، فانه غیر راض

بأصل البيع، لأن البيع اسم للجد الذي له في الشرع حكم، والهزل ضد الجدد، فإذا تصادقا على أنهما لم يباشرا ما هو سبب الملك، لا ينعقد البيع بينهما موجبا للملك“ (المبسوط، كتاب الأكرام، باب ما يكره عليه اللصوص ۵۵/۲۲)۔

پس بیع الہازل یہ ہے کہ دو شخص آپس میں یہ طے کر لیں کہ ایک ایجاب کریگا اور دوسرا قبول کریگا، لیکن یہ حقیقت بیع نہیں ہوگی، بلکہ صرف محض مذاق مقصود ہوگی، لہذا یہ بیع صحیح نہیں ہے چنانچہ علامہ کا سانی فرماتے ہیں کہ بیع الہازل صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہازل کلام بیع کا تکلم کرتا ہے حقیقت بیع کا ارادہ کئے بغیر، لہذا رضا بالبیع نہیں پائی گئی ”ولا يصح بيع الهازل، لأنه متكلم بكلام البيع لاعلى إرادة حقيقته فلم يوجد الرضا بالبيع“ (البدائع، فصل في شرائط الصحة في البيوع ۱۷۶/۵)، اور بیع الہازل باطل ہوتی ہے اور بیع باطل کی تعریف بدائع میں یہ کی گئی ہے کہ بیع باطل وہ بیع کہلاتی ہے کہ جس میں شرائط انعقاد، یعنی اہلیت و محلّیت وغیرہ میں سے کوئی شرط فوت ہو جائے، ”وأما البيع الباطل فهو كل بيع، فإنه شرط من شرائط الانعقاد من الأهلية والمحلية وغيرهما“ (البدائع، کتاب البيوع، خيار الروية ۳۰۵/۵)۔

اہلیت سے مراد یہ ہے کہ عاقل ہو محلّیت سے مراد یہ ہے کہ بیع مال متقوم شرعی مملوک ہو، پس اگر عاقدین میں سے کوئی صبی لا یعقل یا مجنون، پاگل شخص ہو تو بیع باطل ہے اسی طرح اگر بیع مال متقوم شرعی نہ ہو تو بیع باطل ہے، مثلاً عمر و خنیر کی بیع، بیع باطل ہے، لیکن بیع الہازل کو بیع باطل قرار دینا محل اشکال ہے، کیونکہ اس میں ان شرائط میں سے کوئی بھی شرط فوت نہیں ہے، لہذا بیع باطل قرار دینا درست نہیں ہے۔ علامہ شامی نے ”منحة الخالق“ میں اشکال مذکور کا جواب دیا ہے کہ بیع الہازل میں عوضین، یعنی بیع و ثمن میں سے ہر ایک اگر چہ مال ہوتا ہے، لیکن وہ حقیقتاً بیع نہیں ہوتی (یعنی بیع باطل) ہوتی ہے، اس کی وجہ ہے اُس ایجاب و قبول کا شمار نہ ہونا کہ جنکو ان دونوں نے ہزل و مذاق کے ساتھ ذکر کیا ہے، پس ایجاب و قبول دونوں ایسے ہو گئے گویا کہ ان کا وجود ہی نہیں ہوا، لہذا بدون ایجاب و قبول عقد ہوا جو کہ رکن ہے اور رکن کے فوت ہونے سے بیع باطل ہوتی ہے، اس لیے بیع الہازل بیع باطل ہے، ”وان كان كل من عوضيه مالا لكن ليس ببيع حقيقة لعدم الاعتداد بما ذكرنا من الایجاب والقبول مع الهزل فكانهما لم يوجد“ (مختر الخالق علی هامش البحر الرائق ۱۰۰/۶)، اور علامہ ابن نجیم مصری نے ”البحر الرائق“ میں کہا ہے کہ بیع الہازل میں قبضہ کے ذریعے بھی ملک قطعاً حاصل نہیں ہوتی ہے، ”فقد كتبنا في الفوائد الفقهية ان بيع الهازل لا يملك بالقبض كما ذكره البزدوى في الاصول“ (البحر الرائق، حوالہ بالا) بیع الہازل میں ملک حاصل نہیں ہوتی ہے، کیونکہ یہ بیع باطل ہے اور باطل کے لیے کوئی حکم بالکل ثابت نہیں ہوتا اور کاسائی نے ”بدائع“ میں اس کی وجہ ذکر کی ہے کہ حکم کا حصول اس امر کے لیے ہوتا ہے جو موجود ہو اور بیع باطل کا وجود ہی نہیں صرف صورت بیع ہوتی ہے ”ولا حكم لهذا البيع أصلا، لأن الحكم للموجود، ولا وجود

لهذا البيع إلا من حيث الصورة“ (البدائع، خيار الروية ۳۰۵/۵)۔

شیخ بابرہی کی ”عنایہ“ اور بدرالدین عینی کی ”بنایہ“ میں ہے کہ بیع و فاء کے عاقدین میں سے ہر ایک کے لیے حق فسخ حاصل ہے کہ وہ اپنے صاحب کی رضاء کے بغیر بھی اس کو فسخ کر دے اور اگر ان میں سے کوئی ایک اپنے صاحب پر اس کو جائز قرار دیدے تو وہ صاحب پر نافذ نہ ہوگی اور بنایہ میں ہے کہ بازل صرف سبب کے اختیار کرنے پر راضی ہوتا ہے، لیکن اس کے حکم کو پسند نہیں کرتا ہے، پس وہ تائیدی اختیار شرط کی طرح ہو گیا پس وہ عقد فاسد ہے جو موجب ملک نہیں ہے، پس ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ بیع الہازل کا حکم یہ ہے کہ وہ باطل ہوتی ہے، بایں معنی کہ اس کا وجود بالکل نہیں ہوتا اور وہ قبضہ کے باوجود بھی مشتری کے لیے مفید ملک نہیں ہے۔ اور دونوں میں سے ہر ایک کو حق فسخ حاصل ہوتا ہے اور اگر کسی نے اپنے صاحب پر اس کو نافذ کیا تو صاحب کی رضاء کے بغیر نافذ نہ ہوگا۔ پس اسی طرح بیع الوفاء ہے کہ وہ باطل ہے اور مشتری کے لیے قبضہ کے باوجود مفید ملک نہیں ہے، عاقدین میں سے ہر ایک کو حق فسخ حاصل ہے۔

خلاصہ بحث:

بیع الوفاء کی بابت ماسبق میں جو نظریات فقہاء اور اقوال علماء نیز کتب فقہ سے ماخوذ عبارات و تشریحات شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں ان میں ادنی غور کے بعد بھی نتیجہ یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ بیع الوفاء کے بارے میں اساسی و بنیادی طور پر کل چار طرح کے نظریات ہیں اور ان کے ماسوا بقیہ نظریات و اقوال ذیلی و ضمنی امور ہیں۔

بنیادی نظریات چار ہیں:

چنانچہ اساسی نظریات یہ ہیں (۱) رہن ہونا (۲) بیع صحیح ہونا (۳) بیع فاسد ہونا (۴) بیع باطل ہونا۔

پہلا بنیادی نظریہ: اور قائلین رہن کی دلیل دو امور پر مشتمل ہے جس سے انہوں نے بیع الوفاء پر حکم رہن عائد کیا ہے اور وہ دو امور یہ ہیں پہلا امر، فقہی قاعدہ ”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی، لا للالفاظ والمبانی“ ہے کہ عقود و معاملات میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ و کلمات کا اعتبار نہیں ہوتا، اور بیع الوفاء میں عاقدین اگرچہ بیع کے الفاظ و کلمات کا تکلم کرتے ہیں، لیکن مراد و مقصود، معنی رہن ہوتے ہیں، بایں طور کہ مشتری، بائع کو بحیثیت دائن ثمن بطور دین دیتا ہے کہ جس کی ادائیگی کی ذمہ داری بائع پر عائد ہوتی ہے اور مشتری کو اس کی واپسی پر حق مطالبہ حاصل ہوتا ہے اور بائع، مشتری کے قبضے میں بحیثیت مدیون بیع کو بطور رہن رکھتا ہے کہ شرط سلامتی کے ساتھ اور ادائے دین کے وقت اس کی واپسی مشتری پر لازم ہوتی ہے اور بائع کو اس کی واپسی پر حق مطالبہ حاصل ہوتا ہے، لہذا بیع الوفاء رہن ہے۔

اور دوسرا امر، حکم میں تشبیہ بالرہن ہے کہ بیع الوفاء کی حقیقت رہن کی حقیقت شرعیہ کے مشابہ ہے، بایں طور کہ باب رہن میں شیئ مرہون مرہن کے قبضہ میں اس کے مال دین کے تحفظ کے لیے بطور وثیقہ ہوتی ہے کہ اگر مدیون ادائے دین سے

عاجز ہو گیا تو شئی مرہون سے عوض دین وصول کر لیا جائے گا، اسی طرح بیع الوفاء میں مشتری کے پاس بیع اس کے تحفظ دین کے لیے بطور وثیقہ محبوس ہوتی ہے کہ اگر بائع ادا کے ثمن سے عاجز ہو گیا تو مشتری بیع سے اس کی مقدار عوض وصول کر لے گا، پس اس بیع پر بیع الوفاء میں جمیع احکام رہن ثابت ہیں، لہذا بیع الوفاء رہن ہے۔

قول فیصل:

مذکورہ تشریحات و تفصیلات سے ثابت ہوا کہ بیع الوفاء اپنی حقیقت معروفہ کے ساتھ بیع فاسد ہے جس کا فساد اصول و نصوص سے ثابت ہے عام احوال میں بدون حاجت شدیدہ یا بدون ضرورت کے اس کا اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ صورت جواز دو ہیں۔

(۱) ایک وہ ہے جسکو شیخ محمد رسوقی مالکی (متوفی۔ ۱۲۳۰ھ) نے ”الشرح الکبیر“ کے حاشیہ میں ذکر کی ہے کہ اگر قبل العقد یا بوقت عقد کسی شرط کا ذکر نہیں کیا اور عقد تام و لازم ہو گیا اس کے بعد مشتری بطور تبرع و ہمدردی بائع سے یہ کہے کہ جب تو میری طرف ثمن واپس کر دے گا تو میں بیع تیرے حوالے کر دوں گا، لہذا یہ بیع صحیح ہے اور مشتری پر اس وعدے کی وفاء لازم نہیں ہوگی، بلکہ فقط مستحب ہے ”و أما اذا تبرع المشتري للبائع بذالك بعد البيع، بأن قال له بعد التزام البيع: متى رددت إلي الثمن دفعت لك المبيع كان المبيع صحيحاً، ولا يلزم المشتري الوفاء بذالك الوعد، بل يستحب فقط“ (حاشیۃ الرسوقی علی ہاشم الشرح الکبیر، باب البیع ۱/۳۷)، اور وفاء وعدہ کی بابت نصوص مختلف ہیں کہ بعض نصوص سے وفاء وعدہ کا لزوم ثابت ہوتا ہے، مثلاً ”کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالاً تفاعلون“ (الف ۳) اور بعض نصوص سے استحباب ثابت ہوتا مثلاً حدیث میں ہے: ”اذا وعد الرجل أفاه، ومن نيته ان يفی فلم يف ولم يجنی للميعاد، فلا إثم عليه“ (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی العدة)، چنانچہ علامہ قرافی مالکی (متوفی۔ ۶۸۴ھ) نے کتاب الفروق میں اس کی تطبیق بیان کی ہے محض وعدہ کی وفاء لازم نہیں ہے البتہ مکارم اخلاق میں سے ہے: ”أما مجرد الوعد فلا يلزم الوفاء به بل الوفاء من مكارم الاخلاق“ (کتاب الفروق ۲۵/۴)۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ بائع ہی صورت مذکورہ میں مشتری سے یہ عہد و پیمان لے لے کہ وہ اگر ثمن واپس کر دے تو وہ بیع میری طرف حوالے کر دے اور مشتری اس کو قبول کر لے تو صورت اولی کی مانند حکم ہے کہ مشتری پر وفاء وعدہ لازم ہوگا۔ اور اگر بعد العقد ذکر شرط کی مذکورہ صورت پر عمل کرنے میں بائع کو مشتری پر اعتماد نہیں ہے، بلکہ ظن غالب ہے کہ وہ بعد العقد میرے عہد وعدہ کو قبول نہیں کرے گا اور حاجت شدیدہ یا ضرورت لاحق ہے غیر سودی قرض فراہم نہیں ہے تو بیع الوفاء اپنی حقیقت معروفہ کے ساتھ مبتنی بہ شخص کے لیے بقدر حاجت جائز ہوگی۔

بیع الوفاء سے متعلق سوالات کے جوابات:

پہلا سوال:- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں؟ اگر

شرعا منعقد اور درست ہے تو حکما بیع ہے یا نہیں؟

جواب: ماسبق میں مفصل طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ حاجت شدیدہ لاحق ہو اور رفع حاجت کی اس کے سوا کوئی جائز اور ممکن تدبیر نہیں ہے تو مبتلی بہ شخص کے لیے بقدر حاجت و ضرورت جائز ہے اور بطور بیع جائز ہے۔

دوسرا سوال: بیع قرار دینے پر یہ شرط کے بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: عقد بیع میں بائع کا ایسی شرط لگانا کہ جس سے مشتری پر تجبیر لازم آئے مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے شرط فاسد ہے حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مفسد عقد ہے، جیسا کہ ابن قدامہ حنبلی (متوفی ۶۲۰ھ) نے ”المغنی“ میں صراحت کی ہے: ”الضرب الثانی، أن یشرط غیر العتق، مثل أن یشرط أن لا یبیع ولا یهب،..... فہذہ وما اشبهہا شروط فاسدۃ، وهل یفسد بہا البیع؟ علی روایتین..... والثانیۃ، البیع الفاسد، وهو مذهب أبی حنیفۃ والشافعی، لأن النبی ﷺ نہی عن بیع وشرط، ولأنہ شرط فاسد، فأسد البیع، کما لو شرط فیہ عقدا آخر“ (المغنی کتاب البیوع، باب بیع المصراة، فصل الشروط فی البیع تنقسم الی اربعة اقسام) ”اور دلیل فساد ایک تو حدیث ”نہی عن بیع وشرط“ ذکر کی ہے جو عبارت مذکورہ میں موجود ہے اور دوسری دلیل عقلی ہے اور وہ یہ ہے کہ شرط جب فاسد ہو تو اسکی وجہ سے ثمن سے جو مقدار کم ہوگی مشتری پر بائع کی طرف اس کا لوٹانا واجب ہوگا اور وہ مقدار منقوص مجہول ہے جس سے کل ثمن مجہول ہوگی، اور ثمن مجہول کے ساتھ بیع فاسد ہے اور دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ بائع اپنی بیع سے زوال ملک پر راضی ہوا ہے شرط مذکور کے ساتھ اب اگر اس شرط کے بغیر بیع کو صحیح قرار دیں تو بائع کی رضا بغیر اس کی ملک کا زوال لازم آئیگا، جبکہ بیع کی صحت کے لیے رضامندی شرط ہے، اسی طرح جب مشتری کے لیے شرط ہو تو وہ بھی اسی شرط کے ساتھ راضی ہوتا ہے، اگر اس شرط کے بدون بیع کو صحیح قرار دیں تو بدون رضا عقد لازم آئیگا جو شرعا درست نہیں ہے۔ اس لیے حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک ایسی شرط مفسد عقد ہے۔

اور مالکیہ کے نزدیک ایسی شرط کہ جس میں بائع نے مشتری پر حجر و پابندی عائد کی ہو، امام مالک سے اس کی بابت دو روایتیں منقول ہیں، ایک روایت حنفیہ و شافعیہ کے مطابق ہے کہ بیع اور شرط دونوں باطل ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ اگر بائع اپنی شرط کو ساقط کر دے تو بیع جائز ہے، ”وأما القسم الرابع وهی بیوع الشروط التي یسمیہا أهل العلم بیوع الشیاء، فذالک مثل أن یبیع الرجل السلعة علی أن لا یبیع ولا یهب..... أو علی أن باعہا فهو أحق بہا بالثمن الذی یبیعہا بہ..... أو ما أشبه ذالک من الشروط التي تقضى التحجیر علی المشتري فی السامعة التي اشتري، فہذا النوع من البیوع اختلف فیہ إذا وقع شیئ منها علی قولین، أحدهما انه

یفسخ مادام البائع متمسکا بشرطه، وإن ترک الشرط صح البیع،..... والقول الثانی أن حکم هذه البيوع كلها حکم ما فسد من البيوع للإخلال بشرط من شروط صحتها، فيفسخ على كل حال، (المقدمات للمحدث لابن رشد، کتاب البيوع الفاسدة، فصل في تقسيم البيوع في الصحة والفساد ۲/۶۴)۔

البتہ حنابلہ کے نزدیک بیع صحیح ہے اور شرط بھی صحیح ہے، جیسا کہ شیخ علاء الدین ابو الحسن المرادوی (م ۸۸۵ھ) نے تحریر کیا ہے کہ اگر یہ شرط لگائی کہ مشتری نہ بیچے گا اور نہ ہبہ کریگا اور اگر فروخت کریگا تو بائع زیادہ حقدار ہوگا پس امام احمد نے اس کی صحت کی صراحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس بیع و شرط کی صحت پر نصوص صریحہ موجود ہیں اس کے بعد بہت سے نصوص ذکر کئے ہیں: ”لو شرط أن لا یبیع ولا یهب، وإن باعها فهو أحق بها، فنص أحمد على الصحة، وقال: ونصوصه صریحة بصحة هذا البیع والشرط“ (الانصاف فی معرفۃ الرائج من الخلاف، کتاب البیع، باب الشروط فی البیع ۳/۳۵۱)، اور ابن قدامہ نے المغنی میں حسن بصری، امام شعبی، امام نخعی، امام حکم، امام ابن ابی لیلی اور امام ابو ثور کا بھی یہی قول قرار دیا ہے ”قال القاضي، المنصوص عن احمد أن البیع صحیح وهو ظاهر کلام الخرقی هاهنا، وهو قول الحسن، والشعبي، والحکم، وابن أبي لیلی وأبی ثور“ (المغنی ۴/۱۷۱)۔

بہر حال یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ امام احمد بن حنبل کا مذہب رائج یہ ہے کہ عقد میں اگر شرط فاسد ایک ہے تو عقد صحیح ہے اور شرط کی صحت میں دو رائے ہیں کہ وہ باطل ہے یا صحیح ہے رائج یہ ہے کہ شرط بھی صحیح ہے اور اگر دو شرطیں فاسد عقد میں ہوں تو عقد بھی باطل ہے اور شرطیں بھی باطل ہیں اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

تیسرا سوال: مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب: صورت مسئلہ کا حکم یہ ہے کہ یہ بیع فی نفسہ احناف کے نزدیک بیع فاسد ہے پس بیع فاسد کو اس کے مالک کی طرف لوٹانا ہے اور یہ فسخ کے معنی ہیں۔ کیونکہ فسخ کی حقیقت ہے کہ اصل عقد کا بالکل خاتمہ کر دینا اور بیع کو ملک قدیم کی طرف لوٹا دینا کہ گویا کہ وہ بائع کی ملک سے زائل ہی نہیں ہوئی تھی ”والفسخ رفع من الاصل، وإعادة إلى قديم الملك كأنه لم يزل عن ملك البائع“ (البدائع، کتاب البيوع، فصل في حکم البیع ۵/۲۵۴)، اور یہ معنی صورت مذکورہ میں موجود ہیں لہذا فسخ ہونا ثابت ہے اور فسخ ثمن اول پر ہوتا ہے اور ثمن اول پر زیادتی کی شرط باطل ہوتی ہے ”والفسخ يكون بالثمن الاول، ويبتل الشرط الفاسد“ (تحفة الفقهاء، کتاب البيوع، باب الاقالة والمراصة ۲/۱۱۱)، لہذا اس اعتبار سے مالک اول کو بیچنے میں سابق اداء کردہ قیمت لازم ہوگی، زیادتی کا مطالبہ جائز نہیں ہے۔ اور اگر بیع جائز کا اعتبار کیا جائے اور عقد سابق کے ختم کرنے یا ترک کرنے یا زائل کرنے جیسے الفاظ کے ذریعے رد بیع کیا گیا تو اقالہ ہے اور اقالہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک عاقدين کے حق میں فسخ ہی ہے، اگرچہ غیر عاقدين کے حق میں بیع جدید ہے، ”قال ابو حنيفة عليه الرحمة: الاقالة فسخ في

حق العاقدین بیع جدید فی حق ثالث“ (البدائع کتاب البیوع، فصل فی بیان ما یرفع حکم البیع ۳۰۶/۵) اور امام ابو یوسف کے نزدیک تمام کے حق میں خواہ عاقدین ہوں یا غیر عاقدین اقالہ بیع جدید ہے البتہ اگر بیع قرار دینا ممکن نہ ہو تو پھر فسخ ہے ”وقال أبو یوسف: إنها بیع جدید فی حق العاقدین وغیرهما، الا أن لا یمکن أن تجعل بیعا فتجعل فسحا“ اور امام محمد کے نزدیک فسخ ہے البتہ اگر فسخ قرار دینا ممکن نہ ہو تو ضرورتاً بیع جدید قرار دی جائے گی ”وقال محمد، انها فسح إلا أن یمکن أن تجعل فسحا فتجعل بیعا للضرورة“ اور امام زفر فرماتے ہیں کہ تمام لوگوں کے حق میں فسخ ہے ”وقال زفر انها فسح فی حق الناس كافة“ (حوالہ بالا) پس قول فسخ پر ثمن اول ہی لازم ہوگی اس سے زائد کا مطالبہ باطل ہوگا۔ اور قول بیع پر ثمن سابق لازم نہیں ہے لہذا اس سے زائد کا بھی مطالبہ جائز ہے جس پر بھی فریقین راضی اور متفق ہو جائیں۔ لیکن اقالہ میں قول فسخ راجح ہے لہذا ثمن سابق ہی لازم ہوگی اور اگر اس سے زائد کی شرط لگائی یا اس سے کم کی تو شرط باطل ہے اس کا اعتبار نہیں ہے، ”الإقالة جائزة فی البیع بمثل الثمن الاول..... فإن شرطاً أكثر منه أو أقل فالشرط باطل ویرد مثل الثمن الأول“ (بدایہ کتاب البیوع، باب الاقالة ۵۵/۳)، کیونکہ اقالہ شرط فاسدہ سے باطل نہیں ہوتا ہے برخلاف بیع کے کہ وہ شرط فاسد سے باطل ہو جاتی ہے، ”لأن الإقالة لا تبطل بالشروط الفاسدة، بخلاف البیع“ (حوالہ بالا)، اور اگر بیع میں کوئی نقص اور عیب فاحش پیدا ہو گیا ہے تو ثمن اول سے کم پر بھی اقالہ جائز ہے کیونکہ بیع میں عیب فاحش ثمن سے کمی کا سبب واقع ہو جاتا ہے ”إلا أن يحدث فی المبیع عیب، فحينئذ جازت الإقالة بالأقل، لأن الحط يجعل بازاء مافات بالعیب“ (حوالہ بالا)، اور اگر اقالہ پر دلالت کرنے والے الفاظ نہیں کہے، بلکہ بیع و شراء کے الفاظ کے ساتھ رد بیع کا معاملہ طے کیا، مثلاً بائع نے مشتری سے کہا کہ جو تم نے مجھ سے خریدی ہے اس کو مجھ سے اتنی رقم کے بدلے فروخت کر دو، تو مشتری نے کہا کہ میں نے نیچی تو یہ بالا جماع بیع ہے اور اس میں شرائط بیع کی رعایت کی جائیگی ”ولا تصح الابلغظ الاقالة حتی لو قال البائع للمشتري یعنی ما استريت منی بكذا، فقال بعت فهو بیع بالا جماع فیراعی فیہ شرائط البیع“ (الجوهر النیرة، کتاب البیوع، باب الاقالة ۲۰۷/۱)، لہذا فقہ زہیدی صاحب جوہرہ (متوفی ۸۰۰ھ) کے مذکورہ بیان کے مطابق اگر عاقدین نے اقالہ پر دال الفاظ کا اطلاق نہیں کیا ہے تو بیع جدید کا حکم جاری ہوگا جس سے ثمن کی وہ ہی مقدار لازم ہوگی جو عاقدین کے باہمی اتفاق سے طے قرار پائیگی خواہ ثمن اول کے برابر ہو یا اس سے زائد یا اس سے کم۔

چوتھا سوال: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: سطور گذشتہ میں مذکور تشریحات سے جیسا کہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ بیع الوفاء کافی نفسہ بیع فاسد ہونا راجح ہے اور بیع فاسد بالقبض مفید ملک ہوتی ہے اور مملوک مباح الانتفاع ہوتا ہے، اگرچہ حق شرعی کی وجہ سے اس کا فسخ و ابطال لازم

ہوتا ہے چہ جائے کہ بر بنائے حاجت جب یہ بیع، بیع جائز قرار پائے تو بدرجہ اولیٰ اس کی بیع مشتری کے لیے مباح الانتفاع ہوگی۔

پانچواں سوال: خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچدے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: مذکورہ سوال دو شق پر مشتمل ہے۔ شق اول، کہ خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچدے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا، اس کا جواب مبسوط طور پر ماقبل میں ذکر ہو چکا ہے کہ بائع کو اختیار فسخ ہوگا، کیونکہ بائع کی طرف سے مشتری پر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرنے کی شرط ایسی ہی ہے، جیسا کہ وہ مشتری پر رہن کی شرط لگائے یا ثمن میں کسی صفت کی شرط عائد کرے پس اگر مشتری شرط کو پورا نہ کرے تو بائع کو حق فسخ حاصل ہوتا ہے بیع میں شرائط صحت موجود ہونے کے باوجود، لیکن اختیار فسخ کا حصول صرف اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ بائع اپنی ملک بیع کے زوال پر شرط مذکور کے ساتھ راضی ہوا تھا کہ اگر شرط مذکور کی وفاء ہوگی تو بائع کی رضا تام ہوگی اور اگر وفاء شرط نہ ہوگی تو اس کی رضا بھی تام نہ ہوگی، پس جب وفاء شرط کا نہ ہونا متیقن طور پر ظاہر ہو گیا تو بائع کو اس کے حق کی وجہ سے اختیار فسخ حاصل ہوا ہے، ”فللبائع أن يفسخ البيع لفوت الشرط والغرض“ (البدائع کتاب البيوع، فصل في شرائط الصحة في البيع ۱۷۵/۱) اور ”دررالحکام“ میں ہے کہ مشتری کو وفاء شرط پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ بائع کے لیے عقد کو فسخ کرنا جائز ہوگا کیونکہ اس کی رضا بالبیع اسی شرط کے ساتھ ہے اس کے بغیر رضا نہیں ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ عقد کو فسخ کر دے یا ترک رہن پر امضاء عقد کر دے، ”إذا أبيع المشتري ولم يجبر على الوفاء، جاز للبائع أن يفسخ العقد، لأن رضاه بالبيع كان لهذا الشرط فبدونه لا يكون راضياً، وإذا لم يتم رضاه كان له أن يفسخ أو يرضى بتروك الرهن“ (دررالحکام، کتاب الرهن، باب ما صح رهنه والرهن به ۲۵۳/۲)۔

اس کا جواب اس طرح سمجھا جائے کہ بیع الوفاء میں مشتری کی اداء ثمن کے اعتبار سے تین حالتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس نے دوسرے کے ہاتھ فروخت سے قبل بیع کی کل ثمن ادا کر دی تھی اور بائع نے شرط کی وجہ سے قیمت واقعی سے کمی نہیں کی تھی۔ دوسری یہ ہے کہ دوسرے کے ہاتھ فروخت سے قبل ثمن کی ادائیگی تو کی تھی، لیکن بائع اول نے بیع کی قیمت واقعی یعنی اصل ثمن سے کمی کی تھی، تا کہ مشتری اس کی عائد کردہ شرط کی وفاء کرے۔ تیسری یہ ہے کہ دوسرے کے ہاتھ فروخت سے قبل ثمن کی ادائیگی ہی نہیں کی تھی۔ چنانچہ یہ تیسری صورت بیع الغاصب کے مانند ہے جس کا حکم ذکر کیا گیا کہ مشتری اول پر اس کی مشہور قیمت لازم ہوگی قیمت کی ادائیگی سے ثمن کا مالک ہو جائیگا، جیسا کہ بیع الغصب میں ہوتا ہے کہ جب غاصب شئی مغضوب کو فروخت کر دے تو مالک کی طرف قیمت شئی کی قیمت عام سے ضمان اداء کرنے کے بعد اس کے ثمن کا مالک ہو جاتا ہے، ”قول القدوری، لزمته قيمته، معناه إذا كان المبيع من ذوات القيم كالحيوان والعدديات

المتفاوتة، فأما في ذوات الامثال، كالمكيلات، والموزونات والعديدات المتفاوتة فيجب المثل، لأنه مضمون بنفسه بالقبض، فشابه الغصب، والحكم في الغصب كذا لك“ (العناية، كتاب البيوع، فصل في احكام البيع الفاسد ۶/۲۶۵) لیکن یہ صورتِ بحث سے خارج ہے، کیونکہ بیع الوفاء میں بائع ثمن کی طرف شدت کے ساتھ محتاج ہوتا ہے وصول ثمن ہی پر بیع الوفاء کا عقد طے کرتا ہے، لہذا معلوم ہوا کہ مذکورہ تیسری صورت کے علاوہ بقیہ اول الذکر دونوں صورتیں بیع الوفاء میں واقع ہوتی ہیں، پس مذکورہ تشریحات کی روشنی میں یہ حکم ثابت ہوا کہ اگر مشتری نے بائع اول کو ثمن ادا کر دی تھی، بعدہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کیا تو ثمن اول کے مثل تک جائز ہے، اس سے زائد قیمت لینا ممنوع و حرام ہے، اگر حاصل کی تو وہ واجب التصدق ہے اور مذکورہ پہلی اور دوسری صورت کے اعتبار سے حکم میں تفریق ثابت نہیں ہے، یعنی بائع اول نے مشتری سے ثمن واقعی حاصل کی تھی یا شرط رد کی وجہ سے واقعی ثمن سے کمی کی تھی تو دونوں صورتوں کا حکم ایک ہے یا الگ الگ ہے۔ رقم السطور کے علم کے مطابق فقہاء احناف سے تفریق ثابت نہیں ہے، البتہ فقہاء حنابلہ میں سے علامہ ابن قدامہ اور ان کے علاوہ بہت سے فقہاء حنابلہ سے بھی یہ صراحت منقول ہے کہ شرط کی وجہ سے ثمن میں جو کمی واقع ہوئی تھی بائع کے لیے جائز ہے کہ اس کو واپس لے لے، کیونکہ بائع کا ثمن پر بیع سے راضی ہونا شرط کی غرض کو حاصل کرنے کے لیے تھا پس جب اس کی غرض حاصل نہ ہوئی تو جس واقعی ثمن پر راضی ہوتا اس سے کم کی گئی مقدار ثمن کو واپس لینا مناسب ہے، ”فإن حکمنا بصحة البيع، فللبائع الرجوع بما نقصه الشرط من الثمن؛ لأن البائع إنما سمح ببيعها بهذا الثمن مما يحصل من الغرض من الشرط..... فإذا لم يحصل غرضه ينبغي أن يرجع بما سمح به“ (المغنی، کتاب البيوع، فصل الشروط في البيع تنقسم الى اربعة اقسام ۳/۱۷۲)۔

چنانچہ احقر کے نزدیک بھی تفریق اولیٰ ہے، بایں طور کہ اگر بائع اول یعنی بائع و فاء نے بیع کی ثمن واقعی حاصل کر لی تھی تو مشتری و فاء اگر اس سے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے تو وہ زائد رقم گویا کہ مقدار دین پر بدون عوض مضاعف رقم ہے اور یہ معنی ربا ہے اور رقم ربا واجب التصدق ہوتی ہے، کیونکہ اس میں شبہِ خبث موجود ہے، جیسا کہ ماقبل میں مفصل بیان گذرا ہے، نیز مشتری کو صرف اپنی ادا کردہ ثمن کے مثل پر استحقاق حاصل ہے اس سے زائد رقم ربا واجب التصدق ہوتا ہے اور بائع و فاء کے لیے اس کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ثمن واقعی کے حصول سے وہ اپنے حق کامل کو حاصل کرنے والا شمار ہوگا بریں بناء اس کو حق مطالبہ حاصل نہ ہوگا اور بائع و فاء نے شرط کی وجہ سے ثمن واقعی سے کمی کی تھی، یعنی یوم القبض کی قیمت سے بھی کمی کی تھی تو مشتری کے شرط کی و فاء نہ کرنے کی وجہ سے مشروط بھی فوت ہو جائے گا، لہذا بائع سے دفع ضرر کے طور پر اس کو باقی ماندہ مقدار منقوص کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہونا عدل کے قریب ہے۔

تلخیص الکلام بر بیع الوفاء:

۱- بیع الوفاء، بیع ہے، کیونکہ یہ معاملہ لفظ بیع کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے اور عرف میں لفظ بیع کے اطلاق سے معنی بیع ہی مراد ہوتا ہے۔

۲- بیع الوفاء اپنی حقیقت معروضہ و شرط مشہور کے ساتھ باعتبار اصل، مشروع ہے اور باعتبار وصف غیر مشروع ہے۔

۳- بیع الوفاء عام احوال میں شرعاً جائز نہیں ہے، بلکہ شرط فاسد کی وجہ سے واجب الفسخ ہے

۴- بیع الوفاء حاجت شدیدہ کے وقت محتاج شخص کے لیے بقدر حاجت جائز ہے۔ یعنی بالاصل مشروع ہونے کی وجہ سے اس کے ذریعہ صرف حق انتفاع حاصل ہے۔ اور بالوصف غیر مشروع ہونے کی بناء پر اس کے ذریعہ حق تملیک حاصل نہیں ہوتا ہے۔

۵- بائع و فاء کی طرف سے مشتری پر یہ شرط عائد کرنا کہ ”وہ کسی دوسرے سے نہ بیچے گا“ مقتضائے عقد کے خلاف شرط ہے لیکن بر بناء حاجت یہ بائع کی جانب سے مشتری پر ثمن وصول کرنے کے لیے شرط رہن کے مانند ہے جس کا حکم یہ ہے کہ قول مفتی بہ کے مطابق مشتری کو اس کی وفاء پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ وفاء شرط نہ ہونے کی وجہ سے بائع کو اختیار فسخ حاصل ہوگا، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ مشتری وفاء نے کسی دوسرے کے ہاتھ بیع وفاء پر عقد تام نہ کیا ہو۔

۶- اگر خریدار نے شرط مذکور کے خلاف کرتے ہوئے بائع کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا تو وہ عقد نافذ ہو جائیگا اور مشتری ثانی کے لیے بیع حلال و طیب قرار پائے گی بشرطیکہ یہ عقد ثانی موانع صحت سے خالی ہو، البتہ مشتری وفاء پر گناہ لازم آئیگا، کیونکہ اُس نے شرط کی وفاء نہ کر کے بائع کو دھوکہ دیا جو کہ غرر ہے۔ نیز اس نے عقد ثانی کے ذریعہ عقد فاسد سابق کے فساد کو مقرر اور مضبوط کر دیا ہے۔

۷- اگر بائع وفاء نے مشتری وفاء سے ثمن واقعی حاصل کر لی تھی پھر مشتری وفاء نے اگر کسی دوسرے کے ہاتھ بیع کے ساتھ بیع کی تو اس کے لیے بیع حلال نہیں ہے، بلکہ واجب التصدق ہے، کیونکہ اس میں شبہہ انجث موجود ہے۔

۸- اگر بائع وفاء نے مشتری وفاء سے شرط مذکور کی بناء پر یوم القبض کی ثمن واقعی سے کم ثمن وصول کی تھی اور مشتری وفاء نے شرط کی وفاء نہیں کی تو بائع کو باقی ماندہ مقدار مقنوس کے استرداد کا حق حاصل ہوگا، تاکہ اس سے ضرر کو دفع کیا جائے۔

۹- بیع وفاء درحقیقت بیع فاسد ہے جس میں اصل انتفاع کا جائز نہ ہونا ہے، اگرچہ بوقت حاجت بقدر حاجت اُس کی بیع مباح الانتفاع قرار دی گئی ہے، پس جب مشتری وفاء بیع وفاء کی بیع پر اقدام کرنے لگے تو وہ اصل حکم کی طرف عود کر آئے گی، یعنی واجب الفسخ قرار پائیگی اور فسخ، ثمن اول پر ہوتا ہے، نیز بائع اول کی طرف رد بیع کیا جاتا ہے، لہذا مشتری وفاء پر لازم ہے کہ بائع اول ہی کو فروخت کرے جو درحقیقت فسخ بیع ہی ہے۔ لہذا مالکِ اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی

لازم ہوگی اس سے زائد کا مطالبہ کرنا مشتری و فاء کے لیے جائز نہیں ہے، بشرطیکہ عاقدین نے معاملہ ثانی لفظ اقالہ، یا لفظ فسخ، یارد، یا ترک، یا ان کے ہم معنی کسی لفظ کے ذریعے کیا ہو تو یہ حقیقتہً فسخ بیع ہوگا اور عاقدین بھی گناہ سے محفوظ رہیں گے۔

۱۰- اور اگر عاقدین نے عقد ثانی لفظ بیع یا لفظ شراء کے ذریعے کیا ہے تو یہ بیع جدید شمار ہوگی اور اس پر احکام بیع جاری ہونگے یعنی اب وہ ثمن ادا کرنی لازم ہوگی جو باہمی رضامندی سے طے پائے، خواہ ثمن اول سے زائد ہو یا کم ہو، لیکن اس صورت میں یعنی بیع جدید کرنے میں عاقدین گنہگار ہوں گے، کیونکہ بیع جدید پر ان کا اقدام بیع فاسد کے فساد کا تقرر ہے اور یہ عمل خلاف شرع ہے، لہذا اس کا ارتکاب، معصیت ہوگا۔



بیع الوفاء - حقیقت اور حکم

مولانا رحمت اللہ ندوی ☆

بیع الوفاء کا شرعی حکم:

بیع الوفاء کے شرعی حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے:

مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک بیع الوفاء فاسد ہے، اس لئے کہ بائع کا بیع کی واپسی کی شرط جبکہ وہ مشتری کو ثمن واپس کرے، بیع کے تقاضے اور حکم کے خلاف ہے، کیونکہ بیع میں بیع پر مشتری کو دائمی اور کامل ملکیت حاصل ہوتی ہے، اور یہ شرط بائع کے لئے ایک منفعت ہے، کوئی دلیل معین اس کے جواز پر نہیں ہے، لہذا یہ شرط فاسد ہے اور اس بیع میں یہ شرط لگانے سے بیع بھی فاسد ہو جائے گی۔

جبکہ بعض متاخرین حنفیہ اور شافعیہ بیع وفاء کو جائز مانتے ہیں اور بعض احکام بیع کے لئے مفید بھی، وہ یہ کہ مشتری بیع سے انتفاع کرتا ہے اور یہ بیع دوسرے سے بیع ہے۔

مجوزین بیع وفاء کی شرطیں:

لیکن ان کے یہاں جواز کے لئے دو شرطیں ہیں:

- ۱- عقد کے اندر صراحت ہو جائے کہ بائع جب ثمن کی واپسی کرے گا، مشتری بھی بیع واپس کر دے گا۔
- ۲- بدلیں سالم ہوں، اگر بیع ضائع ہو جائے اور اس کی قیمت، دین (ثمن) کے برابر ہو تو اس کے مقابل دین ساقط ہو جائے گا، اور اگر دین کی مقدار سے زائد ہو اور بیع مشتری کے ہاتھ میں ہو تو اس کی قیمت دین کے مقابل کے بقدر ساقط ہو جائے گی، کیونکہ اس سلسلہ میں وہ رہن کی طرح ہے۔

مجوزین کے دلائل:

- ۱- اس شرط کے ساتھ بیع کا متعارف ہو جانا۔

۲- اور سود سے بچنے کے لئے بضرورت لوگوں کا تعامل، لہذا بیع درست ہوگی، شرط لگانے سے فاسد نہ ہوگی، اگرچہ قواعد کے خلاف ہے، کیونکہ قواعد تعامل سے متروک ہو جاتے ہیں، جیسا کہ استصناع میں ہے۔
 علامہ ابن عابدین شامی کے دو اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے اور بعض احکام بیع کے لئے مفید ہے، جیسے اس سے انتفاع کی حلت، لیکن مشتری بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا، زلیعی نے ”باب الاکراہ“ میں فتویٰ اسی قول پر ذکر کیا ہے۔
 متاخرین حنفیہ وغیرہ جو بیع و فاء کو جائز قرار دیتے ہیں، ان کے اجمالی آثار و دلائل یہ ہیں:

۱- ملکیت کا منتقل نہ کرنا، اس بیع سے مشتری کو ملکیت منتقل کرنے والا تصرف حاصل نہیں ہوتا۔
 ۲- بیع کی واپسی میں بائع کا حق ہے، یعنی بائع کا حق ہے کہ بیع واپس لے لے، جبکہ وہ مشتری کو تاقیت و عدم تاقیت کی حالت میں ثمن ادا کر دے۔
 ۳- بیع و فاء میں متعاقبین میں سے کسی کی موت کا اثر، یعنی جب مشتری یا بائع، بیع و فاء میں مرجائے تو اس کے ورثہ احکام و فاء میں اس کے قائم مقام ہوں گے۔
 ۴- متعاقبین کا اختلاف۔

الف- جب متعاقبین کا اصل بیع و فاء میں اختلاف ہو جائے، بایں طور کہ ان میں سے ایک کہے کہ بیع لازم تھی یا و فاء، تو لازم کے مدعی کا قول معتبر ہوگا، الا یہ کہ و فاء کا کوئی قرینہ ہو، اور قرینہ یہ ہے کہ ثمن بہت کم ہو، جس میں لوگ عادیہ دھوکہ نہیں کھاتے، الا یہ کہ اس کا صاحب ریٹ بدل جانے کا دعویدار ہو۔
 ب- اگر مشتری اور بائع میں سے ہر ایک بینہ قائم کر دے تو و فاء کا بینہ مقدم ہوگا۔ کیونکہ خلاف ظاہر ہے۔
 ج- اگر ان میں سے کسی کے پاس بینہ نہ ہو تو مدعی کتات (لزوم) کی بات مانی جائے گی۔

مانعین جواز:

بیع الوفاء کے عدم جواز کے قائلین میں مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین حنفیہ اور شافعیہ کے علاوہ ابوشجاع اور علی سعیدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی ہیں، ان حضرات نے بیع و فاء کو رہن مان کر اس کے جملہ احکام لگائے ہیں، علامہ شامی کے دو اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ بعض محققین کا جامع قول یہ ہے کہ بعض احکام کے حق میں وہ فاسد ہے، یہاں تک کہ دونوں (بائع اور مشتری) فسخ کے محتار ہیں، بعض احکام میں صحیح ہے، جیسے ٹھہرانے کا جواز اور بیع کے منافع، اور بعض کے حق میں رہن ہے کہ مشتری دوسرے سے فروخت نہیں کر سکتا اور نہ رہن رکھ سکتا ہے اور اس کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائے گا۔

چونکہ بیع الوفاء مذکورہ تین عقود کا مرکب ہے، جیسے زرافہ میں اونٹ، گائے اور چیتا کے اوصاف ہیں (تفصیل الموسوعۃ

”فتاویٰ نسفی“ میں ہے:

”بیع وفاء ربا سے بچنے کے لئے ہے، درحقیقت یہ رہن ہے اور مشتری کے ہاتھ میں بیع، مرتہن کے ہاتھ میں رہن کی طرح ہے، جس کا وہ مالک نہیں اور نہ رہن کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع جائز ہے، مشتری نے جو پھل کھایا یا عین کو ہلاک کیا اور فائدہ اٹھایا، اس کا ضامن ہوگا، اور اس کے ہاتھ میں ہلاکت سے دین ساقط ہو جائے گا، جبکہ اس میں دین پورا ہو رہا ہے، بائع کو دین کی ادائیگی کے بعد واپس لینے کا حق ہے“ (کذا فی الظہیریت)۔

”فتاویٰ خانہ“ میں ہے:

”الصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا، ثم ينظر: إن ذكر شرط الفسخ في البيع ففسد البيع، وإن لم يذكر ذلك في البيع وتلفظا بلفظة البيع بشرط الوفاء أو تلفظا بالبيع الجائز لم يفسد البيع، وعندهما هذا البيع عبارة عن بيع غير لازم، وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط بينهما على وجه المواعدة جاز البيع ويلزم الوفاء بالوعد“۔

(صحیح یہی ہے کہ بائع اور مشتری میں جو عقد ہوا ہے کہ اگر لفظ بیع سے ہوا تھا تو رہن نہ ہوگا، پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اگر شرط فسخ بیع کے اندر ذکر کی گئی ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی، اور اگر بیع میں اس کا ذکر نہیں آیا اور دونوں نے لفظ بیع کا بلفظ وفاء کی شرط کے ساتھ یا بیع جائز کا تلفظ کیا تو بیع فاسد نہ ہوگی، اور صاحبین کے یہاں یہ بیع لازم نہ ہوگی، اگر بیع کا ذکر بغیر شرط کے ہوا ہو، پھر دونوں کے درمیان وعدہ کے طور پر شرط ذکر کی گئی ہو تو بیع جائز اور وعدہ کا ایفاء لازم ہے)۔

”عثمانیہ“ میں ہے:

”بيع الوفاء وبيع المعاملة واحد، وإنه فاسد يفيد الملك عند القبض كسائر البيوعات الفاسدة، وللبائع استردادها إذا قضى دينه متى شاء“۔

(بیع وفاء اور بیع معاملہ ایک ہی ہے، اور وہ فاسد ہے، قبضہ کے وقت ملکیت کا فائدہ دیتی ہے، تمام بیوع فاسدہ کی طرح اور بائع کو اسے واپس لینے کا حق ہے جب اس کا دین چکا دے، جس وقت بھی چاہے)۔

اس کے آگے بعض مشائخ سمرقند کا یہ قول لکھا ہے کہ اگر بیع وفاء، بیع کے اندر (عقد کے وقت) غیر مشروط ہو تو اسے مشتری کے حق میں بیع صحیح مانا جائے گا، حتیٰ کہ بیع سے اس کے لئے استفادہ و انتفاع جائز ہوگا تمام املاک کی طرح، اور اس پر کوئی ضمان نہ ہوگا، اور بائع کے حق میں رہن ہوگا کہ مشتری اسے بیع نہیں سکتا، اور اگر مر جائے تو اس کو میراث نہیں ہوگی، اور جب بائع مال لے کر آجائے تو مشتری کو مال لینے اور بیع کو واپس کرنے کا حکم دیا جائے گا، اور یہ اس لئے ہے کہ ایک عقد کے

دو حکم ہو سکتے ہیں (الفتاویٰ التاریخیہ ۲۰۵/۹، ۲۰۷)۔

حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی ”بیع و فاء“ کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

”بیع بالوفاء، یعنی اس طرح بیع کرنا کہ بائع مشتری سے یوں کہے کہ اگر تم روپیہ واپس کر دو گے تو میں تمہاری چیز واپس کر دوں گا، یا بائع کہے کہ میں یہ چیز تمہارے ہاتھ فروخت کر دوں گا، بیع نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت یہ رہن کی صورت ہے اور رہن میں مرتہن کو شبی مرہون سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا ناجائز نہیں“ (کفایت المفتی، ۱۳۸/۸)۔

”بیع الوفاء“ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے:

”ظاہراً بیع، قصداً رہن ہے، اگر بیع و فاء بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے، تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے، اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطرار نہیں۔“

حضرت تھانویؒ نے بیع الوفاء کو عقد فاسد مانا ہے۔

”..... اور بعض کے نزدیک عقد کے قبل ذکر کی ہوئی شرط کا اعتبار ہی نہیں، اور عقد فاسد نہ ہوگا، لیکن وہ بیع بشرط الوفاء نہ ہوگی..... لیکن کثیر من المتاخرین کا فتویٰ ہے کہ قبل عقد ذکر کی ہوئی شرط بھی معتبر اور عقد جائز ہے، لضرورة الناس“ (امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۳، ۱۰۹)۔

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے ایک سوال جو بیع الوفاء سے متعلق ہے، اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:

”اگر بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا کوئی ذکر نہیں آیا، بلکہ جس طرح اور لوگ شب و روز بیع و شراء کرتے ہیں اسی طرح زید و بکر نے بھی بیع و شراء کر لی اور بکر نے اس کو منظور کر لیا تو شرعاً یہ بیع درست ہوگی، اب زید کو قانوناً مطالبہ واپسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا، وہ کسی طرح بکر کو واپسی پر مجبور نہیں کر سکتا۔

بکر کو اس جائیداد میں مالکانہ تصرف کرنے کا پورا حق حاصل ہے، اگر چاہے تو دوسرے شخص کو ہبہ یا رہن سب کچھ کر سکتا ہے، زید کو ان تصرفات سے روکنے کا حق حاصل نہیں اور عرصہ معینہ فریقین میں اگر زید روپیہ ادا کر دے تب بھی بکر کو اختیار ہے کہ وہ اگر مناسب سمجھے اور اس کو مصالح کے خلاف نہ ہو اور بھی کوئی مانع نہ ہو تو واپس کر دے اور اگر مصالح کے خلاف ہے اور نقصان ہوتا ہو تو اس کو واپسی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ زید کا روپیہ لینے سے انکار کر دے۔

غرض قضاء اس پر کوئی حق باقی نہیں رہا، البتہ دیائے اس وعدہ کو پورا کرنا بہتر ہے، تاہم اگر وعدہ کرتے وقت تو پورا کرنے کی نیت تھی، لیکن بعد میں کسی مصلحت و ذاتی ضرورت یا احتمال نقصان کی بنا پر پورا نہیں کرتا، تو شرعاً اس پر گناہ نہیں۔

اگر بیع نامہ میں یا اس سے پہلے بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا ذکر آچکا ہے تو یہ بیع، رہن کے حکم میں ہے، کل جائیداد جس کی بیع ہوئی ہے، رہن رہے گی، بکر کو اس سے انتفاع ناجائز ہے، نہ اس کی آمدنی لے سکتا ہے، نہ اس کو بیع کر سکتا ہے، نہ

اجارہ، نہ رہن، نہ ہبہ، بلکہ اس جائیداد کا محض محافظ ہے، امین رہے گا، اور اس کی جس قدر آمدنی ہوگی، وہ بھی تمام رہن رہے گی، روپیہ وصول ہونے پر اس جائیداد کے ساتھ اس کی آمدنی کی بھی واپسی ضروری ہوگی، جس طرح بکر کو اس جائیداد سے اس عرصہ میں نفع حاصل کرنا جائز ہے، اسی طرح زید کو بھی نفع حاصل کرنے کا حق نہیں، (فتاویٰ محمودیہ ۲۷۶/۲۴-۲۷۸)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنی کتاب ”الفقہ الاسلامی وادلتہ“ میں لکھا ہے:

”اگر بائع اپنے لئے منفعت کی شرط لگا دے جیسے جانور کی سواری یا گھر کی ایک معلوم مدت جیسے ایک ماہ تک کے لئے رہائش اور یہ بھی کہا گیا ہے، ایک سال تک کے لئے، تو بیع جائز اور شرط بھی جائز ہے، حضرت جابرؓ کی اس حدیث کی وجہ سے جس میں یہ آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت جابرؓ کا اونٹ خرید لیا اور مدینہ اپنے گھر تک سوار ہو کر جانے کی شرط لگالی۔

اور اگر بائع کوئی ایسی شرط لگائے جو ثمن میں خلل انداز ہو، تو بیع جائز اور شرط باطل ہو جائے گی، جیسے یہ شرط لگا دے کہ اگر مشتری تین دن تک ثمن نہ لاسکا تو دونوں میں کوئی بیع نہیں، تو اگر بائع مشتری سے کہے کہ جب تمہارے پاس ثمن لے کر آؤں تو بیع مجھے واپس کر دینا، تو جائز نہیں ہے، بیع کی یہی صورت حنفیہ کے یہاں بیع الوفاء سے معروف ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۳۵۰۸/۵)۔

جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ”بیع بہ شرط واپسی“ کے عنوان سے اس کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”شریعت کے اصول کے مطابق اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو تو درست نہیں ہوتی، یہاں چونکہ اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شیئی واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے بیع درست نہیں، البتہ عملاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی سی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے۔“

آگے شامی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بيع الوفاء، وهو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكة، وهو ضامن لما أكل من ثمرة وأتلف من شجرة“۔

(وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانے میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جا رہا ہے اور اسے بیع وفاء کہا جاتا ہے، درحقیقت رہن ہے جس کا خریدنے والا نہ مالک ہوتا ہے اور نہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے) (جدید فقہی مسائل ۳۷۵-۳۷۶، حلال و حرام: ۳۷۳-۳۷۴)۔

مولانا محترم نے اس عبارت میں خط کشیدہ استثناء کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے جس سے مفہوم میں خلل آ گیا ہے، ناچیز کی

رائے میں اس عبارت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ بیع حقیقتاً رہن ہے، نہ وہ اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ استفادہ کر سکتا ہے، مگر اس کے مالک کی اجازت سے، یعنی اگر مالک استفادہ اور استعمال کی اجازت دے دے تو وہ رہن نہیں رہ جائے گا، نوعیت بدل جائے گی۔

مولانا سید عروج احمد قادریؒ نے بیع الوفاء سے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

”چونکہ سمجھوتہ بیع کی تکمیل کے بعد ہوا ہے، اس لئے بظاہر اسے جائز ہونا چاہئے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مطلقاً جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اگر بعد کو ہونے والے سمجھوتے کی نوعیت شرط لازم کی نہ ہو، بلکہ ایک ایسے وعدے کی ہو جس کو پورا کر دے تو بہت اچھا ہے اور پورا نہ کرے تو بائع قانوناً اپنے فروخت کردہ مکان کو واپس لینے کی پوزیشن میں نہ ہو تو یہ معاملہ جائز ہوگا، اور اگر اس سمجھوتہ کی نوعیت شرط لازم کی ہو کہ خریدار اسے واپس کرنے پر قانوناً مجبور ہو تو یہ معاملہ ناجائز ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ واپسی کی شرط لازم کی صورت میں فی الواقع وہ مکان فروخت ہی نہیں ہو، بلکہ اس کی حیثیت محض رہن کی ہوگی اور رہن سے نفع کمانا جائز نہیں ہے، کچھ لوگ اپنے دیئے ہوئے روپے پر نفع حاصل کرنے کے لئے بیع کا حیلہ کر سکتے ہیں“ (احکام و مسائل: ۳۳۴)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے فیصلے:

اکیڈمی کے ساتویں اجلاس منعقدہ جدہ، سعودی عرب، مورخہ ۷-۱۲/ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۹-۱۳/مئی ۱۹۹۲ء میں موضوع سے متعلق آنے والے مقالات اور بحث و مباحثہ کی روشنی میں اس بیع کی حقیقت یہ سامنے آئی کہ:

”کسی سامان کی فروختگی اس شرط کے ساتھ کی جائے کہ فروخت کنندہ جب بھی قیمت واپس کرے گا، خریدار اسے سامان لوٹا دے گا“؛ چنانچہ اکیڈمی نے طے کیا کہ:

اول: یہ معاملہ درحقیقت ایسا قرض ہے جس میں نفع حاصل کیا جاتا ہے، لہذا یہ سودی معاملہ کا ایک حیلہ ہے اور اکثر علماء کی رائے کے مطابق درست نہیں ہے۔

دوم: اکیڈمی کی رائے میں بھی یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے“ (انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ص: ۲۱۰، قرار

داد: ۶۶/۲۴)۔

اس کا متن یہ ہے:

۱- ”أن حقيقة هذا البيع ”قرض جبر نفعاً“ فهو تحايل على الربا وبعدهم صحته قال جمهور

العلماء۔

۲- یروی الجمع أن یبقی هذا العقد غیر جائز شرعاً“ (الفتحة الاسلامیة وادلتہ ۷/۵۲۰۳)۔

زر ضمانت کا حکم:

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

”آج کل صاحب مکان کرایہ دار سے کچھ رقم بطور زر ضمانت حاصل کرتے ہیں، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے، تاکہ کرایہ دار کے ضرر سے خود کو محفوظ کیا جاسکے، یہ ایک طرح سے کرایہ کے ساتھ قرض کی شرط ہے جو رواج کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اگر کوئی شرط رواج کا درجہ اختیار کر لے تو پھر وہ جائز اور درست ہو جاتی ہے، اس لئے جائز ہے“ (حلال و حرام ص: ۴۰۴)۔

خلاصہ بحث:

بیع الوفاء کا جائزہ لینے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک قدیم طریقہ بیع ہے جو سود سے بچنے کے لئے بطور حیلہ اختیار کیا گیا تھا، اسی لئے قدیم کتب فقہ میں کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس دور میں زیادہ رائج نہیں ہوا تھا، اسی لئے فقہاء کی آراء مختلف ہیں، ایسا لگتا ہے کہ نہ تو اس کی پوری حقیقت واضح تھی اور نہ ہی کوئی صریح حکم لگانا ممکن تھا، اب اس کا رواج پہلے سے بہت زیادہ ہو چکا ہے، اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام طور پر آدمی کو غیر سودی قرض ملتا نہیں اور سودی قرض لینا نہیں چاہتا۔ تو وہ اپنے کسی سامان، مثلاً زمین و جائیداد اور مکان وغیرہ کا کسی سے سود اس طرح کر لیتا ہے کہ تم یہ چیز اتنی قیمت میں فلاں مدت تک لے لو، جب میں مدت پوری ہونے پر قیمت واپس کروں گا تو تم بیع مجھے واپس کر دینا، کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کرنا، ایسی بیع جو بیع الوفاء کہلاتی ہے، ناچیز راقم السطور کے نزدیک بر بنائے ضرورت اور تعامل درست اور جائز ہے، بشرطیکہ وقت اور مدت کی تعیین ہو اور سال بھر کے اندر اندر ہو، اور بہتر صورت یہ ہوگی کہ واپسی کی شرط عقد کے اندر نہ ہو، بلکہ بعد میں کوئی معاہدہ کر لیا جائے۔ ہر شرط مفسد بیع یا فاسد نہیں ہوتی، صرف ایسی شرط فاسد ہے جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو، مفضی الی النزاع ہو اور تعامل کی شکل نہ اختیار کر چکی ہو۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی تحریر اس سلسلہ میں متضاد ہے، انہوں نے اپنی کتاب ”حلال و حرام“

(ص: ۴۰۴) پر ”زر ضمانت“ کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

”اگر کوئی شرط رواج کا درجہ اختیار کر لے تو پھر وہ جائز اور درست ہو جاتی ہے“، جبکہ ”جدید فقہی مسائل“ (حصہ

اول ۳۷۵) پر ”بیع بہ شرط واپسی“ کے اندر لکھتے ہیں کہ:

”شریعت کے اصول کے مطابق اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو تو درست نہیں

ہوتی“۔

اب سوالنامہ کے جوابات حاضر ہیں:

۱- یہ معاملہ شرعاً اور حکماً دونوں منعقد اور درست ہے۔

الف- اس شرط کی حیثیت وعدہ اور معاہدہ کی ہوگی، اگر شرط کا ایفاء ممکن ہو اور نقصان دہ نہ ہو تو خریدار کو اسے پورا کرنا چاہئے، اور اگر کوئی عذر ہو یا ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، جس کی وجہ سے پورا نہ کر سکے بشرطیکہ ابتداء میں نیت پورا کرنے کی رہی ہو تو گنہگار اور مواخذہ دار نہ ہوگا۔

ب- مالک اول کو بیع واپس کرتے وقت سابق ادا کردہ قیمت صرف اسی صورت میں لازم ہوگی، جبکہ تفاوت لیسر اور ضرر خفیف ہو، جسے گوارہ کیا جاسکتا ہو، ورنہ زائد کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

ج- خریدار جب تک اسے اپنے پاس رکھے اس سے استفادہ کر سکتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ مالک سے اجازت بھی لے لے، یا پھر عرف میں خود یہ فائدہ اٹھانا مفہوم ہو۔

د- خریدار اگر کسی اور سے بیچ دے تو بیچ سکتا ہے، لیکن مناسب ہے کہ بائع اول سے دریافت کر لے، جب اسے خریداری کی ضرورت نہ ہو یا وہ مزید قیمت دینے سے انکار کرے تو پھر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، مزید قیمت لینا درست ہے۔

۲- اگر اس معاملہ کو رہن قرار دیا جائے تو:

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانا جائز اور درست ہوگا، لیکن پھر اس کی حیثیت رہن کی نہ رہ جائے گی، عطیہ اور ہبہ کی ہو جائے گی۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو یہ صورت بھی جائز ہوگی، کیونکہ کرایہ کم اور زیادہ رکھنا متعاقدین کی باہمی رضا اور اتفاق پر مبنی ہے۔

ج- خریدار چونکہ اس کا کرایہ ادا کر رہا ہے، اگرچہ معمولی درجہ کا ہی سہی، اس لئے اس سے کسی بھی طرح (کاشت یا اجارہ داری وغیرہ) کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

د- اس صورت میں معاملہ کی نوعیت یہ بتا رہی ہے کہ یہ بیع نہیں اصلاً اجارہ ہے اور خریدار کی حیثیت کرایہ دار کی ہے، اور زمین یا مکان پر بیچنے والے کی ملکیت بدستور باقی اور قائم ہے، لہذا بظاہر خریدار اور اصلاً کرایہ دار کو فروخت کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳- ناچیز کی رائے میں زر ضمانت کا مدار عرف و رواج پر ہونا چاہئے، ورنہ اصلاً وہ امانت ہے، لیکن اگر مالک سے تصرف کی اجازت لے لی جائے تو قرض کے دائرہ میں آجائے گی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی، زر ضمانت سے اس کا تعلق نہ ہوگا، کیونکہ زر ضمانت کی ضرورت کرایہ دار کے ضرر سے محفوظ رہنے کی وجہ سے پیش آتی ہے۔

بیع الوفاء اور مال مرہون سے انتفاع

مولانا حبیب اللہ اشہر بستوی ☆

بیع وفاء کا رواج بخارا میں پانچویں صدی ہجری کے اخیر میں ربو سے بچنے کے لئے ایک حیلہ کے طور پر ہوا، ”البيع الذی تعارفه اهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة“۔ اس بیع کا تذکرہ کتب فقہیہ میں: ”الدر المختار مع رد المحتار“ (۵۴۵/۷)، ”فتح القدير“ (۲۴۲/۹)، ”البحر الرائق“ (۱۱/۶)، ”قاضی خان“ (۳۵۳/۲)، ”بزازیہ“ (۴۰۵/۴)، ”ہندیہ“ (۲۰۸/۳)، ”مجمع الانهر“، ”خلاصۃ الفتاوی“ (۴۸/۳)، ”تبيين الحقائق“ (۲۳۷/۶)، ”جامع الفصولین“ (۲۳۴/۱)، ”شرح المجله“ (المادہ: ۱۱۸)، وغیرہ میں تفصیل سے موجود ہے، اور اپنے بزرگوں میں سے حضرت اقدس تھانویؒ کی امداد الفتاوی اور حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ کے فتاوی ”فتاوی دارالعلوم“ اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے فتاوی ”امداد المفتین (فتاوی دارالعلوم) اور حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ کے ”احسن الفتاوی“ وغیرہ میں بھی اس پر فتوی موجود ہے، البتہ متاخرین بزرگوں میں حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، حضرت کی یہ تحریر ”مباحث فقہیہ“ میں (ص: ۵۶۳-۵۹۶) تقریباً ۳۳ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، اور مولانا محمد تقی امینی کی کتاب ”اسلام اور جدید دور کے مسائل“ میں بھی بیع وفاء پر ایک تفصیلی تحریر تقریباً آٹھ صفحات میں موجود ہے اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب ”غیر سودی بنکاری“ میں (ص: ۲۴۳-۲۵۵) تقریباً بارہ صفحات مشتمل ایک مبسوط تحریر موجود ہے، اور ان کے فتاوی ”فتاوی عثمانی“ میں بھی اس پر فتوی موجود ہے۔

بیع وفاء کی تعریف:

بیع وفاء ایک ایسا عقد ہے جس میں بائع یہ شرط لگاتا ہے کہ جب وہ مشتری کو ثمن لوٹا دے گا تو بیع اسے واپس کر دی جائے گی چاہے ثمن نقد کی صورت میں ہو یا دین (قرض) کی صورت میں، بیع وفاء کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے یہ عین تمہارے ہاتھ اس دین کے عوض جو تمہارا میرے ذمہ ہے اس شرط پر فروخت کر دی کہ جب میں قرض ادا

کردوں گا تو وہ شیئی میری ہو جائے گی، یا یہ کہے کہ میں نے تمہارے ہاتھ یہ چیز اس شرط پر فروخت کر دی کہ جب میں ثمن لوٹا دوں گا تو تم مجھے شیئی بیچ واپس کر دو گے۔

”و صورته أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بمالك علي من الدين علي أني متي قضيت الدين فهو لي، أو يقول: بعث منك هذا العين بكذا علي أني إن دفعت إليك ثمنك تدفع العين إلي“ (فتح القدير مع شرحہ ۲۳۱/۹ م زکریا)۔

بیع وفاء کا حکم:

بیع وفاء کے حکم کے بارے میں حضرات فقہاء کے درمیان شدید اختلاف ہے، ”البحر الرائق“ میں ”بزازیہ“ کے حوالے سے اس سلسلہ میں کل آٹھ قول ذکر کئے گئے ہیں، اور علامہ شامی نے نو اقوال ہونا ذکر کیا ہے اور علامہ شامی ہی کی بات شاہد اموجود کے مطابق ہے (البحر الرائق ۷، شامی ۷/۵۳۵ م زکریا)۔

بیع وفاء یہ بیع فاسد ہے بیع بشرط کی وجہ سے، ”فذهب المالكية والحنابلة والمتقدمون من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد، لأن اشتراط البائع أخذ المبيع إذا رد الثمن إلى المشتري يخالف مقتضى البيع وحكمه، فيكون شرطاً فاسداً يفسد البيع باشتراطه فيه، وإنما يقصد من ورائه الأصول إلى الربا المحرم الخ“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔

بیع صحیح ہے، ”لأنه بيع والشرط محمول على الوعد، (والثاني) ذهب المتأخرون من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء جائز وحجتهم في ذلك أن البيع بهذا الشرط تعارفه الناس وتعاملوه به لحاجتهم إليه فراراً من الربا، فيكون صحيحاً لا يفسد البيع باشتراطه فيه، وإن كان مخالفاً للقواعد؛ لأن القواعد تترك بالتعامل كما في الاستصناع“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔

یہ بیع نہیں، بلکہ رہن ہے، ”لأن الاعتبار للنية والمقاصد لا للألفاظ، (والثالث) وذهب أبو شجاع وعلى السعدي والقاضي أبو الحسن الماتريدي من الحنفية إلى أن بيع الوفاء رهن ليس مبيع فيثبت له جميع أحكام الرهن فلا يملكه المشتري ولا ينتفع به، وحجتهم في ذلك أن العبرة في العقود للمعاني لا للألفاظ والمباني“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۱/۹)۔

یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے کہ اگر متعاقدین کے درمیان عقد لفظ بیع کے ذریعہ ہو اور ان دونوں نے بیع میں فسخ کی شرط کو ذکر کیا ہے یا ان دونوں نے شرط وفاء کے ساتھ لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے یا ان دونوں نے بیع الجائز کہہ کر عقد کیا اور عقد جائز کا مفہوم ان کے یہاں عقد غیر لازم ہوتا ہے تو ان صورتوں میں بیع فاسد ہوگی اور اگر ان دونوں نے بیع کا ذکر وفاء کی شرط کے

بغیر کیا پھر بیع ہو جانے کے بعد وفاء کی شرط بطور وعدہ کے ذکر کیا تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی اور وعدہ کی وجہ سے اس کا ایفاء لازم ہوگا (الدر المختار مع الرد ۵۴۶)۔

بیع وفاء بعض صورتوں میں رہن ہے اور بعض احکام میں بیع نافذ جس کی تفصیل یہ کہ اگر بیع بغیر کسی شرط کے مطلق ہوئی اور وفاء کا تذکرہ نہیں کیا گیا پھر اس کے بعد مشتری نے بائع سے وعدہ کیا کہ جب وہ ثمن مثل ادا کر دے گا تو مشتری بیع کو فسخ کر دے گا تو اس صورت میں اگر بیع ثمن مثل یا معمولی غبن کے ساتھ ہو تو بیع لازم ہوگی، لیکن اگر بیع ثمن مثل سے نہیں، بلکہ غبن فاحش سے ہوئی اور بائع کو اس کا علم بھی ہو یا مشتری نے اصل مال پر نفع متعین کر دیا تو اس صورت میں یہ عقد ”عقد رہن“ ہوگا نہ کہ بیع، کیونکہ غبن فاحش کے ساتھ معاملہ کرنا یا ثمن پر نفع متعین کرنا یہ قرینہ رہن کا ہے نہ کہ بیع کا۔

” (والخامس) ما اختاره أئمة خوارجهم أنه إذا أطلق البيع لکن وکل المشتري وکیلاً یفسخ البیع إذا حضر البائع الثمن أو عهد علی أنه إذا أوفاه فسخ البیع والثلث لا یعادل المبیع، وفيه غبن فاحش أو وصح المشتري علی أصل المال ربحاً، بأن وضع علی مائة عشرين ديناراً، فرهن، وإن كان بلا وضع ربح بمثل الثمن أو بغبن یسیر فبات“ (بزازیہ ۴۰۵)۔

اس عقد پر بعض احکام بیع کے اور بعض احکام رہن کے جاری ہوں گے، یعنی مشتری کے حق میں بیع کے احکام جاری ہوں گے اور بائع کے حق میں رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

” (والسادس) إن الشرط إذا لم یذكر فی البیع تجعله صحیحاً فی حق المشتري ورهنًا فی حق البائع“ (بزازیہ ملخصاً ۴۰۷)۔

بیع وفاء یہ بیع مکہ کے مثل ہے، یعنی خریدنے والا اس کو فروخت کرنے کا اختیار نہیں رکھتا اور بائع کو واپس لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

” (والسابع) لا یملک المشتري البیع من الغیر کما فی بیع المکره إن قضی الدین قال: هذا کبیع المشتري من المکره“ (بزازیہ ملخصاً)۔

عقد وفاء یہ تین عقد سے مرکب ہے، بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن سے اسی وجہ سے اس کو زرافہ سے حضرات فقہاء تشبیہ دیتے ہیں، زرافہ ایک جانور ہے جو گائے، اونٹ چیتا تین جانوروں کے مشابہ ہوتا ہے۔

” (الثامن) هو القول الجامع قلت: هذا العقد مرکب من العقود الثلاثة كالزرافة فیها صفة البقر والبعیر والنمر“ (بزازیہ ملخصاً ۴۰۸)۔

مشتری بیع وفاء میں منافع کا مالک ہو جاتا ہے، لہذا اس کے استعمال سے مشتری کے ذمہ ضمان نہیں آئے گا۔

” (والقول التاسع) أن الملك يثبت للمشتري في زوائده ولا يضمه بالائتلاف“

(بزازیہ ۲۰۱۰ء)۔

مذکورہ بالا اقوال کو بطور اختصار درج ذیل چار اقوال میں جمع کیا جاسکتا ہے۔

۱- بیع فاسد، ۲- بیع صحیح، ۳- رہن، ۴- مرکب من الرهن والبیع۔ اس طرح سے کہ بیع مکہ بھی بیع فاسد میں داخل ہے، لہذا اس کے الگ شمار کرنے کی ضرورت باقی نہیں۔ اسی طرح بیع فاسد اور بیع صحیح کا حکم لگا دینے کے بعد پانچوں قول کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ وہ بعض صورت میں بیع فاسد اور بعض صورت میں بیع صحیح ہے، اور بیع صحیح اور رہن کا حکم لگانے کے بعد چوتھے قول یعنی بعض صورت میں بیع اور بعض صورت میں رہن ہے اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہ جاتی، اس لئے کہ جس صورت میں بیع ہوگی تو بیع میں داخل ہو جائے گی اور جس صورت میں رہن ہوگی تو رہن میں داخل ہو جائے گی، اور مرکب والا قول ذکر کرنے کے بعد ان تمام اقوال کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی جس میں بیع و فاء پر بیک وقت بیع ہونے کا اور رہن ہونے کا بھی حکم لگایا جاتا ہے، اس کے تحت چھٹا قول اور نوواں قول جمع ہو جاتا ہے، اور علامہ شامی اور صاحب درمختار وغیرہ نے بھی مذکورہ تفصیل نہ کر کے اختصار ہی سے کام لیا ہے۔

قول راجح:

اکثر علماء کے نزدیک بیع وفارہن ہے اور اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، یعنی مشتری نہ تو اس کا مالک ہوگا اور نہ ہی اس سے انتفاع کا اختیار ہوگا اور اگر مشتری کا دین بائع کے ذمہ ہے تو بیع کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائے گا، اس لئے کہ شریعت میں مدار اور اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے، نہ کہ ظاہری شکلوں کا، ”قال فی الخیریة: والذی علیہ الاکثر انه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام... لا یملکہ ولا ینتفع بہ، الا یاذن مالکہ وهو ضامن لما أکل من ثمرته وأتلف من شجره، ویسقط الدین بهلاکہ“ (شامی ۷/۴۶۶)۔

لیکن اصول اور ضابطہ فقہیہ کے لحاظ سے قاضی خاں وغیرہ والا قول راجح و مفتی بہ ہے، اس لئے کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ جب عقد لفظ بیع سے ہو اور اس عقد میں اگر شرط مقتضاء عقد کے خلاف لگا دی جائے تو اس شرط کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائے گا، لیکن اگر اس شرط فاسد کا رواج ہو جائے تو اس صورت میں وہ شرط مفسد عقد نہ ہوگی اور اگر شرط عقد کے اندر نہ ہو، بلکہ عقد کے بعد ہو جو وعدہ کے طور پر مذکور ہو تو ایسی صورت میں عقد صحیح ہے اور شرط کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

”واختلفوا فی البیع الذی یسمیہ الناس بیع الوفاء أو بیع الجائز، قال اکثر المشائخ منهم السید الإمام أبو شجاع والقاضی الإمام ابو الحسن السغدی: حکمہ حکم الرهن، والصحیح أن العقد الذی جرى بینہما إن کان بلفظ البیع لایكون رهنًا، ثم ینظر إن ذکر شرط الفسخ فی البیع فسد البیع

....، وان ذکر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (الفتاوى الجانية على هامش الهندية ۱۶۴/۲-۱۶۵)۔

اور اگر شرط کا ذکر عقد سے پہلے اور متعاقدین عقد شرط کے بغیر کریں تو شرط مفسد ہوگی کہ نہیں اس میں حضرات فقہاء کی آراء مختلف ہوئی ہیں، چنانچہ ”جامع الفصولین“ میں ہے:

”لو تواضعا قبل البيع ثم تباعا بلا ذكر شرط جاز البيع الخ“ (جامع الفصولین فصل نمبر ۱۸، ۱۷۱، ۲۳)۔
اور علامہ شامی اس کے برعکس فساد کے قائل ہیں:

”وينبغي الفساد لو اتفقا على بناء العقد عليه كما صرحوا به في بيع الهزل“ (شامی ۷/۲۸۲)۔
حضرت تھانویؒ اپنے ایک فتویٰ میں تحریر کرتے ہیں بعض کے نزدیک عقد سے قبل ذکر کی ہوئی شرط کا اعتبار نہیں ہوگا اور عقد فاسد نہ ہوگا، لیکن وہ بیع بشرط الوفاء نہ ہوگی، لیکن کثیر من المتأخرین کا فتویٰ ہے کہ قبل عقد ذکر کی ہوئی شرط بھی معتبر ہے اور عقد جائز ہے (امداد الفتاویٰ ملخصاً ۱۰۸/۳)۔

اور مفتی محمد تقی صاحب اس بحث کا خلاصہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اگر کسی بیع کے صلب عقد میں کوئی شرط نہ لگائی جائے، لیکن عقد سے پہلے یا بعد میں اس کا ذکر وعدے کے طور پر کیا جائے، تو اس سے بیع فاسد نہیں اور نہ ”صفقة فی صفقة“ لازم آتا ہے اور کبھی اس وعدے کو حاجت کی بنا پر لازم بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

بیع الوفاء کے بارے میں حضرات اکابر کے فتاویٰ:

حضرت تھانویؒ کا فتویٰ ظاہراً بیع قصداً رہن ہے اور رہن قصداً اور بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں سواصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر وہ بیع ہے تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے تب بھی حرام ہے لیکن بعض متأخرین نے اجازت دی ہے پس بلا اضطراب ارشاد یتو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب ارشاد یتو اس کو اختیار ہے کہ فتویٰ متأخرین پر عمل کرے اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں (امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۳)۔

اور حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کا فتویٰ چونکہ الفاظ بیع و شراء کے اس میں موجود ہیں اس لئے یہ بیع ہے پھر اگر بیع کے اندر یا بیع کے وقت شرط واپسی کی گئی ہے تو بیع فاسد ہے اور اگر بعد تمام عقد کے واپسی کی شرط کی گئی ہے تو بیع صحیح ہے اور شرط ایک وعدہ ہے (فتاویٰ دارالعلوم ممبئی جز ۱۰۸/۶)۔

مفتی محمد شفیع صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر شرط واپسی کی صلب عقد میں لگائی گئی تو عقد فاسد ہے جس کا فسخ کرنا متعاقدین پر واجب ہے اور اگر شرط واپسی صلب عقد میں ذکر نہ کی گئی اور بعد عقد کے بطور وعدہ ذکر کی گئی تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی اور بعد ختم مدت کے واپس کرنا بیع کا اگر مشتری راضی ہو لازم ہوگا (فتاویٰ دارالعلوم ممبئی جز ۱۰۸/۶)۔

اور مفتی رشید احمد صاحبؒ اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے (حسن الفتاویٰ ۶/۵۰۷)۔

اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا فتویٰ (فارسی فتوے کا ترجمہ) یہ بیع بالوفاء ہے اور اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ فاسد ہے اکثر فقہاء کرام اس عقد میں رہن کے احکام جاری کرتے ہیں اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو بھی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیع دے، اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع وفاء میں مشتری کو بیع رہن وقت وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہذا جن حضرات نے اسے عقد رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا انتقال جائز ہے لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں (فتاویٰ عثمانی ۳/۱۰۸)۔

خلاصہ:

اگر کسی چیز کو ایسی کسی شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے تو یہ شرط مقتضاء عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے فساد عقد کا موجب ہے، البتہ اگر اس شرط کے ساتھ خرید و فروخت کا عرف و رواج ہو جائے تو یہ شرط مفسد نہ ہوگی، لیکن اگر اس شرط کا رواج نہ ہو اور اس شرط کا ذکر صلب عقد میں نہ ہو، بلکہ عقد کے پورا ہونے کے بعد اس شرط کا ذکر بطور وعدہ ہو تو بیع صحیح ہے اور اس وعدے کو بھی پورا کرنا لازم ہے اور اگر شرط کا ذکر نہ تو صلب عقد میں اور نہ عقد کے بعد ہو، بلکہ عقد سے پہلے ہو اور اس شرط کو ملحوظ رکھ کر عقد کیا جائے تو اس کے موجب فساد ہونے میں اختلاف ہے، راجح فساد ہے، مرجوح عدم فساد ہے اور ضرورت کے وقت اس پر عمل کی گنجائش ہے۔

جزئیات مسئولہ کے جوابات:

اس خاص قید و بند کے ساتھ جو معاملہ بیع کے عنوان سے کیا جاتا ہے یہ حضرات فقہاء کے نزدیک رہن یا بیع فاسد ہے، شرعاً اس طرح معاملہ کرنا ناجائز و حرام ہے، البتہ اگر شرط و قید کے اندر نہ ذکر کیا جائے تو اس طرح معاملہ کی گنجائش ہے، معاملہ صحیح ہو جائے گا اور شرط وعدہ بنے گا جس کا ایفاء لازم ہوگا، ایفاء وعدہ کے سلسلے میں مفتی محمد تقی صاحب کی ایک مبسوط تحریر ”وعدے کی شرعی حیثیت“ کے عنوان سے ”غیر سودی بینکاری“ نامی کتاب میں (ص: ۱۳۴-۱۶۰) پر موجود ہے جس کا خلاصہ انہیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

۱- وعدہ کا ایفاء حالات میں صرف دیانتاً واجب ہوتا ہے قضاء نہیں اگر کوئی شخص بغیر کسی عذر کے وعدہ خلافی کرے تو گنہگار ہے اور اگر وعدہ کرتے ہوئے ہی وعدہ خلافی کی نیت ہو تو اسے حدیث میں نفاق فرمایا گیا ہے۔

۲- دو طرفہ وعدہ جسے معاہدہ کہا گیا ہے اس کو بعض فقہاء عصر نے وعدہ سے ممتاز کر کے لازم قرار دیا ہے، یعنی ایک طرفہ وعدے کو قضاءً لازم نہیں کیا، لیکن دو طرفہ وعدہ کو قضاءً بھی لازم قرار دیا ہے۔

۳- بعض معاملات میں حاجت کی وجہ سے ایک طرفہ وعدہ کو قضاءً بھی لازم کیا جاسکتا ہے۔

۴- اگر کسی خلاف شرع بات کا کوئی وعدہ کیا گیا ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں، مثلاً ایک شریک دوسرے شریک سے یہ وعدہ کرے کہ اگر کاروبار میں کوئی نقصان ہوگا تو میں اس کی تلافی کر کے تمہیں دوں گا تو یہ وعدہ بھی چونکہ سارا نقصان ایک فریق پر ڈالنے کا موجب ہے جو شرعاً جائز نہیں، اس لئے یہ وعدہ بھی جائز نہیں۔

۵- تجارتی معاملات میں وعدے کے قضاءً لازم ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کے قضاءً لازم ہونے پر فریقین وعدے کے وقت ہی متفق ہو جائیں (غیر سودی بیکاری: ۱۵۷)۔

الف- بیع و فاء میں بیع کو کسی دوسرے سے فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں، بلکہ بائع کو واپس لوٹانا واجب ہے، کیونکہ اگر یہ بیع صحیح ہے اور شرط وعدہ ہے تو وعدے کی بنا پر واجب ہے اور اگر بیع فاسد ہے تو بھی شرعاً اس بیع کا فسخ اور بیع کا رد واجب ہے، اور اگر رہن ہے تو پھر اس کی واپسی کے واجب و لازم ہونے میں کوئی شبہ نہیں کمافی ”امداد الفتاویٰ“ وغیرہا اور مفتی محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ بیع و فاء میں مشتری کو بیع، رہن، وقف وغیرہ میں سے کسی کا اختیار نہیں (فتاویٰ عثمانی ۱۰۸/۳)۔

”وفی الرد قیل: بیع یفید الانتفاع بہ، ہذا محتمل لأحد القولین أنه بیع صحیح مفید....
إلا أنه لا یملک بیعہ، والقول الجامع.... أنه فاسد فی حق بعض الأحكام... صحیح فی حق بعض الأحكام.... رہن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعہ من آخر ولا رہنہ.... قال فی البحر: ینبغی أن لا یعدل فی الإفناء عن القول الجامع“ (شامی ۴۶۷/۲ م زکریا)۔

ب- مالک اول کو بیچنے کی صورت میں سابقہ قیمت ہی کا مطالبہ ہوگا اس سے زائد کا مطالبہ شرعاً جائز نہیں، اس لئے کہ اگر بیع فاسد ہے تو یہ فسخ بنے گا جس میں قیمت اول ہی لازم ہوتی ہے اضافہ جائز نہیں اور اگر بیع صحیح ہے تو وعدے کی بناء پر سابقہ قیمت سے زائد کا مطالبہ جائز نہیں اور اگر رہن ہے تو قیمت سے زائد مطالبہ کا عدم جواز ظاہر ہے۔

خریدار کا نفع اٹھانا:

بیع و فاء کے طریقے پر خریدی ہوئی بیع سے نفع اٹھانا مفتی بہ قول کے مطابق جائز نہیں، البتہ اگر وفاء کی شرط صلب عقد میں داخل نہ ہو یا اس شرط کا عرف و رواج ہو جائے تو نفع اٹھانا جائز ہے، کیونکہ بیع و فاء میں تین احتمالات ہوتے ہیں بیع فاسد، رہن، بیع صحیح سابقہ دو احتمال کی وجہ سے نفع اٹھانا جائز نہیں، البتہ جب تیسری صورت متعین ہو جائے تو انتفاع جائز ہے۔

د- راجح قول کے مطابق کسی دوسرے سے بیچنا جائز نہیں، رہن فاسد ہے تو عدم جواز ظاہر ہے اور اگر بیع صحیح تو

وعدے لازمہ کی وجہ سے کسی دوسرے سے فروخت کرنے کا عدم جواز متعین و مسلم ہے اور اگر دوسرے سے فروخت کر کے سابقہ قیمت سے زائد وصول کرے تو اس سابقہ قیمت سے جو زائد ہے اس کا بائع کو لوٹانا بہر حال لازم ہے، اس لئے کہ اگر رہن ہے تو پوری قیمت کا مالک بائع اول ہوگا جس میں سے اپنا قرض وضع کرنے کے بعد بقیہ بائع کو ادا کرے اور اگر بیع فاسد ہے تو بھی زائد قیمت بائع اول کو لوٹانے یا صدقہ کرنے کا حکم اور لوٹانے میں کوئی شبہ نہیں اور تصدق میں شبہ کی وجہ سے کلام ہے، اور اگر بیع صحیح ہے تو ایفاء وعدہ کے واجب ہونے کی وجہ سے جو بائع کا اضرار ہو اس کی تلافی کے لئے واپس کرنے کا حکم ہے، ”و حکمہ أن الأجرة للراهن وإن كان بغير إذنه يتصدق بها أو يردّها على الراهن المذكور، وهو أولى صرح به علماؤنا“ (شامی ۵۳۹/۷ م زکریا)۔

”إنما للبائع ما ربح في الثمن (من بيع الفاسد) لا يطيب للمشتري ما ربح في بيع يتعين بالتعيين بأن باعه بأزيد لتعلق العقد، فتمكن الجنب في الربح، فيتصدق به“ (الدر المختار ۲۹۹/۷ م زکریا)۔

بیع وفاء کو رہن قرار دینے کی صورت میں جو احکام مرتب ہوتے ہیں ان کو ضمناً سابقہ جوابات میں عرض کر دیا گیا ہے کہ رہن قرار دینے کی صورت میں مشتری کے لئے اس سے نفع اٹھانا ناجائز نہیں۔

الف- اشیاء مرہونہ سے نفع اٹھانا بلا طیب خاطر کے شرعاً ناجائز و حرام ہے اور یہ سود میں داخل ہے اور قرض کے دباؤ میں ملنے والی اجازت شرعاً غیر معتبر ہے، ”کل قرض جور نفعاً حرام فکروہ للمرتہن سکنی المرهونة یا ذن الراهن، عن عبد الله السمرقندی کان کبار من علماء سمرقند أنه لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن الخ“ (شامی ۳۹۵/۷ م زکریا)، ”القدام على الإجارة بعد البيع دل على أنهما قصداً بالبيع الرهن فلا يحل الانتفاع“ (شامی ۵۴۷/۷)۔

ج- بیع وفاء کو اگر رہن مانا جائے تو اس سے تمام طرح کا انتفاع شرعاً ناجائز و حرام ہے اور یہ سود میں داخل ہے، ”هو رهن في الحقيقة لا ينتفع به... هو ضامن لما أكل من ثمره الخ“ (شامی ۴۳۶/۷ م زکریا)۔

د- بیع وفاء کے طور پر خریدنے والا اس کو بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے اور اگر خلاف شرع بیع دے اور بیع کا فسخ ممکن نہ ہو تو اس کا ضمان آئے گا، کیونکہ یہ غصب ہے۔

”ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه“ (شامی ۵۳۶/۷ م زکریا)۔

۳- ج- ڈپازٹ کے دباؤ میں کرایہ کم دینا:

قرض پر دی گئی رقم سے نفع کمانا ربوا ہے اور حرام ہے یہ ایسا اصول ہے جو ہر عہد میں امت کے درمیان مقبول و معروف رہا ہے اس کو مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے، ہے تو سند ضعیف لیکن فقہاء علماء کے درمیان اس کا منتقلی بالقبول ہونا

ضعف سند کی تلافی کر دیتا ہے، فقہاء نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے، ”القرض بالشرط حرام والشرط لغو کل قرض جو نفعاً حرام، فکرہ للمرتہن سکنی المرهونة یا ذن الراهن“۔

اس اصول و ضابطہ کی بنا پر رضمانت کے نام پر کثیر رقم دینے کے بعد مکان دکان وغیرہ کا کرایہ کم دینا شرعاً، کیونکہ رضمانت مالک کے ذمہ قرض ہو جاتی ہے اور قرض کے دباؤ میں کرایہ کم کرنا اصولی اعتبار سے غلط ہے، اگرچہ مفتی محمد تقی صاحب عثمانی فرماتے ہیں سیکورٹی ڈپازٹ کی وجہ سے جو خلط کی وجہ سے انتہاء قرض بن چکا ہے کرایہ میں اجرت مثل سے کمی کرنا جائز نہیں، لہذا جن بینکوں میں اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی کی جاتی ہے وہ شرعاً درست نہیں، چنانچہ اگر سیکورٹی ڈپازٹ لیا جائے تو اس کی وجہ سے کرایہ میں اجرت مثل سے کمی نہ کرنے کا اہتمام ہونا چاہئے الخ (غیر سودی بینکاری: ۲۷۴)۔



بیع و فاء میں بیع سے فائدہ اٹھانا

مولانا شاہد علی قاسمی ☆

ضرورت مند شخص جب اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے قرض حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو وہ مجبوراً اپنے کسی سامان کو بیچتا ہے، اور خریدار سے کہتا ہے کہ جب میں روپیہ واپس کر دوں تو تم مجھے میرا سامان واپس کر دینا، اس طرح یہ شخص اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، معاملہ کی اسی صورت کو فقہاء احناف ”بیع و فاء“ اور ”بیع معاملہ“ کہتے ہیں، جبکہ شوافع اسے ”رہن معاذ“ اور مالکیہ ”بیع ثنیا“ اور حنابلہ ”بیع امانت“ کہتے ہیں، مصر کے لوگ بھی اسے بیع امانت سے یاد کرتے ہیں، جبکہ ملک شام کے لوگ اسے ”بیع طاعت“ کہتے ہیں (دیکھئے: رد المحتار ۲/۳۶۶، الموسوعۃ الفقہیہ ۲۶۰/۹)۔

بیع و فاء کا حکم:

کسی چیز کو بیچتے ہوئے ایسی شرط لگانا جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے: ”نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع و شرط“ (اعلاء السنن ۱۳/۱۳۶، حدیث نمبر: ۴۶۶۶)، اسی لئے فقہاء نے بھی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے تقاضہ عقد کے خلاف لگائی جانے والی شرط کو بیع کے لئے مفسد قرار دیا ہے، مذہب حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ حسکفی فرماتے ہیں:

”الأصل الجامع فی فساد العقد بسبب شرط لا یقتضیہ العقد ولا یلائمہ الخ“ (الدر المختار علی ہاشم

رد المحتار ۱۲/۱۲۱، باب بیع الفاسد)۔

بیع و فاء میں غور کیا جائے تو یہاں بھی فروخت کنندہ کا خریدار سے کہنا کہ جب میں سامان کی قیمت واپس کر دوں تو مجھے سامان واپس دیدینا یہ تقاضا عقد کے خلاف شرط ہے، کیونکہ بیع کا تقاضا استقرار و دوام ہے، یعنی خریدار اس کا مستقل مالک ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی مرضی سے وہ سامان ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکتا ہے، لیکن بیع و فاء میں استقرار و دوام نہیں رہتا ہے، خریدار کو ہمیشہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کب فروخت کنندہ روپیہ واپس لا کر اپنا سامان لے لے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ بیع و فاء میں سامان کی واپسی کی شرط معاملہ کے لئے مفسد ہے، اسی لئے مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین حنفیہ و شوافع بیع و فاء کو فاسد

قرار دیتے ہیں، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

”فمذهب المالک والحنابلة والمتقدمين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء فاسد، لأن اشتراط البائع أخذ المبيع إذا رد الثمن إلى المشتري يخالف مقتضى البيع وحكمه“ (الموسوعة الفقهية ۲۶/۹)۔

لوگوں کی مجبوریوں اور تعامل کو دیکھتے ہوئے متاخرین احناف و شوافع نے اس میں گنجائش کا راستہ اختیار کیا، البتہ جواز کے یہ قائلین بھی بنیادی طور پر دو گروہ میں منقسم ہو گئے، ایک گروہ کے نزدیک بیع و فاء بیع ہی کی حیثیت سے منعقد ہوگی، لہذا خریدار کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، البتہ فروخت کنندہ سے کئے ہوئے معاہدہ کا لحاظ رکھتے ہوئے خریدار سامان کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مجاز نہیں ہوگا، علامہ ہسکلفی فرماتے ہیں:

”وقيل بيع يفيد الانتفاع به ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس، وهو الصحيح كما في الكافي“ (الدر المختار علی باش الرشد ۲۷/۲۷۷)۔

جواز کے قائلین میں سے دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ بیع و فاء منعقد تو ہو جائے گی، لیکن اس کی حیثیت رہن کی ہوگی، اور اس معاملہ میں رہن کے احکام ہی جاری ہوں گے، کیونکہ عقود میں الفاظ و معانی کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ اغراض و مقاصد کا اعتبار ہے، اور یہ بیع اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے رہن کی طرح ہے (دیکھئے: رد المحتار ۲۷/۲۷۷)۔

صاحب فتاویٰ خیر یہ نے کہا کہ جس بات پر اکثر فقہاء ہیں وہ یہ ہے کہ بیع و فاء رہن ہے، یہ رہن سے کسی حکم میں مختلف نہیں ہے، سید امام نے کہا کہ میں نے امام حسن ماتریدی سے کہا کہ لوگوں کے درمیان یہ بیع عام ہو چکی ہے، جبکہ اس کے اندر عظیم مفسدہ ہے، اور آپ کا قول بھی یہی ہے کہ وہ رہن ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں تو بہتر بات یہ ہے کہ ہم لوگ ائمہ کو اسی پر جمع کریں اور اسی پر متفق ہو جائیں اور لوگوں کے درمیان اسی حکم کو ظاہر کریں، جو فقہ ہمارے مخالفت کرنا چاہے تو وہ اپنے آپ کو ظاہر کرے اور اپنی دلیل کو پیش کرے۔

پھر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ صاحب ”جامع الفصولین“ نے فتاویٰ نسفی کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا کہ لوگوں نے سود سے بچنے کے لئے بیع کی جس صورت کو اختیار کیا ہے اور جسے ”بیع و فاء“ کہا جاتا ہے یہ حقیقت میں رہن ہے، لہذا خریدار اس چیز (بیع) کا مالک نہیں ہوگا اور مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا ہے، اگر اس پھل کو کھائے یا کسی درخت کو تلف کر دے تو وہ اس کا تاوان دے گا اور اگر وہ چیز ہلاک ہو جائے تو اس کے بقدر دین بھی ساقط ہو جائے گا۔

ہمارے نزدیک اس (بیع و فاء) اور رہن کے درمیان کسی بھی حکم میں فرق نہیں ہے۔ شامی کی عبارت ملاحظہ ہو:

”لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام“ (رد المحتار ۳/۲۴۶)۔

علامہ شامی کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیع و فاء رہن کے حکم میں ہے۔ (قیل: ہو رہن) قدمنا آنفاً عن جواهر الفتاویٰ أنه صحیح“ (حوالہ سابق)۔

اس لئے راقم الحروف کی بھی یہی رائے ہے کہ بیع و فاء بیع فاسد نہیں ہے، بلکہ یہ بظاہر بیع ہے اور حقیقت میں رہن ہے، اس لئے بیع و فاء کی صورت میں رہن کے احکام ہی جاری ہوں گے۔

۲- الف: بیع و فاء میں بیع سے فائدہ اٹھانا:

تفصیل بالا کے مطابق بیع و فاء میں بیع کی حیثیت مال مرہون کی ہے تو جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا درست ہے یا نہیں؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے نقاط نظر پیش کر دیئے جائیں۔

حنابلہ کا مسلک:

حنابلہ کے نزدیک اگر مال مرہون کا تعلق ایسے جانور سے ہو جس پر سواری کی جاتی ہو، یا اس کے دودھ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو تو مرہون ایسے جانور کو چارہ وغیرہ کھلاتے ہوئے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس سلسلہ میں بطور استدلال یہ حدیث پیش کی جاتی ہے، ”الظہر یرکب بنفقته إذا کان مرهوناً ولبن الدر ویشرب بنفقته إذا کان مرهوناً، وعلی الذی یرکب ویشرب النفقۃ“ (بخاری: حدیث نمبر: ۲۵۱۲ باب الرهن مرکوب و محلوب)۔

اور اگر مال مرہون کا تعلق مذکورہ جانور سے نہ ہو تو راہن مرہون کی اجازت سے اور مرہون راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، البتہ مرہون فائدہ اٹھائے تو اس کے جائز ہونے کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں، ایک یہ کہ فائدہ اٹھانا بلا عوض نہ ہو، دوسرے یہ کہ رہن کا معاملہ قرض کی وجہ سے نہ ہو:

۱- ”أن لا یکون المرهون به دین“۔

۲- ”أن لا یأذن بغير عوض“ (الموسوعة الفقہیہ ۲۳/۱۸۲ بحوالہ مغنی)۔

شواہع و مالکیہ:

شواہع کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مرہون صرف بہ طور وثیقہ رہن کا معاملہ کرتا ہے، اس کے علاوہ کسی طرح کا تصرف اور انتفاع مال مرہون سے نہیں کر سکتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں: روضۃ الطالبین ۳/۷۹-۹۹، اسنی المطالب ۲/۱۶۱)۔

مالکیہ کے نزدیک بھی مرہون مال مرہون سے عام حالات میں فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، خصوصاً جبکہ راہن نے مرہون سے قرض لیا ہو اور اسی بنیاد پر قرض کا معاملہ کیا ہو، ہاں! اگر مرہون نے صلہ عقد میں انتفاع کی شرط لگا دی ہو اور مدت انتفاع

متعین ہو، اور قرض کی بنیاد پر رہن کا معاملہ نہ ہوا ہو تو ان تین شرطوں کے ساتھ مال مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں: بغیۃ السالک علی الشرح الصغیر ۲/۱۱۲، حاشیۃ السوتی ۳/۲۴۶)۔

احناف کا نقطہ نظر:

احناف کا نقطہ نظر اس سلسلہ میں آپس میں مختلف ہے، ایک رائے یہ ہے کہ راہن و مرہن میں سے کوئی بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، ہاں اگر ایک دوسرے کو اجازت دے دے تو راہن و مرہن میں سے ہر ایک دوسرے کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اکثر احناف کا میلان اسی قول کی طرف ہے، چنانچہ مشہور ماتن علامہ ترمذی غزی حنفی فرماتے ہیں:

”لا الانتفاع به مطلقاً إلا بإذن“ (تتویر الابصار مع الدرر ۲/۶۶)۔

علامہ شامی نے مانعین (جو اجازت سے بھی انتفاع کو ناجائز قرار دیتے ہیں) کا قول ذکر کرنے کے بعد تحریر کیا کہ یہ مشہور قول کے خلاف ہے۔

”هذا مخالف لعامة المعتمرات من أنه يحل بالاذن“ (رد المحتار ۵/۳۱۰)۔

دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ اگر صلب عقد میں انتفاع کی شرط ہو تو یہ ربا کے حکم میں ہے، اور اگر صلب عقد میں انتفاع کی شرط نہ ہو تو راہن کی اجازت سے انتفاع جائز ہے، چنانچہ علامہ شامی نے جو اہر الفتاویٰ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

”ثم رأيت في جواهر الفتاوى إذا كان مشروطاً صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا وإلا فلا بأس“

(حوالہ سابق)۔

تیسرا نقطہ نظریہ ہے کہ بالکل مرہن مال مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، خواہ راہن اجازت ہی کیوں نہ دے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ مال مرہون سے استفادہ درحقیقت قرض سے فائدہ اٹھانا ہے اور قرض سے فائدہ اٹھانا سود ہے اور سود کی اجازت آپسی رضامندی سے بھی نہیں ہو سکتی ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں:

”قال في المنح وعن عبد الله محمد بن أسلم السمرقندی وكان من كبار علماء سمرقند أنه

لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه إذن له في الربا، لأنه يستوفي

دينه كاملاً، فتبقى له المنفعة فضلاً، فيكون ربا، وهذا أمر عظيم“ (رد المحتار ۵/۳۱۰)۔

تیسرا قول ہی متاخرین احناف کا پسندیدہ اور مفتی بہ ہے، علماء ہند کا عمل بھی اسی پر ہے (دیکھئے: فتاویٰ محمودیہ ۲۰/۱۲۸)، لہذا دریافت کردہ صورت میں خریدار جو حقیقت میں مرہن ہے، بیع (مال مرہون) سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، خواہ فروخت کنندہ (راہن) فائدہ اٹھانے کی اجازت ہی کیوں نہ دیدے، اسی قول کو اختیار کرنے میں احتیاط ہے، اور یہی راقم کا بھی نقطہ نظر ہے، البتہ اجارہ کا معاملہ کر کے فائدہ اٹھا سکتا ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

”و كذلك لو استأجره المرتهن صحت الإجارة، وبطل الرهن، إذا جدد القبض للإجارة“

(فتاویٰ عالمگیری ۴۶۵/۵)۔

۲-ب: اگر خریدار بیع و فاء کی صورت میں بیع کا مروجہ کرایہ ادا نہ کرے؟

سابقہ تفصیلات کے مطابق بیع و فاء راقم الحروف کے نزدیک رہن کے حکم میں ہے، اس لئے خریدار کے قبضہ میں اگر زمین یا مکان ہے، تو اس میں بھی رہن کے احکام جو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور مال مرہون سے استفادہ سے متعلق گو کہ احناف کے یہاں بنیادی طور پر تین نقاط نظر ہیں تاہم راقم الحروف کے نزدیک تیسرا قول راجح ہے، یعنی مرہن راہن کی اجازت سے بھی مال مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، حدیث میں ہے:

”كل قرض جو منفعة فهو ربا“ (اعلاء السنن ۵۱۲/۱۳، حدیث نمبر: ۴۸۵۸)۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ سود کے باب میں شبہ سود بھی سود کے درجہ میں ہوتا ہے، یعنی وہ بھی ناجائز ہوتا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان سے چلے گئے، لیکن ربا کی مکمل وضاحت نہیں فرمائی، اس لئے سود اور شبہ سود سے بچو، ”وان رسول اللہ ﷺ قبض ولم يفسرها، فدعوا الربا والريبة“ (ابن ماجہ، باب التغليظ في الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۶)۔

اس لئے راقم الحروف کا خیال ہے کہ مرہن (خریدار) اس زمین یا مکان کے مروجہ کرایہ سے کم ادا کر کے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کی اجازت نہیں ہوگی، کم کرایہ سے مراد اتنا کم جو بن فاحش کے دائرہ میں آجائے، اور بن فاحش کہتے ہیں جو قیمت لگانے والوں کی قیمت کے دائرہ میں نہ آئے، ”هو ما لا يدخل تحت تقويم المقومين“ (کتاب الترفیفات: ۱۶۳)، اس لئے کرایہ اتنا کم رکھنا جو وہاں کے معروف کرایہ سے کم ہو اس کی بھی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ یہ قرض سے فائدہ اٹھانے والی بات ہوگی۔

۲-ج: بیع و فاء میں بیع سے فائدہ اٹھانا:

ما قبل میں یہ بات آچکی ہے کہ بیع و فاء راجح قول کے مطابق رہن ہے، اس لئے رہن کے احکام جاری ہوں گے، لہذا خریدار اس سامان سے کسی طرح کا فائدہ خواہ کاشتکاری کا ہو یا اجارہ داری کا نہیں اٹھا سکتا ہے، ہاں! اگر خریدار نے فروخت کنندہ سے کھیت کو معروف و مروج کرایہ پر حاصل کر کے کاشت کاری کی یا مکان و دکان کے سلسلہ میں باضابطہ کرایہ داری کا معاملہ فروخت کنندہ سے کیا، تو اسے مستقل عقد سمجھا جائے گا، اور فروخت کنندہ نے اولاً جو کچھ روپیہ بیع و فاء کرتے ہوئے حاصل کیا تھا، اس کی حیثیت ”ثمن کے بجائے قرض کی ہوگی، اور فروخت کنندہ مقروض اور خریدار مقرض سمجھا جائے گا، اور پھر کرایہ داری کا معاملہ کرنے کی وجہ سے مقروض ”موجز“ بھی سمجھا جائے گا، اور مقرض مستاجر ہوگا۔

۲-د: بیع و فاء میں بیع کو بیچنے کا حق:

اگر خریدار نے کرایہ داری کا معاملہ نہ کیا ہو تو اس کی حیثیت مرہن کی ہے، اس لئے رہن کے احکام جاری ہوں گے، اور مال مرہون کے سلسلہ میں یہ حکم ہے کہ مرہن راہن کی اجازت کے بغیر مال مرہون کو نہیں بیچ سکتا ہے، علامہ شامی رقمطراز ہیں:

”و کذا توقف علی اجازة الراهن بیع المرتهن، فإن أجاز جاز، وإلا فلا“ (رد المحتار ۵/۳۲۷)۔

اسی طرح راہن کی اجازت پر مرہن کا فروخت کرنا موقوف ہے، اگر راہن اجازت دیدے تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

یہی رائے حنابلہ، شافعیہ اور مالکیہ کی بھی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: المغنی ۴/۴۷۷، روضۃ الطالبین ۴/۸۸)۔

ہاں اگر فروخت کنندہ (راہن) نے معاملہ کے وقت ہی یا معاملہ کے بعد خریدار (مرہن) سے کہہ دیا ہو کہ جب میں فلاں تاریخ تک روپیہ نہ لاسکوں تو آپ بیع (مال مرہون) دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں، تو ایسی صورت میں اس مدت کے بعد خریدار (مرہن) اس سامان کو فروخت کرنے کا مجاز ہوگا، علامہ حسکفی رقمطراز ہیں:

”فإن وكل الراهن المرتهن أو وكل العدل أو غیرهما بیعہ عند حلول الأجل مع“ (الدر المختار علی

ہاشم رد المحتار ۵/۳۲۴)۔

اگر راہن خود سے اجازت نہ دے، لیکن اگر مرہن خصوصی طور پر سامان کو بیچنے سے پہلے راہن سے اجازت لے لے تو بھی کافی ہے، بہر حال! خریدار (مرہن) فروخت کنندہ (راہن) کی اجازت کے بغیر نہیں بیچ سکتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر فروخت کنندہ مناسب مدت گزرنے کے باوجود روپیہ واپس نہ کرے، اور خریدار (مرہن) کو سامان بیچنے کی اجازت بھی نہ دے، تو خریدار کس طرح اپنا حق وصول کرے؟ اس سلسلے میں مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مرہن (خریدار) معاملہ کو قاضی کے پاس لے جائے اور قاضی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ راہن پر دباؤ ڈالے، اگر دباؤ بھی کارگر نہ ہو تو حنابلہ اور شوافع کے نزدیک قاضی جس و ضرب سے کام لے، یہ بھی کارگر نہ ہو تو قاضی خود سامان بیچ کر مرہن کو روپیہ ادا کرے، اور مالکیہ کے نزدیک ضرب و جس کے بغیر ہی قاضی سامان کو بیچ سکتا ہے۔

”فإن أصر علی الامتناع من كلا الأمرین عزره الحاكم بالحبس أو الضرب لیبيع المرهون

فإن لم يفعل باع الحاكم المرهون، و قضي الدين من ثمنه، لأنه تعین طریقاً لأداء الواجب، وإلی هذا

ذهب الشافعية والحنابلة.... وقال المالكية: لا يضرب ولا يحبس ولا يهدد بهما، بل يقتصر الحاكم

علی بیع المرهون وأداء الدين من ثمنه“ (الموسوعة الفقهية ۱۸۹/۲۳)۔

حنفیہ کے نزدیک مشہور قول یہ ہے کہ قاضی خود سے مال مرہون نہیں بیچ سکتا ہے، خواہ تادیب کی تدبیر جیسے جس وغیرہ

کارگرنہ ہو، ایسی صورت میں قاضی جس کو اور دراز کرے گا اور اس وقت تک قید میں رکھے گا جب تک کہ راہن بیچنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

”وقال الحنفية: لا يبيع القاضى المرهون، لأنه نوع حجر، وفى الحجر اهدار أهليته، فلا يجوز، ولكنه يديم الحبس عليه حتى يبيعه دفعاً للظلم“ (حوالہ سابق ۱۹۰/۲۳)۔

لیکن فی زمانہ اس قول پر عمل کرنے میں جو دشواری ہے وہ ظاہر ہے، اس لئے یہ بات مناسب ہوگی کہ اگر راہن اپنی ضد پر ہو، اور قاضی کے کہنے کے باوجود وہ نہ بیچے تو قاضی خود بیچ کر مرہن کو اس کا حق دیدے، چنانچہ علامہ شامی نے ”فتاویٰ ولو الجیہ“ کے حوالے سے لکھا ہے:

”فإذا امتنع باعه القاضى أو أمينه للمرتهن وأوفاه حقه والعهد على الراهن وبه أفتى فى الحامدية“ (رد المحتار ۵/۳۱۳)۔

پس صورت مسئلہ میں خریدار جو حقیقت میں مرہن ہے، وہ بیچ (جو حقیقت میں مال مرہون ہے) کو از خود بلا اجازت بیچنے کا حق نہیں رکھتا ہے، لیکن اگر وہ بیچ ہی دے، تو پھر کیا حکم مرتب ہوگا؟ اس سلسلہ میں فقہاء احناف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مرہن کا یہ تصرف راہن کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر راہن اجازت دیدے تو بیچ نافذ ہو جائے گا، ورنہ نہیں، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”وكذا توقف على إجازة الراهن بيع المرتهن، فإن إجازة جاز وإلا فلا، وله أن يبطله ويعيده رهنًا“ (رد المحتار ۵/۳۲۷)۔

لہذا دریافت کردہ صورت میں اولاً تو خریدار (مرہن) سامان (مال مرہون) کو بیچنے کا مجاز نہیں ہے، اگر بیچ بھی دے تو فروخت کنندہ (راہن) کی اجازت پر اس کا تصرف موقوف رہے گا، اگر اجازت دیدے تو خریدار (مرہن) صرف اپنا دین اس سے وصول کرے، اگر کچھ روپیہ بیچ رہے تو اسے وہ فروخت کنندہ (راہن) کو واپس کر دے۔

یہ تمام تفصیلات تو اس وقت تھیں، جبکہ خریدار نے فروخت کنندہ سے کرایہ داری کا معاملہ نہ کیا ہو، اگر خریدار نے بیچ سے فائدہ اٹھانے کے لئے فروخت کنندہ سے کرایہ داری کا معاملہ کر لیا تھا، تو پھر اس بیچ کی حیثیت مال مرہون سے نکل کر مال مستاجر کی ہوگئی، اور مستاجر کو بھی مرہن کی طرح اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ مال مستاجر کو بیچ دے، چنانچہ ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”وكذلك لو استأجره المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض للإجارة“ (فتاویٰ

اگر بیچ ہی دے تو موجر کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر موجر اجازت دیدے تو مستاجر صرف اتنا روپیہ رکھ سکتا ہے جتنا اس نے بیچ و فاء والے عقد میں موجر، یعنی فروخت کنندہ کو دیا تھا، باقی واپس کرنا ضروری ہوگا۔

۳- زرضمانت کی وجہ سے مروجہ کرایہ میں کمی:

مالک مکان کرایہ دار سے ڈپازٹ اور ضمانت کے نام پر جو ایک بڑی رقم لیتا ہے وہ دراصل امکانی خطرات کے پس منظر میں لیتا ہے، کہ اگر کرایہ دار نے مکان میں غیر معمولی نقصان پہنچایا یا مکان خالی کراتے وقت نیت خراب کر لی، اور مکان کا قبضہ واپس دینا نہ چاہا تو سیکورٹی کے طور پر لی ہوئی رقم ایسے خطرات کی تلافی میں مؤثر رول ادا کرے۔ اس پس منظر میں لی ہوئی رقم ضمانت کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔ البتہ رقم ضمانت کی حیثیت کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ جب اس نے سیکورٹی کے طور پر لیا ہے تو اس کی حیثیت امانت و رہن کی ہوگی، اس لئے مالک مکان کو اس میں تصرف نہیں کرنا چاہئے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ مالک مکان اس میں آزادانہ تصرف کرتا ہے، اس لئے عملی طور پر اور انجام کے اعتبار سے اس میں امانت و رہن کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ نیز جب کرایہ دار مکان خالی کرنے لگتا ہے تو وہ زرضمانت کی واپسی کا ضرور ہی مطالبہ کرتا ہے، خواہ مالک مکان یہ کہے کہ میں نے اس رقم کو ہمیشہ امانت سمجھا، اور امانت کی طرح اس کی حفاظت کی، لیکن وہ رقم مثلاً آگ لگ جانے یا چوری ہو جانے وغیرہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی، پھر بھی کرایہ دار زرضمانت والی رقم سے دستبردار نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ زرضمانت کی حیثیت امانت و رہن کے بجائے قرض کی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب زرضمانت قرض کی طرح ہے، تو کرایہ میں غیر معمولی کمی۔ جو زرضمانت حاصل ہونے کی وجہ سے مالک مکان کرتا ہے۔ جائز ہوگی یا ناجائز؟ بہ ظاہر جواب یہ ہے کہ یہ جائز نہ ہو، کیونکہ یہ قرض سے فائدہ اٹھانے والی بات ہے۔ اور قرض سے فائدہ اٹھانا ناجائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کل قرض جر منفعة فهو ربا“ (اعلاء السنن ۱۳/۵۱۲، حدیث نمبر: ۴۸۵۸)۔ اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ مالک مکان زرضمانت ہی نہ لے، اور اس مکان کا مروجہ کرایہ وصول کرے، یا زرضمانت تو لے، لیکن اسے امانت سمجھے، اور اس میں تصرف نہ کرے، اور کرایہ دار سے بتلا دے کہ میں نے زرضمانت کو سیکورٹی کے طور پر لیا ہے، وہ میرے پاس امانت ہے، اس لئے مکان کے مروجہ کرایہ میں کمی نہیں ہوگی۔

لیکن صورت حال یہ ہے کہ زرضمانت کا معاملہ عام ہو چکا ہے، اور یہ عرف کا درجہ اختیار کر چکا ہے، اور زرضمانت کی وجہ سے مروجہ کرایہ میں کمی بھی رواج پذیر ہے، تو کیا موجودہ عرف کو دیکھتے ہوئے زرضمانت کی وجہ سے مروجہ کرایہ میں کمی جائز ہوگی؟

اس سلسلہ میں راقم کا خیال ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے ایک سو روپے کے سامان کو دس روپے میں بیچے تو اس کی اجازت ہوتی ہے، اسی طرح مالک مکان کو بھی اجازت ہے کہ ایک سو روپے ماہانہ کرایہ والے مکان کو دس روپے ماہانہ

کرایہ کے اعتبار سے دے۔ لہذا زرعمانت وصول کر کے بھی مالک مکان مروجہ کرایہ میں کمی کر سکتا ہے۔ البتہ اس مسئلہ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ زرعمانت کی حیثیت قرض کی ہو جانے کی وجہ سے مروجہ کرایہ میں کمی قرض سے فائدہ اٹھانا محسوس ہوتا ہے، اس لحاظ سے اس میں شبہ سود ہے، اور شبہ سود سے بھی بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ شریعت نے لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر مختلف قسم کے معاملات کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے معدوم کی بیع سے منع فرمایا، پھر لوگوں کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ”بیع سلم“ کی اجازت مرحمت فرمائی، اسی قبیل سے ”بیع استصناع“ کا جواز ہے۔ اسی طرح بیع مکمل ہونے کے بعد تقاضا عقد یہ ہے کہ یہ لازم و نافذ ہو جائے، اور کسی طرح کا خیار عاقدین کو نہ ہو، اس کے باوجود شریعت نے ”خیار شرط“ کی اجازت دی، لہذا صورت مسئولہ میں زرعمانت کا معاملہ کرتے ہوئے مکان و دکان کے مروجہ کرایہ میں کمی بھی ابتلاء عام اور ضرورت انسانی کے پیش نظر جائز ہوگی۔ البتہ اس میں قرض سے فائدہ اٹھانے کا جو شبہ ہوتا ہے، اس کی بنیاد پر اس میں کراہت ختم نہیں ہوگی۔ یعنی راقم کے نزدیک اس طرح کا معاملہ غیر مستحسن ہے۔ اور اس سے بچنا بہتر ہے، لیکن اگر کوئی اس طرح کا معاملہ کر رہی لے تو اسے ناجائز بھی نہیں کہا جائے گا۔

ہاں! اس کا خیال ضروری ہے کہ زرعمانت کی صورت میں مکان و دکان وغیرہ کا کرایہ جتنا کم ہونے کا رواج ہو اس میں بھی مزید کمی نہ ہو، مثلاً بغیر زرعمانت کے اس مکان کا کرایہ دس ہزار روپے ہے، اور زرعمانت کی صورت میں مروجہ کرایہ دو ہزار روپے ہے، اب اگر مکان کا مالک خطیر رقم زرعمانت کے طور پر ملنے کی وجہ سے اس کا کرایہ چار پانچ سو روپے رکھے۔ تو اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیونکہ ایسی صورت میں معاملہ کی نوعیت یوں بن جاتی ہے کہ گویا کرایہ دار نے مالک مکان کو قرض کے طور پر ایک خطیر رقم دی، اور اس کے بدلہ مالک مکان نے اپنا مکان قرض دینے والے کو فائدہ اٹھانے کے لئے دیا، اور اس فائدہ کو عدم جواز سے بچانے کے لئے کرایہ داری کا معاملہ کر لیا جو صرف حیلہ محض ہے۔

اس لئے راقم کے نزدیک زرعمانت رکھنا، اور اس کی بنیاد پر کرایہ میں مروجہ کمی جائز ہے، لیکن ایسا کرنا مستحسن نہیں ہے، اور اگر کرایہ میں اتنی کمی ہو کہ وہ برائے نام ہو تو ناجائز ہے۔

بیع الوفاء میں بیع کے اجارہ و فروخت کی شرعی حیثیت

مفتی محمد یوسف قاسمی جوڈھپوری ☆

سوال: ۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں، اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

بیع ایک ایسا عقد ہے جس کے انعقاد کے لئے جہاں ایجاب و قبول اس کا اہم رکن ہے، وہیں ہر طرح کے شروط فاسدہ سے خالی ہونا بھی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نے بیع کا معاملہ طے کرتے ہوئے کوئی ایسی شرط لگا دی جو عقد بیع کے منعقد ہونے سے مانع ہو (یعنی کوئی شرط فاسد لگا دی) تو پھر یہ بیع منعقد نہیں ہوگی، جیسا کہ تمام کتب فقہ میں وضاحت ہے: ”أما شرائط الابعاد فأنواع منها، الخلو عن الشرط الفاسد“ (فتاویٰ عالمگیری ۳/۳۱۳)، اسی طرح ”البحر الرائق“ میں ہے: ”ومنها: خلو عن شرط مفسد“ (۲۶۰/۵) اور ”بدائع“ میں ہے: ”ومنها: الخلو عن الشرط الفاسد“ (۳۷۵/۴)۔

اب سوال میں مذکور مر وجہ صورت پر غور کریں تو یہ بات واضح ہے کہ اس مر وجہ صورت میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ مشتری کو بیع پر کئی ملکیت حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ مشتری اس میں جیسے چاہے ویسے تصرف نہیں کر سکتا، چونکہ بوقت عقد یہ شرط بائع کی جانب سے لگائی جاتی ہے کہ جب وہ مشتری کی دی ہوئی رقم واپس دے گا اس وقت مشتری اس کو بیع واپس کر دے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ شرط شرط فاسدہ ہے، لہذا یہ مر وجہ شکل بطور بیع درست نہیں ہے، بلکہ فاسدہ ہے، البتہ اس کے رواج کے بہت زیادہ عام ہونے کی وجہ سے فقہاء نے اسے بیع و فاء کا نام دے کر جائز کہا ہے، البتہ یہاں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ تمام فقہاء و علماء نے اسے صورتاً اور شکلاً ہی بیع کہا ہے، حکماً تمام قائلین جواز نے اس کو رہن قرار دیا ہے، چنانچہ کتب فقہ میں اس کی وضاحت ہے کہ بیع الوفاء حقیقتاً رہن ہے، اور ظاہر ہے کہ جب اس کی حقیقت ہی رہن ہے تو پھر یہ حکماً بھی رہن ہے بیع نہیں ہے، لہذا اس پر وہ تمام احکام جاری ہوں گے جو عقد رہن میں جاری ہوتے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خریدنے والا بیع کا مالک نہیں ہوگا، اصل مالک بائع ہی رہے گا، اسی طرح زمین یا مکان وغیرہ فروخت ہونے کی صورت میں

حق شفعہ خریدار کو نہیں ملے گا، بلکہ بائع جو اصل مالک ہے اسی کو ملے گا، اور خریدنے والا جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہے جسے فقہ کی اصطلاح میں مرہن سے تعبیر کیا جاتا ہے اسے مال مرہون سے استفادہ کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا، جیسا کہ علامہ شامی نے وضاحت کی ہے:

”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بالوفاء فهو رهن في الحقيقة، لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكه وهو ضامن لما أكله من ثمره“ (شامی)۔

(بیع کی وہ شکل جس کا آج کل ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ اختیار کیا جاتا ہے اور اسے بیع وفاء کا نام دیا جاتا ہے درحقیقت رہن ہے جس کا خریدنے والا نہ مالک ہوتا ہے اور نہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، البتہ مالک کی اجازت سے ہو سکتا ہے اگر بلا اجازت استفادہ کر لیا تو وہ ضامن ہوگا) (کتاب الفتاویٰ ۲۸۰/۵)۔

چنانچہ ”فتاویٰ محمودیہ“ میں اسی طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ اگر بیع نامہ میں یا اس سے پہلے بطور شرط وعدہ واپسی کا ذکر آچکا ہے تو یہ بیع رہن کے حکم میں ہے کل جائیداد جس کی بیع ہوئی ہے رہن رہے گی اس سے انتفاع ناجائز ہے، نہ اس کی آمدنی لے سکتا ہے، نہ اس کی بیع کر سکتا ہے، نہ اجارہ نہ رہن نہ بہہ، بلکہ وہ اس جائیداد کا محض محافظ اور امین رہے گا اور اس کی جس قدر آمدنی ہوگی روپیہ وصول ہونے پر جائیداد کے ساتھ اس کی آمدنی کی بھی واپسی ضروری ہوگی (محمودیہ ۲۵۷/۱۶)۔

اس کے علاوہ کتب فقہ میں بھی اس کی وضاحت کچھ اسی طرح کی گئی ہے (دیکھئے: شامی، مطلب فی بیع الوفاء، ۵۴۵/۷، الدر مع الرد ۸۳/۱۰، وکذانی تنقیح الفتاویٰ الخمدیہ ۲۵۳/۱، وکذانی کفایۃ المفتی ۱۴۸/۸)۔

الغرض فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ بیع کی یہ مروجہ صورت اصلاً بیع نہیں ہے، اور جب یہ بیع ہی نہیں ہے تو اس پر بیع کے احکام بھی جاری نہیں ہوں گے، ہاں یہ حکماً رہن ہے، لہذا اس پر رہن کے سارے احکام جاری ہوں گے۔

سوال: بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

پہلے سوال کا جواب لکھتے ہوئے احقر نے عبارات فقہاء کی روشنی میں یہ وضاحت کی تھی کہ یہ مروجہ شکل اصلاً بیع نہیں ہے، اب اگر اس کو بیع قرار دیا جائے تو پھر چونکہ بیع میں یہ شرط لگانا کہ مشتری کو کسی دوسرے سے بیچنے کا حق نہیں ہوگا، شرط فاسد ہے، اور تقاضا عقد کے بالکل خلاف ہے، اس لئے بیع منعقد ہی نہیں ہوگی، بلکہ اس شرط کی وجہ سے باطل ہو جائے گی، جیسا کہ فقہاء کی عبارت سے واضح ہے:

”وفي حاشية الفصولين عن جواهر الفتاوى: هو أن يقول: بعت منك على أن يبيعه مني متي جئت بالثمن، فهذا البيع باطل وهو رهن، وحكمه حكم الرهن، وهو الصحيح“ (شامی ۵۴۵/۷)، لہذا بیع

قرار دینے کی صورت میں اس شرط کی وجہ سے بیع باطل ہو جائے گی، البتہ اس کو رہن مان کر درست کہا جائے گا، اور پھر اس پر وہی حکم جاری ہوگا جو رہن پر جاری ہوتا ہے، کہ نہ مشتری مالک ہوگا، اور نہ ہی اسے مال مرہون میں تصرف کا کوئی حق ہوگا، ”ذکر صاحب المنظومة في فتاوى أنه رهن في الحقيقة، لا يملكه المشتري ولا ينتفع، إلا بإذن البائع“ (بزاز علی العالمگیر یہ ۴۰۵/۳)۔

سوال: مالک اول کو بیچنے کی صورت میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا مطالبہ ہو سکتا ہے؟
مالک اول کو بیچنے کی صورت میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، مشتری جو درحقیقت مرہن ہے اس کے لئے زیادہ قیمت لینے کی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ وہ اگر کچھ بھی زیادہ لے گا تو گویا وہ دین پر زیادہ حاصل کرے گا، یعنی دین پر نفع حاصل کرے گا تو شرعاً ممنوع ہے، جامع صغیر میں ہے: ”کل قرض جر نفعها فهو ربا“ (۲۸۲/۲، شامی ۷/۳۹۵)، حضرات فقہاء نے ہر اس قرض کو ممنوع قرار دیا ہے جس پر نفع کی شرط ہو۔

”أما الذي يرجع إلى نفس القرض فهو أن لا يكون فيه جر منفعة“ (بدائع ۶/۵۱۸)، اور یہ کہ مال مرہون سے استفادہ ہی جب درست نہیں ہے تو پھر قیمت میں زیادتی کیسے درست ہوگی، ”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربا؛ لأنه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً، فيكون ربا“ (الدرمغ الرد ۱۰/۸۳، وکذا فی ملتقى الابجر، کتاب الرهن ۲۳۷/۳، وکذا فی الهدایہ ۵۲۲/۳)۔

عبارت مذکورہ سے واضح ہے کہ بائع کی اجازت کے بعد بھی مشتری کے لئے کچھ فائدہ حاصل کرنا درست نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ کون بائع ایسا ہوگا کہ خود اپنے لئے قیمت کے زیادتی کی اجازت دے گا، اولاً تو اجازت دینا ہی مشکل ہے، اور اگر اجازت دے بھی تو پھر عبارت مذکورہ کی روشنی میں سود کے ضمن میں داخل ہونے کی وجہ سے ممنوع ہی ہوگا، چونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مشتری (مرہن) نے جو ثمن بائع کو دی تھی وہ بطور رہن دی تھی اور اس قیمت میں تھوڑی زیادتی بھی ربا شمار ہوگی اور ظاہر ہے کہ ربا نصوص سے حرام ہے، اس لئے احقر کے نزدیک مشتری کے لئے تھوڑی زیادتی کا مطالبہ بھی درست نہیں ہوگا۔

سوال: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بیع الوفاء صرف صورتاً بیع ہے حقیقتاً یہ رہن ہے، اور ظاہر ہے کہ بیع میں تصرف اس وقت درست ہوگا، جبکہ بیع درست ہو اور یہ بیع تو بیع ماننے کی صورت میں درست ہی نہیں ہے، بلکہ ضرورت کی وجہ سے اسے رہن مان کر درست کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جب رہن ماننے کے بعد یہ عقد صحیح ہو تو اس پر حکم بھی رہن کا ہی نافذ ہوگا، اور چونکہ مال مرہون میں مرہن کے لئے کسی طرح کا تصرف درست نہیں ہے، اس لئے بیع الوفاء کی

صورت میں بھی بیع جب تک مشتری کے پاس ہے اسے اس سے فائدہ اٹھانا شرعاً جائز و درست نہیں ہے:

”ولیس للمرتھن الانتفاع بالرهن ولا إجارته ولا إعارته“ (ملتی الابجر، کتاب الرهن ۳/۲۷۳)۔

”أن البیع الذی تعارف علیہ أهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزاً عن الربا فی الحقیقة رهن، والمبیع فی ید المشتري کالرهن فی ید المرتهن، لا یملکه ولا یحل الانتفاع به“ (الخط البرہانی، کتاب البیع الفصل الخامس والعشرون فی البیاعات المکروهة والأرباح الفاسدة ۸/۲۶۰، وکذا فی الشامی ۷/۵۳۶، اور کچھ اسی طرح ہدایہ میں بھی ہے) کتاب الرهن ۳/۵۲۲)۔

اس کے علاوہ علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے جو وضاحت کی ہے اس سے تو صاف واضح ہے کہ کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: ”وقد اغتر کثیر من علماء عصرنا ومن سبقنا بظاہر عبارات الفقہاء أنه یجوز الانتفاع للمرتھن بالإذن من دون أن یفرقوا بین المشروط وغیره ومن دون أن یتأملوا فی أن المعروف کالمشروط فضلوا وأضلوا.....“ (الفک المثلون فی الانتفاع بالرهن ۱۳/۱۲، محمودیہ ۲۰/۱۲)۔ احقر کے نزدیک مذکورہ وضاحت کی روشنی میں خریدار کو کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا درست نہیں ہوگا۔

سوال: خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیچ کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت

ہوگی؟

خریدار جس کی حیثیت اصلاً مرتھن کی ہے اسے اولاً تو تصرف ہی کا حق نہیں ہے، نہ بیچ سکتا ہے نہ کرایہ پردے سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اور تصرفات کر سکتا ہے، کیونکہ اسے تو صرف اپنے پاس مال کو محبوس کرنے کا حق ہے تصرف کا نہیں، جیسا کہ کتب فقہ میں صراحت ہے:

”ولیس للمرتھن أن ینتفع بالرهن لا باستخدام ولا سکنی ولا لبس، إلا أن یأذن له المالك؛

لأن له حق الحبس دون الانتفاع“ (ہدایہ ۳/۵۲۲)۔

البتہ ایک قول اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر خریدار بائع کی اجازت سے بیچے تو اس کا بیچنا صحیح ہوگا، گو یا اس صورت میں مال کا اصل مالک بائع خود ہی فروخت کر رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر خریدار نے بغیر بائع کی اجازت کے بیچ دیا تو بائع کو یہ حق ہے کہ اگر وہ چاہے تو اجازت دے کر بیچ کو نافذ کر دے اور اگر چاہے تو بیچ کو باطل کر کے مال کو واپس رہن رکھ دے، (دیکھئے: الہدایہ مع الدرر ۳/۵۳۸)، البتہ احقر کے نزدیک بہر دو صورت خریدار کو بیچنے کا حق نہیں ہوگا، چونکہ ایسی صورت میں خریدار کو تصرف کا حق دینا ہوگا اور ظاہر ہے کہ مال مرہون میں تصرف کا حق دینا درست نہیں ہے، چونکہ یہ راہن کے اصل مقصد ہی کے خلاف ہے، چونکہ اگر راہن کو بیچنا ہی ہوتا تو پھر وہ بیع و فاء کیوں کرتا۔ اب رہی بات قیمت زیادہ لے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ مال مرہون کے ساتھ وہ بھی رہن ہو جائے گا اور مال مرہون کے ساتھ اس کی بھی

واپسی ضروری ہوگی، اگرچہ بیع مالک کی اجازت سے کیا ہو، چونکہ اگر وہ اس کی واپسی نہ کرے تو یہ اس کے لئے سود کے حکم میں ہوگا جس کی شرعاً گنجائش نہیں ہو سکتی، ”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربا...“ (شامی ۱۰/۸۳)۔

سوال: اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو؟

رہن قرار دیا جائے نہیں، بلکہ یہ اصلاً رہن ہی ہے، جیسا کہ پہلے سوالوں کے جوابات میں وضاحت کی گئی ہے، چنانچہ حضرات فقہاء نے بھی بالکل ایسی ہی توضیح کی ہے، ”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بالوفاء، فهو رهن في الحقيقة...“ (شامی ۷/۵۴۵)۔

سوال: جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت

ہوگی؟

مال مرہون پر مرہن کا قبضہ محض ایک امین اور محافظ کی حیثیت سے ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مرہن کے لئے کسی بھی طرح کا تصرف درست نہیں ہے، یہ بات اگرچہ اکثر فقہاء نے لکھی ہے کہ مالک مال، یعنی راہن کی اجازت سے مرہن مال مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور اس میں تصرف کر سکتا ہے، لیکن علامہ عبداللہ اسلم السمرقندی نے اس کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا ہے کہ: مرہن راہن کی اجازت کے بعد بھی مال مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لئے کہ مالک مال راہن نے مرہن کو ایسی چیز کی اجازت دی ہے جو اصلاً ربا ہے، اور ظاہر ہے کہ ربا کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، اب ایسی حرمت جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہو اسے محض بائع کی اجازت کی وجہ سے جائز نہیں کہا جاسکتا (دیکھئے: شامی ۱۰/۸۳)۔

علامہ سمرقندی کی اس وضاحت کے بالکل مطابق فتویٰ حضرت مفتی محمود حسنؒ نے بھی دیا ہے آپؒ نے اسی طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے: جب زمین کی بیع واپسی کے شرط پر کی جاتی ہے تو شرعاً یہ بیع نہیں ہے، بلکہ یہ رہن ہے اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، واپسی کی مدت تک جو آمدنی مشتری نے حاصل کی ہے وہ درست نہیں، بلکہ سود ہے (محمود یہ ۱۶/۲۶۵)، اور ٹھیک اسی طرح کا جواب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بھی اپنی کتاب، ”کتاب الفتاویٰ“ میں تحریر فرمایا ہے: کہ مروجہ بیع الوفاء اصلاً رہن ہے اس سے استفادہ درست نہیں ہے (کتاب الفتاویٰ ۵/۲۸۰)، اکابر علماء و فقہاء کا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے، ہاں صاحب ”درمختار“ نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ اگر انتفاع کی شرط بوقت عقد لگائی ہو تب تو انتفاع ناجائز ہے چونکہ سود ہے، ورنہ جائز ہے: ”وقیل: إن شرطه كان ربا والال“ (الدر المختار علی الرد ۱۰/۸۳)، لیکن علامہ شامیؒ نے ان کے اس قول کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا ہے کہ اس زمانے میں جو صورت مروجہ ہے اس میں یہ بات مشروط ہی ہوتی ہے کہ مشتری مال مرہون سے فائدہ اٹھائے گا، کیونکہ اگر یہ بات معروف نہ ہو تو پھر کون ایسا آدمی ہے جو اپنے دراہم

ودنا نیر کسی فائدہ کے بغیر خرچ کر دے یا کسی کو دیدے، اور ظاہر ہے کہ معروف مشروط کی طرح ہوتا ہے، لہذا محض یہ احتمالی بات ہے جس سے فرق نہیں پڑتا صحیح بات یہ ہے کہ یہ انتفاع سماج میں اتنا مروج اور معروف ہے جو مشروط سے بھی بڑھا ہوا ہے، اس لئے یہ ممنوع اور ناجائز ہی ہوگا، علامہ شامی لکھتے ہیں:

”والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولا له لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط، لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع“ (شامی ۱۰/۸۳)، لہذا اس قدر وضاحت کے بعد خریدار کے لئے واپسی کے وقت تک کسی طرح کا فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

سوال: اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

یہ طریقہ جو سوال میں مذکور ہے اس طریقہ پر معاملہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ کرایہ مروجہ کرایہ سے کم ہی کیوں نہ ہو، چونکہ کرایہ کی صورت میں مالک کو پورا اختیار ہے کہ وہ اپنی جائیداد جتنی رقم لے کر چاہے دے، اب جبکہ خریدار مروجہ کرایہ سے بہت کم کرایہ دے کر اس کی جائیداد حاصل کر رہا ہے اور وہ اسے دے رہا ہے تو گویا وہ اس پر راضی ہے اور ظاہر ہے کہ کرایہ کی صورت میں مالک کو کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے تو اب ایسی صورت کو خالص عقدا جا رہ کتے ہوئے درست کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

”ھی أی الإجارة بیع منفعة معلومة بعوض معلوم دین أو عین وما صلح ثمناً صلح أجرة“ (ملتنی الاجر، کتاب الاجارة ۵۱۱/۳، وکذا فی الدرعی الردی ۵۲۱/۶)، اور اگر غور کیا جائے تو یہ رہن سے بچنے کی ایک صورت ہے، یعنی خریدار حیلہ کر رہا ہے اور ایسا حیلہ جو حرام یا شبہ حرام سے بچنے کے لئے کیا جائے شرعاً اسے بہتر کہا گیا ہے، لہذا اگر خریدار اس نیت سے کر رہا ہے تب بھی اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔

”وکل حيلة یحتال بها الحل لیتخلص بها عن حرام أو لیتوصل بها إلى حلال فهی حسنة“ (فتاویٰ عالمگیری: کتاب الخیل ۳۹۰/۶)، احقر کے نزدیک یہ صورت جائز و درست ہے۔

سوال: اس عرصہ میں خریدار اس شیئی سے کس طرح کا فائدہ کاشت یا اجارہ داری وغیرہ کا حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ خریدار جو اصلاً مرتہن ہے اس کے لئے اس عرصہ میں شیئی مرہون سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا درست نہیں کاشت کاری اور اجارہ داری کے ذریعہ بھی خریدار فائدہ نہیں اٹھا سکتا، چونکہ کسی بھی طرح کا انتفاع مال مرہون سے یہ سود ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ علماء متاخرین میں سے اکثر نے شامی کی اس عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدم جواز ہی کا فتویٰ دیا، ”أنه لا یحل له أن ینتفع بشیئی منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنہ

اُذن له فی الربا“ (شامی ۱۰/۸۳)، اس سلسلہ میں مولانا عبدالحی کا رسالہ ”الفلک المشحون فی الانتفاع المرہون“ میں جو وضاحت کی گئی ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے، حضرت والا نے اپنی اس تحریر بے نظیر میں بہت اچھوتے انداز میں صراحت فرمائی ہے کہ ہمارے سابق فقہاء اور علماء عصر کو اس عبارت سے کہ مرہن کو راہن کی اجازت سے مال مرہون سے فائدہ اٹھانا درست ہے، بڑا دھوکہ ہوا ہے، چونکہ صحیح بات یہ ہے کہ مرہن کے لئے انتفاع بمال المرہون کسی بھی حال میں درست نہیں ہے، اس لئے کہ جواز کی جو صورت علماء نے نکالی ہے کہ وقت عقد شرط نہ لگائی ہو یا پھر معروف نہ ہو ایسا نہ ہونا بہت مشکل ہے اور جب ایسا نہیں تو پھر جائز کیسے ہوگا، تفصیل کے لئے دیکھئے: (۱۲/۳)، وکذانی الفتاویٰ الکاملیہ: کتاب الرہن: ۲۳۳، وکذانی شرح الجملہ لخالد الاتاسی ۱۹۶۳، وکذانی فتاویٰ رشیدیہ: ۵۲۲، وکذانی احسن الفتاویٰ ۸/۴۹۵، وکذانی کتاب الفتاویٰ ۵/۲۸۰، وکذانی فتاویٰ محمودیہ ۲۰/۱۲، وکذانی تفسیر مظہری ۲/۱۰۳، وکذانی معارف القرآن ۱/۶۲۔

سوال: خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟
 خریدار کو مال مرہون کے بیچنے کا کوئی حق نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر اس نے بغیر بائع کی اجازت کے بیچا یا تو بائع کو پورا اختیار ہے کہ اگر چاہے تو اس کے کئے ہوئے عقد کو رد کر دے، جیسا کہ حضرات فقہاء نے صراحت فرمائی ہے:
 ”وله أن يبطله ويعيده رهناً“ (ہدایہ میح الدرایہ ۳/۵۳۸)، اس کے علاوہ ایک خاص نقطہ پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ راہن مال کو رہن رکھتا ہے، اس لئے ہے، تاکہ وہ تصرفات سے محفوظ بھی رہے اور اس کی ملکیت بھی باقی رہے، اور ظاہر ہے کہ جب خریدار کو بیچنے کی اجازت دیدی جائے گی تو پھر عقد رہن کا جو اصل مقصد ہے وہی فوت ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

سوال: زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت و رہن کی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا کہا جائے گا؟

رقم ضمانت جس کا دوسرا نام پگڑی ہے اسے دو صورتوں میں جائز کہا جاسکتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ اسے قرض کہا جائے دوسرے یہ کہ اس کو رہن کی حیثیت دیدی جائے، قرض کی صورت بظاہر غلط ہے، لیکن احکام کے لحاظ سے اس پر قرض کے احکام جاری ہو سکتے ہیں، کیونکہ قرض کی تعریف اس پر صادق آتی ہے، ”القرض عقد مخصوص ای بلفظ القرض ونحوہ یرد علی مال مثلی“ (شامی فصل فی القرض ۷/۳۸۸)، یہاں پر معاملہ اگرچہ اصلاً قرض کا نہیں ہوا، بلکہ قرض کا تذکرہ تک نہیں ہوا، لیکن حقیقت کے لحاظ سے اسے قرض ہی شمار کیا جائے گا، کیونکہ واپسی کی شرط کے ساتھ مالک مکان کو اس رقم سے نفع اٹھانے کا پورا اختیار اور کرایہ دار کی طرف سے قلبی اجازت ہوتی ہے اور قرض میں بھی یہی بات ہوتی ہے اور محض قرض کا تذکرہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے قرض کے حکم سے خارج بھی نہیں کر سکتے۔

کتب فقہ میں اس کے نظائر موجود ہیں کہ اصل معاملہ کچھ بھی ہو اور کسی بھی لفظ کے ساتھ ہو قرض کا ذکر بھی نہ آیا ہو، لیکن مذکورہ بالا صورت (صاحب مال کی طرف سے دوسرے شخص کو منتفع ہونے کی قلبی اجازت اور واپسی کی شرط) کے پائے جانے کی صورت میں حقیقت و احکام کے لحاظ سے اس کو قرض ہی کہا جاتا ہے، مثلاً مضاربہ میں اگر یہ شرط قرار پا جائے کہ سارا نفع مضارب کو ملے گا رب المال کو کچھ نہ ملے گا تو معاملہ مضاربہ کا ہوا ہے قرض کا تذکرہ تک نہیں ہوا ہے، لیکن حقیقت کے لحاظ سے اس کو قرض ہی کہا جائے گا اور اس پر قرض کے احکام ہی جاری ہوں گے (شامی کتاب المضاربہ ۸/۴۳۲)، اسی طرح نقود و ثمن کے ساتھ اگر عاریت کا معاملہ ہو تو اگرچہ معاملہ عاریت کا ہے قرض کا ذکر تک نہیں، لیکن فقہاء کرام اس کو قرض ہی فرماتے ہیں:

”وعاریة الثمنین قرض“۔

دوسری صورت جو جواز کی نکل سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس رقم کو رہن کا درجہ دیا جائے اور اس میں تمام رہن کے احکام جاری کئے جائیں کیونکہ رہن کی تعریف اس پر بھی صادق آتی ہے، رہن کی تعریف ہے: ”حبس شیئی بحق یمکن استیفاءؤہ اى استیفاء الحق من ذلك الشیء“ (مجمع الانہر ۴/۵۸۴)، ورنہ لغوی حیثیت سے تو پگڑی پر رہن کی تعریف صادق آہی جاتی ہے، اور لغوی معنی مراد لینے میں کوئی استبعاد بھی نہیں۔

اور رہن جس طرح اشیاء کا ہوتا ہے اسی طرح اموال نقدیہ کا بھی ہوتا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

”وصح رهن الحجرین والمکیل والموزون، المراد بالحجرین الذهب والفضة، وانما جاز

رهن هذه الأشياء لِمکان الاستیفاء منها، فكانت محلاً للرهن“ (البحر الرائق ۸/۲۸۲)۔

اب رہی یہ بات کہ امانات وہ شے جس کو اجرت میں لیا گیا ہو، خواہ مکان و دکان ہو یا کوئی اور سامان (گاڑی

وغیرہ) ہو اس کے عوض رہن رکھنا درست نہیں اصل مذہب یہی ہے، کتب فقہ میں اس کی وضاحت ہے:

”ولا یصح الرهن بالأمانات کالودائع والعواری“ (بدایہ ۴/۵۲۶)، ”وکذا لو رهن المستاجر

بالعین الذی استاجره کان باطلاً“ (فتاویٰ قاضی خان علی العالمگیری ۳/۵۹۶)۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں اس رقم ضمانت کو قرض بھی کہہ سکتے ہیں اور رہن بھی البتہ قرض کہنا زیادہ بہتر ہے،

چونکہ قرض کی صورت میں انتفاع بلا خطر درست ہوگا جبکہ رہن کہنے کی صورت میں مالک کی اجازت کے بعد بھی صحیح قول کے

مطابق انتفاع درست نہیں ہوتا ہے۔ ہاں اگر کرایہ میں کمی اسی رقم کی بنیاد پر کرایہ دار کروا تا ہے تو پھر اسے ”کحل قرض جو

نفعاً فهو حرام“ (شامی ۷/۳۹۵) کے..... ممنوع ہونا چاہئے، لیکن اگر کرایہ دار کی طرف سے کوئی بات نہ ہو مالک مکان

خود ہی تبرعاً کم کر دے تو پھر اس کو جائز کہنا چاہئے، (ہکذانی فقہ الاسلامی سمینار ۱۲۹/۱۳۳-۱۳۳)۔

اور یہ رقم ضمانت کو پیشگی کرایہ مان کر جائز کہنا ہی چاہئے چونکہ اب اس کا رواج بہت زیادہ ہو چکا ہے اور ظاہر ہے کہ جہاں صحیح قول عرف عام کو حجت مان کر اس پر فتویٰ دینے کا ہے وہیں بعض علماء نے عرف خاص کو بھی حجت مانا ہے اور اس پر بھی فتویٰ دیا ہے، چنانچہ بالکل اسی رقم ضمانت کی طرح جو آج کل مالک دکان و مکان لیتے ہیں خلوا الحوانیت کو آج سے بہت پہلے بعض علماء نے جائز قرار دیا تھا، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری جن کی وفات ۹۷۰ھ میں ہوئی، اپنی مشہور کتاب ”الاشباہ والنظائر“ میں عرف عام اور عرف خاص کی بحث کے ذیل میں لکھا ہے کہ بہت سے مشائخ نے عرف خاص کو بھی حجت تسلیم کیا ہے اور اس بنیاد پر میری رائے میں قاہرہ کے بازاروں میں رائج خلوا الحوانیت کو (دکانوں کی پگڑی) کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا جانا چاہئے اور خلو کرایہ دار کا ایک ہونا چاہئے، دکان کے مالک کو اسے نکالنے کا حق نہیں ہونا چاہئے، اور نہ دوسرے کو کرایہ پر لگانے کا اگرچہ وہ جائیداد وقف ہو۔

”ولکن أفتی كثير من المشائخ باعتباره، فأقول على اعتباره ينبغي أن يفتى بأن ما يقع في بعض أسواق القاهرة من خلوا الحوانيت لازم ويصير الخلو في الحانوت حقاً له، فلا يملك صاحب الحانوت إخراجه منها ولا إجارته لغيره“ (الاشباہ: ۱۰۳)۔

پس فقہ و فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کم از کم دسویں ہجری سے رقم ضمانت (پگڑی) کا رواج مختلف علاقوں میں پایا جاتا رہا ہے اور کچھ تین چار صدیوں میں یہ رواج بڑھتے بڑھتے اکثر ممالک کے بڑے شہروں میں اس طرح پھیل گیا ہے کہ اب تمام بڑے شہروں میں بغیر اس رقم کے ادا کئے ہوئے کسی مکان یا دکان کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس قدر رواج ہونا تقریباً عرف عام کی طرح ہو گیا ہے، لہذا اس کو اگر پیشگی کرایہ ماننے ہوئے جائز کہا جائے تو شاید احوال زمانہ کی زیادہ رعایت ہو اور لوگوں کی ضرورت بھی پوری ہو سکے۔ ویسے فقہاء نے بھی پیشگی کرایہ کی شرط کو درست کہا ہے، ”ولو آجر بشرط تعجيل الأجرة.... جاز“ (بدائع: ۱۹۵۴، ہکذانی فقہ الاسلامی سمینار ۱۲۸/۳۸-۸۵)۔

بیع و فاء - شرعی حیثیت اور حکم

مولانا محمد عمران ندوی ☆

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شکلاً بیع ہے حقیقتاً بیع نہیں ہے، اور یہ بیع، بیع کے مقابلہ میں رہن سے قریب تر ہے، قدیم فقہ کی کتابوں مثلاً ہدایہ، بدائع الصنائع، قدوری، شرح وقایہ وغیرہ میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا، یہ بعد کے زمانے کی پیداوار ہے۔

جب لوگوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی، آپسی بھائی چارگی اور باہمی تعاون کا جذبہ کم ہوتا گیا، غیر سودی قرض کا ملنا دشوار ہی نہیں بلکہ مشکل ہو گیا تو ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے ”بیع و فاء“ کی شکل وجود میں لائی گئی، جیسے کہ ”فتاویٰ عالمگیری“ میں اس کی صراحت موجود ہے:

”البيع الذی تعارف أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بیع الوفاء، هو فی الحقیقة رهن، و هذا المبیع فی ید المشتري کالرهن فی ید المرتهن لا یملکه ولا یطلق له الانتفاع، إلا بإذن مالکة“ (الفتاویٰ العالمگیریہ ۲۰۸/۳)۔

(ہمارے زمانے میں لوگ سود سے بچنے کے لئے حیلہ کے طور پر جس بیع سے متعارف ہیں، اور جس کا نام انہوں نے ”بیع الوفاء“ رکھا ہے اصل میں وہ رہن ہے اور یہ بیع مشتری کے ہاتھ میں وہی حکم رکھتا ہے جو حکم رہن کا مرتہن کے پاس ہوتا ہے، نہ تو وہ اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر مطلق انتفاع جائز ہے۔ اسی طرح کی وضاحت علامہ ابن عابدین شامی نے بھی کی ہے:

”البيع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه ”بالوفاء“، فهو رهن فی الحقیقة، لا یملکه ولا ینتفع به إلا بإذن مالکة، وهو ضامن لما أکل من ثمره“ (رد المحتار ۳/۳۶۶، بحوالہ کتاب الفتاویٰ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)۔

(ہمارے زمانہ میں لوگ سود سے بچنے کے لئے حیلہ کے طور پر جس بیع سے متعارف ہیں اور جس کا نام انہوں نے

”بیع الوفاء“ رکھا ہے اصل میں وہ رہن ہے، نہ تو وہ شخص اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر انتفاع جائز ہے، اس کے منافع میں سے جو کھائے گا وہ اس کا ضامن ہوگا۔

الف- بیع قرار دینے کے بعد یہ شرط کہ یہ چیز کسی اور سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، اس کا حکم کئے گئے وعدہ کا ہوگا جس کا پورا کرنا از روئے اخلاق ضروری ہوگا، بیع کے اندر اس وعدہ کا کوئی دخل نہیں ہوگا، جیسے کہ ”فتاویٰ عالمگیری“ میں علامہ سید ابوشجاع سمرقندی اور قاضی علی سعیدی کے حوالہ سے یہ قول منقول ہے:

”وعنهما هذا البيع عبارة عن بيع غير لازم، فكذلك، وان ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع، ويلزم الوفاء بالوعد“ (الفتاویٰ العالمیہ ۲۰۸/۳)

(اور ان دونوں حضرات کے نزدیک یہ بیع غیر لازم ہے، اور اسی طرح کسی شرط کے بغیر صرف بیع کا ذکر کیا گیا، اس کے بعد شرط ذکر کی گئی عہد و پیمان کے طور پر تو بیع جائز ہوگی اور وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا)۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت لازم نہیں ہوگی، اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ بیع کے اندر دونوں فریق کے مفاد کا لحاظ ضروری ہے۔ بیع وفا تو ضرورت مند آدمی کو غیر سودی قرض فراہم کرنے ہی کے لئے وضع کیا گیا ہے، اس کے اندر مشتری کا فائدہ نہیں کے برابر ہے، اور اگر سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم کر دی جائے تو اس افراط زر کے زمانہ میں ایک سال کے اندر زمینوں کی قیمت دوگنی ہو جا رہی ہے، لہذا سابق قیمت لازم کرنے میں مشتری کا نقصان ہی نقصان ہے، اس لئے کہ بائع اگر کوئی زمین بیع وفا کے طور پر ایک لاکھ میں فروخت کرتا ہے اور مشتری سے وہ پیسے وصول کر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، پانچ سال کے بعد اس زمین کی قیمت پانچ لاکھ روپے ہو جاتی ہے تو بائع تو ایک لاکھ دے کر پانچ لاکھ کی زمین واپس لے لے گا اور بے چارہ مشتری ایک لاکھ لے کر کف افسوس ملتا رہ جائے گا کہ کاش میں نے ایک لاکھ روپے میں کوئی زمین رجسٹری کرائی ہوتی تو آج حلال طریقہ سے میرے پاس پانچ لاکھ روپے موجود ہوتے۔ احقر کی رائے یہ ہے کہ بیع وفا کے اندر زمین، مکان وغیرہ کی قیمت ثمن خلقی سونے سے طے کر دی جائے تو بہتر ہوگا اور سابقہ اور لاحقہ قیمت کا جھگڑا بھی پیدا نہیں ہوگا۔ اور اس میں صرف ایک فریق کا فائدہ ہو رہا ہے اور دوسرے کو حد سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح قرض حسنہ دینے والے لوگ نہیں رہے، بیع وفا کرنے والے بھی نایاب نہیں تو کمیا ب ضرور ہو جائیں گے۔ اگر کوئی چیز ضرورت بن جائے اور اس میں ابتلاء عام ہو اور وہ شکل لوگوں میں متعارف بھی ہو، اور اس میں کوئی بڑی قباحت بھی نہ ہو تو اس کی گنجائش کے بارے میں غور کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ صاحب ہدایہ رقمطراز ہیں:

”وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل

الاستحقاق يفسده كشرط أن لا يبيع المشتري العبد المبيع، لأن فيه زيادة عارية عن العوض، فيؤدى إلى الربا، أو لأنه يقع بسببه المنازعة فيعربى العقد عن مقصود، إلا أن يكون متعارفاً، لأن العرف قاض على القياس، ولو كان لا يقضيه العقد ولا منفعة فيه لأحد لا يفسده وهو من الظاهر من المذهب كشرط أن لا يبيع المشتري الدبة المبيعة، لأنه انعدمت المطالبة، فلا يؤدى إلى الربا ولا المنازعة“ (ہدایہ ۴۳/۳)۔

(وہ تمام شرائط جن کا عقد متقاضی نہ ہو، اور اس کے اندر متعاقبین میں سے کسی کا کچھ فائدہ ہو اور وہ اہل استحقاق میں سے ہو تو بیع فاسد ہوگی مثلاً یہ شرط لگا دی کہ مشتری وہ خریدار ہو غلام دوسرے کو فروخت نہیں کرے گا، اس لئے کہ صلب عقد میں ایسی زیادتی کی شرط لگی ہوتی ہے جو عوض سے خالی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس کی وجہ سے تنازع پیدا ہوگا، الا یہ کہ وہ شکل متعارف ہو، اس لئے کہ عرف غالب ہوتا ہے قیاس پر۔

اور اگر عقد ان شرائط کا متقاضی نہ ہو اور نہ ہی ان شرائط میں متعاقبین میں سے کسی کا کوئی فائدہ ہو تو بیع فاسد نہیں ہوگی، جیسے بائع نے شرط لگا دی کہ مشتری خریدار ہو جانور دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے تو بیع جائز ہوگی، اس لئے کہ مطالبہ معدوم ہو گیا، لہذا ربا تک بات نہیں پہنچے گی، اور نہ ہی منازعہ پیدا ہوگا۔

ج۔ خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا وہی حکم ہے جو رہن اور ودیعت میں مرہن اور مودع کو ہے، یعنی وہ بیع جو مشتری کے ہاتھ میں ہے اس کی حیثیت امانت کی ہے، بائع کی اجازت سے استعمال کرنا درست ہوگا اور اگر دوران استعمال وہ چیز ہلاک ہو جاتی ہے تو مشتری اس کا ضامن نہیں ہوگا، اور اگر اجازت کے بغیر استعمال کرتا ہے تو ہلاکت کی صورت میں ضامن ہوگا، جیسے کہ ”فتاویٰ تاتارخانیہ“ میں مذکور ہے:

”اعلم بأن عين الرهن أمانة فى يد المرتهن بمنزلة الوديعة“ (الفتاویٰ التاتارخانیہ ۱۸/۵۶۳)۔

(جان لینا چاہئے کہ عین رہن مرہن کے پاس امانت ہوتی ہے ودیعت کی طرح)۔

اسی طرح علامہ شامی کی تشریح ہے، وہ فرماتے ہیں:

”ولو أذن الراهن للمرتهن فى استعماله أو إعارته للعمل، فهلك الرهن فى حالة العمل

والاستعمال هلك أمانة لثبوت يد العارية حينئذ“ (رد المحتار ۱۰/۱۳۱)۔

(اگر رہن رکھنے والا مرہن کو اس کے استعمال کرنے یا عاریت پر دینے کی اجازت دے اور وہ چیز حالت استعمال

میں ہلاک ہو جاتی ہے تو بطور امانت ہلاک ہوگی، کیونکہ اس وقت عاریت والا قبضہ ہے)۔

ایسے ہی صاحب ”بحر الرائق“ فرماتے ہیں:

”ولیس للمرتھن أن ینتفع بالمرھون، إلا بإذن الراهن، فإذا أذن له جاز أن یفعل ما أذن له فیہ، ولو فعل من غیر إذن صار ضامناً بحکم الرهن“ (البحر الرائق ۲۳۸/۹)۔

(مرتبہ کے لئے جائز نہیں کہ راہن کی اجازت کے بغیر مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھائے، جب وہ اجازت دے دے تو جس چیز کی اجازت دی ہے اس کو استعمال کرنا جائز ہوگا، اور اگر اجازت کے بغیر استعمال کر لیا تو وہ ضامن ہوگا راہن کے حکم کے مطابق)۔

د- خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے اس بیچ کا حکم یہ ہے کہ وہ بیچ اول کی اجازت پر موقوف رہے گی، اگر وہ اجازت دے تو بیچ نافذ ہوگی، ورنہ بائع اول مشتری ثانی سے مخاصمت کر کے اپنی چیز واپس لے سکتا ہے۔ جیسے کہ ”فتاویٰ عالمگیری“ میں مذکور ہے:

”باع کرہ من آخر بیع الوفاء وتقابضاً ثم باعه مشتری من آخر بیعاً باتاً، فللبائع أن یخاصم مشتری الثانی ویسترد منه الکرہ“ (الفتاویٰ العالمگیریہ ۲۰۸/۳)۔

(اور شخص نے اپنا باغ دوسرے کے ہاتھ بیچ دیا بیع وفاء کے ذریعہ اور دونوں نے قبضہ بھی کر لیا، پھر مشتری نے وہی باغ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا تو بائع اول کو حق ہوگا کہ مشتری ثانی سے مخاصمت کے ذریعہ اپنا باغ واپس لے لے)۔

۲- اگر اس کو راہن قرار دے دیا جائے تو:

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی حیثیت راہن سے مرتبہ کے فائدہ اٹھانے کی طرح ہوگی۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو از روئے شریعت یہ شکل جائز ہے، جیسے کہ امام قرطبی ”إلا أن تكون تجارة“ (سورہ نساء: ۲۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”والجمهور علی جواز الغبن فی التجارة، مثل أن یبوع رجل یاقوتة بدرهم وهی تساوی مائة، فذلک جائز، وأن المالك الصحیح المملک جائز له أن یبوع مالہ الكثير بالنافۃ الیسیر، وهذا مالا اختلاف فیہ بین العلماء، إذ عرف قدر ذلک“ (تفسیر القرطبی ۱۰۰/۵)۔

(اور جمہور علماء تجارت میں قیمت کے کمی اور زیادتی کے قائل ہیں؛ مثلاً ایک آدمی اپنا یاقوت جو سودرہم کی قیمت کا ہو ایک درہم میں فروخت کر دے تو یہ جائز ہے، اور صحیح ملکیت کے مالک کے لئے جائز ہے کہ اپنا کثیر مال کوڑی کے دام فروخت کر دے، اگر مقدار معلوم ہو تو اس میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور جیسے کہ آپ ﷺ کا پاک ارشاد ہے:

”عن جابر بن عبد اللہ أن النبی ﷺ قال: ”لا یبوع حاضر لباد، دعوا الناس یرزق اللہ بعضهم

من بعض“ (سنن ابن ماجہ ۱۵۷/۱)۔

(حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”شہر میں رہنے والا دیہات سے آنے والے کا سامان فروخت نہ کرے، لوگوں کو اپنے حساب سے خرید و فروخت کرنے دو، اللہ تعالیٰ ایک کے ذریعہ دوسرے کو رزق دیتا ہے۔“)

ابن ماجہ ہی کی ایک دوسری حدیث ہے، جس میں قیمت متعین کرنے کی نفی ہوتی ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا پاک ارشاد ہے:

”عن أنس بن مالك قال: غلا السعر في عهد رسول الله ﷺ، فقالوا: يا رسول الله! قد غلا السعر، فسعر لنا، فقال: ”إن الله هو المسعر القابض الباسط الرازق“ (سنن ابن ماجہ ۱۵۹/۱)۔

(حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں مہنگائی بڑھ گئی، صحابہ کرام نے عرض کیا، یا رسول اللہ مہنگائی بڑھ گئی ہے، ہمارے واسطے قیمت طے فرمادیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”قیمت طے کرنے والا تو اللہ ہے وہی سمیٹنے والا وہی پھیلانے والا اور وہی رزق دینے والا ہے۔“)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”ولو أبرأه عن الأجر أو وهبه منه، فإن كان ديناً وشرط التعجيل صح بالإجماع، ولا عقد بحاله، ولو أبرأه عن الكل إلا درهماً صح بالإجماع، لأنه بمنزلة الحط“ (الفتاویٰ العالمگیریہ ۴/۳۱۷)۔

(اگر کرایہ معاف کر دے یا اس میں سے کچھ ہبہ کر دے، جبکہ وہ دین تھا اور تعجيل کی شرط بھی تھی تو بالاجماع درست ہے اور عقدا اپنے حال پر رہے گا۔ اور اگر پورا کرایہ ہی چھوڑ دے صرف ایک درہم لے تب بھی جائز ہے، اس لئے کہ یہ کرایہ کم کرنے کے مرادف ہے)۔

ان نصوص کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو بھی جائز ہوگا، اس لئے کہ جب اسلامی شریعت میں اپنی چیز بالکل مفت دینا صرف درست ہی نہیں بلکہ اجر و ثواب کی چیز ہے تو کرایہ یا قیمت کم کرنا بدرجہ اولیٰ درست ہوگا، اب صرف ایک شبہ ہی بچ جاتا ہے وہ یہ کہ فقہاء کا اصول ہے: ”كل قرض جو نفعاً فہو ربا“، اس میں بھی قرض کی وجہ سے کرایہ میں کمی بظاہر معلوم ہوتی ہے، اس میں صاحب ہدایہ کا یہ جزئیہ مسئلہ کی وضاحت کرتا ہے۔

”كشروط أن لا يبيع المشتري العبد المبيع، لأن فيه زيادة عارية عن العوض، فيؤدى إلى الربا، أو لأنه يقع بسببه المنازعة، فيعربى العقد عن مقصود، إلا أن يكون متعارفاً، لأن العرف قاض على القياس“ (ہدایہ ۳/۲۳)۔

(وہ تمام شرائط جن کا عقد متقاضی نہ ہو، اور اس کے اندر متعاقدین میں سے کسی کا کچھ فائدہ ہو اور وہ اہل استحقاق میں سے ہو تو بیع فاسد ہوگی مثلاً یہ شرط لگا دی کہ مشتری وہ خریدار ہو غلام دوسرے کو فروخت نہیں کرے گا، اس لئے صلب عقد میں ایسی زیادتی کی شرط لگی ہوتی ہے جو عوض سے خالی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس کی وجہ سے تنازع پیدا ہوگا، الا یہ کہ وہ شکل متعارف ہو، اس لئے کہ عرف غالب ہوتا ہے قیاس پر)۔

لہذا بیع و فاس دور میں معاشرے کی ایک ضرورت بن گئی ہے، لوگ اچانک پیسوں کی ضرورت پڑنے پر اسی بیع و فاء کا سہارا لیتے ہیں، مثلاً علاج معالجہ، تعلیم کی فیس، شادی بیاہ، اور ناگہانی پریشانیوں میں اسی ذریعہ سے روپے حاصل کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ فی سبیل اللہ قرض دینے والے نہیں کے برابر ہیں، بینکوں سے قرض بڑے ہی لوگ نکال پاتے ہیں، عام طبقہ کے لوگوں کی پہنچ وہاں تک نہیں ہو پاتی، اور پھر اس کی کارروائی اتنی لمبی ہوتی ہے کہ قرض پاس ہوتے ہوتے اور روپے ہاتھ میں آتے آتے مریض دوا کے بغیر چل بسے گا، تعلیم کی فیس کی تاریخ نکل جائے گی، اور شادی میں کفو کے رشتہ ہاتھ سے نکل جائیں گے، اور اگر مہاجن کا سود لیتے ہیں تو اس کی شرح سود بہت زیادہ ہوتی ہے جو انسانوں کی ضرورت پوری کرنے کے بجائے جبین و سکون چھین کر رات کی نیند بھی اڑا دیتی ہے اور مزید مقروض کرتی چلی جاتی ہے، اور پھر مہاجن لوگ اتنا نارچر کرتے ہیں کہ لوگوں کا معاشرے میں عزت و آبرو سے جینا مشکل ہو جاتا ہے اور تنگ آ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ لہذا معاشرے کی اس ضرورت کو پوری کرنے کے لئے فقہاء کے بیان کردہ اصول ”الضرورات تبيح المحظورات“ پر عمل کرتے ہوئے گنجائش نکالی جائے گی، تا آن کہ اسلامی بینکنگ (Islamic Banking) کا نظام آجائے۔

ج۔ اس عرصہ میں خریدار اس شے سے اسی طرح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے جس طرح کا فائدہ مرتہن راہن کی اجازت سے شے مرہون سے اٹھا سکتا ہے، اس لئے کہ راہن کی اجازت کے بغیر شے مرہون کے استعمال کی اجازت فقہاء نہیں دیتے، اور اگر وہ اجازت کے بغیر استعمال کرتا ہے اور وہ چیز ہلاک ہوتی ہے تو مرتہن ضامن ہوگا اور اگر اجازت کے بعد استعمال کرتا ہے تو ہلاک ہونے کے باوجود وہ ضامن نہیں ہوگا، جیسا کہ صاحب ”المحرر الرائق“ نے تشریح کی ہے۔

”ولا ينتفع المرتهن بالرهن استخداماً وسكنى ولبساً واجارة واعارة؛ لأن المرتهن يقتضى الحبس إلى أن يستوفى دينه دون الانتفاع، فلا يجوز الانتفاع إلا بتسليط منه، وإن فعل كان متعدياً ولا يبطل الرهن بالتعدي“ (المحرر الرائق ۴۳۸/۹)۔

(مرتہن شے مرہون سے اس کو استعمال کر کے، یا (مکان کی صورت میں) سکونت اختیار کر کے، یا (کپڑے کی صورت میں) پہن کر، یا کرایہ پردے کر، یا عاریت پردے کر فائدہ نہیں اٹھائے گا، اس لئے کہ رہن کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت اپنے پاس روک کر رکھا جائے، جب تک قرض وصول نہ ہو جائے، نہ یہ کہ اس سے انتفاع کیا جائے، الا یہ کہ راہن

استعمال کرنے کی اجازت دے اور قادر بنائے، لیکن اگر مرتہن اجازت کے بغیر مذکورہ منافع حاصل کرتا ہے تو وہ تعدی کرنے والا شمار ہوگا، لیکن تعدی سے رہن باطل نہیں ہوگا۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق تو نہیں رکھتا، لیکن اگر بیچ دے تو راہن کی اجازت پر موقوف ہوگا، جیسے کہ علامہ شامیؒ وضاحت فرماتے ہیں:

”ولو باع من غیر اذنه وقف علی اجازتہ، فإن اجازہ جاز، وکان الثمن رہناً، وکذا إذا باع بإذنه جاز، وکان ثمنه رہناً“ (ردالمحتار ۱۰/۱۳۱)۔

(اگر مرتہن نے راہن کی اجازت کے بغیر شیخ مرہون فروخت کر دی تو راہن کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر اجازت دے دی تو درست اور قیمت رہن رہے گی، اور اگر اجازت سے بیچا ہے تو جائز ہوگا اور رہن کی قیمت اب رہن رہے گی)۔

اگر بیچنے تو اپنے دین کی رقم وصول کر سکتا ہے باقی روپے راہن کی امانت ہوگی مرتہن کے ہاتھ میں۔

۳- زر ضمانت کی حیثیت امانت و رہن کی ہوگی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی کی جائز ہوگی، اس میں تھوڑا شبہ ہوتا ہے، لیکن ضرورت کو دیکھتے ہوئے تھوڑا نرم پہلو اختیار کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ شہری آبادی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، اور جگہ محدود ہے، لہذا کم جگہ میں مضبوط اور کئی منزلہ مکانات بنانا ناگزیر ہے، اور اتنا مضبوط مکان بنانا ایک کے بس کا نہیں ہوتا، لہذا اس ضرورت کی تکمیل کی ایک شرط یہ اپنائی جاتی ہے کہ مالک زمین اپنی اور اپنے شرکاء کی مشترکہ پونجی سے وہ مکان تیار کرتا ہے جو نہ صرف اس کے رہائش کے لئے کافی ہوتی ہے، بلکہ سینکڑوں لوگوں کے رہائش کا نظم اس تھوڑی سی زمین میں ہو جاتا ہے، لہذا پونجی فراہم کرنے والوں کے ساتھ کرایہ میں تخفیف کر دی جاتی ہے، یا مالک زمین قرض وغیرہ سے کثیر رقم فراہم کر کے کئی منزلہ عمارت تعمیر کرتا ہے اور پھر کرایہ داروں سے پگڑی، زر ضمانت کے نام پر ایک اچھی رقم لے کر اپنے قرض کی ادائیگی کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا احقر کی رائے یہ ہے کہ ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی گنجائش ہونی

چاہئے۔

تلخیص:

۱- بیع و فاء۔

الف- کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، اس کا حکم اخلاقاً کئے گئے وعدہ کا ہوگا جس کا

پورا کرنا لازم ہوگا۔

ب- زائد مال کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو بائع کی اجازت سے اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔
د- خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو یہ بیچ معلق رہے گی۔
۲- راہن۔

الف- جب تک بیچنے والا واپس نہ لے لے اس سے وہ راہن کی اجازت سے استعمال کر سکتا ہے۔
ب- مروجہ کرایہ سے بہت کم کرایہ ادا کرنا بھی درست ہوگا۔
ج- راہن کی اجازت سے مرہونہ زمین پر کاشت کرنے کی اجازت ہوگی، لیکن اجرت پر دینے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

د- مالک کی اجازت سے بیچ سکتا ہے، اور اس سے اپنا دین وصول کر سکتا ہے۔
۳- زر ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں تخفیف درست ہوگی۔

☆☆☆

بیع و فاء - احکام و تفصیلات

مولانا محمد حذیفہ بن محمود ٹیلر، داہودی ☆

بیع و فاء کی تعریف:

بیع و فاء (یعنی بیع بہ شرط واپسی) کا مطلب ہے: ”ضرورت مند آدمی اپنی کوئی چیز مثلاً زمین، مکان وغیرہ کسی شخص کو اس شرط پر بیچے کہ متعینہ مدت کے بعد یا جب بائع (اصل مالک) لی ہوئی قیمت واپس ادا کرے، تب سابق قیمت پر ہی خریدار وہ چیز اس اصل مالک کو واپس بیچ دے، کسی دوسرے کو نہ بیچے“، ”صورتہ أن یقول البائع: بع تک هذا بكذا علی أنى متى دفعت لك الثمن تدفع العین الی۔“ (الحمر الرائق: ۶/۱۱، وکذا فی الدرر المرح: ۷/۵۴۵) ”بیع الوفاء هو البیع بشرط أن البائع متى رد الثمن یرد المشتري إلیه المبیع“ (درر الحکام ۱/۹۷، المادة: ۱۸۸، الموسوعة الفقهیة ۲۶۰/۹) اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ: ”بائع مشتری سے یہ کہے کہ تمہارا جو دین میرے ذمہ ہے، اس کے عوض میں نے یہ چیز تمہیں اس شرط پر بیچی کہ جب میں تمہیں دین ادا کر دوں گا، تو تم مجھے یہ بیع واپس کر دوں گے“ (العناویۃ مع الفتح: ۹/۲۳۶، الحمر الرائق: ۶/۱۱، الھندیۃ: ۳/۲۰۹) اس بیع کو بیع و فاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ بائع مشتری سے وعدہ لیتا ہے کہ جب بھی اس کو سابق قیمت واپس کر دی جائے گی، وہ بیع لوٹا دیگا، جس وعدہ کو مشتری پورا کرتا ہے، ”ووجه تسمیته بیع الوفاء أن فیہ عھدا بالوفاء من المشتري بأن یرد المبیع علی البائع حین رد الثمن“ (رد المحتار ۷/۵۴۵)۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خرید و فروخت سے دی ہوئی چیز بیچنے والے کی ملکیت سے نکل کر خریدنے والے کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے اور وہ مکمل طور پر اس کا مالک ہو جاتا ہے، خرید کردہ شے میں اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ کچھ بھی کرے، بیچے، ہبہ کرے یا کرایہ پردے، کسی کو بھی دے، سابق مالک کو یا کسی اور کو، اور کسی بھی قیمت پردے، اس شے سے سابق مالک اور فروخت کنندہ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، پس چونکہ اس بیع میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر شرعی اصول کے خلاف ہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس کی شرعی حیثیت متعین کی جائے اور اس کا حکم شرعی واضح کیا جائے، اس تعلق سے پیدا شدہ سوالات اور ان کے جوابات بالنتفصیل حسب ذیل ہیں:

سوال (۱): یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں؟ اگر شرعاً منعقد اور درست ہے، تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

جواب (۱): بیع و فاء کا یہ معاملہ چونکہ بیع کے عنوان سے ہوتا ہے اور خود عاقدین اس کو بیع ہی سمجھتے ہیں، اس لئے ظاہری صورت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کو بیع بھی قرار دیا جاسکتا ہے، البتہ یہ بیع فاسد کہلائے گی، کیونکہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ بیع کے معاملہ کے ساتھ اگر کوئی ایسی شرط لگادی گئی جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو اور اس کا تعامل بھی نہ ہو تو وہ بیع فاسد ہوگی، درست نہیں ہوگی اور یہاں اس معاملہ کے ساتھ بھی یہ شرط لگادی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شیء سابق ادا کردہ قیمت پر واپس کر دینی ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ شرط بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، کیونکہ بیع مکمل ہو جانے کے بعد مشتری شرعاً بالکل یہ طور پر بیع کا مالک ہو جاتا ہے، بائع کو واپس کرنے کا پابند نہیں ہوتا، نیز اس طرح کی بیع کا عام تعامل بھی نہیں ہے، اس لئے یہ بیع شرعاً صحیح نہیں ہوگی، بلکہ فاسد ہوگی۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، ”نہی عن بیع و شرط۔“ (قال الہیثمی: رواہ الطبرانی فی الاوسط عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ، وفی طریق عبد اللہ بن عمرو ومقال، مجمع الزوائد، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الصفقتین فی صفقة او الشرط فی البیع: ۱۰۴/۴، رقم: ۶۳۸۶، و فی اعلاء السنن عند الکلام فی تحقیق هذا الحدیث: ”فثبت أنه حدیث صحیح صالح للاحتجاج به، فلا یضرننا..... ما فی مجمع الزوائد:“ رواہ الطبرانی فی الاوسط، وفی طریق عبد اللہ بن عمرو ومقال۔“ فان حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ إذا رواہ الثقات عنه صحیح لم یزل الأئمة یحتجون به“ (۱۵۳/۱۴) ایک اور حدیث میں ہے کہ نہ تو سودا اور قرض جائز ہے اور نہ ہی سودے کے ساتھ دو شرطیں جائز ہیں، ”لایحل سلف و بیع و شرطان فی بیع“ (رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن عمرو، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراهیة بیع ما لیس عندک: ۱۴۸/۱، رقم: ۱۲۳۴)۔

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ خرید و فروخت میں ایک یا اس سے زیادہ شرطیں لگانا جائز نہیں ہے، لہذا بیع و فاء میں بھی لگائی گئی شرط ناجائز ہوگی اور چونکہ شرط فاسد کی وجہ سے عقد بیع ہی فاسد ہو جاتا ہے، اس لئے یہ بیع بھی فاسد ہو جائے گی۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

”ومنها الخلو عن الشروط الفاسدة، وهي أنواع، منها..... شرط مال یقتضیہ العقد، وفیہ منفعة للبائع أو للمشتري أو للمبیع إن كان من بنی آدم كالرقیق و لیس بملائم للعقد ولما مجری به التعامل بین الناس.....“ (بدائع الصنائع: ۳/۴۵-۳۴۷، مزید فقہی عبارات اور تفصیلات کے لئے دیکھئے مندرجہ ذیل کتابیں: الہدایة، باب البیع

الفاسد: ۵۹/۳، الفتاویٰ الہندیۃ، کتاب البیوع: ۳/۳۔

امام ظہیر الدین، صدر الشہید حسام الدین اور تاج الاسلام وغیرہ فقہاء کی یہی رائے ہے کہ یہ معاملہ بیع ہے اور شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہے، قاضی خان، صاحب کافی وغیرہ نے اسی کو مختار اور صحیح قرار دیا ہے۔
فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

”والصحيح أن العقد الذي جرى بينهما ان كان بلفظ البيع لا يكون رهنا، ثم ينظر ان ذكر اشرط الفسخ في البيع فسد البيع، وان لم يذكر ذلك في البيع وتلفظا بلفظ البيع بشرط الوفاء وتلفظا بالبيع الجائز وعندهما هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك، وان ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر اشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزم الوفاء بالوعد؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس۔“ (الخانية على هامش الہندیۃ: ۲/۲۵ او كذا في التاتارخانية: ۲/۲۵۹ و الفتاویٰ البزازیة على هامش الہندیۃ: ۲/۲۰۶ و الہندیۃ: ۳/۲۰۹، مجمع الانهر: ۲/۲۳۰، تبیین الحقائق: ۵/۱۸۳، البحر الرائق: ۲/۲۱۰ او كذا في النهر الفائق: ۳/۳۶۸، الدر المختار ورد المختار: ۷/۵۲۶-۵۲۷)۔

بیع وفاء کے بیع فاسد ہونے کے متعلق اصحاب فقہ وفتاویٰ کی تصریحات:

ہمارے اکابر اصحاب فقہ وفتاویٰ نے بھی یہی تصریح فرمائی ہے کہ یہ معاملہ بیع کے اعتبار سے فاسد ہے، چنانچہ:
”کفایت المفتی“ میں ہے: ”یہ صورت وہی ہے جس کو عام طور پر بیع بالوفاء کہا جاتا ہے اور بیع وفاء اس شرط سے جو سوال میں مذکور ہے، بیع فاسد اور حرام ہے“ (۱۳۹/۸)۔
”امداد المفتیین“ میں ہے: ”اگر شرط واپسی کی صلب عقد میں لگائی گئی ہو جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے، تو یہ بیع فاسد ہے، جس کا فسخ کرنا متعاقبین پر واجب ہے۔“

”فتاویٰ دارالعلوم“ میں ہے: ”یہ صورت بیع الوفاء کی ہے،..... تو اعد فقہیہ کے مطابق بیع فاسد ہونا راجح ہے، کیوں کہ اس بیع میں شرط واپسی کی لگائی ہے اور ایسی شرط سے بیع فاسد ہو جاتی ہے اور حکم بیع فاسد کا یہ ہے کہ عاقدین کے ذمے اور ان کے بعد ان کے ورثہ کے ذمے فسخ کرنا اس بیع کا ضروری ہے“ (۱۳۴/۳۲۵، و کذائی: ۳۲۴، ۳۲۷، ۳۳۱)۔
نیز لکھا ہے: ”اگر شرط واپسی کی عقد میں ذکر کی گئی ہے، تو صحیح مذہب یہ ہے کہ اس صورت میں بیع فاسد ہوگی اور اگر شرط واپسی عقد بیع میں ذکر نہیں کی گئی، بلکہ عقد کے بعد اس کا ذکر ہوا ہے، تو بیع جائز ہے اور مدت مقررہ کے اندر حسب وعدہ واپس کرنا بیع کا لازم ہے“ (۱۳۴/۳۲۷)۔

”فتاویٰ محمودیہ“ میں ہے: ”واپسی کی شرط پر فروخت کرنا بیع فاسد ہے، جائز نہیں ہے، اس کو بیع بالوفاء کہتے

ہیں،.....“ (فتاویٰ محمودیہ قدیم: ۲۳/۳۶۸)۔

ایک مقام پر ہے: ”اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا بیع فاسد ہے، بلکہ یہ رہن کے حکم میں ہے، اس کو بیع بالوفاء کہتے ہیں، وہ مکان رہن ہوگا، اس سے نفع اٹھانا مرتہن کے لئے درست نہیں ہوگا“ (فتاویٰ محمودیہ جدید: ۱۶/۲۶۳، ۲۵۹، ۲۶۰)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے: ”اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں، تو یہ بیع فاسد ہے اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے“ (احسن الفتاویٰ: ۶/۵۰۷)۔

”جدید فقہی مسائل“ (۱/۳۷۵) میں ہے: ”اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شیء واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے یہ بیع درست نہیں“۔

پس جب یہ بیع وفاء اس شرط کی وجہ سے فاسد ہوئی، تو بیع فاسد کا جو حکم ہے وہی اس بیع کا ہوگا۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”الثابت بالبیع الفاسد ملک مضمون بالقیمۃ أو بالمثل لبالمسمی بخلاف البیع الصحیح“ (البدائع: ۴/۵۹۰)۔

نیز فرماتے ہیں: ”وأما البیع الفاسد فهو..... وإن كان مشروعاً فی ذاته فالفساد مقترن به ذكراً

ودفع الفساد واجب ولا يمكن الابطساح العقد، فيستحق فسخه“ (البدائع: ۳/۵۸۲-۵۸۳)۔

علامہ مرغینانی فرماتے ہیں: ”وإذا قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد بأمر البائع وفي العقد عوضان كل واحد منهما مال ملك المبيع ولزمته قيمته..... وإنما لا يثبت الملك قبل القبض كيلا يؤدي إلى تقرير الفساد إذ هو واجب الرفع بالاسترداد..... وليس للبائع في البيع الفاسد أن يأخذ المبيع حتى يرد الثمن“ (الهدایہ: ۳/۶۲-۶۵ وکذا فی الدر المختار: ۷/۲۸۷-۲۹۱)۔

”رد المختار“ میں ہے: ”الشروط الفاسدة من باب الربا وهو يختص بالمعوضة المالية دون غيرها من المعاوزات و التبرعات، لأن الربا هو الفضل الخالي عن العوض، و حقيقة الشروط الفاسدة هي زيادة مالا يقتضيه العقد ولايلائمه، فيكون فيه فضل خال عن العوض وهو الربا بعينه.“ (رد المختار: ۷/۳۹۹)۔

”مجلة الاحكام“ میں ہے: ”لكل من المتعاقدين فسخ البيع الفاسد، إلا أنه إذا هلك المبيع في يد المشتري أو استهلكه أو اخرجته من يده ببيع صحيح أو بهبة من آخر أو زاد فيه المشتري شيئاً من ماله كما لو كان المبيع داراً فعمرها أو أرضاً فغرس فيها اشجاراً أو تغير اسم المبيع، بأن كان حنطة فطحنها وجعلها دقيقاً بطل حق الفسخ في هذه الصور“ (مجلة الاحكام مع درر الحکام: ۱/۳۳۶-۳۳۸، المادة: ۳۷۲)۔

(الف): بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: بائع کی مشتری سے یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، اسے ہی بیچا جائے، یہ ایک ایسی شرط ہے جو کہ عقد کے منقضي کے خلاف اور احد المتعاقدين (بائع) کی منفعت کو لئے ہوئے ہے، پس ناقابل اعتبار ہے، اس لئے یہ شرط لغو ٹھہرے گی، تاہم چونکہ یہ بیع فاسد ہے، اس لئے اگر مشتری زمین، مکان وغیرہ پر قبضہ کر کے مالک ہو گیا ہو، تو مذکورہ بالا تصرفات مشتری سے پہلے ہی ہوئی قیمت دیکر کر بیع فسخ کر کے اپنی جائیداد واپس لینے کا بائع کو حق و اختیار ہوگا، مگر یہ حق اس بیع کے فاسد ہونے کی وجہ سے ہوگا، شرط و معاہدہ کی وجہ سے نہیں اور اگر مشتری نے اس قسم کا کوئی مبطل حق فسخ تصرف کر لیا ہو، مثلاً: کسی اور کو بیچ دیا ہو یا کسی کو ہبہ کر کے اس کو حوالہ کر دیا ہو یا وقف کر دیا ہو یا صدقہ کر دیا ہو، تو بائع کو فسخ و استرداد کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

”المشتری شراء ا فاسد ا إذا باع المشتري أو وهبه أو تصدق به بطل حق الفسخ وعلی المشتري القيمة أو المثل و خرج المبيع من أن يكون مستحق الرد علی البائع لحصول البيع من المشتري بتسليطه وكذلك لو رهنه المشتري بطل حق الفسخ وولاية الاسترداد“ (البرائج ۴/۵۸۵-۵۸۷ وکذانی الدر المختار: ۷/۲۹۲-۲۹۴)۔

(ب): مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب: بیع فاسد میں مشتری کا بائع کو بیع واپس کرنا کسی صورت میں بھی ہو، وہ فسخ کہلاتا ہے اور اوپر کی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے کہ جب بیع فسخ کی جائے گی، تو سابق ادا کردہ قیمت ہی کی واپسی ہوگی، اس لئے خریدار کا مالک اول کو بیچنا فسخ کہلا کر سابق قیمت ہی کی واپسی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”وأما بیان ما یكون فسخا لهذا العقد ففسخه بطریقین: قول وفعل والفعل هو أن یرد المبيع علی بائعه علی أى وجه ما رده بیع أو هبة أو صدقة أو اعادة أو ایداع، بأن باع منه أو وهبه أو تصدق علیه أو اعاره منه أو اودعه اياه یرأ المشتري عن الضمان؛ لأنه يستحق الرد علی البائع، فعلى أى وجه ما رده يقع عن جهة الاستحقاق بمنزلة رد العارية والوديعة أنه يكون فسخا.....“ (البرائج: ۴/۵۸۳-۵۸۵ وکذانی الدر المختار: ۷/۲۹۱ وجملة الاحکام مع درر الحکام: ۱/۳۳۷، المادة: ۳۷۲)۔

لیکن اگر مبطل حق فسخ تصرفات مشتری کی وجہ سے بائع کا حق فسخ ختم ہو جانے کے بعد مشتری نے ایک نئے مستقل عقد کے ذریعہ شخص ثالث سے اسے خریدا ہے اور پھر بائع اول کو دوبارہ دے رہا ہے، تو اس صورت میں سابق ادا کردہ قیمت لازم نہیں ہے، اس سے زائد کا بھی مطالبہ مشتری کر سکتا ہے۔ ”المشتری شراء فاسد اذا باع المشتري أو وهبه و تصدق به بطل حق الفسخ و على المشتري القيمة او المثل ولو اشتراه ثانيا أو عاد إليه بسبب مبتدأ لا يعود الفسخ، لأن الملك اختلف لاختلاف السبب، فكان اختلاف الملكين بمنزلة اختلاف العقدين“ (البدائع: ۴/۵۸۵-۵۸۷)۔

(ج): خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: بیع فاسد میں قبضہ کی وجہ سے بیع پر مشتری کی ملکیت اگر چہ ثابت ہو جاتی ہے، مگر فساد ختم کرنے سے پہلے اس کے لئے اس بیع سے رہائش، سواری، بار برداری وغیرہ کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوتا ہے، اس لئے اس بیع میں بھی خریدار کے لئے بیع سے اس طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ ہاں! بیچنا، خریدنا اور رہن رکھنا وغیرہ تصرفات کے ذریعہ فائدہ اٹھانا جائز ہے، مگر بہتر نہیں، مگر وہ ہے۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”إن هذا الملك يفيد المشتري انطلاق تصرف ليس فيه انتفاع بعين المملوك بلا خلاف بين أصحابنا كالبيع والهبة والصدقة والاعتاق والتدبير والكتابة والرهن والإجارة، ونحو ذلك مما ليس فيه انتفاع بعين المبيع، وأما التصرف الذي فيه انتفاع بعين المملوك كأكل الطعام ولبس الثوب وركوب الدابة وسكنى الدار والاستمتاع بالجارية، فالصحيح أنه لا يحل؛ لأن الثابت بهذا البيع ملك خبيث والملك الخبيث لا يفيد اطلاق الانتفاع، لأنه واجب الرفع، وفي الانتفاع به تفرقله، وفيه تقرير الفساد، ولهذا لم يفد الملك قبل القبض تحرزا عن تقرير الفساد بالتسليم“ (البدائع: ۴/۵۹۰ و كذا في الدر المختار: ۷/۲۸۹، والفقه الاسلامي وادلتها: ۵/۴۹۴)۔

(د): خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا؟ اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: بیع فاسد اگر چہ قابل فسخ ہوتی ہے، مگر اس میں بیع مشتری کی ملکیت سے باہر نہیں رہتی ہے، بلکہ قبضہ کی وجہ سے اس پر مشتری کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، اس لئے اگر وہ دوسرے کو بیچ دے یا اور کسی قسم کا تصرف اس میں کر دے، مثلاً: بہہ کر دے یا صدقہ کر دے تو یہ بیع ثانی اور دیگر تصرفات صحیح اور نافذ ہوتے ہیں اور دوسرے شخص کے حق میں

کسی قسم کی خرابی باقی نہیں رہتی، اس لئے بیع و فاء میں بھی اگر مشتری نے بیع دوسرے کو بیچ دی تو یہ بیع درست ہوگی اور اس دوسرے شخص کے لئے اس چیز کا استعمال بھی صحیح ہوگا، اس کے حق میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوگی اور اصل مالک کا حق فسخ ختم ہو جائے گا، خریدار کے لئے اپنی دی ہوئی قیمت سے زیادہ قیمت لینا بہتر نہیں ہے، اگر لی ہے تو اس زائد رقم کا صدقہ کر دے۔ ”ہدایہ“ کی عبارت میں گزرا: ”فإن باعه المشتري نفذ بيعه، لأنه ملكه فملك التصرف فيه وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني“ (الهدایہ ۳/۶۳)۔

مجلة الاحكام میں ہے: ”البيع الفاسد يصير نافذا عند القبض، یعنی يصير تصرف المشتري في المبيع جائزا حينئذ۔“ (مجلة الاحكام مع درر الاحكام: ۱/۳۳۱، المادة: ۳۶۶، نیز تفصیل کے لئے دیکھئے: البدائع: ۴/۵۹۰، البدائع: ۴/۵۸۵-۵۸۷ و كذاني الدر المختار و رد المحتار: ۴/۲۹۲-۲۹۳، الدر المختار مع رد المحتار: ۴/۳۰۰، الدر المختار: ۴/۲۹۹)۔

البتہ: جن حضرات نے اس بیع و فاء کو بیع مکروہ کی طرح فاسد قرار دیا ہے، ان کے نزدیک مشتری کے لئے نہ تو اس بیع سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز ہوگا اور نہ ہی اس کے لئے کسی اور کو بیچنے کا اختیار ہوگا، تاہم اگر وہ بیچ دے تو اس کے تصرفات کے باوجود بائع کا حق فسخ باطل نہ ہوگا، اس لئے بائع جب چاہے، بیع فسخ کر کے لی ہوئی قیمت دے کر بیع واپس لے سکتا ہے، مشتری مزید قیمت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

”ومن مشائخ بخاری من جعل بيع الوفاء كبيع المكروه..... فجعلوه فاسدا باعتبار شرط الفسخ عند القدرة على ايفاء الدين يفيد الملك عند اتصال القبض به وينقض بيع المشتري كبيع المكروه؛ لأن الفساد باعتبار عدم الرضاء، فكان حكمه حكم بيع المكروه في جميع ما ذكرنا“ (تبيين الحقائق: ۵/۱۸۳)۔

”ومن جعل البيع الجائز المعتاد بيعا فاسدا يجعله كبيع المكروه حتى ينقض بيع المشتري من غيره؛ لأن الفساد لفوات الرضاء“ (الهدایہ ۳/۳۳۷)۔

”الرابع أنه فاسد اختاره صاحب الهداية، ومشائخ زماننا، وعليه الفتوى، لكن لا يملك المشتري بيعه من الغير كما في بيع المكروه لا كالفاسد بعد القبض۔“ (انتهى الفتاوى: ۳/۳۶۸)۔

ملاحظہ: بیع و فاء کا فاسد ہونا اور اس تعلق سے مذکورہ بالا تفصیلات و جوابات اس وقت ہیں جبکہ اس بیع کا تعامل نہ ہو اور یہی حال فی زمانہ اس بیع کا ہے کہ اس کا عام تعامل اور عرف نہیں ہے، اور عرف و تعامل وہی معتبر اور مؤثر ہوتا ہے جو کلی یا اکثری ہو۔

چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلوں میں عرف کے معتبر ہونے کی شرطوں کے ذیل میں لکھا ہے:

”عرف کلی یا اکثری ہو، یعنی معاشرہ میں سو فیصد اس کا رواج ہو یا معاشرہ کی غالب اکثریت اس عرف پر عمل پیرا ہو“ (اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے فیصلے: ۳۴)۔

”درالحکام“ میں ہے:

”والحاصل أن العرف لا يكون معتبرا، إلا أن يكون مطردا أو غالبا“ (درالحکام شرح مجلۃ الاحکام: ۴۵/۱، مادہ: ۴۱)۔

لہذا بیع و فاء کا یہ معاملہ بیع کے اعتبار سے فاسد اور نادرست ہے، پس اس لحاظ سے قابل احتراز اور واجب الفسخ ہے۔

مالکیہ، حنابلہ اور متقدمین شافعیہ کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ معاملہ بیع فاسد کا ہے، اور سود کا ایک حیلہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، ”ذهب المالکیۃ والحنابلۃ والمتقدمون من الحنفیۃ والشافعیۃ إلی أن بیع الوفاء فاسد..... ولأن البیع علی هذا الوجه لا یقصد منه حقیقۃ البیع بشرط الوفاء، وإنما یقصد من ورائه الوصول إلی الربا المحرم..... والربا باطل جمیع حالاته“ (موسوع فقہیہ ۲۶۰/۹)۔

مالکیہ کے نزدیک بیع میں اس قسم کی شرط فاسد کہلاتی ہے اور اس شرط کے باقی رہتے ہوئے یہ عقد فاسد ہو جاتا ہے، صاحب ”تلملہ فتح الملہم“ مالکیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لا یكون الشرط فی هذا المذهب فاسدا إلا فی موضعین..... الثانی: إذا كان الشرط یخل بالثمن بأن یزیده أو ینقصه إلی قدر غیر معلوم وهذا..... کبیع الوفاء وصورتہ أن یتتاع سلعة علی أن البائع متی مار د الثمن فالسلعة له..... أن الشرط الفاسد یبطل العقد، إلا إذا نزل عنه المشترط فیسقط الشرط ویبقى العقد، وهذا فیما إذا كان الشرط یخل بالثمن، كما فی بیع الوفاء وغیره“ (تلملہ فتح الملہم: ۶۳۱/۱-۶۳۲)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کا بیع و فاء کے متعلق فیصلہ عدم جواز ہی کا ہے، لکھا ہے:

”اس بیع کی حقیقت یہ سامنے آئی کہ کسی سامان کی فروختگی اس شرط کے ساتھ کی جائے کہ فروخت کنندہ جب بھی قیمت واپس کرے گا، خریدار اسے سامان لوٹا دے گا،..... یہ معاملہ درحقیقت ایسا قرض ہے جس میں نفع حاصل کیا جاتا ہے، لہذا یہ سودی معاملہ کا ایک حیلہ ہے اور اکثر علماء کی رائے کے مطابق درست نہیں ہے، اکیڈمی کی رائے میں بھی یہ معاملہ شرعا ناجائز ہے“ (اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے: ۲۱۰)۔

تعال و ضرورت کے پیش نظر بیع و فاء کا جواز:

تاہم: اگر اس بیع کا تعامل تسلیم کر لیا جائے، تو پھر یہ بیع صحیح ہوگی، فاسد نہ ہوگی، کیونکہ بیع میں لگائی ہوئی شرط اگرچہ

مقتضائے عقد کے خلاف ہو، مگر اس کا تعامل ہو چکا ہو، تو ایسی شرط سے بیع فاسد نہیں ہوتی، وجہ اس کی یہ ہے کہ عقد میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط کی ممانعت کی علت بسا اوقات فریقین کے درمیان نزاع اور اختلاف کا پیدا ہونا ہوتا ہے، جو مقصود عقد کے معارض ہے، جیسا کہ ہدایہ کی عبارت میں گذرا: ”اولاً لأنه يقع بسببه المنازعة فيعوى العقد عن مقصوده، إلا أن يكون متعارفاً؛ لأن العرف قاض على القياس“ (الہدایہ، باب البیع الفاسد: ۵۹/۳) لیکن جب کسی شرط کا عرف اور تعامل ہو جاتا ہے، تو پھر نزاع اور اختلاف پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ختم ہو جاتا ہے: ”الشرط المتعارف ولو لم يكن من مقتضيات العقد جوز البيع معه استحسانا و صار معتبراً..... لأن الشرط متى كان متعارفاً، فلا يكون باعثاً على النزاع ويحصل الملك المقصود بغير خصام۔“ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام العدلیہ: ۱/۱۳۸، مادہ: ۱۸۸) ”والعرف ينفي النزاع، فكان موافقاً لمعنى الحديث“ (البنایۃ فی شرح الہدایۃ، باب البیع الفاسد: ۲۴۱/۷) اس لئے عرف و تعامل کی وجہ سے شرط لگانا جائز ہوتا ہے اور ایسی شرط سے بیع فاسد نہیں ہوتی، مبسوط میں ہے: ”وان كان شرطاً لا يقتضيه العقد وفيه عرف ظاهر، فذلك جائز أيضاً كما لو اشترى نعلاً وشراها بشرط أن يحذوه البائع، لأن الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعي، ولأن في النزوع عن العادة الظاهرة حرجاً بيننا“ (المبسوط ۱۳/۱۳) بدائع میں ہے: ”وكذا إن كان مما لا يقتضيه العقد ولا يلائم العقد لكن للناس فيه تعامل“ (۳۸۱/۴، وكذا في البندیہ ۱۳۴/۳) ہدایہ کی عبارت میں گذرا: ”إلا أن يكون متعارفاً؛ لان العرف قاض على القياس۔“ (الہدایۃ، باب البیع الفاسد: ۵۹/۳) رد المحتار میں ہے: ”تدل عبارة البنزانية والخانية، وكذا مسألة القبقاب على اعتبار العرف الحادث ومقتضى هذا أنه لو حدث عرف في شرط غير الشرط في النعل والثوب والقبقاب أن يكون معتبراً إذا لم يؤد إلى المنازعة“ (رد المحتار: ۲۸۶/۷)۔

غیر مفسد عقد شرطیں:

وضاحت: اس کی یہ ہے کہ عقد بیع میں شرط لگانے کی ممانعت سے تین قسم کی شرطیں مستثنیٰ ہیں، جن کے پائے جانے سے عقد فاسد نہیں ہوتا، بلکہ صحیح اور درست ہوتا ہے، اول: عقد کے وقت لگائی گئی وہ شرط جو عقد اور معاملہ کے مقتضی کے مطابق ہو، دوم: عقد کے وقت لگائی گئی وہ شرط جو عقد اور معاملہ کے مقتضی کے مطابق تو نہ ہو، مگر عقد سے مناسبت رکھتی ہو، جس کو ملائم عقد کہا جاتا ہے، سوم: عقد کے وقت لگائی گئی وہ شرط جو عقد اور معاملہ کے مقتضی کے خلاف ہو اور اس میں متعاقدین میں سے کسی کا فائدہ بھی ہو، مگر ایسی شرط لگانے کا لوگوں میں عام تعامل اور عرف ہو گیا ہو۔

”در مختار“ میں ہے: ”ولابيع بشرط لا يقتضيه العقد ولا يلائمه، وفيه نفع لأحد هما أو فيه نفع لمبيع هو من أهل الاستحقاق..... ولم يجزى العرف به ولم يرد الشرع بجوازه، أما لو جرى العرف به

کبیع نعل مع تشریکہ او ورد الشرع به کخیار الشرط فلا فساد..... فیصح البیع بشرط یقتضیه العقد کشرط الملک للمشری اولایقتضیه العقد ولا نفع فیہ لأحد کشرط أن لایبیع الدابة المبیعة..... اولایقتضیه لکن یلائمه کشرط رهن معلوم..... او جرى العرف به کبیع نعل علی أن یحذوه البائع ویشرکه استحسانا للتعامل بلا نکیر“ (الدر المختار و رد المحتار ۷/۲۸۱-۲۸۲)۔

”تکملة فتح الملهم“ (۱/۲۹۹) میں ہے: ”خلاصة مذهب الحنفية في ذلك أنه إن كان شرطا یقتضیه العقد أو یلائم العقد أو شرطا جرى به التعامل بین الناس، فهو جائز ولا یفسد به البیع“۔
”مجله الاحکام“ میں ہے:

”البیع بشرط یقتضیه العقد صحیح والشرط معتبر..... البیع بشرط یؤید العقد صحیح والشرط أيضا معتبر..... البیع بشرط متعارف یعنی المرعی فی عرف البلد صحیح، والشرط معتبر“ (مجله الاحکام العرلیة: ۱/۱۳۵-۱۳۷، المادة: ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸)۔

پس مسئلہ زیر بحث میں بھی عقد کے مقتضی کے خلاف یہ شرط لگانا کہ ”بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیجا جائے، اسی سے ہی بیجا جائے“ عرف و تعامل کی وجہ سے جائز ہوگا اور اس شرط سے بیع فاسد نہیں ہوگی۔

مشائخ بخاری، مشائخ بلخ اور بعض مشائخ سمرقند (امام نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد نسفی و ۱۰۲۶ھ م ۵۳۷ھ) وغیرہ کی یہی رائے ہے، انہوں نے ضرورت اور تعامل کے پیش نظر اس بیع کو درست قرار دیا ہے، صاحب ”نہایہ“ نے اس کے جواز کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے، علامہ زبلی نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔

”ہدایہ“ میں ہے: ”ومشائخ سمرقند جعلوه بیعا جائزا مفید البعض الأحکام علی هو المعتاد للحاجة الیه“ (الهدایة: ۳/۳۷۷ و کذا فی العناوی مع الفتح: ۹/۲۳۶)۔

تبیین الحقائق میں ہے: ”وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تبیین: ۵/۱۸۳-۱۸۴ و کذا فی النہر الفائق: ۳/۳۶۸)۔

علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ”ومن هذا القبيل بیع الأمانة المسمى بیع الوفاء جوزہ مشائخ بلخ و بخاری توسعه.....“ (الاشاہ: ۱۳۰)۔

نیز لکھتے ہیں: ”الثانی أنه بیع صحیح باتفاق مشائخ الزمان للعرف..... وذكر الزبلی أن الفتوى علی أنه بیع جائز مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعه للغير“ (البحر الرائق: ۶/۱۲، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: الدرر الرد: ۷/۵۳۵، ۵۳۶ و کذا فی ملتقى الاجر فی هامش مجمع الأنهر: ۲/۲۵)۔

چنانچہ جب بعض علاقوں میں اس بیع کی ضرورت بڑھ گئی اور اس کا تعامل ہو گیا، تو بعض فقہاء نے اس کے ضرورت و تعامل کے پیش نظر اس کے جواز کا فتویٰ دیا، علامہ ابن نجیم تحریر فرماتے ہیں:

”ومنها: الافتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر، وقد سموه بيع الأمانة والشافية يسمونه الرهن المعاد هكذا سماه به في الملتقط، وقد ذكرناه في شرح الكنز من باب خيار الشرط“ (الاشباه، القاعدة السادسة من الخامسة: الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كان او خاصة: ۱/۱۳۹)۔

صاحب ”النهر الفائق“ لکھتے ہیں: ”والعمل في ديارنا على ما رجحه الشارح (ای الزيلعي)“ (النهر الفائق: ۳/۳۶۸، و ذکر ذلک الشامی معزیا الیه فی رد المحتار: ۷/۵۴۶)۔

”رد مختار“ میں ”بزازیہ“ وغیرہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

”القول السادس في بيع الوفاء أنه صحيح لحاجة الناس فرارا من الربا، وقالوا: ماضق على الناس أمر إلا اتسع حكمه، وفي الرد: قوله: (فرارا من الربا) لأن صاحب المال لا يقرض إلا بنفع، والمستقرض محتاج، فأجازوا ذلك لينتفع المقرض بالمبيع، وتعارفه الناس، لكنه مخالف للنهي عن بيع و شرط، فلذا رجحوا كونه رهنا“ (الدر المختار و رد المحتار: ۷/۵۵۱)۔

”رد المختار“ میں ہے:

”وفي فتاوى العلامة المحقق عبد الرحمن افندی العمادى مفتى دمشق: أن الحكم العام قد يثبت بالعرف الخاص عند بعض العلماء كالنسفي وغيره“ (رد المختار: ۹/۳۵، ۷/۴۰)۔

درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام میں ہے:

”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة، ومن هذا القبيل تجویز بيع الوفاء، لأنه لما كثر الديون على أهل بخارى مست الحاجة إلى ذلك وصار مرعيا ويفهم منها أن بيع الوفاء كان ممنوعا وقد جوز بناء على الضرورة“ (۱/۳۸، ۳۲)۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء لکھتے ہیں:

”والظاهر أن ما يجوز للحاجة انما يجوز فيما ورد فيه نص يجوزهُ أو تعامل كما في بيع الوفاء فان مقتضاه عدم الجواز ولكن لما مست الحاجة إليه في بخارى بسبب كثرة الديون على أهلها جوز على وجه أنه رهن أبيع الانتفاع بانزاله والرهن على هذه الكيفية جائز“ (شرح التواعد

الفحقیہ، القاعدة الحادیۃ والثلاثون: ۲۱۰)۔

بعض متاخرین احناف کے علاوہ بعض متاخرین شافعیہ کی بھی یہی رائے ہے، ”ذهب بعض المتأخرین من الحنفیة والشافعیة الى أن بیع الوفاء جائز مفید لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالمبیع دون بعضها وهو البیع من الآخر“ (الموسومة الفقیہیہ ۲۶۱/۹)۔

”امداد الفتاویٰ“ میں ہے:

”رہن قصداً و بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سواصل قواعد کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر وہ بیع ہے، تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے، تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطرار نہیں“ (۳/۱۰۷-۱۰۹)۔

اور اصولاً یہ بات ضرورت و تعال کے پیش نظر درست بھی ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے فیصلوں میں ہے:

”عرف عام اگر کسی نص عام سے اس طور پر متعارض ہو کہ عرف عام پر عمل کرنے سے نص کا ترک لازم نہ آئے، بلکہ نص کی تخصیص لازم آئے، تو اس صورت میں عرف عام کی بنا پر نص عام کی تخصیص درست ہے۔“ (اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے فیصلے: ۳۴)

پس جب یہ بیع ضرورت و تعال کے وقت درست ہوگی، تو اس کے احکام بھی مختلف ہوں گے، جس کا حاصل یہ ہے کہ:

(الف): یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، صحیح ہوگی اور اس شرط کی پابندی مشتری کے لئے لازم ہوگی۔

”وقد کثرت فی عهدنا أنواع الشروط فی البیوع والإجارة وغيرها فکل ما جرى به التعامل العام كان جائزاً مثل ما تعارف فی العالم کله ان مشتری الثلاث والدفائن والماکينات الأخری يشترط علی البائع القيام بتصلیحها کلما عرضها فساد فی حدود مدة معلومة کالسنة أو السنین مثلاً فإن هذا الشرط جائز لشیوع التعامل بها“ (تکملة فتح الہلم ۱/۶۳۵)۔

در مختار اور شامی کی عبارت گزر چکی ہے: ”فیصح البیع بشرط جرى العرف به کبیع نعل علی أن یحذوه البائع ویشرکه استحساناً للتعامل بلا نکیر۔“ و فی الرد: قوله: (استحساناً للتعامل) ای ویصح البیع ویلزم الشرط استحساناً للتعامل والقیاس فسادہ، لأن فیہ نفعاً لأحدهما“ (الدر المختار ورد المختار ۷/۲۸۱-۲۸۶)۔

علامہ ابن کحیم تحریر فرماتے ہیں:

”الخلف في الوعد حرام كذا في أضحية الذخيرة، وفي الفنية: وعده أن يأتيه فلم يأت له لا يأثم، ولا يلزم الوعد إلا إذا كان معلقا كما في كفالة البزازية، وفي بيع الوفاء كما ذكره الزيلعي“ (الاشباه، الفن الثاني: فن الفوائد، كتاب الخطر والاباحة: ۲۸۸)۔

”مجلة الاحكام“ میں ہے:

”المواعيد بصورة التعاليق تكون لازمة، لأنه يظهر فيها حينئذ معنى الالتزام والتعهد“ (مجلة الاحكام مع درر الاحكام: ۱/۷۷، المادة: ۸۴)۔

(ب): قیمت کی واپسی کے وقت یا مقررہ مدت پوری ہو جانے کے بعد اصل مالک کو سابق ادا کردہ قیمت ہی کے عوض واپس کرنا ضروری ہوگا، نہ تو سابق قیمت سے زائد لے سکتا ہے اور نہ اصل مالک کے علاوہ کسی اور کو بیچ سکتا ہے، سابق قیمت سے زائد لینا اور اصل مالک کے علاوہ کسی اور کو بیچنا معاہدہ کی خلاف ورزی کہلائے گا، اس لئے مالک پر زائد رقم کی ادائیگی لازم اور ضروری نہ ہوگی۔

”در مختار“ میں ہے: ”المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس“ (الدر المختار مع رد المحتار: ۷/۵۴۷)۔
”تكملة رد المحتار“ میں ہے:

”البيع بشرط متعارف بين الناس في البلد صحيح والشرط معتبر وان كان فيه نفع لأحد المتعاقدين أو لهما، وان كان لا يلائم العقد..... إذا شرط في بيع الوفاء أن يكون قدر من منافع المبيع للمشتري صح، ويلزم الوفاء بالشرط“ (تكملة رد المحتار: ۱۱/۶۸۰)۔

(ج): جب تک بیع مشتری کے پاس رہے گی، تب تک وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، حتیٰ کہ اگر کسی اور کو کرایہ پر دینا چاہے تب بھی دے سکتا ہے۔

”تبيين الحقائق“ کی تصریح گزر چکی ہے:

”ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه ومنهم نجم الدين النسفي فقال اتفق مشائخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهذا الانتفاع به دون البعض وهو البيع لحاجة الناس اليه ولتعاليمهم فيه..... وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تبيين الحقائق: ۵/۱۸۳)۔

”رد المختار“ میں ”بیع وفاء“ کے ذیل میں ہے:

”وفي البزازية:..... ومن اجازة جواز الجارة من البائع وغيره وواجب الجارة“ (رد المختار: ۷/۵۴۸)۔

(د): خریدار یہ بیع دوسرے کو نہیں بیچ سکتا، تاہم اگر اس نے کسی اور کو وہ چیز بیچ دی ہے، تو بائع کو بیع ثانی فسخ کر کے اپنی چیز واپس لینے کا حق و اختیار ہوگا۔
درمختار اور ردالمحتار میں بیع و فاء کے ذیل میں ہے:

”بیع الوفاء قیل بیع یفید الانتفاع به وفي اقالة شرح الجمع عن النهاية: وعليه الفتوى، وفي الرد: قوله: (قيل بیع یفید الانتفاع به) هذا محتمل لأحد قولین، الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی الاکراه: وعليه الفتوى“ (الرد والرد: ۷/ ۵۳۵، ۵۳۶)۔

سوال (۲): اگر اس کو رہن قرار کیا جائے تو

(الف): جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

فقہاء کرام نے جاہجایہ قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ معاملات میں اعتبار محض الفاظ و عبارات کا نہیں، بلکہ معانی و مقاصد کا ہوتا ہے، احکام ظاہری صورتوں سے نہیں، حقائق سے متعلق ہوتے ہیں۔
علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

”فأما لفظ الرهن فليس بشرط فالثوب رهن، لأنه أتى بمعنى العقد والعبرة في باب العقود للمعاني“ (بدائع الصنائع: ۵/ ۱۹۵)۔

”ہندیہ“ میں ہے: ”لان العبرة في العقود للمعاني لا للالفاظ“ (الفتاویٰ الہندیہ، کتاب الکتب: ۵/ ۲)۔
شیخ مصطفیٰ زرقاء لکھتے ہیں:

”العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للالفاظ والمباني۔“ (شرح القواعد الفقہیہ، القاعدة الثانية: ۵۵)۔

فقہاء کی اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غور کیا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اگرچہ صورتاً بیع ہے، مگر وہ درحقیقت رہن ہی ہے، کیونکہ اس طرح کے معاملات کے موقع پر مالک جائیداد کا مقصود اپنی جائیداد کو واقعہ فروخت کرنا نہیں ہوتا، اسی لئے وہ سابق ادا کردہ قیمت پر اپنی جائیداد کو واپس لینے کا معاہدہ کرتا اور اس کی شرط لگاتا ہے، بلکہ اس کا اصل مقصود تو قرض کے طور پر رقم لینا ہوتا ہے اور وہ رقم دینے والے کے اطمینان کے لئے بطور وثیقہ کے اپنی جائیداد اور سامان اس کے حوالہ کر دیتا ہے، اسی طرح رقم دینے والے کے پیش نظر بھی یہ ہوتا ہے کہ میں نے یہ چیز حتمی طور پر نہیں خریدی ہے، جب میری رقم واپس کر دی جائے گی، اس وقت مجھے اس سامان اور جائیداد کو واپس دے دینا ہے اور یہی رہن کی حقیقت ہے، فقہاء کے الفاظ ہیں: ”الرهن هو حبس شيء بحق يمكن استيفاء منه۔“ (کنز الدقائق: ۳۷، الدر المختار: ۱۰/ ۶۸) ”هو جعل المال

محبوسا وموقوفاً علی وجه التبرع مقابل حق ممکن الاستيفاء من المال المذكور“ (درالحکام: ۶۳/۴)۔
اور یہی زیادہ صحیح اور رائج ہے کہ یہ معاملہ فی الحقیقتہ رہن ہے۔

چنانچہ مذکورہ بالا قاعدہ فقہیہ کو ذکر کرتے ہوئے ”درالحکام شرح مجلۃ الاحکام“ میں لکھا ہے:

”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی ولذا یجری حکم الرهن فی بیع الوفاء.....مثال ذلك بیع الوفاء فاستعمال كلمة البيع فيه التي تتضمن تملیک المبیع للمشتري اثناء العقد لیفید التملیک، لأنه لم یکن مقصوداً من الفريقین بل المقصود به إنما هو تامين دين المشتري المترتب فی ذمة البائع وبقاء المبیع تحت يد المشتري لحين وفاء الدين، ولذلك لم یخرج العقد عن كونه عقد رهن فیجری به حکم الرهن ولیجری حکم البيع“ (درالحکام شرح مجلۃ الاحکام: ۱۸-۱۹، المادة: ۳، و کذا فی الغنایة مع الفتوح: ۲۳۶/۹، الدر المختار و رد المحتار: ۵۴۵/۷، ۵۴۶/۷)

امام سید ابوشجاع (اشرف بن ابی الوضاح محمد بن الامام ابی شجاع السید)، امام علی سعدي (علی بن حسن رکن الاسلام ابوالحسن السعدي م ۲۶۱ھ) اور قاضی حسن ماتریدی (حسن بن نصر لکھنی حسن القاضی الماتریدی) وغیرہ کی یہی رائے ہے کہ یہ رہن ہے اور رہن سے انتفاع ناجائز ہے، اس لئے اس معاملہ میں بھی خریدار (مرتبہن) کے لئے بیع (مرہون) سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے، صاحب منظومہ، صاحب جامع فضولین قاضی سماوہ وغیرہ اکثر فقہاء نے اسی کو اختیار کیا اور رائج قرار دیا ہے۔
”خلاصۃ الفتاوی“ میں ہے:

”فتوی السید الإمام أبی شجاع بسمرقند والقاضی الإمام علی السعدي ببخاری، وكثیر من الأئمة علی أن حکم بیع الوفاء حکم الرهن“ (خلاصۃ الفتاوی: ۳/۲۹، الغنایة علی ہاشم ہندیہ: ۲/۱۶۴، تبيين الحقائق: ۵/۱۸۳، الفتاوی المرآة علی ہاشم الہندیہ: ۴/۴۰۵، البحر الرائق: ۶/۱۲)۔
”ہندیہ“ میں ہے:

”البيع الذی تعارف أهل زماننا احتیالاً للربوا و سموه بیع الوفاء هو فی الحقیقة رهن“ (الفتاوی الہندیہ: ۳/۲۰۸-۲۰۹ و کذا فی المحيط: ۱۰/۳۶۹، والتا تاریخانیہ: ۹/۴۰۵)۔

علامہ شامی نے بھی رہن ہونے ہی کو ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں: ”وقد علمت ترجیح القول بأنه رهن“ (رد المحتار: ۷/۵۴۹) ایک مقام پر ہے:

”لکنہ مخالف للنہی عن بیع و شرط، فلذا رجحوا كونه رهننا“ (رد المحتار: ۷/۵۵۱، ۳/۱۷۷، و کذا فی ۳/۲۷۶، ۸/۲۸۲، ۱۱/۲۴۷، ۲۴۵/۵)۔

غرضیکہ عملاً اور حقیقتاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی ہے اور فقہاء نے بھی اس کو رہن قرار دیکر اس حیثیت سے اس کو جائز رکھا ہے اور یہی رائج ہے۔ اب اس معاملہ کو رہن قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص جو خریدار ہے، وہ اس کا مالک نہیں ہوگا، اصل مالک بائع ہی ہے اور وہ راہن ہے اور یہ خریدار مرتہن ہے، سامان شیء مرہون اور مرتہن کے پاس امانت ہے اور ثمن مرہون ہے، یعنی وہ دین و قرض ہے جس کے عوض سامان رہن رکھا گیا ہے، چونکہ عقد رہن میں مرتہن کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہوتی ہے اور اس کو اس سے استفادہ کا کوئی حق نہیں ہوتا، اس لئے اس بیع و فاء میں بھی خریدار کو خریدی ہوئی چیز سے استفادہ کا کوئی حق نہیں ہوگا، بلکہ ”کل قرض جر نفعاً حرام“ کے زمرہ میں داخل ہو کر اس سے فائدہ اٹھانا سود اور حرام ہوگا اور سود چونکہ مالک کی اجازت سے بھی حلال نہیں ہوتا، اس لئے اجازت کا بھی یہاں کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور انتفاع بالکل جائز نہ ہوگا۔

”بدائع“ میں ہے:

”وَأَنَّ الذِّي يَرْجِعُ إِلَى نَفْسِ الْقَرْضِ فَهُوَ أَنْ لَا يَكُونَ فِيهِ جَرْمَنْفَعَةٌ، فَإِنْ كَانَ لَمْ يَجْزِ نَحْوُ مَا إِذَا اقْرَضَ دَرَاهِمَ غَلَّةٍ بِشَرْطِ أَنْ يَرُدَّ عَلَيْهِ صَحَاحًا أَوْ أَقْرَضَهُ وَشَرْطِ لَهْ فِيهِ مَنفَعَةٌ لَمَّا رَوَى عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَنَّهُ نَهَى عَنْ قَرْضِ جَرْمَنْفَعَاءَ، وَأَنَّ الزِّيَادَةَ الْمَشْرُوطَةَ تَشْبِهُ الرِّبَا: لِأَنَّهَا فَضْلٌ لَا يُقَابِلُهُ عَوْضٌ، وَالتَّحْرِيزُ عَنْ حَقِيقَةِ الرِّبَا، وَعَنْ شَبْهَةِ الرِّبَا وَاجِبٌ“ (البدائع: ۶/۵۱۸)۔

ایک مقام پر ہے: ”لأن المرتهن لا يجوز له الانتفاع بالرهن أصلاً“ (البدائع: ۵/۲۱۰، البدائع: ۵/۲۱۲)۔

کنز میں ہے: ”ولا ينتفع المرتهن بالرهن استخداماً وسكنياً ولبساً وإجارة وإعارة“ (کنز الدقائق: ۴۳۹، الهدایہ: ۳/۵۲۲)۔

صاحب منخ الغفار نے انتفاع بالمرہون کے عدم جواز کے متعلق عبداللہ محمد بن اسلم سمرقندی جو کبار علماء سمرقند میں سے تھے، ان کا قول نقل کیا ہے کہ مال مرہون سے انتفاع کسی صورت میں جائز نہیں، اگرچہ راہن نے اس کی اجازت دی ہو، اس لئے کہ یہ سود خوری کی اجازت ہے، چونکہ وہ اپنا پورا قرض وصول کرے گا ہی، پھر یہ نفع ایک زائد شیء ہے، جو اس سے یہ لے رہا ہے اور رہا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے، ”قال فی المنح: وعن عبد الله محمد بن اسلم السمرقندی وكان عن كبار علماء سمرقند، أنه لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربا، لأنه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربواً وهذا امر عظيم“ (رد المحتار: ۱۰/۸۳)۔

در مختار میں ہے: ”وفي المضممرات نقل عن التهذيب أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن وإن

أذن له الراهن قال المصنف: وعليه يحمل ما عن محمد بن اسلم أنه لا يحل للمرتهن ذلك، ولو بالآذن؛ لأنه ربا، قلت: تعليقه يفيد أنها تحريمية“ (الدر المختار: ۱۰/۱۳۸)۔

بیع و فاء کے رہن ہونے اور شیء مرہون سے استفادہ ناجائز ہونے کے متعلق علماء و اصحاب فتاویٰ کی تصریحات:

ہمارے اکابر علماء و اصحاب فتاویٰ کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ بیع فی الحقیقتہ رہن ہے اور رہن میں شیء مرہون سے استفادہ جائز نہیں ہوتا، اس لئے اس بیع میں بھی خریدار کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے (دیکھئے: فتاویٰ محمودیہ، امداد الفتاویٰ، کفایۃ المفتی اور احسن الفتاویٰ وغیرہ)۔

حاصل یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں خریدار جو کہ حقیقتہ مرتہن ہے، اس کے لئے اس خریدی ہوئی شیء سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں، نہ اجازت سے اور نہ بلا اجازت، کیونکہ یہ شیء مال مرہون ہے اور مال مرہون میں جس (روک رکھنے) کا حق حاصل ہوتا ہے، نہ کہ نفع اٹھانے کا حق۔ ”یفید ملک الحبس لا الانتفاع“ (البدائع ۶/۱۳۶)۔

کیا راہن کی اجازت سے شیء مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟

تفصیل اس سلسلہ میں یہ ہے: کہ اس بارے میں تو تمام ہی فقہاء کا اتفاق ہے کہ راہن کی اجازت کے بغیر شیء مرہون سے فائدہ اٹھانا مرتہن کے لئے جائز نہیں، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، البتہ راہن کی اجازت سے شیء مرہون سے فائدہ اٹھانا مرتہن کے لئے جائز ہے یا نہیں: اس بارے میں فقہاء احناف کی رائے مختلف ہے، ایک رائے یہ ہے کہ جب اجازت ہو تو جائز ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ اجازت سے بھی جائز نہیں ہے، تیسری رائے یہ ہے کہ انتفاع اگر مشروط ہو تو جائز نہیں ہے، ورنہ جائز ہے، یہی تیسری رائے راجح، صحیح اور معتدل ہے کہ شیء مرہون سے فائدہ اٹھانے کی اگر شرط لگائی گئی ہو تو یہ ناجائز ہے اور ”کل قرض جوفعاً فهو حرام“ کا مصداق اور ربوا ہے اور شیء مرہون سے فائدہ اٹھانے کی اگر شرط لگائی نہ گئی ہو تو یہ جائز ہے، ربوا میں داخل نہیں ہے اور اس طرح اگلے دونوں اقوال کا مناسب محل متعین ہو کر دونوں کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے اور دونوں پر عمل ہو جاتا ہے۔

علامہ حصکفی نے ان تینوں اقوال کو ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

”وله طلب دينه من رهنه وله حبسه به..... لا انتفاع به مطلقاً لباستخدام ولا سكنى ولا لبس ولا إجارة ولا إعارة، سواء كان من مرتهن أو رهن؛ إلا بآذن كل للآخر، وقيل: لا يحل للمرتهن، لأنه ربا، وقيل: إن شرطه كان ربا والال“ (الدر المختار: ۱۰/۸۲-۸۳)۔

علامہ شامی نے اس ذیل میں بحث کرتے ہوئے ”منح الغفار“ کے حوالہ سے ”جو اہر الفتاویٰ“ کی یہ عبارت نقل کی ہے: ”اذا كان مشروطا صار قرضاً فيه منفعة وهو ربا، والافلا بأس به۔“ پھر لکھتے ہیں: ”أقول: مافی الجواهر يصلح للتوفيق وهو وجيه، وذكروا نظيره فيما لو أهدى المستقرض للمقرض إن كانت بشرط كره والافلا“ (رد المحتار: ۱۰/۸۳، وکذانی: ۷/۳۹۵)۔

ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

”اذا شرط الانتفاع بالرهن كالاستخدام والركوب والزراعة واللبس وشرب اللبن وأكل الثمار، فإن الكل ربا حرام، كما في الجواهر والنتف“ (رد المحتار: ۷/۳۰۱)۔

علامہ عبدالحی لکھنوی اس سلسلہ کی مختلف عبارتیں نقل کر کے اور اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اعلم أنهم بعد ما ا تفقوا على أنه لا يجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن بدون إذن الراهن اختلفوا في جوازه بالإذن على أقوال عديدة كما دلت عليه عباراتهم۔“ پھر مختلف اقوال اور اس سلسلہ کی مختلف عبارتیں نقل کی ہیں، پھر لکھتے ہیں: ”وأولى الأقوال المذكورة وأصحها و أوفقها بالروايات الحدیثية هو القول الرابع: إن كان مشروطا يكره ومالم يكن مشروطا لا يكره، أما كراهة المشروط فلحديث كون القرض الذي جر منفعة ربا، وأما عدم كراهة غير المشروط فلحديث ”الظهر يركب ولبن الدر يشرب“، والمعاد بالكرهية التحريمية كما يفيد ه تعليلهم بأنه ربا، وهي المرادة من الحرمة في قول من تكلم بحرمة المشروط، فإن المكروه التحريمي قريب من الحرام، بل كانه هو“ (الفلک الحشون فی الانتفاع بالرهون: ۸-۱۲)۔

پھر مشروط کی دو قسمیں ہیں: مشروط حقیقی اور مشروط حکمی، مشروط حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ عقد رہن کے وقت صراحتاً مرتہن کے لئے انتفاع بالمرہون کی شرط لگا دی گئی ہو اور مشروط حکمی کا مطلب یہ ہے کہ عقد رہن کے وقت اگرچہ صراحتاً مرتہن کے لئے انتفاع بالمرہون کی شرط نہ لگائی گئی ہو، مگر علاقہ میں اس کا عرف و رواج ہو، لوگ انتفاع ہی کے لئے چیز رہن پر دیتے اور لیتے ہوں، دونوں صورتوں کا حکم ایک ہی ہے، کیونکہ فقہاء کے نزدیک معروف و متعارف کا حکم بھی وہی ہوتا ہے جو مشروط کا ہوتا ہے: ”المعروف عرفاً كالمشروط شرطاً“ (مجملة الاحکام مع درر الحکام: ۱/۳۶، المادة: ۳۳) پس یہ انتفاع بالمرہون مشروط ہو یا معروف كالمشروط، بہر صورت سود ہے اور سود کا لینا دینا نہ اجازت سے درست ہوتا ہے اور نہ بلا اجازت، اس لئے یہ اجازت سے بھی درست نہیں ہوگا، علامہ شامی نے علامہ طحاوی کی یہ بات نقل کی ہے: ”قال ط قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولا له لما اعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط؛

لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع“ (رد المحتار: ۱۰/۸۳) ہاں! اگر عقد کے وقت مال مرہون سے استفادہ کی شرط نہ لگائی گئی ہو اور پہلے سے اس شخص کا مال مرہون سے استفادہ معلوم و معروف نہ ہو اور اس علاقہ میں بھی مال مرہون سے انتفاع کا چلن اور رواج نہ ہو، تب تو مالک کی اجازت سے مال مرہون سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، مگر یہ صورت نادر ہے اور اگر مذکورہ تینوں باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے، تو انتفاع جائز نہیں۔
علامہ عبدالحی لکھنوی اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ثم المشروط أعم من أن يكون مشروطاً حقيقة أو حكماً، أما حقيقة، فبأن يشترط المرتهن في نفس عقد الرهن أن ياذن له الراهن بالانتفاع من الرهن على ما هو المتعارف في أكثر العوام أنهم إذا ارتهنوا شيئاً ودفعوا الدين يشترطون اجازة الانتفاع ويكتبون ذلك في صك الرهن ولو لم ياذن له الراهن أو لم يكتب في الصك لم يدفع المرتهن الدين ولم يرتهن“ (الملك المضمون في الانتفاع بالمرهون: ۱۲-۱۳)۔

وہیہ زحیلی صاحب اس تفصیل کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”قال الحنفية:منهم من فصل فقال: إن شرط الانتفاع على الراهن في العقد فهو حرام؛ لأنه ربا وإن لم يشترط في العقد فحائز لأنه تبرع من الراهن للمرتهن والاشترط، كما يكون صريحا يكون متعارفاً والمعروف كالمشروط، وهذا التفصيل هو المتفق مع روح الشريعة والغالب من أحوال الناس أنهم عند دفع القرض إنما يريدون الانتفاع“ (الفقه الاسلامي وادلته: ۵/۲۵۶، ۴/۲۲۳)۔
حدیث میں ہے:

”لا يعلق الرهن هولمن رهنه له غنمه وعليه غرمه“ (رواه ابن أبي شيبة عن ابن المسيب في مصنفه، كتاب البيوع والاقضية، في الرجل يرهن الرهن فيملك: ۱۱/۵۵۶، رقم: ۲۳۲۵۰، لبيته في السنن الكبرى، كتاب الرهن، باب الرهن غير مضمون: ۶/۳۹، رقم: ۱۱۰۰۰) (گروہی رکھنا گروہی کی چیز کو نہیں روکتا، وہ اس کے اس مالک کی ہے جس نے اس کو گروہی رکھا ہے، راہن کے لئے رہن کا فائدہ ہے، اور اس پر رہن کا تاوان ہے،) یعنی مرہون چیز سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ”معنی قوله عليه السلام: ”لا يعلق الرهن“ أي لا يملك بالدين كذا قال أهل اللغة، ”غلق الرهن“ أي ملك بالدين وهذا كان حكماً جاهلياً فرد رسول الله ﷺ وقوله عليه السلام: ”هولصاحبه الذي رهنه“ تفسير لقوله لا يعلق الرهن وقوله عليه السلام: ”له غنمه“ أي زوائده وقوله عليه السلام: ”وعليه غرمه“ أي نفقته وكنفه“ (البراهن: ۵/۲۱۰، ۲۱۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال مرہون میں ملکیت راہن ہی کی رہتی ہے، اس لئے مرہن مال مرہون سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اور امام احمد کے علاوہ جمہور علماء نے دیگر آثار و اصول کی روشنی میں ”الظہر یرکب بنفقته إذا کان مرہونا ولبن الدر یشرب بنفقته إذا کان مرہونا، وعلی الذی یرکب ویشرب نفقته۔“ (رواہ البخاری عن ابی ہریرة، کتاب الرهن، باب الرهن مرکوب ومحلوب: رقم: ۲۳۷۷) وغیرہ احادیث کے تحت انتفاع المرتهن بالمرہون بلا إذن الراهن کو داخل نہیں مانا ہے، علامہ قسطلانی ”ارشاد الساری“ میں لکھتے ہیں: ”احتج بہ الإمام (احمد) حیث قال: یجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته، ولولم یاذن له المالك، وأجمع الجمهور علی أن المرتهن لا ینتفع من الرهن بشیء، قال ابن عبد البر: هذا الحدیث عند جمهور الفقهاء یرده أصول مجمع علیها، وآثار لایختلف فی صحتها، ویدل علی نسخه حدیث ابن عمر أی القاضی فی أبواب المظالم ”لاتحلب ماشیة امرء بغير اذنه“ (۵/۵۲۵ وکذا فی الفقه الاسلامی وادلتہ: ۵/۲۵۶)۔

علامہ عبدالحی لکھنوی مذکورہ بالا حدیث پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ولایخفی علی المنصف الغیر المتعسف أن اولی الأقوال فیہ ہو حملہ علی انتفاع المرتهن عند إذن الراهن، لکن بشرط أن لا یکون مشروطا حقیقة أو حکما“ (الفک المثنون فی الانتفاع بالمرہون: ۶)۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہے جس میں ایسے قرض سے منع فرمایا گیا ہے جو جالب منفعت ہو اور حلت و حرمت میں تعارض کے وقت حرمت کے پہلو کو ترجیح دی جاتی ہے، ”نعم یصح أن یقال: إنه معارض بخبر النهی عن القرض الذی جر منفعة: ومن المعلوم أن عند التعارض بین الحل والحرمۃ ترجح الحرمۃ والخبر المذکور ہو ما ذکرہ صاحب الهدایة وغیرہ فی بحث کراهة السفاتج أن النبی ﷺ نہی عن قرض جر نفعاً وهو وإن کان متکلماً فیہ سنداً لکنہ تأیید بآثار الصحابة وعمل الأمة“ (الفک المثنون فی الانتفاع بالمرہون: ۷)۔

نیز آپ ﷺ نے قرض سے فائدہ اٹھانے سے بھی منع فرمایا ہے، جبکہ مرہون سے انتفاع قرض سے فائدہ اٹھانے کے زمرہ میں آتا ہے، ارشاد ہے:

”إذا اقرض أحدکم قرضاً فأهدی له أو حملہ علی الدابة، فلا یرکبها ولا یقبلہ، إلا أن یکون جرى بینہ وبينہ قبل ذلک“ (رواہ ابن ماجہ عن انس فی سنہ: ۱۷۵، رقم: ۲۳۳۲)۔

ایک روایت میں ہے:

”إذا أقرض الرجل الرجل فلا يأخذ هدیه“ (رواہ البخاری فی تاریخہ، مشکوٰۃ عن انس، کتاب البیوع، باب

الربا: ۲۳۶، رقم: ۲۸۳۲۔

ایک روایت میں ہے:

”عن ابی موسیٰ قال: اتیت المدینة فلقیت عبد اللہ بن سلام فقال: الا تجيء فاطمک سویقا وتمرا وتدخل فی بیت، ثم قال: انک بارض الربوا بها فاش إذا کان لک علی رجل حق فأهدی إلیک حمل تبین أو حمل شعیر أو قط فلا تأخذہ، فإنه ربا“ (رواہ البخاری فی صحیحہ: ۱/۵۳۸، رقم: ۳۶۰۳)۔

عطاء سے روایت ہے:

”کانوا (أی الصحابة) یکرهون کل قرض جر به منفعة“ (رواہ ابن شیبہ فی مصنفہ، کتاب البیوع والاقضیہ: باب من کره کل قرض جر منفعة: ۱۰/۶۳۷، رقم: ۲۱۰۷۷)۔

ایک روایت میں ہے:

”کل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا“ (رواہ البیہقی فی السنن الکبریٰ عن فضالۃ بن عبید و ابن مسعود و ابی بن کعب و ابن عباس موقوفاً علیہم، کتاب البیوع، باب کل قرض جر منفعة: ۵/۳۳۹، رقم: ۱۰۷۱۵)۔

”اعلاء السنن“ (۱۸/۶۳) میں ہے: ”عن ابن سیرین قال: جاء رجل إلى ابن مسعود، فقال: إن رجلاً رهنی فرسا فرکتها، قال: ما أصبت من ظہرها فهو ربا۔“ اخرجه عبد الرزاق، کنز العمال من غیر تعقب۔“

ان احادیث اور آثار سے معلوم ہوا کہ قرض دینے والے کو مقروض سے ہدیہ لینا یا کسی قسم کی منفعت حاصل کرنا باجود اس کی رضا و رغبت کے ممنوع ہے اور انتفاع بالمرہون میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، لہذا وہ بھی ممنوع ہوگا۔ علامہ حسکفیؒ نے اشباہ کے حوالہ سے لکھا ہے: ”کل قرض جو نفعاً حرام، فکروہ للمرتہن سکنی المرهونة یا ذن الراهن“ (الدر المختار مع الرد، ۳۹۵/۷) (یعنی ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے، وہ حرام ہے، اسی لئے گروی لئے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کرنا مکان مالک کی اجازت سے ممنوع ہے۔) یعنی مرتہن کے لئے راہن کی اجازت کے بغیر تو حرام ہوگا ہی، اگر وہ اجازت دیدے، تب بھی اس مکان سے استفادہ کرنا مکروہ و ممنوع ہوگا۔ علامہ لکھنویؒ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

”انتفاع بغیر اذن حرام اور مع الاذن مکروہ تحریمی ہے،..... فقہ کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ باجوازت راہن مرتہن کے لئے نفع حاصل کرنا جائز ہے، تو یہ جواز صرف اس صورت میں ہے جبکہ اذن خالص ہو اور شرط کا ظاہری اور باطنی اعتبار سے کوئی شائبہ تک نہ ہو اور اگر زمانہ کے دستور کے موافق دل میں خیال بھی گیا تو ربا ہو جائیگا، علاوہ ازیں اگرچہ ایک جماعت فقہاء نے اذن کی صورت میں جائز قرار دے دیا، لیکن فقہاء کا ایک جم غفیر منع کرتا ہے، طحاوی کی عبارت اس پر

شاہد ہے اور تنقیح فتاویٰ حامدیہ میں ہے: ”لیس للمرتہن ولا للراهن أن یزرع الأرض ولا یواجر؛ لأنه لیس لهما الانتفاع بالرهن۔“ اور قنیہ میں جامع التفاریق سے منقول ہے: ”عن أبی یوسف المرتہن یسکن الدار یأذن الراهن یکره۔“ اور مجمع البرکات میں ہے: ”الحاصل أن المرتہن لا ینتفع بالرهن سواء أذن له الراهن أولم یأذن، وفي التهذیب: یکره للمرتہن الانتفاع بالرهن، وإن أذن له الراهن کذا فی المعدن۔“ اور حواشی اشباہ میں ہے: ”فی الجامع عن أحد اللائمة عن عبد الله بن محمد بن اسلم: أن لا یحل له أن ینتفع بشیء منه وإن أذن له الراهن؛ لأنه إذن فی الربا؛ لأنه ینتفع فی دینہ فیكون المنفعة ربا“ اور اشباہ میں ہے: ”یکره للمرتہن الانتفاع بالرهن یأذن الراهن۔“ (فتاویٰ عبد الحی: ۳۰۰-۳۰۱ مزید اردو فتاویٰ کے لئے دیکھئے: فتاویٰ رشیدیہ: ۵۲۱-۵۲۲، امداد الفتاویٰ ۱۰۷۳، فتاویٰ محمودیہ ۲/۳۴۸، ۶۸۳، امداد المنتہین ۸۷۱، کفایت المفتی ۱۳۰/۸، احسن الفتاویٰ ۲۹۸/۸، جدید فقہی مسائل ۲۲۵-۲۲۶)۔

مذکورہ بالا احادیث و آثار، فقہی تصریحات اور علماء کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ رہن سے فائدہ اٹھانا مشروط و مصرح ہو یا معروف و مقصود ہو تو یہ جائز نہیں ہے، لہذا بیع و فاء جو درحقیقت رہن ہے، اس میں بھی خریدار کے لئے بیع یعنی شیء مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

(ب): اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو، تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

جواب: اگر معاملہ کرتے وقت بیع (جو فی الحقیقت رہن ہے اس) کا تذکرہ پہلے کیا ہے، پھر کرایہ کی بات ہوئی ہے، تو گو یا عقد رہن کے بعد عقد اجارہ کیا اور شیء مرہون کو اجرت پر مقرر کرنے سے عقد رہن باطل ہو کر عقد اجارہ منعقد ہو جاتا ہے۔

”خانیہ“ میں ہے: ”إذا ارتهن الرجل دابة بدين له على الراهن وقبضها ثم استاجرها المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن، حتى لا يكون للمرتهن أن يعود في الرهن“ (الخبائعی علی ہامش البندیہ ۵۹۶/۳)۔

”بدائع“ میں ہے: ”لو آجره من المرتهن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد المرتهن القبض للإجارة“ (البدائع: ۵/۲۱۲)۔

”در مختار“ میں ہے: ”بخلاف الإجارة والبیع والهبة والرهن من المرتهن أو من أجنبي إذا باشرها أحد هما یأذن الآخر حیث ینخرج عن الرهن ثم لا یرجع إلا بعقد مبتدأ، لأنها عقود لازمة. وفي الرد: ”وأما الإجارة فالمستاجر إن كان هو الراهن فهي باطلة، وكانت بمنزلة ما إذا أعار منه أو أودعه،

وان كان هو المرتهن و جدد القبض للإجارة أو اجنبيا بمباشرة أحدهما العقد بإذن الأخر بطل الرهن والأجرة للرهن، وولاية القبض للعائد و ليعود رهننا إلا بالاستيناف..... ويشترط في الإجارة تجديد القبض كما علمت انفاً“ (الدر والرد، كتاب الرهن، باب التصرف في الرهن.....: ۱۰/۱۳۰)۔

”فتاویٰ دارالعلوم“ میں ہے:

”اگر مرتهن کو وہی زمین کرایہ پر دیوے اور تجدید قبضہ ہو جاوے تو اجارہ صحیح ہے، لیکن رهن باطل ہے“ (فتاویٰ

دارالعلوم: ۱۵/۳۲۱)۔

پس جب یہ عقد اجارہ ہوگا، تو اس صورت میں زمین، مکان وغیرہ مروج یا غیر مروج کرایہ کے عوض شیء موجر ہوگی، تو پھر سوال یہ ہے کہ فروخت کنندہ نے جو رقم لی ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ اگر اس کو قرض سمجھا جائے، تو گوگویا یہ اجارہ مشروط بالقرض یا معروف كالمشروط بالقرض ہو اور شرط قرض مقتضائے عقد کے خلاف ہے، اس لئے بیع کی طرح یہ عقد اجارہ بھی اس شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہوگا (البحر الرائق: ۷/۵۳۰، البدائع: ۴/۳۷۷ و کذا فی رد المحتار: ۷/۲۸۳، والھندیہ: ۳/۱۳۲، الدر المختار: ۹/۶۴، الھدایۃ: ۳/۶۰، دررالحکام: ۱/۷۶-۷۷، المادة: ۸۳)۔

حدیث میں ہے کہ سود اور قرض جائز نہیں، ”لایحل سلف و بیع و شرطان فی بیع۔“ (رواہ الترمذی عن عبداللہ بن

عمر، ابواب البیوع، باب ما جاء فی کراہیۃ بیع ما لیس عنک: ۱/۱۲۸، رقم: ۱۲۳۴)۔

”الموسوعة الفقہیۃ“ (۱۸۴/۹) میں ہے: ”وقد فسر محمد بن الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ السلف والبیع،

بأنه قول الرجل للرجل أبيعك داری هذه بكذا و كذا علی أن تقرضني كذا و كذا۔“

”اعلاء السنن“ میں ہے:

”قوله: ”لایحل سلف و بیع“ اقول: هذا نص علی حرمة الجمع بین القرض والبیع فی عقد

واحد مثل أن يقول اسلفتك كذا درهما علی أن تبیعني دارك بكذا او يقول: بعتك داری بكذا

علی أن تسلفني كذا۔“ (۱۸۳/۱۴۳، فتاویٰ محمودیہ قدیم: ۲۱/۳۷۰)۔

اور اگر اس رقم کو مرہون قرار دیا جائے، تو اس کی بھی گنجائش ہے، اس صورت میں فروخت کنندہ مرتهن، خریدار

راہن اور یہ رقم شیء مرہون ہوگی، فقہاء نے دراہم و دنانیر کو رهن رکھنا جائز لکھا ہے، ”ویجوز رهن الدراهم

والدنانیر۔“ (الہدایہ: ۴/۵۳۰) ”وصح رهن الحجرین۔“ (کنز الدقائق: ۴/۴۴۰) مگر شیء مرہون بہ زمین مکان وغیرہ نہیں

ہوں گے، یعنی اس رقم کو شیء موجر کے عوض رهن نہیں قرار دیا جاسکتا، کیوں کہ شیء موجر امانت ہوتی ہے اور امانت کے عوض

رهن جائز نہیں ہے۔

”بدائع“ میں ہے:

”.....أما العين فنقول لاختلاف في أنه لا يجوز الرهن بالعين التي هي أمانة في يد الراهن كالوديعة والعارية ومال المضاربة والبضاعة والشركة والمستاجر ونحوها، فإنها ليست بمضمونة أصلاً“ (البدائع: ۵/۲۰۶-۲۰۷)۔

”ہدایہ“ میں ہے: ”لایصح الرهن بالأمانات كالدائع والعواری.....“ (الہدایہ: ۳/۵۲۶)۔
”فتاویٰ قاضی خان“ میں ہے:

”كذا لو رهن المستاجر بالعين الذي استاجره وأخذ المستاجر من الأجر بالعين الذي آجره كان باطل“ (النجاشی علی ہاشم الہندیہ ۳/۵۹۶)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

”إن كانت العين أمانة كالوديعة والعارية والماجور ومال الشركة والمضاربة، فلا يجوز الرهن بها بالاتفاق“ (الفقه الاسلامی وادلتیہ: ۵/۱۹۶ وکذائی درر الحکام: ۳/۸۲، المادة: ۱۰: ۷۱)۔

ہاں! البتہ اجرت اور کرایہ جو خریدار (کرایہ دار) یعنی راہن کے ذمہ ہے، اس کے عوض رہن قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ دین ہے اور دین کے عوض رہن جائز ہے۔

در مختار میں ہے: ”لایصح رهن..... بالأمانات..... وصح بالدين ولو موعودا بأن رهن ليقرضه كذا“ (الدر المختار: ۱۰/۹۷-۱۰۳-۱۰۶)۔

لیکن چونکہ شیء مرہون مرہن کے پاس امانت ہوتی ہے اور اس کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا ممنوع ہوتا ہے، اس لئے اس صورت میں مالک مکان و دکان کے لئے اس مرہون رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا، البتہ اس صورت میں کرایہ کم لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہاں قرض نام کی کوئی چیز نہیں ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانا پایا جائے اور عقد میں متعاقدین جس عوض پر راضی ہو جائیں، وہ درست ہے۔

اور اگر معاملہ کرتے وقت عقد اجارہ کا تذکرہ پہلے کیا ہے، پھر بیع (جو فی الحقیقت رہن ہے اس) کا تذکرہ کیا ہے، تو گو یا عقد اجارہ کے بعد عقد رہن ہوا ہے، اور چونکہ شیء مرہون پر دینے سے عقد اجارہ باطل ہو کر عقد رہن منعقد ہو جاتا ہے، اس لئے یہاں بھی ایسا ہی ہوگا اور زمین، مکان وغیرہ شیء موجرشیء مرہون ہو جائیگی، جس سے استفادہ مرہن، یعنی خریدار کے لئے جائز نہیں ہوگا اور رقم شیء مرہون بہ ہوگی، جس سے استفادہ مالک زمین کے لئے جائز ہے۔

”در مختار“ میں ہے:

”آجر داره لغيره ثم رهنها منه صح وبطلت الإجارة“ (الدر المختار وورد المختار: ۱۰/۱۳۹-۱۵۰)۔

شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

”قال الحنفية: يجوز رهن المستعار والمستاجر عند المستعير والمستاجر وينوب قبض العارية و قبض الإجارة مناب قبض الرهن الا أنهم قرروا: اذا اتفق المتراهنان على الرهن تبطل الاجارة والعارية فلا يبقى في يد المرتهن مستاجرا ولا مستعارا ويصح الرهن اذا لا يجتمع على عين واحد في وقت واحد اجارة و رهن واذا طرأت الإجارة على الرهن بطل الرهن وصحت الإجارة؛ لأن الرهن عقد غير لازم والإجارة عقد لازم“ (الفقه الاسلامي وادلتة: ۵/۲۲۸)۔

پس جب عقد اجارہ باطل ہو چکا، تو کرایہ کا کوئی سوال ہی نہیں، نہ مروج اور نہ اس سے کم، لہذا مالک کے لئے نہ کرایہ لینا درست ہے اور نہ ہی خریدار کے لئے لی ہوئی زمین، مکان وغیرہ کو استعمال کرنا درست ہے۔
حنا بلہ کے نزدیک بھی ایسی چیزیں جو جانور کی قبیل سے نہ ہو، جیسے مکانات وغیرہ، ان سے نفع اٹھانا جائز نہیں، نہ بلا اجازت اور نہ اس کی اجازت سے، ہاں! مکان کا مروجہ کرایہ ادا کر کے رہن پر لینے والا خود اس میں قیام کر سکتا ہے، چنانچہ:
حنا بلہ کے مسلک کی تفصیل کرتے ہوئے وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

”ماليحتاج الي مؤنة (قوت) كالد اروو المتاع ونحوه ليجوز للمرتهن الانتفاع به بغير اذن الراهن بحال، لان الرهن ومنافعه ونمائه ملك الراهن فليس لغيره اخذها بغير اذنه فإن اذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بغير عوض وكان دين الرهن من قرض لم يجز، لأنه قرض يجرم منفعته وذلك حرام قال احمد: اكره قرض الدور وهو الربا المحض يعني اذا كانت الدار رهنا في قرض ينتفع بها المرتهن، وان كان الرهن بضمن مبيع أو أجرد ارا أو دين غير القرض فأذن له الراهن في الانتفاع جاز ذلك“ (الفقه الاسلامي وادلتة: ۵/۲۵۸-۲۵۹)۔

حاصل یہ ہے کہ بیع و فاء میں خریدار کا اس طریقہ پر خریدنا کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو، یہ صورت اس وقت جائز ہے، جبکہ بائع کی لی ہوئی رقم کو مرہون قرار دے کر اس کا استعمال اس کے لئے ممنوع قرار پائے، بشرطیکہ بیع جو فی الحقیقت رہن ہے، اس کا تذکرہ پہلے کیا ہو اور اجارہ کا اس کے بعد کیا ہو۔

(ج): اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ

کا) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

جس صورت میں یہی شے مرہون ٹھہرتی ہے، (یعنی اس وقت جبکہ اس بیع کے ساتھ عقد اجارہ نہ کیا ہو یا عقد اجارہ

کے بعد رہن کا تذکرہ کر کے اجارہ کو باطل کر دیا ہو،) اس صورت میں اس شیء سے خریدار کے لئے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے قرض پر نفع حاصل کرنے کو منع فرما کر اسے سود قرار دیا ہے، اور یہ بھی ایسا ہی ہے، اس لئے اس شیء سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں، سود میں داخل ہے اور حرام ہے، رہن کی وجہ سے مرتہن کو صرف قبضہ کا حق حاصل ہوتا ہے، رہن رکھی گئی چیز سے استفادہ کا حق نہیں۔

”لأن المرتهن غير مالك للمنافع فلا يملك تملكها وإنما هي للراهن“ (رد المحتار: ۹/۸۳)۔

”ليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون“ (البدائع: ۵/۲۱۲)۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ رہن رکھی جانے والی چیز کی حیثیت محض ایک امانت کی ہوتی ہے اور رہن رکھے جانے کے بعد بھی وہ شیء اصل مالک ہی کی ملک ہوتی ہے، اسی طرح اس شیء میں جو اضافہ یا نفع ہو، وہ اصل مالک کی ملک قرار پاتی ہے، جس کے پاس کوئی چیز رہن رکھی جائے اس سے نہ اس کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور نہ کسی تصرف کا، کیونکہ اگر اس کو استفادہ کا موقع دیا جائے تو قرض کے بدلے قرض کی ادائیگی ہوگی اور یہ استفادہ قرض کے سہارے مزید فائدہ اٹھانا ہے، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ اگر خود مالک نے استفادہ کی اجازت دی ہو تو فقہاء متقدمین اس کو جائز قرار دیتے ہیں، لیکن چونکہ اس زمانہ میں اس کی حیثیت قرض دہندہ کی طرف سے ایک طرح کی شرط کی ہوتی ہے اور فقہاء کا اصول ہے: ”المعروف كالمشروط۔“ (کہ جو چیز عرف و رواج کی حیثیت اختیار کر لے وہ شرط کا درجہ اختیار کر لیتی ہے) اس لئے فقہاء متاخرین نے اس کو قطعاً نادرست لکھا ہے، اس لئے کسی طرح بھی رہن کی اشیاء سے استفادہ خریدار کے لئے جائز نہ ہوگا۔

تاہم اگر اس نے اس شیء کو بائع اور مالک کی اجازت کے بغیر کسی اور کو اجارہ پر دے دیا تو حاصل شدہ اجرت بائع کو دیدے، یہی بہتر ہے یا پھر اس کا صدقہ کر دے اور اگر بائع کی اجازت سے کسی اور کو اجارہ پر دے دیا ہے، تو اس صورت میں اس خریدار، یعنی مرتہن اور بائع یعنی راہن کے درمیان کا عقد جو فی الحقیقتہ رہن ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور اجرت کا حقدار اصل مالک یعنی بائع و راہن ہی ہوگا۔

علامہ شامی نے لکھا ہے:

”وأما إذا آجره المشتري وفاء بإذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتهن بذلك، وحكمه أن الأجرة للراهن، وإن كان بغير إذنه يتصدق بها أو يردّها على الراهن المذكور وهو أولى، صرح به علماءنا، قلت: وإذا آجر باذنه يبطل الرهن، كما ذكره في حاشيته على الفصولين“ (رد المحتار: ۷/۵۴۹)۔

”خانیہ“ میں ہے: ”وإن آجرها المرتهن من أجنبی بإذن الراهن تخرج من الرهن وتكون الأجرة

للراهن، وإن كانت الإجارة بغير إذن الراهن يكون الآجر للمرتهن يتصدق به وللمرتهن أن يعيدها في الرهن“ (الحائبة على هاشم الهندي ۳/۵۹۶)۔
 ”ہندیہ“ میں ہے:

”وإذا استأجر داراً وقبضها ثم آجرها، فإنه يجوز إن آجرها بمثل ما استأجرها أو أقل، وإن آجرها بأكثر مما استأجرها فهي جائزة أيضاً، إلا أنه إن كانت الأجرة الثانية من جنس الأجرة الأولى، فإن الزيادة لتطيب له ويتصدق بها، وإن كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة“ (الہندیہ ۳/۴۲۵)۔
 اور جس صورت میں یہ شیء موجر ٹھہرتی ہے، (یعنی اس وقت جبکہ اس بیع کے بعد عقد اجارہ کیا ہو) مگر اجارہ شرط قرض کی وجہ سے فاسد ہے، اس صورت میں اس شیء موجر سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہوگا، کاشت کا ہو یا اجارہ داری وغیرہ کا۔
 ”در مختار“ میں ہے:

”ولاتملك المنافع بالإجارة الفاسدة بالقبض بخلاف البيع الفاسد، فإن البيع يملك فيه بالقبض بخلاف فاسد الإجارة حتى لو قبضها المستأجر ليس له أن يؤجرها“ (الدر المختار ۹/۶۲)۔

”و الفاسد من الإجارة لا يملك بالقبض حتى إذا قبضها المستأجر لا يملكها، ولو آجرها يجب أجر المثل ولا يكون غاصبا وليس للأول أن ينقض هذا العقد“ (البحر الرائق: ۸/۲۹)۔
 (د): خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟ اور بیچنے کو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

راہن ہی چونکہ شیء مرہون کا مالک ہوتا ہے، نہ کہ مرتہن، اس لئے راہن، یعنی فروخت کنندہ کی اجازت کے بغیر اسکو بیچنے کا مرتہن اور خریدار حق نہیں رکھتا ہے، اگر فروخت کنندہ اور راہن کی طرف سے اجازت کے بغیر بیچے گا تو وہ بیع نافذ و لازم نہ ہوگی، بلکہ راہن، یعنی فروخت کنندہ کی اجازت پر موقوف ہوگی، اگر اس کی مرضی نہ ہو تو اس کو مشتری ثانی کے پاس سے وہ شیء واپس لینے کا پورا پورا اختیار ہوگا اور اگر بیچنے کی اجازت ہو تو جتنے میں چاہے بیچ سکتا ہے، مگر اپنے قرض سے زائد رقم راہن کے حوالہ کر دے، کیونکہ یہ راہن ہی کی ملک کا عوض ہے۔

صاحب ”کنز“ تحریر فرماتے ہیں:

”ولايبيعه المرتهن أو الراهن إلا برضاء الآخر“ (۳۳۲ وکذانی ہدایہ ۳/۵۳۸)۔

”رد المختار“ (۱۰/۱۲۵) میں ہے: ”توقف على إجازة الراهن بيع المرتهن، فإن أجازته جاز، وال

فلا، وله أن يبطله ويعيده رهنًا“ -

”در مختار“ میں بیع و فاء کے ذیل میں ہے:

”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد، وفي الرد: قوله: (فللبائع أو ورثته حق الاسترداد) ای علی القول بأنه رهن، وكذا علی قول القائلين بأنه بيع يفيد الانتفاع به، فإنه لا يملك بيعه كما قدمناه..... هذا البحث مصرح به في البزازية حيث قال في القول الأول: إنه رهن حقيقة، باع كرمه وفاء من آخر و باعه المشتري بعد قبضه من آخر باتا وسلمه وغاب فللبائع الأول استرداده من الثاني.....“ (الدر المختار ورد المحتار: ۷/ ۵۳۸، وكذا في الهندي: ۳/ ۲۰۹، والتاريخانية: ۹/ ۲۰۶، والفتاوى البرزازية على هامش الهندي: ۳/ ۲۰۵ - ۲۰۶)۔

علامہ کاسانی رقمطراز ہیں:

”ليس للمرتهن أن ينتفع بالمرهون حتى..... إن كان دارا ليس له أن يسكنها..... لأن عقد الرهن يفيد ملك الحبس لا ملك الانتفاع..... الخ“ (البدائع ۵/ ۲۱۲)۔

اسی طرح موجر ہی چونکہ شیء موجر کا مالک ہوتا ہے، اس لئے اس کی اجازت کے بغیر اسکو بیچنے کا خریدار اور مستاجر حق نہیں رکھتا ہے، اگر فروخت کنندہ کی طرف سے اجازت کے بغیر بیچے گا تو وہ بیع نافذ و لازم نہ ہوگی، بلکہ بائع کو وہ شیء مشتری ثانی کے پاس سے واپس لینے کا پورا پورا اختیار ہوگا اور اگر بیچنے کی اجازت نہ ہو تو جتنے میں چاہے بیچ سکتا ہے، مگر اپنی رقم سے زائد رقم مالک کے حوالہ کر دے، کیونکہ یہ اسی کی ملک کا عوض ہے۔

فائدہ: بعض حضرات نے اس بیع کو مذکورہ بالا تینوں عقود یعنی بیع فاسد، بیع صحیح اور رہن تینوں سے مرکب قرار دے کر اس لحاظ سے اس کے احکام متعین کئے ہیں اور اس کو بعض محققین کی طرف منسوب کر کے اس کو ”القول الجامع“ سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ فتاویٰ بزازیہ میں مذکور ہے:

”القول الثامن: هو القول الجامع فيه ما قاله بعض المحققين..... بأن هذا البيع فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل واحد منهما الفسخ وصحيح في حق بعض الأحكام كحل الانزال ومنافع المبيع و رهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه ولم يملك قطع الشجر ولا هدم البناء وسقط الدين بهلاكه وانقسم الثمن ان دخله نقصان كما في الرهن..... هذا العقد مركب من العقود الثلاثة..... جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما“ (الفتاوى البرزازية على هامش الهندي: ۳/ ۲۰۹، البحر الرائق: ۶/ ۱۲، وكذا في النهر الفائق: ۳/ ۳۶۸)۔

”صاحب بحر“ اس قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

”وينبغي ان لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع“ (البحر الرائق: ۶/ ۱۲، و ذكره الثامی فی رد المحتار: ۷/ ۵۳۶)۔

”مجله الاحكام العدلية“ میں اسی قول کو اختیار کیا ہے (دیکھئے: مجله الاحكام مع درر الحکام: ۱/ ۹۷، المادة: ۱۱۸)۔

”شرح القواعد الفقهية“ میں شیخ احمد زرقاء نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

”والمفتی به هو القول الجامع و عليه جرت (المجلة في المادة: ۱۱۸) وهو أن بيع الوفاء له شبهه بالبيع الصحيح و شبهه بالفاسد، و شبهه بالرهن، و له من كل شبهه بعض أحكام المشبه به“ (شرح القواعد الفقهية، القاعدة الثمانية: ۵۶)۔

اس صورت میں احکام یہ ہوں گے:

کہ بائع کی یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے، فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، معتبر ہوگی، چنانچہ وہ اصل مالک کی اجازت کے بغیر کسی اور کو نہیں بیچ سکتا، اگر بیچ دیگا بائع کو واپس لینے کا حق و اختیار ہوگا، خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا بھی درست ہوگا، اصل مالک جب بھی سابق قیمت واپس کرے، بیچ واپس کرنا ضروری ہوگا، سابق قیمت سے زیادہ کا مطالبہ مشتری نہیں کر سکتا۔

”صاحب نہر“ تحریر فرماتے ہیں:

”الخامس: القول الجامع لبعض المحققين انه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل واحد منهما الفسخ، صحيح في بعض الأحكام كحل الإنزال و منافع المبيع، رهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، و سقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة“ (انظر الفائق: ۳/۳۶۸)۔

مجلہ اور اس کی شرح میں ہے:

”كما أن البائع وفاء له أن يرد الثمن و يأخذ المبيع كذلك للمشتري أن يرد المبيع ويسترد الثمن ليس للبائع ولا للمشتري بيع مبيع الوفاء لشخص آخر“ (مجله الاحكام و در الاحكام ۱: ۳۶۳-۳۶۵، المادة: ۳۹۶-۳۹۷)۔

سوال (۳): زر ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی؟ یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

جواب: عام طور پر یہ اقدام کرایہ دار کی طرف سے کرایہ پر دکان، مکان وغیرہ لینے کی ضرورت اور اس کے تقاضہ کے موقع پر کیا جاتا ہے، نیز مالک مکان و دکان یہ رقم اسی وجہ سے لیتا ہے، تاکہ اس کو اپنے مکان اور کرایہ کی طرف سے اطمینان رہے کہ مکان میں اس کی ملکیت باقی رہے گی، کرایہ دار اس پر غاصبانہ قبضہ نہیں کر سکے گا اور کرایہ کی ادائیگی کے بغیر نہیں بھاگے گا، اس لحاظ سے مکان، دکان وغیرہ چیزیں شیء موجر اور زر ضمانت کے نام پر لی ہوئی رقم کی حیثیت رہیں یعنی شیء

مرہون کی ہوگی اور شرعاً اس طرح رہن لینا درست ہے، فقہاء نے دراہم و دنانیر کو رہن رکھنا جائز لکھا ہے۔ ”صح رہن الحجریں“ (الدر المختار ۱۰۹/۱۰) اور شیء مرہون بہ وہ اجرت ہوگی جو کرایہ دار کے ذمہ میں ہے، کرایہ دار راہن اور مالک زمین مرتہن ہوگا اور چونکہ شیء مرہون مرتہن کے پاس امانت ہوتی ہے اور اس کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا ممنوع ہوتا ہے، اس لئے اس صورت میں مالک مکان و دکان کے لئے اس مرہون رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا۔ البتہ اس صورت میں کرایہ کم لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہاں قرض نام کی کوئی چیز نہیں ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانا پایا جائے اور عقد میں متعاقدین جس عوض پر راضی ہو جائیں، وہ درست ہے۔

”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”ولو استاجر داراً أو شيئاً واعطى بالأجر رهناً جازاً، فإن هلك الرهن بعد استيفاء المنفعة يصير مستوفياً للأجر، وإن هلك قبل استيفاء المنفعة يبطل الرهن ويجب على المرتهن رد قيمة الرهن“ (الہندیہ ۴۳۵/۵)۔

”کتاب الفتاویٰ“ (۲۷۸/۳) میں ہے:

”مالک مکان کے پاس وہ رقم کرایہ دار کی طرف سے رہن کے درجہ میں ہے، جب وہ مکان خالی کرے، اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے.....“۔

”مجموع الفتاویٰ“ (۲۶۰/۲-۲۶۱، ۲۶۲) میں ہے:

”ڈپازٹ کی وہ رقم بحکم رہن ہو کر امانت ٹھہری، تو زید کا اس رقم کو اپنے تصرف میں لانا درست نہیں ہے اور اس کی زکوٰۃ نہ عمر پر ہوگی، نہ زید پر“۔

البتہ حنا بلہ کے مسلک کے مطابق کرایہ کم ہونے کی صورت میں بھی ضمانت کی رقم کو رہن قرار دے کر اس سے انتفاع مالک مکان کے درست ہوگا، کیونکہ اس کے نزدیک جو زمین، مکان وغیرہ ایسے دین کے عوض رہن ہو، جو قرض نہ ہو، تو ایسی شیء مرہون سے فائدہ اٹھانا مالک کی اجازت سے بلا عوض بھی جائز ہے اور کم عوض پر بھی اور مسئلہ زیر بحث میں بھی رقم قرض کے عوض مرہون نہیں ہے، بلکہ کرایہ کے عوض کے مرہون ہے۔

علامہ ابن قدامہ کا بیان ہے:

”مالي احتاج إلى مؤنة كالدراو المتناع ونحوه فلا يجوز للمرتهن الانتفاع به بغير اذن الراهن بحال، لانعلم في هذا خلافاً..... فإن أذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بغير عوض وكان دين الرهن من قرض لم يجز لأنه يحصل قرضاً يجز منفعة وذلك حرام قال احمد: اكره قرض الد ورو هو الربا

المحض، یعنی إذا كانت الدار رهنا في قرض ينتفع بها المرتهن، وإن كان الرهن بشمن مبيع أو أجرد أو دين غير القرض فإذن له الرهن في الانتفاع جاز ذلك.....“ (المغنی: ۴/۴۳۱، وكذا في الفقه الاسلامی وادلتی: ۵/۲۵۸)۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فیصلوں میں ہے:

”مالک مکان زر ضمانت وڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے، بہتر ہے کہ اس کو بعینہ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کر دے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کر دے۔“

تاہم اس رقم کو قرض بھی قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس رقم کی واپسی ہوتی ہے اور اس سے مالک مکان منتفع بھی ہوتا ہے، اور یہی قرض کی حقیقت ہے، ”القرض عقد مخصوص ای بلفظ القرض ونحوہ یرد علی دفع مال مثلی“ (الدر المختار مع رد المحتار: ۷/۳۸۸، الفقه الاسلامی وادلتی: ۵/۲۵۸-۲۵۹) اور قرض قرار دینا یہ بہتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں مالک مکان کے لئے اس رقم کو استعمال کرنا جائز رہتا ہے اور یہ معاملہ اجارہ کا ہی کہلائے گا۔ ”وأمّا حکم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في المقرض للحال وثبوت مثله في ذمة المستقرض للمقرض للحال“ (البدائع: ۶/۵۱۹)۔

البتہ اس صورت میں یہ بات قابل غور اور حل طلب ہوگی کہ عقد اجارہ کے ساتھ قرض بھی مشروط یا معروف کا مشروط ہوتا ہے جو کہ اصلاً مفسد عقد ہے، ”و تفسد الإجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما فسد البيع مما مر يفسد ها“ (الدر المختار: ۹/۶۳) ”وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين يفضي إلى المنازعة، فيفسد الإجارة“ (البحر الرائق: ۸/۲۹)۔

لیکن چونکہ جس طرح عقد بیع میں لگائی گئی شرط ایسی ہو جو رواج و تعامل کا درجہ اختیار کر چکی ہو تو وہ مفضی الی المنازعة نہ ہونے کی وجہ سے مفسد عقد نہیں ہوتی، جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذرا، اسی طرح عقد اجارہ میں لگائی گئی شرط بھی اگر رواج و تعامل کا درجہ اختیار کر چکی ہو تو وہ بھی مفضی الی المنازعة نہ ہونے کی وجہ سے مفسد عقد نہیں ہوتی اور زیر بحث مسئلہ میں بھی شرط قرض کا یہی حال ہے کہ اس کا عرف و تعامل ہو چکا ہے، اس لئے وہ بھی مفسد عقد نہیں ہوگی اور عقد اجارہ کا یہ معاملہ صحیح ہوگا اور اس شیء، یعنی مکان دکان وغیرہ کا استعمال کرایہ دار کے لئے اور رقم کا استعمال مالک کے لئے درست ہوگا۔

مگر اس صورت میں مروج کرایہ طے کرنا ضروری ہوگا، مروج کرایہ سے کم کرایہ طے کرنا یہ قرض سے استفادہ کہلائے گا اور ممنوع ہوگا، جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذرا (تفصیل کے لئے دیکھئے: زد المختار: ۹/۸۷، اعلاء السنن: ۱۳/۵۱۳، اسلام کے

بنیادی احکام: ۲۰۲، کتاب الفتاویٰ ۵/۳۷۳۔

۳- حاصل یہ ہے کہ زر ضمانت کے نام پر لی ہوئی رقم کو رہن بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور قرض بھی، لیکن رہن کی صورت میں مالک مکان و دکان کے لئے اس مرہون رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا، البتہ اس صورت میں کرایہ کم لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور قرض کی صورت میں مالک مکان و دکان کے لئے اس مرہون رقم کا استعمال تو جائز ہوگا، البتہ اس صورت میں مروج کرایہ طے کرنا ضروری ہوگا، مروج سے کم کرایہ طے کرنا جائز نہیں ہے۔

متنبیہ: بعض حضرات ضمانت اور ڈپازٹ کی رقم کو رہن قرار دینا درست نہیں سمجھتے، چنانچہ:
مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”رہن اگر چہ دراہم و دنیا پر کا ہو سکتا ہے،..... جیسا کہ تمام کتب فقہ میں تصریح ہے، مثلاً: ”ہدایہ“ (۴/۵۳۱) میں ہے: ”ویجوز رهن الدرهم والدنانیر۔“ لیکن ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا کما فی الہدایة وغیرہا: ”و الرهن بالدرک باطل والكفالة بالدرک جائز، والفرق أن الرهن للاستيفاء ولاستيفاء قبل الوجوب وإضافة التملیک إلى زمان فی المستقبل لتجوز۔“ (۴/۵۲۷)، ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو، تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا، محض محتمل ہوتا ہے، لہذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے، یہ قرض ہی ہے اور مشروط حکم العرف ہے“ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۴۲۰)۔

مگر یہ بات اس حد تک توجیح ہے کہ اس رقم کو نقصان کا ضمان وصول کرنے کی غرض سے لیا جائے، تو یہ رہن بالدرک کی طرح ہو کر نادرست ہو،۔۔۔ مگر اس کی صرف یہی غرض نہیں ہوتی، بلکہ غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ کرایہ دار کرایہ پابندی سے اداء کرتا رہے، کرایہ ادا کئے بغیر بھاگ نہ جائے، پس اس صورت میں یہ رقم کرایہ جو کرایہ دار کے ذمہ واجب ہو چکا ہے اور دین ہے، اس کے عوض رہن ہوگی اور پہلے گزر چکا ہے کہ کرایہ کے عوض رہن رکھنا درست ہے۔ ”اذا كان مقابل المرهون مالا مضمونا فالرهن صحيح بناء عليه يجوز أخذ الرهن لأجل الدين والمسلم فيه..... وبدل الإجارة..... و ذکر أنه يجوز أخذ الرهن من المستاجر مقابل بدل الإيجار“ (درر الحکام: ۴/۸۱، المادة: ۷۱۰)، پس ضمانت اور ڈپازٹ کی رقم کو رہن قرار دینا بھی درست ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ:

(الف): بیع و فاء یعنی بیع بہ شرط و ایسی اگرچہ ظاہر الفاظ اور عنوان کے اعتبار سے بیع اور شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہے، مگر مقصود و معنی کے لحاظ سے رہن ہے، اس لئے بائع راہن، خریدار مرتہن، بیع شئیء مرہون اور ثمن مرہون بہ ہیں، یہی اکثر

فقہاء و اصحاب افتاء کی تحقیق ہے، لہذا خریدار (مرتبہن) بیع و فاء کے طور پر خریدی ہوئی شے (مرہون) کسی اور کو بیچ نہیں سکتا، بلکہ جب بائع (راہن) لی ہوئی رقم خریدار (مرتبہن) کو واپس کرے، تب وہ شے واپس کرنا ضروری ہوگا، اسی طرح وہ اس شے سے (ربائش، اجارہ وغیرہ) کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، نہ اجازت سے اور نہ بلا اجازت، ہاں! اگر ساتھ میں کرایہ داری کا معاملہ کر لیا ہے، تو اس شے سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، کرایہ چاہے مروج ہو یا مروج سے کم ہو، مگر اس صورت میں بائع کے لئے لی ہوئی رقم کو استعمال کرنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں یہ رقم شے مرہون ہے، اور اگر اس رقم کو قرض سمجھ کر استعمال کیا جا رہا ہے، تو پھر مروج کرایہ ہونا ضروری ہے، ورنہ کرایہ کی کمی قرض سے استنفاد ہو کر سود اور ممنوع ہوگی۔

(ب): کرایہ داری کے معاملہ میں مالک مکان جو کرایہ دار سے کثیر رقم ضمانت اور ڈپازٹ کے نام پر لیتے ہیں، وہ رقم رہن مانی جائے یہ بھی درست ہے اور اس صورت میں مروج سے کم کرایہ طے کرنا بھی صحیح ہے، مگر مالک کے لئے اس رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا، اسی طرح اس رقم کو قرض بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اس صورت میں اس رقم کا استعمال مالک کے لئے جائز ہوگا، مگر مروج کرایہ طے کرنا ہی ضروری ہے، مروج سے کم کرایہ طے کرنا درست نہیں ہے۔

بیع الوفاء کا شرعی حکم

مفتی محمد سعید الرحمن قاسمی ☆

وفا کے لغوی معنی:

وفا غدر (دھوکہ) کی ضد ہے، اس کے معنی پورا کرنے کے ہیں، وفا بلند اخلاق اور آدمی کا دوسرے کے حق کو پورا پورا ادا کرنے اور دینے کا نام ہے۔

”الوفاء لغة ضد الغدر..... والوفاء الخلق الشريف العالی الرفیع وأوفى الرجل حقه ووفاه إياه بمعنى أكمله واعطاء وافيًا“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔

بیع الوفاء کی شرعی تعریف:

بیع الوفاء شریعت اسلامیہ میں اس بیع کو کہتے ہیں، جس میں خرید و فروخت کا معاملہ اس شرط پر ہوتا ہے کہ جب بائع (بیچنے والا) ثمن واپس کر دے گا تو مشتری (خریدنے والا) بیع (فروخت شدہ شئی) بائع کو واپس کر دے گا۔ ”الموسوعة الفقهية“ میں ہے: ”وفى اصطلاح الفقهاء بيع الوفاء هو البيع بشرط أن البائع متى رد الثمن يرد المشتري المبيع إليه“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔

بیع الوفاء کی وجہ تسمیہ:

اس بیع کو بیع الوفاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ مشتری پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ کو پورا کرے جو اس نے بائع سے کر رکھا ہے، یعنی ثمن واپس کرنے کی صورت میں بیع واپس کرنے کا۔

”شامی“ میں ہے: ”بيع الوفاء إن فيه عهدا با لوفاء من المشتري، بأن يرد المبيع على البائع حين رد الثمن“ (رد المحتار ۲۷۳/۴)۔

”الموسوعة الفقهية“ میں ہے: ”وانما سمتى (بيع الوفاء)؛ لأن المشتري يلزمه الوفاء بالشرط“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔

بیع الوفاء کی صورتیں:

”صاحب عنایہ“ نے بیع الوفاء کی دو صورتیں لکھی ہیں۔

۱۔ بائع مشتری سے یہ کہے کہ آپ کا میرے ذمہ جو قرض ہے اس کے بدلہ میں میں نے اپنی فلاں چیز آپ کے ہاتھ میں اس شرط پر فروخت کی کہ جب میں آپ کا قرض ادا کر دوں گا تو فلاں چیز میری ہو جائے گی۔

۲۔ بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے اپنی فلاں چیز اتنی رقم میں آپ سے اس شرط پر فروخت کی کہ جب میں ثمن واپس کر دوں گا تو آپ مجھے بیع واپس کر دیں گے۔

”و صورته أن يقول: البائع للمشتري بعث منك هذا العين بمالك علي من الدين علي أني متى قضيت الدين فهو لي أو يقول: بعث منك هذا العين بكذا علي إني إن دفعت إليك ثمنك تدفع العين الي“ (شرح العنایہ علی شرح فتح القدير ۲۳۶/۹)۔

ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط نے اپنی کتاب ”نظریۃ العرف میں العرف والعادة فی رأی الفقہاء“ کے حوالہ سے بیع الوفاء کی ایک ایسی جامع تعریف نقل کی ہے جو بیع الوفاء کی دونوں صورتوں کو محیط ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

بیع الوفاء ایسا عقد ہے جس میں بائع یہ شرط لگا تا ہے کہ جب وہ مشتری کو ثمن لوٹا دے گا تو بیع اسے واپس کر دے گا۔ خواہ ثمن نقد ہو یا دین (نظریۃ العرف ۱۱۸)۔

مذکورہ بالا تعریف سے یہ بات واضح ہوئی کہ بیع الوفاء میں عین کو دین کے ذریعہ فروخت کیا جائے یا نقد کے ذریعہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس طرح بائع کا یہ کہنا ہے کہ جب میں ثمن لوٹا دوں تو عین مجھے واپس کر دینا یا اسے میرے ہاتھ فروخت کر دینا اس جملہ سے مسئلہ کے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، چنانچہ علامہ شامی ”رد المحتار“ میں رقمطراز ہیں:

”فعلم أنه لا فرق من قوله علي أن ترده علي أو علي أن يبيعه مني“ (رد المحتار ۲۳۶/۳)۔

بیع الوفاء کا نام:

علامہ علاء الدین ^{حصکفی} نے ”الدر المختار“ میں اور علامہ محمد بن عابدین شامی نے ”رد المحتار“ میں بیع الوفاء کے مختلف نام ذکر کئے ہیں، عام طور پر فقہاء اسے بیع الوفاء سے موسوم کرتے ہیں قاہرہ مصر میں اسے بیع الامانة کہا جاتا ہے اور شام میں اسے ”بیع الطاعة“ شوافع نے اسے ”رهن معاد“ کہا ہے مالکیہ نے ”بیع الثناء“ اور بعض فقہاء نے اسے ”البيع الجائز“ اور بعض نے ”بیع المعامله“ کا نام دیا ہے۔

عبارت ملاحظہ ہو: ”سماه الشافعيه بالرهن المعاد ويسمى بمصر بيع الأمانة وبالشام بيع

الطاعة“ (الدر المختار ۲۳۶/۳)۔

”بیع الوفاء----- وبعض الفقهاء یسمیہ البیع الجائز وبعضهم یسمیہ بیع المعاملة“ (رد المحتار

۲۴۶/۲)۔

”الموسوعة الفقهية“ میں ہے: ”هذا ویسمیہ المالكیة بیع الثینا والشافیة بیع العہدة والحنبلة بیع الأمانة، ویسمی أيضا بیع الطاعة وبیع الجائز وسمى فی بعض كتب الحنفیة بیع المعاملة“ (الموسوعة الفقهیة: ۲۶۰/۹)۔

بیع الوفاء کا حکم:

بیع الوفاء کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں فقہا کرام کے مختلف اقوال کتابوں میں ملتے ہیں علامہ محمد بن محمد الکردری نے اپنی مشہور تصنیف بزازیہ میں آٹھ اقوال ذکر کئے ہیں اور ان اقوال کو انہوں نے شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

قول اول:

سید ابوشجاع، امام علی السعدی وقاضی ابوالحسن ماتریدی کا ہے وہ یہ کہ بیع الوفاء درحقیقت رہن ہے اس قول کا حاصل یہ ہے کہ خریدار اس کا مالک نہیں ہوتا ہے اور اس کے لئے بائع کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھانا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ صاحب بزازیہ تحریر فرماتے ہیں۔

” ذکر صاحب منظومة فتاواہ أنه رهن فی الحقیقة لایملکہ المشتري ولا ینتفع به إلا باذن البائع ----- وعلیہ السید ابوشجاع والإمام علی السعدی، والقاضی أبو الحسن الماتریدی“ (الفتاویٰ البرازیة علی ہامش الفتاویٰ الہندیة ۴/۲۰۵)۔

قول دوم:

بیع الوفاء صحیح ہے مشائخ زمانہ نے اسی پر اتفاق کیا ہے۔

”القول الثانی: اتفق مشائخ الزمان علی صحة هذا البیع؛ لأنهما تلفظا بلفظ البیع“ (الفتاویٰ

البرازیة علی ہامش الفتاویٰ الہندیة ۴/۲۰۵)۔

علامہ زبلی نے بھی ”تبیین الحقائق“ میں شرط وفا کے ساتھ اس عقد کو جائز قرار دیا ہے اور مشتری پر لازم قرار دیا ہے کہ جب بائع ثمن واپس کر کے بیع کی واپسی کے مطالبہ کرے تو وہ واپس کر دے اور مشتری کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا ہے، البتہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کو جائز نہیں کہا ہے۔ ”تبیین الحقائق“ کی عبارت ملاحظہ ہو: ”ومن مشائخ سمرقند من جعله بیعا جائزا مفید البعض أحكامه منهم الإمام نجم الدین

النسفی فقال اتفق مشائخنا فی هذا الزمان فجعلوه بیعا جائزاً مفیداً بعض أحكامه وهو الانتقاع به دون البعض وهو لبيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى (تبيين الحقائق ۱۸۳/۵، ۱۸۵).

(بعض مشائخ سمرقند نے اسے بیع جائز اور بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے ان میں سے امام نجم الدین نسفی ہیں انہوں نے کہا کہ ہمارے مشائخ نے اس زمانہ میں اسے بیع جائز قرار دیا ہے اور اسے بعض احکام (بیع سے انتقاع) کے حق میں مفید مانا ہے، جبکہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کے بارے میں نہیں مانا ہے۔ لوگوں کی حاجت اور تعامل کی وجہ سے صاحب ”نہایہ“ نے اسی قول پر فتویٰ نقل کیا ہے۔)

امام برہان الدین علی المرغینانی نے بھی اپنی کتاب ”ہدایہ“ میں اس عقیدے کو ”البيع الجائز المعتاد“ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

”ومن جعل البيع الجائز المعتاد بیعا فاسداً --- ومشائخ سمرقند جعلوه بیعا جائزاً مفیداً لبعض الأحكام علی ما هو المعتاد للجاجة إليه“ (ہدایہ ۳۳/۳)۔

قول سوم:

جسے قاضی خان نے اختیار کیا ہے وہ یہ کہ نہ تو یہ رہن ہے اور نہ ہی علی الاطلاق فاسد، بلکہ صحیح قول یہ ہے کہ اگر متعاقدین کے درمیان یہ عقد لفظ بیع کے ذریعہ ہوا ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ متعاقدین نے بوقت عقد فسخ کی شرط ذکر کی۔ دوسرا یہ کہ فسخ کی شرط ذکر نہیں کیا۔ مگر ان دونوں نے شرط وفاء کے ساتھ لفظ بیع کا تلفظ کیا یا ان دونوں نے بیع جائز کہہ کر عقد کیا اور دونوں کے نزدیک بیع جائز کا مفہوم عقد غیر لازم ہوتا ہے، تو ان تمام صورتوں میں یہ بیع فاسد قرار پائے گی اور اگر ان دونوں نے شرط وفاء کے بغیر بیع کا ذکر کیا اور پھر بعد میں بطور وعدہ شرط وفا کا ذکر کیا تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی اور وعدہ کی رو سے اس کا ایفا لازم ہوگا، کیونکہ ایفاء عہد بھی لازم ہے۔ لہذا لوگوں کی حاجت و ضرورت کے پیش نظر اسے لازم قرار دیا جائے گا، ملاحظہ ہو۔ ”بزازیہ“ کی عبارت:

”القول الثالث : ما ذكره القاضي قال: الصحيح أنه إذا جرى بلفظ البيع لا يكون رهنا، ثم إن شرط فسخ البيع في العقد وتلفظ بلفظ البيع بشرط الوفاء بالبيع الجائز وعند هذا البيع غير لازم فالبيع فاسد، وإن ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد، فيجعل هنا لازماً لحاجة الناس إليه“ (الفتاویٰ البرازیلیہ علی ہامش الفتاویٰ الہندیہ ۳/۲۰۶، ۲۰۷)۔

قول چہارم:

بیع الوفاء بیع فاسد ہے اور اس کے قائل امام ظہیر الدین ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ شرط وفا شرط فاسد ہے اور بیع شرط

فاسد سے فاسد ہو جاتی ہے۔ ”القول الرابع: قال في العدة: واختاره الإمام ظهير الدين أنه بيع فاسد“ (الفتاوى البرازية ۴/۲۰۷)۔

قول پنجم:

بیع الوفاء بعض صورتوں میں رہن ہے اور بعض میں بیع۔ یہ قول ائمہ خوارج کا ہے۔ ان حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ بیع کو مطلق رکھا گیا ہے، لیکن مشتری نے ایک شخص کو اس امر کا وکیل بنا دیا ہے کہ جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو وہ بیع فسخ کر دے گا۔ مشتری نے وعدہ کر لیا کہ جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو وہ بیع فسخ کر دے گا اور ثمن بیع کی مالیت کے برابر نہیں ہے، بلکہ اس میں غبن فاحش ہے، یا یہ کہ مشتری نے اصل مال پر نفع رکھ دیا، مثلاً اصل ثمن صرف سو دینار تھا، مگر اس پر بیس دینار زائد بطور نفع رکھ دیا تو ان تینوں صورتوں میں یہ عقد رہن قرار پائے گا ان کے علاوہ صورتوں میں مذکورہ عقد بیع قرار پائے گا، ”البحر الرائق“ میں ہے:

”الخامس ما اختاره أئمة خوارج أنه إذا أطلق البيع لكن وكل المشتري وكيلا بفسخ البيع إذا حضر البائع الثمن أو عهد أنه إذا أو فاه يفسخ البيع والثمن لا يعادل المبيع وفيه غبن فاحش أو وضع المشتري على أصل المال ربحاً بآن وضع على مائة عشرين ديناراً، فوهن وإلا فبيع بات“ (البحر الرائق ۶/۱۳ کتاب البيوع باب خيار الشرط)۔

قول ششم:

جسے امام فخر الزاہد نے اختیار کیا ہے وہ یہ کہ بیع الوفاء بیع اور رہن دونوں سے مرکب عقد ہے اس پر بیع اور رہن دونوں کے احکام جاری ہوں گے۔ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے، لہذا وہ بیع سے انتفاع کا مالک ہوگا اور بائع کے حق میں رہن ہے، اس لئے وہ اس کا مجاز ہوگا کہ جب وہ مشتری کو ثمن واپس کر دے تو اس سے بیع کی واپسی کا مطالبہ کرے، نیز رہن ہونے کا ثمرہ یہ ظاہر ہوگا کہ مشتری بیع کو کسی دوسرے سے فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوگا۔ اور بیع صحیح ہونے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بائع کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ مشتری کو اس کے انتفاع سے روکے۔

”القول السادس: ما اختاره البعض واختاره الشيخ الإمام فخر الزاهد أن الشرط إذا لم يذكر في البيع يجعله صحيحاً في حق المشتري في ملك الإنزال ورهنا في حق البائع فلم يملك المشتري تحويل يده وملكه إلى غيره“ (الفتاوى البرازية علی باش الفتاوى الهندية ۴/۲۰۷)۔

قول ہفتم:

بیع الوفاء صحیح نہیں ہے اور نہ مشتری بالوفاء کے لئے بیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا صحیح ہے، یہ امام علاء الدین

بدر کا فتویٰ ہے، صاحب ”ہدایہ“ ان کی اولاد اور ہمارے زمانہ کے مشائخ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اس پر فتویٰ بھی ہے۔
 ”أجاب علاء الدین بدر أنه لا يصح، وعلى هذا اختار صاحب الهداية، وأولاده ومشائخ
 زماننا، وعليه الفتوى أعني لا يملك المشتري البيع من الغير“ (الفتاوى البرازيلية على باش الفتاوى ہندیہ ۴۰۸/۳)۔

قول ہشتم:

یہ بعض محققین کا قول ہے، بیع الوفاء تین چیزوں سے مرکب ہے، ایک بیع فاسد، دوسرے بیع صحیح اور تیسرے رہن۔
 بعض احکام میں یہ بیع فاسد ہے، یعنی بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو بیع کے فسخ کا اختیار ہے۔ بعض احکام میں یہ
 بیع صحیح ہے، یعنی مشتری کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز و درست ہے، اور بعض احکام میں یہ رہن ہے، یعنی مشتری کے لئے
 بیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، صاحب ”بزازیہ“ تحریر فرماتے ہیں:

”بأن هذا البيع فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ وصحيح في حق
 بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك الشاري بيعه من
 آخر“ (الفتاوى البرازيلية على باش الفتاوى الہندیہ ۴۰۸/۳)۔

میں کہتا ہوں یہ عقد تین عقود سے مرکب ہے، جیسے زرافہ (ایک جانور ہے جس میں اونٹ گائے اور چیتا تینوں کی
 صفت پائی جاتی ہے) اس کو لوگوں کی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ بدلیں (ثمن و بیع) بائع اور مشتری کے
 پاس بعینہ موجود ہو۔

”قلت هذا العقد مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقرة والنمر جوز
 لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما“ (الفتاوى البرازيلية على باش الفتاوى الہندیہ ۴۰۹/۳)۔
 مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو حضرات بیع الوفاء کے فساد کے قائل ہیں ان کی دلیل
 یہ ہے کہ یہ عقد ایک ساتھ بیع اور شرط دونوں کو شامل ہے اور حضور ﷺ نے ایک ساتھ بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

اور جو حضرات اس بیع کے جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ مشائخ سمرقند اور خود صاحب ”ہدایہ“ امام برہان الدین
 مرغینانی ان کی دلیل یہ ہے کہ شریعت مطہرہ میں عرف و عادت وہ اصول ہیں جن پر بے شمار احکام شرعی کی بنیاد ہے بیع استصناع
 بھی عرف کی بنا پر ہی جائز ہے ورنہ اصولاً تو بیع معدوم ہونے کی وجہ سے اسے بھی ناجائز ہی ہونا چاہئے اور فقہاء کرام کا اس
 پر اتفاق ہے کہ عرف و عادت کی بنا پر نص کو ترک تو نہیں کیا جاسکتا ہے، البتہ نص عام کی تخصیص کی جاسکتی ہے۔ لیکن عرف خاص
 کے ذریعہ نص عام کی تخصیص ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، عام طور پر فقہاء عرف خاص کو معتبر
 نہیں مانتے ہیں اور اس کی وجہ سے نص کی تخصیص کے قائل نہیں ہیں، البتہ بعض فقہاء مثلاً مشائخ بلخ نے عرف خاص کو بھی نص

عام کی تخصیص کے لئے مخصوص مانا ہے۔

”الحاصل أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، ولكن افتى كثير من المشايخ باعتباره“

(الاشباه والنظائر ص: ۱۶۱)۔

اور جب ہم غور کرتے ہیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ ایسا عرف جو لوگوں کے درمیان متعارف ہو اور اس کی داعی لوگوں کی حاجت و ضرورت ہو تو یہ استحسان قرار پائے گا جو مبنی بر عرف ہوگا اور حاجت و ضرورت کی بنا پر نص میں تخصیص جائز ہے۔ چنانچہ اصول فقہ کا مسلمہ ضابطہ ہے۔

”الضرورات تبیح المحظورات“ (الاشباه والنظائر ص: ۱۴۰) (مجبوریاں ممنوعات کو جائز قرار دیدیتی ہیں)۔ اسی طرح فقہ کا اصول ہے: ”الأمر إذا ضاق اتسع“ (الاشباه والنظائر ص: ۱۳۸) (جب کسی معاملہ میں تنگی پیدا ہو تو اس کے حکم (شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے) میں وسعت پیدا کر دی جاتی ہے)۔

خلاصہ بحث:

لوگوں کی ضرورت و حاجت اور عرف کے پیش نظر بیع الوفاء کو جائز قرار دینا چاہئے، رقم الحروف کی یہی رائے ہے۔ بشرطیکہ مبتلی بہ پہلے حتی المقدور بلا سودی قرض لینے کی کوشش کرے اور اگر نہ ملے تو بدرجہ مجبوری بیع الوفاء کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ شرعاً اس کی گنجائش ہونی چاہئے، مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

لیکن بعض متاخرین نے اس کی اجازت دی ہے پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں ہے (امداد الفتاویٰ ۱۰۸۳)۔

(الف، ب، ج، د) شدید مجبوری کی حالت میں اس بیع کی شرعاً گنجائش ہے اور یہ بعض احکام میں مفید ہے، یعنی مشتری کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانا جائز ہے اور جب بائع ثمن واپس کر دے تو مشتری پر حسب وعدہ بیع کی واپسی لازم و ضروری ہوگی، البتہ مشتری بیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی بائع سے زائد رقم لے سکتا ہے۔

(۳) آج کل بڑے شہروں میں دوکان یا مکان جو پیشگی خطیر رقم لے کر کرایہ پر دینے یا لینے کا رواج ہے اس کی دو

صورتیں ہیں۔

(۱) ایک تو یہ صورت ہے بطور زر ضمانت (ڈپوزٹ) پیشگی رقم لے کر دوکان یا مکان کرایہ پر دیا جاتا ہے، اور یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد پیشگی لی گئی رقم کرایہ دار کو واپس کر دی جائے گی اس صورت میں کرایہ کی رقم معمول کے مطابق لی جاتی ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ تو ایسی صورت میں بطور زر ضمانت جو رقم لی جاتی ہے اس کی

حیثیت امانت کی ہے۔ مالک مکان یا دوکان کے لئے بہتر یہ ہے کہ اس رقم کو بعینہ محفوظ رکھے اور جب اجارہ کی مدت مکمل ہو جائے تو مذکورہ رقم کرایہ دار کو واپس کر دے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ خطیر رقم لے کر مالک مکان یا دوکان اس مکان و دوکان کے حق انتفاع سے دست بردار ہو جاتا ہے جو مروجہ پگڑی کی شکل ہے اور حق انتفاع سے دست برداری کے عوض لینے کو فقہاء متاخرین نے جائز قرار دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ جو ماہانہ معمولی رقم لی جاتی ہے وہ حق ملک کی بنا پر ہے، اس صورت میں مالک مکان و دوکان مذکورہ رقم کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کو اس میں ہر قسم کے تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ معمولی کرایہ لینے کو ”سکل قرض جو نفعاً فہو ربا“ کے تحت داخل نہیں کیا جاسکتا ہے۔



بیع و فاء کے شرعی احکام اور دلائل

مفتی محمد خالد حسین نبوی قاسمی ☆

بیع و فاء کی تعریف:

اس کی تعریف میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں؛ لیکن مقصود کے لحاظ سے ملتے جلتے ہیں۔ علامہ زبیلی فرماتے ہیں: ”هو أن يقول البائع للمشتري: بعت منك هذا العين بدين لك على على أنى متى قضيت الدين فهو لى“ (تمبین الحقائق ۱۸۳/۵) بیع و فاء یہ ہے کہ بیچنے والا خریدار سے یوں کہے کہ میں نے تم سے یہ سامان فروخت کیا تمہارے اس قرض کے عوض جو میرے ذمہ ہے اس شرط کے ساتھ کہ جب میں اس قرض کو واپس کر دوں تو یہ سامان میرا ہو جائے گا۔ جبکہ قاضی خاں نے یہ تعریف کی ہے: ”بعت منك بكذا على انى متى دفعت لك الثمن تدفع العين الى“ (البرازیلی علی ہاشم الفتاویٰ الہندیہ ۲۰۹/۳) کہ میں نے تم سے یہ سامان بیچا اس شرط کے ساتھ کہ میں جب بھی تم کو قیمت لوٹا دوں گا تو تم یہ سامان مجھے لوٹا دینا۔ اسی تعریف کو ابن نجیم مصری نے بھی اختیار کیا ہے۔ تعریفات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع و فاء کے احکام میں جو بھی اختلاف ہو؛ لیکن ایک بات متفق علیہ ہے کہ یہ معاملہ درحقیقت دو معاملوں سے مرکب ہے، یعنی اس کی ایک حیثیت بیع ہونے کی ہے، جبکہ دوسری حیثیت رہن ہونے کی ہے۔

بیع و فاء کے احکام اور ان کے دلائل:

بیع و فاء کے حکم میں فقہاء کے درمیان یہاں تک کہ ایک مسلک سے تعلق رکھنے والے فقہاء کے درمیان کافی اختلاف ہے، خاص طور پر امام اعظم کے مسلک کے فقہاء کے مابین یہ اختلاف زیادہ وسیع ہے۔ یہاں تک کہ مصنفین نے ان کے اقوال کی تعداد نو تک ذکر کی ہے۔ ان میں لفظی اختلافات کو اگر ترک کر دیا جائے؛ تو ان کی تعداد چار یا پانچ رہ جاتی ہے، فقہاء میں سے جن کی نظر میں رہن کا پہلو غالب نظر آیا انھوں نے اسے رہن قرار دیا اور اس پر رہن کے احکام کو جاری فرمایا اور جن حضرات نے اس میں بیع کے پہلو کو غالب محسوس کیا انھوں نے اسے بیع قرار دیا اور اس پر بیع کے احکام کو جاری کیا۔ اور کچھ علماء نے گذشتہ مروج تمام معاملات سے علاحدہ ایک مستقل معاملہ قرار دیا۔ کل ملا کر یہ معاملہ مجتہد فیہ ہے اور اس میں اختلاف

رائے کا ہونا فطری امر ہے۔

عدم جواز کے قائلین:

مالکیہ، متقدمین شافعیہ، حنابلہ اور متقدمین حنفیہ کا مسلک ہے کہ بیع و فاء فاسد ہے۔ اس کا سبب ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ بائع کی یہ شرط کہ جب وہ رقم لوٹا دے گا؛ تو اسے بیچا ہوا سامان واپس مل جائے۔ یہ بیع کے تقاضے اور اس کے حکم کے برخلاف ہے، جبکہ خریداری کے بعد وہ سامان دائمی طور پر خریدار کا ہو چکا ہے۔ لہذا اس شرط میں بائع کے لیے منفعت ہے اور کوئی متعین دلیل اس کے جواز پر وارد نہیں ہوئی ہے، لہذا بائع کی طرف سے لگائی ہوئی شرط، شرط فاسد قرار پائے گی۔ اور یہ شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جائے گی (موہب الجلیل ۲۷۲/۲، کشف القناع ۱۴۹/۳، فتاویٰ ابن حجر ہیتمی ۲۳۰/۲، مغنی المحتاج ۳۱۲/۲)، ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بیع و فاء کی مشابہت رہن سے بہت زیادہ ہے اور رہن رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت سے استدلال ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ”لا یغلق الرهن من صاحبه الذی رهنه له غنمه وعلیه غرمه“ (دارقطنی، نیل الاوطار ۱۰۳/۵) (نہیں روکا جائے گا رہن رکھنے والے کو اس کے سامان سے اسی کے لیے اس کے منافع ہیں اور وہی اس کے نقصان کا بھی ذمہ دار ہے)۔ اسی طرح یہ حدیث بھی کہ: ”کل قرض جر نفعاً فهو ربا“ کہ (ہر وہ قرض جس میں قرض لینے والے سے فائدہ حاصل کیا جائے وہ ربوا یعنی سود ہے)۔

جو حضرات ممانعت کے قائل ہیں؛ ان کے پیش نظر مذکورہ دلائل کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے: ”ما كان من شرط لیس فی کتاب اللہ فهو باطل“ (بخاری مع الفتح ۳۲۶/۵) (کہ آں حضور ﷺ نے ہر اس شرط کو باطل قرار دیا جو کتاب اللہ کے تقاضے کے خلاف ہو)۔ اور یہ بھی کہ: ”نہی النبی ﷺ عن بیع وشرط“ (معجم اوسط للطبرانی، علای زلیعی نے ابن قنطان سے نقل کیا کہ انھوں نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، نصب الراية ۱۸/۲) (کہ آنحضرت ﷺ نے بیع کو اس کے مغایر کسی شرط سے وابستہ کرنے سے منع فرمایا)۔ اس حدیث کے عموم اور احتیال ربوا، یعنی سود کو جائز کرنے کے لیے حیلہ سازی کے امکان کی وجہ سے انھوں نے ناجائز قرار دیا۔

جب قاضی علی سعیدی بخاری سے سمرقند آئے تو انھوں نے اس مسئلہ میں فتویٰ طلب کیا۔ سید امام ابو شجاع محمد نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میں نے امام قاضی ابوالحسن ماتریدی سے دریافت کیا کہ بیع و فاء کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ جو لوگوں کے درمیان تیزی سے رواج پارہی ہے؛ جبکہ شرعاً اس میں بڑی خرابیاں ہیں؛ آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ رہن کا معاملہ ہے اور میں بھی اسی رائے کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں؛ مناسب ہے کہ اس مسئلہ کے تعلق سے ہم امت کے ممتاز علماء اور ارباب فتویٰ کو جمع کریں اور اس سلسلہ میں کسی ایک رائے پر متفق ہو جائیں؛ اس پر انھوں نے فرمایا؛ موجودہ وقت میں ہمارا

فتویٰ ہی معتبر ہوگا اور یہ فتویٰ لوگوں کے درمیان مشہور بھی ہو چکا ہے؛ جو اس کی مخالفت کرتا ہے چاہیے کہ وہ سامنے آئے اور اپنی رائے پر دلیل قائم کرے (رد المحتار ۷/۵۴۶)۔

امام نجم الدین نسفی فرماتے ہیں کہ ”وہ بیع جس کو لوگوں نے ربوا کے حیلہ کے طور پر ایجاد کیا ہے اور اس کا نام انھوں نے بیع وفارکھا ہے، رہن ہے اور اس بیع میں فروخت شدہ چیز کی خریدار کے پاس ویسی ہی حیثیت ہوگی جیسی رہن کی ہوتی ہے گروی رکھنے والے کے پاس۔ نہ وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے، نہ بائع کی اجازت کے بغیر وہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے اور اگر بیع وفا کے طور پر بیچے ہوئے درخت سے مرہن کھالے؛ یا اس کو ضائع کر دے تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔ اور اگر مشتری کی زیادتی کے بغیر وہ چیز ہلاک ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوگا اور بائع کو بیچنی ہوئی چیز واپس لینے کا اختیار ہوگا؛ جب وہ اس کا قرض ادا کر دے۔ پھر فرمایا: ”لا فرق بینہ وبين الرهن فی حکم من الأحکام، لأن المتعاقدين وإن سمیا بیعا لکن غرضهما الرهن والاستيثاق بالدين۔ والعبرة فی التصرفات للمقاصد والمعانی لا للافاظ والمبانی“ (در الاحکام شرح غرر الاحکام ۷/۴۳۷) یعنی اس کے درمیان اور رہن کے درمیان کسی بھی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے کہ معاملہ کرتے وقت ان دونوں نے اگرچہ اس کا نام بیع رکھا ہے، لیکن ان کا مقصد رہن رکھنا ہے اور قرض کو مضبوطی فراہم کرنا ہے، جب کہ تصرفات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ کا نہیں۔ اسی قول کے مطابق سمرقند میں قاضی امام سعدی، حسن اور امام ابوشجاع اور دیگر بہت سے ائمہ کرام کا فتویٰ ہے (فتاویٰ ہندیہ ۳/۲۰۹)۔

جواز کے قائلین:

جب کہ متاخرین حنفیہ میں سے ایک جماعت اور متاخرین شافعیہ کے نزدیک بیع وفاجائز ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ یہ بیع کی ایسی شکل ہے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اس کے مطابق معاملہ کرتے ہیں۔ سود سے بچنے کے لیے۔ لہذا اسے درست قرار دیا جائے۔ اس میں شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوگی۔ اگرچہ یہ بیع قواعد کے خلاف ہے، لیکن لوگوں کے تعامل کی وجہ سے قواعد کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ عقد استصناع میں قواعد کو ترک کر دیا گیا (الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/۴۹۹) ان حضرات کے پیش نظر مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ معاملات کے سلسلہ میں جب تک ممانعت معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے کرنے کی اجازت ہوتی ہے (المعاملات طلق حتی يعلم المنع) اس کے علاوہ یہ قواعد مسلمہ بھی پیش نظر ہیں کہ: ”المشقة تجلب التيسير“ اور ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة او خاصة“ (الجلد ۱/۱)، لہذا عدم ممانعت اور عموم بلوی کی وجہ سے ان حضرات نے بیع وفاء کو جائز قرار دیا ہے۔ ملا خسرو (م ۵۸۵) فرماتے ہیں کہ ”مجموع النوازل“ میں ہے کہ ہمارے مشائخ حنفیہ اس زمانہ میں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ معاملہ درست ہے اور مکمل بیع ہے؛ جیسا کہ بعض سلف کا بھی یہی خیال تھا۔ اس لیے کہ معاملہ کرنے والوں نے بیع کا

لفظ استعمال کیا ہے اور اس میں کسی شرط کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ واضح طور پر ذکر کردہ الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ بغیر تلفظ کے پوشیدہ مقصود کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی خاتون سے نکاح کرتا ہے؛ لیکن دل میں یہ چھپائے ہوئے ہے کہ وہ جماع کے بعد اسے طلاق دے دیگا؛ تو اس کی نیت معتبر نہ ہوگی؛ بلکہ اس کا نکاح درست ہو جائے گا (در الحکام ۶/۲۷۶)۔

اس سلسلہ میں ایک قول امام قاضی خاں کا ہے جو قول جواز کے قریب تر ہے: ”الصحيح أنه إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا، بل يكون بيعاً؛ لأن كل منهما عقد مستقل شرعاً لكل منهما أحكام مستقلة“ کہ صحیح یہ ہے کہ اگر بیع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تو وہ رہن نہیں ہوگا؛ بلکہ وہ بیع ہی قرار پائے گا، اس لیے کہ بیع اور رہن دونوں الگ الگ معاملے ہیں اور دونوں کے احکام جدا گانہ ہیں۔ قاضی خاں مزید فرماتے ہیں کہ اگر ان دونوں نے بیع کا معاملہ کیا بغیر شرط کے۔ پھر از روئے وعدہ قرض کی ادائیگی پر سامان واپسی کا تذکرہ کر دیا تو بیع درست ہوگی اور وعدہ کا پورا کرنا ضروری ہوگا، اس قول کا سبب یہ ہے کہ وعدہ کا پورا کرنا بھی شرعاً واجب ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”العدة دين“۔ کہ وعدہ انسان کے ذمہ قرض ہے (فتاویٰ قاضی خاں علی ہاشم الحدید ۱۶۵/۲) گویا یہ معاملہ تو بیع صحیح کا ہے؛ لیکن تعلق کی شکل میں جو وعدہ کیا گیا ہے اس وعدہ کا وفا کرنا لازمی ہے۔ قاضی خاں کے اس قول سے مالکی فقیہ خطاب کا یہ قول قریب تر ہے: ”قال فی معین الحکام: ویجوز للمشتري أن يتطوع للبائع بعد العقد، بأنه إن جاء بالثمن إلى أجل كذا، فالمبيع له ويلزم المشتري متى جاءه بالثمن في خلال الأجل أو عند انقضائه أو بعده على القرب منه“ (تحریر الکلام فی مسائل الالتزام) یعنی مشتری کے لیے درست ہے کہ وہ بائع کے لیے خوش دلی سے اس بات پر تیار ہو جائے کہ جب وہ ایک مقررہ مدت تک ثمن کو ادا کر دے گا تو وہ اسے بیع واپس کر دے گا۔

”فتاویٰ بزازیہ“ میں اس سلسلہ میں علماء کے اقوال ذکر کرنے کے بعد ان میں سے ایک جامع قول کو ذکر کیا ہے؛ جس کو بعض اہل علم نے خاص طور پر فتویٰ کے لیے پسند کیا ہے۔ وہ یہ کہ بیع و فاء بعض احکام کے لحاظ سے درست ہے؛ لہذا اس سے حاصل ہونے والے منافع درست ہوں گے اور اس سے انتفاع درست ہوگا۔ بعض احکام کے لحاظ سے بیع فاسد ہے، لہذا متعاقدین میں سے ہر ایک کو اسے فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ علامہ شامی ابن نجیم سے نقل فرماتے ہیں اسی قول جامع پر فتویٰ دیا جائے۔

جبکہ بعض احکام کے لحاظ سے وہ رہن ہے۔ لہذا مشتری اس سامان کو دوسروں سے بیچ نہیں سکتا ہے۔ نہ رہن رکھ سکتا ہے۔ گویا وہ زراف کی طرح تین معاملات سے مرکب ہے۔ بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن۔ جس طرح زراف میں اونٹ، گائے اور چیتا تینوں کی صفت ہوتی ہے، علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں کہ اس جامع قول سے فتویٰ دینے میں اعراض نہ کیا جائے، جبکہ عمل ہمارے دیار، یعنی مصر میں اس قول پر ہے جسے امام زیلیعی نے ترجیح دی ہے۔ امام زیلیعی فرماتے ہیں: وہ بیع صحیح ہے اور بیع کے

بعض احکام بھی اس پر جاری ہوں گے۔ یعنی اس سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا، لیکن وہ اس کو بیچ نہیں سکتا ہے۔ اسی پر فتویٰ بھی ہے (ردالمحتار ۷/۵۴۶)۔

علامہ سمرقند صاحب منظومہ نجم الدین نسفی (م ۱۰۷۰ء) فرماتے ہیں کہ: موجودہ زمانے کے مشائخ اس کے بیچ صحیح ہونے پر اور اس پر بیچ کے بعض احکام کے جاری ہونے کے جواز پر متفق ہیں؛ یہی رائے بعض سلف کی بھی ہے۔ اور اسے لوگوں کی حاجتوں کی وجہ سے بیچ صحیح قرار دیا گیا، اور اسی وجہ سے آڈر اور اڈوانس دیکر سامان بنوانے (جسے اصطلاح میں استصناع یا سلم کہتے ہیں) کو جائز قرار دیا گیا۔ صاحب ”نہایہ“ کہتے ہیں کہ اسی پر فتویٰ ہے۔ اس قول کی بنیاد اس امر پر ہے کہ فریقین نے بیچ کے لفظ کا تلفظ کیا ہے۔ اور شرعاً اعتبار الفاظ کا ہوتا ہے، الفاظ کے بغیر نیت کا نہیں؛ الفاظ کے بغیر محض نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔

متاخرین شافعیہ میں سے ”بغیۃ المسترشدین“ کے مصنف تحریر فرماتے ہیں: ”بیع العہدۃ صحیح جائز و تثبت بہ الحجۃ شرعاً و عرفاً علی قول القائلین بہ، ولم أر من صرح بکراہتہ و قد جرى علیہ العمل فی غالب جہات المسلمین من زمن قديم و حکمت بمقتضاه الحکام“ (۱۲۳) کہ بیچ عہدہ (وفا) درست ہے اور جائز ہے اور اس سے شرعاً اور عرفاً حجت ثابت ہوتی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس کے قائل ہیں اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کے مکروہ ہونے کی صراحت کی ہو۔ اور اس کے جواز پر ہی عمل ہو رہا ہے مسلمانوں کے زیادہ تر علاقوں میں قدیم زمانے سے اور حکام اسی کے مطابق فیصلے کرتے آرہے ہیں۔

بیچ و فاکے سلسلہ میں رائج قول:

بیچ و فاکے جواز یا عدم جواز کے درمیان قول رائج کیا ہے۔ علامہ علی حیدر نے اس کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ: بیچ و فا میں اگرچہ نواقوال ہیں، لیکن ان سب میں رائج قول وہ ہے جسے ”مجلۃ الاحکام العدلیہ“ میں ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ بیچ و فابیع جائز کے حکم میں ہے، لہذا خریدار کے لیے خریدی ہوئی چیز سے استفادہ کرنے اور نفع حاصل کرنے کی مکمل اجازت ہوگی (اس کے لیے الگ سے اجازت دینا لازمی نہیں ہوگا، بلکہ یہ اس عقد کا تقاضہ ہوگا)۔ اور بیچ و فابیع فاسد کے حکم میں ہے، اس لحاظ سے کہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو اسے فسخ کرنے کا اختیار ہوگا جب چاہیں اور اپنی دی ہوئی قیمت یا سامان واپس لے لیں۔ اور بیچ و فابیع کا حکم رکھتا ہے اس لحاظ سے کہ خریدار سے کسی اور سے نہیں بیچ سکتا ہے، بہر حال رہن سے بیچ و فاکے مشابہت زیادہ واضح اور رائج ہے (شرح المجلۃ ۲/۴۳۱)۔

اس رہن رکھی ہوئی چیز کو اگر وہ کسی اور کے پاس رہن رکھنا چاہے تو یہ بھی درست نہ ہوگا۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: ”إن المشتري و فاء لا يجوز له بیع المبیع ولا رهنه“ (ردالمحتار ۷/۲۴۷) شروع کے طویل علمی و نظریاتی اختلافات

کے بعد یہی رائے فقہاء حنفیہ کی آخری رائے ہے اور فتویٰ کے لیے پسندیدہ ہے۔ اسی پر سلطنت عثمانیہ اور اس کے زیر نگیں علاقوں میں عمل رہا ہے (الفقہ الاسلامی فی ثوبہ الجدید ۴ فقرہ ۱۵۱) تقریباً اسی قول کو ہندستان کے ممتاز اہل تحقیق مولانا اشرف علی تھانوی اور مفتی محمد شفیع عثمانی وغیرہ نے بھی راجح قرار دیا ہے (دیکھیے امداد الفتاویٰ ۱۰۶۳ اور امداد المفتیین ۲/۸۳۸)۔

حیلہ کی شرعی حیثیت:

گزشتہ مباحث سے ایک بات ظاہر ہے کہ جن حضرات نے بیع و فاء کو ناجائز قرار دیا ہے؛ انھوں نے اس کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں سود سے بچنے کا حیلہ کیا گیا ہے، لہذا اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ حیلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ علامہ آلوسی نے آیت کریمہ: ”فاضرب به ولا تحنت“ (سورہ ص ۴۴) کے ذیل میں تحریر فرمایا کہ ہر حیلہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ وہ حیلہ ممنوع ہے جس سے کوئی شرعی حکمت و مصلحت فوت ہو جائے، جیسے زکوٰۃ کو ساقط کرنے کے لیے حیلہ کرنا یا فرائض کو ساقط کرنے کے لیے حیلہ کرنا؛ لیکن اگر انسان حیلہ اس لیے کرتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ ناجائز کے حدود جواز تک پہنچے اور اپنے آپ کو پریشانیوں سے بچائے اور دوسروں کو بھی مصیبتوں سے محفوظ رکھے؛ تو اس طرح کے حیلہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علامہ سرخسی کتاب الحیل میں لکھتے ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ جس کے ذریعہ انسان حرام سے بیع کر حلال کا راستہ اختیار کرے؛ تو اس طرح کا حیلہ کرنا بہتر ہے؛ حیلہ کرنا اس وقت مکروہ ہے جب کہ اس کے ذریعہ کسی کا حق مار لے، یا کسی باطل کو درست بنانے کی کوشش کرے یا راہ حق میں شبہ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور مذکورہ آیت حیلہ کے جواز پر مضبوط دلیل ہے اس لیے کہ اس میں منجانب اللہ حیلہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف کے واقعہ میں آیت کریمہ: ”فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية في رحل أخيه“ (یوسف ۷۰)، ہمیں حیلہ جائزہ کے بارے میں خبر دیتی ہے۔ حیلہ کے جواز کی سب سے مضبوط دلیل صحیحین کی وہ روایت ہے جو ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے کہ حضرت ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنایا تو وہ اچھی کھجوریں لے کر مدینہ منورہ آیا حضور نے دریافت کیا کہ کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؛ تو اس شخص نے کہا کہ بیشک ہم دو صاع دے کر ایک صاع لیتے ہیں اور تین صاع دے کر دو صاع لیتے ہیں، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرو، بلکہ سب گھٹیا کھجور کو دراہم کے عوض بیچ دو پھر دراہم سے اعلیٰ قسم کی کھجور خرید لو (بخاری و مسلم)۔

مذکورہ اصولی مباحث سے سوالنامہ میں درج زیادہ تر سوالات کے جوابات خود بخود واضح ہو گئے۔ مزید وضاحت

کے لیے ترتیب وار جوابات درج کیے جا رہے ہیں:

(۱) یہ معاملہ جو بیع وفا کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ منعقد ہو رہا ہے؛ حنفیہ کی آخری رائے اور قول جامع کے مطابق بیع وفا کا یہ معاملہ شرعاً منعقد اور درست ہے۔ یہ حکماً بیع تو ہے؛ لیکن بیع کے تمام احکام نہیں جاری ہوں گے۔ محض اس لحاظ سے یہ بیع ہے کہ اس کے منافع کا استعمال مشتری کے لیے درست ہے۔ دیگر معاملات میں یہ رہن کے مماثل ہے۔

(الف) چونکہ بیع و فاء محض اس لحاظ سے بیع ہے کہ اس کے تمام منافع کے استعمال کی اجازت مشتری کے لیے ہے، بیچی ہوئی چیز کا مالک درحقیقت بائع ہے۔ لہذا کسی سے نہ بچنے کی شرط لگانا متاخرین حنفیہ کی رائے پر درست ہے اور اسی شرط کی وجہ سے اسے بیع وفا کہتے ہیں، ورنہ اسے مطلق بیع قرار دیا جاتا۔ علامہ شامی فرماتے ہیں: ”الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه“ (الشامیہ ۵۳۶/۷) (ان المشتري با لوفاً لا يملك رقبة المبيع بل منافعه فقط، فالمبيع باق على ملك البائع، مصطفى زرقاء، مجلة الجمع ۱۳۱/۷)۔

(ب) مالک اول کو واپس لوٹانے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی کا مطالبہ کرنا مشتری کے لیے درست ہوگا۔ ہاں اگر ازراہ تبرع مالک اول اسے کچھ مزید دے دے تو وہ زائد رقم اس کے لیے درست ہوگی۔

(ج) خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا، اس لیے کہ بیع وفا کے عنوان سے یہ معاملہ منافع سے انتفاع کے لیے ہی منعقد ہوا ہے اور مالک کی طرف سے اسے نفع اندوز ہونے کا مکمل اختیار ہے۔ ورنہ یہ بیع وفائی نہیں؛ بلکہ رہن کا معاملہ ہوتا۔ گویا مالک نے بیع وفا کا معاملہ مکمل کرنے کے ساتھ ہی اس سامان کے تمام منافع کا مالک خریدار کو بنا دیا۔ اور رہن کی واپسی پر اسے سامان کو واپس کرنے کا پابند کیا۔ علماء نے صراحت کی ہے کہ اس بات کی اجازت ہے کہ طرفین بیع و فاء میں اس بات پر متفق ہو جائیں کہ بائع مشتری سے بیچی ہوئی زمین یا مکان کرایہ پر لے اور مشتری کو اس کا متعین کرایہ ادا کرے، تو اس صورت میں وہ زمین یا مکان مالک کے پاس کرایہ کے طور پر ہوگا۔ اور وہ اس کا کرایہ مشتری کو ادا کرے گا۔ اس لیے کہ بیع کے منافع خریدار کی ملکیت ہیں؛ تو اسے اختیار ہے کہ وہ از خود اسے استعمال کرے، یا کسی کو کرایہ پر دے کر اس سے آمدنی حاصل کرے۔ جب وہ مالک اول کو کرایہ پر دے گا؛ تو اس معاملہ کو بیع استعمال کہتے ہیں: ”الأحكام التي يختلفان فيها إذا أجز المشتري المبيع و فاء بعد القبض للبائع صح ولزمته الأجرة“ (در الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۱۳۸/۲) یعنی وہ احکام جس میں بیع وفا اور رہن میں فرق ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خریدار خریدے ہوئے سامان کو قبضہ کرنے کے بعد بیچنے والے کو کرایہ پر دے تو کرایہ پر دینا درست ہوگا اور کرایہ کی ادائیگی لازمی ہوگی۔ جامع الفصول میں ہے: ”لو أجز المشتري المبيع با لوفاً وقبض أجرته واستهلكها بدون إذن البائع لا يضمن“۔ شامیہ میں ہے: ”ومن جوز جواز الإجارة من البائع وغيره وأوجب الأجرة“ (۵۳۸/۷)۔

(الف) چونکہ وہ من کل الوجوه رہن نہیں ہے، اس لیے جب تک وہ خریدار کے پاس ہے اس کے لیے اس کے منافع سے استفادہ کرنا درست ہوگا۔

(ب) چونکہ یہ معاملہ بھی مروج ہے اور مفضی الی النزاع نہیں ہے، اس لیے اگر طرفین کی رضامندی سے یہ معاملہ

طے ہو جائے تو درست ہوگا۔

(ج) بیع وفا کے ذریعے خریدی ہوئی چیز سے خریدار ہر طرح کاشت اور اجارہ داری کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ”صحیح فی حق بعض الأحکام کحل الإنزال و منافع البیع“ (شامیہ ۵۴۶/۷)۔
 (د) جب وہ اپنے بعض احکام کے لحاظ سے رہن کے حکم میں ہے تو خریدار کے لیے کوئی ایسا تصرف درست نہ ہوگا جو اس کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل کر دے مثلاً وہ اسے کسی اور شخص سے کم یا زیادہ کسی قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا ہے، اسی طرح اسے ہبہ اور گفٹ بھی نہیں کر سکتا ہے، ”ورهن فی حق البعض حتی لایملک المشتري بیعه من آخر و لارهنه“ (ابن عابدین ۵۴۶/۷)، علماء نے جو اسے بیع صحیح کا حکم دیا ہے وہ محض منفعت کی ملکیت کے لیے عین کی ملکیت کے لیے نہیں۔ لہذا اس سامان پر تو بائع کی ملکیت ہی باقی رہے گی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں وفاء کی شرط سب سے اہم ہے؛ لہذا اس شرط کی پابندی کرنا مشتری کے لیے بھی ضروری ہے، اسی شرط نے اس معاملہ کو مطلق بیع اور مطلق رہن سے ممتاز کیا ہے۔

(۳) اس کی حیثیت امانت اور ضمانت کی ہوگی اور اس کی وجہ سے کرایہ کی کمی کو قرض پر فائدہ اٹھانا نہیں سمجھا جائے۔ قبل میں یہ بات آچکی ہے کہ بیع وفا کو بعض فقہاء بیع امانت بھی کہتے ہیں؛ جس سے اس کے امانت ہونے کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ بیع وفا کے تعلق سے جو اختلافات ہیں؛ وہ اس صورت میں ہیں، جبکہ وعدہ وفا کرنے کی شرط صلب عقد، یعنی معاملہ کے اندر ہو۔ لیکن اگر وعدہ وفا کرنے اور بائع سے سامان فروخت کرنے کی شرط الگ سے ہو؛ تو زیادہ تر فقہاء کے نزدیک وہ بیع درست ہوگی اور اس وعدہ کی تکمیل بھی ضروری ہوگی۔ جسے مالکیہ کے یہاں التزام کہا جاتا ہے اور دیناً اس کی تکمیل تو تمام فقہاء کے نزدیک ضروری ہے اور حنفیہ کے نزدیک بعض صورتوں میں قضاء اُ بھی ضروری ہوتی ہے، لہذا مناسب ہوگا کہ اختلافات سے بچنے کے لیے بیع وفا کی ایسی شکل کو رواج دیا جائے جس میں واپسی کی شرط کا تذکرہ بذات خود بیع میں نہ کیا جائے؛ بلکہ الگ سے بعد میں یا پہلے ایسی شرطیں ذکر کی جائیں تاکہ تمام فقہاء کی رائے میں وہ صحیح اور درست معاملہ بن جائے۔

بیع وفا - حقیقت و احکام

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی ☆

بیع و فاء کے سلسلے میں فقہاء کی آراء:

بیع وفا کے حکم کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے، قدر مشترک یہ ہے کہ ضرورت و عرف کی بنا پر جائز ہے، لیکن حکماً بیع صحیح ہے، بیع فاسد ہے، رہن ہے، یا تینوں سے مرکب ہے ہر قول کے قائلین ہیں، علامہ ابن نجیم نے سارے اقوال اور ان کے قائلین کا احاطہ کیا، تو آٹھ اقوال ہو گئے، ذیل کی سطور میں ان چند رایوں کو پیش کیا جا رہا ہے، جن کا مفتی بہ ہونا مصرح ہے۔

۱- حقیقت میں ”رہن“ ہے، خواہ ابتداء میں بیع کی شکل ہی رہی ہو، اس لئے کہ وفا کی شرط ہے جو کہ مقتضائے عقد کے خلاف ہے، اس لئے بیع تو فاسد ہوگئی، اب دین یا قرض کے عوض میں رہن باقی رہا، اس پر سارے ہی احکام رہن کے مرتب ہوں گے۔

”البيع الذي تعارف أهل زماننا احتيالا للربا بيع الوفاء هو في الحقيقة رهن، وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن..... وعليه فتوى السيد أبي شجاع السمرقندی، وفتوى القاضي علي السغدوي ببخارى وكثير من الائمة على هذا كذا في المحيط“ (ہندیہ ۲۰۹۳، کتاب البیوع الباب العشر ون فی البیاعات المکروہۃ والارباح)۔

(ربا سے بچنے کے لئے حیلہ کے طور پر ہمارے زمانے کے لوگوں کے مابین جو عقد بیع الوفا کے نام سے معروف ہے حقیقت میں رہن ہے، اور بیع، مشتری کے قبضہ میں رہن کی طرح ہے، اسی پر سید ابوشجاع سمرقندی، بخاری کے قاضی سغدی کا فتویٰ ہے، اور بہت سے ائمہ کی رائے یہی ہے، جیسا کہ ”محیط“ میں ہے، امام حسن ماتریدی کا تو اس پر اصرار علامہ شامی نے نقل کیا ہے (شامی ۵۳۶/۷ کتاب البیوع، باب الصرف)۔

”فتاویٰ محمودیہ“ میں مفتی محمود نے متعدد فتاویٰ میں رہن ہونے کا رجحان ظاہر کیا ہے (فتاویٰ محمودیہ ترتیب قدیم: ۲۴۱/۲)۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ بعض احکام میں بیع صحیح ہے، البتہ مشروط ہونے کی بنا پر کئے ہوئے وعدہ کو یا شرط کو پورا کرنا ضروری ہے۔

”وقیل: بیع یفید الانتفاع به هذا محتمل لأحد قولین: الاول: أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی الاکراه: وعلیه الفتوی“ (شامی ۵/۲۶۷، کتاب البیوع، باب الصرف)۔ کہا گیا ہے کہ بیع ہے اس سے انتفاع کا فائدہ ہوگا، یہ دو قول میں سے ایک قول کا احتمال رکھتا ہے، اول یہ ہے کہ اس سے انتفاع کے حلال ہونے جیسے بعض احکام میں بیع صحیح ہے، لیکن دوسرے سے بیع نہیں کر سکتا، علامہ زیلعی نے کتاب الاکراه میں کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ بیع صحیح تو ہے، لیکن ایسی بیع نہیں ہے جو قطعی و یقینی اور لازم ہو۔

۳- صاحب ہدایہ وغیرہ نے بیع غیر صحیح قرار دے کر بیع المکرہ کا درجہ دیا ہے، یعنی مشتری کو دوسرے سے بیچنے کی اجازت نہیں، اگر مشتری اس سے انتفاع کرتا ہے تو بیع فاسد میں زوائد سے انتفاع کی طرح ہے، یعنی وہ ضامن ہوگا، اور اگر زوائد ہلاک ہو جائے تو شئی مغضوب کی طرح ہوگا اور ضمان نہیں آئے گا، صاحب بحر پوری تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اختاره صاحب الهدایہ و اولاده ومشائخ زماننا، وعلیه الفتوی“ (المحررات ۸/۶، کتاب البیوع، باب

خیار الشرط)۔

صاحب ہدایہ، ان کی اولاد، اور ہمارے زمانے کے مشائخ کا مختار مسلک ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔

۴- بیع فاسد، بیع صحیح اور رہن سے مرکب ایک عقد ہے: ”الثانی: القول الجامع لبعض المحققین أنه فاسد

في حق بعض الأحكام حتی ملک کل منهما الفسخ، صحیح فی حق بعض الأحكام كحل الإنزال و منافع المبیع، و رهن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة“ (شامی ۵/۲۶۷، کتاب البیوع، باب الصرف)۔

بعض محققین کا قول جامع ہے کہ بعض احکام میں فاسد ہے، یہاں تک کہ بائع و مشتری میں سے ہر ایک کو فسخ کا حق ہے، اور بعض احکام میں بیع صحیح ہے جیسے کہ منافع سے انتفاع کی حالت میں، نیز بعض احکام کے حق میں رہن ہے حتی کہ مشتری کو دوسرے سے بیچنے یا رہن رکھنے کا حق نہیں ہے، وغیرہ ذلک

علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: ”وینبغي أن لا يعدل فی الإفناء عن القول الجامع“ (المحررات ۸/۶، کتاب البیوع،

باب خیار الشرط)۔

(مناسب ہے کہ فتویٰ دینے میں ”قول جامع“ سے عدول نہ کیا جائے)۔

۵- قاضی خاں نے تھوڑی تفصیل کی ہے کہ اگر لفظ بیع سے یہ عقد ہوا ہے تو رہن نہیں ہو سکتا، بلکہ بیع ہی ہے، ہاں اگر صلب عقد میں شرط و فایا بیع کی شرط ہے تو بیع فاسد ہے، اس کے احکام ہی اس پر مرتب ہوں گے، اگر صلب عقد میں شرط نہیں ہے تو وہ ”بیع صحیح لازم“ ہے، البتہ اگر وہ وعدہ کیا ہے کہ واپس کر دیں گے تو وعدے کو نبھانا ضروری ہے، ”ولزم الوفاء وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا“ (المحررات ۸/۶، کتاب البیوع، خیار الشرط)۔

وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہے، کبھی کبھی لوگوں کی حاجت کی خاطر رہا سے بچنے کے لئے وعدہ لازم ہو جاتا ہے، گو یا کہ قاضی خاں نے محض لفظ کا لحاظ کر کے اس کو رہن سے خارج کر دیا، جبکہ رہن یا عقود الفاظ پر نہیں معانی پر منحصر ہوتے ہیں، ”ہندیہ“ میں خاص طور پر رہن کے باب میں صراحت موجود ہے: (دیکھئے: ہندیہ ۴۳۲/۵، کتاب رہن الفصل الاول فی تفسیر رہن)۔ بہر حال رہن کا لفظ تو یہ شرط نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی چیز درہم میں خریدی اور بائع کو کوئی کپڑا دیا اور کہا کہ اس کپڑے کو اپنے پاس رکھو تا آنکہ میں ثمن ادا کر دوں تو کپڑا رہن ہوگا، اس لئے کہ معنی عقد کو اس نے ادا کر دیا، عقود کے باب میں اعتبار معانی ہی کا ہے۔

۶- بعض حضرات نے مشتری کے حق میں بیع صحیح، لیکن بائع کے حق میں رہن مانا ہے، لہذا مشتری کے لئے انتفاع کی گنجائش ہوگی، لیکن بائع جب رہن کو واپس کر دے تو بیع کو واپس کرنا بھی ضروری ہوگا (المحررات ۸/۶، کتاب البیوع، خیار الشرط)۔

ان مختلف نقطہ ہائے نظر میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے کہ مشتری کو یہ حق نہیں کہ دوسرے سے بیع کر دے، یا دوسرے کو رہن کے طور پر دے دے، خواہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ رہن کے حکم میں ہے، یا یہ وجہ ہے کہ وعدہ کیا ہے، جس کو نبھانا اس صورت میں ضروری ہے۔

ہاں مشتری کے لئے اس سے انتفاع کرنا جائز ہے یا نہیں، جو حضرات مرکب یا بیع صحیح مانتے ہیں وہ یقیناً اجازت دیتے ہیں کہ مشتری انتفاع کرے، لیکن جو لوگ رہن یا بیع فاسد باور کرتے ہیں، وہ انتفاع کا حق نہیں دیتے ہیں۔ یہ معاملہ شرعاً درست ہے:

لہذا اس سے یہ خلجان ختم ہو جاتا ہے کہ ایسا مشروط عقد جائز ہے یا نہیں، اس لئے کہ جواز کی حد تک تو ضرورت یا عرف کی بنا پر اتفاق رائے پایا جا رہا ہے، البتہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ یہ بیع ہے یا رہن، اگر بیع مانا جائے تو کیا مشتری کے لئے جائز ہے کہ عام بیوع کی طرح اس کے ساتھ بھی معاملہ کرے، اور اگر بیچنا چاہے تو بائع اول کے بجائے کسی دوسرے سے معاملہ کرے۔

دوسرے سے بیچنا جائز نہیں:

بیع کے قائلین بھی مانتے ہیں کہ بیع کے جملہ حقوق اس سے متعلق نہیں ہوں گے، لہذا دوسرے سے بیچنے کی اجازت

یہ لوگ بھی دیتے ہیں، لیکن بائع اول کے علاوہ دوسرے سے بیچنے کو منع کرتے ہیں۔

”انہ بیع صحیح باتفاق مشائخ الزمان للعرف وما یفعله البائع من التعمیر و أداء الخراج فہو بطریق الرضا لا الجبر..... و ذکر الزیلعی: أن الفتوی علی أنه بیع جائز مفید بعض احکامہ من حل الانتفاع إلا أنه..... لا یملک بیعہ للغير“ (البحر الرائق ۶/۷، کتاب البیوع، باب خيار الشرط)۔

یہ بیع صحیح ہے، علماء عصر کا، عرف کی وجہ سے اتفاق ہے، نیز بائع جو آباد کاری، اور ادائے خراج کرتا ہے وہ رضا کارانہ ہے، نہ کہ زور زبردستی سے، علامہ زیلعی فرماتے ہیں کہ فتویٰ اس پر ہے کہ بیع جائز ہے، بعض احکام مثلاً انتفاع کی حلت کے حق میں مفید ہے، لیکن دوسرے سے بیع کا اختیار نہیں ہے۔

اسی مقام پر اس کی صراحت ہے کہ مشتری کو ثمن کے مطالبہ کا حق ہے، اگر بیع عین ہے اور ہلاک ہو جائے تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ بائع کے علاوہ سے بیچ کر مشتری کے لئے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔
دوسرے سے بیچنے کا حکم:

لیکن اگر دوسرے سے بیچ دیا تو بائع کو حق ہے کہ بیع فسخ کر دے، اس لئے کہ ضرورت کی وجہ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنا لازم ہے، ”وقد یلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا“۔

زائد ثمن کا مطالبہ اور اس بیع سے انتفاع:

اس سے اس نکتہ کو بھی حل کیا جاسکتا ہے کہ بیع بھی بعض احکام میں ہے، اس لئے زائد قیمت کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہوگا، ہاں اس نقطہ نظر میں بیع سے انتفاع کا حق ہوگا، اگر اس کو خالص رہن مانا جائے تو کہا جائے گا:

بیع سے انتفاع کا حق:

چونکہ یہ رہن کے حکم میں اس لئے اس سے انتفاع کی اجازت مشتری کو نہیں دی جائے گی، راجح قول کے مطابق تو رہن، یعنی بائع کی اجازت سے بھی اس سے انتفاع کی گنجائش نہیں نکلتی ہے، علامہ شامی رقم طراز ہیں:

”عن عبد الله بن محمد بن أسلم السمرقندی و كان من كبار علماء سمرقند: أنه لا يحل له أن ينفع بشئ منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه إذن في الربا، لأنه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً“ (شامی ۷/۳۹۵، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولية، مطلب فی کل قرض جرنفا)۔

(عبداللہ بن محمد بن اسلم سمرقندی سے منقول ہے، وہ علمائے سمرقند میں سے بڑے عالم تھے، کہ شی مرہون سے کسی بھی صورت میں انتفاع جائز نہیں ہے، اگرچہ رہن اجازت دے، اس لئے کہ یہ ربا کی اجازت ہے، کیونکہ وہ تو اپنا دین مکمل

وصول کرے گا تو منفعت اس کے لئے مزید باقی رہے گی۔

علامہ شامی نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ معتبرات کے نقول کے خلاف ہے، کیونکہ راہن کی اجازت سے مرہون سے انتفاع درست ہے، ممکن ہے یہ حکم قضاء ہو، اور سمرقندی نے جو بات کہی ہے وہ دیا تہ، یا پھر شرط لگانے کی صورت میں ہو۔

اگر خریدار کرایہ ادا کرے:

اگر مشتری مکان میں رہنے کے عوض کرایہ ادا کرتا ہے تو رہن باطل ہو جائے گا، ”أما الإجارة فالمستأجر إن كان هو المورثين وجدد القبض للإجارة..... بطل الرهن والأجرة للراهن“ (شامی ۱۰/۱۳۰، کتاب الرهن، باب التصرف فی الرهن) بہر حال اجارہ تو مستاجر اگر مرہن ہو اور اجارہ کے لئے قبضہ کی تجدید کر لی تو رہن باطل ہوگا، اور اجرت راہن کو ملے گی۔

لہذا بائع کو اجرت ملے گی، لیکن معاملہ یہاں چونکہ قرض کا ہے، اس لئے اجرت مثل سے کم رہا و سود میں شمار ہوگی، اور ”کل قرض جرنفعاً فهو ربا“ کا مصداق ہوگی، اس لئے مروجہ کرایہ سے کم دینا جائز نہیں ہوگا۔
خریدار کے لئے انتفاع:

بائع کی اجازت کے بغیر مشتری کے لئے بیع سے انتفاع بالکل جائز نہیں، خواہ شکل اجارہ داری کی ہو یا کاشتکاری کی، سارے منافع بائع کے لئے ہوں گے، حتیٰ کہ اگر بائع کی طرف سے اجازت بھی ہو تو راجح یہی ہے کہ سارے منافع کا مالک بائع ہے، نہ کہ مشتری، دیکھئے: (شامی ۷/۵۲۹، کتاب البیوع، باب الصرف، مطلب: باع دراہ و فاء ثم استاجر)۔
خریدار اس کو دوسرے سے بیچ نہیں سکتا:

رہن کے سارے احکام اس پر نافذ ہوں گے، لہذا اس وقت تک دوسرے سے بیچنا جائز نہیں ہوگا جب تک کہ قرض ملنے کی امید ہے، امید منقطع ہونے پر شی مرہون سے استیفاء ہوتا ہے، یہاں بھی معاملہ ایسا ہی ہوگا۔

”قال في الخيرية: والذي وعليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من

الأحكام“ (شامی ۷/۵۲۶، کتاب البیوع، باب الصرف، بیع الوفاء)۔

(خیر یہ میں ہے: جس پر اکثر حضرات ہیں یہ ہے کہ یہ رہن ہے، کسی بھی حکم میں رہن سے الگ نہیں ہے)۔
بہر حال یہ مختلف آراء ہوں، ہر رائے کے مطابق مسائل کی تخریج کی نوعیت الگ ہوگی، لیکن محل غور ہے کہ جن حضرات نے اس کو رہن کہا ہے ان کے پیش نظر کیا ہے، راقم کا خیال ہے کہ بیع کا معاملہ ماننے کی صورت میں ان کو یہ مشکل

پیش آرہی ہے کہ بیع مقتضائے عقد کے خلاف شرط سے فاسد ہو جایا کرتی ہے، یہاں بھی ”وفاء“ کی شرط کے ساتھ ہی معاملہ مشروط ہے، جس میں بائع کا فائدہ بھی ہے، اس لئے بیع کا معاملہ تو فاسد ہو گیا، لیکن صلب عقد میں واپسی کی شرط ہے جو رہن کے مشابہ ہے، اس لئے رہن ماننے کی مجبوری ہے۔

لیکن یہاں رک کر یہ بھی غور کرنا ہوگا کہ فقہاء نے بعض ایسی شرطوں کا استثناء بھی کیا ہے جن میں عاقدین کا فائدہ ہوتا ہے، مگر عرف عام کے تحت آتی ہیں، اہل معاملات کے مابین اس شرط کا رواج ہو گیا ہو، جس کی مثال میں موچی سے چمڑا خرید کر جوتے بنانا، اسی طرح آج کل فری سروس وغیرہ پیش کی جاتی ہے، اس لئے بیع وفاء میں بھی عرف و عادت کا لحاظ کر کے شرط کو اس درجہ میں ہی اتار کر بیع کو فاسد قرار نہ دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ گنجائش ہو۔

اسی طرح جن حضرات نے اس کو بیع قرار دیا ہے انہوں نے بھی بیع کے جملہ حقوق کو نافذ نہیں کیا ہے، بلکہ شرط کے مطابق محض اس وجہ سے کہ بعض وعدوں کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے، مخصوص استثناء بھی کیا ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ مشتری کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔

نیز یہ سب اس لئے کیا جا رہا ہے کہ معاملہ کا انعقاد لفظ ”بیع“ سے ہوا ہے، جبکہ معاملات میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔

اس لئے بیع مانیں یا رہن دونوں اپنے پورے اثرات کے ساتھ نافذ نہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ رائے اختیار کی جائے جس کی ترجمانی علامہ ابن کجیم کر رہے ہیں، یعنی یہ بیع و رہن سے مرکب ایک عقد ہے، بعض معاملات میں بیع ہے، تاکہ اس سے انتفاع کا دروازہ کھلا رہے، اور بعض معاملات میں رہن ہے، تاکہ مشتری کو ایسا اختیار نہ ہو جو کہ بائع کے لئے مضر ہو، نیز شریعت میں اس کی ایسی نظیر موجود ہے جہاں دو حکموں کو ایک کر دیا گیا ہے، حالت مرض میں ہبہ، وہ وصیت بھی ہے اور ہبہ بھی، اسی طرح بیع بالعوض بعض معاملات میں بیع کا حکم رکھتا ہے، جبکہ بعض معاملات میں ہبہ کا، اسی لئے منتفع کا لزوم نہیں ہوتا، کیونکہ حقیقت میں مبادلۃ المال بالمال نہیں ہے، جبکہ موہوب لہ سے رجوع کے باب میں ہبہ کے بجائے بیع کا درجہ دیا گیا اور رجوع کو ناجائز قرار دیا گیا، ”ہندیہ“ میں ہے:

”ولو وهب عقارا من غیر شرط العوض، ثم إن الموہوب له عرضہ من ذلک دارا فلا شفعة فی الدارین لا فی دار الہبۃ ولا فی دار العوض“ (ہندیہ ۱۶۰/۵ کتاب الشفعة، الباب الاول فی تغیرہا) اگر بے غیر عوض کی شرط کے ایک زمین ہبہ کیا، پھر موہوب لہ نے اس کے عوض ایک دوسرا دار دے دیا، تو ان دونوں دار میں شفعة نہیں ہوگا، نہ دار الہبہ میں نہ دار عوض میں۔

اس لئے مرکب معاملہ ماننا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یا پھر اس کو بیع ہی تصور کریں، لیکن بیع کی ایک خاص نوع ہوگی، جس میں مشتری کو ذات بیع سے انتفاع کے علاوہ دوسرے سے بیچنے کا حق نہیں ہوگا، نیز بعض وعدوں کو بمصلحت پورا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے، اس لئے مشتری کے ذمہ اس وعدہ وفا کو پورا کرنا لازم ہوگا۔

رقم ضمانت کا حکم:

ضمانت کے طور پر کرایہ دار سے جو کثیر یا قلیل رقم لی جاتی ہے اسمیں یہ بھی احتمال ہے کہ رہن ہو، کیونکہ روپے پیسے کا رہن درست ہے، لیکن خلیجان یہ ہوتا ہے کہ رہن سے مقصود استیفاء، یعنی اگر دین یا قرض ڈوبنے لگے تو اس مرہون سے وصول کیا جاسکے، ظاہر بات ہے یہ اسی وقت ہوگا، جبکہ وہ چیز پہلے سے واجب ہو، اگر ابھی اجرت کا لزوم ہی نہیں ہوا تو کسی طرح اس کو رہن مانا جاسکتا ہے، البتہ یہ رہن بالدرک کے قبیل سے ہوگا جو کہ صحیح نہیں ہے۔

”الرهن بالدرک باطل، والكفالة بالدرک جائزة والفرق أن الرهن للاستيفاء ولا استيفاء قبل الوجوب، وإضافة التملیک الى زمان فى المستقبل لا يجوز“ (ہدایہ ۵۱۱/۴، کتاب الرهن، باب ما يجوز ارتهانه والارتهان بہ)۔

رہن بالدرک باطل ہے اور کفالت بالدرک جائز ہے، فرق یہ ہے کہ رہن وصول کرنیکی غرض سے ہوتا ہے، اور وجوب سے قبل استیفاء نہیں ہے، نیز تملیک کو مستقبل کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی طرح رہن کا عام اصول ہے:

”ولا يصح الرهن إلا بدين مضمون، لأن حكمه ثبوت يد الاستيفاء و الاستيفاء يتلو الوجوب“ (ہدایہ ۵۰۲/۴، کتاب الرهن)۔

رہن صحیح نہیں ہوتا، مگر ایسے دین کی وجہ سے جو ضمان میں آچکا ہو، اس لئے کہ اس کا حکم استیفاء والا قبضہ ہے، اور استیفاء وجوب کے بعد ہوتا ہے۔

جبکہ ڈپازٹ یا ضمانت کا مقصد درک ہی ہوتا ہے کہ جب کرایہ دار دکان خالی کرے گا تو جو نقصان ہوا ہوگا اس کی تلافی کی جائے گی، تو کیسا کہا جاسکتا ہے کہ یہ رہن ہے، اس لئے اس کو قرض مشروط بحکم العرف ماننا ہی بہتر ہے، نیز عرف کی وجہ سے معاملہ مشروط بھی ہو سکتا ہے، اس کی نظیر اجارہ ہی کا ایک مسئلہ ہے، کسی نے کسی کا غلام مزدوری کے لے لیا ہے، موجد شرط لگاتا ہے کہ کھانا مستاجر کے ذمہ ہے تو فقیہ ابو الیث نے محض عرف کی بنا پر جواز کا فتویٰ دیا ہے فرماتے ہیں:

”أما في زماننا فالعبد يأكل من مال المستأجر عادة“ (ہند یہ ۴۴۲/۴، کتاب الاجارہ، الفصل الثانی فیما یفسد

العقد فی مکان الشرط)۔

(ہمارے زمانے کا عرف ہے کہ مستاجر کے مال سے غلام کھاتا ہے)۔

بڑی رقم کی وجہ سے کرایہ میں کمی:

یقیناً ایک مشت بڑی رقم حاصل ہونے سے کرایہ پر دینے والے کو موقع ملے گا، کہ کسی کاروبار میں لگائے چونکہ اس کی حیثیت قرض کی ہے، اس لئے شرعاً اس کو اجازت بھی ہوگی، لیکن قرض ہونے کا ایک نقصان یہ بھی ہوگا کہ معمولی کوتاہی بھی حرمت کا سبب بن سکتی ہے، اس لئے اگر معاملہ اجرت مثل پر طے ہوا ہے تب تو ٹھیک ہے ورنہ ”کل قرض جبر نفعاً“ کے تحت آ کر سود کا وبال لائیگا۔

”فی الخانیة: رجل المستقرض دراهم وأسكن المقرض فی داره قالوا: يجب أجر المثل علی المقرض، لأن المستقرض إنما أسكنه فی داره عوض عن منفعة القرض لامجانا“ (شامی ۸۷/۹، کتاب الاجارة، باب ضمان الأجر، مطلب: اسکن المقرض فی داره)۔

خانیہ میں ہے کہ ایک شخص نے درہم قرض لیا اور اپنا گھر مقرض کو رہائش کے لئے دے دیا، فقہاء کہتے ہیں کہ مقرض پر اجرت مثل واجب ہے، اس لئے کہ مستقرض نے اپنے گھر کو منفعت قرض کے عوض رہائش کے لئے دیا ہے، نہ کہ مفت (اور ہر وہ قرض جو منفعت کا سبب ہو رہا ہوتا ہے)۔

اسی طرح تنابله کے یہاں صراحت ملتا ہے۔

”لا يجوز أن يشترط فی عقد القرض شرطاً يجبر منفعة للمقرض كأن يشترط المقرض علی المقرض أن ليسكنه داراً مجاناً أو رخصياً“ (الفقه علی المذاهب الاربعہ ۲۳۵/۲ کتاب القرض)۔

(جائز نہیں ہے کہ عقد قرض میں کوئی ایسی شرط ہو جس میں قرض دینے والے کا نفع ہو، مثلاً یہ شرط کہ قرض دینے والا، قرض دار کے مکان میں فری یا کم کرایہ سے رہے گا، لہذا اجرت مثل سے کم کرایہ کی صورت میں جائز نہیں ہوگا)۔

بیع و فاء اور اس کا حکم

مولانا روح الامین ☆

بیع و فاء کا مسئلہ نوازل و واقعات میں سے ہے، جس کا رواج بخارا اور سمرقند میں مذاہب کے استقرار کے بعد پانچویں صدی ہجری میں ہوا۔ اسی وجہ سے اس کے حکم کی تخریج میں فقہاء کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ سطور ذیل ان ہی اقوال کی روشنی میں تخریج راجح کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

بیع و فاء کی تعریف:

بیع و فاء کی تعریف کے سلسلہ میں اقوال مختلف ہیں، کیونکہ فخر الدین زلیعی (مجمع الانہر شرح ملتقى الابحر ۴/۳۱) اور صاحب مجمع الانہر (تبيين الحقائق للزليعي/باب الخلع ۵/۱۸۳) وغیرہ نے اسے دین کے عوض بیع قرار دیا ہے۔

اور بعض نے نقد کے عوض بیع قرار دیا ہے، جیسا کہ علاء الدین حصکفی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

”صورتہ أن يبيعه البعض بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين“ (الدر المختار/فرع الشرط الفاسد يبتقن باصل العقد ۵/۲۷۹)۔

اور بہت سے فقہاء نے دونوں صورتوں کو جمع کیا ہے۔ جیسے: ابن نجیم مصری (بحر الرائق/باب خيار الشرط ۶/۸) علامہ بابر ترقی وغیرہ (عنايه/كتاب الاكراه ۱۳/۱۵۶)۔

پھر ان تعریفات میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ بیع اشیائے منقولہ میں سے ہو یا غیر منقولہ میں سے، جب کہ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء نے اسے عقار کے ساتھ خاص قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”بیع الوفاء کی صورت یہ ہے کہ روپے کا ضرورت مند عقدا اس شرط پر فروخت کرے کہ جب وہ ثمن لوٹا دے گا تو اسے وہ جائیداد واپس کر دی جائے گی“ (مباحث فقہیہ لجامہ الاسلام بحوالہ المدخل لفتی العام ص: ۴۰۹)۔

حاصل یہ ہے کہ یہ بیع بالشرط ہے، جس میں ایک ضرورت مند شخص اپنا سامان کا سودا یوں کرتا ہے کہ تم اسے اتنی قیمت میں لے لو اور اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کر دوں تو تم یہ سامان اسی قیمت پر مجھے واپس کر دینا۔

☆ خادم تدریس جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ، بھروچ، گجرات۔

بیع و فاء کے مساوی اصطلاحات:

جس طرح اس کی تعریف میں متعدد اقوال ہیں، اسی طرح اس کے تسمیہ میں بھی متعدد اقوال ہیں:

مالکیہ کے یہاں ”بیع الثنیاء“ (الہجیہ فی شرح التحفہ لابی الحسن علی بن عبدالسلام التوسلی/فصل فی بیع الخیار ۲/۹۹) و کذا فی حاشیہ الدسوقی/باب بیع العقد ۳/۷۱) شافعیہ کے یہاں ”بیع العہدۃ“ (تختہ المحتاج فی شرح المنہاج/بیتین فی بیعۃ ۱۷/۶۵) حنابلہ کے یہاں ”بیع الامانۃ“ (الاقراع فی فقہ الامام احمد بن حنبل/شروط البیع ۲/۵۸) کا نام دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اسے ”با بیع الطاعۃ، بیع الطاعۃ، بیع الجائز، بیع المعاملۃ اور الرهن المعاد“ سے بھی موسوم کیا جاتا ہے (القاموس الفی السعدی ابو جیب/حرف الواو ۱/۳۸۳)، الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۹/۲۶۰۔

کتب فقہیہ میں محل وقوع:

۱- شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن محمد بن عبد الرحمن طرابلسی المعروف بالخطاب نے بیع بالخطاب میں اس کا تذکرہ

کیا ہے:

- ۲- بزاززی اور قاضی خان نے بیع فاسد میں۔
- ۳- ابن نجیم وغیرہ نے کتاب خیار الشرط میں۔
- ۴- زیلعی اور مرغینانی نے کتاب الاکراہ میں۔
- ۵- فتاویٰ ہندیہ کے مرتبین نے بیوعات مکروہ میں۔

بیع و فاء کا حکم:

اس بیع کے حکم کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، خاصہً حنفیہ کے درمیان تو شدید اختلاف پایا جاتا ہے، ہم اولاد دیگر فقہاء کے مذہب کو ذکر کرتے ہیں، پھر حنفیہ کے مذہب سے بحث کریں گے۔

مذہب مالکی:

مالکیہ کے یہاں یہ بیع فاسد ہے۔ حاشیہ دسوقی میں ہے:

”و بیع الثنیاء هو المعروف بمصر بیع المعاد، بأن یشرط البائع علی المشتري أنه متى أتى له بالثمن رد المبيع له، فإن وقع لك الشرط حين العقد أو توطأ عليه قبله كان المبيع فاسداً ولو أسقط الشرط لتردد الثمن بين السلفية والثمنية“

(بیع الثنیاء جو مصر میں بیع المعاد سے معروف ہے کہ بائع مشتری پر شرط لگا دے کہ جب وہ ثمن اسے واپس کر دے گا تو وہ بیع لوٹا دے گا، یہ شرط عقد کے وقت ہو تو یہ بیع فاسد ہوگی، اگرچہ وہ شرط ساقط کر دے، اس لیے کہ ثمن قرض

اور قیمت ہونے کے درمیان متردد ہے) (الہججہ فی شرح التختہ لابن الحسن علی بن عبدالسلام التصولی فصل فی بیع الخیار ۹۹/۲، وکذا فی حاشیۃ الدسوقی باب بیع العقد ۱۳/۷۱)۔

خطاب عینی فرماتے ہیں کہ اگر مشتری شرط کو ساقط کر دے تو بیع جائز ہوگی یا نہیں؟ دونوں قول ہیں: ایک یہ کہ بیع باطل اور شرط بھی باطل، یہی مشہور ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بیع جائز ہے، جبکہ شرط ساقط کر دے، یہ امام مالک کا قول محمد کی کتاب میں ہے (تختہ المحتاج فی شرح المنہاج بیعتین فی بیعہ ۶۵/۱۷)۔

”الہججہ فی شرح التختہ“ میں ہے کہ یہ بیع مردود ہے، اور اس کی علت میں اختلاف ہے:

(۱) یہ بیع اور سلف ہے، پھر یہ خیار بشرط النقد ہے، پھر اگر مدت کی تحدید ہوتی ہے تو وہ مدت خیار سے زیادہ ہوتی ہے اور اگر تحدید نہیں ہوتی تو پھر مدت مجہول ہے۔

(۲) سخون اور ابن ماشون وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ فرض ہے، جس کے ذریعہ نفع حاصل کیا جا رہا ہے، یہی ”مدونہ“ میں

علت بیان کی گئی ہے۔

مسلك شافعی:

ابن حجر ہیتمی فرماتے ہیں:

”والقول الفیصل فیہ: إن اقترن بہ شرط فاسد کأن یقول: بع تک بعشرة، فإذا رددتها إلیک رددت إلیّ، فیقول الآخر: قبلت، أو یقول المشتري: اشتريته منك بهذا الشرط فیقول له: بع تک کان فاسداً— وأما إذا لم یقترن بہ شرط فاسد کأن یتفقا علی أنه یبعه هذه العین بعشرة مثلاً فإذا ردها إلیه رد العین إلیه، ثم یعقد البیع بايجاب وقبول صحیحین لکنهما یضمران الوفاء بما توافقا علیہ، فالبیع حیثئذ صحیح عند الشافعی یترتب علیہ سائر أحكام البیوعات الصحیحة الخالیة عن ذلك، لکنه مکروه خروجاً من خلاف من أبطله الائمة“

(قول فیصل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر شرط فاسد مقترن بالعقد ہو، مثلاً یوں کہے ”میں نے تجھ کو یہ چیز دس روپے کے عوض فروخت کی، پھر جب میں یہ واپس کر دوں تو تو بھی مجھے بیع واپس کر دینا، دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا یا مشتری کہے کہ میں نے تجھ سے اس شرط پر یہ چیز خریدی اور دوسرا کہے کہ میں نے فروخت کر دی تو یہ فاسد ہے۔ اور اگر شرط عقد کے ساتھ مقترن نہ ہو جیسے دونوں اس پر متفق ہو جائیں کہ یہ عین دس میں فروخت کرے گا، پھر جب وہ دس واپس کر دے گا تو یہ چیز وہ واپس کر دے گا، اس کے بعد وہ دونوں صحیح ایجاب وقبول کے ساتھ بیع کریں، لیکن وفا کی جس شرط پر اتفاق ہوا تھا، دل میں پوشیدہ رکھیں تو اس صورت میں بیع صحیح ہو جائے گی، اس پر صحیح بیع = جو اس شرط سے خالی ہو = کے احکام مرتب ہوں گے)۔

آگے چل کر ابن حجر نے ان علمائے یمن کی تردید کی ہے، جو دونوں صورت میں بیع کی صحت کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں:

”قول ساقط لایعول علیہ ولایتفت إلیہ بل المنقول فی مذهب الشافعی من غیر خلاف
يعتد به فی ذلک هو ما قررتہ فاعتمده ولاتعتر بما سواہ“

البتہ بعض متاخرین شافعیہ جیسے عبدالرحمن بن محمد باعلوی صاحب ”بغیۃ المسترشدین“ نے ضرورت کی بناء پر اس بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

مسلك حنبلی:

عموماً فقہائے حنابلہ نے اسے باطل قرار دیا ہے۔

”الموسوعة الفقهية“ میں علی الاطلاق مالکیہ اور حنابلہ کا یہی مذہب مذکور ہے۔

”مذهب المالکیة والحنابلة والمتقدمون من الحنفیة والشافعیة إلی ان بیع الوفاء فاسد“۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”وما یظہرونہ من بیع الأمانة الذی یتفقون فیہ علی أنه إذا جاء ہ الثمن أعاد إلیہ المبیع،

هو باطل باتفاق الأئمة، سواء شرط فی العقد أو تواطأ علیہ قبل العقد علی أصح قولی الشافعی“۔

البتہ ابن قدامہ حنبلی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر حیلہ کے طور پر یہ صورت اختیار کی، تاکہ مشتری قرض کے ذریعہ اشقاع کرے، تب تو جائز نہیں اور اگر حیلہ کا ارادہ نہ ہو کہ ایک ناجائز کو اپنے لیے حلال کر لے تو جائز ہے۔

مسلك حنفی: صاحب ”فتاویٰ بزازیہ“ نے اس سلسلہ میں فقہائے مذہب کے نواقوال ذکر کیے ہیں: جن کا حاصل یہ

ہے۔

(۱) بعض نے سرے سے اس عقد کو ناجائز کہا ہے، اور عدم جواز کی دو بنیادیں ہیں:

۱- یہ باحلال کرنے کا ایک حیلہ ہے۔

۲- یہ بیع ہازل کے مثل ہے۔

۳- یعنی بیع وفاء میں لوگ جو کہتے ہیں وہ مراد نہیں لیتے، اس لیے کہ وہ تلفظ تو بیع کا کرتے ہیں، جس کا تقاضہ یہ ہے

کہ بیع نافذ اور دائمی ہو، لیکن ان کی مراد ایک عارضی اور وقتی بیع ہوتی ہے۔

(۲) عقد صحیح ہے، البتہ اس کی حقیقت رہن ہے، کیونکہ عقود میں معانی و مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ اور ظاہری

تعبیر معتبر نہیں ہوتی ہے، جیسے فقہاء نے کفالتہ کو بشرطِ براءتِ اصیل حوالہ قرار دیا ہے، اور بیع و فاء کا مقصد صرف طلب و ثوق و اعتماد ہے، اور یہی رہن کا مقصود ہوتا ہے، اس لیے اس پر رہن ہی کے سارے احکام مرتب ہوں گے، اکثر حضرات کی یہی رائے ہے، عموماً اردو فتاویٰ میں اکابر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۳) اس معاملہ کی حقیقت بیع ہی ہے، کیونکہ عاقدین بیع کا تلفظ کرتے ہیں، لہذا اسی کا اعتبار ہوگا، بدون لفظ محض نیت کا اعتبار نہیں ہوتا، اس کے بعد اختلاف ہے۔

(الف) بعض نے اس کو بیع فاسد قرار دیا، کیونکہ یہ بیع بالشرط ہے اور شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔

(ب) بعض نے تعامل اور عرف کی بنیاد پر اسے جائز قرار دیا ہے کہ جس شرط کا تعامل ہو، وہ مفسد نہیں، اگرچہ مقتضائے عقد کے خلاف ہو۔

(ج) بعض نے یہ تفصیل کی کہ صلب عقد میں شرط لگائی تب تو بیع فاسد ہے، اور اگر بیع مطلق کی اور اس کے بعد بطور وعدہ شرط و فاء کا ذکر کیا تو بیع صحیح ہوگی اور وعدہ کا ایفاء لازم ہوگا۔

(د) بعض نے اسے بیع مکروہ کا نقل قرار دیا، جس میں مشتری دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہوگا، کیونکہ بائع کی رضا شامل نہیں۔

(۴) یہ معاملہ بعض صورتوں میں رہن ہے اور بعض صورتوں میں بیع نافذ ہے، اگر بیع مطلق ہوئی، اور مشتری نے وفاء کا وعدہ کیا، تو اس صورت میں اگر ثمن مثل ہو یا معمولی غبن تو بیع لازم ہوگی، لیکن اگر ثمن میں غبن فاحش ہو، اور بائع کو اس کا علم بھی ہو تو پھر یہ رہن قرار پائے گا۔

(۵) یہ معاملہ بیع اور رہن سے مرکب عقد ہے، مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے، لہذا وہ اس سے انتفاع کا مالک ہوگا، اور بائع کے حق میں رہن ہے، لہذا وہ اس کا مجاز ہوگا کہ جب مشتری اس کو ثمن واپس کر دے تو بیع کی واپسی کا مطالبہ کرے، اور مشتری اسے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوگا، اور بیع ہونے کی وجہ سے بائع مشتری کو انتفاع سے روک نہیں سکتا۔

(۶) یہ معاملہ تین چیزوں ”بیع فاسد“ ”بیع صحیح“ اور رہن سے مرکب ہے۔

بیع فاسد ہونے کی وجہ سے عاقدین فسخ کے مالک ہوں گے۔

بیع صحیح ہونے کی وجہ سے مشتری انتفاع کا مالک ہوگا۔

رہن ہونے کی وجہ سے مشتری اس چیز کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مجاز نہ ہوگا، اور ہلاک ہونے کی

صورت میں بائع کے ذمہ سے دین ساقط ہو جائے گا۔

قول راجح کی تعیین:

بیع یا رہن؟

یہ واضح ہے کہ بیع و فاء سے مقصود یہ ہے کہ راہن کو اعتماد میں لیا جاسکے، اور وہ شیء مقبوض سے انتفاع بھی کر سکے۔ لہذا اس معنی اور مقصود کو پیش نظر رکھیں تو ضروری ہوگا کہ اس کی حقیقت معاملہ رہن ہو اور اس پر رہن ہی کے احکام جاری ہوں، جیسا کہ امام ابو الحسن ماتریدی، سید ابوشجاع، ان کے صاحبزادے امام علی سعدی، محمد بن فضل بخاری، بلکہ صاحب ”فتاویٰ خیریہ“ کے بقول اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔

البتہ اگر تعبیر اور لفظ کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر اس عقد کو بیع قرار دینا ہوگا، جیسا کہ قاضی خان کے نزدیک مختار ہے۔

یہی قول راجح معلوم ہوتا ہے، اور ترجیح کی چند وجوہ ہیں:

- ۱- بدون تلفظ محض نیت کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، چنانچہ اگر کسی شخص نے ایک عورت سے اس نیت کے ساتھ عقد کیا کہ ایک سال پورا ہو جائے گا تو وہ اسے طلاق دیدیگا، تو محض اس نیت سے وہ نکاح متعہ قرار نہیں پائے گا۔
- ۲- بیع کا لفظ نہ لغت رہن پر دلالت کرتا ہے، نہ عرفاً اس سے رہن مفہوم ہوتا ہے، اس لیے لفظ بیع سے رہن کا قصد معتبر نہیں، بخلاف کفالتہ اور حوالۃ کے یہ دونوں عرفاً ”ضم“ کے معنی میں مشترک ہیں، لہذا ایک سے دوسرے کا ارادہ کیا جاسکتا ہے۔

۳- اگر معانی و مقاصد کا اعتبار ہے، تو اس معاملہ میں جہاں عاقدین کا مقصود استیثاق ہے، وہیں ان کا مقصود یہ بھی ہے، مقبوض سے انتفاع کرے، لہذا انتفاع کی رضامندی کے بعد رہن قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

بیع جائز یا ناجائز؟

عقد بیع قرار دینے کے بعد غور طلب امر یہ ہے کہ شرعاً یہ بیع جائز ہے یا ناجائز؟ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جن

حضرات نے اسے ناجائز قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر دو بنیادیں ہیں:

۱- یہ ربا و کھلا ل کرنے کا ایک حیلہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ علت یا شبہ بے محل ہے، کیونکہ مقبوض کی حیثیت شیء مرہون کی ہو، تو اس سے انتفاع ربا ہے، لیکن اگر اس کی حیثیت مشتری کی ہو، یعنی مرہون راہن سے وہ چیز خرید لے اور بیع کے ذریعہ اس کا مالک بن جائے، تو پھر انتفاع جائز ہے، اور یہ ”وَأَحِلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵) کے تحت داخل ہوگا، جبکہ پہلی صورت میں ”وَحَرَّمَ الرِّبَا“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵) کے تحت داخل ہوگا، اس لیے کہ ”کل قرض جبر منفعة فہوربا“۔

جہاں تک حیلہ کی بات ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ہر حیلہ شرعاً ممنوع نہیں، علامہ آلوسی ”فاضر بہ ولا تحنث“ (سورہ

ص: ۴۴) کے تحت فرماتے ہیں:

”حیلہ جب حکمت شرعیہ کے ابطال کو مستلزم ہو تو قبول نہیں کیا جائے گا، جیسے سقوط زکاۃ اور سقوط استبراء کا حیلہ، اور جب حیلہ کو ایسے عمل کا وسیلہ بنائے جو اس کے لیے جائز ہو، اور اس کے ذریعہ اپنی ذات سے یا کسی دوسرے سے امر مکروہ کو دفع کرے تو کوئی حرج نہیں۔“

علامہ سرخسی ”مبسوط“ کتاب الحیل میں فرماتے ہیں:

”حاصل یہ ہے کہ جس حیلہ کے ذریعہ انسان حرام سے نجات حاصل کرے یا اسے حلال تک پہنچنے کا وسیلہ بتائے تو یہ امر حسن ہے، مکروہ یہ ہے کہ کسی انسان کے حق کے سلسلہ میں حیلہ کرے، تاکہ اس کا حق باطل ہو جائے، یا باطل کے سلسلہ میں حیلہ کرے تاکہ حق کے ساتھ تلبیس ہو جائے، یا کسی حق میں شبہ پیدا ہو جائے، تو یہ وہ حیلہ کا راستہ ہے، جو مکروہ ہے، الخ۔“

مذکورہ عبارات کو نقل کرنے کے بعد مولانا تقی عثمانی فرماتے ہیں:

”حیلہ مشروعیہ کے جواز پر سب سے قوی دلیل وہ روایت ہے جس کی تخریج حضرات شیخین اور امام نسائی نے حضرت ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے کی ہے۔“

”ان رسول اللہ استعمل رجلا علی خیبر ف جاء هم بتمر جنیب، فقال: اکل تمر خیبر ہکذا؟ قال: انا ناخذ الصاع بالصاعین، والصاعین بالثلاث، قال: لاتفعل، بع الجمع بالدرہم، ثم اتبع بالدرہم جنیباً۔“

اس روایت میں حلال طریق تک پہنچنے کے لیے حیلہ اختیار کرنے کی تعلیم ہے۔ لہذا جو اس قبیل کا حیلہ ہو وہ لامحالہ جائز ہے۔

ہمارے اس مسئلہ میں شئی مقبوض سے انتفاع کو حلال کرنے کے لیے بیع کی تدبیر اختیار کی جا رہی ہے، لہذا جائز ہونا چاہیے۔

۲- اس قول کی بعض حضرات کے نزدیک بنیاد یہ ہے کہ یہ بیع ہازل کے مثل ہے۔

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ بظاہر دونوں میں فرق ہے کہ ہازل دوسرے سے بیع کا قصد کرتا ہی نہیں، اور بیع وفاء میں عاقدین بیع کا قصد کرتے ہیں لیکن بیع مطلق کا نہیں، بلکہ بیع مشروط کا قصد کرتے ہیں۔

بیع صحیح یا فاسد؟

مذکورہ عقد کو بیع قرار دینے کے بعد اس کی چند صورتیں ہیں:

۱- بغیر کسی شرط کے بیع کی جائے، محض دل میں یہ نیت ہو کہ بائع جب ثمن واپس کرے گا تو مشتری بیع واپس

کردے گا، اس صورت کے جواز میں تو کوئی شبہ نہیں۔

۲- بغیر شرط کے بیع کی، پھر دونوں نے وعدہ کے طور پر شرط پر اتفاق کیا، اس صورت میں بھی بیع جائز ہوگی،

اور وعدہ کا ایفاء لازم ہوگا۔

البتہ یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے:

(الف) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عقد کے بعد طے کی جانے والی شرط عقد کے ساتھ لاحق ہوتی ہے، اس کا تقاضہ یہ

ہے کہ مذکورہ صورت میں بیع فاسد ہو، لیکن امام کی دوسری روایت اور حضرات صاحبین کا مذہب یہ ہے کہ یہ شرط عقد کے ساتھ ملحق نہیں ہوگی، اور احناف کے نزدیک یہی روایت راجح ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

”قیل: يلتحق عند أبي حنيفة، وقيل: لا، وهو الأصح كما في جامع الفصولين، لكن في الأصل

أنه يلتحق عند أبي حنيفة، وإن كان الإلحاق بعد الافتراق عن المجلس، وتمامه في البحر، قلت: هذه

الرواية الأخرى عن أبي حنيفة وقد علمت تصحيح مقابلهما، وهي قولهما“۔

(ب) وعدہ کا ایفاء مطلوب و مستحسن ہے، بلکہ دیائے لازم ہے، لیکن فقہاء کے درمیان اختلاف ہے کہ قضاء لازم ہے

یا نہیں؟

۱- مطلقاً واجب ہے، یہ امام احمد کی ایک روایت، جس کو ابن تیمیہ نے اختیار کیا ہے، اور مالکیہ کا ایک قول ہے۔

۲- مجرد وعدہ تو واجب نہیں، البتہ معلق وعدہ کا ایفاء واجب ہے، یہ حنفیہ کا مذہب ہے، لیکن اس وقت جب کہ تعلق

حنفیہ کے قواعد کی رو سے جائز بھی ہو، اور تملیکات کی تعلق جائز نہیں ہے۔

تاہم مذکورہ مسئلہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ وعدہ کا ایفاء کبھی لازم ہو جاتا ہے، اس لیے ضرورت کی بناء پر اسے

لازم قرار دیا جائے گا۔

”ويلزم الوفاء بالوعد، لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس“

یہی علامہ شامی نے جامع الفصولین کے حوالہ سے لکھا ہے۔

نیز حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے ”معارف القرآن“ میں وعدہ اور عہد کے درمیان فرق کرتے ہوئے لکھا کہ وعدہ

تو یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے کسی کو کچھ کرنے کی یقین دہانی کرے تو اس کا ایفاء دیائے واجب ہے، قضاء نہیں، اور عہد یہ

ہے کہ دو شخص آپس میں کچھ طے کریں اور کسی امر پر اتفاق کر لیں، تو اس کا ایفاء دیائے بھی واجب ہے اور قضاء بھی۔

اس اعتبار سے مسئلہ مذکورہ میں یہ فقط وعدہ نہیں بلکہ جانبین سے عہد ہے، لہذا اس کا ایفاء قضاء بھی لازم ہوگا۔

۳- بیع کی تیسری صورت یہ ہے کہ عقد سے پہلے شرط پر اتفاق کریں، پھر عقد کے وقت شرط کا ذکر نہ کریں، اس صورت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اکثر کے نزدیک جائز ہے۔
علامہ شامی فرماتے ہیں:

”وكذا لو تواضعا قبل البيع ثم عقدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز، ولا عبرة بالمواضعة السابقة“۔

”اگر بیع سے پہلے اتفاق کیا، پھر وفاء کی شرط کے بغیر عقد کیا تو عقد جائز ہے اور سابق اتفاق کا کوئی اعتبار نہیں۔
در مختار میں ہے:

”وقيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهنا، ثم إن ذكر النسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً“۔

بعض کہتے ہیں کہ بیع کے لفظ سے معاملہ کیا تو رہن نہیں ہوگا، پھر اگر فسخ کی شرط عقد میں یا عقد سے پہلے لگائی یا بیع وفاء کو غیر لازم سمجھ کر معاملہ کیا تو بیع فاسد ہوگی۔
ابن عابدین ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

”وقد سئل الخبير الرملي عن رجلين تواضعا على بيع الوفاء قبل عقده وعقد البيع خالي عن الشرط، فأجاب بأنه صرح في الخلاصة والفيض والتارخانية وغيرها، بأنه يكون على ماتواضعا“۔
”خیر الدین ربلی سے ان دو شخصوں کے متعلق پوچھا گیا جو عقد سے پہلے بیع پر اتفاق کر لیں اور عقد شرط سے خالی ہو، تو ان کا جواب تھا کہ خلاصہ، فیض، تارخانیہ وغیرہ میں صراحت ہے کہ ان کا یہ معاملہ اپنے اتفاق پر باقی رہے گا“۔
۴- عقد کی چوتھی صورت یہ ہے کہ عقد کے وقت استرداد یا فسخ کی شرط لگائی، تو یہ بیع اصول کے اعتبار سے فاسد ہے، کیونکہ شرط مقتضی عقد کے خلاف ہے، جو عقد کے فساد کو مستلزم ہے۔
البتہ شرط کے فساد اور اس کے نتیجے میں عقد کے فساد کی بنیاد دو چیزیں ہیں:

(الف) عقد کا مفضی الی النزاع ہونا، یہی وجہ ہے کہ جب کسی شرط کا تعامل اور عرف ہو، تو وہ شرط جائز ہوتی ہے، کیونکہ عرف قاطع نزاع بن جاتا ہے۔
ابن عابدین منخ سے نقل کرتے ہیں:

”فإن قلت: نهى النبي عن بيع وشرط، فيلزم أن يكون العرف قاضيا على الحديث، قلت ليس بقاض عليه، بل على القياس، لأن الحديث معلول بوقوع النزاع المنخرج للعقد عن المقصود به وهو قطع المنازعة، والعرف ينفي النزاع فكان موافقا لمعنى الحديث، فلم يبق من الموانع إلا القياس

والعرف قاض علیہ ملخصاً۔“

(اگر تو کہے کہ آپ ﷺ نے توبیح بالشرط سے منع فرمایا ہے، لہذا لازم یہ آئے گا کہ عرف حدیث پر قاضی ہے؟ میں کہوں گا کہ حدیث پر نہیں بلکہ قیاس پر قاضی ہے، اس لیے کہ حدیث (حکم) کی علت یہ ہے کہ ایسے نزاع کا سبب ہو جو عقد کو مقصود سے خارج کر دے، یعنی (نہی کی علت) قطع منازعت ہے، اور عرف منازعت کو ختم کر دے گا، لہذا حکم تو حدیث کے مقصد کے موافق ہے، اور مانع صرف قیاس ہے اور عرف قیاس پر قاضی ہوتا ہے)۔

(ب) شرط کاربا کو متضمن ہونا، یعنی کبھی عقد میں ایسی منفعت زائدہ مشروط ہوتی ہے، جس کے مقابلہ میں کوئی عوض نہیں ہوتا، تو ایسی شرط ربا کو متضمن ہوگی، اور فساد عقد کا سبب بنے گی۔
صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

”کل شرط لایقتضیہ العقد وفیہ منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود علیہ وهم من أهل الاستحقاق یفسدہ—لأن فیہ زیادة عارۃ عن العوض فیؤدی إلى الربوا أولأنه یقع بسببہ المنازعة فیعری العقد عن مقصودہ“۔

ہر وہ شرط جو عقد کے مقتضی کے مطابق نہیں اور اس میں متعاقدين میں سے کسی ایک یا معقود علیہ کا نفع ہے اور وہ اہل استحقاق میں سے ہے، عقد کو فاسد کر دیتی ہے، اس لیے کہ اس میں ایسی زیادتی ہوتی ہے، جو عوض سے خالی ہو تو وہ متعدی الی الربا ہوگی، اور اس لیے کہ اس کی وجہ سے منازعت واقع ہوگی، جس کے نتیجے میں عقد اپنے مقصود سے خالی ہو جائے گا۔
اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کی شرط بھی تعادل و عرف کی وجہ سے جائز ہو جاتی ہے، اور کیا تعادل اس قسم کے ربا کی حلت کا سبب بن سکتا ہے؟

اس باب میں تفصیل یہ ہے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں:

۱- ”حقیقت ربا“ اس کا مصداق ربا بالنسیۃ اور ربا الفضل ہے، اول کا ثبوت آیت قرآنیہ سے اور ثانی کا ثبوت

حدیث نبوی سے ہے۔

۲- ”شبیہ ربا“ جس کا حاصل اصل شئی پر ایسی زیادتی جو اصل شئی کی جنس سے نہ ہو، خواہ وہ از قبیل اجناس ہو یا از قبیل عروض، یہ بھی ممنوع ہے، مگر اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت نہیں، بلکہ قیاسی ہے، فقہاء عقد بیع میں جب شرط کو مفضی الی الربا قرار دیتے ہیں، تو وہاں یہی شبیہ ربا ہی مراد ہوتا ہے۔

اول کی حرمت تعادل اور عرف سے ختم نہیں ہوگی ”العمل بالعرف مالم یخالف الشریعة کالمکس

والربوا ونحو ذلک“۔

البتہ شبہہ ربا کی حرمت منصوص نہیں بلکہ قیاسی ہے، اور عرف و تعامل قیاس پر قاضی ہے، اس لیے تعامل و عرف کا تعارض جب قیاس سے ہو تو تعامل معتبر ہوگا۔

صاحب ہدایہ شرط فاسد کے دونوں وجوہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”لأن فيه زيادة عارية عن العوض فيودي إلى الربوا أولأنه يقع بسببه المنازعة فيعري العقد عن مقصوده، إلا أن يكون متعارفاً؛ لأن العرف قاض على القياس“۔

”کیونکہ مذکورہ شرط میں ایسی زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہے، لہذا یہ مفضی الی الربا ہوگی، یا اس لیے کہ اس کی وجہ سے منازعت واقع ہوگی، تو عقد مقصود سے خالی ہو جائے گا، مگر یہ کہ ایسی شرط متعارف ہو، اس لیے کہ عرف قیاس پر حجت ہوتا ہے“۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرط فاسد خواہ منازعت کا سبب ہو، خواہ ربا کا سبب، لیکن متعارف ہو تو وہ شرط جائز ہوتی ہے اور معاملہ درست ہوتا ہے، کیونکہ عبارت میں ”إلا أن يكون متعارفاً“ دونوں صورت سے استثناء ہیں، لہذا مذکورہ صورت گواصلاً ناجائز ہے، لیکن اگر اس کا تعامل مسلم ہے تو پھر اسے بھی جائز قرار دینا چاہیے۔

نیز یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ربا کا تحقق تو معاملہ کو رہن قرار دینے کی صورت میں ہے، کیونکہ شی مرہون سے انتفاع ربا میں داخل ہے اور جب ہم نے اس معاملہ کو بیع قرار دیا تو اب شی مقبوض سے انتفاع بیع ہی کا مقتضی ہے، لہذا ربا کیونکر لازم آئے گا؟ ہاں اس صورت میں استرداد کی شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہوگی، جو تعامل کی وجہ سے مفسد عقد نہ ہونا چاہیے۔

حاصل بحث:

سوال میں مذکور صورت معاملہ بیع ہے، رہن نہیں، اس لیے کہ رہن پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ موجود نہیں، اور مقصد جہاں استیثاق ہے، وہیں یہ بھی ہے کہ شی مقبوض سے انتفاع جائز ہو سکے، بلکہ انتفاع کی حلت ہی کے لیے وہ بیع کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

پھر بہتر یہ ہے کہ عقد کے وقت ایسی کوئی شرط نہ لگائے، بلکہ عقد سے پہلے یا بعد معاہدہ کر لے، جس کی پاسداری متعاقدین پر لازم ہوگی۔

تاہم اگر شرط کے ساتھ معاملہ کیا تو ضرورت اور تعامل ناس کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا جائے گا۔

حضرت تھانویؒ نے اصولاً تو عدم جواز کا قول کیا ہے، لیکن بوقت ضرورت جواز کے قول پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپورؒ نے ”فتاویٰ خلیلیہ“ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے، یہ شکل

پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے، تاکہ فقہاء متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے۔

مشائخ سمرقند، مشائخ بلخ، مشائخ بخاری، امام نجم الدین نسفی، فخر الدین زلیلی اور صاحب ”نہایہ“ وغیرہ نے ضرورت اور حاجت ناس کی وجہ سے جواز ہی کا فتویٰ دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد سوال نامہ میں مذکور جزئیات کا جواب ذکر کیا جاتا ہے:

(الف) ایفائے عہد و وعدہ کے وجوب کا مقتضی یہ ہے کہ مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہو، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) خریدار کے لیے اس سے انتفاع جائز ہے۔

(ج) معاہدہ کی رو سے مالک اول کا اس سے حق وابستہ ہے، اس لیے خریدار کسی اور کو فروخت نہیں کر سکتا، اگر فروخت کرے تو یہ وعدہ اور معاہدہ کی خلاف ورزی ہے۔

کثیر رقم ضمانت اور کم کرایہ:

آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر دوکان یا مکان میں جو اجارہ کا معاملہ طے پاتا ہے، اس سلسلہ میں دو امر تحقیق طلب ہیں:

۱- زر ضمانت کی حیثیت:

عرف و معاشرہ کے پیش نظر اس زر ضمانت کی حیثیت امانت یا رہن کی نہیں، بلکہ قرض کی ہے، کیونکہ مالک مکان و دوکان اس رقم سے انتفاع کرتا ہے، بلکہ اسی غرض سے کرایہ دار سے مطالبہ کرتا ہے، رہن قرار دیئے جانے کی صورت میں اس کے لیے انتفاع حلال نہ ہوگا۔

۲- زر ضمانت کی بناء پر کرایہ میں کمی:

اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) قرض کا لین دین اور اس کا مطالبہ و ادائیگی اسی غرض اور اسی شرط سے ہو، تو اس کا عدم جواز بالکل واضح ہے، کیونکہ یہ ”کل قرض جرم نفعافہو حرام“ میں داخل ہے۔

”قال الحافظ: حدیث أن النبی ﷺ نہی عن قرض جرم نفعافہو حرام“ میں داخل ہے۔
 فقہوربا، قال عمر بن بدر فی المغنی: لم یصح فیہ شیء، وأما إمام الحرمین فقال: إنه صح وتبعه الغزالی، وقد رواه الحارث بن أبی أسامة فی مسنده من حدیث علی باللفظ الأول وفي إسناده سوار بن مصعب

وهو متروك، ورواه البيهقي في المعرفة عن فضالة بن عبيد موقوفا بلفظ: "كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا"، ورواه في السنن الكبرى عن ابن مسعود وأبي بن كعب وعبدالله بن سلام وابن عباس موقوفا عليهم)

(ب) اگر یہ لین دین مشروط نہ ہو، تو بعض فقہاء جیسے ابو بکر خضاف، محمد بن سلمہ امام بلخ، شمس الائمہ حلوانی جواز کے

قائل ہیں۔

البتہ معروف مثل مشروط ہے، اس لیے یہ رعایت جائز نہ ہوگی۔



بیع وفا اور اس کی تفصیلی بحث

مولانا عمران اللہ قاسمی ☆

ضرورت کی وجہ سے بہت سی اشیاء وجود میں آتی ہیں، نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں حالات کے بدلنے سے، طور و طریق بدلتے ہیں جس کی وجہ سے بعض امور میں بسا اوقات شرعی حکم کی حیثیت واضح نہیں ہو پاتی، ایسے ہی حالات کے تحت اختیار کیا جانے والا ایک معاملہ بیع وفا بھی ہے، زمان و مکان، کے فرق کی بنا پر اس میں پائی جانے والی وسعت و کثرت اور موجود تنوع کے پیش نظر موجودہ سیمینار میں اس کو بحث کا موضوع قرار دیا گیا ہے :

فقہاء کرام نے بیع وفا کی شکل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔ ایک صاحب ضرورت انسان سود سے بچنے کی خاطر اپنے کسی سامان مثلاً زمین جائیداد کی فروختگی کا معاملہ یوں کرتا ہے کہ تم میری فلاں چیز کو اتنی قیمت پر لے لو، اور جب میں تم کو یہ قیمت واپس لوٹاؤں تو مجھ کو میرا سامان اسی سابقہ قیمت پر واپس کر دینا، کسی دوسرے کو فروخت مت کرنا (البحر الرائق ۶/۱۱ / مطبوعہ زکریا یوبند) فقہاء کرام نے اس طرح کے معاملہ کو متعدد ناموں کے ساتھ موسوم کیا ہے چنانچہ اس عقد کو بیع الوفا، بیع الامانہ، بیع الاطاعت، بیع المعاملہ، البیع الجائز، بیع الرہن وغیرہ ناموں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (رد المحتار ۷/۵۴۵) بیع وفا کی جو صورت ذکر گئی ہے اس میں کچھ شرائط اور خاص قید و بند ہونے کی وجہ سے وہ محل بحث بن گئی ہے، کہ آیا مخصوص شرائط اور قید و بند کے ساتھ یہ بیع جائز ہے یا ناجائز ہے۔

جواز و عدم جواز کی بحث:

بیع وفا کے جواز اور عدم جواز کے سلسلے میں فقہاء میں اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ فقہاء متاخرین میں سے بعض حضرات مثلاً امام ظہیر الدین، تاج الاسلام، صدر الشہید وغیرہ اس کو فاسد قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں شرط فاسد ہوتی ہے، ”منہم الإمام ظہیر الدین والصدر الشہید حسام الدین والصدر الشریعہ تاج الاسلام فجعلوه فاسداً باعتبار الفسخ“ (زیلعی ۵/۱۵۳) ”والأصح عندی أنه بیع فاسد یوجب الملک بعد القبض و حکمہ حکم سائر البیاعات الفاسدة، لأنه بیع شرط لا یقتضیہ العقد، وقد نہی النبی ﷺ عن بیع و شرط“

(تبيين الحقائق ۵/۱۸۴)۔

اور میرے نزدیک زیادہ درست بات یہی ہے کہ یہ بیع بیع فاسد ہے جو قبضہ کے بعد ملکیت کو لازم کرتا ہے اور اس کا حکم تمام بیوع فاسدہ کی طرح ہے، کیونکہ یہ بیع ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا ہے، حالانکہ حضور ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح ”الجامع الوجیز“ میں ہے:

”واختاره الامام ظهير الدين أنه بيع فاسد، فلو تباعا ثم قال أحدهما“ چون سیم آدم بیع بمن بازده

فقال: نعم، لا يفسد البيع أما لو شرطاه في البيع يفسد“ (الجامع الوجیز للبرزازی علی الہندیہ ۳/۴۰۷)۔

اور اسی کو امام ظہیر الدین نے اختیار کیا ہے کہ یہ بیع فاسد ہے لہذا اگر طرفین نے عقد کر لیا پھر ان میں سے ایک نے کہا جب میں شمن لا کرواپس دیدوں تو میری بیع مجھے واپس کر دینا دوسرے نے کہا جی ہاں تو بیع فاسد نہیں ہوگی، اور اگر دونوں نے بیع میں اس کی شرط لگا دی ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی۔

اسی طرح ”فتاویٰ قاضی خاں“ میں ہے:

”والصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا، ثم ينظر إن ذكرا

شرط الفسخ في البيع فسد البيع، وإن لم يذكر ذلك في البيع وتلفظا بلفظة البيع بشرط الوفاء
اوتلفظا بالبيع الجائز، وعندهما هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك ولفظة صاحب
البحر فالبيع فاسد“ (قاضی خاں ۲/۳۴۹)۔

اور درست بات یہ ہے کہ وہ ایسا عقد ہے جو متعاقدین کے درمیان جاری ہوا اگر یہ لفظ بیع کے ذریعہ منعقد ہوا تو وہ رہن نہیں ہو سکتا، پھر دیکھا جائے گا کہ اگر عقد میں فسخ کی شرط کا ذکر کیا ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی، اگرچہ عقد میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا ہے، اور دونوں نے لفظ بیع کا تلفظ وفا کی شرط کے ساتھ کیا ہے یا دونوں نے بیع جائز کے ساتھ تلفظ کیا ہے، اور صاحبین کے نزدیک یہ بیع غیر لازم ہے، تب بھی یہی حکم ہے اور صاحب بحر کے الفاظ ہیں: ”فالبيع فاسد“ بیع فاسد ہے۔

مطلب یہ کہ فقہاء میں سے امام ظہیر الدین، صدر الشریعہ تاج الاسلام، صدر الشہید حسام الدین وغیرہ عدم جواز کے قائل ہیں، جیسا کہ مذکورہ عبارات سے ظاہر ہے۔ اسی طرح انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے ساتویں اجلاس منعقدہ جدہ سعودی عرب ۷ رذوالقعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۹۲ء کو اس موضوع پر بحث و تجویز کے بعد اس کا شرعی حکم بیان کیا ہے کہ یہ معاملہ درحقیقت ایسا قرض ہے جس میں نفع حاصل کیا جاتا ہے، لہذا یہ سودی معاملہ کا حیلہ ہے اور اکثر علماء کی رائے کے مطابق درست نہیں، نیز اکیڈمی کی رائے میں یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے مترجم خیر ندوی ۲۱۷)۔

فقہاء میں سے ایک بڑا طبقہ بیع و فاکے جواز کا بھی قائل ہے، فقہ کی مستند کتب میں جواز سے متعلق فقہاء کے اقوال و فیصلے مذکور ہیں، ”تبيين الحقائق“ میں مشائخ سمرقند اور امام نجم الدین نسفی کے اقوال اور اسی طرح صاحب ”نہایہ“ کا فتویٰ بھی نقل کیا ہے :

”ومن مشائخ سمرقند من جعله بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه ومنهم الإمام نجم الدين النسفی، فقال اتفق مشائخنا فی هذا الزمان فجعلوه بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى“ (تبيين الحقائق ۱۸۳/۵)۔

اور مشائخ سمرقند میں بعض نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے جو بعض احکام بیع کے لئے مفید بھی ہے اور انہیں میں سے امام نجم الدین نسفی فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے مشائخ اس عقد کے جواز پر متفق ہیں اور انہوں نے اس کو بعض احکام میں مفید قرار دیا ہے مثلاً بیع سے انتفاع اور بعض احکام (فروختگی کے عدم جواز) میں غیر مفید قرار دیا ہے اور یہ عقد لوگوں کی ضرورت اور تعال کی وجہ سے جائز ہے صاحب نہایہ نے کہا کہ اس کے جواز پر ہی فتویٰ ہے۔
مصری محقق علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں:

”ومن هذا القبيل بيع الأمانة المسمى بيع الوفاء جوزة مشائخ بلخ وبنخارى توسعه“ (الاشباه والنظائر/۱۳۰)۔

اور اسی قبیل سے بیع الامانت ہے جس کو بیع الوفا کہا جاتا ہے اس کو مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری نے لوگوں کے لئے وسعت دیتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔
علامہ ابن نجیم دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”ومنها: الافتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على اهل بنخارى وهكذا بمصر وسموه بيع الامانة“ (الاشباه والنظائر/۱۳۹)۔

اور انہیں باتوں میں سے بیع و فاکے کی صحت پر فتویٰ ہے جب اہل بخاری پر دیون زیادہ ہو گئے اور اسی طرح مصر میں بھی جواز کا فتویٰ ہے اور اہل مصر اس کو بیع الامانہ کہتے ہیں۔
علامہ ابن عابدین شامی نے بھی اس کے جواز کو نقل کیا ہے :

”أنه بيع صحيح يفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا يملك بيعه قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى“ (رد المحتار ۷/۵۳۶)۔

بلاشبہ یہ بیع صحیح ہے جو بعض احکام کو مفید ہے اس کے ذریعہ نفع کے حلال ہونے کی وجہ سے مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا مالک نہیں ہوگا اور زلیعی نے کتاب الاکراہ میں کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔

اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ بیع وفا اصل قواعد کی رو سے رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے اور اگر وہ بیع ہو تو بوجہ مشروط ہونے کے بیع فاسد ہے تب بھی حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے پس بلا اضطرار شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطرار شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ متاخرین کے فتویٰ پر عمل کر لے اگرچہ مشتری کو کوئی اضطرار نہیں (امداد الفتاویٰ ۳/۱۰۷/۱۰۸)، حضرت تھانوی نے اولاً اصول کے اعتبار سے ناجائز قرار دیا مگر بصورت اضطرار دوسرے فریق جو جواز کے قائل ہیں ان کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے۔

درمختار میں ایک دوسری جگہ پر منقول ہے :

”القول السادس في بيع الوفاء: أنه صحيح لحاجة الناس فرارا من الربا، وقالوا: ماضق علي الناس أمرا لا اتسع حكمه“ (درمختار مع رد المحتار ۷/۵۵۱)۔

چھٹا قول بیع وفا کے بارے میں ہے کہ وہ لوگوں کی ضرورت اور ان کو سود سے بچانے کے لئے درست ہے محققین نے کہا ہے کہ جب کوئی معاملہ لوگوں پر تنگ ہو جاتا ہے تو اس کے حکم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

خلاصہ و مشورہ:

مذکورہ عبارت سے واضح ہوا کہ مشائخ سمرقند، مشائخ بلخ، مشائخ بخاری اور امام نجم الدین نسفیؒ اور صاحب نہایہ وغیرہ بیع وفا کے جواز کے قائل ہیں اور اہل مصر اور علامہ ابن نجیم مصری نے اس کے جواز پر فتویٰ نقل کیا ہے علامہ ابن عابدین شامی نے بھی اس کو درست قرار دیا ہے، ان تمام تحریرات اور فتاویٰ کی روشنی میں اولیٰ اور انسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی ضرورت اور ان کو سود سے بچانے کے لئے بیع وفا جائز اور شرعا منعقد و درست ہے۔

البتہ احتیاط کے پیش نظر فقہاء کی عبارات میں غور و فکر کرنے کے بعد بیع وفا میں ایک احتیاطی صورت اپنائی جاسکتی ہے، کیونکہ اس معاملہ میں جواز میں یہ بات مانع ہوتی ہے کہ عقد بیع کے وقت بیع کو ثمن اول کی ادائیگی پر واپسی کی شرط لگائی جاتی ہے، لہذا اگر عقد میں ثمن اول پر واپسی کو بطور شرط ذکر نہ کیا جائے اور بعد عقد ثمن اول پر واپسی کو بطور وعدہ متعین کر لیا جائے تو عقد تو ایجاب و قبول سے منعقد ہو جائے گا، اور وعدہ کی وجہ سے عقد کو فاسد اور ناجائز نہیں قرار دیا جاسکے گا کیونکہ وعدہ کی حیثیت دوسری ہوگی۔

”فتاویٰ قاضی خاں“ میں اس صورت کو ذکر کیا گیا ہے:

”وان ذکر البیع بلا شرط ثم شرطه علی وجه المواعدة جاز البیع ولزم الوفاء، وقد يلزم

الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا“ (فتاویٰ فاضلی خاں/۳۴۹۲)۔

اور اگر فریقین نے بلا شرط کے لفظ بیع کا ذکر کیا پھر اس کے بعد معاہدے کے طور پر وفا کی شرط لگائی تو بیع جائز اور درست ہو جائے گی اور وفا بھی لازم ہوگی اس لئے کہ کبھی سود سے لوگوں کو بچانے کے لئے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وعدہ کو پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔
”در مختار“ میں ہے :

”قلت : ومفاده أنهما لو تواضعا على الوفاء قبل العقد ثم عقد اخیالاً عن شرط الوفاء في العقد جائز ولا عبرة للمواضعة“۔

اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر دونوں نے عقد بیع سے قبل وفا پر عہد باندھ لیا اور پھر شرط وفا سے خالی عقد کیا تو عقد جائز ہے اور عہد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے مذکورہ عبارت پر حاشیہ کے تحت لکھا ہے :

”ولو تواضعا قبل البيع ثم تبایعا بلا ذكر شرط فيه جاز البيع عند أبي حنيفة إلا إذا تصادقا انهما تبایعا على تلك المواضعة - وكذا لو تواضعا الوفاء قبل البيع ثم عقدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز ولا عبرة للمواضعة السابقة ۵۱۔ وفي البزازیة : وإن شرط الوفاء ثم عقد ا مطلقا إن لم یقر بالبناء على الأول فالعقد جائز ، ولا عبرة بالسابق ، كما فی التلجنة عند الامام“ (شامی/۷/۵۴۵)۔

علامہ ابن نجیمؒ ”البحر الرائق“ میں بیع وفا پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”قد نص فی غریب الروایة عن الامام ان البيع لایكون تلجنة حتى ینص علیها فی العقد وهي الوفاء واحد“ (البحر الرائق/۶/۱۲)۔

دوسرے مقام پر علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں: ”قلت : هذا العقد مرکب من العقود الثلاثة كالزرافة فیها صفة البعیر والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إلیه بشرط سلامة البدلین لصاحبهما“ (البحر الرائق/۶/۱۳)۔

مذکورہ تمام عبارات سے اسی رائے کو تقویت ملتی ہے کہ بوقت عقد شرط کو ذکر نہ کیا جائے اور عقد کے بعد یا عقد سے قبل بطور معاہدہ طے کر لیا جائے کہ ثمن اول پر بیع کو واپس کر دیا جائے گا تو یہ عقد درست ہوگا۔ انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی کے سترہویں اجلاس جو ۲۸/ جمادی الاول ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۴ جون ۲۰۰۶ء عمان میں منعقد ہوا تھا اس میں یہ طے پایا، کہ محض ایجاب و قبول سے بیع منعقد ہو جائے گی اور کسی وعدے کی وجہ سے اس کو فاسد اور ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ فریقین کی جانب سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرنا یا نیتاً لازم ہوگا قضاء لازم نہیں ہوگا۔ (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ کے شرعی فیصلے ص ۴۹۹)۔

لہذا مناسب یہ ہے کہ عقد بیع سے پہلے یا بعد میں ثمن اول پر بیع کی واپسی کا وعدہ کر لیا جائے اور پھر عقد بیع ہر طرح

کی شرط سے خالی کر کے کیا جائے تو انعقاد بیع میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی اور یہ بیع منعقد ہو جائے گی اور وعدہ کی وفاداریاً ہوگی قضاء لازم نہ ہوگی، اور یہ صورت شرعاً جائز ہے۔

سوالات کا ترتیب وار جواب:

سوال (۱) یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

جواب۔ یہ معاملہ اگر عقد بیع کے وقت خاص قید و بند کے ساتھ کیا جائے تو بیع فاسد ہوگی اور شرعاً درست اور منعقد نہیں ہوگی۔ لیکن اگر قید و بند کو عقد بیع کے ایجاب و قبول سے پہلے یا بعد میں طے کیا جائے اور عقد بیع کو اس سے خالی رکھا جائے تو اس طرح کی قید و بند کے باوجود بیع منعقد ہو جائے گی۔ ”وان ذکر البیع بلا شرط ثم شرطه علی وجه المواعدة جاز البیع، ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا“ (قاضی خاں ۲/۳۴۹) گویا یہ عقد بیع اور وعدے کا مجموعہ کہلائے گا۔

سوال (الف) بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ثمن اول کی ادائیگی کے وقت حسب وعدہ بائع ہی کے ہاتھ بیچنا ضروری ہے، لیکن اگر کسی دوسرے کو بھی بیچ دے تو یہ قضاء جائز ہے، البتہ وعدہ خلافی کا گنہگار ہوگا دیانت کا تقاضہ یہی ہے کہ فروخت کنندہ کے ہاتھ ہی فروخت کرے۔
سوال (ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟
جواب: حسب وعدہ دیانتہ و اخلاقاً سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، لیکن چونکہ مشتری اول اس وقت بیع کا مالک ہے اس لئے اپنی ملکیت میں سابقہ قیمت سے زیادہ یا ثمن مثل کے مطالبے کا قضاء مجاز ہوگا، البتہ وعدہ خلافی کا بھی گنہگار ہوگا،
”لأن الخلف في الوعد حرام“ (الاشاہ والنظار ۳۰/۲۳۷)۔

سوال (ج) خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب: حاصل شدہ بیع خریدار کی ملکیت ہے، اس لئے اس کو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

سوال (د) خریدار اگر کسی دوسرے کو بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: اگر کسی دوسرے کے ہاتھ بیچا جائے تو قضاء بیع جائز اور نافذ ہوگی اور قیمت کا بھی وہی مالک ہوگا اور مزید

قیمت بھی لے سکتا ہے، البتہ وعدہ خلافی کا گنہگار ہوگا۔

سوال (۲) اگر اس کو رہن مان لیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: بعض فقہاء نے اس کو رہن کے حکم میں مانا ہے فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

”قال أكثر المشائخ منهم السيد الإمام أبو شجاع والقاضي الإمام أبو الحسن علي السغدی: حكمه حكم الرهن لا يملكه المشتري ويضمنه المشتري بالأكل من ثمره ولإباح له الانتفاع ولالأكل الإباحة المالك ويسقط الدين بهلاكه إذا كان به وفاء بالدين ولا يضمن الزيادة إذا هلك لبصنعه وللبيع أن يسترد إذ قضى الدين“ (قاضی خاں ۳۴۹= تبیین الحقائق ۵/۱۸۳)۔

اکثر مشائخ نے کہا جن میں امام ابو شجاع اور قاضی امام ابو الحسن علی السغدی وغیرہ ہیں کہ اس بیع کا حکم رہن کے حکم کی طرح ہے اس میں مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا اور اس کے پھل میں سے کھانے کی وجہ سے مشتری اس کا ضامن ہو جائے گا اور مشتری کے لئے بیع سے انتفاع مباح نہیں ہے اور نہ ہی اس میں سے کچھ کھانا جائز ہے اور بیع کی ہلاکت کی وجہ سے دین ساقط ہو جائے گا، جب بیع دین کے برابر ہو اور زیادہ کا تاوان لازم نہیں ہوگا، جب مشتری کی تعدی اور لاپرواہی کے بغیر ہلاک ہو جائے اور بائع کو بیع واپس لینے کا حق ہوگا جب دین ادا کرے۔

الغرض اس کو رہن قرار دینے کی صورت میں احکامات بدل جائیں گے، جو رقم بائع کو حاصل ہوگی وہ قرض ہوگی اور بیع شے مرہون ہوگی۔

سوال: الف: جب بیچنے والا اس کو واپس نہ لے تو اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: رہن کی صورت میں مشتری بیع کا مالک نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ مرہون ہوتا ہے میعاد مذکور میں اس کے لئے جائداد سے نفع اٹھانا درست نہیں ہے، ”قاضی خاں“ میں ہے:

”و حكمه حكم الرهن لا يملكه المشتري ويضمنه بالأكل من ثمره ولإباح له الانتفاع“ (فتاویٰ قاضی خاں ۳۴۹/۲)۔

اس کا حکم رہن ہے مشتری اس کا مالک نہ ہوگا اور اس میں سے کھالینے کی وجہ سے ضامن ہوگا اور اس کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

”ولانتفع المرتهن استخداما وسكنى ولبسا واجارة واعارة؛ لأن الرهن يقتضى الحبس إلى أن يستوفى الدين دون الانتفاع“ (المحررات ۶/۳۳۸ کتاب الرهن)۔

اور مرہون خدمت لینے، رہائش اختیار کرنے، پہننے، کرایہ پر دینے ادھار دینے کے اعتبار سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ رہن جس کا تقاضہ کرتا ہے، یہاں تک کہ دین بلیغ پورا پورا وصول کر لیا جائے۔

سوال: ب اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: چونکہ بیع شے مرہون ہے، اس لئے کرایہ عام رواج کے مطابق لازم ہوگا، مروجہ کرایہ سے کم دینا جائز نہ ہوگا اور بائع بھی اپنی جانب سے کرایہ کم کر دے تو بھی جائز نہ ہوگا، چونکہ بائع کو ملنے والی رقم قرض ہے اور اب کرایہ میں ہونے والی تخفیف اسی قرض کی وجہ سے ہے تو یہ سود ہے جو درست نہیں ہے۔

سوال (ج) اس صورت میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟
جواب: اس صورت میں خریدار بیع سے کسی بھی طرح کا نفع حاصل نہیں کر سکتا ہے، سوال الف کے جواب میں اسکی تفصیل آچکی۔

سوال (د) خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے، یا نہیں اگر بیچے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟
جواب: خریدار کے لئے اس کو بیچنا درست نہیں ہے، ہاں اگر مشتری کو اپنا دیا ہو اور وہ بیع جو شمن کی صورت میں دیا ہے ملنے کی شکل نہ بن پارہا ہو تو استیفاء قرض کے لئے راہن کی اجازت سے شے مرہون کو اپنی ملکیت میں لے کر اس کو بیچ کر اپنی رقم حاصل کر سکتا ہے اگر شے مرہون کی قیمت قرض سے زائد ہے تو زائد قیمت کا واپس کرنا ضروری ہے۔

سوال (۳) ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپیہ رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے تو اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار ماہوار ہونا چاہئے، لیکن پانچ سو یا ایک ہزار طے کیا جاتا ہے، کیونکہ زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے تو کیا زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت اور راہن کی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

جواب: مکان یا دکان کرایہ پر لینے کی صورت میں جو رقم بطور ضمانت لی جاتی ہے وہ شریعت کے کسی بھی قاعدہ پر منطبق نہیں ہوتی ہے، کیونکہ جو تعامل ہے اس کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ قرض امانت اور راہن کسی بھی صورت پر فٹ نہیں ہوتی، بلکہ طریقہ کار یہ بتلاتا ہے کہ وہ رشوت ہے جو سراسر حرام اور ناجائز ہے اور اس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

ہاں لوگوں کی سہولت کے لئے اس کو قرض کی صورت سمجھا جا سکتا ہے، مگر اس صورت میں کرایہ میں تخفیف سود سے مشابہت پیدا کر دیتی ہے اس وجہ سے اس سے بچنا بھی لازم اور ضروری ہے۔

بیع الوفاء شریعت کی نظر میں

مولانا محمد فاروق ☆

بیع واپسی زیادہ قیمت کا مطالبہ:

جو لوگ بیع الوفاء کو جائز کہتے ہیں، خواہ ضرورت کی وجہ سے ہو، یا شرط وفاء عقد کے بعد لگانے کی وجہ سے ہو، دونوں صورتوں میں مشتری کے لئے زیادتی ثمن کے مطالبہ کا حق نہیں، اس لئے کہ عاقدین کے مابین مثل ثمن ادا کرنے پر بیع لوٹا دینے کا عہد ہو چکا ہے، اور حاجت انسانی کی وجہ سے کبھی وعدوں کی تکمیل ضروری ہوتی ہے، لہذا اس عہد کے مطابق صرف مثل ثمن کے مطالبہ کا حق ہوگا، جیسا کہ علامہ علاء الدین حسکفی فرماتے ہیں:

”ولو بعده على وجه الميعاد جاز، ولزم الوفاء به، لان المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس“ (الدر المختار ۲/۵۴۷ زکریا) (اگر بیع ہو جانے کے بعد وعدہ کے طور پر شرط وفاء قرار پاتی ہے تو جائز ہے، اور اس کا پورا کرنا لازم ہے، اس لئے حاجت ناس کی وجہ سے کبھی وعدوں کا ایفاء لازم ہوتا ہے)۔

اور شرط فاسد کے ساتھ بیع کے جواز کی صورت میں، جواز کا ثمرہ صرف بیع سے انتفاع کے جواز میں ظاہر ہوگا، تاکہ مشتری بیع سے فائدہ اٹھانے میں مرتکب ربوانہ ہو، اس بیع کے جواز کا ثمرہ نہ تو زیادتی ثمن میں ظاہر ہوگا اور نہ بیع کو بیچنے یا بہہ وغیرہ کرنے کا حق ہوگا، جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

”إنه بيع صحيح مفيد لبعض احكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه الخ وفيه؛ وبعض الفقهاء يسميه البيع الجائز ولعله سلبنى على أنه بيع صحيح لحاجة التخلص من الربا حتى يسوء للمشتري اكل ريعه“ (شامی ۷/۵۴۶) (بے شک یہ بعض احکام، یعنی بیع سے انتفاع کے حلال ہونے کے سلسلے میں بیع صحیح ہے، مفید ہے، مگر مشتری بیع کو بیچنے کا مالک نہیں ہے، اور شامی میں ہے کہ بعض فقہاء اس عقد کو بیع جائز نام رکھتے ہیں، اور اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ بیع ربا سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت کی وجہ سے صحیح ہے، تاکہ مشتری کے لئے بیع کے نفع سے کھانا جائز ہو)۔

انتفاع بیع کا حکم:

رہی بات عین بیع سے مشتری کے فائدہ اٹھانے کی، تو اگر بیع الوفاء میں مشتری کے فائدہ اٹھانے کی شرط لگا دی گئی ہے تو مجوزین کے نزدیک فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے، اور اگر بیع میں فائدہ اٹھانے کی شرط نہیں لگائی گئی ہے، تو مشتری کے لئے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں، اس لئے کہ جب شرط مذکور سے عقد خالی ہے تو حقیقت کے اعتبار سے رہن ہے، اور رہن سے مرتہن فائدہ نہیں اٹھا سکتا، جیسا کہ ”شرح المجلہ“ میں ہے:

”وإذا شرط في بيع الوفاء أن يكون قدر من منافع المبيع للمشتري صح ذلك، وإن لم يشترط ذلك، فليس للمشتري أن ينتفع المبيع، لأنه في يده كالرهن“ (شرح المجلہ ۱/۲۵۱) (اور جب بیع الوفاء میں منافع بیع کے کچھ حصہ کی شرط مشتری کے لئے طے ہو جائے تو یہ صحیح ہے، اور اگر یہ شرط نہ لگائی جائے تو مشتری کے لئے بیع سے انتفاع جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ اس کے قبضہ میں رہن کی طرح ہے۔

اور اگر وعدہ استرداد عقد بیع کے بعد قرار پایا ہے تو ظاہری بات ہے کہ بیع بالکل جائز ہے، اس لئے مشتری کے لئے انتفاع سے کوئی چیز مانع نہیں ہے، کما مر من قبل مفصلاً

بیع کا حکم:

ما قبل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ اس بیع الوفاء کی اجازت دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کے جواز کا ثمرہ صرف بیع سے انتفاع کے جواز میں ظاہر ہوگا، مشتری کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ اس بیع کو کسی کے ہاتھ بیچ دے یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ مالک بنانے کا تصرف کرے، جیسا کہ شرح المجلہ میں ہے:

”ليس للبائع ولا للمشتري بيع الوفاء من آخر“ (ایضاً ۱/۲۲۴)۔

(بائع و مشتری دونوں میں سے کسی کے لئے بھی وفاء کی بیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں)۔
حتیٰ کہ اگر مشتری نے کسی دوسرے سے اس کو بیچ دیا اور اس کا مالک بنا دیا، تو بائع یا اس کے ورثہ کو مشتری ثانی سے بیع واپس لینے کا حق حاصل ہوگا، جیسا کہ علامہ ہسکلفی فرماتے ہیں:

”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد، قال الشامي: هذا على القول بأن رهن وكذا..... بانه بيع يفيد الانتفاع به، فانه لا يملك بيعه“ (شامی ۱/۵۳۸) (اور اگر مشتری نے اس کو بیچ دیا تو بائع یا اس کے ورثہ کو حق استرداد حاصل ہوگا، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ یہ حکم بیع الوفاء کو رہن ماننے کی صورت میں ہے، اسی طرح اس قول کے مطابق بھی ہے کہ یہ بیع ہے جو بیع سے انتفاع کا فائدہ دیتی ہے)۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بیع کی حیثیت رہن جیسی ہے، اور رہن میں تصرف بیع وغیرہ کی اجازت نہیں ہے، جیسا کہ

”موسوعہ فقہیہ“ میں ہے:

”ان بیع الوفاء لا یسوغ للمشتري التصرف الناقل للملك کالبيع و الهبة عند من محبوه (الی قولہ) لانه کالرهن، والرهن لا یجوز بیعه“ (موسوعہ فقہیہ ۲۶۲/۹) (بے شک بیع الوفاء میں مشتری کے لئے ناقل ملک تصرف جیسے بیچنا، ہبہ کرنا، مجوزین کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس لئے کہ بیع رہن کے حکم میں ہے اور رہن کو بیچنا جائز نہیں ہے)۔

رہن کی صورت میں:

جو لوگ بیع الوفاء کو لفظ و عبارت کے اعتبار سے بیع اور حقیقت کے اعتبار سے رہن مانتے ہیں، جیسا کہ اکثر و بیشتر علماء کا یہی قول ہے، تو اس صورت میں اس عقد پر رہن کے جملہ احکام جاری ہوں گے، جیسا کہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

”قال فی الخیریه: والذی علیہ الاکثر أنه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الاحکام“ (شامی ۵۳۶/۷) (خیریہ میں فرمایا کہ: جس قول پر اکثر و بیشتر حضرات ہیں وہ یہ ہے کہ یہ عقد رہن ہے، احکام رہن سے کسی بھی طرح خارج نہیں ہے)۔

رہن سے انتفاع:

لہذا مرہن یعنی مشتری کے لئے اس شے مرہون سے انتفاع کی اجازت ہوگی یا نہیں، تو اس سلسلے میں تقریباً سبھی لوگ متفق ہیں کہ راہن، یعنی بائع کی اجازت کے بغیر رہن سے انتفاع جائز نہیں، جیسا کہ شرح الحجۃ میں ہے:

”لیس للمرتہن الانتفاع بالرهن بدون اذن الراهن“ (شرح الحجۃ ۴۱۵/۱) (مرہن کے لئے بدون اذن راہن رہن سے انتفاع جائز نہیں ہے)۔

تاہم اگر راہن خود مرہن کو انتفاع کی اجازت دے دے تو کیا مرہن کے لئے انتفاع کی اجازت ہو سکتی ہے؟
تو اس سلسلے میں فقہاء کے مابین قدر اختلاف ہے:

بعض حنفیہ اس صورت میں مطلقاً اجازت دیتے ہیں، اور دوسرے بعض مطلقاً ممانعت کے قائل ہیں، اس لئے کہ شے مرہون سے انتفاع کی صورت میں رہو یا شبہ رہو لازم آتا ہے، اور رہو یا شبہ رہو کی اباحت میں اجازت معتبر نہیں۔ اور بعض حضرات تفصیل کا قول فرماتے ہیں جس سے پہلے دونوں اقوال میں تطبیق ہو جاتی ہے وہ یہ کہ: اگر عقد میں شرط انتفاع لگا دی گئی تو یہ مفضی الی الربو ہونے کی وجہ سے ناجائز و حرام ہے، اور اگر عقد میں انتفاع کی شرط نہیں لگائی گئی تو جائز ہے، اس لئے کہ یہ راہن کی طرف سے مرہن کے لئے ایک تبرع و صلہ ہے جس کی اجازت ہے، علامہ وہبہ زحیلی بیان کرتے ہیں:

(اور جب راہن مرتہن کوشی مرہون سے انتفاع کی اجازت دے دے تو بعض حنفیہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، اور ان میں سے بعض مطلقاً ممانعت کے قائل ہیں، اس لئے کہ اس میں ربایا شبرہ باللازم آتا ہے، اور اجازت و رضا، ربایا اس کے شبہ کو حلال نہیں کرتی، اور ان میں سے بعض تفصیل کے قائل ہیں: چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر شرط انتفاع عقد رہن میں ہے تو رہا ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اور اگر عقد میں شرط نہیں ہے تو جائز ہے، اس لئے کہ یہ راہن کی جانب سے مرتہن کے لئے ایک قسم کا تبرع ہے، تاہم شرط لگانے کی دو قسمیں ہیں: صریحاً اور متعارفاً) (الفقہ الاسلامی وادلنہ ۲/۴۲۹۰)۔

صریحاً:

تو یہ ہے کہ باضابطہ عقد رہن میں شرط لگائی جائے کہ مرتہن شی مرہون سے منتفع ہوگا، اور متعارف یہ ہے کہ عقد میں باضابطہ شرط نہیں لگائی گئی، تاہم غالب احوال لوگوں کا یہی ہے کہ جب وہ کسی کو قرض دے کر شی مرہون پر قبضہ کرتے ہیں تو انتفاع کا ارادہ رکھتے ہیں، ورنہ اگر انتفاع کی اجازت نہ ہو تو وہ کسی بھی طرح قرض دینے کے لئے تیار نہ ہوں، اور قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز معروف ہوتی ہے وہ شرط کے درجہ میں ہوتی ہے، اس لئے موجودہ زمانہ میں خواہ عقد میں شرط انتفاع ہو یا نہ ہو، معروف ہونے کی وجہ سے ممنوع ہوگا، اور یہی سمجھا جائے گا کہ انتفاع مشروط ہے، اور جب مشروط ہے تو انتفاع بالراہن جائز نہیں۔ جیسا کہ وہ بہ زحلی اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

(اور شرط لگانا کبھی تو صراحتہ ہوتا ہے اور کبھی عرف و عادت کے طور پر ہوتا ہے، اور قاعدہ ہے ”المعروف کالمشروط“) (الفقہ الاسلامی وادلنہ ۲/۴۲۹۰) اور شامی میں ہے کہ (غالب احوال الناس یہ ہے کہ وہ قرض دیتے وقت انتفاع کے خواہاں ہوتے ہیں، اگر انتفاع کی امید نہ ہو تو وہ روپے کسی طرح نہ دے، اور یہ بمنزلہ شرط کے ہے، اس لئے کہ معروف چیز مشروط کے حکم میں ہوتی ہے، اور اس وجہ سے اس عقد کا ممنوع ہونا معین ہو جاتا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ ہر ایسا قرضہ جو نفع کا باعث ہو خواہ وہ نفع مشروط ہو یا متعارف ہو، بہر صورت حنفیہ کے نزدیک سود ہونے کی وجہ سے حرام و ناجائز ہوگا، جیسا کہ علامہ زحلی مسئلہ نقل فرماتے ہیں: (ہر ایسا قرضہ جو نفع کا باعث ہو خواہ نفع مشروط ہو یا متعارف حنفیہ کے نزدیک ربا کے حکم میں ہے)۔

”اعلاء السنن“ میں امام ابن سیرین کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہی فرمان منقول ہے کہ رہن سے انتفاع سود و ربا ہے، جیسا کہ نقل فرماتے ہیں:

”عن ابن سیرین قال: جاء رجل إلى ابن مسعود فقال: إن رجلاً رهني فرساً فكتبها قال: ما أصبت من ظهرها فهو ربا، أخرجه عبد الرزاق“ (امام ابن سیرین سے روایت ہے کہ ایک آدمی ابن مسعود کے پاس آیا اور کہنا لگا کہ ایک آدمی نے میرے پاس گھوڑا رہن پر رکھا ہے، اور میں نے اس پر سواری کر لی تو حضرت عبداللہ بن

مسعود نے فرمایا کہ گھوڑے کی پشت سے جو تم فائدہ اٹھایا ہے وہ سود ہے۔
 نیز حضرات اکابر نے بھی شی مرہون سے مرہن کے لئے انتفاع کی اجازت نہیں دی ہے، جیسا کہ ”امداد الفتاویٰ“، ”کفایت المفتی“ اور ”فتاویٰ محمودیہ“ وغیرہ میں موجود ہے۔
 حاصل یہ ہے کہ بیع الوفاء کو رہن ماننے کی صورت میں مرہن، شی مرہون سے کسی طرح کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، خواہ شی مرہون سے اجارہ داری کے ذریعہ ہو یا کاشتکاری کے ذریعہ ہو، یا کسی اور طریقہ سے ہو۔
 مرہون کو کرایہ پر لینا:

بیع الوفاء کو حقیقتہً رہن ماننے کی صورت میں چونکہ بیع مرہون کے حکم میں ہوتی ہے، اس لئے راہن اگر شی مرہون، مرہن کو بطور اجارہ کے دے دے تو اس کی وجہ سے عقد رہن ختم ہو جائے گا، اور وہ شی بطور اجارہ کے رہ جائے گی، اور شی مرہون پر قبضہ بحیثیت مرہن کے نہیں رہے گا، بلکہ بحیثیت مستاجر کے رہے گا، جیسا کہ علامہ شامی فرماتے ہیں:
 ”إذا أجز الراهن الرهن عن المرتهن بنفسه الجرد عقد الإجارة ولا يحتاج تجديد القبض كما يفيدہ كلام البزازية“ (شامی زکریا ۱۰/۱۳۹) (جب راہن مرہن کو شی مرہون اجارہ پر دے دے تو محض عقد اجارہ سے رہن ختم ہو جائے گا، اور اس کے لئے تجدید قبضہ کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی)۔

”وفی شرح المجلة: أما الإجارة، فالمستاجر (الی قوله) إن كان هو المرتهن و جدد القبض للإجارة (الی قوله) بطل الرهن والأجرة للراهن“ (شرح المجلة ۱/۴۱۳) (اور شرح مجلہ میں ہے کہ بہر حال اجارہ تو مستاجر اگر خود مرہن ہو اور اجارہ کے لئے تجدید قبضہ کر لیا ہو تو رہن باطل ہو جائے گا اور اجرت راہن کے لئے ہوگی)۔
 اب اگر مرہن اجرت مثل کے عوض کرایہ پر لے لیتا ہے تو اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں وہ اپنے دیئے ہوئے قرض سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہا ہے، بلکہ عام کرایہ دے کر ایک نئے عقد کے ذریعہ کرایہ پر لے رہا ہے، لیکن اگر مروجہ کرایہ سے غیر معمولی کم کرایہ پر لیتا ہے تو اس سلسلے میں کچھ تفصیل ہے:
 اگر اس طرح کی شرط قرض دیتے وقت طے کی گئی کہ میں اتنا قرض اس شرط پر دیتا ہوں کہ آپ کو فلاں شی اتنے روپے کے عوض کرایہ پر دینا ہوگی، تو یہ صورت بالاتفاق ناجائز ہوگی، اس لئے کہ اس عقد میں منفعت زائدہ کی شرط ہے، جس سے ربا اور سود کا لزوم ہوتا ہے۔

”وفی الشامیہ: وقال خواهر زاده: ما نفل عن السلف محمول علی ما اذا كانت المنفعة مشروطة و ذلك مکروه بلا خلاف“ (شامی زکریا ۷/۳۹۷ فصل فی القرض) (خواہر زادہ نے فرمایا کہ سلف سے جو ممانعت منقول ہے وہ محمول ہے اس صورت پر جبکہ منفعت مشروط ہو اور یہ بلا اختلاف مکروہ ہے)۔

شامیؒ کا یہ جزئیہ اگرچہ مستقرض کے مقرض سے ثمن خالی کے بدلہ سامان خریدنے کے سلسلے میں ہے، لیکن مذکورہ صورت اجارہ سے مالا متحد ہے، کیونکہ دونوں ہی صورت میں ثمن کی زیادتی یا کرایہ کی غیر معمولی کمی قرض کی وجہ سے ہے۔ نیز موفق ابن قدامہ نے بلا کسی اختلاف کے اس طرح کی شرط کے ساتھ منفعت حاصل کرنے کو مبلغ تحریم سے قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

”وان شرط أن يوجره داره بأقل من أجرتها، أو على أن يستاجر دار المقرض بأكثر من أجرتها (الی قولہ) کان أبلغ فی التحريم“ (مغنی ۴/۳۹۱) (اور اگر یہ شرط لگائی گئی کہ بائع اپنا دار مشتری کو اس کی اجرت سے بہت کم اجرت پر کرایہ دے گا یا مقرض کا دار اس کی اصل اجرت سے زائد اجرت پر لے گا تو یہ غایت حرمت کا باعث ہوگا)۔

اسی طرح علامہ وہبہ زحیلی مسلک حنابلہ کے تحت فرماتے ہیں:

(اور اگر بغیر کسی تخفیف کے اجرت مثل کے عوض انتفاع ہو تو قرض وغیرہ میں جائز ہے، کیونکہ یہ انتفاع بالقرض نہیں ہے، بلکہ اجارہ کے ذریعہ انتفاع ہے، اور دیگر اجرت میں تخفیف کردی تو یہ قرض میں جائز نہیں)۔

البتہ عقد قرض میں اس طرح کم کرایہ سے لینے کی شرط تو نہیں تھی، تاہم بعد میں نئے عقد کے ذریعہ معاملہ اجارہ طے پایا اور اس میں معمولی قیمت طے ہوئی تو اس سلسلے میں ہمارا حنفیہ کے مابین اختلاف ہے، حضرت امام محمد اور امام کرخیؒ کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ”کل قرض جرنفعاً“ کے لئے منفعت کا عقد قرض میں مشروط ہونا ضروری ہے، اور یہاں مشروط فی العقد نہیں ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ ”فصل فی القرض“ میں تحریر فرماتے ہیں:

”کل قرض جرنفعاً حرام إذا کان مشروطاً (الی قولی) وإن لم یکن النفع مشروطاً فی القرض، فعلى قول الكرخي لا بأس به“ (شامی ۷/۳۹۵) (ہر قرض جو بائع نفع ہو جب مشروط ہو تو حرام ہے اور اگر نفع مشروط فی القرض نہیں ہے تو حضرت کرخی کے مطابق کوئی حرج نہیں ہے)۔

لیکن حضرت امام خصاص اور امام شمس الائمہ حلوانی اس طرح کے معاملہ کو درست نہیں کہتے اور اکثر و بیشتر مشائخ بلخ اس طرح کے معاملہ کو ناپسند جانتے ہیں، جیسا کہ علامہ شامیؒ قرضہ کے بعد مستقرض کے ثمن غالی کے بدلہ مقرض سے کوئی چیز خریدنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

”وذكر الحلواني: أنه حرام، (الی قولہ) وكثير من مشائخ بلخ كانوا يكرهونه ويقولون: إنه قرض جرنفعة، اذلولاه لم يتحمل المستقرض غلاء الثمن“ (شامی ۷/۲۹۷) (اور حضرت حلوانی نے ذکر فرمایا کہ یہ حرام ہے اور اکثر و بیشتر مشائخ بلخ اس کو کروہ جانتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک ایسا قرضہ ہے جو باعث منفعت ہے اس لئے کہ اگر منفعت پیش نظر نہ ہوتی تو مستقرض اس قدر غالی ثمن کا تحمل نہ کرتا)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر بیع الوفاء کو رہن مان لیا جائے، اور شی مرہون مشتری کو کرایہ پر دے دی جائے تو عقد رہن ختم ہو جائے گا، اور اجرت مثل کے ذریعہ یہ عقد اجارہ صحیح ہو جائے گا، لیکن اگر اجرت مثل سے غیر معمولی کم قیمت پر معاملہ اجارہ طے ہو تو مشروط بالعقد کی صورت میں بالاتفاق ناجائز اور عدم مشروط کے سلسلے میں اختلاف ہے، بندہ کار حجان عدم اجازت کی طرف ہے، تاکہ اس طرح کی حیلہ سازیوں سے حرمت سود کی خفت نہ ہو، اور اس جیسا عمل سود خواری کا ذریعہ نہ بن جائے۔

زر ضمانت کی حیثیت:

جو رقم ضمانت کے طور پر لی گئی ہے وہ عرف و عادت کے اعتبار سے قرض مشروط میں داخل ہے، گویا یہ عقد اس طور سے ہو رہا ہے کہ تم اگر اتنی خطیر رقم دو گے تو میں تم کو اجرت کثیرہ والا مکان یا دوکان معمولی اجرت پر دے دوں گا، تو اس طرح اجرت کثیرہ کا مکان و دوکان معمولی اجرت پر اسی لئے دیا جا رہا ہے، تاکہ قرضہ کی خطیر رقم سے مؤجر کو فائدہ حاصل ہو، اور مقرض اتنی بڑی رقم اسی لئے دے رہا ہے، تاکہ مکان و دوکان کم کرایہ پر ملے، اس لئے یہ صورت ”کل قرض جرنفعاً“ کے تحت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

اور اگر اس زر ضمانت کو رہن مان لیا جائے تو ٹھیک ہے کہ بدل اجارہ کے عوض رہن جائز ہے، لیکن اس قدر بدل اجارہ کے عوض اتنی بڑی رقم نہ تو رہن کے طور پر رکھنے کا معمول ہے اور نہ مالک مکان و دوکان کا اتنی معمولی اجرت کے بدلہ اپنے اعیان کو دینے کا معمول ہے، لہذا یہ صورت رہن کی نہیں ہے، بلکہ عرف و عادت کے اعتبار سے قرض مشروط کی صورت ہے۔

خلاصہ جواب:

(الف): بیع کے عنوان سے شرط و قید کے ساتھ جب دو عاقل عقد کریں تو بیع منعقد ہو جائیگی، خواہ شرط فاسد ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہو، یا لفظ بیع ہو اور معتاد رہن ہو، یا بیع ورہن اور فساد میں سے ہر ایک من وجہ ہو۔

ب- بیع قرار دینے کے بعد یہ شرط کہ ”کسی سے نہ بیچا جائے، بائع ہی سے بیچا جائے“ شرط فاسد ہے، البتہ تعامل و حاجت کی وجہ سے بعض حضرات کے نزدیک جائز ہے، اور بعض کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے، اور بعض کے نزدیک رہن ہے، لیکن بندہ کی رائے کے مطابق اس شرط کو ”عقد بیع“ ہو جانے کے بعد وعدہ کے طور پر طے کرنا چاہئے، تاکہ بالاتفاق بیع بھی جائز ہو جائے، اور عاقدین کے مقاصد بھی حاصل ہوں جیسا کہ تفصیل ماقبل میں مذکور ہوئی۔

ج- مجوزین بیع کے نزدیک فائدہ اٹھا سکتا ہے، بندہ کے نزدیک شرط فی العقد کی صورت میں اگرچہ فائدہ اٹھانا جائز ہے، تاہم صیانت دین و ایمان اور احتراز عن الشبہات کی وجہ سے فائدہ اٹھانے سے گریز کرنا چاہئے مکالمہ مضیٰ التفصیل، البتہ اگر وعدہ استرداد عقد بیع کے بعد ہو تو فائدہ اٹھا سکتا ہے احتراز کی ضرورت نہیں۔

د- اگر دوسرے سے بیچ دے تو مجوزین کے نزدیک بائع کو یا اس کی وفات کے بعد اس کے ورثہ کو دوسرے مشتری سے بیچ واپس لینے کا حق ہوگا، اور ان حضرات کے نزدیک مثل ثمن سے زائد کی اجازت نہیں ہوگی کما مرفصلاً:

۲- رہن کی صورت میں:

الف- رہن سے فائدہ اٹھانا سودور بوا ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔

ب- مردوجہ اجرت سے غیر معمولی کم اجرت پر دینے کی شرط اگر عقد فرض میں ہے تو بالکل جائز نہیں، اور اگر عقد قرض ہو جانے کے بعد ہے تو بعض کے نزدیک جائز اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، بندہ بھی اسی کا قائل ہے۔

ج- خریدار بیچ سے بیچ سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا۔

۳- زر ضمانت کی حیثیت عرف و عادت کے اعتبار سے قرض مشروط کی ہے، رہن کی نہیں، اس لئے اس طرح کا معاملہ باعث سود ہونے کی وجہ سے جائز نہیں۔



تیسرا باب

مختصر تحریریں

.....

بیع بالوفاء کی حقیقت اور حکم

مفتی جمیل احمد زیری ☆

بیع وفاء کے متعلق ایک سوال کے جواب میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

”بیع بالوفاء میں اختلاف ہے کہ یہ بیع ہے یا رہن؟ اور بیع ہے تو بیع صحیح ہے یا فاسد، اور صحیح یہ ہے کہ اگر بوقت بیع واپسی کی شرط کی تو بیع فاسد ہے، کیونکہ بیع شرط سے فاسد ہو جاتی ہے، اور بیع بالوفاء یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کی بیع کرے اور مشتری سے یہ شرط کرے کہ برس یا چھ مہینہ کے بعد جب میں ثمن واپس کر دوں تو میری چیز واپس کر دینا، بعض فقہاء اس کو رہن کہتے ہیں اور بعض بیع اور شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہو جاتی ہے“ (کامل ومدلل فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۴/۳۲۳)۔

اس جواب سے قبل ایک اور سوال کے جواب میں ”در مختار“ کی عبارت:

”وبیع الوفاء ذکرته هنا تبعاً للدرر صورته أن يبيعه العين باعت إلى جاز ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس، وهو الصحيح كما في الكافي والخانية“ (در مختار ۴/۲۷۷)۔

نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اس عبارت سے ”بیع الوفاء“ کی تعریف اور اس میں جو کچھ فقہاء کا اختلاف ہے، ظاہر ہو گیا، سو یہ اختلاف تو اب مرتفع نہیں ہو سکتا، اور ان اقوال میں سے ہر ایک کی تصحیح کی گئی ہے، اور ہر ایک کی طرف علماء کبار ہیں، کسی قول کی تغلیط نہیں ہو سکتی، لیکن باعتبار قواعد کے بیع فاسد ہونا بیع الوفاء کا رائج ہے، کیونکہ بیع شرط مخالف سے فاسد ہو جاتی ہے، مگر یہ فساد اس وقت ہے کہ بیع میں شرط اقالہ کی جائے، اور اگر بعد میں بطریق وعدہ اس کا ذکر کیا گیا تو فساد نہیں“ (کامل ومدلل فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۴/۳۲۳)۔

ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

”بلکہ بوقت معاملہ بیع قطعی ہو بلا کسی شرط کے، اور بعد میں بطریق وعدہ مشتری سے واپسی کا وعدہ لے لیا جائے، پس اگر ایسا ہوا تو نفع حاصل کرنا درست ہوگا، ورنہ نہیں“ (کتاب مذکور ۳۲۵/۱۳)۔

انہی مقامات پر اسی انداز کے حضرت مفتی صاحب کے چند فتاویٰ اور بھی ہیں، سب کا حاصل وہی ہے جو اوپر کے فتاویٰ میں مذکور ہوا۔

بیع الوفاء کے تحت ہی، ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

”یہ صورت بگاڑی ہوئی بیع بشرط الوفاء کی ہے، مگر اس کا طریق دوسرا ہے، پھر وہ بھی اصل مذہب ہی جائز نہیں“ (امداد الفتاویٰ ۱۰۷/۳)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”رہن قصداً اور بیع ظاہراً کو بیع الوفاء کہتے ہیں، سواصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے، اور انتفاع اس سے حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے، اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں“ (کتاب مذکور ۱۰۸/۳)۔

”فتاویٰ عالمگیری“ میں ہے:

”البيع الذي تعارف أهل زماننا احتيئالاً للربا وسموه بيع الوفاء هو في الحقيقة رهن، وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن لا يملكه ولا يطلق له الانتفاع إلا بإذن مالكة وهو ضامن لما أكل من ثمره واستهلك من شجره، والدين ساقط بهلاكه في يده إذا كان به وفاء بالدين ولا ضمان عليه في الزيادة إذا هلك من غير صنعه وللبائع استرداداه إذا قضى دينه ولا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام“ (فتاویٰ عالمگیری ۲۰۸/۳)۔

(وہ بیع جس سے ہمارے زمانے کے لوگ رہا کی حیلہ سازی کے طور پر متعارف ہیں، اس کا نام لوگوں نے بیع الوفاء رکھا ہے۔ وہ حقیقت میں رہن ہے، اور یہ بیع، مشتری کے قبضہ میں اسی طرح ہے، جیسے مرتهن کے قبضہ میں رہن، مشتری نہ اس کا مالک ہے، نہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کے لئے اس سے انتفاع جائز ہوگا، وہ اس کا جو میل کھالے یا اس کا جو درخت ضائع کر دے تو اس کا ضامن ہوگا، اگر بیع اس کے قبضہ میں رہتے ہوئے ضائع ہو جائے اور اس سے قرض کی ادائیگی ہو جا رہی ہو تو قرض ساقط ہو گیا، اور زیادہ کی صورت میں اس پر کوئی ضمان نہیں اگر ضائع ہونا بغیر اس کے کسی فعل کے ہو، اور بائع، قرض ادا کرنے کے بعد بیع کو واپس لے لے، ہمارے نزدیک اسی بیع اور رہن میں، کسی بھی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے)۔

”فتاویٰ عالمگیری“ کی ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع الوفاء کا وجود، سود کی حیلہ سازی کے لئے ہوا تھا، اور فقہ اکیڈمی کے سوانامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سود سے بچنے کے لئے اس کو اختیار کیا گیا، سواں نامہ کی عبارت ہے:

”خرید و فروخت کے باب میں ”بیع الوفاء“ بھی ضرورت و حالات کے تحت اختیار کی جانے والی ایک شکل ہے جس کو کھلے طور پر سودی معاملات سے بچنے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اختیار کیا گیا“۔

احقر کا خیال ہے کہ اگر بلا اضطرار و ضرورت شدیدہ اسے اختیار کیا گیا ہو تو احتیالاً لکربا میں سے ہوگا اور اضطرار و ضرورت شدیدہ کے نتیجہ میں اسے اختیار کیا گیا ہو تو سوالنامہ کے ذیل میں آئے گا۔

”بیع و فاء“ کو ”بیع“ کہا جائے یا رہن؟ اس سلسلہ میں احقر حضرت تھانوی کی رائے سے متفق ہے کہ یہ ظاہراً بیع ہے اور حقیقتاً و قصداً رہن ہے، اگر اس کو بیع مان لیا جائے تو بیع فاسد ہو جائے گی، کیونکہ مقضیٰ عقد کے خلاف شرط لگی ہوئی ہے اور رہن کے اعتبار سے اس شی کو بیچنے، خریدنے اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اگر پہلے سے واپسی کی شرط پر نہ بیچا ہو تو مشتری، شاید ہی واپس کرے اور شاید ہی کسی اور کو نہ بیچے، مجبور و مضطر مستفرض کے لئے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

احقر اپنی بساط کے مطابق اس مسئلہ کی پوری صورت حال پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ کوئی ضرورت مند جو اپنی ضرورت کے معاملے میں اضطرار شدید تک پہنچ چکا ہو اسے غیر سودی قرض نہ ملتا ہو اور اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی کوئی جائیداد وغیرہ بیچنے پر مجبور ہو، وہ اگر بیع و فاء کرے تو حضرت تھانوی کے الفاظ میں: ”بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے (امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۳)، جو کہ اس بیع کے جواز کے قائل ہیں اور مشتری پر وعدہ یا شرط جو بھی ہو، پورا کرنا لازم ہوگا، جبکہ بقول مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی ”یہ اختلاف تو اب مرتفع نہیں ہو سکتا اور ان اقوال میں سے ہر ایک کی تصحیح کی گئی ہے اور ہر ایک کی طرف علماء کبار میں کسی قول کی تغلیط نہیں ہو سکتی“ (مکمل و مدلل فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۴/۳۲۴)۔

حضرت مفتی صاحب کے اس انداز نے بھی ”بیع و فاء“ کے لئے مذکورہ صورت میں جواز کی گنجائش پیدا کی ہے۔ اگر بیع کی واپسی کا وعدہ، عقد بیع کے بعد لیا گیا ہو تو اس عقد کے، عقد بیع ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس وعدہ کو پورا کرنا فقہاء نے لازم لکھا ہے:

”ولو بعده علی وجه الميعاد جاز و لزم الوفاء به؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس، وهو الصحيح“ (در مختار ۲/۲۷۵)۔

(اور اگر عقد بیع کے بعد وعدہ کے طریقہ پر ہو تو بیع جائز نہیں ہے اور وعدہ کو پورا کرنا لازم ہے، اس لئے کہ وعدہ لوگوں کی حاجت کی وجہ سے لازم ہوتے ہیں، یہی صحیح ہے)۔

سوالنامہ کے جوابات:

۱- واپسی کی شرط، اگر عقد بیع کے وقت نہ رہی ہو، بعد میں بطور وعدہ ہو تو بلاشبہ یہ بیع صحیح ہے، اور اگر عقد بیع کے

وقت یہ شرط رہی ہو تو بیع فاسد ہے۔

البتہ اضطرار شدید میں متاخرین کے فتویٰ پر عمل کی گنجائش ہے۔

الف- اگر بائع، شرعاً اضطرار شدید کی حالت میں ہو اور یہ شرط رکھی ہو تو مشتری کو کسی دوسرے کو فروخت کرنے کا

اختیار نہ ہوگا۔

ب- جب بیع مان لی گئی تو زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے، مگر ثمن مثل سے زیادہ نہ ہو۔

ج- خریدار، فائدہ اٹھا سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنی ملکیت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

د- اضطرار کی حالت میں، وعدہ یا شرط مان لینے کی وجہ سے کسی اور کو بیچنے کا حق نہ ہوگا۔

۲- غیر مضطر کے لئے اس کی حیثیت رہن کی ہوگی۔

الف- خریدار کے لئے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، تو اس کو خریداری نہیں کہیں گے، بلکہ یہ

اجارہ ہے، اور مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم کرایہ ہو تو بھی جائز ہے، لیکن اگر مالک مکان یا زمین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے کم کرایہ مقرر کیا گیا ہو تو کراہت سے خالی نہ ہوگا۔

ج- اگر مذکورہ طریقہ پر خریدار ہے تو رہن ہونے کی وجہ سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانے کا حق نہ ہوگا، لیکن اگر شق ب

کے مطابق اجارہ ہے تو فائدہ اٹھانے کا حق ہوگا۔

د- رہن کی صورت میں خریدار بیچنے کا حق نہیں رکھتا، الا یہ کہ وہ صورت پیدا ہو جائے جو اسے مال مرہون سے اپنا

حق لینے پر مجبور کر دے۔

۳- اس صورت میں زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی، اور کرایہ میں کی جانے والی کمی کو ”کمل قرض جبر

نفعاً حرام“ (درمختار ۴/۱۹۴)، کے تحت لاکر قرض سے فائدہ اٹھانا نہیں قرار دیا جائے گا، کیونکہ دوکان کے کرایہ کی کمی کسی چیز کا

حصول نہیں، بلکہ ادائیگی کی کمی ہے، یعنی یہ شخص کوئی مال حاصل نہیں کر رہا ہے، بلکہ جو چیز اسے ادا کرنی پڑتی اس کی مقدار گھٹ

گئی ہے، اگرچہ من وجہ یہ بھی فائدہ ہی ہے، مگر اس کی صورت حال بقول ابن سلمہ ”بل هذا بیع جبر منفعة وهی

القرض“ (ردالمحتار ۴/۱۹۶) کے انداز میں بالفاظ دیگر ”هذا اجارة جبر منفعة وهی القرض“ قرار دی جائے گی۔

احقر کی معلومات کے مطابق ”کمل قرض جبر نفعاً حرام“ کے تحت جتنی مثالیں بیان کی جاتی ہیں سب میں

قرض دہندہ، قرض لینے والے سے نقد یا عین حاصل کرتا ہے، مثلاً ”شراء الشيء اليسير بثمان غال لحاجة القرض“

(درمختار ۴/۱۹۵، بعض فقہاء نے تو اس صورت کو بھی مع الکرہت جائز لکھا ہے دیکھئے: ردالمحتار مع درمختار کا یہی صفحہ)۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں

مقرض کو قرض کی وجہ سے معمولی چیز کا دام بہت زیادہ مل گیا، یہ حصول نقد ہوا، اسی طرح رہن سے فائدہ اٹھانے والا مرہون کھیت یا دوکان میں زراعت و اجارہ کرتے عین یا نقد کا حصول کرتا ہے۔ بعض فقہاء نے ”جو نفعاً“ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: ”سواء كانت المنفعة نقداً أو عيناً كثيرة أو قليلة“ (الفقه الاسلامی وادلتہ ۴/۲۶۶)۔



بیع و فاء کی شرعی حیثیت

مفتی شیری علی گجراتی ☆

”الدین یسر“ دین میں تو آسانی ہونی چاہئے اور اللہ کے رسول کا فرمان ہے کہ ”تم لوگوں کے ساتھ آسانی کیا کرو اور لوگوں کے ساتھ تنگی نہ کیا کرو“ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”یسروا ولا تعسروا“ کہ تم لوگوں کے ساتھ آسانی کرنا اور لوگوں کو تنگی اور پریشانی میں مت ڈالنا اور قاعدہ ہے کہ ”الضرورات تبیح المحظورات“۔

ان وجوہات کی بنا پر قاضی ابو یوسف نے، بلکہ احناف نے حیلوں کو جائز رکھا اور اسی بناء پر علماء سمرقند نے مجبوری کی وجہ سے یہ بیع و فاء کی شکل نکالی اور اس کو جائز کہا اور صاحب ”ہدایہ“ مرغینانی بھی علماء سمرقند میں سے ہیں، اسی وجہ سے وہ بھی فرما گئے: ”أما البيع الجائز المعتاد“ حالانکہ یہ معنی رہن ہے اور صاحب ”ہدایہ“ نے اس بیع و فاء کو ”کتاب الاکراہ“ میں ذکر کر دیا ہے اور بیع اکراہ تو مجبوری کی صورت میں ہوتی ہے اور یہ بیع و فاء بھی مجبوری کی وجہ سے ہوتی ہے اور مجبوری دونوں طرف سے ہوتی ہے کہ بائع کو بڑی رقم کوئی قرض دینا نہیں ہے اور مشتری اتنی بڑی رقم مفت میں کسی کو قرض دے گا نہیں، لہذا یہ بیع و فاء کی صورت نکالی ضرورت کی وجہ سے اور ضرورت بھی ایک مجبوری ہے اور مکراہ کی بیع جب اکراہ دور ہو جائے تو وہ فسخ کر سکتا ہے، لہذا جب وہ مدیون دین ادا کر دے تو اپنی چیز واپس لے سکتا ہے، ضرورت کے دفع ہونے کی وجہ سے۔

الف۔ چونکہ یہ بیع مکراہ کے حکم میں ہے اور بیع مکراہ یہ موقوف ہوتی ہے اکراہ کے دور ہونے پر، لہذا اکراہ کے دور ہونے پر مکراہ بیع فسخ کر سکتا ہے، اسی طرح یہاں بھی دین کی ادائیگی کے بعد مجبوری کے دور ہونے کی وجہ سے مدیون اپنی چیز واپس لے کر بیع کو فسخ کر سکتا ہے۔

ب۔ مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ یہ

بیع مکراہ کی طرح ہے۔

ج۔ چونکہ اس کو بیع مکراہ کے حکم میں کر دیا تو خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

د- خریدار کسی دوسرے سے اس بیع کو نہیں بیچ سکتا، اس لئے کہ یہ بیع مکرمہ کے حکم میں ہے۔
 (الف) اس بیع و فاء کی حیثیت چونکہ رہن کی بھی ہے، اس لئے کہ جب راہن مرتہن کو شیئی مرہون سے انتفاع کی اجازت دیدے تو اس سے مرتہن نفع اٹھا سکتا ہے اور اس بیع میں بائع کی طرف سے انتفاع بیع کی اجازت ہوتی ہے۔
 (ب) اگر اس کو قرض مان کر کرایہ کم لے تو جائز نہیں ہے، اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے: ”کل قرض جو نفعاً فہو رباً“۔

(ج) اس عرصہ میں خریدار اس شیئی سے کاشت کا تو فائدہ اٹھا سکتا ہے، البتہ اجارہ داری کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے کہ اگر کسی کو کرایہ پر دیا اور پھر اس نے خالی کرنے سے انکار کر دیا تو خریدار کے لئے بائع کو مکان سپرد کرنا دشوار ہو جائے گا۔

(د) اس بیع و فاء کو معنی رہن مانتے ہوئے بھی اس کو بیچنے کا بالکل حق نہیں ہے، اس لئے کہ مرتہن شیئی مرہون کو بیچ نہیں سکتا ہے۔

۳- اس کی حیثیت قرض کی ہوگی، اس لئے کہ مکان مالک ان روپیوں کو اپنے کاروبار میں استعمال کرنے کی غرض سے لے رہا ہے اور یہ صرف قرض ہی میں ہوتا ہے اور رہن ہی بات کرایہ میں کمی کرنے کی تو وہ حرام ہے رہا ہونے کی وجہ سے، ”کل قرض جو نفعاً فہو ربوا“۔

بیع الوفاء کی حیثیت اصول شرع کی روشنی میں

مولانا سید قمر الدین محمود بڑودوی ☆

خرید و فروخت کے باب میں بیع کی مختلف صورتیں عوام الناس کے درمیان رائج ہیں جن میں بعض صورتیں شریعت کے نزدیک قواعد فقہیہ کی روشنی میں جائز ہیں، بعض حرام اور ناجائز یا مکروہ ہیں۔ بعض صورتیں اصولاً تو ناجائز ہیں، مگر حاجات ناس اور عموم بلوی کے پیش نظر اس میں جواز کی گنجائش نکالی گئی ہے، اسی قسم کی ایک صورت بیع، بیع بالوفاء ہے۔

بیع وفاء کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص ضرورت مند ہے اپنی ضرورت کے لئے اسے رقم چاہئے غیر سودی قرض ملتا نہیں اور سودی قرض لینا نہیں چاہتا تو وہ اپنے سامان زمین جائیداد وغیرہ کی بیع اس طرح کرتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں اس کو خرید لو اور اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں وصول شدہ قیمت واپس کروں تو تم یہ اسی قیمت پر مجھے دیدینا کسی دوسرے کو مت فروخت کرنا۔

عقد بیع میں جو یہ شرائط لگائی گئی ہیں تو یہ بیع مع الشرط ہے اور ”نہی عن بیع وشرط“ کے ماتحت یہ بیع فاسد ہے، لہذا یہ بیع جائز نہ ہوگی اور اگر عقد بیع مطلقاً کیا عقد کے وقت کوئی شرط نہیں لگائی گئی، عقد سے پہلے یا بعد میں اس شرط کا تذکرہ اور جانین سے اس کا وعدہ کر لیا گیا تو اس صورت میں بیع تو صحیح ہو جائے گی، مگر اسے بیع وفاء نہیں کہا جائے گا۔

اگر واپسی کی شرط کے ساتھ بیع کی گئی تو یہ بیع ناجائز ہوگی اسے بیع نہیں، بلکہ رہن قرار دیا جائے گا اور جب کہ یہ معاملہ رہن کا ہو تو اس صورت میں مشتری کو اس جائیداد سے کسی قسم کے انتفاع کا حق حاصل نہ ہوگا، درحقیقت وہ مشتری نہیں، بلکہ مرتہن قرار دیا جائے گا اور مرتہن کو بلا اذن راہن شیئ مرہونہ سے انتفاع کا حق حاصل نہیں ہے، نیز شیئ مرہونہ کو فروخت کرنے کا بھی اسے حق نہیں:

”قلت: وبه صدر فی جامع الفصولین فقال رامز الفتاوی النسفی: البیع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة لا یملکہ ولا ینتفع به إلا یاذن مالکھ“ (رد المحتار ۵/۲۷۶)۔

”البيع الذى تعارف أهل زماننا احتيلاً للربا وسموه بيع الوفاء هو فى الحقيقة رهن، وهذا المبيع فى يد المشتري كالرهن فى يد المرتهن لا يملكه ولا يطلق له الانتفاع، إلا بإذن مالكة“ (فتاوى ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

اگر عقد بیع تو مطلقاً کیا گیا، مگر عقد بیع سے پہلے واپسی کی شرط کا تذکرہ کیا گیا تو اس صورت میں اصل مذہب تو فساد عقد ہے، جیسا کہ ”امداد الفتاویٰ“ (۱۰۸/۳) پر مذکور ہے:

”كما فى الدر المختار: ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً ولو بعده على وجه الميعاد جائز ولزم الوفاء به؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس“۔
اور بعض کے نزدیک عقد کے قبل ذکر کی گئی شرط کا اعتبار ہی نہیں اور عقد فاسد نہ ہوگا۔

”كما فى الدر المختار: لو تواضعا على الوفاء قبل العقد ثم عقداً خالياً عن شرط الوفاء فالعقد جائز ولا عبرة للمواضعة“۔

لیکن بہت سے متاخرین کا فتویٰ ہے کہ قبل عقد ذکر کی ہوئی شرط بھی معتبر اور عقد جائز ہے، ”الضرورة الناس، وفى رد المحتار: وقد سئل الخیر الرملی عن رجلین تواضعا على بيع الوفاء قبل عقده وعقد البيع خالياً عن الشرط، فأجاب بأنه صرح فى الخلاصة والفيض والتاتارخانية وغيرها بأن يكون على ما تواضعا“ (امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۱)۔

الحاصل متاخرین فقہاء کے نزدیک بیع بالوفاء جائز ہے، ”الضرورة الناس“ چنانچہ ”امداد الفتاویٰ“ (۱۰۸/۳) پر مذکور ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطراب تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں۔

”رد المحتار“ (۲۸۰/۵) پر مذکور ہے:

”القول السادس فى بيع الوفاء: أنه صحيح لحاجة الناس فراراً من الربا، وقالوا: ما ضاق على الناس أمر إلا اتسع حكمه، ثم قال: والحاصل أن المذهب عدم اعتبار العرف الخاص، ولكن أفتى باعتباره فأقول على اعتباره الخ“۔

خلاصہ یہ کہ متاخرین فقہاء نے حاجات ناس کا لحاظ کر کے بیع وفاء کی اجازت دی ہے، لہذا احقر کی رائے میں بیع وفاء کی اجازت مجبوری کے درجہ میں ہونی چاہئے۔

سوال کی بقیہ صورتوں کے جوابات حسب ذیل ہیں:

الف- بیع قرار دیئے جانے پر یہ شرط کے بعد میں کسی دوسرے کو نہ بیچا جائے اس کا کیا حکم؟ اس صورت میں مشتری

کو کسی دوسرے کو فروخت کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا، ”لأن المواعيد قد تكون لازمة لحوائج الناس“ -
 ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟ اگر واپسی کی
 شرط کرتے وقت یہ طے ہوا کہ موجودہ قیمت پر ہی بیچ کو واپس کرنا ہوگا تو اس صورت میں ”أوفوا بالعہد“ (سورہ
 اسراء: ۳۴) کے ماتحت سابق ادا کردہ قیمت پر ہی واپس کرنا ہوگا۔
 ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟ جب عقد بیع صحیح مان لیا گیا تو
 درمیانی مقررہ مدت میں مشتری کو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔
 د- خریدار اگر کسی دوسرے کو بیچ دے تو اس بیچ کا کیا حکم ہے اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ خریدار کو
 ”أوفوا بالعہد“ کے ماتحت بائع اول ہی کو واپس کرنا لازم ہوگا کسی دوسرے کو فروخت کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔
 اگر اس عقد کو رہن قرار دیا جائے تو مرتہن اس سے کسی قسم کا نفع حاصل نہیں کر سکتا:

”قال فی المنح: وعن عبد الله محمد بن اسلم السمرقندی وکان من كبار علماء سمرقند أنه
 لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربا؛ لأنه يستوفي
 دينه كاملاً، فلاتبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربا، وهذا أمر عظيم، (وقال بعد أسطر) قال الطحطاوى:
 قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاها لما أعطاه الدراهم، وهذا
 بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع والله تعالى اعلم“ (رد المحتار ۶/۲۸۲)۔
 خریدار کو فروخت کرنے کا حق اس صورت میں حاصل نہیں ہے۔

بیع و فاء سے متعلق احکام

مفتی انور علی اعظمی ☆

بیع و فاء ضرورت کے تحت اختیار کی جانے والی خرید و فروخت کی ایک شکل ہے جس کی بنیادی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کو قرض کی ضرورت ہے لیکن غیر سودی قرض اسے دستیاب نہیں ہو رہا ہے، اپنے کسی سامان کا سودا یوں کرتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں اسے لے لو پھر جب میں اتنا پیسہ واپس کر دوں تو میرا سامان مجھے لوٹا دینا اسے کسی اور کے ہاتھ نہ بیچنا۔

انسان اپنی چھوٹی بڑی ضروریات کی تکمیل کے لئے روپیوں کا محتاج ہوتا ہے، اس کے لئے وہ دوسرے سے قرض چاہتا ہے، چھوٹا قرض آسانی سے مل جاتا ہے، لیکن بڑا قرض حاصل کرنا دشوار ہے، اگر کوئی تیار بھی ہو گیا تو وہ اس کی گارنٹی چاہتا ہے، شریعت نے انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی صورت میں رہن کی شکل بتلائی ہے، تاکہ حاجت مند کی حاجت پوری ہو جائے اور قرض خواہ کا پیشہ بھی محفوظ رہے، رہن کی صورت میں قرض کی واپسی یقینی ہو جاتی ہے، لیکن قرض دار کے عاجز ہونے کے وقت میں قرض خواہ شی مرہون کو بیچ کر اپنا قرض وصول کر سکتا ہے، حدیث و تفسیر کی کتابوں میں رہن کا یہی فائدہ مذکور ہے، لیکن آج کل عام مسلمان صرف آخرت کے نفع کو سامنے رکھتے ہوئے رہن کی گارنٹی کے باوجود قرض دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ قرض دار تو قرض کی رقم حاصل کر کے اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے، جبکہ قرض خواہ شی مرہون سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، یہ اس لئے کہ شی مرہون سے مرہن کے لئے بلا اجازت انتفاع جائز نہیں (کنز الدقائق میں مذکور ہے جس کا ترجمہ ہے) اور جس کے پاس رہن رکھا جائے وہ سامان رہن سے خدمت لے کر یا اس میں رہ کر یا اس کو پہن کر یا اس کو کرایہ پردے کر یا وقتی طور پر عاریت پردے کر فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

ان حالات میں حصول قرض کا صرف مروجہ سودی طریقہ باقی رہ جاتا ہے، لیکن جن حضرات کے سامنے سود کی حرمت کی صریح نصوص ہیں، اور جنہیں اللہ رب العزت کے سامنے جو ابد ہی کا احساس بھی ہے وہ اس حرام طریقہ کو پسند نہیں کرتے، اس لئے اس کی متبادل کوئی ایسی ہی شکل بن سکتی ہے جس میں جانین کو نفع بھی ہو اور سود سے اجتناب بھی ہو، اس کے لئے حاجت مند اپنا کوئی سامان بیچنا چاہتا ہے، تاکہ اس کی قیمت سے اپنا کام چلائے اور پھر جب پیسے کا نظم ہو جائے تو سابقہ

قیمت ادا کر کے اپنا سامان واپس لے لے، اس تمہید کے بعد سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

۱- الف: اس معاملہ کو بیع کہا جائے یا رہن؟ اس سلسلہ میں ”در مختار“ میں مذکور ہے:

”وقیل: هو بیع یفید الانتفاع به، وفي الإقالة شرح المجمع عن النهاية: وعليه الفتوى، وقيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهنا، ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعا فاسداً، ولو بعده على الميعاد جاز ولزم الوفاء به“ (در مختار علی شامی ۷/۲۲۵ مطبوعہ دارالکتب دیوبند)۔

(اور یہ بھی کہا گیا ہے بیع ہے، اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، ”شرح مجمع“ کے ”باب الاقالة“ میں ”نہایہ“ سے نقل کیا ہے اس کے بیع ہونے پر فتویٰ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر معاملہ کا انعقاد لفظ بیع کے ساتھ ہو تو رہن نہیں ہوگا، پھر اگر دونوں نے معاملہ کے انعقاد کے وقت یا اس سے پہلے بیع کی واپسی کا ذکر کیا اور اس بیع کو غیر لازم سمجھا تو بیع فاسد ہوگی اور اگر واپسی کا ذکر اس کے بعد وعدہ کے طور پر کیا تو بیع جائز ہوگی اور وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوگا)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر عقد لفظ بیع کے ساتھ کیا جائے اور واپسی کی شرط نہ عقد سے پہلے ہونہ عقد کے وقت، بلکہ بعد میں ایک طرح کا وعدہ آپس میں ہو تو بیع درست اور جائز ہوگی، علامہ شامی نے زیلعی کا راجح مسلک یہی نقل کیا ہے اور اس صورت میں بیع کے صحیح ہونے کا مدار صاحبین کے اس قول پر ہے کہ عقد کے بعد شرط فاسد کو ذکر کرنا عقد کو فاسد نہیں کرتا (۷/۲۲۵)۔

موسوع فقہیہ (۹/۲۶۰) پر مذکور ہے: ”وذهب بعض المتأخرين من الحنفية والشافعية إلى أن بیع

الوفاء جائز مفید لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالبيع دون بعضها وهو بیع من الآخر“۔

”وحتهم في ذلك أن البيع بهذا الشرط تعارفه الناس وتعاملوا به بحاجتهم إليه فرار من

الربوا فيكون صحيحاً لا يفسد البيع باشرطه فيه، وإن كان مخالفاً للقواعد، لأن القواعد تترك بالتعامل، كما في الاستصناع“ (بحوالہ تبیین الحقائق للزیلعی)۔

(حنفیہ اور شافعیہ کے بعض متاخرین علماء اس جانب گئے ہیں کہ بیع وفا جائز ہے، بعض احکام کے لئے مفید ہے اور

بعض کے لئے نہیں، مثلاً اس بیع سے مشتری نفع اٹھا سکتا ہے، لیکن اسے دوسرے کے ہاتھ بیع نہیں سکتا، جواز کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ بیع اس شرط کے ساتھ لوگوں کے درمیان متعارف ہے اور لوگ اپنی ضرورتوں کی وجہ سے سود سے بچنے کے لئے ایسے بیع کو عمل میں لاتے ہیں، لہذا یہ صحیح بیع ہوگی اس میں شرط لگانے کی وجہ سے فاسد نہیں ہوگی اگرچہ وہ شرط قواعد کے مخالف ہے، کیونکہ قواعد تعامل کی وجہ سے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ استصناع میں ہوتا ہے)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اضطرار شدید میں متاخرین کے قول پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے (امداد

الفتاویٰ ۳ ص ۱۰۳ مطبوعہ زکریا یونین۔

ب۔ بیع و فایں مشتری کے بیع کو واپس کرتے وقت سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی اگر کچھ ہی اضافہ کا مطالبہ کرے تو اس کی گنجائش ہے، تھوڑے کی حد فقہاء کے یہاں غبن یسیر سے کی گئی ہے، یعنی اخلاقی طور پر وعدہ کے مطابق مشتری کو سابقہ قیمت کا مطالبہ کرنا چاہئے، لیکن چونکہ مشتری بیع کا مالک ہے، اس لئے اپنی چیز کو بیچتے وقت وہ اس قیمت سے زیادہ کا یاٹن مثل کے مطالبہ کا قضا مجاز ہے، البتہ اس صورت میں وعدہ کے عدم ایفاء کا گنہگار ہوگا۔

ج۔ بیع و فایں خریدار اس سامان کا مالک ہے، اس لئے جب تک بیع اس کے پاس ہے اس سے فائدہ اٹھاتا رہے گا، ”وذهب بعض المتأخرین من الحنفیة والشافعیة إلى أن بیع الوفاء جائز مفید لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالبیع“۔

د۔ خریدار اگر دوسرے کو بیچ دے تو بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا حق ہے: ”ولو باعه المشتري فللبائع ولورثته حق الاسترداد“ (در مختار علی الشامی)، علامہ شامی نے اس عبارت کی تشریح میں لکھا ہے: ”أی علی القول، بأنه رهن، وكذا علی القولین للقائلین، بأنه بیع یفید الانتفاع به، فإنه لا یملک بیعه كما قدمنا“۔

خریدار اگر دوسرے کے ہاتھ بیچ دے تو رہن کی بناء پر بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا حق ہے اور بیع ہونے کی بناء پر بھی اس لئے کہ بیع و فایں اپنے وعدہ کے مطابق مشتری دوسرے کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا (شامی ۷/۴۲۶)، اس بیع کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ بائع قرض لے کر اپنا کام چلا لے اور اس کی جائداد محفوظ رہے، غیر سودی قرض دشوار ہونے کی بنا پر بدرجہ مجبوری اس بیع کی اجازت اسی پس منظر میں دی گئی ہے، اس لئے اگر مشتری اس سامان کو بائع کے علاوہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو وعدہ خلافی کا مرتکب بھی ہوگا اور بیع و فایں کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا، لہذا مشتری کو ایسا نہیں کرنا چاہئے، لیکن اگر مشتری بیع کا مالک ہونے پر ایسا کر لیتا ہے تو بائع یا اس کے ورثہ کو واپس لینے کا حق حاصل ہے۔

(ھ) اور اگر مشتری اس کو فروخت کر رہا ہے اور قیمت خرید سے زیادہ قیمت وصول کرتا ہے تو منافع کا حق دار بائع ہوگا، الا یہ کہ بائع مشتری کو اس کی اجازت دے دے، بیع و فایں مرتب ہونے والے آثار پر بحث کرتے ہوئے ”موسوع فقہیہ“ میں مذکور ہے:

”منافع البیع بیع و فایں للبائع كإجازة وثمرة الأشجار ونحوها فلو باع داره من آخر بثمان معلوم بیع و فایں وتقابضا ثم استاجرها من المشتري مع الشرائط صحة الإجارة وقبضها ومضت المدة هل یلزم الأجر؟ قال: لا، فتبین أن الملك لم ینتقل للمشتري إذ لو انتقل لو جبت الأجرة، وكذلك ثمن الشجر للبائع دون المشتري فإن المشتري لو أخذ من ثمن الأشجار شیئا، فإن أخذه بإذن البائع

برئت ذمتہ، وان أخذ بغير إذنه ورضاه ضمنها (موسوعة بحواله الفتاوى الهندية و منبع الأحكام) (موسوعہ فقہیہ ۲۶۲/۹)۔

۲- الف: رہن ماننے کی صورت میں جو رقم بائع کو دی گئی ہے وہ قرض ہوگی اور بیع شی مرہون سے مرہن کا فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، الا یہ کہ راہن اس کی اجازت دے دے، ”ہدایہ“ میں مذکور ہے: ”ولیس للمرتہن أن ینتفع بالرهن لا یرتفع لہ ولا یرتفع لہ لیسکنی ولبس، إلا أن یأذن لہ المالك“ (ہدایہ ۵۰۶/۳)۔
(اور مرہن کے لئے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ رہن سے نفع اٹھائے، نہ تو خدمت لے کر اور نہ ٹھہر کر اور نہ پہن کر، الا یہ کہ مالک اس کی اجازت دیدے)۔

شی مرہون سے فائدہ اٹھانے میں فقہاء کرام کے نزدیک مندرجہ ذیل تفصیلات ہیں، احتیاف کے نزدیک مرہن اور راہن دونوں کے لئے شی مرہون سے انتفاع درست نہیں ہے، نہ تو مکان سے سکنی کا نفع اور نہ مرکوب سے سواری کا نفع، الا یہ کہ ایک دوسرے کو اجازت دے دے، اور ایک قول یہ ہے کہ مرہن کے لئے راہن کی اجازت کے باوجود نفع اٹھانا درست نہیں، اس لئے کہ وہ سود ہے، اور ایک قول میں یہ کہا گیا ہے کہ راہن کی اجازت سے مرہن کے لئے انتفاع درست ہے، اگر عقد رہن میں انتفاع کی شرط نہ لگائی گئی ہو (موسوعہ فقہیہ ۱۸۳/۲۳)۔

مالکیہ کے نزدیک شی مرہون سے انتفاع چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے، ۱- انتفاع کی شرط صلب عقد میں مذکور ہے، ۲- انتفاع کی مدت متعین ہو، ۳- مرہون بہ قرض کا دین نہ ہو۔
اگر ان شرائط کا لحاظ نہ کرے تو ان کے نزدیک انتفاع جائز نہیں۔

حنابلہ کے یہاں محلوب اور مرکوب کا حکم الگ ہے، مرہن مرکوب پر خرچ کرے اس سے سواری کا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور محلوب سے اپنے نفقہ کے برابر انتفاع حاصل کر سکتا ہے، اس لئے کہ راہن کی اجازت کی ضرورت نہیں، ان کے علاوہ انتفاع کے لئے اجازت شرط ہے، البتہ مرہن کے انتفاع کے لئے راہن کی اجازت کے علاوہ دو شرطیں مزید ہیں: ۱- مرہون قرض کا دین نہ ہو، ۲- راہن بغير عوض کے اجازت نہ دے۔

شافعی کے نزدیک مرہن کو شی مرہون میں صرف حق استیثاق حاصل ہے، اس کے علاوہ وہ وہ شی مرہون میں کسی طرح کا تصرف کا حق نہیں رکھتا اور اس سے کوئی نفع نہیں اٹھا سکتا، البتہ شی مرہون سے راہن ہر ایسا نفع اٹھا سکتا ہے جو اس کی قیمت میں کمی پیدا کرنے کا سبب نہ بنے، جیسے مرکوب پر سواری کرنا محلوب کا دودھ دوہنا، غلام سے خدمت لینا، مکان میں سکونت اختیار کرنا، البتہ ایسا انتفاع جس سے مرہون کی قیمت پر اثر پڑے وہ راہن کے لئے مرہن کی اجازت کے بغیر درست نہیں (موسوعہ فقہیہ ۱۸۳/۲۳، ۱۸۵)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے یہاں مرتہن کو فی الجملہ کچھ شرائط کے ساتھ شی مرتہن سے نفع اٹھانے کی گنجائش ہے۔

ب- اگر خریدار اس طریقے پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو اس صورت میں اپنے قرض سے فائدہ اٹھانا ہوگا، کیونکہ خریدار اصلاً مرتہن ہے اور بیع رہن ہے اور بائع راہن ہے، تو دراصل کرایہ کی کمی جو مرتہن کے لئے کی جا رہی ہے وہ قرض کے دباؤ میں کی جا رہی ہے اور مرتہن اپنے قرض کی وجہ سے یہ فائدہ حاصل کر رہا ہے اور قرض دے کر نفع اٹھانا سود ہے، ”ونہی رسول اللہ ﷺ القرض جر نفعاً رواہ سعید بن منصور فی سننہ ثم البیہقی..... عن یزید بن ابی یحییٰ سئلت انس ابن مالک فقلت: یا ابا حمزۃ الرجل یقرض أخاه المال فیہدی إلیہ فقال: قال رسول اللہ ﷺ: إذا أقرض أحدکم أخاه قرضاً فأهدی إلیہ طبقاً فلنقا یقبلہ أو حملہ علی دابة فلا یرکبہا، إلا أن یکون بینہ وبين قبل ذلک“ (یعنی شرح ہدایہ ۲۷۱/۴)۔

ج- رہن ماننے کی صورت میں خریدار مرتہن ہے اور مرتہن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ شی مرتہن کو اجرت پر دے یا عاریت پر (ہدایہ ۵۰۶/۴) پر مذکور ہے: ”ولیس لہ أن یواجر أو یعیر؛ لأن لیس لہ ولایۃ الانتفاع بنفسہ، فلا یملک تسلیط غیرہ إلیہ“ (ہدایہ ۵۰۶/۴)۔

د- خریدار، یعنی مرتہن شی مرتہن کو بغیر راہن کی اجازت کے بیچنے کا حق نہیں رکھتا اور اگر راہن کی اجازت سے بیچتا ہے تو اپنے دین کو وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، اس سے زائد جو قیمت ہوگی وہ راہن کا حق ہوگی، کیونکہ شی مرتہن راہن کی ملک ہے، ”ولیس للمرتہن أن یبیعہ إلا برضاء الراہن، لأنه ملکہ ومارضی بیعہ“ (ہدایہ ۵۲۲/۴)۔

۳- زر ضمانت کی کثیر رقم دینے کے بعد کرایہ میں اجرت مثل سے کمی کرنا کیسا ہے؟

زر ضمانت کی رقم نہ امانت ہے اور نہ رہن یہ درحقیقت قرض ہے اور قرض دے کر اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، اس لئے دوکان یا مکان کرایہ پر لینے والا بطور ضمانت مالک کو جو رقم دے رہا ہے اس کے عوض کرایہ میں کمی کرنا درست نہیں، دوکان اور مکان کا واجب کرایہ دینا ضروری ہے، واجب کرایہ کا اندازہ اس کے آس پاس کی دوکان اور مکان سے لگایا جائے گا۔

”وفی الخانیۃ: رجل استقرض دراهم واسکن المقرض فی دارہ قالوا: یجب أجر المثل علی المقرض، لأن المستقرض إنما أسکنہ فی دارہ عوضاً عن منفعة القرض لا مجاناً وهذا کثیر الوقوع واللہ تعالیٰ اعلم“ (رد المحتار علی در المختار ۷۵/۹)۔

بیع و فاء سے متعلق احکام اور مسائل

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی ☆

۱- اس طرح کے عقود شرعاً درست ہیں اور ان پر دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں، عدم قائلین بیع و شراہ کی دلیل یہ ہے کہ تصرفات میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ و ظواہر کا ”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی“ (تواعد الفقہ ۹۱) ”انما یتبنی الحکم علی المقصود لا علی ظاہر اللفظ“ (تواعد الفقہ ۶۳) ”لأن الاعتبار للمعانی دون الصور“ (ہدایہ ۱۸۵/۳)، مثلاً حوالہ عدم برأت کی شرط کے ساتھ کفالہ بن جاتا ہے آزاد عورت اگر شاہدین کی موجودگی میں مہر کی تعیین کے ساتھ اپنی ذات کا ہبہ کرے تو نکاح بن جاتا ہے، استصناع فاسد بعد بیان مدت سلم بن جاتا ہے، اس لئے یہ معاملہ بیع کا نہیں، بلکہ رہن کا ہے۔

خاص قید و بند کی تفصیلات بھی پیش نظر رہنی چاہئیں کہ آیا وہ شرط و قید صلب عقد میں ہے یا نہیں، شیخ امام ظہیر الدین نے چند صورتیں بیان فرمائی ہیں جن کا ذکر حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے (مباحث فقہیہ ص ۵۷۸) پر فرمایا ہے: ”بیع الوفاء بیع فاسد ہے اور اگر ان دونوں نے عقد کرتے ہوئے اس طرح قول و اقرار کیا کہ ایک نے دوسرے سے کہا: جب میں ٹخن واپس کروں گا تو اس شئی کو میرے ہاتھ فروخت کر دینا، اس نے جواب میں ”ہاں“ کہا، تو اس سے عقد فاسد نہیں ہوگا، لیکن اگر صلب بیع میں اس طرح کہا کہ ہم نے یہ شرط کیا کہ جب ہمارے پاس ٹخن لوٹ کر آجائے گا تو ہم اس عقد کو نسخ کر دیں گے تو اس سے عقد فاسد ہو جائے گا اور اگر یہ شرط عقد کے بعد لگائی گئی ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عقد کے ساتھ یہ شرط ملحق ہو جائے گی، مگر اس کا ذکر نہیں کیا گیا کہ الحاق شرط مجلس عقد میں ہو یا مجلس عقد کے علاوہ میں، لیکن اگر یہ شرط پہلے لگائی پھر شرط ذکر کئے بغیر عقد کیا تو عقد جائز ہوگا اور پہلی شرط کا اعتبار نہ ہوگا“۔

بیع قرار دینے والوں کی تحریریں پیش ہیں:

”ومن مشائخ سمرقند من جعله بیعا جائزا مفید بعض أحكامه منهم الإمام نجم الدین النسفی، وقال: اتفق مشائخنا فی هذا الزمان فجعلوه بیعا جائزا مفید بعض أحكامه، وهو الانتفاع به

دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل، وجوز الاستصناع لذلك، وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى، (تبيين الحقائق ۵/۱۸۳-۱۸۴) "وقال في الكافي والصحيح: أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهنا، (تبيين الحقائق ۵/۱۸۴)، "ومشائخ سمرقند جعلوه بيعا جائزا مفيدا لبعض الأحكام وهو الانتفاع به دون البيع والهبة على ما هو المعتاد بين الناس للحاجة إليه، واختاره المصنف رحمه الله تعالى، وأشار إليه بقوله البيع الجائز المعتاد" (الغاية على ما مشتمل فتح القدير ۸/۱۶۹-۱۷۰)۔

مذکورہ تحریروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انتفاع کی اجازت ہے، نہ کہ بیع و ہبہ کی، حضرت قاضی مجاہد الاسلامیؒ کی آنے والی تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ "عرف خاص کو عام طور پر فقہاء معتبر نہیں مانتے ہیں، بعض فقہاء اس کا اعتبار کرتے ہیں، اسی طرح عموماً فقہاء عرف طاری کو مسترد کر دیتے ہیں، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسا عرف جو لوگوں کے درمیان متعارف اور رائج ہے اس کی داعی لوگوں کی ضرورت اور حاجت ہے تو یہ استحسان قرار پائے گا جو عرف پر مبنی ہوگا اور حاجت کی بنا پر نص عام میں تخصیص جائز ہے، اس لئے کہ قواعد فقہیہ کے مطابق ضرورت کی وجہ سے ممنوع چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں اور حاجت ضرورت کے قائم مقام ہو جاتی ہے، اور جب کوئی چیز باعث تنگی ہوتی ہے تو اس کے حکم میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، ان قواعد فقہیہ کا تقاضہ یہی ہے کہ بیع و فاء کو لوگوں کی حاجت و ضروریات کے پیش نظر جائز قرار دیا جائے، حاصل یہ ہے کہ بیع و فاء کا قضیہ عرف خاص حادث کا قضیہ ہے جو نص عام کے متضاد ہے اور فقہاء نے عرف و حاجت کی بنیاد پر استحساناً اسے جائز قرار دیا ہے" (مباحث فقہیہ ص ۵۹۶)۔

ان دلائل کی روشنی میں احقر کی رائے یہ ہے کہ بیع و فاء کو بعض احکام کے اعتبار سے بیع قرار دیا جانا نسب معلوم ہوتا

ہے۔

۱- الف: اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ معاملہ صحیح ہے اور اس کا ایفاء لازم ہے "وقیل: بیع یفید الانتفاع به، وفي إقالة شرح الجمع عن البناية: عليه الفتوى، وقيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهنا..... ولو بعده على وجه الميعاد جاز، ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس" (الرد المحتار علی الدرر ۵۳۶/۷-۵۳۷)، نیز یہ شرط اگر ایسی ہو کہ اس کے بغیر بائع بیع پر راضی نہ ہو تو یہ بیع فاسد ہے، لیکن اگر صرف وعدہ کے طور پر یہ شرط ہے بیع کو اس پر موقوف نہیں رکھا گیا تو یہ درست ہے، اخلاقاً وعدہ پورا کرنا چاہئے "ولو اخرج من خرج الوعد لم يفسد"، "فقد صرح علماؤنا بأنهما لو ذكرا البيع بلا شرط، ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد الخ" (الرد المحتار علی الدرر ۲۸۱/۷ باب البيع الفاسد) اس کی تائید قاضی خاں کی اس عبارت سے بھی ہو رہی

ہے: ”وان ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع ویلزمه الوفاء بالوعد؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (۲/۲۵۳ مطب مصطفائی)۔

۱- ب: کتب فقہ میں بیع و فاء کی ذکر کردہ تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتری بائع اول سے زائد کا مطالبہ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ بیع یا شئی مرہونہ اسی دین یا عین کے بالعوض ہے جو بائع یا راہن کے ذمہ تھی، علامہ شامی نے (رد المحتار ۷/۵۴۵) پر ذکر فرمایا ہے: ”فعلم أنه لا فرق بین قولہ علی أن تردہ علی أو علی أن تبیعہ منی“۔

پھر یہ کہ سوال میں ذکر کردہ عبارت ”تم اتنی قیمت میں اسے لے لو اور اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کرنے کے حال میں ہوں تو یہ سامان تم مجھ کو اسی قیمت پر دے دینا، اس کا بھی تقاضہ یہی ہے کہ مشتری زائد قیمت کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۱- ج: اس کا جواب (۱) میں دیا جا چکا ہے۔

۱- د: مشتری کو صرف انتفاع کا حق تھا، اگر اس نے بیع دیا تو یہ عذر اور بدعہدی میں شمار ہوگا وہ گنہگار ہوگا، اگر بائع چاہے تو اس معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے، اور اگر راضی ہو گیا تو زائد قیمت مشتری کو بائع کے حوالہ کرنی ہوگی۔

۲- الف: وہ عبارتیں جن سے راہن کی اجازت سے انتفاع درست قرار دیا گیا ہے، پیش کی جا رہی ہیں: ”قلت: وبہ صدر فی جامع الفصولین فقال رامز الفتاوی النسفی: البیع الذی تعارفہ اهل زماننا احتیالا للربا وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة لا یملکہ ولا ینتفع بہ، إلا یاذن مالکہ“ (الرد المحتار علی الدر ۷/۵۴۶)، ”ولیس للمرتہن أن ینتفع بالرهن لباستخدام ولا بسکنی ولا لبس، إلا أن یأذن له المالك“ (فتح القدیر ۸/۲۰۱، بدائع الصنائع ۵/۲۱۲)، ”المرتہن إذا ركب الدابة المرهونة یأذن الراهن فعبطت فی ركبہ لا یضمن ولا یسقط شیء من الدین“ (قاضی خاں علی البندیہ ۳/۶۰۱) ”وان كان فعل ذلك باذن الراهن فلا ضمان علیه، لأن وجوب الضمان باعتبار التعدی وهو فی الانتفاع یأذن المالك لا یكون متعدیا“ (ہندیہ ۵/۴۶۶)۔

اگرچہ ذکر کردہ تحریروں سے راہن کی اجازت سے مرتہن کے لئے انتفاع کی گنجائش نکلتی ہے، لیکن فقہاء نے اس اجازت کو بمنزلہ شرط و بحالت مجبوری اجازت تسلیم کیا ہے اور مجبوری کے تحت اجازت کا اعتبار نہیں، ”لما قال العلامة السید احمد الطحاوی (تحت قولہ وسیجی آخرض) قلت: والغالب من أحوال الناس أنهم یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما اعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط وهو مما یعین المنع“ (حاشیہ طحاوی علی الدر المختار ۴/۲۳۴)، علامہ ابن عابدین رقم طراز ہیں: ”لا یحل أن ینتفع بشئی منه

بوجه من الوجوه، وإن أذن لدالراهن، لأنه أذن له في الربا؛ لأنه يستوفى دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً، فيكون ربا، وهذا امر عظيم“ (رد المحتار على الدرر ۱۰/۸۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (فقہ الحلال والحرام ص ۳۵۴) پر تحریر فرماتے ہیں: ”والقول الفصل والرأى الصائب والمذهب المحتاط وما يوافق الأصول العامة للإسلام أن المال المرهون لا يجوز الانتفاع منه للمرتهن لا بإذن الراهن ولابدونه“، نیز قاسم الفقه (۲/۳۶۷) میں تحریر فرماتے ہیں: ”رأى الحروف كلفه نظرياً هي كذا في صورته كونها جائزاً هونا چاہئے یہ رہن کے حکم میں ہے..... لیکن اس کی مناسب اجرت ادا کئے بغیر اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دینا صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ مال رہن سے نفع اٹھانا سود کے دائرہ میں آتا ہے اور تعامل کی وجہ سے سود اور محرمات منصوصہ میں کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔“

۲- ب: فتاویٰ عثمانی میں ایک فتویٰ کا جواب پیش ہے جس سے اس سوال کا جواب معلوم ہو سکتا ہے۔

وہ جواب اس طرح ہے: ”جو موٹر سائیکل گروی رکھی گئی ہے قرض خواہ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے، البتہ اگر استعمال کا کرایہ بازاری نرخ کے مطابق مقرر کر کے اسے قرض میں محسوب کیا جائے تو جائز ہے (فتاویٰ عثمانی ۳/۲۲۳)۔“

۲- ج: مرتہن کو کاشت وغیرہ کا شرعاً حق نہیں ہے، کاشت وغیرہ سے جتنا کمایا ہے وہ راہن کی امانت ہے، اگر یہ امانت راہن کے ذمہ جو قرض ہے اسے پورا کر دیتی ہے تو راہن قرض سے بری الذمہ ہو گیا اور اگر ایسا نہیں تو لقیہ راہن کے ذمہ لازم ہے، فتاویٰ عثمانی (۳/۲۲۲) کے حاشیہ پر بحوالہ ”کفایت المفتی“ یوں رقم ہے: ”زمین پر مرتہن کو صرف قبضہ کرنا جائز ہے اس کو کاشت کرنا یا کاشت کے لئے کسی کو دینا جائز نہیں اور اگر خود کاشت کرے تو اس کا پورا کرایہ راہن کو ادا کرے، یا اس کی رقم میں سے وضع کرے اور اگر کسی دوسرے کو کاشت کے لئے دی ہے تو اس کا پورا معاوضہ راہن کو دے یا رقم رہن میں سے وضع کرے۔“

”ولا يصح الرهن إلا بدين مضمون، لأن حكم ثبوت يد الاستيفاء“ (ہدایہ، کتاب الرهن) رہن کا مقصد صرف ادائیگی کی توثیق ہے، لہذا مرتہن کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس رہن سے کسی بھی صورت میں فائدہ اٹھائے، ”قال عامة العلماء: بأن الرهن مضمون على المرتهن“ (البحر الرائق ۱/۲۳۱)۔

۲- د: راہن کی اجازت کے بغیر رہن رکھنا درست نہیں تو فروخت کرنا بدرجہ اولیٰ درست نہ ہوگا، ”وليس للمرتهن أن يرهن الرهن، فإن رهن بغير إذن الراهن كان للراهن الأول أن يبطل الرهن الثاني ويعيده إلى يده“ (فتاویٰ ہندیہ ۵/۴۶۴، بدائع الصنائع ۵/۲۱۴)، مرتہن کی ملکیت ہی ثابت نہیں ہوئی تو تصرف کیسے کر سکتا ہے؟ ہاں اگر حلول اجل ہو گیا اور استيفاء معتذر ہو جائے تو فروخت کرنے کی اجازت ہے، ”فإن المرتهن أحق بالمرهون يباع في دينه إذا تعذر

الاستیفاء“ (ہدایہ اخیرین ص ۸۷ کتاب البیوع)، بشرطیکہ راہن نے مرتہن کو فروخت کرنے کی اجازت دی تھی، اور اگر ایسا نہیں ہے تو قاضی سے رجوع کرے گا اور قاضی اسے مجبور کرے گا، تا آنکہ راہن شی کو خود ہی فروخت کرنے پر راضی ہوں، یہ امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے، صاحبین کے نزدیک قاضی خود ہی فروخت کر دے گا، ”ولیس للقاضی أن یبیع الرهن بدین المرتہن من غیر رضا الراہن لکنہ یحبس الراہن حتی یبیعہ بنفسہ عند أبی حنیفۃ علیہ الرحمۃ وعندہما لہ أن یبیعہ علیہ“ (بدائع الصنائع ۲۱۵/۵ مکتبہ زکریا) مرتہن فروخت کرے یا قاضی، غبن فاحش سے اجتناب ضروری ہے، ”والذی لا یتغابن الناس فیہ مالا یدخل تحت تقویم المقومین الخ“ (ہدایہ ۳/ کتاب الوکالۃ ص ۱۹۰ باب الوکالۃ بالبیع والشراء)۔

۳- زر ضمانت کی رقم اجرت معجلہ مان کر بالاقساط کرایہ میں منہا ہو یا پہلے ماہ کا کرایہ زر ضمانت اور متعینہ کرایہ دونوں کا مجموعہ ہو اور پھر ماہ بمہا وصول ہونے والا کرایہ اجرت مؤجلہ ہو، بہر دو نوع یہ رقم کرایہ یا کرایہ کا جز ہو تو جن کی صحت میں کوئی کلام نہیں، یا پھر اسے رہن مانا جائے اور رہن جس طرح اشیاء کا ہوتا ہے، اسی طرح اثمان اور اموال نقدیہ کا بھی، جیسا کہ ابن نجیم کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے، ”وصح رهن الحجرین والمکیل والموزون المراد بالحجرین الذهب والفضۃ، وانما جاز رهن هذه الأزیاء لِمکان الاستیفاء منها، فکانت محلا للرهن“ (البحر الرائق ۲۸۲/۸)، زر ضمانت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کرایہ دار ماہ بمہا کرایہ دیتا رہے اور متعینہ مدت میں مکان یا دوکان خالی کر دے اور اگر ایسا نہ کرے تو اس رقم سے وصولیابی ممکن ہو سکے، اب اس پر رہن کے احکام جاری ہو کر وہ رقم مالک مکان یا دوکان کے پاس اس وقت تک رہے گی جب تک وہ اسے خالی نہیں کرتا، نیز اس رقم سے مالک انتفاع بھی بغیر زر ضمانت دینے والے کی اجازت کے نہیں کر سکتا وغیرہ یا پھر اسے قرض مانا جائے اب مالک مکان اس رقم سے انتفاع بھی کر سکتا ہے، نیز قرض کی تاجیل بھی لازم نہیں دینے والا مدت مقررہ سے پہلے بھی اسے وصول کر سکتا ہے، اسی طرح تخلیہ مکان و دوکان کی جو مدت متعین ہے اس کے قبل اگر کرایہ دار کا انتقال ہو جاتا ہے تو زر ضمانت کرایہ دار کے ورثاء علی الفور وصول کر سکتے ہیں۔

احقر کے خیال میں قرض ماننا زیادہ موزوں ہے، کیونکہ رہن ماننے کی صورت میں بعض فقہاء کے نزدیک اجازت کے بعد بھی انتفاع درست نہیں اور یہ انتفاع سو دور با کے درجہ میں ہے، جیسا کہ گذشتہ سطور سے واضح ہو چکا ہے، لیکن اس پر وہ اعتراض جو سوال میں مذکور ہے وارد ہوتا ہے، لہذا اگر وہ کرایہ جس کی کمی قرض سے نفع اٹھانے کے مترادف ہے اجرت مثل قرار دے دیا جائے تو یہ اعتراض بھی ختم ہو جائے گا۔

اس لئے عرض ہے کہ فقہاء نے جہاں (بدل خلو) زر ضمانت کا ذکر فرمایا ہے وہاں صراحتہ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ کرایہ دار کو اجرت مثل دینی ہوگی، اور اجرت مثل کی وضاحت، بایں طور ہے کہ اگر عمارت ہٹالی جائے تو اس سے زائد کرایہ نہ مل سکے،

اگر یہ صورت حال ہے تو کرایہ دار جو کرایہ دے رہا ہے وہی اجرت مثل مان لی جائیگی اگرچہ فی الحال اس کا کرایہ زیادہ کیوں نہ مل سکتا ہو، خلاصہ یہ کہ موجودہ عمارت کے ہٹا لینے کے بعد دوسرا شخص جس قدر کرایہ دے کر لینا پسند کرے وہی یہاں اجرت مثل قرار پائے گی، ”فإذا كان بحيث لورفعت عمارته لا تستاجر بأكثر تترك في يده بأجر المثل“ (رد المحتار ۳۵/۹)۔ ”و الواقع في زماننا أنه يستاجر بدون أجر المثل بكثير ويدفع بعض الأجرة وتقطع بعضها من العمارة وقد يقال لجوازه: وجه وذلك أنه أراد آخرون يستأجره ويدفع للاول ماصرفه على العمارة لا يستأجره إلا بتلك الأجرة القليلة“ (رد المحتار علی الدرر ۳۴/۹)۔

ہمارے زمانہ میں بکثرت رائج ہے کہ مستاجر اجرت مثل کے بغیر زیادہ اجرت پر لے لیتا ہے، اور اس کا کچھ موجر کو دے دیتا ہے، اور دوکان و عمارت کے کرایہ میں کمی کر دیتا ہے اس کے جواز کی صورت اس طرح ہے کہ اگر کوئی دوسرا اجرت پر لینا چاہے اور مستاجر کو عمارت پر خرچ کی ہوئی رقم دے دے تو دوسرا اسے نہ لے، مگر اسی اجرت قلیلہ سے، تو یہ بھی اجرت مثل کہلائے گی۔

خلاصہ جوابات:

۱- احقر کے نزدیک یہ معاملہ بعض جہتوں (انتفاع وغیرہ) کے اعتبار سے بیع کے درجہ میں ہے۔

الف- اگر وعدہ کے طور پر یہ شرط ہو اور معاملہ اس پر موقوف نہ ہو تو درست ہے، اور وعدہ کا ایفا لازم ہے۔

ب- بیع و فاء کی تعریف اور سوال میں مذکور تحریر اس کی متقاضی ہے کہ زائد کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

ج- انتفاع درست ہے۔

د- مشتری کو صرف انتفاع کا حق تھا اگر اس نے فروخت کر دیا تو یہ عذر اور بدعہدی میں شمار ہوگا اور وہ گناہگار ہوگا،

بائع چاہے تو اس معاملہ کو فسخ کر سکتا ہے اور اگر راضی ہو گیا تو زائد قیمت بائع کے حوالہ کرنی ہوگی۔

۲- الف: شیء مرہون سے انتفاع درست نہیں ہونا چاہئے، یہ ربا اور سود کے درجہ میں ہے۔

ب- مکان یا زمین کا کرایہ بازاری نرخ کے مطابق مقرر کر کے اسے قرض میں محسوب کیا جائے۔

ج- مناسب اجرت دیئے بغیر انتفاع کی گنجائش نہیں ہے۔

د- اگر استیفاء معتذر ہو جائے اور راہن نے مرتہن کو حلول اجل کے بعد فروخت کرنے کی اجازت دی تھی تو وہ

فروخت کر سکتا، بصورت دیگر وہ اولاً اپنے قرض کا مطالبہ کرے گا اس میں ناکامی کے بعد قاضی کی جانب سے رجوع کرے گا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قاضی راہن کو قید کر دے گا، یہاں تک کہ وہ خود نیچنے پر راضی ہو جائے۔

بیع و فاء اپنے حکم کے اعتبار سے بیع ہے

مولانا ابوسفیان مفتاحی ☆

یہ معاملہ بیع و فاء جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے اور حکماً بیع ہے یا رہن ہے اس باب میں حضرات فقہاء کرام کی دورائیں ہیں: ۱- رہن، ۲- بیع، اور یہی دوسری رائے کہ بیع ہے، مفتی بہ ہے، لہذا یہ معاملہ حکماً بیع ہے، واللہ اعلم، چنانچہ صاحب درمختار لکھتے ہیں:

”وبیع الوفاء ذکرته هنا تبعاً للدرر صورته أن يبيعه العين بألف على أنه إذا رد الثمن عليه رد عليه العين، قيل: هو رهن، فتضمن زوائده، ويقول الشامي رحمه الله تحته: قدمنا آنفاً من جواهر الفتاوى أنه الصحيح، قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفتقر عن الرهن في حكم من الأحكام، قال السيد الإمام: قلت للإمام الحسن الماتريدي: قد فشا هذا البيع بين الناس وفيه مفسدة عظيمة، وفتواك أنه رهن وأنا أيضاً على ذلك فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هذا ونظيره بين الناس فقال: المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذلك بين الناس فمن خالفنا فيبرز نفسه وليقم دليله، لو قتل وبه صدر في جامع الفصولين فقال رامزا الفتاوى النسفي: البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالياً للربا وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به إلا بإذن مالكة وهو ضامن ما أكل من ثمره وأتلف من شجره، ويسقط الدين بهلاكة لو بقي ولا يضمن الزيادة وللبيع استرداد إذا قضى دينه لا فرق عندنا بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام۔

وقيل: بيع يفيد الانتفاع به ويقول الشامي تحته: هذا محتمل لأحد قولين الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه، قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى۔“

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق یہ معاملہ حکماً بیع ہے۔

الف- بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ سے ہی بیچا جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے یہ شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے، اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع ہے اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے۔

چنانچہ ”در مختار مع رد المحتار“ (۲/۴۴۴) میں ہے:

”وقیل: بیع یفید الانتفاع به، وفي إقالة شرح الجمع عن النهاية: وعليه الفتوى، وقيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهناً، ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله، أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً ولو بعده على وجه الميعاد وواز ولم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح، كما في الكافي والخانية، والله اعلم، ويقول العلامة الشامي رحمه الله تحت قوله جاز مقتضاه: أنه بيع صحيح بقرنية مقابلة لقوله كان بيعاً فاسداً، والله اعلم“۔

خلاصہ کلام: یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے۔

ب- جب یہ معاملہ حکماً بیع ہو گیا مفتی بہ قول کے اعتبار سے مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت لازم نہیں ہوگی اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام:

سابق ادا کردہ قیمت لازم نہیں، بلکہ اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے، تو اس کو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، چنانچہ در مختار (۲/۴۴۴)

میں ہے: ”بیع یفید الانتفاع به، وعليه الفتوى“۔

د- خریدار کے لئے درست نہیں ہے کہ کسی دوسرے کو بیچے، بلکہ مزید قیمت لینا بھی جائز نہیں ہے۔

۲- الف- غیر مفتی بہ قول کی بنا پر اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے لے اس وقت

تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے: ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا،

كذا في المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية (۱/۴۱۱)، وفيه سوار بن مصعب متروك

الحديث ضعفه البوصيري وقال: له شاهد من حديث فضلة بن عبيد رواه الحاكم وعنه البيهقي“ (من

باش المطالب العاليہ)۔

اور صحیح بخاری کی حدیث ”الظھر یرکب بنفقته إذا كان مرهونا ولبن الدر یشرب بنفقته إذا كان

مرهونا“ (الحدیث) اس حدیث کی تاویل عند الحنفیہ میں کہ حرف باء سببیت کی ہے یا حدیث منسوخ ہے، کما قال السيد

فی حاشیة المشكاة قوله: ”الظهر يركب بنفقة الظهر الخ والجمهور على أن منافع المرهون للراهن والنفقة عليه قالوا: والحديث منسوخ بآية الربا، فإنه يلزم انتفاع المرتهن لأجل دينه، وكل قرض جرّ نفعاً فهو حرام، وقيل: الأولى أن يقال ليس الباء للبديلية بل للجمعية أى الظهر يركب وينفق عليه فلا يمنع الرهن الراهن عن الانتفاع بالمرهون ولا يسقط عن الإنفاق أى يركبه الراهن وينفق عليه، كما يدل عليه حديث لا يغلق الرهن الرهن أى المرهون من صاحبه الذى رهنه له غنمه وعليه غرمه“ رواه الشافعى مرسلأ ورأى مثله أو مثل معناه لا يخالف عنه عن أبى هريرة متصلاً، (مشکوٰۃ ۲۵۰/۲۵۰)۔

اس حدیث کی شرح ”تحفۃ اللمعی“ میں ہے: اس حدیث میں نبی ﷺ نے شیئی مرہون سے انتفاع کی اجازت دی ہے اور یہ امام احمدؒ کی دلیل ہے، دیگر ائمہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث مسئلہ باب سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس حدیث کے مطلب میں ہے کہ چونکہ شیئی مرہون کے بقاء کے خرچے راہن کے ذمہ ہوتے ہیں، کیونکہ وہی اس کا مالک ہے اور حفاظت مرتهن کے ذمہ ہوتی ہے اور اگر گھوڑا سواری کا ہے تو اس کو کرایہ پر اٹھانا اور مرہون جانور کا دودھ بیچنا مرتهن کے ذمہ ہے اور جو آمدنی ہو وہ رہن میں شامل ہوتی ہے، مگر سادہ معاشرہ میں توسع ہوتا ہے، پائی پائی کا حساب نہیں ہوتا، نیز دیہات میں جانور کرایہ پر اٹھانا اور دودھ بیچنا دشوار ہے اور راہن کے لئے صبح و شام جانور کا چارہ مرتهن کے گھر پہنچانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا بھی دشوار ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرتهن ہی جانور کا خرچہ اٹھائے اور بدلے میں اس پر سواری کرے اور اس کا دودھ پیئے، پس یہ مرہون سے فائدہ اٹھانا نہیں، بلکہ خرچ کرنے کا لم سم بدلہ ہے اور دلیل اس حدیث کے وہ الفاظ ہیں جو بخاری میں ہیں: ”الظهر يركب بنفقته إذا كان مرهوناً ولبن الدر يشرب بنفقته إذا كان مرهوناً وعلى الذى يركب ويشرب النفقة، اس حدیث میں ”بنفقته“ کا مطلب وہی ہے جو جمہور نے بیان کیا ہے یہ انتفاع بعوض مصارف ہے مرہون سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے (تحفۃ اللمعی ۱۷۷/۱۷۷)۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے، البتہ اگر عقد اجارہ باقاعدہ کیا گیا اور اجارہ کے لئے قبضہ جدید کیا گیا تو یہ اجارہ صحیح ہو اور رہن باطل ہو گیا، چنانچہ شامی (۱۰۴/۱۰) میں ہے: ”وان كان هوأى المستاجر المرتهن وجدد القبض لإجارة بطل الرهن والأجرة للراهن، والله اعلم۔“

ج- اس عرصہ میں خریدار کے لئے اس شیئی سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کرنا درست نہیں، مثلاً کاشت کا یا اجارہ

داری وغیرہ۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا۔

۳- زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز نہ ہوگی اور اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا۔

جدید فقہی مسائل (۱۳۰۴ھ) میں ہے قرض ماننے کی صورت میں دو باتیں حل طلب رہ جاتی ہیں، اول یہ کہ قرض میں تا جیل نہیں ہوتی اور ہمارے یہاں کے عرف میں اور رواج کے مطابق زیر بحث مسئلہ میں فریقین اجل کے پابند ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ مالک مکان کرایہ سے اس قرض کو مشروط کر دیتا ہے، پس یہ ایک شرط فاسد ہے اور شرط فاسد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے، ان کا حل اس طرح ہے کہ قرض میں تا جیل کا گواحتاف کے یہاں اعتبار نہیں، اس لئے قرض تبرعات کے قبیل سے ہے تاہم امام شافعیؒ کے یہاں تا جیل کا اعتبار ہے اور امام مالکؒ کے یہاں نہ صرف اس کا اعتبار ہے، بلکہ قرض میں تا جیل واجب ہے، سلف میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عطاء، حضرت عمرو بن دینار وغیرہ رحمہم اللہ جیسے بلند پایہ اہل علم بھی تا جیل کو درست اور معتبر مانتے ہیں، اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ احناف کے نزدیک قرض میں تا جیل کا درست نہ ہونا عام قواعد فقہیہ سے مستنبط ہے کسی نص صریح سے نہیں، جبکہ آیت مدایت بظاہر جمہور کی تائید میں رہتی اور تمام دیون بشمول قرض میں تا جیل کے معتبر ہونے کو ظاہر کرتی ہے، پس ہمارے زمانہ کے تعامل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ میں جمہوری رائے قبول کر لیا جائے تو مضائقہ نظر نہیں آتا۔

اجارہ شرط فاسد کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ:

الف- اس میں عاقدین میں سے کسی ایک کے لئے منفعت ہو۔

ب- شرط ایسی ہو کہ اس کی وجہ سے آئندہ نزاع پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہو۔

ج- دو شرط رواج کا درجہ نہ اختیار کر چکی ہو، چنانچہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں: ”وکل شرط لا یقتضیہ العقد،

وفیہ منفعة لأحد المتعاقدين یفضی الی المنازعة فیفسد الإجارة“۔

بیع الوفاء کے شرعی احکام

مفتی محمد عبدالرحیم القاسمی ☆

۱- ضرورت مند شخص اس شرط پر جائیداد یا سامان بیچتا ہے کہ اتنی مدت کے بعد یا جب میں اس کی قیمت واپس کر دوں تو یہ چیز تم مجھ کو اسی قیمت پر دیدینا دوسرے کو مت بیچنا۔
بیع کی صورت جو بیان کی گئی ہے اس کو ”بیع الوفاء“ سے تعبیر کیا گیا ہے، شریعت کا اصول یہ ہے کہ بیع کے معاملہ کے ساتھ اگر کوئی ایسی شرط لگا دی جائے جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو تو بیع درست نہیں ہوگی، چونکہ اس معاملہ میں یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شئی واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے بیع درست نہیں۔

البتہ اس بیع کی صورت بالکل رہن کی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے، اب اس معاملہ کو رہن قرار دینے کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ وہ شخص جو خریدار ہے اس کا مالک نہیں ہوگا اصل مالک بائع ہی ہے (کتاب الفتاویٰ ۲۸۰/۵)۔
”شامی“ میں ہے:

”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيالا للربا وسموه بالوفا فهو رهن في الحقيقة“ (شامی ۲۳۶/۴)
(ہمارے زمانے والوں کے عرف میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ اختیار کیا جاتا ہے اس کا نام بیع وفاء رکھتے ہیں، حقیقت میں وہ رہن ہے)۔

اگر وعدہ نفس بیع میں داخل ہے تو بیع بالوفا ہے جس کے متعلق شامی نے متعدد اقوال نقل کئے ہیں، راجح یہ ہے کہ یہ صورت بیع ہے، مگر معنی رہن ہے (فتاویٰ محمودیہ ۲۹۶/۲۳)۔

اگر یہ شرطیں ایجاب و قبول بیع سے پہلے کی گئی ہیں یا بیع کے ساتھ کی گئی ہیں تو ان دونوں کا ایک حکم ہے اگر بیع قطعی کی گئی پھر شرطیں لگا دی گئیں تب بھی امام اعظم کے نزدیک ان شرطوں کا ایسا ہی حال ہے، جیسا کہ نفس بیع میں لگانے سے ہوتا

ہے اور صاحبین فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بیع قطعی ہوگئی اور یہ اقرار علیحدہ ہے اور اس کا پورا کرنا دیا نہ ضروری ہے، اگر پورا نہیں کرے گا تو وعدہ خلاف کہلائے گا (فتاویٰ محمودیہ ۲۷۹/۲۳-۲۸۰)۔

علامہ شامی نے صاحبین کے قول کو راجح بتایا ہے:

”لو ذکر الشرط بعد العقد يلتحق بالعقد عند أبي حنيفة“ (درمختار علی ہاشم رد المحتار ۲۴۷/۳) (اگر عقد کے بعد شرط ذکر کی تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ شرط عقد سے مل جائے گی)۔

اس پر علامہ شامی نے لکھا ہے:

”فیصیر بیع الوفاء كأنه شرط فی العقد وقدمنا فی البیع الفاسد ترجیح قولہما بعدم التحاق الشرط المتأخر عن العقد به“ (شامی ۲۴۷/۳) (پس یعنی وفا ہو جائے گی گویا کہ عقد ہی میں شرط لگائی ہے، بعد میں لگائی گئی شرط کے عقد سے نہ ملنے کے متعلق صاحبین کے قول کی ترجیح ہم نے بیع فاسد کے ذیل میں بیان کی ہے)۔

الف- اگر بیع تو بلا شرط کر لی جائے اس کے بعد دوسری مجلس میں پھر واپسی کا معاہدہ کر لیا جائے تو بیع درست ہو جائے گی اور مدت معینہ میں رقم ادا کرنے پر حسب معاہدہ وہ مکان واپس کرنا اخلاقاً لازم ہوگا (فتاویٰ محمودیہ: ۲۷۶)۔

”ثم إن ذكرا الفسخ فيه أو قبله أو زعماءه غير لازم كان بيعاً فاسداً ولو بعده على وجه الميعاد جاز، ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح“ (درمختار علی ہاشم رد المحتار ۲۴۷/۳) (اگر بیع توڑنے کا ذکر عقد کے اندر کیا ہے یا اس سے پہلے کیا ہے یا اس بیع کو ان دونوں نے لازم نہیں سمجھا تو بیع فاسد ہو جائے گی اور اگر اس کے بعد وعدہ کیا تو پورا کرنا لازم ہو گیا، اس لئے کہ وعدوں کو پورا کرنا لازم ہے لوگوں کی حاجتوں کی وجہ سے یہی قول صحیح ہے)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اکثر فقہاء کرام اس عقد (مسئلے) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے اور مشتری کو بھی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیع دے (فتاویٰ عثمانی ۱۰۸/۳)۔

”رد المحتار“ میں بیع وفاء کے متعلق کئی اقوال نقل کئے ہیں، لیکن جامع قول کو اس طرح ذکر کرتے ہیں:

”قوله وقيل: بيع يفيد هذا محتمل لأحد القولين الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه

من حل انتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه، قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى“۔

(ایک قول یہ ہے کہ یہ بیع صحیح ہے بعض احکام یعنی اس سے فائدہ حاصل کرنے کے حلال ہونے کے لئے مفید ہے

مگر یہ خریدار اس کو دوسرے کو بیچنے کا اختیار نہیں رکھتا یعنی نے کہا کہ اسی پر فتویٰ ہے)۔

”الثانی القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة جواز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما، قال في البحر: وينبغي أن لا يعدل في الإفتاء عن القول الجامع، وفي النهر: والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي“ (ردالمحتار ۲/۲۳۷-۲۳۸)۔

(بعض محققین کا جامع قول یہ ہے کہ بعض احکام میں وہ بیع فاسد ہے، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک اس کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے، بعض احکام میں بیع صحیح ہے، جیسے اس میں ٹھہرنا بیع سے فائدہ حاصل کرنا اور بعض احکام میں رہن ہے، یہاں تک کہ خریدار اس کو دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مالک نہیں اور اس کو دوسرے کے پاس رہن بھی نہیں رکھ سکتا اس چیز کے ہلاک و ضائع ہونے سے قرض ساقط ہو جائے گا تو یہ تین عقدوں سے مرکب ہے، لوگوں کی حاجت کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ مالکوں کے پاس دونوں بدل صحیح سالم ہوں۔ بحر میں ہے مناسب یہ ہے کہ جامع قول پر فتویٰ دینے سے عدول نہ کیا جائے اور نہر میں ہے کہ ہمارے ملک میں اسی قول پر عمل ہے جس کو زیلعی نے ترجیح دی ہے)۔

ب۔ مالک اول سابق قیمت ہی ادا کرے گا تو خریدار اس کو وہ چیز بیچ دے گا، واپس دے دیگا، ”لأنه بيع فيه إقالة“ کیونکہ یہ بیع میں اقالہ ہے (شامی ۲/۲۳۷-۲۳۸)۔

”ان الفتوى في ذلك أن البيع إذا أطلق، ولم يذكر فيه الوفاء، إلا أن المشتري عهد إلى البائع أنه أوفى مثل ثمنه، فإنه يفسخ معه البيع يكون باتا حيث كان الثمن ثمن المثل أو بغبن يسير“۔
(فتویٰ یہ ہے کہ جب مطلق کا ذکر کیا ہے اس میں واپسی کی شرط نہیں لگائی اس کے علاوہ خریدار نے بائع سے معاہدہ کیا کہ اگر وہ ثمن مثل دے دے گا تو وہ اس بیع کو فسخ کر دے گا تو یہ بیع قطعی ہو جائے گی اس کی قیمت ثمن مثل یا اسی طرح تھوڑے فرق کے ساتھ ہوگی)۔

”فلو كان بغبن فاحش مع علم البائع به فهو رهن، وكذا لو وضع المشتري على أصل المال ربحاً، أما لو كان بمثل الثمن أو بغبن يسير بلا وضع ربح فبات“۔

اگر بائع نے جان بوجھ کر غبن فاحش کے ساتھ معاملہ کیا تو وہ رہن ہوگا، اسی طرح خریدار نے اصل مال پر کچھ نفع مقرر کیا تب بھی یہ معاملہ رہن ہوگا، البتہ ثمن مثل یا تھوڑے فرق کے ساتھ ہو اور مال پر نفع مقرر نہیں کیا ہو تو یہ بیع قطعی ہوگی (شامی ۲/۲۳۷-۲۳۸)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جتنی قیمت دی تھی اتنی ہی واپس لے گا تو بیع ہوگی اگر واپسی میں زیادہ قیمت کا مطالبہ کرے گا یا

دیئے ہوئے مال پر نفع مقرر کرے گا تو یہ معاملہ رہن ہوگا۔

ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس کے لئے بیع سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، بیع و فاء میں مشتری کو بیع رہن وقف وغیرہ میں سے کسی کا بھی کوئی اختیار نہیں اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں، لہذا جن حضرات نے اسے عقد رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک تو مشتری کا فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں (فتاویٰ عثمانی ۱۰۸/۳)۔

د- خریدار کو یہ حق نہیں کہ کسی دورے کو بیچ دے اگر کسی دوسرے کو بیچ دیا تو مالک یا اس کے وارث اس چیز کو دوسرے خریدار سے واپس لینے کا حق رکھتے ہیں، ”ولو باعہ المشتري، فللبائع أو ورثته حق الاسترداد“ (شامی ۲/۲۷۷)۔

۲- الف: بیع میں واپسی کی شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے جس کا فسخ کرنا واجب ہوتا ہے، یہ درحقیقت رہن ہے، رہن سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں، بلکہ یہ سود ہے (فتاویٰ محمودیہ ۲۳/۲۸۸)۔

”هو أن يقول: بعث منك على أن تبعه مني متى جئت بالثمن، فهذا البيع باطل، وهو رهن، وحكمه حكم الرهن“۔

بیع و فاء یہ ہے کہ کہے میں نے تجھ کو یہ چیز اس شرط پر فروخت کی کہ میں جب قیمت لے کر آؤں تو یہ چیز مجھ کو بیچ دینا تو یہ بیع باطل ہے اور یہ رہن ہے اس کا وہی حکم ہے جو رہن کا حکم ہے، یہی قول صحیح ہے (شامی ۲/۲۷۶)۔

”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربا؛ لأنه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً، فيكون ربا، وهذا أمر عظيم“۔

(اس کے لئے کسی بھی طریقے سے اس سے فائدہ حاصل کرنا حلال نہیں اگرچہ راہن اجازت دیدے، اس لئے کہ وہ اس کو سود کی اجازت دے رہا ہے، کیونکہ وہ اپنا قرض تو کامل مکمل پورا وصول کرے گا تو حاصل کیا ہوا نفع اس کے لئے زائد بیچ جائے گا تو وہی سود ہو جائے گا اور یہ بڑا معاملہ ہے) (شامی ۵/۳۱۰)۔

ب- خریدار اگر مکان یا زمین کا مروجہ کرایہ ادا کرے تو کرایہ داری جائز ہے اور مروجہ کرایہ سے کم ادا کرے تو اس چیز سے فائدہ حاصل کرنا سود ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے فرمایا ہے: ”قلت: وهو مقيد بما قلنا بما إذا كان يدفع أجر المثل، وإلا كانت سكناه بمقابلة ما دفعه من الدراهم عين الربا“ (میں نے کہا کہ کرایہ داری کی اجازت اس شرط کے ساتھ مقید ہے جب وہ اجرت مثل ادا کرے، ورنہ اس مکان میں اس کا رہنا ان درہموں کے مقابلہ میں ہوگا جو اس نے دیئے ہیں تو یہی اصلی سود ہو جائے گا) (شامی ۱۷/۳)۔ لہذا یہ معاملہ جائز نہیں ہوگا۔

ج- مروجہ کرایہ طے کر کے کرایہ داری کی گئی ہے تو متعینہ مدت میں اس چیز سے کرایہ دار کا فائدہ حاصل کرنا جائز ہے، ”تصح اجارة أرض للزراعة“ (درمختار علی ہاشم ردالمحتار ۱۷۷-۱۸)۔

”فتاویٰ محمودیہ“ میں ہے رہن کا معاملہ ختم کر کے اجارہ کا معاملہ کر لیا جائے، مثلاً ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے تو اپنی زمین متعین تین سال کے لئے اجارہ پر دیدی جائے اور ایک ہزار روپے پیشگی کرایہ وصول کر لیا جائے وہ تین سال تک کاشت کر کے آمدنی وصول کرے پھر واپس کر دے (فتاویٰ محمودیہ ۲۳/۲۸۶)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا، شامی میں ہے: ”أى على القول بأنه رهن، وكذا على القولين بأنه بيع فاسد الانتفاع به، فإنه لا يملك بيعه“ اس قول پر کہ یہ رہن ہے اور ان دونوں قولوں پر کہ یہ بیچ ہے نفع حاصل کرنے کا فائدہ دیتی ہے قائلین اس پر متفق ہیں کہ وہ بیچنے کا مالک نہیں (شامی ۲۳/۲۴)۔

اگر وہ بیچے تو مالک اور اس کے وارث اس چیز کو واپس لینے کا حق رکھتے ہیں۔

”ولو باعه المشتري فلبائع أو ورثته حق الاسترداد“ (درمختار علی ہاشم ردالمحتار ۲۳/۲۴)۔

۳- بڑے شہروں میں زرعت کے نام سے یا پگڑی کے نام سے کثیر رقم لے کر دوکان یا مکان کرایہ پر دینے کا رواج ہے یا ڈپازٹ کی رقم جس کو عرف عام میں پگڑی کہا جاتا ہے اس کے متعلق حضرت مفتی تقی عثمانی نے تحریر فرمایا ہے ہمارے زمانہ کی موجودہ پگڑی جو مالک مکان کرایہ دار سے لیتا ہے جائز نہیں اور پگڑی کے نام سے لیجانے والی یہ رقم شریعت کے کسی قاعدے پر منطبق نہیں ہوتی، لہذا یہ رقم رشوت اور حرام ہے۔

البتہ پگڑی کے مروجہ نظام میں مندرجہ ذیل تبدیلی ممکن ہے مالک مکان و دوکان کے لئے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یکمشت رقم لے لے جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی اس یکمشت لی ہوئی رقم پر اجارہ کے سارے احکام جاری ہوں گے اگر اجارہ کسی وجہ سے طے شدہ مدت سے پہلے فسخ ہو جائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ اجارہ کی باقی ماندہ مدت کے مقابل میں یکمشت رقم کا جتنا حصہ آ رہا ہے اسے واپس کر دے (فقہی مقالات ۱/۲۱۷)۔

مثال کے طور پر دس لاکھ روپے کی پیشگی (پگڑی) لے کر مروجہ کرایہ دس ہزار روپے کے بجائے صرف ایک ہزار یا پانچ سو روپے لینے پر مالک آمادہ ہو جاتا ہے یہ معاملہ جائز ہے۔ ”فتاویٰ محمودیہ“ میں ہے اجرت کی دو قسمیں ہیں ایک مَجَل جس کی یکمشت مقدار متعین ہو، دوسری قسطوار ہر ماہ یا ہر سال ہے، اول کو عرف میں پگڑی کہتے ہیں ثانی کو کرایہ داری کہتے ہیں، اس طرح مالک مکان یا دوکان کسی کو کرایہ پر دے تو بظاہر گنجائش معلوم ہوتی ہے (فتاویٰ محمودیہ ۱۷/۱۲۷)۔

”نعم جرت العادة أن صاحب الخلو حين يستأجر الدكان بالأجرة اليسيرة يدفع للناظر

دراہم تسمى خدمة هي في الحقيقة تكملة أجره المثل أو دونها، وكذا إذا مات صاحب الخلو أو نزل عن خلوه لغيره يأخذ الناظر من الوارث أو المنزول له دراہم تسمى تصديقاً، فهذا تحسب من الأجرة أيضاً۔

(یہ عادت جاری ہے کہ کم کرایہ پر دوکان لیتے وقت کرایہ دارنگراں کے نام سے درہم روپے دیتا ہے، یہ حقیقت میں اجرت مثل (مروجہ کرایہ) کو پورا کرنا ہے، یا اس سے کچھ کم ہے، اسی طرح کرایہ دار کے مرنے پر اس کے وارث سے یا دوسرے کے حق میں کرایہ دار کے دست بردار ہونے پر نئے کرایہ دار سے تصدیق کے نام پر نگراں درہم روپے لیتا ہے، یہ بھی کرایہ میں ہی شمار کیا جائے گا) (شامی ۱۷/۴)۔



بیع و فاء میں انتفاع کا حیلہ

مولانا ولی اللہ محمد قاسمی ☆

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لا تتركبوا ما ارتكبت اليهود وتستحلوا محارم الله بأدنى الحبل“ (رواہ ابن بطہ، و ہذا اسناد جید، اغاثۃ

اللبغان / ۴۳۳، ابن القیم الجوزیہ، محمد بن ابی بکر، ط: طاریطہ الریاض / ۲۰۰۵ء)۔

(یہودیوں جیسی حرکت مت کرو، اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو معمولی حیلے بہانے سے حلال مت کرو)۔

یہودیوں کو سنچر کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا، انہوں نے اس سے بچنے کا یہ حیلہ کیا کرتے تھے کہ جمعہ کے

دن دریا کے کنارے گڑھا کھود دیتے تھے، تاکہ سنچر کے دن اس میں مچھلیاں آکر گرتی رہیں اور پھر اتوار کے دن انہیں پکڑ

لیں، اور ایسا ہی کرتے تھے، انہیں اس کی پاداش میں سخت سزا دی گئی اور ان کی صورتیں بندروں جیسی بنا دی گئیں۔

ان کے لئے چربی کھانا بھی حرام تھا، اس کے لئے وہ یہ حیلہ کیا کرتے تھے کہ چربی کو پگھلا دیا تاکہ اسے چربی کے

بجائے دوسرا نام دیا جاسکے اور اسے بیچ کر اس کی قیمت کو اپنے لئے حلال سمجھتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”قاتل الله اليهود حرمت عليهم الشحوم فجملوها فباعوها“ (متفق علیہ، اغاثۃ اللبغان / ۴۳۴)۔

(اللہ یہودیوں کو برباد کرے ان پر چربی حرام کی گئی تو اسے پگھلا کر کے بیچ دیا)۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی بھی فرمائی ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آنے والا ہے جس میں حرام چیزوں کا نام

بدل کر اسے حلال کرنے کی کوشش کی جائے گی (حوالہ مذکور / ۴۳۷)۔

”یأتی علی الناس زمان یتحلون الربا باسم البیع“ (رواہ ابن بطہ باسنادہ عن الاوزاعی عن النبی و ہذا ان کان

مرسلاب صالح للاعتضاد بہ بالاتفاق اغاثۃ / ۴۳۸)۔

(ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ ربا کو بیع کے نام سے حلال کرنے کی کوشش کریں گے)۔

ربا کو حلال کرنے کے لئے جو مختلف نام دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک نام ”بیع الوفاء“ ہے چنانچہ ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”البيع الذي تعارف أهل زماننا احتيالا للربا وسموه بالبيع الوفاء وهو في الحقيقة رهن“

(الفتاویٰ الہندیہ ۳/۲۰۸ ط: مکتبہ زکریا دیوبند)۔

(وہ بیع جو ہمارے زمانہ کے لوگوں میں متعارف ہے جو ربالیئے کا ایک حیلہ ہے اور جسے بیع وفا کہا جاتا ہے وہ درحقیقت رهن ہے)۔

بیع الوفاء کی تعریف:

کوئی شخص کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ فروخت کرے کہ جب وہ خریدار کو اس کی ادا کردہ قیمت یا اس کے دیئے ہوئے قرض کو واپس کر دے گا تو خریدار اس چیز کو اس کے حوالے کر دے گا، خرید و فروخت کی اس صورت کو بیع وفا، بیع امانت، بیع اطاعت، بیع معاملہ وغیرہ کے نام سے جانا جاتا ہے (رد المحتار ۷/۱۵۴۵، ابن عابدین الشامی، ط: مکتبہ زکریا، البحر الرائق ۶/۷۱، ابن نجیم، طبع مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان)۔

بیع وفا کی قسمیں:

بیع وفا کی دو قسمیں ہیں:

۱- سامان فروخت کرنے والے کے ذمہ خریدار کا قرض ہے، بیچنے والا کہتا ہے کہ قرض کے بدلے یہ چیز فروخت کر رہا ہوں اس شرط کے ساتھ کہ قرض کی ادائیگی کے بعد یہ چیز مجھے مل جائے گی، یا خریدار میرے ہاتھ اسے فروخت کر دے گا۔

۲- بیچنے والے کے ذمہ کوئی قرض نہیں ہے، البتہ وہ خریدار سے کچھ نقد رقم کا طلب گار ہے جس کے بدلے میں وہ اپنی کوئی چیز اسے بیچ رہا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس رقم کی واپسی کے وقت اس کی چیز اسے واپس مل جائے گی، یا خریدار اس کے ہاتھ فروخت کر دے گا (دیکھئے: العنایلی ہاشم الفتح القدیر ۸/۱۶۹، محمد بن محمود البارتی ط: احیاء التراث لبنان، ورد المحتار ۷/۱۵۴۵)۔

دونوں صورتوں میں یہ طے ہوتا ہے کہ بیچنے والا جب قرض واپس کرے گا تو اس کا سامان اسے مل جائے گا، اور حقیقت صرف یہ ہے کہ ایک شخص قرض کے بدلے میں مقروض کی کوئی چیز لے کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، جو صراحتاً ربا ہے، اور ربا کے نام سے بیچنے کے لئے وہ خرید و فروخت کا ڈھونگ رچانا چاہتا ہے۔

بیع وفا کا حکم:

”بیع وفا“ پانچویں صدی ہجری میں ایجاد ہوئی (فقہ المشکلات ۲/۲۱۲، القاضی مجاہد الاسلام القاسمی، ط: مجمع الفقہ الاسلامی)، اس

لئے فقہاء متقدمین سے اس سلسلہ میں کچھ منقول نہیں ہے، اسی طرح سے یہ بخاری وغیرہ تک محدود رہی ہے، اس لئے دوسرے مکاتب فکر کے فقہاء سے اس مسئلے میں صراحتاً کچھ ثابت نہیں ہے، اور حنفی فقہاء کی رایوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے تفصیل سے انہیں ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے:

۱- بیع وفا اپنی حقیقت کے اعتبار سے ”رہن“ ہے، اور اس پر ”رہن“ کے تمام احکام جاری ہوں گے، خریدار نہ تو اس کا مالک ہوگا اور نہ ہی اس سے فائدہ اٹھانے کا حقدار ہوگا، اس لئے کہ معاملہ کرنے والوں کی نیت اور مقصد کا اعتبار ہوگا، نہ کہ الفاظ و عبارات کا، ”لأن الاعتبار بأغراض المتعاقدين“ (الفتاویٰ الہدایہ علی ہاشم البہدویہ ۴/۵۰۵)۔
عام طور پر فقہاء نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے کہ یہ معاملہ باطل ہے اور اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے، ”والذی علیہ الاکثر أنه رهن“ (رد المحتار ۷/۵۳۶)۔

۲- صاحب منظومہ کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے تمام مشائخ کے نزدیک بیع کا یہ معاملہ صحیح ہے اور اس پر بیع کے تمام احکام جاری ہوں گے، اور بیچنے والے کو اسے واپس لینے کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان دونوں نے بیع کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لئے اسے بیع سمجھا جائے گا، دونوں کی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا (الفتاویٰ الہدایہ ۴/۵۰۶)۔

۳- قاضی خاں کا کہنا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ جب ”بیع“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اسے ”رہن“ نہیں کہا جاسکتا ہے، البتہ دیکھا جائے گا کہ فسخ بیع کی شرط عقد کے اندر ہے یا نہیں، اگر بیع کے اندر یہ شرط نہیں ہے، لیکن دونوں نے بیع بشرط وفا یا بیع جائز کا لفظ استعمال کیا ہے اور ان کا مطلب بیع جائز سے یہ ہے کہ یہ بیع لازم نہیں ہے، ان تمام صورتوں میں یہ بیع فاسد ہے، اور اگر بیع کسی شرط کے بغیر ہوئی ہے اور بیع کے بعد بطور وعدہ فسخ کی شرط کو ذکر کیا گیا ہے تو بیع جائز ہے اور وعدہ کی پاسداری لازم ہے، اس لئے کہ ضرورت کی وجہ سے کبھی وعدہ کو پورا کرنا قانونی طور پر بھی لازم ہو جاتا ہے (البہدویہ ۳/۲۰۹، رد المحتار ۷/۵۴۷)۔
۴- امام ظہیر الدین کہتے ہیں کہ اگر بیع میں یا بیع کے بعد وفا کی شرط لگائی گئی ہے تو بیع فاسد ہے، یہ نقطہ نظر اس پر مبنی ہے کہ شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، اور اگر عقد سے پہلے وفا کی شرط لگائی گئی ہے اور معاملہ کسی شرط کے بغیر طے پایا ہے اور دونوں کا یہ اعتراف نہیں ہے کہ یہ معاملہ سابق شرط پر مبنی ہے تو بیع درست ہے (الفتاویٰ الہدایہ ۴/۲۰۷)۔

۵- بعض فقہاء کہتے ہیں کہ یہ معاملہ بیع فاسد، صحیح اور رہن تینوں سے مرکب ہے، اور ہر ایک کے احکام اس پر جاری ہوں گے، بیع فاسد کی وجہ سے دونوں کو فسخ کا حق حاصل ہوگا، اور بیع صحیح کی وجہ سے خریدار اس سے فائدہ اٹھانے کا حقدار ہے اور رہن کی وجہ سے دوسرے کو فروخت نہیں کر سکتا ہے (الفتاویٰ الہدایہ ۴/۲۰۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ بیع وفا، ربا کو حلال کرنے کا ایک بہانہ ہے، جس زمانہ میں اس معاملہ کا رواج ہوا اس عہد کے صاحب بصیرت علماء نے سختی سے اس کی تردید کی، امام ابو شجاع کہتے ہیں کہ میں نے ابو الحسن ماتریدی سے کہا:

”قد فشا هذا البيع بين الناس، وفيه مفسدة عظيمة وفتواك أنه رهن وأنا أيضاً على ذلك، فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هذا ونظهره بين الناس، فقال: المعتبر اليوم فتوانا، وقد ظهر ذلك بين الناس فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله“ (فتاوى مشکات/ ۲۱۷)۔

(یہ معاملہ لوگوں کے درمیان پھیل چکا ہے اور اس میں بڑا فساد ہے، اور آپ کا فتویٰ ہے کہ یہ رهن ہے، اور میں بھی آپ کے موافق ہوں تو بہتر ہے کہ ہم ائمہ کو جمع کریں اور سب لوگ اس پر متفق ہو جائیں اور اسے لوگوں کو بتلائیں، تو انہوں نے کہا، اس وقت ہمارا فتویٰ ہی معتبر مانا جاتا ہے، اور ہمارا یہ فتویٰ لوگوں کو معلوم ہے، لہذا جو ہمارا مخالف ہے وہ سامنے آئے اور اپنی دلیل پیش کرے)۔

اور اسی طرح کے معاملہ کے متعلق علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

”جب کوئی واپس کرنے کے اختیار کی شرط لگائے قرض سے فائدہ اٹھانے کے بہانے، تاکہ وہ فروخت کردہ چیز کی آمدنی اور نفع کو اتنی مدت تک حاصل کرتا رہے جب تک کہ قرض لینے والا ثمن سے فائدہ اٹھاتا رہے، پھر ثمن کی واپسی کے وقت فروخت کردہ چیز کو لوٹا دے، اس معاملہ میں کوئی خیر نہیں ہے، اس لئے کہ یہ حیلہ، بہانہ ہے، اور ثمن لینے والے کے لئے اس مدت میں اس سے فائدہ اٹھانا یا کوئی تصرف کرنا حلال نہیں ہے“ (المغنی ۱/ ۲۷۷، ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، ت ۶۲۰، ط: دار عالم الکتب الریاض ۱۹۸۶ء)۔

یہی رائے مالکیہ اور شوافع کی بھی ہے، علامہ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

”فإن قال البائع: متى جئت بالثمن ردت إلى المبيع لم يجز“ (الفتاوى الاسلامیة وادلتہ ۵/ ۳۵۸، الذکثور وہبہ الزحیلی، ط: دار الفکر دمشق ۲۰۰۲ء)۔

(اگر بیچنے والا کہے کہ جب میں ثمن واپس کروں گا تو تم سامان واپس کر دو گے تو یہ صورت مالکیہ کے یہاں جائز نہیں

ہے)۔

اور شافعیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

”ويبطل البيع إن كان الشرط منافياً مقتضى العقد، مثل أن لا يبيع المبيع أولاً يهبه“ (حوالہ

مذکور)۔

(اگر شرط عقد کے تقاضے کے خلاف ہو، جیسے یہ شرط کہ خریدار سے کسی کے ہاتھ فروخت نہیں کرے گا یا بطور تحفہ نہیں

دے گا تو اس صورت میں بیع باطل ہے)۔

علامہ ابن حجر ہیتمی سے اس معاملہ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ:

”بیع کا وہ طریقہ جو لوگوں کے درمیان رائج ہے کہ وہ اس پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ ثمن مثل کے بغیر کوئی چیز فروخت کریں گے، اور بیچنے والا جب اس ثمن کو واپس کرے گا تو خریدار سامان کو لوٹا دے گا، لیکن یہ شرط عقد کے اندر نہیں ہے (اس لئے کہ اگر عقد کے اندر ہے تو معاملہ فاسد ہے) تو اس وقت بیع امام شافعی کے نزدیک صحیح ہے اور جب بیچنے والا ثمن لے کر آئے تو خریدار کو اختیار ہوگا کہ وہ سامان کو واپس کرے یا نہ کرے، لیکن واپس نہ کرنے کی صورت میں وہ دھوکہ دینے کی وجہ سے گنہگار ہوگا، اس لئے کہ اگر بیچنے والے کو پہلے معلوم ہو جاتا کہ یہ واپس نہیں کرے گا تو وہ اس ثمن پر بیچنے پر آمادہ نہ ہوتا“ (فقہ المشکلات / ۲۲۷)۔

علامہ وہب زحیلی ”مجمع الفقہ الاسلامی جدہ“ کی قرارداد کو اس سلسلہ میں نقل کرتے ہیں کہ:
 ”اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ قرض دے کر نفع حاصل کرنا ہے اور ”ربا“ لینے کا ایک بہانہ ہے، جمہور علماء کے نزدیک یہ بیع صحیح نہیں ہے اور اکیڈمی سے وابستہ علماء کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے (فقہ الاسلامی وادنیہ / ۵۲۰۳)۔

اس کا نام ”معاملہ“ رکھ دینے کے باوجود باقی ہے، اس لئے کہ اس کی جو حقیقت ہے اس پر عقد سے پہلے اتفاق ہو چکا ہے اور دونوں کو معلوم ہے اور جس سے دلوں کے بھید جو جاننے والا باخبر ہے ان دونوں نے عقد سے پہلے صریح ربا پر اتفاق کیا ہے اور پھر اس کا نام معاملہ رکھ دیا ہے اور بظاہر خرید و فروخت کر رہے ہیں، حالانکہ اس کا بالکل ارادہ نہیں ہے یہ بہانہ اور مکاری ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو دھوکہ دینا ہے ان میں اور یہودیوں میں کیا فرق ہے جنہوں کو اس چربوٹی کو اس کا نام اور شکل بدل کر حلال سمجھ لیا“ (افاضۃ اللہقان / ۴۳۵، ۴۳۶)۔
 نیز وہ لکھتے ہیں:

”اگر اس طریقے کو ڈاکٹر اور مریض کے ساتھ اپنائیں کہ ضرر رساں چیزوں کا نام اور شکل بدل کر استعمال کرنے کے لئے دے دیں تو مریض زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا، اسی طرح سے اللہ اور اس کے رسول نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ دل کی صحت اور ایمانی قوت کی حفاظت کے لئے ہے، جیسے کہ ڈاکٹر جن چیزوں سے مریض کو پرہیز کرنے کے لئے کہتا ہے اس کا مقصد اس کی صحت جسمانی کی حفاظت ہے، اب اگر کوئی مریض یا ڈاکٹر اس نقصان دہ چیز کو اس کی شکل یا نام بدل کر استعمال کرنے یا کرانے لگے تو مرض اور بڑھتا ہی جائے گا، یہاں تک کہ ہلاکت کے گھرے میں جا گرے گا، جب تم ان حیلوں پر غور کرو گے جن کا مقصد حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنا ہے تو بالکل یہی حال پاؤ گے، بلکہ اس کا نقصان ان حرام چیزوں سے بڑھا ہوگا جو اپنی اصل شکل اور نام پر باقی ہیں“ (حوالہ مذکور / ۴۳۹)۔

اس تفصیل کے بعد سوالات کا جواب بالترتیب یہ ہے:

- ۱- یہ معاملہ باطل ہے، اور خرید کردہ پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔
الف- تقاضائے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے شرط فاسد ہے۔
ب- چونکہ رہن ہے، اس سے ادا کردہ قیمت لازم ہے، اس سے زیادہ لینا باہ ہے۔
ج- جائز نہیں ہے۔
د- درست نہیں ہے۔
۲- (الف) جائز نہیں ہے۔



بیع و فاء کی شرعی حیثیت

مفتی سلمان پالپوری قاسمی ☆

۱- شریعت کا اصول یہ ہے کہ بیع کے معاملہ کے ساتھ اگر کوئی ایسی شرط لگا دی گئی جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو تو بیع درست نہیں ہوگی، چونکہ اس معاملہ (بیع الوفاء) کے ساتھ یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شہی واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے بیع درست نہیں، البتہ عملاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا، اس لئے یہ صورتاً تو بیع ہے، لیکن حقیقتاً اور حکم کے اعتبار سے رہن ہے، ”شامی“ میں ہے:

”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتيلاً للربوا وسموه بالوفاء فهو رهن في الحقيقة الخ“ -

(وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جاتا ہے اور اسے بیع الوفاء کہا جاتا ہے

درحقیقت رہن ہے)۔

۲- بیع الوفاء حقیقت اور حکم کے اعتبار سے رہن ہے، اکثر فقہاء اور اکابر اسی کے قائل ہیں، جیسا کہ سابق میں

تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

الف- یہ صورت جائز نہیں، سود میں داخل ہے، فقہاء نے لکھا ہے:

”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه إذن في الربا“ (رد

المحتار کتاب الرهن)۔

(مرتبہ کے لئے شہی مرہون سے کسی بھی طرح انتفاع جائز نہیں، اگرچہ راہن اسے انتفاع کی اجازت دیدے،

کیونکہ یہ سود کی اجازت ہے)۔

ب- یہ صورت جائز نہیں، سود میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے قرض پر کسی بھی طرح نفع حاصل کرنے سے منع

فرمایا اور اسے سود قرار دیا ہے، ”كل قرض جمع نفعاً فهو ربا“ (الجامع الصغير للسيوطي ۲/۲۸۴)، البتہ مکان یا زمین کا مناسب

کرایہ دے کر نفع اٹھا سکتا ہے۔

ج۔ اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ مناسب اجرت دے بغیر نہیں کر سکتا ہے۔

د۔ نام نہاد مشتری اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک ہی نہیں۔

ایک وضاحت:

اگر بیع کے ساتھ واپسی کی شرط نہ ہو، بلکہ بوقت معاملہ بیع قطعی ہو بلا کسی شرط کے، اور بعد میں بطریق وعدہ مشتری سے واپسی کا وعدہ لیا جائے، تو یہ بیع بالکل درست ہے، یہ بیع الوفاء میں داخل نہیں۔

گنجائش:

اگر کسی شخص کو روپیوں کی سخت ضرورت ہے، اور اسے کہیں سے قرض نہیں ملتا، اور اس کے پاس مکان یا دکان وغیرہ موجود ہے اور اس کو رہن میں رکھ کر قرض حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر رہن میں رکھنے کی صورت میں مرتہن اس سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے کوئی شخص رہن رکھ کر بھی قرض دینے پر تیار نہیں اور صاحب ضرورت اس ضرورت کی وجہ سے اپنے اس مکان یا دکان کو جو اس کے لئے ذریعہ سکونت یا ذریعہ معاش ہے اگر بالکل یہ فروخت کر دے تو آئندہ مزید مشکلات کا اندیشہ ہے تو ایسی شدید مجبوری میں جواز کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے (کذافی امداد الفتاویٰ ۱۰۸/۳)۔

زر ضمانت کی شرعی حیثیت:

۳۔ زر ضمانت کی شروعات تو ضمانت اور رہن کے طور پر ہوئی تھی، بسا اوقات کرایہ دار مکان یا دکان کا کرایہ باقی چھوڑ کر غائب ہو جاتا تھا اور مالک مکان کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا اسے مصیبت سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ عقد اجارہ کے وقت کرایہ دار سے متعین رقم ایڈوانس لی جانے لگی کہ خدا نخواستہ آئندہ چل کر کرایہ دار کرایہ کی رقم باقی چھوڑ کر غائب ہو گیا تو اس ایڈوانس یا ڈپازٹ کے نام سے لی گئی رقم سے باقی کرایہ وصول کیا جاسکے، اس صورت میں اس رقم کی حیثیت رہن کی ہو جائے گی، اور شرعاً اس طرح رہن لینا دینا درست ہے، فتاویٰ عالمگیری، (۴۳۵/۵) میں ہے:

”ولو استاجر داراً أو شيئاً أو أعطى بالأجر رهنًا جاز الخ“۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کرایہ دار مکان کو نقصان پہنچا دیتا ہے یا بجلی وغیرہ کے واجبات چھوڑ کر چلا جاتا ہے، جو بعد میں مالک مکان کو ادا کرنے پڑتے ہیں، اس مقصد کے لئے بھی کرایہ دار سے زر ضمانت (ڈپازٹ) کے نام سے ایک رقم ایڈوانس وصول کی جاتی ہے، گویا یہ ایک نوع کا زر ضمانت ہے، جیسا کہ مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے تصریح فرمادی ہے (دیکھئے: آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱۴۰/۶)۔

جہاں تک احقر کا اندازہ اور معلومات ہے ڈپازٹ لینے دینے کی اصل بنیاد مندرجہ بالا دو میں سے ایک وجہ ہے، بعد میں لوگوں نے جب دیکھا کہ ڈپازٹ کے نام سے وصول کی جانے والی یہ رقم مالک مکان کے پاس یونہی پڑی رہتی ہے، کسی استعمال میں نہیں آتی تو مالکان مکان جن کے قبضہ میں یہ رقم رہتی تھی، انہوں نے بلا اجازت اس رقم کو استعمال کرنا شروع کر دیا، جب اس کا رواج عام ہونے لگا تو دیندار مالکان مکان کو یہ بات کھٹکی کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ ایسے لوگوں نے کرایہ داروں میں سے کچھ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ ہماری اس رقم سے جو بطور امانت وضمانت ہے مالک مکان کے پاس جوں کی توں محفوظ رہنی چاہئے مالک مکان ہماری اجازت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو ہم کیوں نہ اس کو دی جانے والی اجازت سے فائدہ اٹھائیں؟ چنانچہ انہوں نے اس شرط پر اجازت دینا شروع کیا کہ اس اجازت کی بنیاد پر کرایہ میں کچھ کمی کر دی جائے۔

عصر حاضر میں زرضمانت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ جاننے سے قبل ایک فقہی اصول ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا

ہے۔

فقہی اصول:

فقہاء کرام نے جابجا قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ معاملات میں اعتبار محض الفاظ کا نہیں معنی کا ہوتا ہے، عبارات کا نہیں مقاصد کا ہوتا ہے، احکام ظاہری صورتوں سے نہیں حقائق سے متعلق ہوتے ہیں، اصولیین نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے:

”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی لا للألفاظ والمبانی“ (قواعد الفقہ)، ”لأن الاعتبار

للمعانی دون الصور“ (ہدایہ ۱۸۵/۳)۔

یہ مسئلہ معروف ہے اور اس کے لئے مزید دلائل کی حاجت نہیں، فقہاء کرام نے اس قاعدہ کا لحاظ فرمایا ہے، مثلاً رشوت کی حقیقت جب پائی جائے گی تو اس کو رشوت ہی کہا جائے گا، گور رشوت دینے والا ہدیہ اور دعوت کے نام سے کوئی چیز دے۔

مذکورہ بالا قاعدہ ذہن نشین کر لینے کے بعد دیکھنا چاہئے کہ عصر حاضر میں زرضمانت کی لین دین کی حقیقت کیا ہے؟ کیوں دیا جاتا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کی تحقیق کرنے کے لئے معاملہ کرنے والوں کا تعامل، عرف و رواج، اور ان کی شہادت کافی ہے، چنانچہ معاملہ کرنے والوں کے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر حاضر میں زرضمانت (ڈپازٹ) سے مالک مکان فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگا کر اس میں تصرف کرتا ہے، بلکہ اب تو زرضمانت لینے کا اصل مقصد ہی اس سے فائدہ اٹھانا بن گیا ہے، اور کرایہ دار کی طرف سے بھی استعمال کی قلبی اجازت ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں اس کے قرض ہونے کی شہادت دیتی ہیں۔

یہاں اگرچہ معاملہ قرض کے لفظ سے نہیں ہوا ہے، لیکن حقیقت کے لحاظ سے اس کو قرض ہی شمار کیا جائے گا، کیونکہ واپسی کی شرط کے ساتھ مالک مکان کو رقم سے منتفع ہونے کا پورا اختیار اور کرایہ دار کی طرف سے قلبی اجازت ہوتی ہے اور قرض میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے، محض قرض کا نام نہ لینے سے اس کو قرض کے حکم سے خارج نہیں کر سکتے۔ کتب فقہ میں اس کے نظائر موجود ہیں کہ اصل معاملہ کچھ بھی ہو اور کسی بھی لفظ کے ساتھ ہو قرض کا ذکر بھی نہ آیا ہو، لیکن مذکورہ بالا صورت (صاحب مال کی طرف سے دوسرے شخص کو منتفع ہونے کی قلبی اجازت اور واپسی کی شرط) کے پائے جانے کی صورت میں حقیقت اور احکام کے لحاظ سے اس کو قرض ہی کہا جاتا ہے، مثلاً مضاربہ میں اگر یہ شرط طے پائے کہ سارا نفع مضارب کو ملے گا، رب المال کو کچھ بھی نہ ملے گا تو گو معاملہ مضاربہ کا ہوا ہے، قرض کا تذکرہ تک نہیں ہوا، لیکن حقیقت کے لحاظ سے اس کو قرض ہی کہا جائے گا اور اس میں قرض ہی کے احکام جاری ہوں گے، فقہاء کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے:

”وان شرط كل الربح للمضارب فمستقرض فإن استحقاق كل الربح لا يكون إلا بعد أن يصير رأس المال ملكاً له؛ لأن الربح فرع المال واشتراطه له يوجب له تملكه رأس المال اقتضاء“
(شامی ۴/۸۴، مجمع الانہر ۳/۴۴۴)۔

اسی طرح نفوذ و دشمن کے ساتھ اگر عاریت کا معاملہ ہو تو اگرچہ معاملہ عاریت کا ہے قرض کا ذکر تک نہیں، لیکن فقہاء کرام اس کو قرض ہی فرماتے ہیں:

”وعارية الثمنين قرض“ (درمختار مع رد المحتار ۸/۴۱۵)۔

حاصل یہ کہ عصر حاضر میں زرضمانت (ڈپازٹ) اپنی حقیقت اور بحکم تعامل و عرف قرض کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اگرچہ اس کی ابتداء رہن اور زرضمانت کے طور پر ہوئی تھی، لہذا احقر کی رائے میں بحالت موجودہ بجائے رہن کے اس کو قرض کا درجہ دینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قرض ماننے کی صورت میں مالک مکان زرضمانت سے بے خطر منتفع ہو سکتا ہے، برخلاف اشیاء مرہونہ سے انتفاع کے، کہ اجازت کے بعد بھی صحیح قول کے مطابق اس سے انتفاع جائز نہیں، حالانکہ زرضمانت سے انتفاع کے سلسلہ میں ابتلاء عام ہے۔

جب کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان کو دیکھانے والی رقم (زرضمانت، ڈپازٹ) قرض کی حیثیت رکھتی ہے، تو قرض پر دی جانے والی رقم کے بدلہ فائدہ اٹھانا، یعنی کرایہ کم کرنا، سود اور حرام ہے: ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ (الجامع الصغیر للسیوطی ۲/۲۸۴)، یہ ایسا اصول ہے جو ہر عہد میں امت کے درمیان مقبول و معروف رہا ہے، ضعف سند کے ساتھ صحیح، لیکن اسے مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے، اور فقہاء و علماء کے درمیان اس کا متعلق بالقبول ہونا ضعف سند کی تلافی کر دیتا ہے، علاوہ ازیں متعدد صحابہ سے موقوف روایتیں مروی ہیں، فقہاء نے بھی اس موضوع کے مختلف گوشوں پر بحث کی ہے، درمختار میں

حکفی نے بحوالہ خلاصہ لکھا ہے: ”القروض بالشرط حرام والشرط لغو“ قرض میں کوئی شرط لگانا حرام ہے اور شرط لغو ہے، اور ”اشباہ“ کے حوالہ سے لکھا ہے: ”کل قرض جر نفعاً حرام، فکروہ للمرتہن سکنی المرہونۃ بیذن الراہن“ (ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ حرام ہے، اسی لئے گروی رکھے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کرنا مکان والے کی اجازت سے مکروہ ہے)۔



بیع و فاء اور فقہاء کی تشریحات

مولانا شرف عباس قاسمی ☆

بیع وفا کی وضاحت:

وفا کا معنی ہے پورا کرنا، اور اس خاص معاملے کو بھی وفا سے اس لیے موسوم کیا جاتا ہے، کہ اس میں مشتری سے اس بات کو پورا کرنے کا عہد لیا جاتا ہے کہ وہ بیع، ادائیگی، ثمن کی صورت میں بائع کو وہی لوٹائے گا، ”ووجه تسميته بيع الوفاء أن فيه عهداً بالوفاء من المشتري، بأن يرد المبيع على البائع حين رد الثمن“ (رد المحتار ۷/۵۴۵)، بعض فقہاء نے اسے بیع جائز اور بعض نے بیع المعاملہ سے بھی موسوم کیا ہے۔

بیع وفا کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنا سامان کسی کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ جب بھی بائع مشتری کو وہ قیمت واپس کرے گا، مشتری وہ عین اسے لوٹا دے گا، اس دوران مشتری، بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ اس کے فروخت کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

صورتہ: ”أن يبيعه العين بألف على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين، وسماء الشافعية بالرهن المعاد، ويسمى بمصر بيع الأمانة، وبالشام بيع الطاعة“ (الدر المختار ۷/۵۴۵)۔

وصورتہ: ”أن يقول البائع للمشتري، بعث منك هذا العين بدین لك علي أني متي قضيت الدين فهو لي“ (البحر الرائق ۱۱/۶)۔

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

جواب: یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، امام مالکؒ بیع کی اس شکل کو سرے سے ہی ناجائز قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس میں ایسی شرطیں ہیں جو مقتضاء عقد کے خلاف ہیں۔ ”فإن قال البائع للمشتري:

متی جنتک بالثمن رددت الی المبیع، وهو المعروف ببيع الوفاء عند الحنفية لم یجز البیع“ (الفقه الاسلامی وأدلته ۴/ ۲۵۴)، البتہ فقہاء احناف کی تصریحات کی روشنی میں یہ بیع شرعاً منعقد اور درست ہے، کیونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ درحقیقت سودی لین دین سے بچنے کی ہی ایک شکل ہے، اس لیے بعض فقہاء نے اس شکل کو ”البيع الجائز“ قرار دیا ہے، ابن عابدین شامی کہتے ہیں: ”ولعله مبني على أنه بيع صحيح لحاجة التخلص من الربا حتى يسوغ للمشتري أكل ربحه“ (رد المحتار ۷/ ۵۴۵)۔

وفاحکماً بیع ہے یا رہن؟

صاحب ”الفتاویٰ البرازیة“ نے اس پر طویل کلام کرتے ہوئے اس سلسلے میں آٹھ اقوال نقل کئے ہیں: جن میں سے ہم یہاں صرف تین اقوال کے نقل پر اکتفاء کر رہے ہیں، جس سے مسئلے کے کئی رخ سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) صاحب منظومہ کی رائے یہ ہے کہ یہ سرے سے بیع ہے ہی نہیں بلکہ یہ درحقیقت رہن ہے، لہذا مشتری اس عین کا نہ تو مالک ہوگا اور نہ ہی بائع کی اجازت کے بغیر اس کے لیے انتفاع جائز ہوگا۔

”الأول ما اختاره صاحب المنظومة أنه رهن حقيقة فلا يملكه المشتري ولا ينتفع به، إلا باذن البائع، ويضمن ما أكل من نذله وما أتلف من الشجرة، ويسقط الدين بهلاكه، ولا يضمن ما زاد كالأمانة، ويسترد عند قضاء الدين“ (البرازیة علی ما مشابہتہ ۳/ ۱۲۶)۔

(۲) یہ معاملہ بیع صحیح کے طریقے پر ہی منعقد ہوگا، مشائخ کے یہاں عرف کی وجہ سے یہی متفق علیہ قول ہے، علامہ فخر الدین زلیعی بھی اسی کے قائل ہیں: ”الثانی“ ”أنه بيع صحيح باتفاق مشايخ الزمان للعرف وما يفعله البائع من التعمير وأداء الخراج فهو بطريق الرضا لا الجبر، الزيلعي، أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (المصدر السابق)۔

(۳) تیسرا قول جسے صاحب بزازیہ نے جامع قرار دیا ہے اور صاحب بحر نے بھی اس کی وکالت کی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض اعتبار سے یہ بیع صحیح ہے، بعض اعتبار سے فاسد اور بعض اعتبار سے یہ رہن ہے، فرماتے ہیں: ”أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، وصحيح في حق بعض الأحكام كحل النزاع ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه، ولم يملك قطع الشجرة ولا هدم البناء وسقط الدين بهلاكه وانقسم الثمن إن دخله نقصان كما في الرهن“ (المصدر السابق)۔

اسی رائے کی روشنی میں صاحب بزازیہ نے اسے مرکب من العقود الثلاثہ قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ”قلت:

هذا العقد مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر، جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما“ (المصدر السابق)۔

”میرا خیال ہے کہ یہ عقد تین عقود (بیع صحیح، فاسد، رہن) سے مرکب ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے زرافتہ (ایک جانور جو اونٹ کی شکل کا ہوتا ہے، اگلی ٹانگیں لمبی اور پچھلی چھوٹی ہوتی ہیں، کھال چتکبری ہوتی ہے، سر پر دو چھوٹے سینگ ہوتے ہیں) جس میں بیک وقت تین جانور اونٹ، بیل اور چیتے کے اوصاف پائے جاتے ہیں، لوگوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہ معاملہ جائز ہے، بشرطیکہ متعاقدین کے دونوں بدل صحیح سلامت ہوں۔“

اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علی الاطلاق اسے بیع یا رہن قرار دینا مشکل ہے، مختلف جزئیات اور شکلوں کو سامنے رکھتے ہوئے رہن یا بیع کے احکام منطبق کیے جائیں گے۔

(الف) بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: علامہ حسکفیؒ نے جہاں ”وفاء“ کے بیع ہونے کا قول نقل کیا ہے، ”وقیل: بیع یفید الانتفاع بہ“، اس کی تشریح میں ابن عابدین شامیؒ نے دو احتمال نقل کیے ہیں، ایک تو وہ ہے جسے قول جامع کے ذیل میں اوپر نقل کیا جا چکا ہے، کہ یہ محض بعض احکام کے اعتبار سے بیع ہے، ورنہ بعض کے اعتبار سے رہن ہے، اس اعتبار سے مسئلے کی توجیہ آسان ہے کہ چونکہ یہ خالصتہً بیع نہیں، بلکہ اس میں رہن کا بھی پہلو ہے، لہذا مشتری، بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کرنے کا مجاز نہیں ہوگا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ واقعہً بیع ہی ہے، لیکن یہ محض اس حد تک ہے کہ اس سے انتفاع جائز ہے، وہ اس کے بیچنے کا تو بہر حال حق دار نہیں ہوگا، شامی کہتے ہیں: ”وقیل: بیع یفید الانتفاع بہ) هذا محتمل لأحد قولین: الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی المکراہ: وعليه الفتوی، الثانی القول الجامع لبعض المحققین: أنه فاسد فی حق بعض الأحكام حتی ملک کل منهما الفسخ صحیح فی حق بعض الأحكام، كحل الإنزال و منافع المبیع ورهن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعه من آخر ولا رهنه وسقط الدين بهلاكه“ (رد المحتار ۷/۷۴۷)۔

بیع خالص قرار دینے کی صورت میں بھی حکم تو یہی ہوگا کہ خریدار، صرف فروخت کنندہ ہی کو بیچے، البتہ بیع قرار دیتے ہوئے یہ حکم انتہائی مشکل ہے، اس لیے کہ بیع کے ذریعہ وہ شی مشتری کی ملکیت میں آچکی ہے، اور مشتری کو اپنی ملکیت میں کسی بھی طرح کے تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اس دشواری سے خلاصی کی راہ یہ ہے کہ اسے شرط کی وجہ سے بیع صحیح کے بجائے بیع فاسد قرار دیا جائے، جہاں مشتری کو عام تصرف کی اجازت نہیں ہوتی ہے، البتہ یہ اشکال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ بعد القبض تو

بیع فاسد میں بھی مشتری کا تصرف معتبر ہو جاتا ہے؟ اس لیے بعض حضرات فقہاء نے بیع فاسد بعد القبض قرار دینے کے بجائے اسے بیع مکروہ پر محمول کیا ہے، جس میں مشتری کو بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ وہ شی فروخت کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔

(ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب: یہ بات پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ بیع وفا اپنی اصل کے اعتبار سے درست نہیں ہے، کیونکہ اس میں شرط کے ساتھ بیع ہے اور حدیث میں تصریح ہے: ”نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرط“۔

البتہ جن حضرات فقہاء نے اس کو بیع قرار دیتے ہوئے بھی جائز قرار دیا ہے، انہوں نے جواز کا مدار عرف اور تعامل پر رکھا ہے، اس لیے مسئلے کی اس شق کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے: اگر لمبی مدت گزر چکی ہو تو چوں کہ عرفاً اس صورت میں غبن فاحش ہو جاتا ہے اس لیے مشتری کو اس تناسب سے زائد قیمت وصول کرنے کا حق ہونا چاہئے اور اگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد واپسی ہو رہی ہے، تو اصل قیمت پر ہی واپسی ہونی چاہئے، اس حوالے سے درج ذیل جزیئے سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے، شامی میں ہے: ”ولو قال البائع: بعتهک بیعاً باتاً فالقول له، إلا أن يدل علی الوفاء بنقصان الثمن كثيراً، إلا أن يدعی صاحبه تغیر السعر“ (رد المحتار ۷/۵۵۰)۔

(اگر بائع نے یہ کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ قطعیت والی بیع کی ہے تو اسی کے قول کا اعتبار ہوگا، مگر یہ کہ ثمن میں کافی نقصان کے ساتھ وفا پر دلالت کرے، الا یہ کہ صاحب مال قیمت میں تبدیلی کا دعویٰ کرے)۔

(ج) خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع ہے اور مشتری بیع پر قبضہ کر چکا ہے، اس لیے وہ جس طرح چاہے فائدہ اٹھائے، صرف اس کے لیے کسی اور کے ہاتھ بیچنے کی ممانعت ہے، (وقیل: بیع یفید الانتفاع به) هذا محتمل لأحد قولین: الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی الاکراه: وعلیه الفتوی“ (رد المحتار ۷/۵۴۷)۔

(د) خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: خریدار کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، رہن کی صورت

میں تو یہ حکم بالکل واضح ہے، بیع کی صورت میں بھی اسے اجازت نہیں ہے، کیونکہ جو حضرات بیع ہونے کے قائل ہیں، وہ صرف اس حد تک کہ اس سے انتفاع جائز ہے، ورنہ وہ بھی اس کی کسی اور کے ہاتھ فروختگی کے قائل نہیں ہیں، لہذا اگر خریدار کسی دوسرے سے بیچ دے تو بائع کو یا اس کے ورثہ کو اس بیع کو فسخ کر کے اپنے قبضے میں لے لینے کا حق ہوگا۔

”ولو باعه المشتري للبايع أو ورثته حق الاسترداد أي على القول بأنه رهن، وكذا على القولين القائلين بأنه بيع يفيد الانتفاع به، فإنه لا يملك بيعه“ (رد المحتار ۷/۵۳۸)۔

اس طرح اس کے لیے مزید قیمت کی بھی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ بیع وفایں بیع کا عوض درحقیقت وہی دین ہے، جو بائع کے ذمے لازم ہے، ”وفي الكفاية عن المحيط: هو أن يقول البائع للمشتري: بع منك هذا العين بمالك علي من الدين علي أي متى قضيته فهو لي“ (رد المحتار ۷/۵۳۵)۔

(۲) وفا کے رہن ہونے کی حیثیت:

فقہاء کی ایک بڑی جماعت کا خیال یہ ہے کہ وفاء کو اگرچہ بیع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ رہن ہی ہے، ”جوہر الفتاویٰ“ میں اسی کو صحیح قرار دیا ہے، ”فتاویٰ خیریہ“ میں ہے کہ اکثر حضرات کی رائے کے مطابق بیع وفاء رہن ہی ہے، اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو رہن کے حکم سے مختلف ہو، علامہ شامی نے ”فتاویٰ النسفی“ کی درج ذیل عبارت بھی نقل کی ہے: ”البيع الذي تعارفه أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بيع الوفاء هو رهن في الحقيقة لا يملكه ولا ينتفع به، إلا بإذن مالكة، وهو ضامن لما أكل من تمره وأتلف من شجره ويسقط الدين بهلاكه لو بقي ولا يضمن الزيادة، وللبيع استرداداً إذا قضى دينه، لا فرق عندنا، بينه وبين الرهن في حكم من الأحكام“ (رد المحتار ۷/۵۳۶)۔

”ربا کے حیلے کے طور پر ہمارے زمانے کے لوگوں کے درمیان جو بیع متعارف ہے، جسے بیع وفا کا نام دے رکھا ہے، وہ درحقیقت رہن ہے، خریدار اس کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس دوران وہ جو پھل کھائے، یا درخت کو ضائع کر دے، اس کو اس کا ضمان دینا پڑے گا، اور اس کی ہلاکت سے دین ساقط ہو جائے گا، اگر وہ باقی ہو، اور وہ زیادتی کا ضامن نہیں ہوگا، اور بائع جیسے ہی اپنا دین ادا کر دے مشتری سے واپس لینے کا حق اسے حاصل ہو جائے گا، ہمارے نزدیک بیع وفا اور رہن کے مابین کسی حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

اسی طرح سید ابوالشجاع، امام علی السعدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی وغیرہم بھی اسی کے قائل ہیں (دیکھئے: الفتاویٰ

(الف) جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: رہن ہونے کے اعتبار سے جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے وہ خریدار کے پاس امانت ہے، اس کے وہی احکام ہوں گے جو عام طور سے شی مرہون کے ہوتے ہیں، چنانچہ خریدار نہ اس کو بیچ سکتا ہے، اور نہ ہی بائع کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع کر سکتا ہے، اور اگر اجازت کے بغیر کھالیا تو وہ ضامن ہوگا، اتلاف کی صورت میں بھی وہ ذمہ دار ہوگا، اور اس کے بہ قدر اس کا حصہ دین ساقط ہو جائے گا، ”بزازیہ“ میں ہے: ”ذکر صاحب المنظومة فی فتاواہ أنه رهن فی الحقیقة لا یملکہ المشتري ولا ینتفع به الا بإذن البائع ویضمن ما أکل من نزله وأتلف من شجره ویسقط الدين بهلاکة ولا یضمن ما زاد کالأمانة ویسترد عند قضاء الدين“ (البرازیة علی ہاش البندیة ۴/۳۰۵)۔

(ب) اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

جواب: اگر خریدار اس طریقے پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو یہ صورت بھی جائز ہوگی، اس لیے کہ یہی خریدار کے پاس مرہون ہے، جس سے وہ بائع کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، تو جب بلا عوض انتفاع کی گنجائش ہے تو بائع اگر عوض لیسر پر رضامند ہو جائے تو اس صورت میں بھی گنجائش ہونی چاہئے: ”إن كان المشتري أخذ النزل بلا إذن البائع له أن یضمنه الغلّة المحمولة، وإن كان یأذنه أو أعطاه البائع؛ لأنه هبة منه، وكذا إذا كان اشتری كله وأخذ الغلّة“ (البرازیة ۴/۳۰۵)۔

”اگر مشتری نے بائع کی اجازت کے بغیر پیداوار لے لی تو بائع اس کو اٹھائے ہوئے غلے کا ضامن بنا سکتا ہے، اور اگر بائع کی اجازت سے ہے یا بائع نے اس کو دیا ہے تو مشتری پر کوئی ضمان نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ بائع کی طرف سے ہبہ ہے، اسی طرح جب مشتری نے سارے کو خرید لیا ہو اور غلہ لے لیا ہو“۔

(ج) اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اگر بائع کی اجازت ہے تو خریدار اس عرصے میں اس سے کاشت وغیرہ کا انتفاع کر سکتا ہے: ”هو رهن فی الحقیقة لا یملکہ ولا ینتفع به الا بإذن مالکة“ (رد المحتار ۷/۵۴۶) لیکن اجارہ داری کا جواز مشکل نظر آ رہا ہے، اس

لیے کہ اگر خود راہن کو اجرت پر دیا ہے تو یہ درست نہیں ہے اور اجرت لازم نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کی حیثیت راہن کی ہے اور راہن اگر مرہن سے کوئی شئی اجارہ پر لیتا ہے، تو اجرت لازم نہیں ہوتی ہے، ”ولو استاجرہ بائعہ لا یلزمہ أجر لانه رهن حکما حتی لا یحل الانتفاع به“ (الدرع الردۃ/۵۳۸)؛ ”فإن أجر المبیع وفاء من البائع، فمن جعله فاسدا قال: لا تصح الإجارة ولا یجب شیء، ومن جعله رهنا كذلك، ومن أجازہ جوز الإجارة من البائع وغیرہ وأوجب الأجرة“ (البرازیة ۴/۲۰۰) اور اگر بائع کے علاوہ کسی اور کو بائع کی اجازت سے اجارہ پر دیا ہے تو اجرت بائع کو ملے گی اور اگر بائع کی اجازت کے بغیر ہے، تو اجرت یا تو صدقہ کر دے یا بائع کو ہی لوٹا دے، ”وأما إذا اجره المشتري وفاء یأذن البائع فهو كإذن الراهن للمرتهن بذلك، وحكمه أن الأجرة للراهن وإن كان بغیر اذنه، یتصدق بها أو یردها علی الراهن المذكور وهو أولى صرح به علماؤنا“ (رد المحتار ۷/۵۳۹)۔

(د) خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

جواب: خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔ ”وأجاب عماد الدین وعلاء الدین بدر ومنهاج الشریعة فی المشتري وفاء إذا باع أو وفاء أو وهب إن هذا التصرف لا یصح وإذا مات المشتري وفاء فورثته یقومون مقامه فی أحكام الوفاء“ (البرازیة ۴/۲۰۶) ”ولو باعه المشتري للبايع أو ورثته حق الاسترداد“ (الدرع الردۃ/۵۳۸)۔

(۳) رقم ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

جواب: آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر جو معاملہ طے کیا جاتا ہے، یہ معاملہ درست نہیں ہے، کیونکہ پیشگی ضمانت کی جو خطیر رقم حاصل کی جا رہی ہے، اس کی حیثیت اگر صرف امانت و راہن کی ہو تو فقہاء نے راہن کی اجازت سے اس سے انتفاع کو جائز قرار دیا ہے، اگرچہ بعض حضرات کو اس میں بھی تردد ہے، ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی عدم جواز کو ہی مزاج شریعت سے زیادہ ہم آہنگ قرار دیا ہے۔

”لا یجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن اذا كان مشروطا أو متعارفا، وإن لم یکن كذلك فیجوز مع الكراهة التحریمیة، إلا أن یأذن الراهن فیحل، جاء فی معتبرات كتب الحنفیة، وقال بعضهم: لا یحل وإن أذن الراهن بالانتفاع، وهذا هو المتفق مع الروح العامة فی الشریعة فی تحريم الربا“ (الفقه الاسلامی ۴/۵۱۵)۔

لیکن یہاں مسئلہ صرف امانت و راہن تک ہی محدود نہیں ہے، اس لیے کہ امانت، راہن یا ودیعت میں اگر صاحب مال اجازت دے دے تو اگرچہ تصرف جائز ہو جاتا ہے، لیکن حکماً اب وہ امانت کے بجائے قرض کے زمرے میں آ جاتا ہے۔

”إذ الذي يملكه الوديع من الوديعة حفظها فقط، لا التصرف فيها، لكن المودع إذا أذن بالتصرف في الوديعة كانت قرضاً، لأن العبرة للمعاني“ (۵۱۸/۴)۔

”جس کے پاس کوئی چیز بہ طور ودیعت رکھی جائے وہ فقط اس کی حفاظت کا مالک ہے، اس میں تصرف کا حق نہیں رکھتا ہے، البتہ اگر مودع نے مال ودیعت میں تصرف کی اجازت دیدی ہے، تو اسے قرض خیال کیا جائے گا، اس لیے کہ اعتبار معانی کا ہوتا ہے۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو رقم ضمانت حاصل کی گئی ہے، اس کی حیثیت قرض کی ہے، گویا کرایہ قرض دے کر کم کرایہ پر مکان حاصل کر رہا ہے، اس طرح یہ شکل ”کل قرض جو نفعاً“ کے تحت داخل ہو کر ممنوع قرار پاتی ہے۔



بیع و فاء کی شرعی حیثیت

مولانا کلیم اللہ عمری ☆

بیع و فاء کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم کیا ہے؟

لغت میں وفاء غدر کی ضد ہے، ”ونی بعهده“ اور ”أونی“، ایک ہی معنی میں مستعمل ہے، ”أونی الرجل حقہ“ اور ”وفاء ایاه“ کے معنی ہیں، اس نے اس کا حق مکمل اور پورا کر دیا، وفاء شریفانہ، عالی اور بلند اخلاق کا نام ہے۔

فقہاء کرام کی اصطلاح میں: ”بیع الوفاء هو أن یبیع شخص عن شخص آخر بمبلغ ما علی أنه متی وارد المبلغ رد علیہ تلک العین“ (ادبیۃ الناسک و شاکل الحاج و السالک لأبی یزن حمزہ بن فالج الفتحی ص ۱۹)۔

”هو أن یبیع المحتاج إلی النقد عقاراً علی أنه متی وفي الثمن استرد العقار“ (فتاویٰ فی المسح علی الخفین ص ۵۰، شیخ ڈاکٹر عبداللہ بن جریرین)۔

یعنی بیع و فاء کی صورت یہ ہے کہ کوئی نقد روپیوں کا محتاج شخص اپنی جائیداد کو کسی آدمی سے یوں سودا کرتا ہے کہ تم اتنی قیمت میں اس سامان کو خرید لو، اتنی مدت کے بعد یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کر دوں میرا سامان مجھ ہی کو واپس بیچنا، کسی دوسرے کو مت بیچنا، گویا بائع اپنی بیع کو جب چاہے قیمت ادا کر کے واپس حاصل کر لے گا، قرض حاصل کرنے کی بجائے یہ ایک حیلہ ہے، قرض کے مقابلہ میں نفع حاصل کیا جاسکتا ہے، اس بیع کے مختلف نام ہیں، مالکیہ کے یہاں ”بیع الثنیا“، شافعیہ کے نزدیک ”بیع العہدہ“، حنابلہ نے ”بیع الامانۃ“ اور حنفیہ نے ”بیع المعاملۃ“ کا نام دیا ہے، نیز بعض اہل علم اس بیع کو ”بیع الطاعۃ“ اور ”بیع الجائز“ بھی کہتے ہیں (الکشاف القناع ۱۳۹۳ھ، الفتاویٰ الہندیہ ۲۰۹/۳)۔

فقہاء کی اصطلاح میں بیع و فاء اس لئے کہا جاتا ہے کہ خریدار پر اس شرط کی وفاداری اور تکمیل لازم ہوتی ہے (قرار رقم ۶۶ (۷/۴) قرار مجلس مجمع الفقہ الاسلامی المنعقد فی دورۃ مؤتمرہ السالط بجدہ فی السعودیہ ۷-۱۲ ذی القعدہ ۱۴۱۲ھ الموافق ۹-۳ مئی ۱۹۹۲)۔

”حقیقۃً هذا البیع هو بیع المال بشرط أن البائع متی رد الثمن یرد المشتري إلیہ المبیع“ (یعنی اس بیع کی حقیقت یہ ہے کہ بائع اپنی چیز کو اس شرط پر بیچے گا کہ جب وہ مشتری کو ثمن واپس کر دے گا تو مشتری

بیع کو واپس کر دے گا، ”قرر ما یلی أن حقیقة هذا البیع (قرض جرنفعا) فهو تحایل علی الربا وبعدم صحته قاله جمهور العلماء“ (یعنی یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ تجارت درحقیقت سود حاصل کرنے کا ایک حیلہ ہے، اسی وجہ سے جمہور علماء نے اس بیع کے عدم جواز پر اتفاق کیا ہے۔

”إن هذا العقد غیر جائز شرعا“ (یعنی یہ تجارت شرعا جائز نہیں ہے) (فتاویٰ الشیخ محمد بن صالح العثیمین

عبرالانترنیت ۷۳/۱)۔

بیع و فاء کا حکم:

”حکمه حکم الرهن فی جميع الأحكام علی ما علیه الأكثر، كما فی الخیریه والحوای

الزاهدی، وهو الصحيح، كما فی جواهر الفتاوی“ (العقود الدررینی تنقیح الفتاوی الحامدیة لابن عابدین بن محمد امین ۲۲۱/۱)۔

(اکثر علماء نے بیع و فاء پر رہن کا حکم لگایا ہے، جیسا کہ خیریه، حاوی اور زاہدی میں مذکور ہے)۔

۲- ”بیع الوفاء هو فی الحقیقة رهن“ (فتاویٰ الہندیہ ۲۰۹/۳)۔

(بیع و فاء درحقیقت رہن ہی ہے)۔

”حکمه حکم الرهن فی أرجح الأقوال عندنا“ (فتاویٰ الہندیہ ۹۰/۱)۔

(راجح قول کے مطابق ہمارے پاس اس بیع کا حکم رہن ہی کا ہے)۔

”بیع امانة یطلق علی بیع الوفاء“ (موسوعہ فقہیہ ۲۰۹/۹)۔

”ذهب المالکیة والحنبلة والمتقدمون من الحنفیة إلى أن بیع الوفاء فاسد؛ لأن اشتراط

البائع أخذ المبیع إذا رد الثمن إلى المشتري یخالف مقتضى البیع، وحکمه وذهب بعض المتأخرین

من الشافعیة والحنفیة إلى أن بیع الوفاء جائز مفید لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري من المبیع

دون بعضها وهو البیع من آخر“ (موسوعہ فقہیہ ۲۴۰/۹)۔

یعنی مالکیہ، حنبلیہ اور متقدمین حنفیہ کی رائے میں بیع و فاء فاسد ہے، کیونکہ بائع شرط لگاتا ہے کہ وہ جب کبھی قیمت لوٹا

دے گا تو بیع کو واپس حاصل کر لے گا، اور یہ بیع کے تقاضوں اور اس کی حکمتوں کے منافی ہے، البتہ بعض متأخرین شافعیہ اور

حنفیہ کی رائے میں بیع و فاء جائز ہے اور بعض احکام میں مفید بھی ہے اور مشتری خود بیع سے مستفید تو ہوتا ہے، لیکن مالکانہ قبضہ یا

کسی اور کو فروخت کرنے یا تصرف کے سارے حقوق حاصل نہیں ہوتے، مگر تعامل کی وجہ سے قواعد کو ترک کیا جاتا ہے (تیسرین

البحث فی الدررلیلی ۵/۱۸۳، البحر الرائق ۸/۶، الفتاویٰ الہندیہ ۲۰۸/۳)۔

علامہ ابن عابدین شامی نقل فرماتے ہیں: بیع و فاء کے بارے میں لوگوں کی حاجات کے پیش نظر سود سے بچنے کے

لئے وہ جائز ہے، محققین فرماتے ہیں کہ جب لوگوں پر کوئی معاملہ تنگ ہو جاتا ہے تو اس کے حکم میں وسعت اور گنجائش ضرور پیدا ہو جاتی ہے (در المختار مع الشامیہ ۵۵۱/۷ زکریا)۔

”جاء في قرار مجمع الفقه الاسلامي المنعقد في دورة مؤتمره السابع بجدة في المملكه العربيه السعوديه من ۱۲-۷/ذی القعدہ ۱۴۱۲ھ، بعد الاطلاع على البحوث الواردة إلى المجمع بخصوص موضوع (بيع الوفاء) وبعد الاستماع للمناقشات التي دارت حول بيع الوفاء وحقيقته: (بيع المال بشرط أن البائع متى رد الثمن يرد المشتري اليه المبيع)۔

تقرر: أولاً: إن حقيقة هذا البيع (قرض جر نفعاً) فهو تحايل على الربا، وبعدم صحته قال جمهور العلماء۔

ثانياً: يرى المجمع أن هذا العقد غير جائز شرعاً“ (انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جده کے شرعی فیصلے ص ۲۱۷)۔

انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جده کے ساتویں اجلاس کی تجاویز میں یہ بات طے ہوئی کہ:

۱- یہ معاملہ (بیع وفاء) درحقیقت ایک ایسا قرض ہے جس میں نفع حاصل کیا جاتا ہے، لہذا یہ سودی معاملہ کا ایک حیلہ ہے، اور اکثر علماء کی رائے کے مطابق درست نہیں ہے، ۲- اکیڈمی کی رائے میں یہ معاملہ شرعاً ناجائز ہے۔
نوٹ: راقم الحروف کی رائے بھی مذکورہ آخر الذکر قرارداد کے عین موافق ہے۔

سوال نمبر ۱: یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے تو شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں، اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

مذکورہ معاملہ بیع نہیں ہے، اس لئے کہ بیع میں دو چیزیں جمع نہیں ہو سکتی ہیں، یعنی شرط اور بیع، خرید و فروخت میں مشروط تجارت کی شرعاً اجازت نہیں ہے، فرمان نبوی ﷺ ہے: ”نہی عن بیع و شرط“ (المجم الاوسط ۴۳۶۱)، یعنی آپ ﷺ نے بیک وقت تجارت کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، لہذا یہ عقد شرعاً منعقد نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ یہ رہن کے قبیل سے ہے، جیسا کہ اکثر علماء کی رائے ہے۔

مذکورہ عقد خاص قید و بند کے ساتھ کیا جائے تو بیع فاسد ہوگی، اگر شرط و فاء کو عقد سے پہلے یا بعد میں طے کیا جائے تو بیع منعقد و لازم ہوگی، نیز اضطراری صورت میں فریقین کے لئے اقالہ کی صورت بھی جائز ہوگی جس سے فریقین استفادہ کر سکتے ہیں اور سودی نظام سے بچ سکتے ہیں۔

حنفیہ میں ابوشجاع علی السعدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ بیع و فاء رہن ہے، اس پر احکام رہن ہی نافذ ہوں گے، دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ عقود میں اعتبار معانی کا ہے، الفاظ اور کلمات کا اعتبار نہیں

ہوگا، نیز اس بیع میں ٹمن لوٹانے کے وقت فروخت شدہ چیز واپس لینے کی شرط ہے جو رہن کی ہی صورت ہے۔

الف- بیع قرار دینے پر شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

بیع کی صورت میں بیع صحیح ہوگی اور شرط کو ملتی، یعنی کالعدم قرار دیں گے جس طرح سے نبی کریم ﷺ نے حضرت بریرہؓ کی بیع میں صحت بیع کا حکم صادر فرمایا اور حضرت بریرہؓ کو فروخت کرنے والوں کی شرطوں کو باطل قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”الولاء لمن اعتق“ (صحیح بخاری) یعنی آزاد کردہ غلام کا ترکہ آقا کو حاصل ہوگا۔
مذکورہ حدیث شریف کی روشنی میں بیع صحیح ہوگی، البتہ شرط کالعدم قرار دی جائے گی، زیادہ سے زیادہ مشتری پر شرط وفاء اور وعدے کو پورا کرنا اخلاقی لحاظ سے ضروری ہوگا۔

نوٹ: حدیث رسول ﷺ: ”نہی عن بیع و شرط“ (المجم الاوسط) اپنے عموم پر نہیں ہے، بلکہ بعض شروط عقد کے منافی ہوتے ہیں، جیسا کہ بریرہؓ کی بیع کے تعلق سے فرمایا کہ بیع صحیح ہے، اگرچہ لوگ اس میں ۱۰۰ باطل شرطیں لگائیں، ”الولاء لمن اعتق“ (بخاری ۴۵۶)، یعنی اس بیع میں شرط کو باطل قرار دیا گیا اور عقدک صحت کا حکم لگایا، جبکہ حدیث جابرؓ میں بیع اور شرط جمع ہوئے، مگر آپ ﷺ نے اس بیع کو صحیح قرار دیا، اس لئے کہ اس بیع میں شرط عقد کے منافی نہیں تھی، یعنی رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابرؓ سے ایک مرتبہ اونٹ کا سودا کیا تو حضرت جابرؓ نے شرط لگائی کہ میں اس اونٹ کو بیچ دوں گا، مگر اس شرط پر کہ میں اس پر سوار ہو کر مدینہ پہنچوں گا، پھر اونٹ کو آپ کے حوالہ کروں گا تو آپ ﷺ نے اس شرط کو منظور فرمایا اور اس کی قیمت ایک اوقیہ ادا فرمائی (صحیح البخاری ۲۷۱۸)۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟

بیع میں بائع اپنی بیع پر قیمت لگانے میں آزاد ہوتا ہے، خواہ وہ بیع مجمل ہو یا بیع موبل، جس طرح وہ بیع کو بیچنے یا نہ بیچنے میں مختار کل ہوتا ہے، نیز موجودہ صورتحال میں بھی بیع کی صورت میں زائد قیمت کا مطالبہ شرعاً درست قرار دیا جائے گا۔

ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

بیع مشتری کی ملکیت میں پہنچنے کے ساتھ بیع سے استفادہ اس کا ذاتی حق ہے، چاہے تو وہ خود مستفید ہو، یا کسی کو عاریت دے یا ہبہ کرے یا رہن کے طور پر رکھے، یہ سارے حقوق ملکیت تامہ کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں، لہذا خریدار بیع سے استفادہ کر سکتا ہے، اس لئے کہ وہ اس چیز کا مالک و مختار کل ہے۔

د- خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیچ کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

بیچ کی صورت تسلیم کرنے پر خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے کسی کو بیچ دے، شرعاً اس کا تصرف درست ہوگا، نیز مزید قیمت لے کر فروخت کرنا بھی اس کے لئے جائز ہوگا، اس لئے کہ بیچ پر ملکیت کے ساتھ قبضہ تامہ کے ساتھ وہ آزاد ہے، جب چاہے کسی کو بیچے اور بیچ پر قوت خرید سے زائد رقم کے ساتھ نفع بڑا چڑھا کر بیچنا اس کا حق ہے اور اسلام اس حق کو تسلیم کرتا ہے اور آزادی بھی دیتا ہے، البتہ شرط وفاء اور وعدے کو پورا کرنا اخلاقی لحاظ سے ضروری ہوگا۔

۲- الف: اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

رہن کی صورت میں شرعی اصول یہ ہے کہ مال مرہون سے استفادہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ مال مرہون پر راہن کو خرچ کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو ایسی صورت میں راہن کا مال مرہون سے استفادہ جائز ہوگا، اور بالفرض اگر راہن کو مال مرہون پر کسی قسم کا خرچ نہ آئے تو مال مرہون سے استفادہ جائز نہ ہوگا، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الرهن يركب بنفقته اذا كان مرهونا ولبن الدر يشرب بنفقته اذا كان مرهونا وعلى الذی يشرب ويركب النفقة“ (بخاری ۲۵۱۲)، یعنی رہن رکھے ہوئے جانور پر اخراجات و مصارف کے عوض سواری کی جاسکتی ہے اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ بھی پیا جاسکتا ہے، اور جو سواری کرتا ہے اور دودھ پیتا ہے وہی اخراجات کا ذمہ دار ہے، البتہ جہاں مال مرہون پر راہن کو کسی قسم کا خرچ لازم نہ آئے تو ایسی صورت میں قرض سے استفادہ لازم آئے گا جو کہ سود شمار ہوگا ”کل قرض جرنفعاً فهو ربا“، ہر وہ قرض جو نفع لے آئے وہ سود ہے، اگرچہ یہ روایت ضعیف ہے، لیکن یہ مسئلہ صحیح احادیث سے ثابت ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن سلامؓ سے مروی ہے کہ جب تیرا کسی شخص پر حق ہو اور وہ تجھے بھوسا یا خشک گھاس رسی سے باندھ کر ہدیہ بھیجے تو تجھے چاہئے کہ اس کو نہ لے یقیناً وہ سود ہے (بخاری ۳۸۱۴ کتاب المناقب باب مناقب عبد اللہ بن سلامؓ)، مذکورہ حدیث کی روشنی میں رہن سے انتفاع درست نہیں ہے۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

مذکورہ صورت ہندوستان کے مروجہ قانون کے تحت وضع شدہ ہے، یعنی کرایہ دار کسی دوکان یا مکان پر تین سال تک قابض / مستفید ہو تو وہ اس مکان پر اپنا قبضہ جما سکتا ہے، ایسی صورت میں شرعاً اس کا حکم یہ ہوگا کہ مناسب و متعارف کرایہ

متعین ہونے کے بعد اور طرفین کی رضامندی کے ساتھ خریدار مکانات کو کرایہ ادا کرے، یعنی کرایہ عرف کے مطابق ہی ہو، مروجہ کرایہ سے کم کرایہ طے کرنا کھلم کھلا سود ہی ہے، شرعی اصول یہ ہے کہ ہر وہ قرض جس سے انتفاع مقصود ہو وہ سود ہے۔ اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کاری یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ خریدار کو بیع سے کاشت کاری یا اجارہ داری یا کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے اگر وہ نفع اٹھائے تو ثمن کی صورت میں دی گئی رقم قرض سے منہا ہو کر اس کا مروجہ کرایہ بائع یا راہن کو ملے گا، شے مرہون سے استفادہ کی صورت وہی ہوگی جو کہ نص سے ثابت ہے، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”الرهن يركب بنفقته إذا كان مرهونا ولبن الدريشرب بنفقته إذا كان مرهونا وعلى الذى يشرب ويركب النفقة“ (بخاری ۲۵۱۲)، (راہن رکھے ہوئے جانور پر اخراجات و مصارف کے عوض سواری کی جاسکتی ہے اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ بھی پیا جاسکتا ہے اور جو سواری کرتا ہے اور دودھ پیتا ہے وہی اخراجات کا ذمہ دار ہے)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

مذکورہ صورت بیع کی ہو تو خریدار بیع کو بیچنے کا حق رکھتا ہے اور قیمت جو مناسب سمجھے یا مارکیٹ کی جو قیمت ہو اس قیمت پر بیچنا جائز ہوگا، ورنہ راہن یا قرض کی صورت میں مال مرہون میں تصرف کا کوئی حق نہیں ہوگا، البتہ مرہون استیفاء قرض کے لئے راہن کی اجازت کے ساتھ ہی مرہون کو بیچ کر اپنی رقم حاصل کر سکتا ہے، زائد رقم کو راہن کے حوالہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔

۲- رقم ضمان کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض سے فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

امانت کی دو قسمیں ہیں: ۱- امانت مضمونہ، ۲- امانت غیر مضمونہ

زر ضمانت کی حیثیت امانت کی ہوگی، یہ امانت مضمونہ ہے، اس زر ضمانت میں عام طور پر تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، اور یہ امانت ضمانت کے ساتھ مربوط ہوگی، نقصان کی صورت میں تصرف کرنے والا زر ضمانت لوٹانے کا مسؤول ہوگا۔

۱- البتہ اشیاء کی ضمانت غیر مضمون ہوگی (الامان لا ضمان)، لہذا اس صورتحال میں مرہون مال مرہون سے استفادہ

نہیں کرے گا۔

۲- اگر مال مرہون میں مرہون کی جانب سے تفریط ثابت اور محقق ہو تو وہی مسؤول ہوگا اور اگر تفریط ثابت نہ ہو تو وہ

مسؤول نہ ہوگا۔

نوٹ: حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے انتقال کے وقت حضرت عمر ۸۶ ہزار درہم مقرض

تھے، قرض کا معاملہ اپنی ذات کے لئے نہیں تھا، بلکہ ان کے پاس لوگوں کی امانتیں تھیں اور لوگ رہن رکھا کرتے تھے، اور آپ

مالکوں سے اجازت لے کر تصرف کیا کرتے تھے، گویا وہ امانت مضمونہ تھی اسی وجہ سے اسے قرض کا نام دیا گیا تھا (فقہ السیرۃ النبویہ مع موجز تاریخ الخلافۃ الراشدۃ ل محمد سعید رمضان البوطی ۱/۳۵۹)۔

- ۱- صورت مسئولہ میں از روئے شرع زر ضمانت کی حیثیت امانت کی ہوگی، یعنی امانت مضمونہ کی ہوگی، ضرورتہ مالک مکان تصرف کا حق رکھ سکتا ہے اور نقصان کی صورت میں زر ضمانت لوٹانے کا مکلف بھی ہوگا۔
- ۲- زر ضمانت کی کثرت کی وجہ سے کرایہ میں کمی کرنے کا مسئلہ مصالح مرسلہ میں سے ہے، نیز یہ بیع معاملات کی ایک جدید قسم ہے جو رہن اور قرض سے جدا شکل ہے، جس میں متعاقدین ایک دوسرے کے محتاج ہیں، جیسے بیع سلم وغیرہ میں بائع و مشتری ایک دوسرے سے مستفید و محتاج بھی ہوتے ہیں، لہذا اس صورت حال میں زر ضمانت کی کثرت کی وجہ سے کرایہ میں کمی درست ہے۔



بیع و فاء میں بیع واپسی کی شرط کا حکم

مفتی محمد جعفر علی رحمانی ☆

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے، اور ایسی بیع کے حکم میں ہے، جو اپنے بعض احکام میں مفید اور بعض میں غیر مفید ہے، نیز اس بیع میں جو خاص قید و بند لگائی جاتی ہے گرچہ وہ قواعد شرعیہ کے مخالف ہے، مگر تعارف و تعامل ناس کی وجہ سے یہاں قواعد شرعیہ متروک ہوں گے۔

ویسے تو اس کے جواز و عدم جواز میں شدید اختلاف رہا، امام ظہیر الدین اور صدر الشہید وغیرہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، امام ابوشجاع، امام علی، امام ابن نجیم، امام بیہقی، سعدی، قاضی حسن ماتریدی اور امام مرغینانی وغیرہ اس کو حاجت ناس کے پیش نظر استحساناً، اور عرف عام حادث کا قضیہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اصولاً عدم جواز کو ثابت کیا ہے، اور بوقت ضرورت جواز پر عمل کی اجازت دی ہے، اور علاوہ مہ خلیل احمد رحمہ اللہ نے جائز قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور بیع مع الشرط کی قید نہ لگائی جائے، تاکہ فقہائے متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے (محقق و مدلل جدید مسائل: ۱/۲۹۹-۳۰۰)۔

(الف): بیع و فاء کی صورت میں یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے، یہ شرط، شرط لازم ہے، اور کسی دوسرے کو بیچنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ بیع بالوفاء کے متعلق مفتی محمد تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں: ”اس کے بارے میں اصل مذہب یہ ہے کہ یہ فاسد ہے، اکثر فقہاء کرام اس عقد (مسئلے) میں رہن کا حکم جاری کرتے ہیں اور بیع کو فاسد قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے، اور مشتری کو بھی اس سے نفع اٹھانا جائز ہے، لیکن یہ حق حاصل نہیں کہ آگے کسی اور کو بیچ دے، اور ”رد المحتار“ میں اس کے متعلق کئی اقوال نقل کیے ہیں، لیکن جو قول جامع ہے اس کو بایں طور ذکر کرتے ہیں:

”قوله: (وقیل: بیع یفید الانتفاع بہ) هذا محتمل لأحد القولین: الأول: أنه بیع صحیح مفید

لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه - قال الزيلعي في الإكراه : وعليه الفتوى -
 الثاني : القول الجامع لبعض المحققين أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ -
 صحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البيع - ورهن في حق البعض حتى لم يملك
 المشتري بيعه من آخر ولا رهنه ، وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها
 صفة البعير والبقر والنمر جواز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها - قال في البحر :
 وينبغي أن لا يعدل في الإفتاء عن القول الجامع - وفي النهر : والعمل في ديارنا على ما رجحه الزيلعي
 “ (شامی : ۳۳۲/۴ ، باب الصرف ، ۲۷۶/۵ ، ط : سعيد ، البحر : ۸/۶ ، تبیین : ۱۸۳/۵) [الفتاویٰ الہندیہ :
 ۲۰۸/۳ - ۲۰۹ ، ط : دار الفکر ، شامی : ۲۲۶/۴ - ۲۲۷ ، ط : احياء التراث و بولاق ، الموسوعة الفقهية : ۲۶۱/۹ ،
 بيع الوفاء ، درر الحکام شرح مجلة الأحكام : ۱۱۱/۱ ، المادة : ۱۱۸ ، البيوع]

اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع وفا میں مشتری کو بیع - رہن - وقف وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں،
 اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ لہذا جن حضرات نے اسے عقد رہن
 قرار دیا ہے، ان کے نزدیک تو مشتری کا فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے، اور جن حضرات نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے ان کے
 نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں (فتاویٰ عثمانی: ۱۰۸/۳،
 کتاب البيوع، فصل فی أنواع البيوع المختلفة، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند)۔

(ب): مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

(ج): خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(د): خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو یہ بیع صحیح نہ ہوگی، اور اگر مزید قیمت لے تو یہ سود ہوگا، آگے کسی اور کو

بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

۲- اگر اس کو رہن قرار دیں تو.....

(الف): جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز و حرام ہوگا۔

(ب): اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مردوجہ کرایہ سے بہت ہی

کم ہو، تو (رہن قرار دیئے جانے کی صورت میں) یہ عقد اجارہ شرعاً درست نہیں، کیونکہ شئی واحد میں عقد رہن واجارہ دونوں جمع

نہیں ہو سکتے۔

(ج): اس عرصہ میں خریدار اس شئی سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

(د): خریدار جب اس کا مالک نہیں تو بیچنے کا حق اُسے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔
 ۳- زرِ ضمانت کی حیثیت رہن کی ہے، قرض و امانت کی نہیں، لہذا اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہے، البتہ اس صورت میں مالک دکان یا مکان کو اس کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی، خواہ کرایہ دار اس کی اجازت دے، کیونکہ رہن سے انتفاع کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔
 رہی یہ بات کہ کرایہ دار اور مالک مکان و دکان دونوں کی ضرورتیں پھر کس طرح پوری ہوں گی؟ تو اس کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ زرِ ضمانت کے طور پر دی جانے والی رقم کو پیشگی کرایہ کے طور پر دے دیا جائے اور وہ اس سے اپنے کرایہ کی متعینہ رقم بتدریج منہا کرتا جائے، اس طرح مالک مکان و دکان کو کاروبار کے لیے ایک بڑی رقم بنام پیشگی کرایہ حاصل ہوگی، اور کرایہ دار کی دکان یا مکان کی ضرورت بھی پوری ہوگی، اور کرایہ کی پیشگی رقم وصول ہونے کی وجہ سے مکان یا دکان کے مروجہ کرایہ میں کمی کرنا شرعاً جائز بھی ہے۔

والحجة على ما قلنا :

(۱) ما في ” البحر الرائق “ : وصورته : أن يقول البائع للمشتري بعث منك هذا العين بدین لك عليّ عليّ أني متى قضيت الدين فهو لي أو يقول البائع بعثك هذا بكذا على أني متى دفعت لك الثمن تدفع العين إليّ - (۶/۱۱) ، كتاب البيع ، باب خيار الشرط ، تبين الحقائق : ۲۳۷/۶ ، كتاب الإكراه ، رد المحتار : ۵۲۵/۷ ، مطلب في بيع الوفاء ، ما في ” الدر المختار مع الشامية “ : والقول السادس في بيع الوفاء : أنه صحيح لحاجة الناس فراراً من الربا ، وقالوا : ما ضاق على الناس أمر إلا اتسع حكمه - ” الدر المختار “ - (۷/۵۵۱) ، كتاب البيوع ، باب الصرف ، مطلب : قاضيان من أهل التصحيح والترجيح)

ما في ” تبين الحقائق “ : ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه منهم الإمام نجم الدين النسفي فقال : اتفق مشايخنا في هذا الزمان فجعلوه بيعاً جائزاً مفيداً بعض أحكامه وهو الانتفاع به دون البعض وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملمهم فيه ، والقواعد قد تترك بالتعامل وجوز الاستصناع لذلك ----- وقال صاحب النهاية : وعليه الفتوى - (۵/۱۸۲) ط : دار الكتاب الإسلامي)

ما في ” الموسوعة الفقهية “ : وذهب بعض المتأخرين من الحنفية والشافعية إلى أن بيع الوفاء جائز مفيد لبعض أحكامه وهو انتفاع المشتري بالمبيع دون بعضها وهو البيع من آخر ، وحجتهم في ذلك : أن البيع بهذا الشرط تعارفه الناس وتعاملوا به لحاجتهم إليه فراراً من الربوا ، فيكون صحيحاً لا يفسد البيع باشرطه فيه ، وإن كان مخالفاً للقواعد ، لأن القواعد تترك بالتعامل ، كما في الاستصناع - (۲۶۰/۹-۲۶۱) ، بيع الوفاء ، البحر الرائق : ۸/۶ ، دار الكتاب الإسلامي)

ما في ” الأشباه والنظائر لابن نجيم “ : ” الأمر إذا ضاق اتسع وإذا اتسع ضاق “ - (۱/۳۰۳) ، الأشباه والنظائر

للسیوطی: ١/١٦٥، قواعد الفقه: ص/٦٢، القاعدة: ٢٨، درر الحکام شرح مجلة الأحکام: ١/٣٦، المادة: ١٨، شرح القواعد الفقهية: ص/١٢٣، رد المحتار: ١/١٨٩)

(٢) (امداد الفتاویٰ: ٣/١٠٨-١٠٩، کتاب البیوع، بیع بالوفاء، مکتبہ دارالعلوم کراچی)

(٣) (ایضاح النوادر: ص/٤٦-٤٩، ط: فریدیکڈ پوپرائیویٹ لمٹیڈ)

(٤) ما فی ” رد المحتار “: البیع الذي تعارفه أهل زماننا احتیالا للربوا وسموه بالوفاء فهو رهن في الحقيقة لا یملکه ولا ینتفع به إلا بإذن مالکة وهو ضامن لما أكل من ثمره - الخ - (٣/٣٢٦)

(کتاب الفتاویٰ: ٥/٢٨٠، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، قاموس الفقه: ٢/٣٦٦، بیع الوفاء، فتاویٰ امارت شرعیہ: ١/٢٣٣، کتاب البیوع، مزید فقہی عباراتوں کے لئے دیکھئے:

ما فی ” تبیین الحقائق “ ٥/١٨٣، ط: دار الکتب الاسلامی،

ما فی ” الموسوعة الفقهية “ (٩/٢٦١، البحر الرائق: ٦/٨، ط: دار الکتب الاسلامی)

” موسوعة فتاویٰ المعاملات المالية “ (٤/٢٢٤، حکم بیع الوفاء، مرکز الدراسات الفقهية والاقتصادية،

ط: دار السلام بالقاهرة)

” الفقه الإسلامي وأدلته “ (١/١٣٦، دار الفکر سوریه بدمشق)

” تبیین الحقائق “ (٥/١٨٣، ط: دار الکتب الاسلامی)

” الأشباه والنظائر “ (ص/١٣٩ - ١٦١، ایضاح النوادر: ص/٤٦-٤٩، ط: فریدیکڈ پوپرائیویٹ لمٹیڈ)

” فتاویٰ قاضیخان علی هامش الہندیة “ المواعدة جاز البیع ویلزمه الوفاء بالوعد، لأن المواعید قد تكون

لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس -

(٢/١٦٥، فصل في الشروط المفسدة، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، ومکتبہ زکریا دیوبند، الفتاویٰ الہندیة:

٣/٣٠٩، ط: دار الفکر، البحر الرائق: ٦/٨، دار الکتب الاسلامی، شامی: ٤/٢٨١، کتاب البیوع، باب البیع

الفاسد، مطلب في البیع بشرط فاسد، الأشباه والنظائر: ٣/٢٣٤، الفن الثاني، الحظر والإباحة، ط: إدارة القرآن کراچی

، مرقاة المفاتیح: ٨/٦١٢، کتاب الآداب، باب الوعد، الفصل الثاني، مکتبہ رشیدیہ، الموسوعة الفقهية: ٩/٢٢٤،

بیع وشرط) (فتاویٰ محمودیہ: ١٦/٢٥٥، کراچی، احسن الفتاویٰ: ٦/٥٠٤، کتاب البیوع، بیع بالوفاء)

(٤) ما فی ” القرآن الکریم “: ﴿أحل الله البیع وحرم الربوا﴾ - [سورة البقرة: ٢٤٥] - ﴿يا أيها الذین

أمنوا اتقوا الله وذرّوا ما بقی من الربوا إن کنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله﴾ - (سورة البقرة

: ٢٤٨ - ٢٤٩)

ما فی ” الصحیح لمسلم “: عن جابر رضی الله عنه قال: ” لعن رسول الله ﷺ آکل الربوا وموكله وکاتبه

وشاهديه، وقال: هم سواء “-

(٢/٢٤٢، السنن لابن ماجة: ١/١٦٥، باب التغلیظ في الربوا، السنن لأبي داود: ٢/٢٤٣، کتاب البیوع، صحیح البخاری:

١/٢٨٠، کتاب البیوع)

ما فی ”فتح الملہم“ : قولہ : (وموكله) یعنی الذي يؤدي الربا إلى غيره ، فإثم عقد الربا والتعامل به سواء في كل من الآخذ والمعطي ، ثم أخذ الربا أشد من الإعطاء ، لما فيه من التمتع بالحرام - (۵۷۴/۷) ، باب لعن آكل الربا وموكله)

ما فی ”مرقاة المفاتيح“ : (آكل الربا) أي أخذه، وإن لم يأكل ، وإنما خص بالأكل ، لأنه أعظم أنواع الانتفاع - (۲۲/۶) ، كذا في عون المعبود : ص/۱۲۳۵ ، كتاب البيوع ، باب آكل الربا وموكله ، رقم الحديث : (۳۳۳۳) ”تبيين الحقائق“ : والربا محرم بالكتاب والسنة وإجماع الأمة ، أما الكتاب فقولہ تعالیٰ : ﴿وأحل الله البيع وحرم الربوا﴾ - وأما السنة فما روي عن ابن مسعود : ”أن النبي ﷺ لعن آكل الربا وموكله ، وكتبه ، وشاهده ، وقال : هم سواء“ - (۲۲۷/۴) ، كتاب البيوع ، باب الربا)

ما فی ”موسوعة فتح الملہم مع التكملة“ : عن علي مرفوعاً قال : قال رسول الله ﷺ : ”كل قرض جر منفعة فهو ربا“ - (۵۷۴/۱) ، كتاب المساقات والمزارعة ، اعلاء السنن : ۱۴ / ۵۶۷ ، كتاب الحوالة ، باب كل قرض جر منفعته فهو ربا ، كذا في فيض القدير : ۹ / ۲۲۸۷ ، رقم الحديث : ۶۳۳۶ ، وكذا في الجامع الصغير للسيوطي : ص/۳۹۴ ، عن علي ، رقم الحديث : ۶۳۳۶ ، السنن الكبرى للبيهقي : ۵ / ۵۷۱) ما فی ”رد المحتار“ : وفي الأشباه : كل قرض جر نفعاً حرام - اهـ - (۳۹۵/۷)

”فتاوى قاضيخان على هامش الهندية“ (۱۶۵/۲) ، فصل في الشروط المفسدة ، مكتبه رشيدية كوئته ، ومكتبه زكريا ديوبند ، الفتاوى الهندية : ۳ / ۳۰۹ ، ط : دار الفكر ، البحر الرائق : ۶ / ۸ ، دار الكتاب الإسلامي ، شامي : ۷ / ۲۸۱ ، كتاب البيوع ، باب البيع الفاسد ، مطلب في البيع بشرط فاسد ، الأشباه والنظائر : ۳ / ۲۳۷ ، الفن الثاني ، الحظر والإباحة ، ط : إدارة القرآن كراچی ، مرقاة المفاتيح : ۸ / ۶۱۲ ، كتاب الآداب ، باب الوعد ، الفصل الثاني ، مكتبه رشيدية ، الموسوعة الفقهية : ۹ / ۲۲۷ ، بيع وشرط (فتاوى محمودية : ۱۶ / ۲۵۵ ، كراچی ، احسن الفتاوى : ۶ / ۵۰۷ ، كتاب البيوع ، بیع بالوفاء)

”رد المحتار“ (۸۳/۱۰) ، ط : دار الكتب العلمية بيروت ، الفلك المشحون في الانتفاع بالمرهون : ص/۱۳ ، ملحقه بمجموعة رسائل اللكنوي : ۳ / ۱۳ ، كتاب الفقه على المذاهب الأربعة : ۲ / ۲۸۲ ، مبحث الانتفاع بالمرهون)

”النتف في الفتاوى“ (ص/۳۷۰) ، كتاب الرهن ، ما لا يجوز في الرهن)

خلاصہ:

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے، اور ایسی بیع کے حکم میں ہے، جو اپنے بعض احکام میں مفید اور بعض میں غیر مفید ہے۔

(الف): بیع و فاء کی صورت میں یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیجا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیجا جائے، یہ

شرط، شرط لازم ہے، اور کسی دوسرے کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

(ب): مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

(ج): خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(د): خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو یہ بیچ صحیح نہ ہوگی، اور اگر مزید قیمت لے تو یہ سود ہوگا۔

۲- اگر اس کو رہن قرار دیں تو.....،

(الف): جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز و حرام ہوگا۔

(ب): رہن قرار دیئے جانے کی صورت میں یہ عقد اجارہ شرعاً درست نہیں، کیونکہ شیء واحد میں عقد رہن و اجارہ دونوں

جمع نہیں ہو سکتے۔

(ج): اس عرصہ میں خریدار اس شیء سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

(د): خریدار جب اس کا مالک نہیں تو اسے بیچنے کا حق بھی حاصل نہیں ہوگا۔

۳- زر ضمانت کی حیثیت رہن کی ہے، لہذا اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہے۔



ضرورت شدیدہ میں بیع و فاء سے استفادہ کا حکم

مولانا محمد عفاان منصور پوری ☆

ایک ضرورت مند شخص کا اپنے کسی سامان کو دوسرے کے ہاتھ یہ کہہ کر فروخت کرنا کہ جب میں ثمن لوٹا دوں تو تم مجھے بیع واپس کر دینا اصطلاح فقہاء میں بیع و فاء، بیع جائز، بیع معاملہ، بیع امانت، بیع اطاعت یا رہن معاہدہ کہلاتا ہے (کمانی رد المحتار ۴۲۳/۷)۔

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء بیع و فاء کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”وہو عقد توثیقی فی صورة بیع علی أساس احتفاظ الطرفين بحق التراد فی العوضین“ (المدخل الفقہی ۶۱۱/۱) (طرفین) (ثمن و بیع) کے محفوظ ہونے کی بنیاد پر عوضین کو واپس لینے کے سلسلہ میں بیع کی شکل میں ایک قابل الطمینان معاملہ)۔

سوال نامہ میں مذکور صورت حال اور موجودہ حالات کے تناظر میں جبکہ ضرورت مند شخص کو غیر سودی قرض نہیں ملتا اور سودی قرض سے وہ گریز کرنا چاہتا ہے ”بیع و فاء“ جیسے معاملات کا بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت سہارا لینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:

”رہن قصد اوبیع ظاہر اکوبیع الوفاء کہتے ہیں، سواصل قواعد مذہب کی رو سے یہ بھی رہن ہے اور انتفاع اس سے حرام ہے، لیکن بعض متاخرین نے اجازت دی ہے، پس بلا اضطراب شدید تو اس کا ارتکاب نہ کرے اور اضطراب شدید میں بائع کو اختیار ہے کہ فتویٰ متاخرین پر عمل کرے، اگرچہ مشتری کو کوئی اضطراب نہیں“ (امداد الفتاویٰ ۱۰۷۳)۔

علامہ شامی نے بھی اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ایک مقام پر گنجائش کی راہ ذکر کی ہے:

”القول السادس فی بیع الوفاء: أنه صحیح لحاجة الناس فراراً من الربا (لأن صاحب المال لا یقرض إلا بنفع والمستقرض محتاج، فأجازوا ذلك لینتفع المقرض بالمبیع وتعارفه الناس، لكنه مخالف للنهی عن بیع وشرط، فلذا رجحوا کونه رهنا) وقالوا: ما ضاق علی الناس أمر إلا اتسع

حکمہ“ (ردالمحتار مع الدرر ۷/۴۲۹)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عمومی حالات میں اس معاملہ کو اختیار کرنے سے اجتناب کیا جائے، ہاں خصوصی حالات میں ضرورت مند شخص کے لئے، جبکہ وہ غیر سودی قرض ملنے کے سلسلہ میں ناامید ہو جائے بقدر ضرورت بیع و فاء کا معاملہ کرنے کی اجازت ہے۔

جواز کی بہتر شکل:

اس معاملہ میں جواز کی ایک بہتر اور صاف ستھری شکل یہ نکل سکتی ہے کہ مجلس عقد میں شرط یا وعدہ کے طور پر واپسی کا کوئی ذکر نہ کیا جائے، بلکہ روزمرہ کے عام معاملات کی طرح اس کو بھی انجام دیا جائے پھر کسی دوسری مجلس میں بائع مشتری سے اس رعایت کی درخواست کر لے اور مشتری منظور کر لے تو اس معاملہ کے شرعاً صحیح طور پر منعقد ہونے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا اور قضاء بائع کو ادائیگی ثمن کے وقت واپسی کے مطالبہ کا کوئی حق نہ ہوگا اور مشتری بیع میں مالکانہ تصرف کا حق دار ہوگا، البتہ دیانۃً مشتری پر وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوگا، ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”وإن ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع ویلزم الوفاء بالوعدہ، کذا فی فتاویٰ قاضی خان“ (الہندیہ ۲۰۹/۳)۔

”وفی الدر المختار: ولو بعدہ علی وجه المیعاد جاز ولزم الوفاء، لأن المواعید قد تكون لازمة لحاجة الناس وهو الصحيح، کما فی الکافی والنخانیہ“ (۴۲۵/۷)۔

حکماً اس معاملہ کو کیا کہا جائے؟

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ معاملہ حکماً بیع ہے یا نہیں تو اکثر فقہاء کرام کی تصریحات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ الفاظ و تعبیرات کے اعتبار سے یہ اگرچہ بیع معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت و روح کے اعتبار سے رہن ہے اور یہی پہلو اس باب میں راجح ہے، نہ اس کو من کل الوجوہ بیع کہا جاسکتا ہے اور نہ من کل الوجوہ رہن اس لئے کہ اگر بیع قرار دیں تو مقتضاً عقد کے خلاف شرط موجود ہونے کی وجہ سے فساد لازم آئے گا اور اگر رہن قرار دیں تو مرہن کے لئے شیئی مرہون سے انتفاع جائز نہ ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار ۷/۴۲۵)۔

۲۔ مشتری کا بیع سے انتفاع جائز ہے یا نہیں؟

الف، ب، ج۔ رہن قرار دیئے جانے کے بعد اب سوال پیدا ہوگا کہ خریدنے والے کے لئے اس شیئی سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ یہ معاملہ من کل الوجوہ رہن نہیں اس میں بیع کی بھی آمیزش ہے اور بیع سے مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق ہوتا ہی ہے تو یہاں بھی مشتری کو فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی اگر بائع (مالک) کی

جانب سے رضامندی متحقق ہو مگر فی الحوالہ السابقتہ، ”ولا ینتفع به، إلا بإذن مالکھ“ -

اسی طرح اگر خریدار اس جگہ کو برائے کاشت دینا چاہے یا اجارہ داری کے طور پر فائدہ حاصل کرنا چاہے تو شرعاً اس کی اجازت ہے، نیز اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ کرایہ مروجہ کرایہ سے بہت کم ہے تو اگر مالک اس پر رضامند ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہئے۔
شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء بیع و فاء پر کلام کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”فهو عقد مزيج من بيع ورهن، لكن أحكام الرهن فيه هي الغالبة، ففيه من معنى البيع أحكام: أهمها أن المشتري بالوفاء يملك بمقتضى العقد منافع الشيء المبيع وفاء، فله أن ینتفع به بنفسه وأن ینستغله بإيجاره للبائع ذاته أو لغيره“ (الدرل الشفی العام ۲۱۱/۱)۔
مشتري کو بیع وغیرہ کا حق نہیں ہے:

د- خریدار کے لئے اس جگہ کو بیچنے کی اجازت نہیں ہوگی اس لئے کہ مرتہن پر شئی مرہون کی حفاظت و صیانت لازم ہوتی ہے۔

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء تحریر فرماتے ہیں:

”وفیه من معنی الرهن أن المشتري لا یملک حق استهلاك المبيع ولا نقل ملکیتہ إلى أحد بعوض ولا بغير عوض، ولا أن یرهنه ولا أن ینشئ علیه حقاً عينياً لأحد، بل یجب علیه حفظه وصیانتہ وأن المشتري ملزم برد البیع بالوفاء إلى البائع متى ردّ هذا إليه الثمن، وهذا معنی الوفاء فی تسمیته“ (الدرل الشفی العام ۲۱۱/۱)۔

علامہ شامی اور صاحب ”البحر الرائق“ وغیرہ نے قول جامع کے طور پر اس باب میں جو فیصلہ کن بات ذکر فرمائی ہے اس سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے، چنانچہ ”رد المحتار“ میں ہے:

”قوله (وقیل: بیع یفید الانتفاع به) هذا محتمل لأحد القولین: الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی الإکراه: وعلیه الفتوی، الثانی القول الجامع: أنه فاسد فی حق بعض الأحكام حتی ملک کل منهما الفسخ، صحیح فی حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البیع، ورهن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعه من آخر، ولا رهنه وسقط الدين بهلاکة فهو مرکب من العقود الثلاثة كالزرافة فیها صفة البعیر والبقر والنمر جوزّ لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلین لصاحبها، قال فی البحر: وینبغی أن لا یعدل عن القول الجامع

وفی النہر: والعمل فی دیارنا علی ما رجحہ الذیلعی“ (ردالمحتار ۷/۲۲۵)۔

اس ساری بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیع و فاء میں مشتری کو بیع، رہن، وقف، وغیرہ میں سے کسی کا بھی اختیار نہیں، اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ مشتری کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے یا نہیں تو جن لوگوں نے اسے عقد بیع قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا انتفاع جائز ہے، اور جن حضرات نے اسے عقد رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک مشتری کا فائدہ اٹھانا جائز ہے، ہاں آگے کسی اور کو بیچنا یا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں، لیکن ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ مشتری کے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں ضرورتاً اس معاملہ کو بیع قرار دیا جائے اور انتفاع جائز ہو، اس لئے کہ اس میں بیع کی مشابہت بھی موجود ہے۔

۳- عام طور پر بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر جو معاملہ طے کیا جاتا ہے وہ اجرت معجلہ کا ہوتا ہے، صاحب مکان کو یکمشت خطیر رقم کی حاجت ہوتی ہے، اس لئے وہ پیشگی کرایہ وصول کر لیتا ہے اور ماہانہ معمولی رقم فریقین کی رضامندی سے طے ہو جاتی ہے اس اعتبار سے زر ضمانت کی حیثیت نہ قرض کی ہوئی، نہ امانت کی، نہ ہی رہن کی، بلکہ وہ صاحب دکان کی ملک ہوگی اور اس معاملہ کے شرعاً جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے، ”یعتبر ویراعی کل ما اشترط العاقدان فی تعجیل الأجرة وتأجیلها (وفی موضع آخر) ینلزم الأجرة بشرط التعجیل، یعنی لو شرط أن تكون الأجرة معجلة لزم المستاجر تسلیمها“ (شرح اللجلہ ۱/۲۶۱، ۲۶۵، بحوالہ فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۵۸۳)۔

بیع بالوفاء میں بیع سے استفادہ کا حکم

مولانا عبداللطیف پالنپوری ☆

بیع بالوفاء کا اطلاق چند صورتوں پر ہوتا ہے، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

۱- ایک شخص اپنی زمین اطمینان قرض کے واسطے دائن کے قبضہ میں دیتا ہے اور بیع کا لفظ نہیں بولتا ہے اور فریقین میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ دائن اس زمین پر قابض اور متصرف رہے گا، اور جو کچھ نفع نقصان ہو وہ دائن کے ذمہ ہوگا، مدیون اس کا ذمہ دار نہ ہوگا، یہ صورت صریح رہن ہے، اور رہن صریح میں مرتہن کا انتفاع مشروط ہو یا معروف، بلا اختلاف حرام ہے۔

”ثم نقل عن التهذيب أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن وإن أذن له الرهن، قال المصنف: وعليه يحمل ما عن محمد بن أسلم من أنه لا يحل للمرتهن ذلك ولو بالإذن؛ لأنه ربا، قلت: وتعليله يفيد أنها تحريمية، فتأمله“ (در مختار علی الشامی ۳۳۶/۵، طبع بیروت، امداد الفتاویٰ ۱۰۷/۳)۔

۲- بائع نے اپنی زمین واپسی کی شرط کے بغیر مشتری کو بیع دی اور مشتری نے خرید لی، پھر دونوں نے بطور وعدہ کے شرط کا ذکر کیا کہ جب بائع ٹن واپس کرے گا تو مشتری بیع لوٹا دے گا، تو یہ بیع صحیح ہے اور اس پر بیع صحیح کے احکام جاری ہوں گے، یعنی مشتری اس بیع کا مالک ہوگا، اور مشتری کے لئے اس بیع سے ہر قسم کا انتفاع جائز ہوگا، البتہ وعدہ کا ایفا چونکہ لازم ہے، اس لئے بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچنا صحیح نہیں ہے، اور بائع سے سابقہ قیمت سے زیادہ کا مطالبہ صحیح نہیں ہے، اگر بائع کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ بیچے گا یا سابقہ ٹن سے زیادہ کا مطالبہ کرے گا تو وعدہ خلافی کا مرتکب ہوگا۔

”قلت وفي جامع الفصولين أيضاً: لو ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد إذ المواعيد قد تكون لازمة، فيجعل لازماً لحاجة الناس.... وبه أفتى في الخيرية. وقال: فقد صرح علماؤنا بأنهما لو ذكرا البيع بلا شرط، ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع، ولزم الوفاء بالوعد ۵۱، قلت: فهذا مبني على خلاف ما مر تصحيحه والظاهر أنهما قولان مصححان“ (رد المحتار علی الدرر ۱۲۰/۳، ۱۲۱/۳، ۱۱۲/۳، بیروت، احسن الفتاویٰ ۵۰۷/۶)۔

۳- متعاقبین نے عقد بیع سے پہلے واپسی کی شرط لگائی ہو پھر عقد بیع کیا ہو تو اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ شرط معتبر ہوگی اور بیع صحیح ہوگی، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات سے معلوم ہوتا ہے، ”وقد سئل الخیر الرملى عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقده وعقدا البیع خالیاً عن الشرط فأجاب بأنه صرح فی الخلاصة والفیض والتاتار خانیة وغیرها، بأنه یکون علی ما تواضعا“ (رد المحتار علی الدرر ۱۲۱/۳ بیروت)۔

”تنبیہ: فی جامع أيضاً لو شرطاً فاسداً قبل العقد ثم عقدا لم یبطل العقد ۵“ (رد المحتار

۱۲۱/۳ بیروت)۔

پہلی عبارت سے معلوم ہوا کہ شرط معتبر ہے اور دوسری عبارت سے معلوم ہوا کہ عقد صحیح ہوگا، اگرچہ اس صورت میں اصل مذہب فساد عقد کا ہے، کما فی الدر المختار: ”ثم إن ذکرنا الفسخ فیہ أو قبله أو زعماه غیر لازم کان بیعاً فاسداً“ (۲۳۷/۳)۔

لیکن حاجت الناس کی وجہ سے پہلے قول کو اختیار کرنا نسب معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی نے ”امداد الفتاویٰ“ (۱۰۸/۳) پر اس قول کو اختیار فرمایا ہے، نیز اس صورت میں ایک قول یہ بھی ہے کہ عقد سے قبل ذکر کی ہوئی شرط کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، اور عقد فاسد نہ ہوگا، لیکن اس صورت میں بیع بشرط الوفاء نہ ہوگی، کما فی الدر المختار، ”ولو تواضعا علی الوفاء قبل العقد ثم عقدا خالیاً عن شرط الوفاء فالعقد جائز ولا عبرة للمواضعة“ (رد مختار ۲۳۶/۳)۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ متعاقبین صلب عقد میں واپسی کی شرط کے ساتھ بیع کریں، مثلاً بائع یہ کہے کہ میں نے اپنی یہ زمین ایک ہزار میں بیچی اس شرط پر کہ جب میں شمن تم کو لوٹا دوں تو تم یہ زمین مجھ کو واپس لوٹا دو گے۔

نوٹ: واپس لوٹانے کا لفظ کہا ہو یا واپس بیچنے کا لفظ کہا ہو دونوں کا حکم ایک ہے، کما فی الشامیہ، ”فعلیم أنه لا فرق بین قوله علی أن ترد ۵ علی أو علی أن تبعه منی“ (شامی ۲۳۶/۳ بیروت)۔

اور یہ چوتھی صورت ہی حقیقت میں بیع بالوفاء کا مصداق ہے، اس صورت کے حکم کے سلسلہ میں فقہاء میں بہت زیادہ اختلاف ہے، چنانچہ بزاز یہ میں آٹھ اقوال نقل کئے ہیں، علامہ شامی نے بھی اس پر بہت تفصیلی بحث فرمائی ہے۔

ہمارے ماضی قریب کے اکابر مفتیین کے فتاویٰ کو دیکھنے سے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاملہ بیع فاسد محکم رہن ہے، اور رہن کے تمام احکام اس پر جاری ہوں گے، یعنی خریدار اس بیع کا جو درحقیقت رہن ہے مالک نہیں ہوگا، اور خریدار کے لئے اس زمین سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کاری یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اور خریدار کے لئے اس بیع کو بیچنا جائز نہیں ہے، اور بائع جب دین ادا کر دے تو اس زمین کو واپس لے سکتا ہے، (قیل: ہو رہن) قدمنا آنفاً عن جواهر الفتاویٰ أنه الصحيح قال فی الخیریة: والذی علیہ الأكثر أنه رہن لا یفترق عن

الرهن فی حکم من الأحکام... قلت: وبه صدر فی جامع الفصولین، فقال رامزا لفتاوی النسفی: البیع الذی تعارفه أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بیع الوفاء هو رهن فی الحقیقة لا یملکه ولا ینتفع به إلا بإذن مالکه وهو ضامن لما أکل من ثمره وأتلف من شجره ویسقط الدین بهلاکه لوبقی ولا یضمن الزیادة وللبائع استردادہ إذا قضی دینہ لا فرق عندنا بینہ وبين الرهن فی حکم من الأحکام ۵، (ردالمحتار علی الدر المختار ۲۳۶/۳ بیروت)۔

۳- زرمانت کی ابتدا تو ضمانت اور رہن کے نام پر ہوئی تھی، بسا اوقات کرایہ دار مکان یا دکان کا کرایہ باقی چھوڑ کر غائب ہو جاتا تھا اور مالک مکان کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا، اس مصیبت سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کرایہ دار سے متعین رقم ایڈوانس لی جانے لگی، تاکہ اگر کرایہ دار کرایہ کی رقم باقی چھوڑ کر چلا جائے تو اس ایڈوانس یا ڈپازٹ کے نام سے لی گئی رقم سے وہ باقی کرایہ وصول کیا جاسکے، اس صورت میں اس رقم کی حیثیت رہن کی ہو جائے گی اور شرعاً اس طرح رہن لینا درست ہے، ”ولو استاجر داراً أو شیئاً وأعطی بالاجر رهنًا جاز“ (ہندیہ ۴۳۵/۵)۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کرایہ دار مکان کو نقصان پہنچا دیتا ہے، یا بجلی وغیرہ کے واجبات چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو بعد میں مالک مکان کو ادا کرنے پڑتے ہیں اس مقصد کے لئے بھی کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر ایک رقم ایڈوانس وصول کی جاتی ہے گویا یہ ایک نوع کا زرمانت ہے (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱۴۰/۶)۔

ڈپازٹ لینے دینے کی اصل بنیاد مندرجہ بالا دو میں سے ایک وجہ ہے، بعد میں ڈپازٹ کے نام پر وصول کی جانے والی رقم کو مالک مکان و دوکان نے بلا اجازت استعمال کرنا شروع کر دیا، جب استعمال کا رواج عام ہونے لگا تو دینی ذہن رکھنے والے مالکان کو یہ بات کھٹکی کہ اجازت کے بغیر اس رقم کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ ایسے لوگوں نے کرایہ دار سے اجازت لینا شروع کیا، پھر کرایہ دار نے یہ سوچنا شروع کیا کہ ہماری یہ رقم جو بطور امانت مالکان مکان کے پاس محفوظ رہنی چاہئے مالک مکان ہماری اجازت سے اس رقم سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو ہم کیوں نہ اس کو دیکھنے والی اجازت سے فائدہ اٹھائیں؟ چنانچہ انہوں نے اس شرط پر اجازت دینا شروع کیا کہ کرایہ دار میں کچھ کمی کر دی جائے، آج کل جو معاملات ہو رہے ہیں اس کی بنیاد یہی ذہنیت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ معاملہ درست کہلایا جاسکتا ہے، کچھ لوگ ڈپازٹ کی رقم زیادہ دے کر مالک مکان سے پورا ہی کرایہ ساقط کروا لیتے ہیں، ظاہر ہے ان کی طرف سے جو رقم دی گئی ہے، وہ قرض کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بدلے میں یہ آدمی قرض لینے والے کے مکان سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اور قرض پر دی گئی رقم کے بدلے میں فائدہ اٹھانا سو و حرام ہے۔ ”درمختار“ میں ”الاشباہ والنظائر“ کے حوالہ سے لکھا ہے: ”کل قرض جو نفعاً فہوم حرام، فکروہ

للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن“ (درمختار علی الشامی ۱۷۴/۳، بیروت)۔

علامہ شامی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر نفع اس قرض کے معاملہ میں مشروط ہو تو حرام ہے، اور عبداللہ بن محمد بن اسلم سمرقندی جو کبار علماء سمرقند میں سے تھے ان کا قول نقل کیا ہے کہ مال مرہونہ سے انتفاع کسی صورت میں جائز نہیں ہے، اگرچہ راہن نے اجازت دی ہو، اس لئے یہ کہ سود خوری کی اجازت ہے (شامی ۱۷۴/۳ بیروت)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈپازٹ کی رقم کی حیثیت قرض کی ہے امانت کی نہیں ہے، کیونکہ اسکے استعمال کی اجازت صراحتاً یا دلالتاً ہوتی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا، جبکہ امانت کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوتا ہے۔

اسی طرح ڈپازٹ کی رقم کو رہن بھی نہیں کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا ہے، ہدایہ میں ہے: ”الرهن بالدرک باطل والكفالة بالدرک جائزة، والفرق أن الرهن للاستيفاء ولا استيفاء قبل الوجوب وإضافة التملك إلى زمان في المستقبل لا تجوز“ (ہدایہ آخرین ۵۱۱/۳)۔

ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا محض محتمل ہوتا ہے، لہذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے ہیں، یہ قرض ہی ہے (محمود الفتاویٰ ۷۸/۳، فتاویٰ عثمانی ۲۲۰/۳)۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ڈپازٹ کی رقم امانت یا رہن نہیں ہے، بلکہ قرض ہی ہے، اور قرض دیکر فائدہ اٹھانا حرام ہے، لہذا کرایہ دار کے لئے ڈپازٹ کی رقم دے کر کرایہ میں کمی کرنا یا بالکل کرایہ ساقط کر دینا جائز نہیں ہے، اور قرض پر فائدہ اٹھانے کی وجہ سے حرام ہے، سود کے حکم میں ہے، اور اس صورت میں کرایہ دار پر اجرت مثل واجب ہوگی، ”عالمگیری“ میں ہے: ”لو استقرض رجل دراهم من رجل وقال: اسكن حانوتی هذا... فالأجرة واجبة على المقرض يريده به أجر المثل الخ“ (ہندیہ ۵۲۱/۳)۔

بیع و فاء فقہاء کی نظر میں

مولانا محمد الاعمش

۱: الف- بیع وفا کی جو شکل بیان کی گئی ہے وہ شرعاً منعقد اور درست نہیں ہے، کیونکہ بیع کا شرعی معنی ہے کہ ”مبادلة المال بالمال تمليکاً و تملکاً“ یا ”مقابلة مال بمال قابليين للتصرف“۔

صورت مسنولہ میں مبادلة المال بالمال تو ہے، لیکن مشتری کو تملک و تصرف کا حق حاصل نہیں ہے، اس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، اس لئے یہ بیع شرعاً درست نہیں ہے۔

ب- اگر اس کو بیع مان لیا جائے، تو بائع کی یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے کو نہ بیچا جائے، بائع ہی کو بیچا جائے، اور اسی قیمت پر بائع ہی کو دیا جائے، تو یہ شرطیں مقتضاء عقد کے خلاف ہیں، اور ہر ایسی شرط بالاتفاق باطل اور ناجائز ہے۔

ج- جب یہ بیع شرعاً درست نہیں ہے تو اس سے انتفاع بھی درست نہیں ہوگا، کیونکہ مشتری کو حق ملکیت و تصرف حاصل نہیں ہے، اور غیر کی ملکیت سے فائدہ اٹھانا بغیر اس کی اجازت جائز نہیں ہے۔

د- اگر بیع مذکور میں باطل شرط ختم کر دی جائے، اور مشتری کو پورا حق ملکیت و تصرف دے دیا جائے تو اسے وہ جس قیمت میں فروخت کرنا چاہے اس کو اختیار حاصل ہے۔

۲- بیع مذکور کو اگر رہن قرار دیا جائے تو یہ جائز صورت ہوگی۔

الف، ب، ج، د- ان شقوں کے تحت جو سوالات کئے گئے ہیں وہ سب بیع سے تعلق رکھتے ہیں، رہن کے دائرے میں نہیں آتے ہیں، کیونکہ شیئی مرہون راہن کی ملکیت اور مرہن کے قبضہ میں امانت ہوتی ہے، اس لئے اس میں کوئی تصرف یا انتفاع کی کارروائی کرنا درست نہیں ہے، بلکہ ”کل قرض جو منفعة فهو ربا“ الحدیث، کا مصداق ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔

شارع علیہ الصلاة والسلام نے مرہون شیئی سے صرف دو صورتوں میں انتفاع کی اجازت دی ہے، ایک یہ کہ مرہون شیئی مرکوب ہو، دوسری یہ کہ مجلوب ہو، ان دونوں سے مرہن اتنی ہی مقدار میں سواری کرنے یا دودھ پینے کا فائدہ اٹھا سکتا ہے جس قدر ان کی خوراک و ضروریات پر اس نے خرچ کیا ہے، کما قال النبی ﷺ: ”الظہر یرکب بنفقته إذا

کان مرهوناً، والضرع يشرب بنفقته إذا كان مرهوناً“ (رواہ البخاری)۔

رہی یہ بات کہ مرہون غیر مرکوب یا غیر محبوب ہو، اگر وہ کسی نفع کا محتاج نہ ہو، جیسے مکان اور سامان جیسی چیز ہو تو مرہن کو کسی حال میں اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، یہ متفق علیہ مسئلہ ہے، البتہ اس صورت میں رہن سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا جب فائدہ بالعوض ہو، جیسے مرہن، راہن سے مکان کرایہ داری پر لے، اور اس کا کرایہ، کرایہ مثل سے کم یا زیادہ نہ ہو، تو یہ انتفاع جائز ہوگا، کیونکہ یہ انتفاع بالقرض نہیں ہے؛ بلکہ بالاجارہ ہے، ملاحظہ ہو: ابن قدامہ کے کلام کا اقتباس۔

”فإن أذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بغير عوض و كان دين الرهن من قرض لم يجز، یعنی إذا كانت الدار رهنًا في قرض، لأنه يحصل قرضاً يجز منفعة، وذلك حرام۔

فأما إن كان الانتفاع بعوض مثل إن استأجر المرتهن الدار من الراهن بأجرة مثلها من غير محاباة في القرض وغيره، لكونها انتفع بالقرض، بل بالاجارة، وإن حاباه في ذلك، فحكمه حكم الانتفاع بغير عوض، لا يجوز في القرض ويجوز في غيره“ (المغنی ۴/۳۶۷)۔

۳- دکان یا مکان کو کرایہ پر دینے کے لئے ضمانت کے نام سے مالک جو رقم لیتا ہے، اس کی حیثیت قرض کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ مالک مکان عرف کے مطابق کرایہ دار سے کرایہ طے کرے، اور رقم ضمانت سے مقررہ کرایہ وضع کرتا رہے، اور کرایہ دار کو کسی طرح کا مادی یا معنوی فائدہ نہ حاصل ہو، خواہ کرایہ میں کمی کے طور پر یا اور کسی ذریعہ سے ہو، ورنہ ”کل قرض جو منفعة فهو ربا“ کی رو سے حرمت لازم آئے گی۔

رقم ضمانت کو امانت یا رهن نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ امانت اور رهن میں تصرف جائز نہیں ہے، اس سے عقد اجارہ باطل ہو جائے گا۔

بیع و فاء کا حکم

مفتی محمد مقصود فرقانی ☆

بیع و فاء کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ، یعنی عقد بیع شی کی واپسی کی شرط سے خالی ہو اور پھر عقد کے بعد وعدہ کے طور پر واپسی کی شرط کا ذکر کیا جائے تو یہ جائز ہے، قاضی خاں (۳۸۲/۳ مطبوعہ نول کشور) میں ہے:

”واختلفوا فی بیع الوفاء أو البیع الجائز إلی أن قال: وإن ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع ویلزمه الوفاء بالوعد؛ لأن القواعد قد تكون لازمة لحاجة الناس“۔

اور شامی (۳۸۱/۴) پر ہے:

”لو تواضعا علی الوفاء قبل العقد ثم عقداً خالياً عن شرط الوفاء، فالعقد جائز ولا عبرة للمواضعة“۔

اور ص ۱۸۷ پر ہے:

”وقد سئل الخیر الرملى عن رجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقده وعقد البیع خالياً عن الشرط، فأجاب بأنه صرح فی الخلاصة والفیض والتاتارخانية وغيرها بأنه یكون علی ما تواضعا“۔

اور صفحہ ۳۸۶ پر ہے:

”القول السادس فی بیع الوفاء: أنه صحیح لحاجة الناس فراراً من الرباء وقالوا: ما ضاق علی الناس أمر إلا اتسع حکمه“۔

اور صفحہ ۳۴۱ پر ہے:

”قوله صورته) هو أن يقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بمالك علی من الدين علی أنى متى قضيته فهو لى اه وفى حاشية الفصولین عن جواهر الفتاوى: هو أن يقول: بعث منك

علی أن تبعه منى متى جئت بالثمن، فهذا البيع باطل وهو رهن وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح اه
 فعلم أنه لا فرق بين قوله على أن ترده على أو على أن تبعه منى، قال السيد الامام قلت للامام الحسن
 الماتريدى: قد فشا هذا البيع بين الناس وفيه مفسدة عظيمة وفتواك أنه رهن وأنا أيضاً على ذلك
 فالصواب أن نجمع الأئمة ونتفق على هذا ونظيره بين الناس فقال: المعتبر اليوم فتوانا وقد ظهر
 ذلك بين الناس، فمن خالفنا فليبرز نفسه وليقم دليله، اه-

”شامی“ کے (صفحہ ۳۴۳) پر ہے:

”سئل القاضى الامام الحسن الماتريدى عن من باع داره من آخر بثمان معلوم بيع الوفاء
 وتقابضا استاجرها من المشتري مع شرائط صحة الإجارة وقبضها ومضت المدة هل يلزمه الأجر؟
 فقال: لا، لأنه عندنا رهن، والراهن إذا استاجر الرهن من المرتهن لا يجب الأجر، وفي البزاية: فإن
 أجر المبيع وفاء من البائع فمن جملة فاسدا قال: لا تصح الإجارة ولا يجب شئ ومن جعله رهنا
 كذلك-

مذکورہ بالا عبارات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ واپسی کی شرط عقد کے اندر نہیں ہونا چاہئے، بلکہ نفس عقد واپسی کی
 شرط سے خالی ہو اور عقد سے پہلے یا عقد کے بعد بیع کی واپسی پر بائع و مشتری کے درمیان رضامندی ہو تو یہ بیع درست ہے اور
 فقہاء نے اس کے مختلف نام بیان کئے ہیں، شافعیہ نے اسے رهن معاد کہا ہے، اور مصر میں ”بیع الامانہ“ کہا گیا ہے اور ملک
 شام کے اندر ”بیع الاطاعہ“ کا نام دیا گیا، ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ رهن ہے، اور بعض فقہاء اسے بیع الجائز بھی کہتے ہیں اور
 بعض اس کا نام ”بیع المعاملۃ“ رکھتے ہیں غرض یہ کہ ہر جگہ کے عرف و عادت کے اعتبار سے لوگوں نے بیع و فاء کا نام الگ الگ
 بیان کیا، مفہوم سب اصطلاحات کا ایک ہی ہے، صرف نام علاحدہ علاحدہ ہے اوپر جتنی عبارات تھیں وہ بیع و فاء کے جواز پر
 تھیں بشرطیکہ نفس عقد بائع و مشتری کے درمیان بیع کے واپسی کی شرط سے خالی ہو اب اس کے بعد جو عبارات پیش کی
 جائیں گی وہ بیع کے عدم جواز اور اس کے فساد کی ہوں گی، کیونکہ نفس عقد کے اندر ایسی شرط لگانے سے جو مقتضائے عقد کے
 خلاف ہو فقہاء نے ایسی بیع کو بیع فاسد قرار دیا ہے، چنانچہ عالمگیری (۷۶۳) پر ہے:

”وانما دخل الفساد بشرط فيه منفعة لأحد المتعاقدين-

اور جوہرہ نیرہ (۲۴۰/۱) پر ہے:

”وأما الوجه الذى كلاهما فاسدان فهو أن يكون الشرط مما لا يقتضيه العقد وفيه منفعة
 لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الخصومة وليس للناس فيه تعامل نحو أن يشتري ثوباً

بشرط الخیاطة الخ، فالبيع فاسد: لأن هذا الشرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة للمشتري وكذا إذا كان في الشرط منفعة للمعقود عليه وهو من أهل الخصومة نحو أن يبيع عبداً بشرط العتق فالبيع فاسد“۔

”درمختار“ میں ہے:

”وقيل: بيع يفيد الانتفاع به، وفي إقالة شرح الجمع عن النهاية: وعليه الفتوى، وقيل: أن بلفظ البيع لم يكن رهناً ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً ولو بعده على وجه الميعاد (جاز ولزم الوفاء به الخ)۔

اور اس کے آگے ہے:

”ولا يلد كره ولم يرد به الشرع ولا العرف وكان لأحد المتعاقدين فيه منفعة“۔

ہدایہ (۴۵/۳) پر ہے:

”لو باع عبداً على أن يستخدمه البائع شهراً أو داراً على أن يسكنه أو على أن يقرضه المشتري درهماً أو على أن يهدى له هدية؛ لأنه شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين، ولأنه عليه السلام نهى بيع سلف“۔

”ہدایہ“ کے حاشیہ (نمبر ۴) پر ہے:

”عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال: قال رسول

الله ﷺ: لا تحل سلف وبيع“۔

ان تمام عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نفس عقد کے اندر شرط پائی جائے تو مقتضاً عقد کے خلاف ہو تو ایسی بیع فاسد ہے اور مقتضاً عقد کے خلاف پائی جانے والی بہت سی شرطوں کی مثالیں مذکورہ بالا عبارات میں گزر چکیں اور اس مسئلہ میں حنفیہ شوافع مالکیہ اور حنابلہ کی ایک رائے ہے کہ عقد میں مقتضاً عقد کے خلاف شرط کا مطلب یہ ہے کہ عاقدین میں سے کسی ایک کے لئے نفع ہو یا وہ چیز جس پر عقد کیا جائے اس میں نفع ہو اور وہ اہل خصومت میں سے ہو، البتہ اگر شریعت نے ایسی بیع کے جواز کی گنجائش رکھی ہے جس میں شرط مقتضاً عقد کے خلاف ہو اور وہ جائز ہو، جیسے خیار شرط اور خیار اجل تو یہ صورت بیع کی پہلی صورت سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح اگر کسی جگہ لوگوں کا تعامل یہ ہے کہ مشتری بائع سے جلد خریدتے وقت یہ شرط لگائے کہ وہ مشتری کے لئے خف (موزہ) بنا کر دے گا یا مشتری بائع سے ٹوپی اس شرط کے ساتھ خریدے کہ بائع اس میں اپنے پاس سے اسٹر لگا کر دے گا تو یہ بیع بھی لوگوں کے تعامل کی وجہ سے جائز ہے، جیسا کہ اوپر عبارات سے معلوم ہوا۔ پس بائع و مشتری کے درمیان جو اس طرح معاملہ ہو:

۱- الف- اگر وہ مقتضاً عقد کے خلاف شرط سے خالی ہو جب تو اس پر بیع کا اطلاق ہوگا اور شرعاً وہ بیع منعقد ہوگی، اور بیع منعقد ہونے کے بعد بائع کی طرف سے بیع کے لئے مشتری سے یہ شرط کہ وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے یہ بیع سے متعلق حکم نہیں ہوگا صرف یہ بائع و مشتری کے درمیان ایک وعدہ ہوگا جو مشتری کو قبول کرنے کے بعد اسے پورا کرنا لازم ہوگا۔

ب- جب بیع کا اطلاق اس پر ہوگا تو مشتری کے لئے بائع کے ہاتھ فروخت کرنے اور فروخت نہ کرنے دونوں کا اختیار حاصل ہوگا، البتہ جب بیع سے قبل یا بعد میں ادا کی گئی قیمت کے ساتھ واپسی کا وعدہ ہوگا تو پھر مشتری کے لئے اپنے وعدے کے مطابق عمل کرنا لازم ہوگا۔

د- بیع کے منعقد ہونے کی صورت میں مشتری کو بیع سے فائدہ حاصل کرنے کی صورت میں مکمل اختیار ہوگا، لیکن واپسی کے وعدے کی شکل میں جو وعدہ ہوگا اسی کے مطابق عمل کرنا پڑے گا۔

ھ- اگر بائع و مشتری قبل عقد یا عقد کے بعد بیع کی واپسی پر رضامندی کر لیں تو پھر مشتری کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا درست نہیں ہے اور اگر فروخت کر دیا تو بیع تو درست ہوگی، مگر وعدہ خلافی کی وجہ سے مشتری گنہگار ہوگا اسی طرح مشتری بائع اول سے واپسی کے وعدے کے بعد اگر مزید قیمت لے تو وہ جائز تو ہوگی، مگر گنہگار ہوگا۔

۲- الف- حنفیہ کے نزدیک بیع و فاء رہن کے حکم میں ہے اگر اسے رہن قرار دیا جائے تو مشتری کو نہ بیچنے کا حق حاصل ہوگا اور نہ مزید قیمت لینے کا حق حاصل ہوگا اور اگر اس نے مزید قیمت لی تو وہ سود ہوگا اور بیع کو اگر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیا تو اس پر اس بیع کی قیمت واجب ہوگی۔ حنفیہ کے نزدیک رہن ہونے کی عبارات اوپر گزر چکی ہیں، درمختار میں ہے:

”ثم نقل عن التهذيب أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن وإن أذن له الرهن، قال المصنف: وعليه يحمل ما عن محمد بن اسلم من أنه لا يحل للمرتهن ذلك ولو بالأذن؛ لأنه ربوا، قلت: وتعليقه يفيد أنها تحريمية، فتأمله اهـ. قلت: هذا في الشروط، وقد تقرر أن المعروف كالمشروط“ -

لہذا اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو پھر مرتہن کے لئے، یعنی مشتری کے لئے رہن، یعنی بیع سے فائدہ اٹھانا یا اسے فروخت کرنا ممنوع ہوگا اور رہن مان لینے کی صورت میں مشتری کو بائع سے مزید قیمت لینا ربو میں داخل ہوگا۔ شامی میں ہے:

”لأنه عندنا رهن والراهن إذا استاجر الرهن من المرتهن لا يجب الأجر، وفي البزاية: فإن أجر المبيع وفاء من البائع فمن جملة فاسداً قال: لا تصح الإجارة ولا يجب شيئاً، ومن جعله رهنا كذلك“ -

”فتاویٰ نسفی“ کے اندر ہے کہ سود سے بچنے کے لئے ہمارے زمانہ کے لوگوں نے جس بیع کو اختیار کیا ہے اور اس کا نام بیع وفاء رکھا ہے وہ حقیقت میں رہن ہے اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قبل العقد اور بعد عقد واپسی کے وعدہ کے اعتبار سے تو اسے رہن کہا جاسکتا ہے، مگر نفس عقد چونکہ واپسی کی شرط سے خالی ہوگا، اس لئے اس پر بیع کا حکم جاری ہوگا اور اس بارے میں تفصیل سے میں اوپر عرض کر چکا۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر کہ مکان یا زمین کا کرایہ مروجہ کرایہ سے کم ادا کرے۔

ج- د- تو یہ اجارہ کی صورت ہوگی بیع کا اطلاق اس پر نہیں ہوگا اور نہ بیع کے احکام اس پر جاری ہوں گے، کیونکہ بیع کے شرائط اس صورت میں نہیں پائے جاتے۔ رہا مسئلہ مروجہ کرایہ سے کم کرایہ کا ادا کرنے کا تو یہ آجر اور مستاجر کی رضامندی پر موقوف ہے، اور جو دونوں کا طے شدہ فیصلہ ہوگا اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا اور چونکہ اس صورت میں اجرت پر لینے والا شخص مکمل اس چیز کا مالک نہیں ہوگا، اس لئے اسے فروخت کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہوگا۔

۳- آج کل کثیر زر ضمانت کا جو مروجہ طریقہ ہے اور کم کرایہ پر معاملہ طے ہو جاتا ہے وہ حالات زمانہ کے اعتبار سے درست ہے اور اس کی تین صورتیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ پیشگی رقم کرایہ میں شامل ہو کر ختم ہو جاتی ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ مالک مکان یا مالک دوکان کے پاس محفوظ رہتی ہے اور طے شدہ وعدے کے مطابق اسے واپس کرنا پڑتی ہے، البتہ جب تک وہ رقم اس کے پاس رہتی ہے اسے اپنے مصرف میں استعمال کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، لہذا وہ رقم قرض سمجھی جائے گی امانت اور رہن میں شمار نہیں ہوگی، کیونکہ امانت اور رہن کا امین اور مرہن کے لئے استعمال کرنا درست نہیں ہے رہن کے استعمال نہ کرنے میں مرہن کے لئے پہلے فقہی عبارتیں گزر چکی ہیں اور ودیعت کا، یعنی امانت کا حکم یہ ہے کہ جب اس کا مالک اسے طلب کرے تو امین پر اس کا واپس کرنا واجب ہے، عالمگیری (۳/۴۶۴) پر ہے:

”وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع وصيرورة المال أمانة في يده ووجوب أدائه عند الطلب مالكة كذا في الثمن، والوديعة لا تودع ولا تعار ولا تواجر ولا ترهن، وإن فعل شيئاً منها ضمن، كذا في البحر الرائق“۔

اور آج کل ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ پیشگی رقم نہ کرایہ میں شامل کی جاتی ہے اور نہ واپس کرنا پڑتی ہے، بلکہ وہ یوں ہی مالک مکان یا مالک دوکان کو دیدی جاتی ہے اور وہ اس کی ملک ہو جاتی ہے۔

تعالیٰ کی وجہ سے بیع و فاء میں بیع سے استفادہ

مولانا محمد صادق مبارکپوری ☆

بیع و شراء جائز ہے، اس کے تحت کتب فقہ و فتاویٰ میں ایک عنوان نظر آتا ہے بیع الوفاء کا۔ بیع الوفاء ضرورت کی بنا پر کی جانے والی ایک شکل ہے۔

جس کی بنیادی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی ضرورت مند ہوتا ہے، غیر سودی قرض نہیں ملتا، اور سودی قرض لینا شرعاً جائز نہیں ہے، تو اپنی کسی شے (زمین، جائیداد وغیرہ) کو فروخت کرتا ہے کہ تم اس کو اتنی قیمت میں لے لو، اتنی مدت یا جب بھی میں اس قیمت کو واپس کرنے کے حال میں ہوں گا، یہ شے مجھ کو اسی قیمت پر واپس کر دینا کسی دوسرے کو مت دینا۔

شریعت کے اصول کے مطابق اگر بیع میں کوئی ایسی شرط لگائی گئی جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو تو درست نہیں ہوتی، یہاں چونکہ اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شے واپس کرنی ہوگی، یہ بیع کے اصول و تقاضے کے خلاف ہے، اس لئے بیع درست نہیں ہے، البتہ عملاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی سی ہے۔

فقہاء کرام نے ایک طرف اس کے غیر معمولی تعالیٰ اور دوسری طرف فقہی قباحت کو دیکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز قرار دیا ہے، جب اس معاملہ کو رہن قرار دیا گیا تو اس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ شخص جو خریدار ہے، اس کا مالک نہیں ہوتا ہے، اصل مالک بائع ہے، اس لئے خریدار کے لئے زمین و مکان وغیرہ سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، خریدار کی حیثیت امین کی ہے، اور اس شے کی حیثیت رہن کی ہے، شے مرہون سے انتفاع جائز نہیں ہے۔

اب چند جلیل القدر فقہاء احناف کی تصریحات ملاحظہ فرماتے چلیں:

ماہیہ ناخفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی رقمطراز ہیں:

”البيع الذی تعارفه اهل زماننا احتیالاً للربا و سموه ببيع الوفاء هو رهن فی الحقیقة لا یملکھ ولا ینتفع به، إلا یاذن مالکھ، وهو ضامن لما أكل من ثمره و أتلف من شجره“ (مطلب فی بیع الوفاء باب الصرف کتاب البیوع ۴/۲۷۳ رشیدیہ کوئٹہ)۔

(وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جا رہا ہے اور اسے بیع وفاء کہا جاتا ہے، درحقیقت رہن ہے، جس کا خریدنے والا نہ مالک ہوتا ہے اور نہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے)۔
اسی تصنیف لطیف میں علامہ شامی حنفیؒ نے ”بیع الوفاء“ کی شکل کی وضاحت کرتے ہوئے اس کا حکم ان الفاظ میں درج فرمایا ہے:

”و فی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی: هو أن یقول: بعت منك علی أن تبیعہ منی متی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل وهو رهن، وحكمه حکم الرهن وهو الصحیح، قال السید الإمام: قلت للإمام الحسن الماتریدی: قد فشا هذا البیع وفيه مفسدة عظيمة وفتواک أنه رهن وأنا أيضاً علی ذلك“ (رد المحتار ۵/۲۷۳، کتاب البیوع باب الصرف، مطلب فی بیع الوفاء رشیدیہ کوئٹہ)۔

(جواہر الفتاوی کے حوالہ سے جامع الفصولین کے حاشیہ میں درج ہے کہ کوئی شخص کہے میں نے تجھ کو اس شرط پر بیچا کہ اسے مجھ کو بیچ دینا، جب میں اس کی قیمت دوں، پس یہ بیع باطل ہے، حقیقت میں رہن ہے، اس کا حکم رہن کا حکم ہے، یہی صحیح ہے، سید امام نے کہا کہ میں نے امام حسن ماتریدی سے کہا کہ اس بیع کا سلسلہ رواج پا گیا، اس میں بڑا فساد ہے، آپ کا فتویٰ رہن کا ہے، میں بھی اسی کا قائل ہوں)۔

”الھیط البرہانی فی الفقہ الاسلامی“ میں ہے:

”أن البیع الذی تعارف علیہ أهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزاً عن الربا فی الحقیقة رهن، والمبیع فی ید المشتري كالرهن فی ید المرتهن لا یملکہ ولا یحل الانتفاع بہ“ (کتاب البیوع، الفصل الخامس والعشرون ۸/۲۶۰ غفار کوئٹہ)۔

(وہ بیع جس پر اہل سمرقند کا تعارف ہے، انہوں نے اس کا نام سود سے بچنے کے لئے بیع الوفاء تجویز فرمایا، حقیقت میں رہن ہے، بیع مشتری کے قبضہ میں رہن جیسی ہے، مرہن کے قبضہ میں، اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے)۔
عہد عالمگیری میں شیخ نظام الدین کی سربراہی میں مرتب شدہ فقہ حنفی کے ذخیرہ ”الفتاویٰ الہندیہ“ میں ہے:

”البیع الذی تعارف أهل زماننا احتیالاً للربا وسموه بیع الوفاء هو فی الحقیقة رهن وهذا البیع فی ید المشتري كالرهن فی ید المرتهن لا یملکہ ولا یطلق له الانتفاع إلا بإذن مالکہ“ (۲/۲۰۸ کتاب البیوع دارالکتب دیوبند)۔

(وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانہ میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جا رہا ہے، اس کا نام بیع وفاء تجویز کیا، یہ حقیقت میں رہن ہے، یہ بیع خریدار کے قبضہ میں ایسی ہے جیسے مرہن کے قبضہ میں رہن ہوتا ہے، اس کا مالک نہیں ہوتا ہے، مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے)۔

ان تصریحات فقہاء کرام سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بیع نہیں، بلکہ رہن ہے، اور جب رہن قرار پایا تو اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

۱- یہ معاملہ ہمارے نزدیک شرعاً منعقد اور درست ہے، راجح قول کے مطابق یہ صورت بیع ہے، مگر حکماً رہن ہے۔
”رد المحتار علی الدر المختار“ میں ہے:

”وهو يقول: بعث منك على أن تبيعه مني متى جئت بالثمن، فهذا البيع باطل وهو رهن
وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح“ (کتاب البیوع باب الصرف مطلب فی بیع الوفاء)۔

(کوئی شخص کہے کہ میں نے تم کو اس شرط پر بیچا کہ مجھ کو بیچ دینا جب میں اس کی قیمت لاؤں، پس یہ بیع باطل ہے، درحقیقت رہن ہے، اس کا حکم رہن کا ہے اور یہی صحیح قول ہے)۔

الف- راجح قول کے مطابق شیئی مرہون قرار پا کر اس کو بیچنا دوسرے کے ہاتھ جائز نہیں ہے۔
ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ ہی قیمت لازم ہوگی، کیونکہ راجح قول کے مطابق یہ بیع نہیں ہوئی، بلکہ شیئی مرہون قرار پائے گی۔

ج- راجح قول کے مطابق یہ شیئی مرہون ہے، اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

د- خریدار کو سرے سے بیچنا ہی جائز نہیں ہے، کیونکہ راجح قول کے مطابق یہ معاملہ مذکورہ رہن ہے۔

۲: الف- خریدار کو اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، شامی میں ہے:

”لا يحل له أن ينتفع بشيئ من وجه من الوجوه وإن أذن له الراهن“۔

(کسی طریقہ سے بھی فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، اگرچہ راہن اس کی اجازت دے)۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ”ملئقی الا بحر جمع مجمع الانهر“ میں ہے:

”ليس للمرتهن الانتفاع بالرهن ولا اجارته ولا اعارته“ (۳/۲۷۳ کتاب الرهن غفاریہ کوئٹہ)۔

(مرتہن کے لئے رہن سے فائدہ اٹھانا یا اس کو بطور اجارہ یا بطور عاریت دینا جائز نہیں ہے)۔

ج- اس عرصہ میں خریدار کسی طرح کا فائدہ نہیں لے سکتا ہے، کیونکہ یہ شیئی مرہون ہے اور شیئی مرہون سے فائدہ

لینا جائز نہیں ہے، ”البحر الرائق“ میں ہے:

”ولا ينتفع المرتهن استخداماً وسكنياً ولبساً واجارة وإعارة؛ لأن الرهن يقتضى الحبس إلى

أن يستوفى دينه دون الانتفاع“ (کتاب الرهن ۳۳۸/۶ رشیدیہ)۔

(مرتہن خدمت لے کر، یا رہائش اختیار کر کے یا پہن کر یا اجارہ و عاریت پر دے کر فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لئے

کہ رہن روکے جانے کا تقاضا کرتا ہے، یہاں تک کہ دین ادا کرے، نہ کہ فائدہ لینے کا تقاضا کرتا ہے)۔
 د- خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا ہے، کیونکہ اس کی ملک نہیں ہے اور دوسرے کی ملک میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے، شامی میں ہے: ”لایجوز التصرف فی مال الغیر“ (کسی کی ملکیت میں تصرف کرنا جائز نہیں ہے)۔
 ۳- زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہے، اس کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی حرام و ناجائز اور سود ہوگی، کیونکہ اسے قرض سے فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا، قرض دے کر فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، علامہ حصکفی ”در مختار“ میں بحوالہ ”الاشباہ والنظائر“ تحریر فرماتے ہیں:

”کل قرض جر نفعاً حرام فکفره للمرتہن سکنی المرهونة یا ذن الراهن“ (مطلب کل قرض جر نفعاً حرام، فصل فی القرض ۴/۱۹۳، رشیدیہ کوئٹہ)۔
 (ہر قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے حرام ہے، اس لئے گروی رکھے ہوئے مکان میں مرتہن کو رہائش اختیار کرنا مالک کی اجازت سے بھی مکروہ ہے)۔

اس کی ایک دوسری نظیر اسی کتاب میں بحوالہ ”قنیہ“ درج ہے:
 ”فیہا (أی فی القنیة) شراء الشیء الیسیر بثمان غال لحاجة القرض یجوز ویکره“ (مطلب کل قرض جر نفعاً... فصل فی القرض ۴/۱۹۵ رشیدیہ کوئٹہ)۔

(اس میں یعنی قنیہ میں ہے کہ معمولی چیز زیادہ قیمت میں قرض کی ضرورت سے لینا جائز مع الکرہت ہے)۔

بیع و فاء کی حیثیت

مولانا ابراہان ندوی ☆

بیع الوفاء اصلاً رہن ہے:

بیع الوفاء کے نام سے کیا جانے والا یہ معاملہ اصلاً رہن ہے، اگرچہ الفاظ بیع کے استعمال کئے جا رہے ہیں، کیونکہ ثمن (قرض) کی واپسی پر سامان کی واپسی رہن میں ہوتی ہے، اصول فقہ کا قاعدہ ہے:

”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی للألفاظ والمعانی“ (القواعد الفقہیہ از علی احمد ندوی)۔

(معاملات میں اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ و تعبیرات کا)۔

معاملات میں اصل اعتبار مقاصد کا ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا، علامہ ابن نجیم مصری رقمطراز ہیں:

”الحاصل كما فی الهدایة أن المعتبر فی هذه العقود هو المعنی“ (المحررات ۵/۳۳۳، زکریا بکڈ پو

دیوبند)۔

(خلاصہ کلام: جیسا کہ ہدایہ میں ہے کہ ان معاملات میں اعتبار معانی کا ہے)۔

اکثر فقہاء احناف کی رائے بھی یہی ہے کہ یہ رہن ہے اور رہن ہی کے احکام اس پر جاری ہوں گے۔

علامہ ابن عابدین شامی نقل فرماتے ہیں:

”قال فی الخیرية: والذی علیہ الأكثر أنه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام“

(رد المحتار ۷/۵۳۶، زکریا بکڈ پو دیوبند)۔

(خیر یہ میں ہے کہ اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ رہن ہے اور اس پر تمام احکام رہن کے جاری ہوں گے)۔

نیز سابق مفتی اعظم فلسطین سید سابق علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

”بیع الوفاء: حکمہ حکم الرهن فی أرجح الأقوال عندنا“ (فقہ السنہ ۳/۱۳۴، دارالکتب العربیہ بیروت)۔

(راجح قول کے مطابق ہمارے نزدیک بیع الوفاء کا حکم رہن کا ہے)۔

”الموسوعة الفقهية“ میں فقہاء احناف میں شیخ ابوشجاع، علی السغدی، قاضی ابوالحسن ماتریدی کی رائے بیع الوفاء کے رہن ہونے کی نقل کی گئی ہے:

”وذهب أبو شجاع وعلی السغدی والقاضی ابو الحسن الماتریدی من الحنفیة إلی: أن بیع الوفاء رهن وليس بیع، فیثبت له جمیع أحكام الرهن“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۱/۹)۔
 (فقہاء احناف میں ابوشجاع، شیخ علی السغدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی کی رائے ہے کہ بیع وفاء رہن ہے بیع نہیں ہے، تو اس میں رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے)۔

خریدار کا اس سامان سے فائدہ اٹھانا:

مالک (یعنی بائع) جب تک اس سامان کو واپس نہ لے تو خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا کیسا ہے؟ دراصل یہ بیع رہن ہے، اور شیخی مرہونہ سے انتفاع بلا اجازت درست نہیں ہے اور یہ ”کل قرض جرنفعاً فہو حرام“ میں شامل ہے، بعض فقہاء نے مالک کی اجازت کے بعد بھی ممنوع قرار دیا ہے۔

چنانچہ علامہ شامی نقل فرماتے ہیں:

”لا یحل له أن ینتفع بشیئ منہ بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له فی الربا؛ لأنه یتستوفی دینہ کاملاً، فتبقى له المنفعة فضلاً فیکون ربا“ (رد المحتار ۵۱۰/۷) مکتبہ زکریا دیوبند)۔

(قرض دینے والے کے لئے شیخی مرہونہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے گرچہ رہن اس کی اجازت دیدے، اس لئے کہ یہ سود کی اجازت ہے، کیونکہ وہ اپنا پورا قرض وصول کرے گا، تو یہ نفع اس کے لئے زائد ہوا، لہذا یہ سود ہوگا)۔
 البتہ احناف کا مفتی یہ قول یہ ہے کہ اگر مالک نے انتفاع کی اجازت دیدی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ علامہ شامی مذکورہ قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”قلت: وهذا مخالف لعامة المعتمرات من أنه یحل بالاذن“ (رد المحتار ۵۱۰/۷)۔

(یہ عام معتبر فقہی عبارات و آراء کے خلاف قول ہے، معتبر یہی ہے کہ اجازت کے بعد استفادہ حلال ہے)۔
 نیز فقہاء کی تحریروں میں بڑی صراحت ملتی ہے کہ بیع الوفاء کی صورت میں بیع (شیخی مرہونہ) سے مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”البیع الذی تعارف أهل زماننا احتیالاً للربا، وسموه بیع الوفاء هو فی الحقیقة رهن، وهذا المبیع فی ید المشتري كالرهن فی ید المرتهن لا یملکہ ولا یطلق له الانتفاع، إلا بإذن مالکھ“ (الفتاویٰ

(ہمارے زمانہ میں بیع کی وہ معروف شکل جو سود سے بچنے کے لئے اختیار کی جاتی ہے، اور وہ بیع و فاء کے نام سے موسوم ہے، حقیقت میں وہ رہن ہے، یہ بیع مشتری کے پاس مرتہن کے ہاتھ میں رہن کے مانند ہے، جس کا خریدار نہ مالک ہوتا ہے اور نہ ہی مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے)۔

بعض دیگر فقہاء کے نزدیک مالک کی اجازت کے بغیر بھی رہن سے انتفاع جائز ہے، جبکہ جمہور فقہاء کا مسلک اس کے خلاف ہے۔

محدث کبیر شیخ عبدالرحمن مبارکپوری نقل فرماتے ہیں:

”قال رسول اللہ ﷺ : الظھر یرکب إذا کان مرھوناً، ولبن الدر یشرب إذا کان مرھوناً وعلی الذی یرکب ویشر ب نفقته، هذا حدیث حسن صحیح وفيه حجة لمن قال: یجوز للمرتهن الانتفاع بالرهن إذا قام بمصلحته ولولم يأذن المالك، وهو قول أحمد وإسحاق وطائفة ... وذهب الجمهور إلى أن المرتهن لا ینتفع من المرهون بشئی، وتأولوا الحدیث“ (تختة الاحوذی ۴/۲۶۱)۔

(رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جانور پر سواری کی جائے گی جب وہ رہن میں رکھا ہوا ہو، اور اونٹنی کا دودھ پیا جائے گا جب وہ رہن میں رکھی ہوئی ہو، اور اس کا خرچہ سواری کرنے والے اور دودھ پینے والے پر ہوگا، یہ حدیث حسن و صحیح ہے، اس حدیث میں ان لوگوں کے لئے دلیل ہے جن کے نزدیک مرتہن کے لئے رہن سے انتفاع درست ہے، جبکہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے اور مصالح کا خیال رکھے، گرچہ مالک اس کی اجازت نہ دے، یہ امام احمد بن حنبل، امام اسحاق و ایک گروہ کا مسلک ہے، اور جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ مرتہن شئی مرہونہ سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اور اس حدیث کی انہوں نے تاویل و توجیہ کی ہے)۔

مکان یا زمین کا کرایہ مروجہ کرایہ سے کم ہو:

خریداری کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ خریدار معینہ مدت یا شمن کی واپسی تک جو مکان یا زمین خریدے اس کی قیمت بطور کرایہ ادا کرے، مگر کرایہ مروجہ کرایہ سے بہت کم ہو تو یہ جائز نہیں ہے، ”کل قرض جر منفعة فهو ربا“ (کنز العمال ۶/۲۳۸ حدیث: ۱۵۵۱۶، موسسة الرسالہ بیروت)، میں شامل ہے، کیونکہ اگر بائع نے اس سے یہ رقم نہ لی ہوتی تو اتنے کم کرایہ پر بھی نہ دیتا، یہ اس کی مجبوری و قرض دینے کا فائدہ اٹھا رہا ہے، اور اسی کا نام ربا ہے، بہت سے فقہاء نے اس صورت کو بھی ممنوع قرار دیا ہے، کہ اگر مستقرض (قرض دار) قرض دہندہ سے بعد میں کوئی سامان زیادہ قیمت پر خریدے تو یہ بھی ربا میں داخل ہے)۔

علامہ شامی اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد نقل فرماتے ہیں:

”و کثیر من مشائخ بلخ کانوا یکرهونہ، ویقولون: إنه قرض جرّ منفعۃ، إذ لولاه لم یتحمل المستقرض غلاء الثمن“ (ردالمحتار ۷/۳۹۷، زکریا بکڈ پو دیوبند، کتاب البیوع مطلب کل قرض جرّ منفعۃ حرام)۔
(زیادہ تر مشائخ اسے ممنوع قرار دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ قرض سے فائدہ حاصل کرنا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو قرض دار بھاری قیمت پر کبھی نہ آمادہ ہوتا)۔
البتہ عرف میں جو مرد وجہ کرایہ ہے وہ کرایہ ادا کرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

خریدار کا کاشت یا اجارہ داری کے ذریعہ فائدہ اٹھانا:

خریدار کے پاس وہ شئی بطور رہن ہے، وہ اس کا مالک نہیں ہے، اصل مالک بائع یعنی قرض حاصل کرنے والا راہن ہے، اس لئے خریدار کا کاشت کر کے یا اس شئی کو کرایہ پر دے کر کسی طرح کا نفع حاصل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے، البتہ اگر راہن کی اجازت سے کسی کو کرایہ پر دیدے تو درست ہے، مگر کرایہ کے طور پر حاصل ہونے والی رقم اصل مالک بائع کی ہوگی، اگر مالک کی اجازت کے بغیر کرایہ پر دیدے تو کرایہ کی رقم کو بائع کو واپس کرے یا اس کو صدقہ کرے، دیکھئے: (ردالمحتار ۷/۵۴۹، زکریا بکڈ پو دیوبند)۔

خریدار کا بیع کو فروخت کرنا:

خریدار اس شئی کو فروخت کرنے کا اختیار نہیں رکھتا ہے، کیونکہ بیع کے نفاذ کے لئے ملکیت یا ولایت شرط ہے، اور یہاں خریدار اس چیز کا مالک ہے، نہ ہی اسے ولایت حاصل ہے۔
علامہ ابن نجیم مصری رقمطراز ہیں:

”أما شرائط النفاذ فالملك أو الولاية فلم یعقد بیع الفضولی عندنا“ (المحررات ۵/۴۳۵، زکریا

بکڈ پو دیوبند)۔

(بیع کے نفاذ ہونے کی شرطیں ملکیت یا ولایت دونوں میں سے کوئی ایک ضروری ہے، ہمارے نزدیک فضولی کی بیع منعقد نہیں ہوتی)۔

بیع الوفاء کے جو صحت کے قائل ہیں اور وہ حضرات جو اسے رہن قرار دیتے ہیں، دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ خریدار فروخت کرنے کا حقدار نہیں ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رقمطراز ہیں:

”ولو باعه المشتري فلبائع أو ورثته حق الاسترداد، أي علی القول، بأنه بیع بفید الانتفاع به،

فإنه لا یملک بیعه“ (ردالمحتار ۷/۵۴۸)۔

(بیع وفا اگر بیع کو مشتری فروخت کر دے تو جو اس بیع کے رہن ہونے کے قائل ہیں اور جن کے نزدیک یہ بیع درست ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا صحیح ہے، دونوں کے یہاں اس صورت میں) بائع یا اس کے ورثاء کو بیع کو واپس لوٹانے کا حق ہے، اس لئے کہ وہ (مشتری) اس کو فروخت کرنے کا مالک نہیں ہے)۔

☆☆☆

بیع و فاء کا شرعی حکم

مفتی ریاست علی قاسمی راجپوری ☆

تعریف:

بیع و فاء یہ ہے کہ بائع مشتری سے اس بات کو پورا کرنے کا عہد و پیمان لے کہ جس وقت بائع ثمن واپس کر دے گا تو مشتری وہ بیع اس کو واپس کر دے گا، تا تا ر خانیہ میں ہے: ”بیع الوفا أن يقول البائع للمشتري: بع هذا بمالك عليّ عليّ أني متى قضيت الدين فهو لي“ (تا تا ر خانیہ ۲۰۵/۹)۔

بیع و فاء کی تعریف میں اختلاف کی دو صورتیں ہیں:

- ۱- بائع قرض لے کر اس کے بدلے میں بیع مشتری کو سونپ دے۔
- ۲- پہلے سے بائع مقرض ہو اس کے بدلے میں بیع مشتری کے حوالے کر دے۔

حکم:

امام حسن ماتریدی کے قول کے مطابق یہ رہن ہے، چنانچہ شامی میں ہے: ”قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام“ (رد المحتار ۵۴۶/۷)۔

اور بقول زیلعی کے یہ بیع جائز ہے، بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے کہ اس مکان میں رہائش کا فائدہ حاصل کرنا، لیکن مشتری اس کو فروخت کرنے کا مالک نہ ہوگا۔ ”الحرا لرائق“ میں ہے: ”وذكر الزيلعي: أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (الحرا لرائق ۱۲/۶)۔

بعض محققین کا قول یہ ہے کہ بعض احکام کے حق میں بیع فاسد ہے اور بعض احکام کے حق میں بیع صحیح ہے اور بعض

میں رہن ہے۔

”القول الثامن الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، وصحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البيع.... ورهن في حق البعض حتى لم

یملک المشتري بیعه من آخر ولا رهنه الخ“ (البحر الرائق ۱۳/۶)۔

”مباحث فقہیہ“ میں ہے کہ بیع و فاء کے سلسلہ میں فقہاء حنفیہ کے مختلف اقوال ہیں، نیز قول راجح اور مفتی بہ ہونے کے بارے میں بھی ان کے اقوال مختلف ہیں اکثر فقہاء اس کے رہن ہونے کے قائل ہیں اور بعض فقہاء بعض احکام کے حق میں اس کے جائز اور بعض کے حق میں فاسد ہونے کے قول کو راجح قرار دیتے ہیں (مباحث فقہیہ ص ۵۸۵)۔

بہر حال اگر بیع وفا کو رہن مانا جائے، جیسا کہ امام حسن ماتریدی کا قول بھی ہے تو مرتہن اس کا مالک نہ ہوگا اور مالک (بائع) کی اجازت کے بغیر اس سے نفع بھی اٹھا سکتا اگر اس نے نفع اٹھالیا یا اس کو تلف کر دیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا اور ہلاکت کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا۔ ”بحر“ میں ہے: ”الأول ما اختاره صاحب المنظومة أنه رهن حقيقة فلا يملكه المشتري ولا ينتفع به إلا بإذن البائع.... وسقط الدين بهلاكه“ (البحر الرائق ۱۱/۶-۱۳)۔

اگر خریدار اس کو طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت کم ہے تو بیع کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں ایک عقد (بیع) میں دو عقد (بیع و اجارہ) جمع ہو رہے ہیں اور آپ ﷺ نے اس طرح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے: ”عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة“۔

اگر مشتری اس کو بیچنا چاہے تو اس کو مالک کی اجازت کے بغیر یہ حق حاصل نہیں، ”بحر“ میں ہے: ”أن الفتوى على أنه بيع جائز.... إلا أنه لا يملك بيعة للغير“ (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

اور اگر بیع صحیح مانا جائے، جیسا کہ امام زبیلی نے ذکر کیا ہے تو مشتری کے لئے اس سے فائدہ حاصل کرنا تو حلال ہوگا، البتہ وہ اس کو فروخت کرنے کا مالک نہ ہوگا، ”شامی“ میں ہے:

”الأول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعة، قال الزيلعي في الإكراه: وعليه الفتوى“ (رد المحتار ۵۳۶/۷)۔

اور اگر اس کو بعض احکام میں بیع فاسد اور بعض میں بیع صحیح مانا جائے اور بعض میں رہن، جیسا کہ بعض محققین کا قول ہے تو بیع فاسد کی صورت میں عاقدین میں سے ہر ایک فسخ کا مالک ہوگا اور بیع صحیح کی صورت میں مشتری بیع و منافع بیع کا مالک ہوگا اور رہن کی صورت میں نہ تو فروخت کرنے کا مالک ہوگا اور نہ رہن رکھنے کا اور اس کی ہلاکت کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا۔ صاحب ”بحر“ فرماتے ہیں:

”القول الثامن الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، وصحيح في حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البيع، ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعة من آخر ولا رهنه..... وسقط الدين بهلاكه“ (البحر الرائق ۱۲/۷)۔

بیع قرار دینے کی صورت میں بائع کا عقد سے پہلے یا عقد کے اندر یہ شرط لگانا کہ یہ صرف اسی کو بیچی جائے کسی اور کو نہ بیچی جائے، شرط فاسد ہے۔ شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ شرط مقتضایہ عقد کے خلاف ہے، اس معاملہ بیع کو صحیح بنانے کی شکل یہ نکل سکتی ہے کہ اولاً عقد بیع بغیر شرط کے کر لیا جائے اور اس کے بعد بطور وعدہ کے آپس میں یہ طے کر لیا جائے کہ جب بائع مشتری کو ثمن لوٹا دے گا تو مشتری بیع بائع کے حوالے کر دے گا، یہ صورت شرعاً درست ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم ”بجز“ کے اندر رقم طراز ہیں:

”ثم إن شرطاً فسخه في العقد أو تلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء... فالبيع فاسد، وإن ذكر الوفاء بلا شرط ثم شرطه على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء“ (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

پھر اگر مشتری مالک اول (بائع) کو فروخت کرے گا تو سابق ادا کردہ قیمت ہی کے عوض کر سکتا ہے زائد قیمت کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے کہ بطور وعدہ کے عام طور سے عقد کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی وعدے لازم ہو جاتے ہیں، چنانچہ ”بجز“ میں ہے: ”وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا“ (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

علامہ ابن عابدین شامی اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”لأن المواعيد قد تكون لازمة، قال في البرازية في أول كتاب الكفالة: إذا كفل معلقاً، بأن قال: إن لم يؤد فلان فأنا أدفعه إليك، ونحوه يكون كفالة لما علم أن المواعيد باكتساء صور التعليق تكون لازمة“ (رد المحتار ۵۴۷/۷)۔

اگر خریدار اس کو بائع کے علاوہ کسی اور کو فروخت کر دے تو یہ بیع مالک (بائع) کی اجازت پر موقوف رہے گا اور اگر مالک یا اس کے ورثہ کو لوٹانے کا حق حاصل ہوگا، چنانچہ فتاویٰ ”عالمگیری“ میں ہے:

”وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن لا يملكه... إلا بإذن مالكة“ (عالمگیری ۲۰۹۳)۔

”شامی“ میں ہے:

”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد على القول بأنه رهن“ (رد المحتار ۵۴۸/۷)۔

آج کے اعتبار سے فتویٰ اس پر دیا جاتا ہے کہ بیع وفاق حقیقت میں رہن ہے، نہ کہ بیع، البتہ استحساناً بیع ہی ہے، تاکہ متعاقدین کے لئے اس چیز سے انتفاع جائز ہو جائے۔

بیع الوفاء شریعت کی نظر میں

مولانا غلام اللہ کاوی ☆

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں:
 اول: مجلس عقد میں یا مجلس عقد سے پہلے بطور شرط و وعدہ واپسی کا ذکر نہ آیا ہو، اور لوگ شب و روز جس طرح بیع و شراء کرتے ہیں، اسی طرح بیع و شراء کیا ہو، بعدہ کسی دوسری مجلس میں دوسرے وقت واپسی کی درخواست کی ہو، اور خریدار نے منظور بھی کر لیا ہو، تو یہ بیع ہے، اب بائع کو قانوناً واپسی کا کوئی حق نہیں ہے، ”وان ذکر البیع من غیر شرط علی وجہ المواعدة جاز البیع“ (فتاویٰ قاضی خان علی ہاشم الفتاویٰ العالمیہ یہ ۱۶۵/۲ فصل فی شرط المفسدة) کذانی الدر المختار علی الرد المحتار کتاب البیوع باب الصرف مطلب فی بیع الوفاء ۲۷۷/۵۔

دوم: اگر مجلس عقد میں یا اس سے پہلے بطور شرط و وعدہ واپسی کا ذکر آچکا ہے اور خریدار نے منظور بھی کر لیا ہے، تو یہ رہن کے حکم میں ہے، خریدار کو اس سے انتفاع جائز نہیں، اور اس کی آمدنی بائع کی ہے، مشتری فقط امین ہے، نہ خریدار اس کو بیع سکتا ہے، نہ ہیہ کر سکتا ہے، نہ رہن دے سکتا ہے، نہ کرایہ پر دے سکتا ہے، اپنے روپے وصول ہونے کے بعد بیع بائع کو آمدنی کے ساتھ واپس کرنا ضروری ہے، ”ولا یحل له أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه، وان اذن له الراهن، لأنه اذن له فی الربا؛ لأنه ینستوفی دینہ کاملاً، فتبقى له منفعة فیکون ربا“ (الدر المختار علی الرد المحتار ۶/۲۸۲ کتاب الربہن) (کذانی تنقیح الحدیث ۱/۲۵۲ مکتبہ مدینہ مصر) کذا کفایۃ المفتی ۸/۱۳۸ (کذانی فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۲۵۶)۔

الف- مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے اول صورت میں قضاء واپسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا ہے، ہاں دیانتاً اس وعدہ کا پورا کرنا بہتر ہے، اگر مصالح کے خلاف ہو اور نقصان ہوتا ہو تو اس کو واپسی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے، شرعاً اس پر کوئی گناہ بھی نہ ہوگا۔

”وعده أن یاتیہ فلم یأتہ، لا یأثم، قال بعض الفضلاء: فإن قیل: ما وجه التوفیق بین ہذین القولین، فإن الحرام یأثم بفعلہ، وقد صرح فی القنیۃ بنفی الیأثم؟ قلت: یحمل الأول ما إذا وعد وفی

نیئتہ خلف فیحرم، لأنه من صفات المنافقین، والثانی علی ما إذا نوى الوفاء وعرض مانع“ (الاشباه والنظائر للحموی الفہم الثانی کتاب الخطر والاباحہ ۲۳۶/۳)۔

”عن زید، بن ارقم عن النبی ﷺ قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نیئتہ أن یفی لہ، فلم یف ولم یجیی للمیعاد فلا إثم علیہ، قال الاشراف: هذا دلیل علی أن النیة الصالحة ینتاب الرجل علیہا، وإن لم یقترن معہا المنوی وتختلف عنہا ۵۱ ومفہومہ أن من وعد وليس من نیئتہ أن یفی ولم یف، فعلیہ الإثم سواء وفی بہ أو لم یف، فإنه من أخلاق المنافقین، ولا تعرض فیہ لمن وعد ونیئتہ أن یفی فلم یف بغير عذر“ (مرقاۃ المفاتیح ۶۱۵/۸، کتاب الآداب باب الوعد الفصل الثانی، کذافی فیض القدر ۸۹۱/۲ رقم الحدیث: ۷۹۴)۔

ثانی صورت میں، یعنی مجلس عقد میں یا مجلس عقد سے قبل بطور شرط و وعدہ واپسی کا ذکر آچکا ہے، خریدار نے منظور بھی کر لیا ہے، تو یہ بیع نہیں ہے، رہن ہے، اس کو بیع الوفاء کہتے ہیں، بیع رہن شمار ہوگی، اس سے نفع اٹھانا خریدار (مرہن) کے لئے درست نہیں۔

”وهو أن یقول بعث منک أن تبیعہ منی متی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل، وهو رہن، وحکمہ حکم الرهن، وهو الصحيح“ (رد المحتار ۲۷۶/۵ کتاب البیوع باب الصرف)۔

”ولا ینتفع المرتهن استخداماً وسکنی، لبسائے ﷺ، واجارة واعارة، لأن الرهن یقتضی الحبس إلى أن یستوفی دینہ دون الانتفاع“ (البحر الرائق ۴۳۶/۶ کتاب الرهن)۔

اس بیع سے جو کچھ منافع حاصل ہوں گے وہ بائع (راہن) کے ہوں گے، ”ونماء الرهن كالولد والثمر واللبن والصوف والوبر والاراش ونحو ذلك للراهن، لتولده من ملكه وهو رهن مع الأصل تبعاً له“ (الدر المختار مع الرد المحتار ۵۲/۶ باب الرهن، کذافی ملتقى الابرج مع جمع الانهر ۳۰۴/۴ کتاب الرهن)۔

ب- اول بیان کردہ صورت میں، یعنی مجلس عقد یا اس سے پہلے کوئی شرط و وعدہ واپسی کا نہ ہوا ہو تو خریدار مالک بن چکا ہے، اسے اختیار ہے بائع کو بیچے یا کسی اور کو بیچے یا خود ہی اپنے پاس رکھے اور فروخت ہی نہ کرے، اگر بائع کو بیچے اول ثمن پر تو بھی درست ہے زائد قیمت سے بیچنا بھی درست ہے، ”وان ذکر البیع من غیر شرط ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع“ (فتاویٰ قاضی خاں علی ہاشم الفتاویٰ العالمیہ ۱۶۵/۲ فصل فی الشروط المفسدة)۔

ثانی بیان کردہ صورت میں، یعنی مجلس عقد میں یا اس سے پہلے شرط و وعدہ واپسی کا ہو چکا ہو تو یہ رہن ہے، بیع نہیں، جب مکمل رقم ادا کر چکے تو وہ شیئی اسی طرح حاصل شدہ منافع و آمدنی بائع کو یعنی راہن کو واپس کرنا ضروری ہے، ”وهو أن یقول: بعث منک علی أن تبیعہ منی متی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل، وهو رہن، وحکمہ حکم الرهن، وهو الصحيح“ (رد المحتار ۲۷۶/۵ کتاب البیوع باب الصرف)۔

”ونماء الرهن والشمر واللبن والصوف والوبر والارش ونحو ذلك للراهن لتولده من ملكه وهو رهن مع الأصل تبعاً له“ (الدر المختار ج ۶/۵۲)۔

بیان کردہ اول صورت میں فائدہ اٹھانا جائز ہے (فتاویٰ قاضی خاں ۱۶۵/۲)۔

بیان کردہ ثانی صورت میں فائدہ اٹھانا جائز نہیں، ”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربوا، لأنه يستوفى دينه كاملاً، فبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربا“ (الدر المختار ج ۶/۳۸۲)۔

د- بیان کردہ اول صورت میں دوسرے کو بیچنا درست ہے، کل ٹمن کا مالک ہوگا بائع کا اس میں کوئی حق نہیں ہے، زائد ٹمن کا خریدار ہی مالک ہے، کما مر، رہن قرار دے تو دوسرے کو بیچنا درست نہیں، اس لئے کہ بیع کا وہ خود مالک نہیں بائع (راہن) جب مکمل رقم ادا کر دے جو آپ نے دی ہے، تب بیع (مرہون) راہن کی ہوگی، واپس کرنا ضروری ہے، ”وفى حاشية الفصولين وهو أن يقول: بعث منك على أن تبعه منى متى جئت بالثمن، فهذا بيع باطل وهو رهن، و حكمه حكم الرهن، وهو الصحيح“ (رد المختار ج ۶/۲۷۵، کتاب البيوع باب الصرف مطلب في بيع الوفاء)۔

۲- الف- جب تک بیچنے والا واپس نہیں لے گا، راہن قرار دینے کی صورت میں اس سے فائدہ اٹھانا حلال نہیں ہوگا، ”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربا، لأنه يستوفى دينه كاملاً، فبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربا“ (الدر المختار ج ۶/۳۸۲ کتاب الرهن، كذا في تنقيح الحامد ج ۲/۲۵۲)۔

ب- مالک شروع میں پگڑی کے نام سے بڑی رقم وصول کر لیتا ہے، جس سے قبضہ کا حق پگڑی دینے والے کی ملک میں چلا جاتا ہے، جیسا کہ دوسرے فقہی سمینار میں تجویز پاس ہو چکی ہے، اب مالک کی ملکیت ناقص ہونے کی وجہ سے اجرت و کرایہ میں کمی یقیناً ہوگی، اس لئے بندہ کا خیال ہے، مروجہ کرایہ سے کم کرایہ طے کرنا درست ہوگا، (دیکھئے نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۴۳)۔

مولانا خالد سیف اللہ صاحب اپنی کتاب ”حلال و حرام“ میں تحریر فرماتے ہیں:

۲- پگڑی کے ذریعہ دکان حاصل کرنے والے کرایہ دار کا خود مالک مکان یا نئے کرایہ دار سے پگڑی وصول کرنا دوسری صورت بھی جائز ہے، دراصل حق ملکیت اور حق قبضہ دو مستقل حقوق ہیں، جو مکان سے متعلق ہیں، کرایہ دار پگڑی ادا کر کے حق قبضہ خرید کر لیتا ہے، اور حق ملکیت اصل مالک کا باقی رہتا ہے، اب کرایہ دار اصل مالک مکان یا نئے کرایہ دار سے اسی حق قبضہ کی قیمت پگڑی کے نام سے وصول کر لیتا ہے، فقہاء کے یہاں ایسی نظیریں موجود ہیں کہ جن میں بعض حقوق کو قابل قیمت تسلیم کیا گیا ہے (حلال و حرام ص: ۴۰۵، رد المختار ج ۴/۱۵، جموی علی الاشباه القاعدة السادسة)۔

مالک حق قبضہ بیچ چکا ہے تو ملکیت میں کمی کی وجہ سے کرایہ بھی کم ہوگا، اس لئے اس کے جواز میں شبہ نہ کرنا چاہئے۔
ج۔ اگر مالک نے بڑی رقم پگڑی کے نام سے وصول کی ہو، پھر ماہانہ و سالانہ کرایہ بھی دیتا ہو تو کاشت یا اجارہ داری سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہوگا۔

اگر رہن ہو تو (خریدار) مرہن کو اس سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں، اس کی انکم راہن کی ہوگی، ”و الغالب من أحوال الناس إنهم إنما يريدون عند الدفع الانتفاع، ولو لاه لما أعطاه الدراهم وهنا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف المشروط وهو مما يعين المنع“ (شامی ۱۰/۵-۱۱)۔

د۔ رہن ہو تب اس کا بیچنا درست نہیں، اپنا قرض وصول ہونے کے بعد راہن کو واپس کرنا ضروری ہے۔
۳۔ دوسرے فقہی سمینار میں تجویز پاس ہو چکی ہے، کہ جب مالک کرایہ دار سے پگڑی کے نام پر بڑی رقم وصول کرے، تو مالک کا قبضہ کرایہ دار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اب اس کی ملکیت کی قیمت میں بھی نقص آجاتا ہے، پھر کرایہ بھی کم ہو تو اس کے جواز میں شبہ نہ ہونا چاہئے، کم کرایہ پر لینا درست ہوگا۔

بیع و فاء اور کرایہ کے مکان پر ڈپازٹ رقم کا حکم

مفتی شبیر احمد دہلوی ☆

۱- یہ معاملہ جو خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے وہ شرعاً منعقد نہیں ہوتا، لیکن عرف عام کی وجہ سے اس کو حکماً بیع کہا جائے گا، ”حکم البیع بالوفاء الذی یقع فاسداً کحکم البیع الذی یقع صحیحاً، فلیس للبائع ای للمدین أن یسترد المبیع ویتصرف فیہ ما لم یؤد ما أخذ من المشتري ای الدائن“ (دررالحکام ۱/۴۳۳)۔

الف- بیع و فاء میں بیع دوسرے کو بیچنے کا حق نہیں ہوگا، بلکہ فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے۔

ب- مشتری جب بیع واپس کرے تو اتنی ہی قیمت میں واپس کرنا لازم ہے، زائد کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

ج- ”إذا شرط فی الوفاء أن یکون قدر من منافع المبیع للمشتري صح ذلك“۔ اس سے معلوم ہوا کہ خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، عقلی دلیل یہ ہے کہ جب دائن مدیون کو دین دیتا تھا اور وہ (مدیون) بطور رہن کوئی چیز رکھتا تھا اور رہن سے فائدہ اٹھانا ناجائز تھا، اس لئے اس کو بیع و فاء کی شکل دی گئی تو اس سے بھی عقلاً معلوم ہوتا ہے کہ خریدار (دائن) کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

د- ”أن البیع بالوفاء فی حکم الدین فی کل شأن من شئونه وعلیه، فلیس لأحد من البائع والمشتري أن یبیع مبیع الوفاء من آخر بدون إذن آخر حتی لو باعه البائع من آخر، بیع و فاءً أو بیعاً باتاً وسلمه إیاه، فلا یکون صحیحاً ولکل واحد من الطرفين بیعه بإذن الآخر، فإذا باع إنسان ماله المباع بیع و فاء من آخر بیعاً باتاً وأجازہ المشتري الوفائی کان جائزاً“ (دررالحکام)۔

لہذا مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ مشتری بائع کی اجازت سے بیچ سکتا ہے اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں اگر مزید قیمت لے تو اس کا بائع کو لوٹانا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ من و جبرہن کے حکم میں ہے۔

۲- اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو شامی کی عبارت: ”لا یحل أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له فی الربا، لأنه یتوفی دینہ کاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً فیکون ربا، وهذا

امر عظیم“۔ اس پر دال ہے کہ رہن سے نفع اٹھانا بالکل ناجائز اور حرام ہے بحکم سود۔

الف۔ جب اس کو رہن قرار دیا جائے تو خریدار کا فائدہ اٹھانا حرام ہے اور اگر اس نے اس سے جو نفع کمایا ہے اگر وہ رہن کے قرض کو کافی ہو جاتا ہے تو اب مرتہن مرہونہ کو واپس کر دے اور وہ رہن کے پاس کچھ نہیں مانگ سکتا، ہاں البتہ اگر کم نفع کمایا ہے (قرض سے) تو پھر جتنی مقدار کم ہے اتنی مقدار رہن کے ذمہ لازم ہے اور اگر زیادہ نفع کمایا ہے (قرض سے) تو مرتہن کے ذمہ اس زائد رقم کا واپس کرنا لازم ہے (مستفاد فتویٰ عثمانی)۔

ب۔ مالک مکان کا کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر رقم لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ اس رقم کی حیثیت کی تعیین پر ہے اس کی شروعات تو ضمانت اور رہن کے نام پر ہوئی تھی، بسا اوقات کرایہ دار مکان یا دکان کا کرایہ باقی چھوڑ کر غائب ہو جاتا تھا اور مالک مکان کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا، اس مصیبت سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کسی عقد اجارہ کرتے وقت کرایہ دار سے متعین رقم ایڈوانس لی جائے گی کہ خدا نخواستہ آئندہ چل کر اگر کرایہ دار کرایہ کی رقم باقی چھوڑ کر غائب ہو گیا تو اس ایڈوانس یا ڈپازٹ کے نام سے لی گئی رقم سے وہ بقایا کرایہ وصول کیا جاسکے، اس صورت میں اس رقم کی حیثیت رہن کی ہو جائے گی اور شرعاً اس طرح رہن لینا درست ہے۔ ”ولو استاجر داراً أو شیئاً وأعطی بالاجور دهنًا جاز“ (ہندیہ)، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کرایہ دار مکان کو نقصان پہنچا دیتا ہے یا بجلی وغیرہ کے واجبات چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو بعد میں مالک مکان کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بھی کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر ایک رقم ایڈوانس وصول کی جاتی ہے۔ گویا یہ ایک نوع کا زر ضمانت ہے، جیسا کہ مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے تصریح فرمائی ہے۔ لیکن بعد میں لوگوں نے جب دیکھا کہ ڈپازٹ کے نام پر وصول کی جانے والی یہ رقم مالک مکان کے پاس یوں ہی پڑی رہتی ہے کسی استعمال میں نہیں آتی تو مالکان مکان جن کے قبضہ میں یہ رقم تھی۔ انہوں نے بلا اجازت اس رقم کو استعمال کرنا شروع کیا جب اس کا رواج عام ہونے لگا تو دینی ذہن رکھنے والے مالکان مکان کو یہ بات کھٹکی کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ ایسے لوگوں نے کرایہ داروں سے اجازت لینا شروع کیا اور انہوں نے بھی اجازت دینا شروع کیا، کرایہ داروں میں سے کچھ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ ہماری رقم سے جو بطور امانت و ضمانت مالک مکان کے پاس جوں کی توں محفوظ رہنی چاہئے، مالک مکان ہماری اجازت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو ہم کیوں نہ اس کو دی جانے والی اجازت سے فائدہ اٹھائیں؟ چنانچہ انہوں نے اس شرط پر اجازت دینا شروع کیا کہ اس اجازت کی بنیاد پر کرایہ میں کچھ کمی کر دی جائے، یعنی عام طور پر اس جیسے مکان کی جو اجرت مثل ہونی چاہئے، اس کے بجائے ڈپازٹ کے طور پر دی گئی رقم کو استعمال کرنے کے بدلہ میں اس اجرت مثل کی مقدار میں کمی کی شرط لگائی جائے اور آج کل جو معاملات ہو رہے ہیں اس کی بنیاد یہی ذہنیت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ معاملہ درست کہلا یا جاسکتا ہے؟ کچھ لوگوں نے ڈپازٹ کی رقم خوب بڑھا کر اور اس کے استعمال کی اجازت دے کر مالک

مکان سے پورا کرایہ ہی ساقط کروالیا یا مروجہ کرایہ میں سے کمی کی گئی، گویا یہ صاحب اپنی رقم ایک مدت کے لئے مالک مکان کو استعمال کے لئے دے رہے ہیں اور اس کے بدلہ میں اس مدت کے لئے مکان و دکان سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ظاہر ہے ان کی طرف سے جو رقم دی گئی ہے وہ قرض کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بدلے میں یہ آدمی قرض لینے والے کے مکان سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور قرض پر دی گئی رقم کے بدلہ میں فائدہ اٹھانا سود و حرام ہے۔ درمختار میں علامہ حسکفی نے ”الاشباہ والنظائر“ کے حوالے سے لکھا ہے: ”کل قرض جو نفعاً فہو حرام“ اسی طرح مفتی لدھیانوی یوسف صاحب فرماتے ہیں:

مالک مکان کا کرایہ دار سے ایڈوانس رقم لینا امانت ہے یا قرض؟

ہے تو امانت، لیکن اگر کرایہ دار کی طرف سے استعمال کی اجازت ہو (جیسا کہ عرف میں یہی ہے) تو یہ قرض شمار ہوگا۔ مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو یہ صورت جائز نہیں ہے۔

جب اس کو رہن قرار دیا گیا تو اس سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا اور اس کو بیچنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر رہن اجازت دے تو بیچ سکتا ہے، لیکن مرتہن اتنی ہی قیمت کا مالک ہوگا جتنی اس نے بطور قرض دی ہے، مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوگا کہ اگر ضمانت رقم کو رہن قرار دیا جائے تو اس سے فائدہ اٹھانا اور اس کو استعمال کرنا جائز نہیں۔ اور رہا امانت کا مسئلہ کہ اس میں عرف کے جاری ہونے کی وجہ سے (استعمال کا عرف) امانت نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ قرض ہے، جیسا کہ مفتی یوسف صاحب لدھیانوی نے فرمایا، لہذا یہ اب قرض ہے تو اس کی وجہ سے یا تو بالکل کرایہ نہ لینا یا کرایہ میں مروجہ کرایہ سے بہت کم لینا جائز نہ ہوگا کیونکہ یہ قرض سے ایک قسم کا فائدہ اٹھانا ہے جو بالکل حرام اور ناجائز بحکم سود ہے۔

بیع و فاء (بیع بشرط واپسی) کا شرعی حکم

مولانا قمر الزماں ندوی ☆

بیع و فاء کی تعریف:

بیع و فاء کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں (زیادہ تعریفات باہم متقارب ہیں صرف تعبیرات کا فرق ہے) بیع الوفاء کی چند تعریفیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

”بیع الوفاء“ یہ ہے کہ کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب بائع (فروخت کنندہ) ثمن مشتری (خریدار) کو لوٹا دے گا تو بیع اسے واپس کر دی جائے گی (مباحث فقہیہ ص: ۴۰۸)۔

مجلہ عثمانیہ (۱۱۸) میں ہے: بیع الوفاء یہ ہے کہ مال کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب ثمن واپس کر دے گا تو مشتری اسے بیع لوٹا دے گا (شرح الجملہ ص: ۶۷ بحوالہ مباحث فقہیہ)۔

بیع و فاء کی جامع تعریف یہ کی گئی ہے کہ ”بیع الوفاء“ ایک ایسا عقد ہے جس میں بائع یہ شرط لگاتا ہے کہ جب وہ مشتری کو ثمن لوٹا دے گا تو بیع اسے واپس کر دی جائے گی، چاہے ثمن نقد کی صورت میں ہو یا دین (قرض) کی صورت میں (نظریہ العرف ص: ۱۱۸ بحوالہ مباحث فقہیہ ص: ۴۰۹)۔

بیع الوفاء کی اس تعریف میں اعیان منقولہ اور غیر منقولہ سب شامل ہیں، البتہ شیخ مصطفیٰ زرقاء کے نزدیک بیع الوفاء عقار (غیر منقولہ اشیاء) کے ساتھ خاص ہے، لہذا منقول کے اندر بیع الوفاء کی صورت اس سے خارج ہوگی۔

بیع و فاء کی تعریف اور تفصیلات کو ذکر کرنے کے بعد اب اکیڈمی کی جانب سے سوالات کے جواب لکھے جا رہے ہیں:

۱- بیع و فاء دراصل رہن ہے:

”بیع الوفاء“ حقیقت کے لحاظ سے رہن ہے، اور فقہاء نے اس کو رہن کی حیثیت ہی سے جائز رکھا ہے، اس لئے اس پر بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے، بلکہ رہن کے احکام جاری ہوں گے، وہ احکام یہ ہیں: مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا، بائع کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع بھی نہیں کر سکتا، اس کے منافع کو اگر استعمال کرے، یا بیع درخت ہو اسے تلف کر دے

تو وہ اس کا ضامن ہوگا، بیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں بائع سے دین ساقط ہو جائے گا۔ اگر بیع کی مالیت مقدار دین سے زائد ہو تو ہلاک ہونے کی صورت میں زائد کا تاوان اس پر واجب نہیں ہوگا (صرف دین ساقط ہو جائے گا) جیسا کہ امانت میں ہوتا ہے۔ جس وقت بائع قرض ادا کر دے بیع اسے لوٹا دی جائے گی۔ اسی طرح زمین یا مکان وغیرہ فروخت ہو تو حق شفیعہ اصل مالک ہی کو ہوگا۔ اس خریدار کو جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کی امین کی ہے اور جسے فقہ کی اصطلاح میں مرہن سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے استفادہ کا کچھ حق نہیں ہوگا، کیونکہ مال مرہن سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

۲- بیع و فاء میں (بیع) مال مرہن سے فائدہ اٹھانے کا حکم:

الف- اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے پاس وہ مال مرہن کے حکم میں ہے، اس لئے اس سے فائدہ اٹھانا از روئے شریعت جائز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر بیع و فاء میں عقد کے وقت بیع سے انتفاع کی کسی جہت سے کوئی شرط نہیں لگائی اور بعد میں بائع نے اپنی خوشی سے انتفاع کی اجازت دے دی تو ایسی صورت میں احقر کے نزدیک مشتری کے لئے شیبی مرہون سے انتفاع کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ بعض علماء نے عقد رہن میں اس صورت میں شیبی مرہون سے انتفاع کی اجازت دی ہے، جبکہ بعض علماء کے نزدیک اس صورت میں بھی انتفاع ناجائز ہے، البتہ اگر شیبی مرہون سے انتفاع کا رواج عام ہو تو ”المعروف کالمشروط“ کے تحت بیع و فاء میں بھی عقد رہن کی طرح مرہن سے انتفاع جائز نہیں ہوگا۔

البتہ اگر بیع و فاء کو اجارہ کی شکل دے دی جائے (عقار وغیرہ میں) تو اس صورت میں زمین، مکان وغیرہ سے انتفاع کی شکل نکل سکتی ہے اور وہ از روئے شریعت درست اور جائز بھی ہوگی، مثلاً اگر روپے قرض دینے والا روپے بطور قرض دے دے اور قرض لینے والا قرض دینے والے کو اپنی زمین دے، اور ان دونوں کے درمیان اجارہ کی تمام شرطوں کے ساتھ معاملہ طے پائے کہ اتنے دنوں کے لئے زمین لی جا رہی ہے، اس کی اجرت متعین ہو جائے کہ اس کی سالانہ یا ماہانہ اجرت اتنی ہوگی، خواہ وہ روپے کی شکل میں ہو یا غلہ کی شکل میں ہو، تو اس طرح اس زمین سے قرض دینے والے کے لئے فائدہ اٹھانا شرعاً جائز اور درست ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں شیبی مرہون سے انتفاع نہیں ہوا، بلکہ اجارہ کی صورت میں اس کی اجرت دے کر فائدہ اٹھانا ہوا جو جائز ہے، اب خواہ اجرت کی رقم قرض دینے والا مالک زمین کو دیتا ہے یا قرض کی رقم سے منہا کرتا رہے دونوں صورتیں صحیح ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق رہن رکھی جانے والی چیز کی حیثیت محض ایک ضمانت کی ہوتی ہے اور رہن رکھے جانے کے بعد بھی وہ شیبی اصل مالک ہی کی ملک ہوتی ہے اسی طرح اس شیبی میں اضافہ یا جو کچھ نفع ہو وہ بھی اصل مالک کی ملک قرار پاتی ہے، البتہ شیبی مرہون کی حفاظت، افزائش وغیرہ میں جو اخراجات آئیں گے وہ سب (بائع) اصل

مالک کو دینا پڑے گا۔ اگر شہی مرہون کے طور پر گھر ہو تو متقدمین فقہاء قرض دینے والے کو اس سے استفادہ کی اجازت دیتے تھے، البتہ فقہاء متاخرین کے یہاں اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس زمانے میں اس کی حیثیت قرض دہندہ کی طرف سے ایک طرح کی شرط ہوتی ہے اور فقہاء کا اصول ہے: ”المعروف كالمشروط“ کہ جو چیز عرف و رواج کی حیثیت اختیار کر لے وہ شرط کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

ب۔ بیع و فاء میں خریدار (قرض دہندہ) کا مکان یا کم کرایہ ادا کرنے کا حکم:

اگر بیع و فاء میں قرض دہندہ کو بائع نے مکان بیچا ہے جو مکان کہ مشتری (قرض دہندہ) کے پاس بطور رہن ہے اب اگر مشتری کو کرایہ پر مکان کی ضرورت ہے تو اس مکان کو مروجہ کرایہ پر لے لے لینا جائز ہوگا، لیکن اگر خریدار مروجہ کرائے سے کم کرایہ دیتا ہے تو شرعاً یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں قرض دے کر اس قرض کی بنیاد پر نفع اٹھانا جائز ہے، ”کل قرض جرنفعاً فهو ربا“، البتہ اگر بائع اپنی رضامندی سے بغیر کسی خارجی یا داخلی دباؤ کہ محض اپنی طرف سے یہ سوچ کر کہ ”ہل جزاء الاحسان الی الاحسان“ قرآنی ضابطہ ہے کرایہ کم لے تو کچھ بھی حرج نہیں ہونا چاہئے۔

عام حالت میں کم کرایہ ادا کرنا گویا قرض سے فائدہ اٹھانا ہے جو سراسر ناجائز ہے، علامہ ابن عابدین شامی نے فتح القدیر سے نقل کیا ہے:

”لا یحل له أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له فی الربا...
والغالب من أحوال الناس أنهم یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط“ (خلاصۃ الفتاویٰ ۱۸۶/۲ بحوالہ جدید فقہی مسائل ۴۲۶/۱)۔

ج۔ اگر اس عرصہ میں خریدار اس شہی سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت یا اجارہ داری وغیرہ) اٹھانا چاہے تو از روئے شرع اس کی گنجائش نہیں ہوگی، کیونکہ یہ بھی قرض دے کر اس سے فائدہ اٹھانے کی طرح ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے، (البتہ عقد اجارہ کے طور پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے فائدہ اٹھا سکتا ہے)۔

د۔ خریدار کو اس کو (بیع) بیچنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ بیع و فاء میں بیع مشتری کے پاس امانت ہے، اور امانت کو بغیر مودع کی اجازت کے بیچنا شریعت میں درست نہیں ہے، اور پھر بیع و فاء میں اس کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے کہ بائع بیع کو اپنی ملکیت سے نہ نکلنے دینے ہی کی وجہ سے بیع وفا کر رہا ہے کہ مشتری اس کو کسی دوسرے سے فروخت نہ کرے۔ ورنہ بیع وفا کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

البتہ اگر اس درمیان بائع اس کو بیچنے کی اجازت دے دے تو وہ اس سامان کو فروخت کر سکتا ہے اگر اس نے قیمت متعین کر دی، اور مشتری نے اس سامان کو اس سے زیادہ قیمت میں فروخت کر دیا تو وہ قیمت یا فائدہ مشتری کا ہوگا اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، اگر مشتری نے بائع کی مرضی کے بغیر اس کو فروخت کر دیا تو یہ بیع موقوف کے درجہ میں ہے اگر بائع

بغیر کسی دباؤ اور ڈروخوف کے اس کی اجازت دے دے تو یہ بیع درست ہو جائے گی۔

۳۔ کثیر رقم ضمانت کی وجہ کم کرایہ پر معاملہ طے کرنا:

آج کل پوری دنیا میں اور خاص طور پر بڑے شہروں میں یہ معاملہ عام ہے کہ کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے، تو حق ہے اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے، لیکن مالک پانچ سو روپے یا ایک ہزار روپے کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لئے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے، تو کیا از روئے شرع یہ معاملہ درست ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی قرض دے کر اس سے فائدہ اٹھانا از روئے شرع درست نہیں ہے اور اگر زر ضمانت کی حیثیت امانت درہن مان لیا جائے تو بھی امانت اور رہن سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے، لیکن آج کل یہ صورت عموم بلوی کی شکل اختیار کر چکا ہے اور لوگوں کا تعامل اس پر بہت زیادہ ہے، اس لئے علماء کرام کو اس مسئلہ پر نئے زاویے سے سوچنا ہوگا اور ”الحرج مدفوع شرعاً“ کے ضابطہ کو سامنے رکھ کر مسئلہ کو حل کرنا پڑے گا۔

احقر کی رائے میں اگر مکان و دکان کا مالک قرض دہندہ کی کثیر رقم ضمانت سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور اپنے کاروبار کو وسعت دے رہا ہے اور کثیر رقم ضمانت کے بے پناہ اور اتنا فائدہ ہی کے بنیاد پر وہ مروجہ کرایہ سے کم لینے پر راضی ہے اور اس کا اس پر راضی ہونے سے (اس کا) نقصان بھی نہیں ہو رہا ہے، بلکہ دوسری طرف سے اس کی مکاحقہ بھری پائی ہو رہی ہے، اس لئے اس کثیر رقم ضمانت کی بنیاد پر کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہونی چاہئے اور اسے قرض سے فائدہ اٹھانا نہیں سمجھا جانا چاہئے، اس طرح کے معاملہ کرنے میں کوئی غرر اور دھوکہ بھی نہیں ہے، اور فقہی قاعدہ ”لا ضرر ولا ضرار“ کے ضمن میں بھی نہیں آتا، بلکہ شریعت میں ایسے موقع پر گنجائش اور وسعت کی راہ دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ”یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر“ (سورۃ بقرہ: ۱۸۵)، ”لا یكلف اللہ نفساً الا وسعها“ (سورۃ بقرہ: ۲۸۶)، ”وما جعل اللہ علیکم فی الدین من حرج“ (سورۃ حج: ۷۸)، فقہاء نے ایسے ہی مواقع کے لئے مندرجہ ذیل قواعد کو مستنبط کیا ہے، ”المشقة تجلب التیسیر“، ”إذا ضاق الأمر اتسع“، ”وإذا اتسع ضاق“، ”الضرر یزال“، ”الضرورات تبیح المحظورات“، ”الحاجة تنزل منزلة الضرورة“۔

البتہ یہ آسانی مبتنی بہ کی حالت اور پوزیشن کو دیکھتے ہوئے دی جائے گی کہ اگر قرض دے کر فائدہ اٹھانا کسی کی مجبوری اور کسی کی غربت سے فائدہ اٹھانے پر مبنی ہو تو اس صورت میں اس کی اجازت تو بالکل نہیں ہوگی کہ سود کی حرمت کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر یہ دیکھا جائے گا کہ کرایہ کم کرنے پر وہ مجبور ہے اور اس مجبوری کا فائدہ قرض دہندہ اٹھا رہا ہے تو اس صورت میں یہ معاملہ درست نہ ہوگا۔

بیع بالوفاء مسائل اور احکام

مولانا حفیظ الرحمن مدنی ☆

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں؟ اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

فقہی نصوص کی روشنی میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ معاملہ منعقد اور درست ہے اور یہ صورت بیع ہے لیکن حکماً رہن ہے (ردالمحتار علی الدر المختار ۷/۵۳۶ ذکر یا بکڈ پوسہار پور، الفتاویٰ العالیگیریہ الہندیہ ۲۰۹/۳ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان، البحر الرائق ۶/۱۱ باب خیار الشرط ذکر یا بکڈ پوسہار پور)۔

ردالمحتار میں بیع الوفاء کی تفصیل مذکور ہے، اور راجح یہی ہے کہ یہ صورت بیع ہے، مگر حکماً رہن ہے، لہذا اس سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے ”کل قرض جو نفعاً حرام“ (ردالمحتار علی الدر المختار ۷/۳۹۵ ذکر یا بکڈ پودوبند)۔
الف- بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے کو نہ بیچا جائے، بائع ہی کو بیچا جائے اس کا کیا حکم ہے:
عالگیری کی عبارت (۲۰۹/۳) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں واپسی کی شرط کا ذکر بطریق وعدہ ہے، لہذا یہ جائز ہے، اور وعدہ کا پورا کرنا ضروری ہے، دوسرے کو بیچنے میں وعدہ خلافی ہے، لہذا یہ جائز نہیں ہے۔

”يقول النسبى عليه السلام العدة دين، فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس“ (زلیلی ۵/۱۸۴ بحوالہ فتاویٰ

مجمودیہ ۲۳/۲۸۰)۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زیادہ کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے:

مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ حکماً رہن ہے، اور ادا کردہ قیمت قرض بعوض رہن ہے، لہذا اس سے زیادہ وصول کرنا سود میں داخل ہوگا، جیسا کہ فقہاء کا اصول ہے۔

نیز ”ردالمحتار“ میں ہے: ”کل قرض جو نفعاً حرام“ (ردالمحتار علی الدر المختار ۷/۳۹۵ ذکر یا بکڈ پودوبند)۔

ج- خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہے؟
 خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو بغیر مالک کی اجازت کے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، اور اگر فائدہ اٹھایا تو اس نفع کی جتنی اجرت ہوگی قرض میں سے محسوب ہوگی اور خریدار کو اتنا قرض میں سے کم کرنا پڑے گا۔

دلیل: ”مطلب فی البیع بالوفاء وحيلة الربا۔ و ذکر عن شیخ الإسلام عن السيد الإمام أبي شجاع والقاضي الحسن الماتريدي- إن البیع الذی سموه بیع الوفاء احتیالاً للربا رهن فی الحقیقة والمشتوی مرتهن الخ-“ (الملاحظ فی الفتاوی الحنفیة لأبی القاسم اسمرقندی ۳۲۶، مطبوعہ بیروت) بقیہ تفصیل اگلے جواب میں ہے۔

د- خریدار اگر کسی چیز کو بیچ دے تو اس بیچ کا کیا حکم ہوگا، اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟
 خریدار اگر بیچ دے تو یہ بیچ نافذ نہیں ہوگی، اس لئے کہ بائع کی اجازت کے بغیر اس سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اور اس شی کے عین یا نفع سے تصرف کا ضمان ہوگا، اور اس کے بقدر دین سے ساقط ہوگا، حتیٰ کہ اگر وہ شی ہلاک ہوگی تو قرض کی ادائیگی بھی ساقط ہو جائے گی (الملاحظ فی الفتاوی الحنفیة ص ۲۲۷، رد المحتار ۵۴۶/۷)۔

۲- بیع وفا کو رہن قرار دینے کی صورت میں چار شقیں مذکور ہیں:

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی۔

علامہ ابن عابدین شامی نے اس کی کئی صورتیں ذکر کی ہیں:

بیع فاسد، بیع جائز، بیع غیر نافذ، اور اس میں راجح یہ ہے کہ بیع بالوفاء درحقیقت رہن ہے، اور اکثر فقہاء نے اس کو رہن قرار دیا ہے، ”فتاوی عالمگیری“ میں بھی یہی ہے، صاحب ”البحر الرائق“ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، نیز صاحب ”المحیط البرہانی“ نے اس کے رہن ہی ہونے کو ترجیح دی ہے، اور بیع کے عنوان سے جو اس کو درست مانا ہے، وہ ضرورہ حاجت مند کی بھی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے، اور جب یہ رہن ہے تو اسپر تمام احکام رہن ہی کے جاری ہوں گے، اور تا واپسی خریدار کو بغیر بائع کی اجازت کے اس سے انتفاع جائز نہیں ہوگا۔

دلیل صاحب الملاحظ نے لکھا ہے: ”والناس یسمونه الرهن والعبرة للمقاصد لا للألفاظ“ (الملاحظ فی

الفتاوی الحنفیة ۲۲۷)۔

نیز صاحب رد المحتار کی طویل عبارت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، اور بلحاظ حاجت جواز کی طرف اشارہ ملتا ہے، (تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار ۵۴۶/۷ زکریا بکڈ پوڈیو بند) ”نوع فیما یتصل بالبیع الفاسد وهو بیع الوفاء

الخ“ (المحرر الرائق كوتبہ ۳/۴۰۵، ۴۰۶)۔

فقہاء نے بیع و فاء کو اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے (حلال و حرام ص ۳۷۴)۔

ب- اگر خریدار اس طریقہ پر خرید لے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی۔

خریدار کو عقد شراہ کے ساتھ عقد اجارہ کو ضم کرنا جائز نہیں، کیونکہ فقہاء نے صفتہ علی صفتہ کو درست نہیں قرار دیا ہے، ”بدائع الصنائع“ کے اندر، نیز اصولی کتابوں ”ہدایہ“ وغیرہ میں یہی لکھا ہے۔

اور اگر فرضاً اجارہ کی صورت مان لی جائے تو بھی یہ غبن کی صورت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے، شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ تاجر نہ نفع کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ محتاج کی ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے خود گراں بیچا جائے، دوسرے یہ کہ معمولی نفع لیا جائے، نفع کی یہ دوسری صورت تمدنی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور برکت کا باعث بھی (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۲۷۱، بحوالہ حلال و حرام ص ۲۵۰)۔

ج- اس عرصہ میں خریدار اس شئی سے کس طرح کا فائدہ (کاشت یا اجارہ داری) وغیرہ کا حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

چونکہ یہ معاملہ رہن کا ہو جاتا ہے، کیونکہ فقہائے بیع و فاء کو اس کے غیر معمولی تعامل اور بعض دوسری قباحت کی وجہ سے رہن کی حیثیت سے جائز قرار دیا ہے۔

لہذا اس مدت میں خریدار کو اس سے کسی طرح کا فائدہ کاشت یا اجارہ کا حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

دلیل: ”مطلب فی بیع الوفاء وحیلۃ الربا“ و ذکر عن شیخ الإسلام عن السید الإمام أبی شجاع والقاضی الحسن الماتریدی: إن البیع الذی سموه بیع الوفاء احتیالاً للربا رہن فی الحقیقا والمشتري مرتهن لا یملکہ ولا یطلق له الانتفاع إلا بإذن البائع الخ..... والناس یسمونه الرهن—والعبارة للمقاصد للألفاظ“ (المختلط فی الفتاوی الحنفیۃ لأبی القاسم محمد بن یوسف السمرقندی دارالکتب العلمیۃ بیروت ۲۲۷/۲۲۶، الفتاوی العالمگیریہ ۳/۲۰۹، کونہ فتاوی قاضی خاں، علی ہاشم العالمگیریہ ۶/۲۷۱-۲۰۷)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟ اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟

جس طرح خریدار اس مدت میں کاشت یا اجارہ کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ہے، اسی طرح بیچنے کا حق بھی نہیں رکھتا ہے، کیونکہ یہ سب مشتری کے ذاتی تصرفات میں سے ہے جو مشتری کی ملکیت کا تقاضا کرتا ہے، اور رہن قرار دیئے جانے کی

وجہ سے شی مرہون میں مرہن کی ملکیت ثابت ہے نہیں۔

دلیل: اس پر سابق نصوص سے روشنی حاصل ہوتی ہے، ”قال فی الخیریة: والذی علیہ الأکثر أنه رهن لا یفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام“ (رد المحتار علی الدر المختار ۷/۵۳۶)۔

۳- آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی، یا ایسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

مذکورہ سوال میں زر ضمانت کی حیثیت، امانت و رہن کی نہیں ہو سکتی، کیونکہ زر ضمانت ادا کرنے والا دوکان یا مکان کا کرایہ ادا کرتا ہے، اور وصول کرنے والا مالک اس زر ضمانت میں تصرف کرتا ہے، جبکہ شی مرہون یا امانت میں تصرف جائز نہیں ہے، اور اگر بغیر تعدی کے ضائع ہو جائے تو تاوان واجب نہیں ہوتا ہے، اور یہاں قصد آس میں تصرف و تعدی پائی جاتی ہے، جس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔

لہذا یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس کو قرض قرار دیا جائے گا، گویا کہ کرایہ کے ساتھ قرض کی شرط ہے، البتہ اجارہ شرط فاسد سے فاسد ہو جاتا ہے، لیکن اس میں ضروری ہے کہ اس میں تین چیزوں میں کوئی چیز ہو، اولاً یہ کہ اس میں عاقدین میں سے کسی کے لئے منفعت ہو، دوم: یہ کہ وہ شرائط ایسی ہوں کہ اس کی وجہ سے آئندہ نزاع کا قوی امکان ہو۔ سوم: یہ کہ وہ شرط رواج کا درجہ نہ اختیار کر چکی ہو، اسی طرح جب شرط رواج کا درجہ اختیار کر لے تو وہ اجارہ کی صحت میں مانع نہیں ہوگی۔

دلیل: ”رجل استاجر عبدا کل شہر بكذا علی أن یکون طعامه علی المستاجر، أو دابة علی أن یهکون علفها علی المستاجر، ذکر فی الکتاب أنه لا یجوز، قال الفقیه أبو اللیث فی الدابة: فأخذ بقول المتقدمین، أما فی زماننا فالعبد یأکل من مال المستاجر عادة کذا فی الظهریة“ (الفتاویٰ الہندیہ العالمگیریہ مطبوعہ کوئٹہ ۲/۴۲۲)۔

فقہ ابو اللیث نے تعامل اور عادت ہی کا اعتبار کیا ہے، اور یہ بات تجربات و مشاہدات سے ثابت ہے کہ اس شرط نے رواج کا درجہ پالیا ہے، اس لئے اس کو شرط فاسد کے درجہ میں رکھنا صحیح نہیں ہے۔

اور زر ضمانت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے کم کرایہ طے کرنا درحقیقت یہ کرایہ میں کی جانے والی کمی ہے جو جائز ہے، قرض کے بدلے فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔

اور اجارہ کے صحیح ہونے کے لئے شرط یہی ہے کہ جتنا کرایہ عاقدین کے درمیان طے ہو جائے وہی اجارہ ہے، اس کی تفصیل کتاب ”الفقہ الاسلامی وادلتہ“ (ڈاکٹر وہبہ زحیمی ۵/۳۸۰ تا ۳۸۲) میں مذکور ہے، اور اس میں فساد اجارہ کا سبب اجرت کی کمی کو نہیں ذکر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بدائع الصنائع (ص ۱۹۳-۱۹۴) کے حوالے سے لکھا ہے: ”أما شروط الأجرة فهي اثنان: أولاً أن تكون الأجرة مالا متقوما معلوما ، ثانياً: أن لا تكون الأجرة منفعة هي من جنس المعقود عليه“۔

نیز انہوں نے (مجمع الفقہ الاسلامی ج ۶ رقم ۶ عام ۱۴۰۸ھ ۱۹۸۸ء) کی قرارداد بھی ذکر کی ہے: ”إذا اتفق المالك والمستاجر على أن يدفع المستاجر للمالك مبلغاً مقطوعاً زائداً عن الأجرة الدورية، فلا مانع شرعاً من دفع هذا المبلغ المقطوع على أن يعد جزءاً من أجرة المدة المتفق عليها“ (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۵/۳۸۲۲-۳۸۲۷)۔

مذکورہ نصوص فقہیہ کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ کم کرایہ اور اجرت کا معاملہ کرنا بھی صحیح ہے، اس میں قباحت نہیں ہے، البتہ اگر فریق ثانی راضی نہ ہو تو مکروہ ہو سکتا ہے۔



بیع و فاء کے سلسلہ میں فقہاء کی آراء

مولانا عبدالرحمن مفتاحی ☆

فقہاء کی اصطلاح میں بیع و فاء اس بیع کو کہتے ہیں جس کا انعقاد اس شرط کے ساتھ ہو کہ جب بائع ثمن کو لوٹائے گا تو مشتری کو بیع لوٹانا ہوگا۔ اس بیع کو بیع و فاء لئے کہتے ہیں کہ مشتری کو شرط پورا کرنا لازم ہوتا ہے (موسوعہ فقہیہ ۲۶۰/۹)۔

بیع و فاء کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تم کو مثلاً یہ مکان ۲۰۰۰ روپے کے عوض اس شرط پر فروخت کیا کہ جب میں ثمن لوٹاؤں گا تو تم کو مکان واپس کرنا ہوگا۔ ”و صورتہ ان یقول البائع للمشتري: بعث منك هذا العين بدین لك علی، علی انی متی قضیت الدین فہو لی، أو یقول البائع: بعثك هذا بكذا علی انی متی دفعت لك الثمن تدفع العین الی، كذا فی البحر الرائق“ (فتاویٰ ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

بیع و فاء کے سلسلہ میں فقہاء کی رائیں مختلف ہیں:

ایک رائے کے مطابق یہ بیع صحیح ہے، مشتری کو بیع سے بجز بیع کے ہر قسم کا انتفاع جائز ہے، ان حاملین رائے نے لوگوں کی حاجت اور تعامل کو مد نظر رکھتے ہوئے استصناع پر قیاس کیا ہے، ”والاستصناع جائز فی کل ما جرى التعامل فیہ، كالقلنسوة والخف والأوانی المتخذة من الصفر والنحاس وما أشبه ذلك“ (فتاویٰ ہندیہ ۲۰۷/۳)۔

نوٹ: تعامل کی وجہ سے اس کو جائز قرار دینا صحیح نظر نہیں آتا، کیونکہ مال رہن سے نفع اٹھانا سود کے دائرے میں آتا ہے، اور تعامل کی وجہ سے سود اور محرّمات منصوصہ میں کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے؛ کیونکہ اس بیع کے ساتھ ثمن کی ادائیگی کے وقت واپسی بیع کی شرط لگی ہوئی ہے، جو تقاضائے عقد اور حکم بیع کے خلاف ہے۔ بیع صحیح کا حکم یہ ہے کہ بیع بائع کی ملکیت سے منتقل ہو کر مشتری کی ملکیت میں چلی جائے، اور مشتری کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہو جائے، جب کہ سوائنامہ میں مرقومہ صورت ایسی نہیں ہے؛ اس لئے یہ شرط فاسد ہے، اور شرط فاسد سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، اس کا فسخ واجب ہو جاتا ہے:

”ولا بیع بشرط لا یقتضیہ العقد ولا یلائمه وفيه نفع لأحدهما أو للمبیع من أهل الاستحقاق، ولم یجر العرف به ولم یرد الشرع بجوازه“ (شامی کراچی ۸۵/۵، نعمانی ۱۲۰/۳، مجمع الانہر ۹۰/۳)۔

تیسری رائے یہ ہے کہ بیع وفا صورتاً تو بیع ہے، مگر حقیقتاً رہن ہے؛ کیونکہ اس پر رہن کا معنی صادق آتا ہے، اور عقود میں معانی ہی کا اعتبار ہے نہ کہ الفاظ و مبانی کا، جیسا کہ ہدایہ اولین (ص: ۳۱۳) پر ہے: ”والعبارة فی العقود للمعانی“ اسی ضابطہ کے پیش نظر ہبہ بشرط عوض بیع ہے، کفالہ بشرط براءت اصیل حوالہ ہے، اور حوالہ بشرط عدم براءت اصیل کفالہ ہے، اسی طرح بیع وفاء بھی صورتاً اور لفظاً بیع ہے، مگر حقیقتاً اور معنماً رہن ہے، اور اس پر رہن کے ہی احکام جاری ہوں گے:

”فی الشامی: وفي حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی: هو أن یقول: بعت منك علی أن تبیعہ منی منی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل وهو رهن، وحكمه حکم الرهن، وهو الصحيح“ (در مختار مع الشامی ۲۷۶/۵ مطلب فی بیع الوفاء قبیل کتاب الکفالة، شامی زکریا ۵۴۵/۷ باب الصرف، مطلب فی بیع الوفاء، عالمگیری کوئٹہ ۲۰۹/۳ کتاب البیوع)۔

راقم الحروف کا نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ بیع کی اس صورت کو باطل ہونا چاہئے، یہ رہن کے حکم میں ہے، لہذا قرض دینے والا اپنے قرض کی ضمانت کے طور پر اس شے کو اپنی تحویل میں رکھ سکتا ہے، لیکن اس کی مناسب اجرت ادا کئے بغیر اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا۔

اسی لحاظ سے سوالنامہ میں مذکور تمام جزئیات کا جواب تحریر کیا جاتا ہے:

الف- جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے، اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا؛ کیونکہ یہ شے مرہون ہے اور شے مرہون سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، ”ولیس للمرتہن الانتفاع بالرهن باستخدام ولا بسکنی ولا بلبس“ (مجمع الانہر ۲۷۳/۴ کتاب الرهن، در مختار مع الشامی زکریا ۸۲/۱۰، ۸۳ کتاب الرهن)۔

ب- اگر خریدار مروجہ کرائے سے کم کرایہ ادا کرے گا تو جائز نہیں ہوگا؛ کیونکہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہوگا، اور ”کل قرض جر نفعاً حرام“ کے تحت داخل ہو کر حرام ہوگا۔ حدیث میں ہے: ”کل قرض جر نفعاً فهو ربا“ (الجامع الصغیر ۲/۲۸۴)۔

ج- اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا ہے، ”لا یحل له أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن فی الربا“ (شامی کراچی ۲۸۲/۶ زکریا ۸۳/۱۰ کتاب الرهن، زیلعی ۶۷۷/۶، البحر الرائق کوئٹہ ۲۳۸/۸)۔

د- خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا ہے؛ کیونکہ بائع ہی اصل مالک ہے، اس لئے جب تک اس کی اجازت نہ ہو،

اس کو فروخت نہیں کیا جاسکتا، ”ولیس للمرتھن أن یبیعہ إلا برضاء الراهن، لأنه ملکہ ومارضی بیعہ“ (الہدایۃ علی ہاشم فتح القدیر ۵/۵۳۸)، اگر اس کی اجازت سے بیچنے کی نوبت آئے تو ثمن کی حد تک قیمت لی جاسکتی ہے، بقیہ محفوظ کر لیا جائے اور بائع کے حوالے کر دیا جائے؛ کیونکہ وہی اصل مالک ہے، اور شیئ مرہون ہے۔

۳- زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز نہ ہوگی، یہ قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا جو کہ حرام ہے، حدیث میں ہے: ”کل قرض جر نفعاً فهو حرام“ (الجامع الصغیر ۲/۲۸۴)۔



بیع و فاء کے بیع اور رہن ہونے کا مسئلہ

مفتی جنید بن محمد ☆

۱- یہاں بیع کی جو صورت بیان کی گئی ہے، فقہاء کے یہاں اس کو ”بیع الوفاء“ سے تعبیر کیا گیا ہے، شریعت کا اصول یہ ہے کہ بیع کے معاملہ کے ساتھ اگر کوئی ایسی شرط لگا دی گئی جو تقاضہ عقد کے خلاف ہو تو بیع درست نہیں ہوگی، چونکہ اس معاملہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شیئ واپس کر دینی ہوگی، اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے، اس لئے بیع درست نہیں، البتہ عملاً اس بیع کی صورت بالکل رہن کی ہے، اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے، خلاصہ یہ کہ یہ معاملہ رہن کا ہے، بیع کا نہیں ہے (کتاب الفتاویٰ ۲۸۰، ۲۷۹/۵)۔

”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر الفتاوی: هو أن یقول: بعث منک علی أن تبیعہ منی متی جنت بالثمن، فهذا البیع باطل، وهو رهن، وحکمہ حکم الرهن، وهو الصحیح: قال السید الإمام: قلت للإمام الحسن الماتریدی: قد فشا هذا البیع وفيه مفسدة عظيمة، وفتواک أنه رهن، وأنا أيضاً علی ذلك“ (رد المحتار ۵۳۵/۷، ۵۳۶، کتاب البیوع، باب الصرف، مطلب فی بیع الوفاء مکتبہ زکریا دیوبند)۔

بعض فقہاء کے نزدیک یہ بیع صحیح ہے:

”قوله: (وقیل: بیع یفید الانتفاع به) هذا محتمل لأحد قولین: الأول أنه بیع صحیح مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعه، قال الزیلعی فی الإکراه: وعلیه الفتوی الخ“ (رد المحتار ۵۳۶/۷)۔

الف- مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ بیع صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی کسی اور کو بیچنا درست نہ ہوگا، یعنی کسی دوسرے کو نہ بیچنے کی شرط لگانا درست ہے۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ درست نہیں ہے۔

ج- خریدار اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

د- خریدار بیع کو کسی اور کے ساتھ بیچ نہیں سکتا، ”إلا أنه لا يملك بيعه“ (شامی) البتہ اگر بیچ دیا تو یہ بیع موقوف ہوگی، اب اگر مالک اول اجازت دے گا تو منعقد ہو جائے گی اور اگر فسخ کر دے گا تو فسخ ہو جائے گی، بیع منعقد ہونے کی صورت میں زائد قیمت بھی مالک اول کی شمار ہوگی۔ کیونکہ مشتری تو بیع کرنے کا حق ہی نہ رکھتا تھا۔ ”وفى الهداية: ومن باع ملك غيره، فالملك بالخيار إن شاء أجاز البيع، وإن شاء فسخ الخ“ (الفتاویٰ التاتاریخانیہ ۸/۲۶۹)۔
واضح رہے کہ مذکورہ جوابات سوالات قائم کرنے کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں، ورنہ اس طرح کے معاملات میں صحیح اور راجح قول کے مطابق بیع فاسد ہو کر رہن کا حکم ہوگا۔

۲- الف- صورت مسئلہ میں مشتری کو جو کہ درحقیقت مرہن ہے اس جائیداد سے میعاد مذکور میں نفع حاصل کرنا جائز نہیں، ”ولا ينتفع المرتهن استخداماً وسكنى ولبساً وإجارة وإعارة، لأن الرهن يقتضى الحبس إلى أن يستوفى دينه دون الانتفاع“ (المحررات ۶/۳۳۸، فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۲۶۰-۲۶۱)۔
ب- ”کل قرض جبر نفعاً حرام“ کی بنیاد پر مرہن کرائے سے کم کرایہ دینا سود میں شمار ہوگا (جس کی مکمل تفصیل جواب نمبر ۳ کے تحت آ رہی ہے)۔

ج- اس جائیداد سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا (کاشت کی شکل میں ہو یا اجارہ کی شکل میں) جائز نہیں ہے: ”لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الرهن؛ لأن أذن له في الربا؛ لأنه يستوفى دينه كاملاً فبقى له المنفعة فضلاً، فيكون ربا“ (الدر المختار مع رد المحتار ۶/۴۸۲)، ”وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن ولا إجارته ولا إعارته الخ“ (ملتی الأبحر ۴/۲۳)۔

د- رہن کی مدت مکمل ہونے سے پہلے مرہن اسے بیچ نہیں سکتا، البتہ مقررہ مدت کی تکمیل پر مرہن کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ شہی مرہون کے ذریعہ اپنا حق وصول کر لے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مدت مکمل ہونے پر مرہن راہن سے دین کا مطالبہ کرے گا، اگر وہ ادا نہ کرے اور معاملہ طے کرتے وقت راہن نے مال مرہون کے بیچنے کا اختیار دے دیا تھا تو خود اس کو فروخت کر کے حق وصول کرے گا، ورنہ قاضی یا امین سے رجوع کرے گا اور قاضی یا امین شہی مرہون کو بیچ کر مرہن کا قرض ادا کر دیں گے، اس صورت میں اگر شہی مرہون کی قیمت قرض کی رقم سے زیادہ آئی ہے تو قرض سے جو بیچ رہے وہ راہن کو دے دیا جائے گا اور اگر شہی مرہون کی قیمت قرض کی رقم سے کم آئی ہے تو مرہن بقیہ رقم کا مطالبہ راہن سے کرے گا (دیکھئے: رد المحتار ۵/۳۲۳، مستفاد از قاموس الفقہ ۳/۵۰۴، احسن الفتاویٰ ۸/۴۹۴)۔

سوال میں جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے بعض خطوں میں اس کا کافی رواج پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے

اکثر لوگ سودی معاملے میں پڑ جاتے ہیں اور ویسے بھی بغیر سود کے قرض پانا مشکل ہوتا ہے، ہر شخص اپنے دیئے ہوئے قرض سے کسی نہ کسی شکل میں فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور مجبوراً بغیر سود کے قرض ملتا نہیں تو اس کے لئے یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا کوئی ذکر نہ آئے، بلکہ جس طرح اور لوگ شب و روز بیع و شراء کرتے ہیں اسی طرح بیع و شراء کر لی جائے پھر کسی دوسری مجلس میں دوسرے وقت میں اس رعایت کی درخواست کر لی جائے کہ آپ اگر آئندہ یہ چیز بیچیں تو مجھے بیچنا اب اگر مشتری اسے منظور کر لیں تو شرعاً یہ بیع درست ہوگئی، اب بائع کو قانوناً مطالبہ واپسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا، وہ کسی طرح مشتری کو واپسی پر مجبور نہیں کر سکتا، مشتری کو اس جائیداد میں مالکانہ تصرف کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا، اگر چاہے تو دوسرے شخص کو ہبہ یا بیع یا رہن سب کچھ کر سکتا ہے، بائع کو ان تصرفات سے روکنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

اور عرصہ معینہ میں فریقین میں اگر بائع روپیہ ادا کر دے تب بھی مشتری کو اختیار ہے کہ اگر وہ مناسب سمجھے اور اس کے مصالح کے خلاف نہ ہو اور بھی کوئی مانع نہ ہو تو واپس کر دے اور اگر مصالح کے خلاف ہو اور نقصان ہوتا ہو تو اس کو واپسی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بائع کا روپیہ لینے سے انکار کر دے، غرض قضاء اس پر کوئی حق باقی نہ رہا، البتہ اخلاقاً و دیناً اس وعدہ کو پورا کرنا مشتری کے ذمہ ہے۔

”لو ذکر البيع بلا شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه العقد جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، إذ المواعید قد تكون لازمة فيجعل لازماً لحاجة الناس“ (شامی ۵/۸۳، کتاب البيوع باب البيع الفاسد)۔
 ”ولو بعده علی وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به، لأن المواعید قد تكون لازمة لحاجة الناس الخ“ (در مختار ۷/۵۳، کتاب البيوع، باب الصرف مطلب فی بیع الوفاء)۔

تاہم اگر وعدہ کرتے وقت تو پورا کرنے کی نیت تھی، لیکن بعد میں کسی مصلحت و ذاتی ضرورت یا احتمال نقصان کی بنا پر پورا نہیں کرتا تو شرعاً مشتری پر گناہ نہیں۔

”عن زید بن أرقم عن النبي ﷺ قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نيته أنه يفى له، فلم يف ولم يجيء للميعاد، فلا إثم عليه، قال الأشرف: هذا دليل على أن النية الصالحة يثاب الرجل عليها، وإن لم يقترن معها المنوى وتختلف عنها ۵ الخ“ (مرقاۃ المفاتیح ۸/۶۱۵، مستفاد از فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۹)۔

۳- اس کے جواب میں مفتی احمد صاحب خانی پوری صاحب کا ایک تفصیلی فتویٰ نقل کرنا مفید سمجھتا ہوں:
 ”مالک مکان کا کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر رقم لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ اس کا مدار اس رقم کی حیثیت کی تعیین پر ہے، اس کی شروعات تو ضمانت اور رہن کے نام پر ہوئی تھی، بسا اوقات کرایہ دار مکان یا دکان کا کرایہ باقی چھوڑ کر غائب ہو جاتا تھا اور مالک مکان کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا، اس مصیبت سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ عقد اجارہ کرتے

وقت کرایہ دار سے متعینہ رقم ایڈوانس یا ڈپازٹ کے نام سے لی گئی رقم سے وہ بقایا کرایہ وصول کیا جاسکے، اس صورت میں اس رقم کی حیثیت رہن کی ہو جائے گی، اور شرعاً اس طرح رہن لینا درست ہے، ”ولو استأجر داراً أو شيئاً وأعطى بالأجر رهنًا جاز“ (ہندیہ ۴۳۵/۵)، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کرایہ دار مکان کو نقصان پہنچا دیتا ہے یا بجلی وغیرہ کے واجبات چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو بعد میں مالک مکان کو ادا کرنے پڑتے ہیں، اس مقصد کے لئے بھی کرایہ دار سے ڈپازٹ کے نام پر ایک رقم بطور ایڈوانس وصول کی جاتی ہے گویا یہ ایک نوع کا ضمانت ہے، جیسا کہ مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانوی نے صراحت فرمائی ہے، (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۱۴۰۶/۱۴۰۶)۔

جہاں تک میرا اندازہ اور معلومات ہیں، ڈپازٹ لینے دینے کی اصل بنیاد مندرجہ بالا دو میں سے ایک وجہ ہے، بعد میں لوگوں نے جب دیکھا کہ ڈپازٹ کے نام پر وصول کی جانے والی یہ رقم مالک مکان کے پاس یوں ہی پڑی رہتی ہے کسی استعمال میں نہیں آتی تو مالک مکان جن کے قبضہ میں یہ رقم تھی، انہوں نے بلا اجازت اس رقم کو استعمال کرنا شروع کیا، جب اس کا رواج عام ہونے لگا تو دینی ذہن رکھنے والے مالکان مکان کو یہ بات کھٹکی کہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ ایسے لوگوں نے کرایہ دار سے اجازت لینا شروع کیا اور انہوں نے بھی اجازت دینا شروع کیا۔ کرایہ داروں میں سے کچھ نے یہ سوچنا شروع کیا کہ ہماری یہ رقم جو بطور امانت و ضمانت ہے مالک مکان کے پاس جوں کی توں محفوظ رہنی چاہئے، مالک مکان ہماری اجازت سے فائدہ اٹھا رہا ہے، تو ہم کیوں نہ اس کو دی جانے والی اجازت سے فائدہ اٹھائیں؟ چنانچہ انہوں نے اس شرط پر اجازت دینا شروع کیا کہ اس اجازت کی بنیاد پر کرائے میں کچھ کمی کر دی جائے، یعنی عام طور پر اس جیسے مکان کی جو اجرت مثل ہونی چاہئے اس کے بجائے ڈپازٹ کے طور پر دی گئی رقم کو استعمال کرنے کے بدلہ میں اس اجرت مثل کی مقدار میں کچھ کمی کی شرط لگائی جائے، آج کل جو معاملات ہو رہے ہیں اس کی بنیاد یہی ذہنیت ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ معاملہ درست کہلایا جاسکتا ہے؟ کچھ لوگوں نے ڈپازٹ کی رقم خوب بڑھا کر اور اس کے استعمال کی اجازت دے کر مالک مکان سے پورا کرایہ ہی ساقط کر دیا، گویا یہ صاحب اپنی رقم ایک مدت کے لئے مالک مکان کو استعمال کے لئے دے رہے ہیں اور اس کے بدلہ میں اسی مدت کے لئے مکان یا دکان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، ظاہر ہے ان کی طرف سے جو رقم دی گئی ہے وہ قرض کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بدلہ میں یہ آدمی قرض لینے والے کے مکان سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور قرض پر دی گئی رقم کے بدلہ میں فائدہ اٹھانا سود اور حرام ہے۔

درمختار میں علامہ ”ہسکفی“ نے ”الاشباہ والنظائر“ کے حوالہ سے لکھا ہے: ”کل قرض جر نفعاً حرام، فکروہ للمرتہن سکنی المرہونۃ بإذن الراہن“ (درمختار) یعنی ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل کیا جائے وہ حرام ہے، اسی لئے گروی لئے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کرنا مکان مالک کی اجازت سے ممنوع ہے (یعنی مرتہن کے لئے راہن کی اجازت

کے بغیر تو حرام ہوگا ہی اگر وہ اجازت دیدے تب بھی اس مکان سے استفادہ کرنا مکروہ ہوگا، علامہ شامی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر نفع اس قرض کے معاملہ میں مشروط ہو تو حرام ہے اور عبداللہ ابن محمد ابن اسلم سمرقندی جو کبار علماء سمرقند میں سے تھے ان کا قول نقل کیا ہے کہ مال مرہونہ سے انتفاع کسی صورت میں جائز نہیں اگرچہ راہن نے اسے اجازت دیدی ہو، اس لئے کہ یہ سود خوری کی اجازت ہے، چونکہ وہ اپنا پورا قرض وصول کرے گا ہی، پھر یہ نفع ایک زائد شئی ہے، اس لئے کہ یہ ربا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے (شامی ۱۶۶/۵، دار الفکر)۔

اس لئے صورت مسئولہ میں زید کا بکر سے دو لاکھ روپے بطور ڈپازٹ (جو قرض ہی ہے) لے کر اپنا فلیٹ بلا کر ایہ رہنے کے لئے دینا اور بکر کا اس میں بلا کر ایہ رہنا سود کے حکم میں ہے جو ناجائز ہے، نیز صورت مسئولہ میں بکر پر اس فلیٹ کی اجرت مثل (یعنی عام طور پر اس فلیٹ کا جو کرایہ ہوتا ہو) واجب ہوگی۔ ”عالمگیری“ میں ہے: ”لو استقرض رجل دراهم من رجل وقال: اسكن حانوتی هذا، فإن لم أرد عليك دراهمك لا أطلبك بأجرة الحانوت والأجرة التي تجب عليك هبة لك فدفع المقرض الدرهم وسكن الحانوت مدة، قال: إن كان ذكر ترك الأجرة عليه مع استقراضه منه المال، فالأجرة واجبة على المقرض يريد به أجر المثل الخ“ (ہندیہ ۵۲۱/۴، محمود الفتاویٰ ۸۸/۳ تا ۹۱)۔

مندرجہ بالا تفصیلی جواب سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بطور ڈپازٹ دی گئی رقم اصل میں قرض ہے اور قرض کے عوض مشروط نفع حرام ہے، ”کل قرض جر نفعاً حرام“ لہذا ڈپازٹ کی رقم دے کر کرایہ میں کمی کرنا یا کرایہ معاف کر دینا، جیسے ہیوی ڈپازٹ کہتے ہیں درست نہ ہوگا۔

بیع و فاء کی شرعی حیثیت

مولانا عبدالشکور قاسمی

- ۱- بیع و فاء سے متعلق فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، جیسا کہ صاحب بحر الرائق نے آٹھ قول نقل کئے ہیں، بعض نے کہا وہ حقیقتاً رہن ہے، مشتری کو اس سے نفع حاصل کرنا صحیح نہیں۔
- دوسرا قول بیع سے متعلق ہے، لیکن بیع کی واپسی کی شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہے۔ مفتی عزیز الرحمن صاحب نے ”فتاویٰ دارالعلوم دیوبند“ میں تحریر فرمایا کہ راجح یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے۔ عاقدین کے لئے اس کا فسخ کر دینا ضروری ہے۔
- ۲- اس شکل کو رہن بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ شیئی مرہون سے نفع حاصل کرنا سود ہے۔
- عاقدین نے عقد کے وقت بیع کی واپسی کی شرط بیان نہیں کیا بعد میں وعدہ کے طور پر ذکر کیا تو اس صورت میں بیع صحیح ہوگی اور تعال کی وجہ سے سود سے بچنے کی ایک شکل ہوگی۔
- سود کی حرمت پر نص قطعی اور نہ چھوڑنے کی صورت میں اللہ اور رسول ﷺ سے اعلان جنگ جیسی وعید کی روشنی میں جمہور فقہاء امت کے فتاویٰ کے بعد بعض علاقوں کے تعال کی وجہ سے جواز کی طرف میلان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔
- ۳- کثیر رضمانت پر جو مکان یا دکان کا معاملہ طے کیا جاتا ہے، اور اس معاملہ کے تحت جو رقم لی جاتی ہے، اس کا بڑا حصہ یکمشت معاملہ طے کرتے وقت لیا جاتا ہے اور بقیہ بالاقساط جو قبضہ اور انتفاع کا عوض ہے، جس میں کمی زیادتی کی گنجائش ہونی چاہئے۔
- مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے جدید فقہی مسائل میں تمام ائمہ کے مذاہب بیان فرما کر مسئلہ کو جس طرح واضح فرمایا ہے وہ اس موضوع پر کافی ہے۔

بیع و فاء کا حکم

مفتی محمد اشرف قاسمی ☆

۱- یہ معاملہ اگر عقد بیع کے ساتھ خاص قید و بند کی پابندی کرتے ہوتا ہے تو بیع فاسد ہوگی۔ لیکن اگر قید و بند، یعنی شرط و فا کو عقد بیع کے ایجاب و قبول سے پہلے یا بعد میں طے کیا جائے تو اس قسم کی قید و بند سے بیع فاسد نہ ہوگی، بلکہ بیع منعقد ہوگی۔
الف- دیانۃً بائع ہی سے بیچنا ضروری ہے، لیکن قضاء کسی دوسرے سے بیچ دے تو جائز ہے وعدہ خلافی کا گناہ گار ہوگا۔

ب- مالک اول کو بیچنے میں حسب وعدہ دیانۃً سابقہ و اخلاقاً سابقہ ادا کردہ قیمت لازم ہوگی، لیکن چونکہ مشتری اول بیع کا مالک ہے، اس لئے اپنی چیز میں..... زیادہ یا ثمن مثل کے مطالبہ کا قضاء مجاز ہے، البتہ اس صورت میں بھی وعدہ کے عدم ایفا کا گناہ گار ہوگا۔

ج- بیع خریدار کی ملکیت میں ہے، اس لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔
د- خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچ دے تو وعدہ خلافی کا گناہ گار ہوگا، لیکن قضاء اس کی یہ بیع جائز و نافذ ہوگی اور قیمت کا وہی مالک ہوگا۔

۲- اس کو رہن قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔
الف- اگر اس کو رہن قرار دیتے ہیں تو پھر اس سے خریدار کو نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔
ب- خریدی ہوئی چیز خود کو کرایہ پر دینا عیب ہے، رہن ماننے کی صورت میں جو ثمن دیا اس کو قرض مان لیں تو یہ شیئی مرہون ہوگی، اب اس کا کرایہ مروجہ کرایہ سے کم دینا جائز نہیں، بلکہ کرایہ مثل واجب ہوگا۔
ج- شیئی مرہون سے کاشت کاری یا اجارہ داری یا کسی قسم کا نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، اگر نفع اٹھانا ہے تو ثمن کی صورت میں دی ہوئی رقم میں سے منہی ہو کر اس کا مروجہ کرایہ بائع یا راہن کو ملے گا۔
د- بائع یا راہن کی اجازت سے استیفاء قرض کے لئے شیئی مرہون کو بیچ سکتا ہے، اگر قیمت زائد حاصل ہو تو زائد

قیمت راہن کو واپس کرنا ضروری ہے۔

۳- کاروباری یا کسی ضرورت کے لئے روپیہ کو راہن نہیں رکھا جاتا ہے، بلکہ سامان کو راہن رکھا جاتا ہے، اس لئے یہ خطیر رقم راہن نہیں ہو سکتی، نیز امانت بھی نہ ہوگی، کیونکہ امانت کو اپنی ضروریات میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، یہ ضمانت قرض ہی ہوگی۔ قرض دینے والا قرض لینے والے کے کسی سامان گھر مکان سواری سے اگر فائدہ اٹھاتا ہے تو پھر کرایہ مثلی واجب ہوتا ہے اس قرض دار کے مکان میں مروجہ کرایہ سے رہنا درست نہیں، یہ قرض سے نفع اٹھانا ہے جو کہ حرام ہے۔

☆☆☆

بیع و فاء تعریف اور احکام

مفتی محمد شاہد قاسمی ☆

بیع و فاء کی تعریف:

بیع و فاء یہ ہے کہ بائع مشتری سے اس بات کو پورا کرنے کا عہد و پیمان لے کہ جس وقت بائع ثمن واپس کر دے گا تو مشتری وہ بیع اس کو واپس کر دے گا، ”تا تاریخانیہ“ میں ہے:

”بیع الوفا أن يقول البائع للمشتري: بعث هذا بمالك عليّ عليّ متى قضيت الدين فهولي“ (۳۰۵/۹ تاریخانیہ)۔

وفی الدر مع الرد: (ص ۵۳۵ ج ۹) ”صورتہ أن یبیع العین بألف علیّ إذا ردّ علیہ الثمن ردّ علیہ العین“

بیع و فاء کی دو صورتیں ہیں: (۱) بائع قرض لے کر اس کے بدلے میں بیع مشتری کو سونپ دے، (۲) پہلے سے بائع مقروض ہو اس کے بدلے میں بیع مشتری کے حوالے کر دے۔
حکم:

امام حسن ماتریدی کے قول کے مطابق یہ رہن ہے، چنانچہ شامی میں ہے: ”قال في الخيرية: والذي عليه الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن في حكم من الأحكام“ (رد المحتار ۷/۵۳۶)۔

اور بقول زیلیعی یہ بیع جائز ہے، بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے کہ اس مکان میں رہائش کا فائدہ حاصل کرنا، لیکن مشتری اس کو فروخت کرنے کا مالک نہ ہوگا۔ ”الجرالزائق“ میں ہے: ”وذكر الزيلعي: أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (الجرالزائق ۱۲/۶)، و قال الزيلعي في الاكراه: ”و عليه الفتوى“ (شامی ۷/۵۳)۔

بعض محققین کا قول یہ ہے کہ بعض احکام کے حق میں بیع فاسد ہے اور بعض احکام کے حق میں بیع صحیح ہے اور بعض

میں رہن ہے۔

”القول الثامن الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، وصحيح في حق بعض الأحكام كحل النزال و منافع البيع..... ورهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه الخ“ (البحر الرائق ۱۳۶)۔

مباحث فقہیہ میں ہے کہ بیع وفا کے سلسلہ میں فقہائے حنفیہ کے مختلف اقوال ہیں، نیز قول راجح اور مفتی بہ ہونے کے بارے میں بھی ان کے اقوال مختلف ہیں اکثر فقہاء اس کے رہن ہونے کے قائل ہیں اور بعض فقہاء بعض احکام کے حق میں اس کے جائز اور بعض کے حق میں فاسد ہونے کے قول کو راجح قرار دیتے ہیں (مباحث فقہیہ ۵۸۵)۔

بہر حال! اگر بیع وفا کو رہن مانا جائے، جیسا کہ امام حسن ماتریدی کا قول بھی ہے تو مرتہن اس کا مالک نہ ہوگا اور مالک (بائع) کی اجازت کے بغیر اس سے نفع بھی نہیں اٹھا سکتا، اگر اس نے نفع اٹھالیا یا اس کو تلف کر دیا تو وہ اس کا ضامن ہوگا اور ہلاکت کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا۔ ”بحر“ میں ہے: ”الاول ما اختاره صاحب المنظومة أنه رهن حقيقة فلا يملكه المشتري ولا ينتفع به، الا باذن البائع..... وسقط الدين بهلاكه“ (البحر الرائق ۱۱۶-۱۳)۔

اگر خریدار اس کو اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مرؤجہ کرایہ سے بہت کم ہے تو بیع کی یہ صورت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں ایک عقد (بیع) میں دو عقد (بیع و جارہ) جمع ہو رہے ہیں اور آپ ﷺ نے اس طرح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ ”مشکوٰۃ شریف“ میں ایک حدیث ہے: ”عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة“ (۲۴۸)۔

اگر مشتری اس کو بیچنا چاہے تو اس کو مالک کی اجازت کے بغیر یہ حق حاصل نہیں ”بحر“ میں ہے: ”أن الفتوى على أنه بيع جائز..... الا أنه لا يملك بيعه للغير“ (البحر الرائق ۱۲۶)۔

اور اگر بیع صحیح مانا جائے، جیسا کہ امام زبلی نے ذکر کیا ہے تو مشتری کے لیے اس سے فائدہ حاصل کرنا تو حلال ہوگا، البتہ وہ اس کو فروخت کرنے کا مالک نہ ہوگا، شامی میں ہے: ”الاول أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، الا أنه لا يملك بيعه، قال الزيلعي في الكراه: و عليه الفتوى“ (رد المحتار ۵۴۶)۔

اور اگر اس کو بعض احکام میں بیع فاسد اور بعض میں بیع صحیح مانا جائے اور بعض میں رہن، جیسا کہ بعض محققین کا قول ہے تو بیع فاسد کی صورت میں عاقدين میں سے ہر ایک فسخ کا مالک ہوگا اور بیع صحیح کی صورت میں مشتری بیع و منافع بیع کا مالک ہوگا اور رہن کی صورت میں نہ تو فروخت کرنے کا مالک ہوگا اور نہ رہن رکھنے کا اور اس کی ہلاکت کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا۔

صاحب بحر فرماتے ہیں: ”القول الثامن الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ، و صحيح في حق بعض الأحكام كحلّ النزال و منافع البيع، و رهن في حق البعض حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر و لارهنه..... و سقط الدين بهلاكه“ (البحر الرائق ۱۲/۷)۔

بیع قرار دینے کی صورت میں بائع کا عقد سے پہلے یا عقد کے اندر یہ شرط لگانا کہ یہ صرف اسی کو بیچی جائے کسی اور کو نہ بیچی جائے، شرط فاسد ہے۔ شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے، اس معاملہ بیع کو صحیح بنانے کی شکل یہ نکل سکتی ہے کہ اولاً عقد بیع بغیر شرط کے کر لیا جائے اور اس کے بعد بطور وعدہ کے آپس میں یہ طے کر لیا جائے کہ جب بائع مشتری کو شمن لوٹا دے گا تو مشتری بیع بائع کے حوالے کر دے گا، یہ صورت شرعاً درست ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم بحر کے اندر رقم طراز ہیں: ”ثم إن شرطاً فسخه في العقد أو تلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء..... فالبيع فاسد، و إن ذكراً

البيع بلا شرط ثم شرطاً على وجه المواعدة جاز البيع و لزوم الوفاء“ (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

پھر اگر مشتری مالک اول (بائع) کو فروخت کرے گا تو سابق ادا کردہ قیمت ہی کے عوض کر سکتا ہے زائد قیمت کا مطالبہ کرنا شرعاً ناجائز نہیں۔ اس لیے کہ بطور وعدہ کے عام طور سے عقد کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی وعدے لازم ہو جاتے ہیں، چنانچہ ”بحر“ میں ہے ”و قد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا“ (البحر الرائق ۱۲/۶)۔

علامہ ابن عابدین شامی اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”لأن المواعيد قد تكون لازمة“ قال في البزازیة في أول كتاب الكفالة: إذا كفل معلقاً، بأن قال: إن لم يؤد فلان فأنا أدفعه إليك، ونحوه يكون كفالة لما علم أنّ المواعيد باكتساء صور التعليق تكون لازمة“ (رد المحتار ۵۳۷/۷)۔

اگر خریدار اس کو بائع کے علاوہ کسی اور کو فروخت کر دے تو یہ بیع مالک (بائع) کی اجازت پر موقوف رہے گی اور مالک یا اس کے ورثہ کو لوٹانے کا حق حاصل ہوگا، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”وهذا المبيع في يد المشتري كالرهن في يد المرتهن لا يملكه..... إلا بإذن مالكة“ (عالمگیری ۲۰۹/۳) شامی میں ہے: ”ولو باعه المشتري فللبائع أو ورثته حق الاسترداد على القول، بأنه رهن“ (رد المحتار ۵۳۸/۷)۔

آج کے اعتبار سے فتویٰ اس پر دیا جاتا ہے کہ بیع وفا حقیقت میں رہن ہے، نہ کہ بیع، البتہ استثنائاً بیع ہی ہے، تاکہ متعاقبین کے لیے اس چیز سے انتفاع جائز ہو جائے۔

☆ جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ کرے اس وقت تک خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ ”کما مره

من قول الزيلعي: أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه الآخر“

☆ اگر خریدار اس طریقے پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرائے سے بہت ہی کم

ہو اور وہ اس مکان یا زمین سے انتفاع بھی کرے تو یہ صورت چونکہ ایک عقد میں دو عقدوں کو شامل ہے، اس لیے درست نہیں۔
 ”لما روى عن أبي هريرة قال: نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة.“ (مشکوٰۃ شریف ۲۳۹)۔

البتہ اس عرصہ میں خریدار مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ”کما مر“

☆ آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرائے پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلاً ایک دوکان یا مکان پر دس لاکھ روپے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے تو اس کا مروجہ کرایہ مثلاً دس ہزار روپے ماہانہ ہونا چاہئے، لیکن مالک پانچ سو یا ایک ہزار روپیہ کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لیے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے۔

☆ تو اس زر ضمانت کی حیثیت نہ تو قرض کی ہے، نہ رہن کی، بلکہ اس کو اجرت مجملہ قرار دیا جائے گا اور یہ اجرت کرایہ ہی میں شمار ہوگی اور باقی پانچ سو یا ایک ہزار روپے اس کے بعد ہر ماہ کا کرایہ قسطوار قرار دیا جائے گا اور یہ صورت جائز ہوگی۔

”جرت العادة أن صاحب الخلو حين يستاجر الدكان بالأجرة اليسيرة يدفع الناظر دراهم تسمى خدمة هي في الحقيقة تكملة أجرة المثل“ (ردالمحتار ۳۱۷)۔

لیکن اگر یہ رقم واپسی کی شرط کے ساتھ ہو تو اس کی حیثیت قرض کی ہوگی اور کرایہ میں کی جانے والی کمی ”کمل قرض جرنفعا فهو ربا“ کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

بیع و فاء کی فقہی حیثیت

مولانا یوسف علی ☆

۱- بیع و فاء اصطلاح فقہاء میں: ”هو البيع بشرط أن البائع متى رد الثمن يرد المشتري المبيع إليه“، جو معاملہ بیع و فاء کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، اگر بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں بطور وعدہ واپسی کا ذکر نہیں آیا، بلکہ عام معاملہ کے مانند بائع مشتری نے بیع و شراء کر لئے پھر دوسرے وقت، دوسری مجلس میں بائع نے مشتری سے درخواست کی اور مشتری یہ رعایت کرے ایک عرصہ معینہ کے اندر جب بائع معینہ روپیہ ادا کر دے، تو مشتری بیع کو واپس کر دے، پھر مشتری نے اس کو منظور کر لیا تو یہ بیع شرعاً درست ہو جائے گی، ”قاضی خان“ میں ہے: ”الصحيح أنه إن وقع بلفظ البيع لا يكون رهنا، وإن وقع بلفظ البيع لا يكون رهنا، وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطه على وجه المعاودة جاز البيع، ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فرارا من الربا“ (بحر الرائق ۱۲/۶)۔

اب بائع کو دینا اپنا وعدہ پورا کرنا چاہئے، کیونکہ ”اشباہ والنظائر“ میں ہے: ”الخلف في الوعد حرام“، اور اگر بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں بطور شرط یا وعدہ واپسی کا ذکر ہو تو یہ صورت بیع ہے اور حکماً رہن ہوگا۔

بیع و فاء کے حکم میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہے:

مالکیہ حنابلہ اور متقدمین حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے، ان کی دلیل ہے:

۱- یہ مقتضی بیع کے خلاف ہے، کیونکہ بیع کا حکم یہ ہے کہ بیع پر علی سبیل الاستقرار والدوام مشتری کا ملک رہے، حالانکہ بیع و فاء کے شرط پر بائع کا منافع ہے، لہذا یہ شرط فاسد ہوگا۔

۲- اس صورت میں حقیقت بیع مقصد نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کے پیچھے ربا کی طرف وصول لازم آتا ہے، اس صورت میں مشتری کو اجل معلوم کے لئے دیا جاتا ہے جس میں بائع کا نفع ہوتا ہے اور بیع کو فروخت کرنے کے بعد بائع کا نفع یہ رہا ہے اور رہا ہر حالت میں باطل ہے۔

حنفیہ کے علماء جیسے ابو شجاع، علی سعیدی، قاضی ابوالحسن ماتریدی فرماتے ہیں کہ بیع و فاء رہن ہے، حقیقت وہ بیع

نہیں، لہذا اس میں تمام احکام رہن جاری ہوگا، لہذا مشتری نہ مالک ہوگا، نہ نفع حاصل کرے گا، ان کی دلیل یہ ہے: کہ عقود میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے الفاظ کا اعتبار نہیں، لہذا شرط عوض جو ہبہ ہوتا ہے وہ بیع ہو جاتا ہے اور بیع و فاء میں جب یہ شرط ہوتی ہے کہ ردِ ثمن پر بیع بائع لوٹا لے گا تو یہ رہن ہو جائے، کیونکہ اداء دین سے مرہون رہن کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اور بعض متأخرین حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک بیع و فاء جائز ہے، بعض احکام میں مفید ہے کہ مشتری کے لئے اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہے اور بعض احکام میں مفید نہیں کہ مشتری اس کو دوسرے کے پاس فروخت نہیں کر سکتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ بیع و فاء کی شرط پر لوگوں کا تعارف اور تعامل ثابت ہے اس کی طرف لوگوں کی حاجت اور ضرورت کی وجہ سے کہ بائع کو روپیہ کی ضرورت ہے اور اس کو کوئی قرض حسنہ نہیں دیتا ہے اور سود سے قرض لینا نہیں چاہتا ہے اس صورت میں بیع و فاء کے علاوہ دفع ضرورت کی کوئی صورت نہیں، لہذا اوفاء کے شرط پر بیع صحیح ہوگی، اگرچہ قواعد کے مخالف ہے، لیکن تعامل الناس کی وجہ سے قواعد کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ استصناع کی صورت میں قواعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ صاحب ”در مختار“ نے بیع و فاء کے بارے میں فرمایا:

”وقیل: بیع یفید الانتفاع به وفي اقالة شرح الجمع عن النهاية: وعليه الفتوى، وقيل: إن كان بلفظ البيع لم يكن رهنا، ثم إن ذكر الفسخ فيه أو قلبه أو زعماه غير لازم كان بيعا فاسدا، ولو بعده على وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به؛ لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس، وهو الصحيح، كما في الكافي والخانية“ (شامی ۲۷۵/۲-۲۷۷)۔

علامہ ابن عابدین شامی میں فرماتے ہیں: ”هذا محتمل لأحد القولين: الاول: أنه بيع صحيح مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا انه لا يملك، قال الزيلعي في الاكراه: وعليه الفتوى، الثاني: القول الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد في حق بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ صحيح في بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبيع حتى لم يملك المشتري بيعه من آخر ولا رهنه سقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر - جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبها، قال في البحر، ”وينبغي أن لا يعدل في الافتاء عن القول الجامع، وفي النهي: والعمل في ديارنا على مآرحة الزيلعي“۔

پھر علامہ شامی نے ”در المختار“ کی عبارت ”قوله لم يكن رهنا“ کی شرح میں فرمایا:

”لأن كل منهما عقد مستقل شرعا لكل منهما أحكام مستقلة“ (در المختار ص ۲۷۷)۔

”وفي الجامع الفصولين: لو شرطاً شرطاً فاسداً قل العقد ثم عقد لم يبطل العقد“، وقد سئل

الخیر الرملی عن الرجلین تواضعا علی بیع الوفاء قبل عقده وعقد البیع خالیا عن الشرط فأجاب بأنه صرح فی الخلاصة والفیض والتتارخانیة وغیرها، بأنه یکون علی ما تواضعا“ (در المختار ۵/۸۴)۔

”بزازیہ“ میں بیع وفاء کے بارے میں آٹھ قول ہیں، قول ثانی میں ہے: ”أنه بیع صحیح باتفاق مشائخ الزمان للعرف وما ینفع البائع فهو بطریق الرضا لا، البحر“ (البحر ائق ۱۲)۔

علامہ ابن نجیم فرماتے ہیں کہ بیع وفاء تین صفت سے مرکب ہے، لیکن ذات یعنی عین عقد ایک ہے جیسا کہ زرافتہ میں تین صفت یعنی: بعیر، بقر، نمر، تینوں صفتیں اس میں ہیں، لیکن ذات کے اعتبار سے وہ ایک علاحدہ حیوان ہے، ایسا ہی بیع بالوفاء میں اگرچہ تین صفتیں ہیں، لیکن ذات کے اعتبار سے وہ ایک بیع ہے، جس میں ”مبادلة المال بالمال بالتراضی“ ہے۔ لہذا انسان کی حاجت اور ضرورت کو مد نظر رکھ کر بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا جائے، جیسا کہ علامہ زلیعی کی رائے بزازیہ کا قول ثانی ہے، شامی کا قول مختلف فیہ ہے۔

۱- الف: اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ شرط قبل العقد یا بعد العقد موعید میں سے ہو تو مشتری کو اس کو پورا کرنا چاہئے، ”لان المواعید قد تكون لازمة لحاجة الناس“، وقال ابن نجیم: ”الخلافة فی الوعد حرام“، لہذا دیانۃ بیع مشتری کے خریدنے بعد بیع پر کل اختیار مشتری کو حاصل ہو جاتا ہے، چاہے فروخت کرے چاہے ہبہ کرے، چاہے رہن رکھے، لہذا مشتری شرط پر عمل کرنے میں مجبور نہیں۔

۱- ب: بائع کے پاس بیچنے کی شرط اگر موعید سے ہو تو سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اور زائد کا مطالبہ دیانۃ جائز نہ ہوگا، ہاں شرعاً و قضاءً زائد کا مطالبہ جائز ہو جائے گا۔

۱- ج: اگر عین عقد میں بیع کو لوٹانے کی کوئی شرط نہ ہو اور بعد میں کوئی وعدہ نہ ہو تب اس سے فائدہ اٹھانا مطلقاً جائز ہوگا، اگر عقد کے بعد موعید کے قبیل سے ہو تو اس وقت شرعاً و قضاءً فائدہ اٹھانا جائز ہوگا اور دیانۃ جائز نہ ہوگا۔

۱- د: اگر خریدار کسی دوسرے سے بیچ دے اور مزید قیمت لے تو قضاءً جائز ہوگا، دیانۃ جائز نہ ہوگا۔

۲- الف: رہن قرار دینے کی صورت میں جب تک بیچنے والا اس کو نہ لے اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، نہ اس کی آمدنی سے انتفاع جائز ہوگا نہ اس کو بیچ سکتا ہے، نہ اجارہ دے کر نفع حاصل کر سکتا ہے، نہ ہبہ کر سکتا ہے، بلکہ مشتری صرف محافظ اور امین رہے گا۔

بیچنے والے کی اجازت سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہوگا، ”الأشباہ والنظائر“ میں ہے: ”یکره للمرتہن الانتفاع بالرهن باذن الراهن“ اور ”قنیہ“ میں ہے: ”عن أبی یوسف المرتہن سکن الدار المرهونة باذن الراهن یکره لما فیہ شبهة الرباء“۔

حموی ”حاشیہ اشباہ“ میں ہے: ”عن عبد الله بن محمد بن اسلم أنه لا ينتفع بشئ منه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن في الربا، لأنه يستوفي دينه فتكون المنفعة ربا“۔

”درمختار“ کے حاشیہ میں ہے: ”فی شرح المنتقى: أنه يحرم الانتفاع بلا إذن وبه يكره، كما في المضمرة وغيرها“۔

اور ”رد المحتار“ میں ہے: ”والغالب من أحوال الناس إنما يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما أعطاه الدرهم، وهذا بمنزلة الشرط: لأن المعروف كالشروط، وهو مما يعين المنع“۔

اور ”مجمع البركات“ میں ہے: ”الحاصل أن المرتهن لا ينتفع بالرهن سواء أذن له الراهن أو لم يأذن“۔

”وفى التهذيب: ”يكره للمرتهن الانتفاع بالرهن وإن أذن له الراهن كذا فى المعدن“ صحیح بخاری شریف کی حدیث: ”عن أبى موسى قدمت المدينة فلقيت عبد الله بن سلام فقال لى إنك بأرض الربا فيه فاش، فإذا كان لك على رجل حق فأهدى إليك محل شعير فلا تأخذه، فإنه ربا، وجاء هذا المعنى عن ابن مسعود و ابن عباس و ابن عمر“۔

اور مصنف ابن ابی شیبہ میں عطار سے روایت ہے: ”كانوا أى الصحابة يكرهون كل قرض جرمه منفعة“ اور مسند ابن اسامہ میں حضور ﷺ سے منقول ہے: ”كل قرض جرمه نفعاً فهو حرام“۔

ان احادیث اور اقوال صحابہ سے معلوم ہوا کہ قرض دینے والے کو مقروض سے ہدیہ لینا یا کسی قسم کی منفعت حاصل کرنا باوجود اس کی رضا و رغبت کے مکروہ تحریمی ہے اور مال مرہون یہ قرض کے مقابلہ میں اور مرہون سے فائدہ لینا گویا قرض سے فائدہ لینا ہے۔

اور فقہ کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ باجائز راہن مرہن کے لئے نفع حاصل کرنا جائز ہے، یہ جو از صرف اس صورت میں ہے، جبکہ اذن خالص ہو اور شرط کا ظاہری و باطنی اعتبار سے شائبہ تک نہ ہو، اگر زمانہ کے دستور کے موافق دل میں خیال بھی آگاتو ربا ہو جائے گا، علاوہ ازین اگرچہ ایک جماعت فقہاء نے اذن کی صورت میں جائز قرار دیا ہے، لیکن فقہاء کا ایک جم غفیر اس کو منع کرتا ہے، ”تنقیح فتویٰ حامدیہ“ میں ہے: ”لیس للمرتهن ولا للراهن أن یزرع الأرض ولا یوآجرها؛ لأنه لیس لهما الانتفاع بالرهن“ (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحی)۔

۲- ب: جبکہ ایسے بیع کو رہن قرار دیا تو ایسی صورت میں خریدار کرایہ ادا کرنے میں کرایہ کا مالک راہن ہوگا اور کم کرایہ ادا کرنے میں مرہن کا فائدہ ہے، اور مرہون سے نہ راہن کو انتفاع جائز ہوگا اور نہ مرہن کو جائز ہوگا، کیونکہ فقہ کی عبارت

ہے: ”لیس لهما الانتفاع بالرهن“۔

۲-ج: اس عرصہ میں خریدار کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے، ہاں جبکہ راہن کی طرف سے اذن خالص ہو جس میں شرط کا ظاہری و باطنی شائبہ تک نہ ہو۔

۲-د: خریدار اس کو بیچنے کا حق نہیں رکھتا اگر بیچنے تو یہ جائز نہ ہوگا، ہاں جب مال مرہون ضائع ہو جانے کا خوف ہو اور راہن موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں ثمن مثل کے مقابلہ بیچنا جائز ہوگا اور یہ ثمن مشتری کے قرض سے وضع ہوگا۔

۲-ھ: کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کرنا اس کی زر ضمانت کی حیثیت امانت کی ہوگی اور اس صورت میں کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی، کیونکہ یہ کمی دونوں کی تراضی سے ہے، اگرچہ اس میں اجرت رکھنے والے کا فائدہ ہے، لیکن وہ امانت رکھنے پر مجبور ہے۔

اور قرض ماننے کی صورت میں قرض دار کا فائدہ ہوگا اور یہ ناجائز ہوگا، کیونکہ حدیث میں ہے: ”کل قرض جور بہ نفعاً فہو ربا“۔

اور راہن لینے کی صورت میں بھی مرہن کا نفع ہے، کیونکہ ضمانتاً یہ فائدہ مال مرہون کے مقابلہ میں ہے اور مرہون سے مرہن کا انتفاع ربا ہے جو حرام ہے۔

بیع و فاء وقت کی ایک اہم ضرورت

مولانا عبدالخالق رامپوری ☆

قرآن و حدیث کی شکل میں جو ہمیں قانون ملا ہے وہ قیامت تک کے لیے ہے، کیونکہ ہماری شریعت آخری شریعت ہے، جب وہ قیامت تک کے لیے ہے اور اللہ کا یہ آخری قانون ہے تو کوئی بھی قانون اپنی حرکت سے زندہ رہتا ہے۔ زندگی کی حرارت اور حرکت کسی بھی زندہ قانون میں نمایاں ہوتی ہے، لیکن یہ حرکت، یعنی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قانون کی تطبیق بہت نازک ذمہ داری کا کام ہے۔ قانون میں حرکت اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگی اصول و قواعد کلیہ اور تعبیر قانون کے مسلمہ ضوابط کی بنیاد پر ہی برقرار رہ سکتی ہے۔

فقہ اکیڈمی اپنے سمیناروں کے ذریعہ یہ نازک ذمہ داری ادا کر رہی ہے دور حاضر کے نئے مسائل کا حل پیش کرتی ہے، یہ مسائل کے حل پیش کرنے کا معتبر و مامون طریقہ ہے۔

خرید و فروخت کے باب میں ”بیع و فاء“ ضرورت و حالات کے تحت اختیار کی جانے والی ایک شکل ہے جس میں ہوتا یہ ہے کہ کوئی شخص صاحب ضرورت ہے اس کو روپیہ کی ضرورت ہے، اور کسی سے ادھار بھی نہیں ملتا، اور اس کے پاس مکان یا دکان یا زمین وغیرہ موجود ہے، اور اس کو رہن میں رکھ کر روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر رہن میں رکھنے کی صورت میں مرتہن اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے کوئی شخص رہن رکھ کر بھی قرض دینے کے لیے تیار نہیں، اور صاحب جائیداد اس ضرورت کی وجہ سے اپنی ہمیشہ کی ضرورت کی جائیداد کو بالکل بیع و فروخت کرنا بھی نہیں چاہتا تو اس طرح حاجتمند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے فقہانہ عقد کی ایک نئی شکل نکالی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مکان و دکان یا زمین وغیرہ صاحب ضرورت شخص اس طرح فروخت کرے کہ فروخت شدہ جائیداد مشتری کے پاس ہر طرح سے امانت تو نہیں، مگر مثل امانت کے ہوگی کہ مشتری اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، مگر اس کو فروخت نہیں کر سکتا، اور فائدہ اٹھانے کا سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ بائع لی ہوئی پوری رقم واپس نہ کر دے، اور جب بائع رقم واپس کر دے گا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ اتنی رقم لے کر جائیداد واپس کر دے جتنی میں اس نے بائع کو دیا تھا اور اس عقد کو بیع الوفاء بیع الامانۃ بیع الرہن وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے (البحر الرائق ۶/۷)۔

یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں، اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے اس کو فقہاء سمرقند، بلخ اور بخاری نے ضرورت کے پیش نظر شرعاً درست قرار دیا ہے اور امام نجم الدین نسفی نے نقل فرمایا ہے کہ ان کے زمانہ کے تمام مشائخ نے متفق ہو کر اس معاملہ کو جائز قرار دیتے ہوئے بہت سے احکام بیع کے لیے مفید ثابت کیا ہے۔ اور صاحب ”نہایہ“ نے اس معاملہ کے جواز کی رائے کو مفتی بہ قرار دیا ہے، اور علامہ زین الدین ابن نجم مصری نے قرضوں کی کثرت کے زمانہ میں بیع الوفاء کی صحت و جواز پر فتویٰ کا حکم فرمایا ہے (تفصیل کے لیے زیلعی صفحہ ۱۸۳ ج ۱۵ اشباہ صفحہ ۱۳۰-۱۳۹-۱۶۱ ملاحظہ فرمائیں)۔ وہیں کچھ دوسرے فقہانے شرط فاسد کی وجہ سے اس کو ناجائز و فاسد فرمایا ہے (ملاحظہ فرمائیں البحر الرائق صفحہ ۶ ج ۶)۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے فتویٰ خلیلیہ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق رکھا جائے اور شرط کی قید نہ لگائی جائے، تاکہ فقہاء متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ہو جائے، اس سے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے مشائخ سمرقند و بلخ بخاری اور امام نسفی اور صاحب نہایہ کے فتویٰ کے مطابق اس زمانہ میں بیع الوفاء کو درست قرار دینا زیادہ بہتر ہوگا۔ جب یہ بیع درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے۔

(الف) چونکہ فقہانے اس کو بیع الامانہ یا بیع الوفاء کہا ہے تو اس لفظ امانت اور وفاء سے تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ بعد میں کسی دوسرے کو نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی کو بیچا جائے اس شرط کا یہ حکم ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ بیع میں اس طرح کی شرط صحیح نہیں ہوا کرتی ہے، اس لیے یہ شرط درست نہ ہوگی۔

(ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت سے زائد کا بھی مطالبہ کر سکتا ہے، کیونکہ یہ بیع ہے، لیکن عدم ایفاء کا گناہ گار ہوگا۔

(ج) خریدار کا جب تک اس کے پاس سامان ہو اس سے فائدہ اٹھانا درست ہوگا، کیونکہ اس نے اس کو خریدار ہے اور وہ بروقت اس کا مالک ہے۔

(د) دوسرے کو بیچ دے تو یہ بیع درست ہوگی اور مزید قیمت لینا بھی درست ہوگا، لیکن ہاں وعدہ خلافی کا گناہ گار ہوگا۔

۲- اگر اس کو بیع نہیں رہن قرار دیا جائے تو خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی حیثیت سود کی ہوگی کیونکہ ”لأن الموتهن لا يجوز له الا نتفاع بالرهن أصلاً“ (بدائع الصنائع صفحہ ۱۳۵ ج ۶)۔ مرتہن کے لیے رہن رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز نہیں ہے۔

س:- اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟۔

ج:- یہ صورت جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ اجارہ کے کسی قاعدہ پر منطبق نہیں ہوتی۔

اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

ج:- کسی طرح کا فائدہ نہیں حاصل کر سکتا، کیونکہ یہ رہن ہے۔

س:- خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں اور بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے۔

ج:- قرض دہندہ کو اپنا یا ہواروپہ بائع سے ملنے کی شکل نہ بن پارہی ہو تو پھر استیفاء قرض کے لیے راہن یا بائع

کی اجازت سے شے مرہون کو اپنی ملکیت میں لے کر یا اس کو بیچ کر اپنی رقم حاصل کر سکتا ہے، اگر مرہون شے کی قیمت قرض سے زائد ہے تو پھر زائد قیمت راہن کو واپس کرنا ضروری ہے۔

آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اس نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے یہ رقم شریعت کے کسی

قاعدہ پر منطبق نہیں ہوتی، اس ز ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز نہیں ہوگی اور یہ قرض پر فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اگر اس میں درج ذیل تبدیلیاں کر لی جائیں تو جواز پیدا ہو جائیگا۔

(۱) مالک مکان و دکان کے لیے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں ایک مشت رقم لے لے جسے متعینہ

مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ ایک مشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس ایک مشت لی ہوئی رقم پر اجارہ کے سارے احکام جاری ہوں گے اگر اجارہ کسی وجہ سے طے شدہ مدت سے پہلے فسخ ہو جائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ اجارہ کی باقی ماندہ مدت کے مقابل میں ایک مشت رقم کا جتنا حصہ آ رہا ہے اسے واپس کر دے۔

(۲) اگر اجارہ متعینہ مدت کے لیے ہوا ہے تو کرایہ دار کو اس مدت تک کرایہ داری باقی رکھنے کا حق ہے، لہذا اگر کوئی

دوسرا شخص یہ چاہے کہ کرایہ دار اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور یہ دوسرا شخص اس کی جگہ کرایہ دار ہو جائے تو پہلے کرایہ دار کے لیے جائز ہے کہ اس شخص سے عوض کا مطالبہ کرے، پہلے کرایہ دار کا یہ عمل بالعوض کرایہ داری سے دست برداری ہوگا اور مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہوگا اور وظائف اور حق سے دست برداری کے مالی عوض لینے پر علماء نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ”فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال“ (درمختار کراچی صفحہ ۵۱۹ ج ۳۔)

وظائف سے دست برداری کے مالی عوض لینے کے جواز پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے جواز کی شرط یہ ہے کہ اصل کرایہ داری کا معاملہ متعینہ مدت کے لیے کیا گیا ہو۔ مثلاً دس سال کے لیے اور دس سال پورا ہونے سے پہلے، پہلا کرایہ دار دست بردار ہو رہا ہو۔

(۳) اگر اجارہ معین مدت کے لیے ہو تو مالک مکان و دکان کے لیے جائز نہیں ہے کہ شرعی عذر کے بغیر اجارہ کو فسخ کر دے۔ ”و یصیر الخلو فی الحانوت حقاً له، فلا یملک صاحب الحانوت إخراجہ منها“ (الاشاہ والنظار صفحہ ۱۶۲) اور دکان کی پگڑی مالک کا حق ہو جاتا ہے لہذا مالک کے لیے کرایہ دار کو نکالنے کا حق نہ ہوگا۔ اور اگر مالک نے عذر شرعی کے بغیر دوران مدت اجارہ فسخ کرنا چاہا تو کرایہ دار کے لیے جائز ہے کہ اس سے عوض کا مطالبہ کرے اور اس کا یہ اقدام مالی عوض لے کر اپنے حق سے دست برداری کے دائرے میں داخل ہوگا اور یہ عوض مدت معینہ کے بدلے میں اپنی یک مشنت دی ہوئی رقم کا وہ جزء ہے جو استحقاقی مدت میں سے واپسی کے وقت باقی ماندہ مدت کی وجہ سے رہ گیا تھا۔



بیع الوفاء کا شرعی حکم

مولانا محمد رمضان علی فرقاتی ☆

ضرورت کی وجہ سے بہت سی چیزیں وجود میں آتی ہیں جن کے سبب بہت سے مسائل بھی سامنے آتے ہیں، ان مسائل سے نمٹنے کے لئے لوگ طرح طرح کی شکلیں تجویز کرتے ہیں، تاکہ اپنی ضرورتوں کو پوری کر سکیں۔ ان نئے مسائل میں اس کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ان مسائل کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ بیع الوفاء کا مسئلہ بھی اہم ہے جس کی حلت و حرمت کی تحقیق ضروری ہے۔ جب لوگوں کے دلوں میں خوف خدا غالب تھا اور جلب منفعت اخروی مقصد اول تھا تو لوگ کسی ضرورتمند کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے قرض دیتے تھے، لیکن جب لوگوں میں دنیا کی محبت غالب آگئی تو بغیر نفع حاصل کئے ہوئے کوئی کسی کو جلدی قرض دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ایک ضرورتمند کو کافی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر بیع الوفاء رواج ہوا ہے۔

بیع الوفاء کی تعریف:

قرض کا خواہاں شخص، کسی آدمی سے کوئی شے اس شرط پر فروخت کرے کہ یہ شے اس ثمن میں فروخت کر رہا ہوں، اس شرط پر کہ جب میں ثمن ادا کر دوں گا تو یہ فروخت کی ہوئی شے مجھے لوٹا دینا۔

”صورتہ ان یقول البائع للمشتري: بع منک هذا العین بدین لک علیّ علیّ اونی متی قضیت الدین فہو لی أو یقول البائع: بع تک هذا بکذا علیّ اونی متی دفعت لک الثمن تدفع العین الی“ (الجہد الرائق، تعلق خیار الشرط بالشرط)۔

یہ ایک ایسا عقد ہے جس میں بائع یہ شرط لگاتا ہے کہ جب وہ مشتری کو ثمن لوٹا دے گا تو بیع اسے واپس کر دی جائے گی، چاہے ثمن نقد کی صورت میں ہو یا قرض کی صورت میں۔ عام بیع میں، بیع بائع کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور خریدنے والا اس کا مکمل مالک بن جاتا ہے اور خریدی ہوئی چیز میں اس کو پورا اختیار رہتا ہے کہ وہ اس کو بیچے، ہبہ کرے، کرایہ پردے، یا جس طرح چاہے تصرف کرے، لیکن بیع الوفاء کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ اس میں بائع کو انتقال ملکیت کا اختیار

نہیں رہتا، بیع الوفاء کی شرعی حیثیت اور شرعی حکم کو ذیل میں تحریر کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

(۱) یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعاً منعقد اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

بیع الوفاء کے بارے میں علماء کرام کے مختلف کے اقوال ہیں جن کو ذیل میں تحریر کیا جاتا ہے:

۱- فقہائے کرام کا پہلا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء جائز ہے، لیکن غیر لازم ہے:

اس کی تائید قاضی خان اور دیگر فقہاء کرام نے کی ہے۔ قاضی خان کا قول ہے کہ اگر متعاقدین نے یہ عقد لفظ بیع کے ذریعہ کیا تو اس صورت میں وہ رہن قرار نہیں پائے گا۔ اگر ان دونوں نے شرط لگائی تو دیکھا جائے گا کہ وہ شرط کس قسم کی ہے؟ اگر ان دونوں نے بیع میں فسخ کی شرط لگائی، یا شرط وفاء کے ساتھ بیع کی، یا بیع جائز (عقد غیر لازم) کے ساتھ بیع کی تو ان تمام صورتوں میں یہ بیع فاسد ہو جائے گی۔ اگر ان دونوں نے بغیر کسی شرط کے بیع کی اور بیع ہو جانے کے بعد بطور وعدہ شرط وفاء کا ذکر کیا تو ایسی صورت میں بیع جائز ہوگی اور اس وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا۔

”الثالث ما اختاره قاضیخان وقال: الصحيح أنه إن وقع بلفظ البيع لا يكون رهنا، ثم إن شرطاً فسده في العقد أو تلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء أو تلفظاً بالبيع وعندهما هذا البيع غير لازم فالبيع فاسد، وإن ذكر البيع بلا شرط ثم شرطاه على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء، وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا“ (خانیہ ۱۶۵/۲۔ البحر الرائق، باب خيار الشرط۔ جامع الفصولین ۱۴۰/۱)۔

”وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع، ويلزم الوفاء بالوعد، كذا في فتاوى قاضی خان“ (الفتاوى الهندية، الباب العشر، ون في البيعات المكروهة)۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء، بیع فاسد ہے:

اس قول کو ”فتاویٰ العدة“ میں ذکر کیا گیا ہے اور اسے امام ظہیر الدین نے اختیار کیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر شرط وفاء کے ساتھ بیع ہوئی، یا بیع کے بعد شرط لگائی گئی تو یہ بیع فاسد ہو جائے گی، کیونکہ بیع، شرط فاسد کے ساتھ فاسد ہو جاتی ہے اور شرط وفاء شرط فاسد ہے اور اگر بیع سے پہلے شرط لگائی گئی اور شرط کا تذکرہ کئے بغیر عاقدین نے آپس میں عقد کیا تو ایسی صورت میں بیع درست ہوگی اور پہلی شرط کا اعتبار نہیں ہوگا اور یہ عام بیع کی طرح ہوگی۔

”الرابع ما قاله في العدة واختاره ظهير الدين: أنه بيع فاسد ولو الحقاه بالبيع التحق وافسده ولو بعد المجلس على الصحيح، ولو شرطاه ثم عقداً مطلقاً إن لم يقرأ بالبناء على الأول فالعقد جائز، ولا عبرة بالسابق، كما في التلجنة عند الامام“ (البحر الرائق، تعلیق خيار الشرط بالشرط)۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء، رہن ہے:

”ہندیہ“ میں ”جامع الفصولین“ کے حوالہ سے ہے کہ ”سود سے بچنے کے لئے ہمارے زمانہ میں جس بیع کا رواج ہو گیا ہے، جس کو بیع الوفاء کہا جاتا ہے، حقیقت میں وہ ”رہن“ ہے اور یہ بیع، خریدنے والے کے قبضہ میں رہن کی طرح ہے جس کا وہ مالک نہیں ہوگا اور نہ اس سے فائدہ اٹھا سکے گا، مگر یہ کہ مالک اس کو اجازت دیدے۔ (مالک کی اجازت کے بغیر) جو کچھ وہ اس سے نفع اٹھائے گا اس کا ضامن ہوگا، اگر بیع کی قیمت ثمن کے برابر ہے تو بیع کے ہلاک ہونے سے وہ ثمن ساقط ہو جائے گا اور اس کی واپسی لازم نہیں ہوگی اور اگر بیع کی قیمت ثمن سے زیادہ ہے اور بیع کی ہلاکت میں اس کا دخل نہ ہو تو ثمن سے زیادہ مالیت کا وہ ضامن نہیں ہوگا، اور بائع کو یہ حق ہے کہ بیع کی واپسی کا مطالبہ کرے، جب کہ وہ دین کو ادا کر دے، ہمارے نزدیک رہن اور اس (بیع الوفاء) کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح ”فصول عمادیہ“ میں ہے۔ سید امام ابوشجاع، امام علی سغدی، امام قاضی حسن ماتریدی اور ائمہ کی ایک جماعت نے بیع الوفاء کو رہن ہی مانا ہے۔

عقد کے وقت اگر متعاقدین، لفظ بیع کا استعمال کریں گے تب بھی بیع الوفاء کو رہن ہی کہا جائے گا، کیونکہ عقود میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ و ظاہری شکل کا نہیں۔ بیع الوفاء سے دونوں کی نیت رہن کی ہوتی ہے، بیع کی نہیں ہوتی، سوال کرنے پر مشتری کہتا ہے کہ میں نے فلاں کی مملوکہ چیز گروی رکھی ہے، اور بائع بھی یہی کہتا ہے کہ میں نے فلاں کے پاس اپنی مملوکہ چیز گروی رکھی ہے۔ اس لئے یہاں مقاصد کا اعتبار ہوگا الفاظ کا نہیں، کیونکہ تصرفات میں معانی کا ہی اعتبار ہوتا ہے۔ مثلاً ”حوالہ“ عدم برأت کی شرط کے ساتھ ”کفالہ“ بن جاتا ہے اور ”کفالہ“ برأت کی شرط کے ساتھ ”حوالہ“ ہو جاتا ہے۔

”البيع الذی تعارف أهل زماننا احتیالا للربا وسموه بیع الوفاء هو فی الحقیقة رہن، وهذا المبیع فی ید المشتري كالرهن فی ید المرتهن لا یملکة ولا یطلق له الانتفاع، إلا یأذن مالکة وهو ضامن لما اکل من ثمره واستهلک من شجرة والدين ساقط بهلاکة فی یده إذا کان به وفاء بالدين ولا ضمان علیه فی الزيادة إذا هلکت من غیر صنعه وللبائع استردادہ إذا قضی دینه، ولا فرق عندنا بینہ وبين الرهن فی حکم من الأحکام، کذا فی الفصول العمادیة، وعليه فتوى السيد أبي شجاع السمرقندی، وفتوى القاضی علی السغدی ببخاری، وكثير من الائمة علی هذا، کذا فی المحيط“ (الفتاویٰ الہندیہ: الباب العشر ون فی البیاعات المکرّہة)۔

”ومنہم من جعله رهنا منہم السيد الامام أبو شجاع والامام علی السغدی، والامام القاضی الحسن الماتریدی قالوا لما شرط علیه أخذه عند قضاء الدين أتى بمعنى الرهن، لأنه هو الذى یؤخذ عند قضاء الدين والعبرة فی العقود للمعانی دون الالفاظ حتى جعلت الكفالة بشرط براءة الأصيل حوالة وبالعكس كفالة، والاستصناع عند ضرب الأجل سلما، فإذا کان رهنا لا یملکة ولا ینتفع به وأی شیء

أكل من زوائده يضمن ويسترده عند قضاء الدين، ولو استاجر به البائع لايئزمه أجرته كالرهن إذا استاجر المرهون وانتفع به، ويسقط الدين بهلاكه فيثبت فيه جميع أحكام الرهن“ (تبيين الحقائق، كتاب الاكراه)۔

۴- چوتھا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء، بیع صحیح ہے:

امام نجم الدین نسفی نے فرمایا کہ مشائخ زمانہ نے عرف کی بناء پر بیع الوفاء کو بیع صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ زیلعی تحریر کرتے ہیں کہ فتویٰ اس پر ہے کہ وہ بیع جائز ہے، مگر کسی دوسرے کے ہاتھ بیع کو فروخت کرنے کا وہ مالک نہیں ہے۔

”الثانی: أنه بیع صحیح باتفاق مشائخ الزمان للعرف... و ذکر الزیلعی أن الفتوی علی أنه بیع جائز مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به؛ إلا أنه لا یملک بیعه للغير“ (البحر الرائق: تعلیق خیار الشرط بالشرط)۔

”ومن مشائخ سمرقند من جعله بیعا جائزا مفیدا بعض أحكامه منهم الامام نجم الدین النسفی فقال اتفق مشایخنا فی هذا الزمان فجعلوه بیعا جائزا مفیدا، بعض أحكامه وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البیع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه، والقواعد قد تترك بالتعامل وجوز الاستصناع لذلك وقال صاحب النهاية، وعليه الفتوی“ (تبيين الحقائق: كتاب الاكراه)۔

۵- پانچواں قول یہ ہے کہ بیع الوفاء، بیع اور رہن سے مرکب ہے:

”البحر الرائق“ میں ہے کہ امام زاہد کا یہ مختار قول ہے کہ جب بیع میں شرط کا تذکرہ نہ کیا جائے تو مشتری کے حق میں یہ بیع صحیح ہوگی جس کی وجہ سے وہ اس کے منافع کا مالک ہوگا، اور بائع کے حق میں یہ رہن ہوگا، جس کی وجہ سے مشتری کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ بیع کا قبضہ یا اس کی ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے اور جب بائع دین کی ادائیگی کر دے تو اس کو بیع کو لوٹانے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔

”القول السادس ما اختاره الإمام الزاهد: أن الشرط إذا لم يذكر في البیع كان بیعا صحیحا فی حق مشتری، حتی ملک الانزال ورهنا فی حق البائع فلم یملک مشتری تحویل یدہ وملكه إلى غيره وأجبر علی الرد إذا حضر الدين“ (البحر الرائق: تعلیق خیار الشرط بالشرط)۔

”القول الجامع لبعض المحققين: أنه فاسد فی حق بعض الأحكام حتی ملک کل منهما الفسخ، صحیح فی حق بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع البیع، ورهن فی حق البعض حتی لم تملك مشتری بیعه من آخر ولا رهنه، وسقط الدين بهلاكه فهو مركب من العقود الثلاثة كالزرافة فيها صفة البعير والبقر والنمر جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما قال فی البحر:

الغرض ”بیع الوفاء“ کے متعلق احناف کے نزدیک اختلاف ہے۔ بعض نے اس کو بیع صحیح، بعض نے بیع جائز غیر لازم، بعض نے فاسد اور بعض نے اس کو رہن اور بعض نے اس کو بیع اور رہن سے مرکب مانا ہے۔ عرف، تعامل اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس زمانہ میں ”بیع الوفاء“ کو جائز قرار دیا جانا چاہئے، کیونکہ عرف و حاجت کی وجہ سے بہت سی چیزیں جائز ہو جاتی ہیں، جیسا کہ ”بیع استصناع“ دراصل معدوم شئی کی بیع ہے اور جو چیز موجود نہ ہو اس کو بیچنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا، لیکن عرف و ضرورت کی وجہ سے بیع استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے اسی طرح اس کو بھی جائز قرار دیا جانا چاہئے۔ فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ ضرورت کی وجہ سے ممنوع چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں۔

شیخ الاسلام ابو عبد اللہ محمد بیرونی الثانی المتوفی ۷۱۲ھ، جو علامہ شامی کے ہم عصر ہیں، انہوں نے بھی اسی کو پسند کیا ہے کہ بیع الوفاء کو جائز قرار دیا جائے کیونکہ تعامل کی وجہ سے بسا اوقات قواعد کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اسی اصل کی بناء پر استصناع جائز ہے، حالانکہ وہ معدوم شئی کی بیع ہے۔ اس زمانہ میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اور اس کو کلی طور پر ناجائز قرار دینا لوگوں کو ایسے سود پر آمادہ کرنا جو علانیہ حرام ہے۔

”وحجة هؤلاء في اعتبار ه على هذا الوجه احتياج الناس إليه وتعاملهم به، والقواعد تترك بالتعامل، ولهذا الوجه جاز الاستصناع مع أن قاعدة امتناع بيع المعدوم تباها، وما ضاق على الناس امر إلا اتسع... ومما لا ريب فيه أن الناس إذا كانت لهم حاجة إليه في تلك الاغصار على فضلها، فهم إليه في هذا العصر على وضوح اختلاله أحوج، وقد فشا التعامل به في ديارنا فاشوا خارجا عن الحد... وأما منعهم من التعامل به جملة بعد هذا الفشو والحاجة الشديدة إليه، فحامل لهم على الهجوم على الربا المجمع على تحريمه جهارا“ (الوفاء بما يتعلق ببيع الوفاء: واما الفضول فاو لها فيما يرجح الوفاء اليه من العقود ۹۳)۔

اس لئے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اس کو بیع اور رہن کا مرکب مانا جائے۔ جیسا کہ علامہ زبلی نے فرمایا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے اور علامہ ابن نجیم مصری نے فرمایا کہ اس قول سے عدول نہی کرنا چاہئے۔

(الف) بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

بیع الوفاء کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گرچہ اس کی تعریف میں فرق ہے، لیکن اس کے احکام میں کافی حد تک یکسانیت ہے، اسی لئے جن حضرات کے یہاں بیع الوفاء جائز ہے، ان کے یہاں اس کی صراحت ملتی ہے کہ اگر بیع کے بعد بطور وعدہ ان دونوں نے شرط لگائی تو اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا (بحوالہ سابق) اس لئے مشتری بیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ نہیں بیچ سکتا اور جن حضرات نے اس (وفاء) کو بیع اور رہن سے مرکب مانا ہے، ان کے یہاں بھی اس حکم کی صراحت ہے کہ مشتری اس کا قبضہ یا اس کی ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتا ہے، اس لئے اس شرط کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔

(ب) مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟ جن حضرات نے ”بیع الوفاء“ کو بیع صحیح قرار دیا ہے تو انہوں نے مشتری کے لئے اس بیع سے صرف انتفاع کو جائز قرار دیا ہے، فروخت کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہے، نیز معاہدہ اس پر ہوا ہے کہ ثمن اول کے لوٹانے پر بیع واپس کر دی جائے گی، اسی لئے مالک اول کو بیچنے میں صرف سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(ج) خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟ خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس کے لئے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔ کیونکہ یہ مشتری کے حق میں بیع ہے اور بیع میں مشتری کو بیع سے استفادہ کا پورا اختیار رہتا ہے۔

”وذكر الزيلعي: أن الفتوى على أنه بيع جائز مفيد لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (البحر الرائق: تعلیق خیار الشرط بالشرط)۔

(د) خریدار اگر کسی دوسرے سے بیچدے تو اس بیع کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اسکی کیا حیثیت ہوگی؟ سطور بالا میں گزر چکا ہے کہ بیع الوفاء کو بیع اور رہن کا مرکب مانا جائے گا تو مشتری کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ بیع کو دوسرے کے ہاتھ بیچ دے۔ اس لئے کسی دوسرے سے بیچنے کی صورت میں وہ بیع درست نہ ہوگی اور مشتری ثانی سے قیمت لینا بھی درست نہ ہوگا، بلکہ مشتری اول پر لازم ہوگا کہ جب بائع اول ثمن واپس کرے تو بیع اس کے حوالے کر دے۔

”فلم يملك المشتري تحويل يده وملكه إلى غيره وأجبر على الرد إذا أحضر الدين“ (البحر الرائق: تعلیق خیار الشرط بالشرط)۔

”إلا أنه لا يملك بيعه للغير“ (البحر الرائق: تعلیق خیار الشرط بالشرط)۔

۳- آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت کی وجہ سے کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟

درج بالا جو صورت ذکر کی گئی اس کو امانت نہیں کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس پر اس کی تعریف صادق نہیں آتی۔ امانت کی تعریف مندرجہ ذیل ہے:

”الابداع... هو لغة من الودع أى الترك، وشرعا تسليط الغير على حفظ ماله صريحا أو دلالة“ (الدر المختار على هامش الرد، کتاب الابداع ۱۲/۱۳۸)۔

اوپر جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں وہ اپنی رقم کی حفاظت کے لئے مکان مالک کو مسلط نہیں کرتا ہے، اسی لئے

اس کو امانت کہنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح اس کو رہن بھی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس کی تعریف بھی اس پر صادق نہیں آتی ہے، رہن کی تعریف یہ ہے۔

”الرهن... هو... شرعا حبس شیئی مالی... بحق یمكن استیفاء و... منه“ (الدر المختار)۔

اوپر جو صورت بیان کی گئی ہے اس میں مکان یا دوکان کے عوض میں وہ رقم مالک مکان کے پاس جمع نہیں کرتا ہے۔ اسی لئے اس کو رہن بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ آخر اس کو قرض ہی کہنا ہوگا اور قرض سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اور پیشگی رقم کے بدلہ میں کرایہ کم کرنا قرض سے فائدہ اٹھانا ہی سمجھا جائے گا، کیونکہ وہ اگر پیشگی رقم جمع نہ کرے تو اس کو مکان بھی کرایہ پر نہیں ملے گا۔ اس سے واضح ہے کہ اس صورت کو قرض پر نفع اٹھانا سمجھا جائے گا جو کہ ناجائز ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ مکان مالک یہ کہے کہ تم دس لاکھ روپے دیدو اور یہ مکان کرایہ پر لے لو، جمع شدہ رقم میں سے تمہارے کرایہ کی رقم ہر ماہ کٹتی رہے گی، اور اس کے علاوہ بھی دس ہزار کی رقم مثلاً ہر ماہ تم کو دینا ہوگا، تو اس میں جواز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سوالنامہ میں جس مسئلہ کے بابت پوچھا گیا ہے اس کے متعلق فقہ اکیڈمی ہند کے ایک سیمینار کی تجویز میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ پگڑی سے متعلق سیمینار کی تجویز میں اس کی وضاحت ملاحظہ ہو:

”مالک مکان زرضمانت وڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے بہتر ہے کہ اس کو بعینہ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کر دے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کر دے“۔

{ خلاصہ کلام }

حاصل یہ ہے کہ سود سے بچنے کے لئے ”بیع الوفاء“ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اسی لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیع الوفاء کو لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے بیع اور رہن کا مرکب مان کر جائز قرار دیا جائے۔ جائز ہونے کی صورت میں بیع الوفاء کے لئے درج ذیل احکام ہوں گے:

۱- خریدار بیع سے فائدہ اٹھانے کا حقدار ہوگا۔

۲- خریدار کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ بیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے۔

۳- بائع جب ثمن کو لوٹا دے تو خریدار پر بھی لازم ہوگا کہ بیع بائع کے حوالہ کر دے۔

۴- معاملہ اس طرح کرے کہ پہلے بغیر شرط کے بیع کر لی جائے، بعد میں بطور وعدہ شرط و فاء کا تذکرہ کیا جائے۔

جن حضرات کے یہاں بیع الوفاء رہن ہے، تو رہن کی صورت میں بھی اگر بائع خریدار کو رہن سے فائدہ اٹھانے کی

اجازت دیدے تو اس کے لئے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔

بیع و فاء کی شرعی حیثیت

مولانا نعیم اختر قاسمی ☆

کتب فقہ میں بیع کی ایک خاص قسم کا ذکر ملتا ہے، جسے ”بیع و فاء“ کہتے ہیں، اس میں بیع موبد ہونے کے بجائے موقت، یعنی ایک خاص وقت تک کے لئے ہوتی ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بائع (جسے اصلاً رقم کی ضرورت ہوتی ہے) کوئی سامان اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ جب وہ رقم مشتری کو لوٹا دے گا تو بائع بھی اس کا سامان واپس کر دے گا، چونکہ اس میں مشتری سے ایک وعدہ پورا کرنے کی شرط ہوتی ہے، اس لئے اسے ”بیع و فاء“ کہتے ہیں (شامی ۷/۵۴۵)۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بظاہر تو یہ ایک مشروط بیع کا معاملہ ہے، لیکن معنی و مقصد کے لحاظ سے اس کی صورت رہن کی ہے، چونکہ اس معاملہ کے دورخ ہیں، ظاہری اور معنوی اس لئے اس کے حکم کے تعیین میں فقہاء کی آراء بھی مختلف ہیں، اس سلسلہ میں صاحب فتاویٰ بزازیہ نے نو (بزازیہ علی الہندیہ ۳۰۵/۳-۳۱۰)، اور علامہ ابن نجیم نے آٹھ اقوال ذکر فرمائے ہیں (البحر الرائق ۷/۷۶)، لیکن قابل ذکر تین قول ہیں۔

۱- یہ درحقیقت رہن کا معاملہ ہے، لہذا رہن کے سارے مسائل اس سے متعلق ہوں گے، مثلاً مشتری اس کا مالک نہ ہوگا، بائع کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہوگا۔ اس کے منافع کو استعمال کرنے کی صورت میں اس کا ضامن ہوگا، اگر بیع اور شمن کی قیمت برابر ہو تو ہلاک ہونے کی صورت میں دین ساقط ہو جائے گا، اگر بیع کی قیمت زیادہ ہو تو زائد کا ضامن نہ ہوگا۔ دین کی ادائیگی کے وقت بائع اسے واپس لے لے گا (بزازیہ علی الہندیہ ۳۰۵/۳)، اکثر علماء کی یہی رائے ہے (شامی ۷/۵۴۶)۔

۲- دوسرا قول یہ ہے کہ تعامل و ضرورت کی وجہ سے یہ بیع جائز ہے اور مشتری پر اس شرط کا پورا کرنا لازم ہے (بزازیہ علی الہندیہ ۳۰۶/۳)۔

۳- تیسرا قول یہ ہے کہ یہ معاملہ بیع فاسد، صحیح اور رہن تینوں سے مرکب ہے، بعض احکام میں یہ بیع فاسد ہے، چنانچہ دونوں کو فسخ کا اختیار ہے۔ بعض احکام میں یہ بیع صحیح ہے، چنانچہ بیع کا منافع اس کے لئے حلال ہے، اور بعض احکام

کے اعتبار سے یہ رہن ہے، چنانچہ مشتری اسے کسی اور کے پاس نہ تو رہن رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے بیچ سکتا ہے وغیرہ (شامی ۵۴۶/۷، بحر ۸/۶)، اسے قول جامع قرار دیا گیا ہے اور صاحب ”البحر الرائق“ کی رائے میں اسی قول کو مفتی بہ ہونا چاہئے (بزاز علی الہندیہ ۴۰۸/۳)۔

چونکہ اس معاملہ میں اقوال کے اختلاف کے ساتھ ساتھ تصحیح میں بھی علماء کی رائیں مختلف ہیں، اس لئے ترجیح کا تعین کرنے کے لئے یہ بات دیکھنی ہوگی کہ کون سا قول مقصد بیع سے قریب تر اور مزاج شریعت سے ہم آہنگ ہے؟ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہر شرعی معاملہ کا ایک خاص مقصد اور اس کے انعقاد کی ایک خاص صورت ہوتی ہے، مثلاً کوئی شخص کسی سے کوئی سامان اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے بغیر اجرت کے حاصل کرتا ہے تو اسے اعارہ یا عاریت سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے مسائل اور احکام الگ ہیں۔

اور اگر اجرت دے کر حاصل کرتا ہے تو اسے اجارہ کہتے ہیں اس کے احکام و مسائل جدا ہیں۔ کبھی کسی چیز کا مالک بن کر خود مختاری کے ساتھ اس میں تصرف کرنا چاہتا ہے تو اس کی قیمت ادا کر کے اسے حاصل کر لیتا ہے، اسے بیع کا نام دیا جاتا ہے، اس کے احکام و مسائل مختلف ہیں۔ کبھی کسی کی مثلی چیز کی ذات سے فائدہ اٹھا کر اس کا مثل واپس کرتا ہے اسے قرض یا دین سے موسوم کرتے ہیں اس کے احکام و مسائل کی نوعیت اور ہوتی ہے۔

کبھی قرض دیتے وقت دائن اپنے اطمینان کے لئے مدیون کا کوئی سامان قرض کی واپسی تک اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اسے اصطلاح شریعت میں رہن کا نام دیا جاتا ہے، اس کے احکام و مسائل کی صورت دوسری ہوتی ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ اب لائق توجہ بات یہ ہے کہ ”بیع وفاء“ میں متعاقدین اس معاملہ کو بیع کا نام تو دیتے ہیں، مگر ایک ایسی شرط کا اضافہ کرتے ہیں جو اسے بیع کی حقیقت سے یکسر خارج کر دیتی ہے، کیونکہ بیع کا مقصد اور اس کی روح یہ ہے کہ متعاقدین ایک دوسرے کی چیز کے اس طرح مالک بن جائیں کہ ایک کو دوسرے کی چیز سے کوئی سروکار نہ رہے، اسی لئے بیع موقت درست نہیں ہے، ”عالمگیری“ میں ہے:

”ومنها أن لا یکون موقتاً، فإن أقتنه لم یصح“ (ہندیہ ۳/۳)۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

”لأن العقد یقتضی الملك والملک یقتضی إطلاق التصرف فی المملوک“

(بدائع ۳۸۷/۳)۔

(کیونکہ عقد بیع کا تقاضا ملک ہے اور ملک کا تقاضا یہ ہے کہ مملوک میں ہر طرح کے تصرف کی اجازت ہو)۔

فقہاء نے شروط بیع کے صحیح ہونے کی جو صورتیں بیان کی ہیں ان میں شرط کے باوجود بیع کی حقیقت برقرار رہتی ہے،

مثلاً:

۱- بیع خود اس شرط کی متقاضی ہو، مثلاً تسلیم بدلیں کی شرط۔

۲- شرط مقتضائے عقد کے موافق ہو، مثلاً ادھار بیع میں بائع یہ شرط لگائے کہ ثمن کے بدلے مشتری کوئی سامان

رہن رکھے۔

۳- شریعت میں اس کا ثبوت ہو، جیسے خیار شرط۔

۴- اس شرط کا تعادل ہو، جیسے تسمہ لگانے کی شرط پر ”نعل“ خریدنا (بزاز یہ علی البندیہ ۳/۴۲۳)۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ”بیع وفاء“ میں جو شرط عائد کی جاتی ہے وہ بیع کو اس کی حقیقت سے خارج کر دیتی ہے، لہذا اسے کم از کم بیع کا نام تو نہیں دیا جاسکتا، تو کیا اس پورے معاملہ کو سرے سے کالعدم قرار دیا جائے؟ جیسا کہ ایک قول یہ بھی ہے

(بزاز یہ علی البندیہ ۳/۴۰۸)۔

فقہ کا ایک قاعدہ ہے کہ ”اعمال الکلام اولیٰ من اہمالہ، جس کا حاصل یہ ہے کہ عاقل و بالغ شخص کے کلام کو لغو ہونے سے بچانا اولیٰ ہے، لہذا اس پورے معاملہ کو جب ایک دوسری حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو معاملہ ”بیع وفاء“ کا نام دے کر کیا جاتا ہے رہن کے اندر بعینہ یہی صورت ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ اس مقصد کے لئے شریعت نے ایک دوسرے معاملہ (رہن) کو مشروع کیا ہے اور عقود میں اعتبار معانی و مقاصد کا ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا مثلاً کفالتہ بشرط البراء، حوالہ ہے اور حوالہ بشرط عدم البراءۃ کفالتہ (ہدایہ ۳/۸۸، کتاب الکفالتہ)، لہذا اس معاملہ کو رہن قرار دے کر اس پر رہن کے سارے احکام جاری ہوں گے، جیسا کہ پہلے قول میں بیان کیا گیا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جب یہ صورت رہن کی ہے تو متعاقبین اسے بیع کا نام کیوں دیتے ہیں؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ چونکہ رہن میں مرتہن کا شبہی مرہون سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوتا، کیونکہ حدیث میں ہے: ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ اس لئے اسے بیع کا نام دیتے ہیں، تاکہ اس صورت میں مشتری کا بیع سے فائدہ اٹھانا درست ہو جائے، گویا دائن کا اپنے دین کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کا یہ ایک حیلہ ہے اور ایسا حیلہ جس سے کسی حکم شرعی کا مقصد ہی فوت ہو جائے درست نہیں، علامہ شامی ”فتاویٰ نسفی“ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

”البيع الذی تعارفہ اهل زماننا احتیالاً للربا وسموہ ببيع الوفاء هو رهن فی الحقیقۃ“ (شامی

۵۴۶/۷)۔

(ربا کے حیلہ میں ہمارے زمانے میں بیع وفاء کے نام سے جس بیع کا عرف ہے وہ دراصل رہن ہے)۔

”جوہر الفتاویٰ“ کے حوالہ سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

”فهذا البيع باطل وهو رهن، وحكمه حكم الرهن وهو الصحيح“ (شامی ۵۳۵/۷)

(یہ بیع باطل ہے اور یہ معاملہ رهن کا ہے اس پر رهن کے احکام جاری ہوں گے، یہی صحیح قول ہے)۔

”فتاویٰ خیریہ“ کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:

”والذی علیہ الأكثر أنه رهن لا يفترق عن الرهن فی حکم من الأحکام“ (بدائع ۵۳۶/۷)

(اکثر علماء کی رائے میں یہ رهن ہے، رهن کے کسی بھی حکم میں اس سے علاحدہ نہیں ہے)۔

لہذا اس معاملہ کو رهن قرار دینے والا قول ناچیز کے خیال میں راجح ہے، اگر کسی علاقے میں اس بیع کا عرف بھی ہو گیا ہو تو نوص سے متصادم ہونے کی وجہ سے عرف فاسد ہے جو معتبر نہیں۔

رهن سے فائدہ اٹھانا:

رهن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دائن اپنے قرض کی وصولیابی کے تعلق سے مطمئن رہے یہ گویا ایک قسم کا وثیقہ ہوتا ہے اور بس۔ اسی لئے مرتہن کو فقط حق حبس حاصل ہوتا ہے، نہ کہ حق انتفاع، ”لأن عقد الرهن يفيد ملك الحبس لا ملك الانتفاع“ (بدائع ۲۱۲/۵)۔

لیکن راہن اگر مرتہن کو رهن سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے تو اس کے متعلق تین قول ہیں:

۱- مطلقاً جائز ہے۔

۲- مطلقاً ناجائز ہے۔

۳- اگر مرتہن نے انتفاع کی شرط لگائی تھی تو ناجائز ہے، ورنہ جائز (درمختار علی ہامش الرد ۳۱۰/۵)۔

علامہ شامی نے اس مسئلہ پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ہے اور راہن کی اجازت سے نفع اٹھانے کو معتبر متون کے حوالہ سے درست قرار دیا ہے، تاہم ان کا رجحان مطلقاً (خواہ انتفاع کی شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو) ناجائز ہونے کا لگتا ہے ان کی عبارت ہے:

”والغالب من أحوال الناس يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا

بمنزله..... الشرط؛ لأن المعروف كالمشروط، وهذا مما يعين المنع“ (رد المحتار ۳۱۱/۵)

(لوگوں کا حال عموماً یہ ہوتا ہے کہ وہ قرض دیتے وقت اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو قرض ہی نہ

دیں، یہ عمومی حال شرط کے درجہ میں ہے، کیونکہ جو چیز معروف ہوتی ہے وہ گویا مشروط ہوتی ہے، اس لحاظ سے انتفاع کا

نا درست ہونا متعین ہو گیا)۔

لیکن ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غیر مشروط معاملہ مکمل ہو جانے کے بعد دوسری مجلس میں یا کسی دوسرے وقت میں مرتہن راہن سے رہن سے فائدہ اٹھانے کی اجازت مانگے اور راہن اسے اجازت دیدے یا راہن از خود مرتہن کو اس کی اجازت دیدے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

چونکہ معاملہ جب یہاں مکمل ہو گیا اور قرضدار نے بغیر کسی شرط کے قرض حاصل کر لیا تو پھر بعد میں مرتہن کو انتفاع کی اجازت دینے میں ”المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً“ والی صورت نہیں پائی گئی، اس لئے یہ صورت درست ہونی چاہئے اور رہن سے انتفاع جائز ہونا چاہئے، گویا یہ سمجھا جائے گا کہ راہن اپنا مال مرتہن کو عاریت پر دے رہا ہے اور یہ جائز ہے، اور یہ ایسا ہی ہو گیا، جیسا بغیر کسی سابقہ شرط کے مدیون کا دائن کو اضافہ کے ساتھ قرض واپس کرنا، البتہ ایسی صورت میں جب تک مرتہن اس سے فائدہ اٹھاتا رہے گا وہ سامان رہن کے بجائے عاریت تصور کیا جائے گا انتفاع کے بعد پھر دوبارہ وہ رہن سمجھا جائے گا، ”فتاویٰ ہندیہ“ میں ہے:

”ولو كان الرهن مصحفاً أو كتاباً ليس له أن يقرأ فيه بغير إذنه، فإن كان بإذنه فما دام يقرأ فيه كان عارية، فإذا فرغ عنها عاد رهننا كذا في السراجية“ (الفتاویٰ الہندیہ ۴۶۶/۵)۔

(اگر رہن قرآن یا کوئی کتاب ہو تو راہن کی اجازت کے بغیر اس کا پڑھنا جائز نہیں اگر اجازت سے پڑھ رہا ہے تو پڑھنے کے دوران اسے عاریت سمجھیں گے اس سے فارغ ہونے کے بعد پھر دوبارہ رہن ہو جائے گا)۔
مرتہن کا رہن کو اجرت پر لینا:

یہ درست ہے اور اس کی حیثیت رہن سے ہٹ کر اجارہ کی ہو جائے گی، ہندیہ کی عبارت ہے:

”و كذلك لو استاجرہ المرتہن صحت الإجارة وبطل الرهن إذا جدد القبض للإجارة“

(الفتاویٰ الہندیہ ۴۶۵/۵)۔

(ایسے ہی اگر مرتہن نے رہن کو اجرت پر لیا تو اجارہ درست اور رہن باطل ہو جائے گا، جبکہ اجارہ کے لئے از سر نو قبضہ کیا ہو)۔

جب یہ معاملہ اجارہ کا ہو گیا تو اب مستاجر اس میں کاشت وغیرہ کے ذریعہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

اب اجارہ کا تقاضا تو یہی ہے کہ مستاجر (مرتہن) اس کا مروجہ کرایہ ادا کرے، لیکن اگر دونوں فریق مروجہ کرایہ سے کم پر معاملہ کر لیتے ہیں تو چونکہ انہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے، اس لئے یہ معاملہ قضاء درست ہو جائے گا، لیکن ایسا کرنے میں مرتہن گویا قرض دینے پر نفع اٹھانا چاہتا ہے کہ اس کا کرایہ معمول سے بہت کم متعین کرتا ہے اور راہن اس کے احسان کا بار محسوس کرتے ہوئے اس کی رعایت میں بادل ناخواستہ اسے قبول کرتا ہے، اس لئے یہ دیانت کے خلاف ہے اور ”کحل

قرض جو نفعاً فہو ربا“ کے تحت داخل ہے، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

”شرعاً اجرت کے تعین کا معیار باہمی معاہدہ ہے، یعنی باہمی رضامندی سے جو اجرت مقرر کر دی جائے وہ شرعاً جائز ہے، البتہ ہر فریق پر دینا تائبہ واجب ہے کہ وہ دوسرے فریق کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسی اجرت مقرر نہ کرے جو اپنی کارکردگی کے لحاظ سے عرفاً نا کافی یا بہت زائد ہو“ (فتاویٰ عثمانی ۳۸۶/۳، کتاب الاجارۃ)۔

مشتری (مرتبہن) کا رہن کو بیچنا:

چونکہ رہن کا مالک رہن ہی ہوتا ہے، اس لئے مرتبہن کو اسے بیچنے کا حق نہیں ہے اگر بیچنے کا تو رہن کی اجازت پر موقوف ہوگا (بدائع ۲۱۲/۵)۔

زر ضمانت قرض ہے:

دکان و مکان کا مالک اپنے کرایہ دار سے پیشگی ایک بڑی رقم حاصل کرتا ہے جسے زر ضمانت، ڈپازٹ، سیکورٹی وغیرہ نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب کرایہ دار دکان و مکان خالی کرے تو اگر اس میں کوئی نقصان کیا ہو تو اس کے ذریعہ اس کا ضمان لیا جاسکے، اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور یہ معاملہ اجارہ بشرط القرض کا ہے اور چونکہ اس شرط کا عرف عام ہے، اس لئے جائز ہے، جیسا کہ فتاویٰ عثمانی میں لکھا ہے (فتاویٰ عثمانی ۴۱۹/۳ کتاب الرہن)۔

ایک استفتاء کے جواب میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ”ڈپازٹ کی رقم کو رہن اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ رہن بالدرک صحیح نہیں ہوتا کما فی الہدایہ وغیرہا، ”والرہن بالدرک باطل، والکفالة بالدرک جائزۃ الخ“، ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا، محض محتمل ہوتا ہے، لہذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے یہ قرض ہی ہے اور مشروط بحکم العرف ہے“ (فتاویٰ عثمانی ۴۲۱/۳ کتاب الرہن)۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ایک بڑی رقم پیشگی حاصل کرنے کے لئے مالک جو کرایہ میں غیر معمولی کمی کرتا ہے تو اس کی وجہ سے کرایہ دار، یعنی قرض دینے والا ایک فائدہ حاصل ہو رہا ہے، تو کیا اسے قرض پر نفع اٹھانا سمجھا جائے اور اس نفع کو سود قرار دیا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نوعیت تھوڑی مختلف ہے، یہاں پر اصلاً مالک ایک بڑی رقم، یعنی قرض کا محتاج ہے، اس لئے وہ کرایہ میں کمی کر کے لوگوں کو اپنی ضرورت کی تکمیل پر آمادہ کر رہا ہے، اب اگر کوئی کرایہ دار جسے کسی دکان یا مکان کی ضرورت ہو اس کی شرط منظور کر لیتا ہے تو اس کی حیثیت اصلاً دائن کی نہیں ہے، بلکہ مستاجر کی ہے اور ہونے والا نفع ایک ضمنی نفع ہے، لہذا اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

بیع و فاء اور دیگر متعلقہ احکام

مولانا ارشاد رساوا

اولاً: بیع و فاء کی دو صورتیں ہیں:

اول مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا، بلکہ شب و روز لوگ جس طرح بیع کرتے ہیں اسی طرح بیع ہوئی بعد میں کسی اور مجلس میں واپسی کا تذکرہ کیا گیا اور مشتری نے اسکو منظور کر لیا تو شرعاً یہ بیع درست ہے، اب مدت پوری ہو جانے پر بائع مشتری کو واپسی پر مجبور نہیں کر سکتا۔

”وان ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر البیع بینہما علی وجہ المواعدة جاز البیع، ویلزم الوفاء بالوعدہ“ (فتاویٰ تاتارخانیہ ۹ ص ۲۰۵ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

(الف) جب مشتری اس چیز کا مالک ہو چکا ہے تو بائع کی طرف سے واپسی پر اسکو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہاں وہ وعدہ دے چکا ہے، اسلئے دیانتہ واپسی کرنی چاہئے، جبکہ مشتری کو اپنی ذاتی ضرورت نہ ہو اور واپسی کرنے میں مصلحت کے خلاف نہ ہو اور اگر مشتری کو اس چیز کی ضرورت ہے یا اور کسی مصلحت کی بناء پر واپسی میں دشواری ہے، جبکہ وعدہ کرتے وقت واپسی کا پورا ارادہ تھا تو گناہ بھی نہ ہوگا۔

(ب) مالک اول کو بیچنے کی صورت میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لیگا، اسلئے کہ اسی قیمت پر واپسی کرنے کا وعدہ کر چکا ہے، اگر زائد قیمت لیگا تو گناہ ہوگا، البتہ اسی قیمت پر بیچنے پر بائع مشتری کو مجبور نہیں کر سکتا کیونکہ آدمی اپنی چیز کی جو چاہے قیمت لگا سکتا ہے۔

”عن زید بن ارقم (عن النبی ﷺ قال: إذا وعد الرجل أخاه ومن نيته أن يفى له فلم يف) بعذر (ولم يجئ للميعاد) لمانع (فلأثم عليه) قال الأشرف هذا دليل على أن النية الصالحة يثاب الرجل عليها، وإن لم يقترب معها المنوى وتخلف عنها ومفهومه أن من وعد وليس من نيته أن يفى فعلية الإثم سواء وفى به أو لم يف، فإنه من أخلاق المنافقين ولا تعرض فيه لمن وعد ونيته أن يفى ولم يف بغير عذر فلا دليل لما قبل من أنه دل على أن الوفاء بالوعد ليس بواجب إذ هو أمر مسكوت عنه“ (مرقات المفاتيح ۹ ص ۱۰۳ مکتبہ فیصل پبلیکیشنز)۔

(ج) خریدار اس چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اسلئے کہ اس کی ذاتی چیز ہے اور آدمی اپنی چیز میں جو چاہے تصرف کر سکتا ہے۔

(د) مجلس عقد میں چونکہ واپسی کا کوئی ذکر نہ تھا، اسلئے یہ بیع شرعاً درست ہونے کی وجہ سے مشتری اس چیز کا مالک بن چکا ہے اور آدمی اپنی چیز کے بارے میں آزاد ہوتا ہے جسکو چاہے بیچے اور جو قیمت لگانا چاہے لگاوے، البتہ بائع اول سے واپسی کا وعدہ کر چکا ہے، اس لئے بغیر کسی معقول عذر کے کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ بیچنے کا تو گناہ ہوگا۔

(۲) ”ومن اشترى شيئاً وأغلى في ثمنه فباعه مرابحة على ذلك جاز“ (فتاویٰ ہندیہ ۳ / ۱۶۱ مکتبہ دارالکتب دیوبند)۔

ثانی: بیع و فاء کی دوسری صورت

بیع ہوتے وقت ہی بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا تذکرہ کیا گیا اور مشتری نے اسکو منظور کر لیا تو اس شرط کے تقاضے عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہو جائیگی، ہاں یہ شکل چونکہ بعینہ رهن کی ہے اور عقود میں معنی کا اعتبار ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا، لہذا حکماً یہ رهن کا معاملہ ہو جائے گا، اس لئے رهن کے تمام احکام اس میں جاری ہونگے۔

”وفی حاشیة الفصولین عن جواهر فتاوی: أن یقول: بعت منك علی أن تبعه منی متی جئت بالثمن، فهذا البیع باطل، وهو رهن، وحكمه حکم الرهن، وهو الصحيح“ (رد المحتار ۷ / ۴۲۳ مکتبہ دارالکتب دیوبند)۔

(الف) جب یہ معاملہ رهن کا معاملہ ہو گیا تو جب تک یہ چیز مشتری کے پاس رہے اسکے لئے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اگر فائدہ اٹھائیگا تو سود ہو جائیگا، چاہے بیچنے والا اٹھانے کی اجازت دیوے تو بھی فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ربا (سود) میں اجازت دینا ہے جسکا اعتبار نہیں۔

”وعن عبد الله محمد ابن اسلم السمر قندی وکان من كبار علماء سمر قند أنه لایحل له (للمرتھن) أن ینتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن: لأنه أذن له فی الربا؛ لأنه یرتفعی دینہ کاملاً فتبقى له المنتفعة فضلاً، فیکون ربا، وهذا امر عظیم“ (رد المحتار ۱۰ / ۷۰۱ مکتبہ دارالکتب دیوبند)۔

(ب) اگر خریدی جانے والی چیز دکان یا مکان ہے اور خریدار اسکو اس طریقے پر خریدتا ہے کہ اسکا کرایہ ادا کرتا ہے لیکن مروجہ کرایہ سے کم کرایہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ قرض سے کسی بھی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اور مذکورہ شکل میں قرض سے فائدہ اٹھانا لازم آتا ہے ہاں خریدار اس دکان یا مکان کا جو مروجہ کرایہ ہے وہ کرایہ مکمل دیتا ہے تو یہ صورت جائز ہوگی۔

”قال رسول الله ﷺ کل قرض جر نفعاً فهو ربا“ (فتح القدیر ۷ / ۲۳۲ مکتبہ زکریا دیوبند)۔

(ج) جب تک خریدی ہوتی چیز خریدار کے پاس رہے اس عرصہ میں مشتری کے لئے کسی بھی طرح کا فائدہ مطلقاً جائز نہیں ہے خود بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور نہ کسی دوسرے کو کرایہ وغیرہ پر دے سکتا ہے اگر کرایہ پردیا اور کرایہ حاصل کیا تو اسکو مشتری اپنے پاس محفوظ رکھے گا پھر واپسی میں کرایہ کے بقدر بیع کی قیمت میں سے کٹوادے گا۔

” (لا الانتفاع به مطلقاً) لا باستخدام ولا سكنى ولا لبس ولا اجارة ولا اعادة“ (در المختار ۱۰/۷۰۷)

مکتبہ دارالکتب دیوبند۔

(د) چونکہ مجلس عقد میں واپسی کی شرط لگائی گئی تھی جسکے تقاضہ عقد کے خلاف ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہوگئی تھی، اس لئے مشتری کیلئے اس چیز کو کسی سے بیچنا جائز نہیں ہے اگر مشتری نے اسکو بیچ دیا تو بائع کو واپس طلب کرنے کا حق ہے۔

”ولو باعه المشتري (فللبائع أو ورثه حق الاسترداد) أي على القول بأنه رهن“ (در المختار مرجع رد المحتار

ج ۷ ص ۳۲۶ مکتبہ دارالکتب دیوبند۔

ثالث: زر ضمانت کے طور پر رقم اس لئے لی جاتی ہے، تاکہ مکان یا دکان خالی کرتے وقت کرایہ دار نے اگر کوئی نقصان کیا ہو تو اسکا ضمان اس رقم سے لیا جاسکے، لیکن یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا، محض مستقبل میں محتمل ہوتا ہے اور آئندہ زمانہ میں کسی خطرہ کا احتمال ہو تو اس پر رهن درست نہیں ہے، لہذا اس زر ضمان کو رهن نہیں کہہ سکتے، بلکہ احقر کے ناقص خیال میں یہ قرض ہے، اسکی وجہ سے کرایہ میں کمی کرنا یہ قرض سے، فائدہ اٹھانا ہے جو درست نہیں ہے۔

”والرهن بالدرک باطل والكفالة بالدرک جائزة، والفرق أنّ الرهن للاستيفاء ولا استيفاء

قبل الوجوب“ (ہدایہ آخرین ۵۲۷ مکتبہ یاسرندیم دیوبند)۔

بیع الوفاء - مسائل واحکام

مفتی معز الدین قاسمی ☆

بیع الوفاء کی اصطلاحی تعریف:

”بیع الوفاء“ کی تعریف فقہاء نے الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ تقریباً ایک جیسی کی ہے، شامی کے الفاظ ہیں: ”ہو أن يقول البائع للمشتري: بع منك هذا العين بما لك على من الدين على أنى متى قضيتَهُ فهو لى وفى حاشية الفصولين عن جواهر الفتاوى: هو أن يقول: بع منك على أن تبيعهُ منى متى جئت بالثمن“ (شامی دارالکتاب ۷/۴۲۴)۔

”البحر الرائق“ میں ہے: ”و صورتہ أن يقول البائع للمشتري: بع منك هذا العين بدين لك على على أنى متى قضيت الدين فهو لى، أو يقول البائع: بعتك هذا بكذا على أنى متى دفعت لك الثمن تدفع العين إلى“ (بحر ۱۱/۶)۔

”بیع الوفاء عند الحنفية: هو أن يقول البائع للمشتري: بع منك هذا الشيء بما لك على من الدين على أنى متى قضيت الدين فهو لى، وهو أن يبيعه العين على أنه إذا رد عليه الثمن رد عليه العين، ويسمى أيضاً بيع الطاعة، وسماه الشافعية بالرهن المعاد - فى الجملة (م ۱۸۸): هو البيع بشرط أن البائع متى رد الثمن يرد المشتري إليه المبيع“ (القاموس القحصى ۱/۳۸۴ المکتبۃ الشاملۃ، التعريفات للبحر جانی ۱۵/۱)۔

”بیع الوفاء أن بيع السلعة للمشتري بالذى له عليه من الدين على أنه متى قضاء الدين عادت إليه السلعة“ (AMORTGAGE BY CONDITIONAL SALE) (مجموعۃ الفقہاء ۱۱۵/۱، ۵۰۷)۔

ان تمام تعریفات کا حاصل یہ ہے کہ بائع اس شرط کے ساتھ فروخت کرے کہ جب میں بیع کی قیمت لوٹا دوں تو تم بیع مجھے واپس دے دینا۔

شرعی حیثیت و حکم:

بیع الوفاء کے شرعی حکم کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے، مالکیہ، حنابلہ اور حنفیہ و شافعیہ میں سے متقدمین اس کے عدم جواز کے قائل ہیں وہ اس کو بیع فاسد قرار دیتے ہیں، اور متاخرین نے ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز رکھا ہے، اور قائلین جواز بھی اس کو الگ الگ حیثیت میں رکھتے ہیں، چنانچہ ”موسوع فقہیہ“ میں ہے:

”بیع الوفاء کے شرعی حکم کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، مالکیہ، حنابلہ، اور حنفیہ و شافعیہ میں سے متقدمین کی رائے ہے کہ بیع الوفاء فاسد ہے، اس لئے کہ ثمن خریدار کو لوٹانے پر فروخت شدہ چیز کے لینے کی فروخت کرنے والے کی طرف سے شرط لگانا بیع کے تقاضہ اور حکم کے خلاف ہے، بیع کا تقاضہ ہے کہ استقرار و دوام کے طور پر فروخت شدہ چیز پر خریدار کی ملکیت ہو، اور اس شرط میں فروخت کرنے والے کا فائدہ ہے، اس کے جواز کی کوئی معین دلیل وارد نہیں ہے، لہذا یہ شرط فاسد ہوگی اور بیع میں اس کی شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جائے گی۔“

نیز اس لئے کہ اس طریقہ پر بیع کا مقصد حقیقتاً بیع بشرط الوفاء نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد حرام ربو اتک پہنچنا ہوتا ہے، یعنی مال کو ایک مدت تک کے لئے دینا، اور فروخت شدہ چیز کا نفع ہی ربو ہے اور ربو اتک تمام حالات میں باطل ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ کی رائے ہے کہ بیع و فاء جائز ہے اور بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے خریدار کا فروخت شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا، اور بعض احکام کا فائدہ نہیں دیتی جیسے دوسرے کے ہاتھ فروخت، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس شرط پر بیع کا لوگوں میں عرف ہے، لوگوں نے اپنی ضرورت کی وجہ سے اس پر عمل کیا ہے، تاکہ ربو سے بچ سکیں، لہذا یہ صحیح ہوگی اور اس کی شرط لگانے سے بیع فاسد نہ ہوگی، گوکہ وہ قواعد کے خلاف ہے، اس لئے کہ تعال کی وجہ سے قواعد کو ترک کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ استصناع میں ہے (موسوع فقہیہ اردو ۲۸۳/۹)، ”قال فی العلائیہ: وما ضاق علی الناس أمر الا اتسع حکمہ“ (در مختار)۔

”بزازیہ“ نے اس پر طویل بحث کرتے ہوئے فقہاء کرام کے آٹھ اقوال ذکر کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

قول اول:

پہلا قول یہ ہے کہ بیع الوفاء درحقیقت رہن ہے، نہ تو مشتری بیع کا مالک ہوگا اور نہ ہی بائع کی اجازت کے بغیر اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے۔ ”ذکر صاحب المنظومۃ فی فتاواہ: أنه رهن فی الحقیقۃ لایملکہ المشتري ولاینتفع به، إلا بإذن البائع ویضمن ما أکل من نزلہ وأتلف من شجرہ، ویسقط الدین بہلاکہ ولایضمن ما زاد کالأمانة ویسترد عند قضاء الدین؛ لأن الاعتبار بأغراض المتعاقدين، فإن البائع یقول: رهن ملکي والمشتري یقول: ارتهنت ملکة“۔

القول الثانی:

ابن نجیم نے ”بزازیہ“ کے دوسرے قول کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرف کی بنیاد پر مشائخ زمان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، بزازیہ کی عبارت اس طرح ہے: ”اتفق مشائخ الزمان علی صحة هذا البيع؛ لأنهما تلفظا بلفظ البيع ولا عبرة بمجرد النية بلا لفظ، فإن من تزوج امرأة بنية أن يطلقها إذا مضى سنة لا يكون متعة“۔

القول الثالث:

تیسرا قول قاضی خاں کا اختیار کردہ ہے کہ اگر لفظ بیع کے ذریعہ عقد ہو تو رہن نہیں ہوگا۔ ”ما ذکرہ القاضی قال: الصحيح أنه إذا جرى بلفظ البيع لا يكون رهناً ثم إن شرطاً فسخ البيع في العقد وتلفظاً بلفظ البيع بشرط الوفاء أو تلفظاً بالبيع الجائز وعندنا هذا البيع غير لازم فالبيع فاسد، وإن ذكر البيع بلا شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ولزم الوفاء“۔

القول الرابع:

چوتھا قول یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے اور اگر شرط کو بیع کے ساتھ لاحق کیا تو یہ لاحق ہو کر بیع کو فاسد کر دیگی۔ ”قال فی العدة واختاره الإمام ظهير الدين، أنه بيع فاسد ولو شرطاً في البيع يفسد، ولو بعد العقد يلتحق به عند الإمام، وإن شرطاً الوفاء ثم عقداً مطلقاً إن لم يقر بالبناء على الأول فالعقد جائز ولا عبرة بالسابق“۔

القول الخامس:

پانچواں قول یہ ہے کہ بیع مطلق ہو لیکن مشتری کوئی وکیل متعین کر دے کہ جب بائع ثمن حاضر کر دے تو تم بیع فسخ کر دینا حالانکہ ثمن بیع کے برابر نہیں ہے، اس میں غبن فاحش ہے۔ یا یہ کہ مشتری اصل مال پر کچھ نفع رکھ دے تو اس صورت میں وہ رہن ہوگا ورنہ بیع لازم، ”ما اختاره أئمة خوارجهم أنه إذا أطلق البيع، لكن وكل المشتري وكيلاً بفسخ البيع إذا حضر البائع الثمن أو عهد على أنه إذا أوفاه ففسخ البيع، والثلثن ليعادل المبيع، وفيه غبن فاحش، أو وضع المشتري على أصل المال ربحاً، بأن وضع على مائة عشرين ديناراً فرفهن والافات“۔

القول السادس:

چھٹا قول یہ ہے کہ جب بیع میں شرط کا ذکر نہ ہو تو یہ مشتری کے حق میں صحیح ہوگی یہاں تک کہ وہ بیع کو اپنے پاس رکھنے کا مالک ہوگا اور بائع کے حق میں رہن، لہذا مشتری قبضہ اور ملکیت کی تحویل الی غیر کا مالک نہ ہوگا اور جس وقت دین کو حاضر کر دیا جائے تو بیع کے لوٹانے پر اس کو مجبور کیا جائے گا۔ ”ما اختاره البعض واختاره الشيخ الإمام فخر الزاهد

أن الشرط إذا لم يُذكر في البيع نجعلهُ صحيحاً في حق المشتري حتى ملك الإنزال، ورهنًا في حق البائع، فلم يملك المشتري تحويل يده وملكه إلى غيره واجبر على الرد إذا حضر الدين“۔
القول السابع:

ساتواں قول صاحب ہدایہ وغیرہ کا اختیار کردہ ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ مشتری دوسرے سے بیچنے کا مالک نہیں ہوگا، جیسا کہ بیع مکروہ میں ہے؛ بلکہ بیع فاسد بعد القبض کی طرح ہے۔

”أنه لا يصح وعلى هذا اختار صاحب الهداية وأولاده ومشائخ زماننا وعليه الفتوى أعني لا يملك المشتري البيع من الغير، كما في بيع المكروه لا كالبيع الفاسد بعد القبض“۔
القول الثامن:

آٹھواں قول یہ ہے کہ یہ بیع بعض احکام کے حق میں فاسد ہے، بعض احکام کے حق میں صحیح اور بعض کے حق میں رہن ہے۔ ”هو القول الجامع مآقاله بعض المحققين، بأن هذا البيع فاسد في بعض الأحكام حتى ملك كل منهما الفسخ وصحيح في بعض الأحكام كحلّ الإنزال ومنافع المبيع ورهن في حق البعض حتى لم يملك الشاري بيعه من آخر ولا رهنه ولم يملك قطع الشجر ولا هدم البناء“ (بزازیہ علی الھندیہ ۴/۳۰۵، البحر الرائق ۶/۱۱)۔

بعض حضرات اس بیع کو بیع مکروہ کے حکم میں رکھتے ہیں کہ جس طرح مکروہ کی بیع فاسد ہوتی ہے اسی طرح بیع وفاء بھی فاسد ہوگی۔ ”ومن مشائخ بخاری من جعل بيع الوفاء كبيع المكروه منهم الإمام ظهير الدين والصدر الشهيد حسام الدين والصدر السعيد تاج الاسلام... فجعلوه فاسداً باعتبار شرط الفسخ عند القدرة على إيفاء الدين يفيد الملك عند اتصال القبض وينقض بيع المشتري كبيع المكروه؛ لأن الفساد باعتبار عدم الرضاء، فكان حكمه كحكم بيع المكروه في جميع ما ذكرنا“ (تبيين الحقائق شرح كنز كتاب الأكرام ۱۵/۲۲۲، المکتبۃ الشاملۃ، مجمع الأنهر شرح ملینق الأبحر کتاب الأكرام ۷/۷۰۷، عناية ۱۳/۱۵۶)۔

بیع الوفاء کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان اتنا اختلاف ہے کہ کسی ایک جہت کو متعین کرنا دشوار ہے؛ البتہ جو چیز قدرے مشترک سب کے ہاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ رہن کا پہلو ہر ایک کے ہاں غالب نظر آتا ہے، اس لئے کہ وفاء فروخت شدہ چیز کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں فقہاء کرام رہن کو غالب رکھ کر بائع پر بھی وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں، ”وفی بیع الوفاء یجب زکوٰۃ الثمن علی البائع، وعلی قول الزاهد والسرخسی: علی المشتري أيضاً“ (فتح القدير كتاب الزکوٰۃ ۳/۲۸۶)، ”وقالوا فی البیع الذی اعتاده أهل سمرقند وهو بیع الوفاء: إن الزکوٰۃ علی البائع

فی ثمنہ إن بقى حولاً“ (بدائع ۳۹۱/۳)۔

”البيع الذى تعارفه أهل زماننا احتيالا للربا وسموه بيع الوفاء هو فى الحقيقة رهن“ (ہندیہ ۲۰۹/۳، شامی زکریا ۵۴۶/۷) ”قوله (على البائع إن بقى فى يده): أما إذا قبضه المشتري وزرع فيه و أخذ الغلة فالخراج عليه؛ لأنه فى الحقيقة رهن“ (شامی زکریا ۲۷۳/۳)۔

”ولافرق عندنا بينه وبين الرهن فى حكم من الأحكام“ (ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

اس لئے بیع الوفاء کو رهن ہی کے درجہ میں رکھا جانا چاہئے، اور چونکہ فقہاء کرام نے اس کو ضرورت کی بنیاد پر جائز کہا ہے، اس لئے اس سے انتفاع بھی جائز ہوگا، ورنہ تو مشتری (مرتبہن) یہ سمجھ کر کہ اس کو خریدنے کے بعد میرے لئے اس سے انتفاع جائز نہ ہوگا قرض دینے اور خریدنے سے اعراض کرے گا جس کی وجہ سے غیر سودی قرض ملنا دشوار ہوگا اور ضرورت باقی ہی رہے گی، ”لأن صاحب المال لا يقرض، إلا ببيع، والمستقرض محتاج، فأجازوا ذلك لينتفع المقرض بالبيع“ (شامی زکریا ۵۵۱/۷) اور علامہ ابن نجیم کی تجویز کے مطابق قول جامع کو اختیار کیا جانا احسن معلوم ہوتا ہے ”ويبقى أن لا يعدل فى الافتاء عن القول الجامع“ (بجری ۱۳/۶) لیکن دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کے سلسلہ میں مدت متعین کرنا اولیٰ ہے، تاکہ اجل معلوم کے بعد مشتری (مرتبہن) اگر خرید کردہ چیز کو فروخت کر کے مال حاصل کرنا چاہے تو اس پر اس سلسلہ میں کوئی تنگی نہ ہو، ورنہ تو بائع کی ضرورت پوری ہو جائے گی، لیکن مشتری و فاء کی بنیاد پر اس کو فروخت کرنے سے قاصر رہے گا اور اس کی ضرورت پوری نہیں ہوگی۔

مختصر اسوالوں کے جوابات اس طرح ہیں:

۱- یہ معاملہ جو خاص قید و بند کے ساتھ بیع کے عنوان سے ہوتا ہے شرعاً منعقد ہوگا، ”البيع ينعقد بإيجاب و قبول“ اور ابتداءً یہ بیع ہوگا، لیکن نہایت رهن ہوگا۔

(الف) اس شرط کے ساتھ بیع کہ بعد میں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائے بائع سے ہی بچا جائے یہ شرط بیع کو فاسد نہیں کرے گی، ”أنه بيع صحيح لا يفسده الشرط اللاحق“ (شامی زکریا ۵۴۷/۷)۔

لیکن شرط کو پورا کرنا مشتری پر واجب ہوگا۔

”وقد يلزم الوعد لحاجة الناس فراراً من الربا“ (بجری ۱۲/۶)۔

”جاز ولزم الوفاء به“ (درمختار، ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

”لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس“ (درمختار)۔

(ب) مالک اول کو فروخت کرنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی اس سے زائد کا مطالبہ کرنا جائز نہیں، اس

لئے کہ یہ نہایت رهن کے حکم میں ہے۔

(ج) خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہوگا ”(وقیل: بیع یفید الانتفاع بہ) آنہ بیع صحیح مفید لبعض أحكامہ من حل الانتفاع بہ“ (شامی ۵۴۶/۷، بحر ۱۲/۶، بزازی علی الہندیہ ۲۰۹/۳)۔

(د) خریدار اگر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے تو یہ بیع نافذ نہیں ہوگی، بلکہ بائع کو حق ہوگا کہ اپنی چیز کے لوٹانے کا اس سے مطالبہ کرے۔

”ولو باعہ المشتري فلبائع أو ورثته حق الاسترداد“ (در مختار)۔

”ورهن فی حق البعض حتی لم یملک المشتري بیعہ من آخر ولا رهنہ“ (شامی ۵۴۶/۷، بحر ۱۳/۶، بزازی علی الہندیہ ۲۰۹/۳)۔

لیکن ضروری ہے کہ مدت کا تعین ہوتا کہ مشتری کے لئے حرج لازم نہ آئے اور وہ ایک مدت کے بعد اس چیز کو فروخت کر کے اپنی حاجت کو پورا کر سکے، اور اگر مزید قیمت لے تو قرض کی بقدر قیمت کو منہا کر کے بقیہ کا بائع کو لوٹانا واجب ہوگا۔

بیع الوفاء کی حقیقت اور شرعی حکم

مولانا محمد عبید اللہ ندوی ☆

یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے، یہ ظاہراً و لفظاً بیع لیکن قصداً اور حقیقتاً رہن ہے، اس پر رہن کے تمام احکام جاری ہوں گے مثلاً:

الف- خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور حرام ہے، انتفاع مشروع ہو یا معروف، جیسا کہ آج کل اکثر جگہوں پر رواج ہے، کیونکہ یہ ربوا ہے اور ربوا اجازت سے حلال نہیں ہوتا۔

”قال في المنح: وعن عبد الله بن محمد بن اسلم السمرقندي وكان من كبار العلماء في سمرقند أنه لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن، لأنه إذن له في الربا، لأنه يستوفي دينه كاملاً تنبقي له المنفعة فضلاً، فيكون ربا، وهذا أمر عظيم (وقال بعد أسطر): قال الطحاوي: قلت: و الغالب من أحوال الناس أنهم يريدون عند الدفع الانتفاع ولولاه لما أعطاه الدراهم، وهذا بمنزلة الشرط: لأن المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع“ (شامی ۱۱/۵، ۳۱۰)۔

(منع میں فرمایا ہے: کہ عبد اللہ بن محمد بن اسلم سمرقندی جو سمرقند کے بڑے علماء میں سے تھے، سے روایت ہے کہ شئی مرہون سے کسی طرح کا انتفاع درست نہیں ہے، اگرچہ راہن اس کو انتفاع کی اجازت دے دے، اس لئے کہ یہ ربا کی اجازت ہے (اور ربا اجازت سے حلال نہیں ہوتا ہے)، اور اس لئے کہ وہ اپنا دین مکمل وصول کرے گا تو منفعت فضل ہوگی تو یہ ربا ہوگا اور یہ بہت بڑا گناہ ہے، اس کے چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں: امام طحاوی فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ لوگوں کے غالب احوال یہ ہیں کہ وہ دیتے وقت انتفاع کی نیت رکھتے ہیں، اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ (مرہن) دراہم بطور قرض نہیں دے گا، اور یہ شرط کے درجہ میں ہے، اس لئے کہ معروف مشروع کی طرح ہے اور وہ ناجائز ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

”وفي الدر المختار: ثم نقل عن التهذيب أنه يكره للمرتهن أن ينتفع بالرهن، وإن أذن له الراهن قال المصنف: وعليه يحمل ما عن محمد بن أسلم من أنه لا يحل للمرتهن ذلك ولولاه لاذن؛

لأنه ربوا، قلت: وتعليله يفيد أنها تحريمية فتأمله“ (درمختار بحوالہ امداد الفتاویٰ ۳/۵۴، فتاویٰ عثمانی ۳/۱۰۸)۔
(اور درمختار میں ہے: پھر ”تہذیب“ سے نقل کیا گیا ہے کہ مرہن کے لئے شیء مرہون سے انتفاع مکروہ ہے اگرچہ راہن اس کی اجازت دے دے، مصنف فرماتے ہیں کہ: محمد بن اسلم سے جو یہ منقول ہے کہ مرہن کے لئے یہ حلال نہیں ہے، اگرچہ با اجازت ہوں، اس لئے کہ وہ ربوا (سود) ہے، اس کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا، میں کہتا ہوں کہ اس کی تعلیل اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ وہ مکروہ تحریمی ہے۔“)

ب- یہ صورت بھی ناجائز ہے، کیونکہ یقینی بات ہے کہ بائع کی طرف سے یہ رعایت (مروجہ کرایہ سے کم پر رضامندی) اسی قرض کی وجہ سے ہے اور ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ (اعلاء السنن ۱۳/۵۱۲) کے کلیہ میں داخل ہے اگر مشروط ہو تب تو ظاہر ہے اگر مشروط نہ بھی ہو تب بھی ”المعروف کا مشروط“ کے تحت ناجائز ہے۔

ج- خریدار کو بیع وفا کی صورت میں اس شیء سے کسی طرح کا فائدہ (مثلاً بیع، وقف، رہن، کاشت، اجارہ وغیرہ) اٹھانے کا اختیار نہیں ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں نے اسے عقد بیع مانا ہے ان کے نزدیک بھی صرف نفس انتفاع جائز ہے، لیکن آگے کسی کو بیچنا وقف وغیرہ کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، چنانچہ درمختار میں ہے: ”الانتفاع به مطلقاً، لا باستخدام ولا سكنی ولا لبس ولا اجارة ولا اعادة سواء كان من مرتهن أو راهن، إلا باذن كل للآخر، وقيل: لا يحل للمرتهن، لأنہ ربا، وقيل: إن شرطه كان ربا، والا فلا“ (اعلاء السنن ۱۳/۵۱۲)۔

(اس سے (شیء مرہون) مطلقاً کسی طرح کا انتفاع جائز نہیں ہے نہ استعمال، نہ سکونت نہ پہننا، نہ اجارہ وغیرہ پر دینا چاہے راہن کی طرف سے، ہو یا مرہن کی طرف سے الا یہ کہ ایک ایک دوسرے کو اجازت دے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مرہن کے لئے حلال نہیں، اس لئے کہ ربا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر شرط کی ہو تب تو حلال نہیں، ورنہ حلال ہے۔ اور اگر کاشت کی زمین میں یا اجارہ پر دے دیا تو وہ تمام منافع و آمدنی راہن کی ہوگی اور مرہن پر شیء مرہون کی واپسی کے وقت وہ تمام منافع مثلاً کاشت کی پیداوار اور اجارہ کی منفعت وغیرہ واپس کرنا واجب ہوگا یا اس کی رقم میں سے وضع کرنا ضروری ہوگا۔

د- جب خریدار اس سے انتفاع کا حق نہیں رکھتا تو بیچنے کا حق کیسے حاصل ہوگا۔

۳- زر ضمانت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اسے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہے تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے، کیونکہ بسا اوقات کرایہ دار مکان کو نقصان پہنچا دیتا ہے، بعض اوقات بجلی، گیس وغیرہ کے بل چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو مالک مکان کو ادا کرنے پڑتے ہیں، اسی لئے زر ضمانت رکھوایا جاتا ہے، ورنہ اگر پورا اعتماد ہو تو پھر اس کی ضرورت ہی نہ رہے، یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا، بلکہ صرف محتمل ہوتا ہے اس لئے اس کو رہن نہیں کہہ سکتے ہیں، لہذا

یہ رقم ہے تو امانت لیکن کرایہ دار کی طرف سے استعمال کی اجازت ہونے کی وجہ سے (جیسا کہ عرف یہی ہے) قرضہ شمار ہوگا (فتاویٰ عثمانی ۳/۴۲۰، ۴۲۱)۔

اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی، کیونکہ جس طرح بائع کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ سامان (مبیع) کم قیمت پر بیچے یا زیادہ قیمت پر اسی طرح مالک مکان کو اختیار ہوگا کہ وہ مکان کا کرایہ کم متعین کرے یا زیادہ۔



بیع و فاء کا حکم

مولانا محمد روح اللہ قاسمی ☆

بیع و فاء کا حکم:

اس بیع میں غور کرنے کے دو پہلو ہیں: بنیادی طور پر بیع کی یہ شکل اختیار ہی اس لئے کی گئی ہے کہ شی مرہون سے انتفاع کی حرمت لازم نہ آئے، کیونکہ شی مرہون سے انتفاع ”کل قرض جرنفعا“ کے تحت آنے کی وجہ سے ربا میں داخل تھا، لہذا قرض کے لین دین کا یہ معاملہ کرتے ہوئے بیع کا معاملہ بھی کر لیا گیا، تاکہ شی مرہون مرہون کی ملکیت میں چلا جائے اور اس کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہو سکے، اس طرح الفاظ چاہے بیع کے استعمال کئے گئے مگر مقصود مال مرہون کی منفعت کا حصول ہی ہے جو ربا کے تحت داخل ہے، اور فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ”العبرة فی العقود للمقاصد والمعانی لا للالفاظ والمبانی“ (تواعد الفقہ ص ۹۱ للمفتی عظیم الاحسان)۔

معاملات میں مقصود و معانی کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا، لہذا مقصود و معانی کا اعتبار کر کے اسے ناجائز ہونا ہی چاہئے، چنانچہ مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ نے مورخہ ۹ تا ۱۳ مئی ۱۹۹۲ کو جدہ میں منعقد ہونے والے اپنے ساتویں سمینار میں بیع و فاء سے متعلق جو قرارداد پاس کیا ہے اس کا متن درج ذیل ہے:

”ان حقيقة هذا البيع قرض جر نفعاً فهو تحايل على الربا وبعدهم صحته قال جمهور

العلماء“۔

”یروی الجمع ان یبقی هذا العقد غیر جائز شرعاً“ (قراردت ۶۶ قرارات و توصیات مجمع الفقہ الاسلامی بیع الوفاء)۔
(اس بیع کی حقیقت یہ ہے کہ وہ قرض ہے جس سے نفع کا حصول ہو رہا ہے، لہذا یہ بطور حیلہ کے ربا کو حاصل کرنا ہوا اور جمہور علماء اس کی عدم صحت کے قائل ہیں، اسی بنیاد پر اکیڈمی اس بیع کو شرعاً ناجائز ہی سمجھ رہی ہے)۔

دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ اس معاملہ کو کرنے کے لئے صریح طور پر بیع کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، مقصود کچھ بھی ہو، لیکن جس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ یہ معاملہ بیع کے تحت ہی رہے، چنانچہ اس کی نظیر فقہ میں

موجود ہے کہ کسی نے نکاح موقت کیا، مگر نکاح کے موقت ہونے کا اظہار اپنے الفاظ میں نہیں کیا ہے، یہ بات اس کے ذہن میں ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ جماع کے بعد اسے طلاق دے دے گا، ایجاب و قبول میں الفاظ کو مطلق رکھا ہے تو یہ نکاح صحیح ہے، ”معین الحکام“ میں ہے: ”لأنهما تلفظا بلفظ البيع بلا ذكر شرط فيه والعبارة للملفوظ أيضا دون المقصود، فإن من تزوج امرأة ومن نية أن يطلقها بعد ما جامعها صح العقد“ (القسم الثاني، الباب الرابعون، القضا بیع الوفا)۔

(اس لئے کہ عاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا اور اس میں کسی شرط کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور ملفوظ کلام کا بھی اعتبار ہوتا ہے، جیسے کسی نے اس ارادہ سے نکاح کیا کہ جماع کے بعد طلاق دے دے گا (مگر اس ارادہ کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا تو عقد نکاح صحیح ہے)۔

ان دونوں پہلوؤں کے سامنے ہونے کی وجہ سے فقہاء کرام کا اس بیع کے حکم میں زبردست اختلاف ہے، چنانچہ صاحب بحر نے آٹھ اور بزازیہ نے فقہاء کے اقوال بیان کئے ہیں (دیکھئے: البحر الرائق ۶/۱۱، بزازیہ علی ہاشم البندیہ ۴/۳۰۵، ۴۱۰) جن میں مالکیہ و حنابلہ اور متقدمین حنفیہ و شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے، کیونکہ اس میں ایسی شرط موجود ہے جو تقاضائے عقد کے خلاف ہے، یعنی علی السبیل الدوام مشتری کو ملکیت حاصل نہیں ہو رہی ہے، نیز اس میں بائع کا فائدہ ہے، اور ایسی شرط جو تقاضائے عقد کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ احد العاقدین کا فائدہ بھی اس میں ہو اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، نیز عاقدین کا مقصد بیع کا معاملہ کرنا ہے بھی نہیں، بلکہ ربا کے حصول کے لئے بطور حیلہ کے یہ معاملہ وجود میں آیا ہے، اور یہ ہر حال میں ربا اور حرام ہے، موسوعہ فقہیہ (موسوعہ فقہیہ کویت بیع الوفاء) جس کا ما حاصل وہی ہے جو بیان کیا گیا۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بیع و فاء خالص رہن کا معاملہ ہے اور اس پر مکمل رہن کے احکام جاری ہوں گے، چنانچہ مشتری اس کا مالک نہیں ہوگا، اس سے انتفاع کا حق نہیں ہوگا، ہلاک ہونے کی صورت میں اسی کے بقدر دین ساقط ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ معاملات میں اعتبار معانی کا ہوتا ہے، الفاظ کا نہیں، فقہ میں اس کے بے شمار نظائر ہیں کہ الفاظ کسی عقد کے لئے استعمال کئے گئے، مگر اپنے معانی و مقصود کے اعتبار سے وہ دوسرا عقد بن گیا تو مقصود کا اعتبار کیا گیا، جیسے بہہ بشرط العوض بیع ہے، کفالت بشرط البراءة حوالہ ہے اور حوالہ بشرط عدم البراءة کفالت ہے وغیرہ وغیرہ، یہ رائے ابو شجاع، علی السغدی اور قاضی ابوالحسن ماتریدی وغیرہم کی ہے (تبيين الحقائق شرح كنز باب الاكراه)۔

۳۔ بعض متاخرین حنفیہ و شافعیہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ بیع بعض احکام کے لئے مفید ہے، بعض کے لئے مفید نہیں ہے، جیسے مشتری کے لئے بیع سے انتفاع جائز ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ کسی تیسرے سے بیچنا چاہے تو جائز نہیں ہے، ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگرچہ قواعد کی رو سے یہ بیع جائز نہیں ہونا چاہئے لیکن ربا سے بچنے کے لئے یہ معاملہ کیا جاتا ہے، اور اس کا رواج

چل پڑا ہے، اور تعامل کی وجہ سے قاعدہ کے تقاضہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جس کی نظیر استصناع کا معاملہ ہے (موسوۃ فقہیہ کویت ربیع الوفاء)۔

علامہ زلیعی نے اسی قول پر فتویٰ کی صراحت کی ہے، ”و ذکر الزلیعی: أن الفتوی علی أنه بیع جائز مفید بعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعه للغير“ (المحرص ۶/۱۳)، صاحب منظومہ علامہ سمرقندی نے الدین النسفی نے اس قول پر مشائخ زمان کا اتفاق نقل کیا ہے، صاحب نہایہ نے بھی کہا ہے ”علیہ الفتوی“ (تبین الحقائق/الاکراه)۔

۴- قاضی خاں کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ لفظ بیع کے ذریعہ کیا گیا ہے تو بیع ہی ہوگا، پھر قاضی خاں نے مسئلہ تفصیل پیش کی ہے کہ یہ دیکھا جائے گا کہ دوران عقد شرط کا تذکرہ ہوا ہے یا نہیں؟ اگر شرط کا تذکرہ سرے سے نہیں ہوا ہے، البتہ اس معاملہ کے لئے بیع جائز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد عاقدین کے ذہن میں یہ بات ہے کہ یہ عقد لازم نہیں ہے اور ثمن پر قدرت کے بعد اس بیع کو فسخ کر دیا جائے گا، یا شرط کا تذکرہ بیع کے ساتھ متصل ہوا جس کی دو شکل ہے یا تو یہ کہا گیا کہ وفا کی شرط کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا رہا ہے (بشرط الوفا) یا عقد بیع میں رد کی شرط لگا دی گئی، تو ان تینوں شکلوں میں بیع فاسد ہوگی، اور اگر شرط کا تذکرہ ہوا ہے، مگر اس کی صورت یوں ہوئی کہ پہلے عاقدین معاملہ بیع سے فارغ ہو گئے پھر بعد میں بطور معاہدہ کے یہ شرط لگائی گئی تو اس صورت میں یہ بیع صحیح ہوگی، کیونکہ فساد بیع کی کوئی وجہ نہیں ہے، پھر یہ معاہدہ بیع سے الگ ہو کر ایک دوسرا معاملہ ہے، لہذا اس کی پابندی لازم ہوگی، کیونکہ ایفائے عہد کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

۵- ایک قول جسے قول جامع کا نام دیا گیا ہے یہ ہے کہ اس عقد میں بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن تینوں بیک وقت موجود ہیں، اس طرح یہ بیع تین معاملات کا مجموعہ ہے اور ہر معاملہ کے اپنے تقاضے ہیں، بیع صحیح کے تقاضہ سے مشتری کے لئے منفعت جائز ہے، بیع فاسد کے تقاضہ سے عاقدین کو فسخ کا اختیار حاصل ہے اور رہن کے تقاضہ کی بنا پر مشتری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیع کو کسی دوسرے سے بیچے یا رہن رکھے۔

رائے:

جیسا کہ بات آچکی ہے کہ بیع و فاء کا مقصود رہن سے انتفاع حاصل کرنا ہے، اس لئے اگر اس کے معنی و مقصود پر نظر رکھی جائے تو قول اول (جو متقدمین حنفیہ و شافعیہ) کا مسلک ہے کہ یہ بیع فاسد ہے، نیز اس میں بطور حیلہ کے ربا کو حاصل کرنا ہے، اور قول ثانی جو قاضی ابوالحسن ماتریدی وغیرہ کی رائے ہے کہ یہ خالص رہن ہے اور اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے کو ترجیح حاصل ہوتی ہے، اور اگر اس کے الفاظ پر نگاہ رکھی جائے تو پھر ان اقوال کو ترجیح ہوتی ہے، جس میں فی نفسہ اسے جائز ہونے کی بات کی گئی ہے، جیسا کہ متاخرین حنفیہ کا یہی مسلک ہے، ہم نے تین اقوال بیان کئے ہیں جن میں اس معاملہ کو جائز

کہا گیا ہے، پہلا قول جس پر علامہ سمرقندی نے مشائخ زمان کا اتفاق نقل کیا ہے کہ یہ بعض احکام کے لئے مفید ہے، دوسرا قول جو قاضی خاں کا مختار ہے جس میں مسئلہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے، اور تیسرا قول جسے قول جامع کا نام دیا گیا ہے ان اقوال میں راجح کون ہے؟

ان اقوال میں قول جامع کی ترجیح سمجھ میں آتی ہے جس کی وجوہ درج ذیل ہیں؛

۱۔ جس قول پر علامہ سمرقندی نے مشائخ زمان کا اتفاق نقل کیا ہے، نیز علامہ زلیعی کا بھی اختیار کردہ اور صاحب نہایہ کے ذریعہ ”علیہ الفتویٰ“ کی صراحت ہے، یعنی یہ کہ یہ بیع بعض احکام کے لئے مفید ملک ہے، اس کی علت بیان کرتے ہوئے ”در الاحکام شرح غرر الاحکام“ اور ”معین الاحکام“ وغیرہ میں یہ لکھا ہے: ”لأنهما تلفظا بلفظ البيع من غیر ذکر شرط فيه والعبارة للملفوظ لصادون المقصود، فإن من تزوج امرأة ومن نيته أن يطلقها بعد ما جامعها صح العقد“ (در الاحکام کتاب البیوع ربيع الوفاقیل کتاب الغنعة، معین الاحکام القسم الثانی الباب الاربعون)۔

(اس لئے عاقدین نے لفظ بیع کا تلفظ کیا ہے اور اس میں کسی شرط کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور اعتبار مقصود کے مقابلہ میں نصاب مملو کا ہوتا ہے، چنانچہ اگر کسی نے اس نیت سے نکاح کیا کہ جمع کے بعد طلاق دے دے گا) مگر اس نیت کی صراحت نہیں کی (تو یہ نکاح صحیح ہے)، اس علت سے یہ واضح ہے کہ ان حضرات کے یہاں اس بیع کے صحیح ہونے اور مفید ملک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دوران عقد کسی فسخ ورد کی شرط کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور معاملہ کے لئے جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ شرط کے تذکرہ سے خالی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ جب یہ معاملہ کسی شرط کے تذکرہ سے خالی ہوا اور کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا گیا جو بیع وفاء کی طرف مشیر ہو تو بالاتفاق یہ عقد صحیح ہے، کیونکہ اس میں فساد کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے، چاہے شرط کا تذکرہ عقد سے پہلے ہو یا بعد میں ہو اس سے مسئلہ کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، چنانچہ علامہ شامی نے ”جامع الفصولین“ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

”لوتواضعا الوفاء قبل البيع ثم عقدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز ولا عبرة بالمواضعة

السابقة“ (۲۴۶/۴)۔

(اگر بیع سے پہلے عاقدین بیع وفاء پر اتفاق کر لیں پھر بغیر شرط وفاء کے بیع کا معاملہ کریں تو یہ عقد جائز ہے اور سابق اتفاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے)، نیز قاضی خاں کے حوالہ سے بھی یہ عبارت گزر چکی ہے ”ثم ذكرنا الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد“ (خانیہ بہامش الہندیہ ۱۶۵/۲) (اگر عاقدین بغیر کسی شرط کے بیع کر لیں پھر بطور معاہدہ کے بعد میں شرط کا تذکرہ کریں تو بیع جائز ہے اور ایفائے وعدہ لازم)۔

الغرض مسئلہ کی یہ تصویر اسے بحث سے خارج کر دیتی ہے، کیونکہ بیع وفاء نام ہی ایسی بیع کا ہے جس میں رد یا فسخ کی

شرط لگائی ہو اور اسی شرط کی وجہ سے یہ بیع دوسرے بیوع سے ممتاز ہوتی ہے۔

دوسرا قول جو قاضی خاں کا اختیار کردہ ہے اس قول میں قاضی خاں نے درحقیقت بیع و فاء کو حرمت کے دائرہ سے نکالنے کی شکل اور کیفیت کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور جس صورت میں ان کے یہاں یہ بیع جائز ہے یعنی ”وان ذکر البیع من غیر شرط، ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع (کما مرانفا)“ اس شکل کے جواز میں کوئی کلام ہے ہی نہیں، نیز اس شکل پر بھی بیع و فاء کی تعریف صادق نہیں آئے گی، جبکہ قول جامع میں اس شرط کا لحاظ رکھ کر اس پر حکم لگایا گیا ہے، چنانچہ ”مجلة الاحکام العدلیة“ میں بیع وفا کی تعریف ”هو البیع بشرط أن البائع متی رد الثمن یرد المشتري إليه المبیع“ کے بعد درج ہے: ”وهو فی حکم البیع الجائز بالنظر إلى انتفاع المشتري به، وفي حکم البیع الفاسد بالنظر إلى کون کل من الفریقین مقتدرا علی الغنم، وفي حکم الرهن بالنظر إلى أن المشتري لا یقدر علی بیعه الی الغیر“ (المادة/۱۱۸)۔

۳- قول جامع کے اعتبار سے اگرچہ یہ معاملہ تین عقود (بیع صحیح، بیع فاسد، رہن) کا مجموعہ بن جاتا ہے، مگر اس کی نظیر کتب فقہ میں مذکور ہے: ”کالمضاربة، فإن المال عند المضارب أمانة، فإذا تصرف فهو وکیل، فإذا ربح فهو شریک، فإذا فسدت فهو أجیر اجارة فاسدة، فإذا خالف فهو غاصب“ (جامع الفصولین بحوالہ شرح التواعد الفقہیة القاعدة الثانية العبرة فی العقود للمقاصد، للشیخ احمد بن محمد الزرقاء)۔

(جیسے مضاربت کہ مال مضارب کے پاس امانت ہے، تصرف کے بعد وہ وکیل ہے، حصول نفع کے بعد شریک ہے، مضاربت فاسد ہونے کی صورت میں اجیر ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں غاصب ہے)۔

۴- صاحب بحر نے کہا ہے: ”وینبغی أن لا یعدل فی الافتاء عن القول الجامع“ (البحر ۶/۱۳) (مناسب ہے کہ فتویٰ دینے میں قول جامع سے اعراض نہ کیا جائے)۔

۵- ”مجلة الاحکام العدلیة“ میں ہے: ”الحاجة تنزل منزل الضرورة عامة أو خاصة ومن هذا القبیل تجویز البیع بالوفاء لیث أنه لما کثرت الدیون علی أهل بخاری مست الضرورة إلى ذلک وصار مرعیا“ (مجلة الاحکام العدلیة/المقالة الثانية/المادة/۳۲)۔

۶- قول جامع کو ہی مجلة الاحکام العدلیة میں اختیار کیا گیا ہے (کما مر المادة/۱۱۸) چنانچہ شیخ احمد بن محمد الزرقاء نے اپنی شرح میں لکھا ہے: ”والمفتی به هو القول الجامع وعلیه جرت الجملة فی المادة/ (۱۱۸)، وهو أن جمیع الوفاء له شبهة بالبیع الصحیح وشبهة بالفاسد وشبهة بالرهن وله من کل شبهة بعض أحكام الشبهة به، ولا مانع من أن یكون للعقد الواحد أكثر من حکم واحد باعتبار المقصود منه“ (شرح التواعد الفقہیة حوالا بالبالا)۔

(مفتی بہ قول جامع ہے اور ”مجلة الاحکام العدلیة“ میں اسے اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بیع وفا کو بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن تینوں سے مشابہت ہے اور تینوں کے احکام کا ایک حصہ اس میں موجود ہے اور اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ایک عقد

کے لئے مقصود کے اعتبار سے ایک سے زیادہ حکم ہو۔

نیز خواجہ علی حیدر مجلہ کی شرح میں لکھتے ہیں: ”والحاصل أن بيع الوفاء إن وجد فيه تسعة أفعال فارجعها القول الذي اتبعته الجملة في قولها ”وهو في حكم البيع الجائز بالنظر إلى انتفاع المشتري به، وفي حكم البيع الفاسد بالنظر إلى كون كل من الفريقين مقتدرا على الفسخ، وفي حكم الرهن بالنظر إلى أن المشتري لا يقدر على بيعه إلى الغير“ (دررالحکام فی شرح مجلۃ الاحکام الربویۃ / المادة بیع الوفاء)۔

شیخ مصطفی الزرقاء نے بیع وفا میں فقہاء کے اختلاف اور قول جامع کی ترجیح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ”فبناء علی هذا لا یصح بعد ذلك اطلاق القول بأن بیع الوفاء عند الحنفیة هو كالرهن من جمیع الوجوه ولا أن یقال: إن منافع البیع وتمرتة هی للبائع، ولا یحل شیء منها للمشتري، إلا بإذن البائع“ (مجلۃ بیع الفقه الاسلامی / العدد السابع / بیع الوفاء)۔

(چنانچہ اب یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حنفیہ کے یہاں بیع وفاء مکمل رہن کی طرح ہے، نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ منافع بیع پر مکمل بائع کا حق ہے اور اس کی اجازت کے بغیر مشتری کے لئے کچھ بھی حلال نہیں ہے)۔

ایک شبہ کا جواب:

بیع وفا کے جواز کا قول اختیار کرنے کی صورت میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ بیع درحقیقت ربا کو حاصل کرنے کا ایک حیلہ ہے، حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے اپنے بھائی مفتی محمد تقی عثمانی کی ”تکملہ فتح الملہم“ کے حوالہ سے اس شبہ کو حل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت یہ وہم ہی صحیح نہیں ہے، کیونکہ مثلاً اگر مرتہن شی مرہون سے فائدہ اٹھالے تب تو وہ حرام ہے، لیکن اگر کسی مرتہن نے شی مرہون کو راہن سے خرید لیا اور اس کا مالک ہو گیا پھر ملکیت کی بنیاد پر فائدہ اٹھالیا تو پھر اس انتفاع کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہوگا اور یہ آیت خداوندی ”احل الله البیع“ (سورۃ بقرہ: ۲۷۵) کے تحت داخل ہوگا۔

نیز یہ حیلہ شرعاً ممنوع بھی نہیں ہے، پھر اپنے بھائی مفتی تقی عثمانی صاحب کے حوالہ سے اور یہ امام سرخسی کی مبسوط کے حوالہ سے تکملہ میں فرماتے ہیں: ”إن ما يتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن“ جو حیلہ حلال تک پہنچنے یا حرام سے بچنے کا ذریعہ بنے وہ جائز ہے، نیز شیخین و نسائی کی ”أو كل تمر خيبر هكذا؟“ والی روایت سے بھی اس کے جواز پر استدلال کیا ہے، پھر مفتی رفیع صاحب فرماتے ہیں: ”وفی مسألتنا أی مسألة بیع الوفاء تغیرت حقيقة العقد، فإن حقيقة بیع الوفاء كانت رهنا فی الأصل، ثم غیروا الرهن إلى البیع ولا شبهة فی جواز البیع فكان جائزا“ (تکملہ فتح الملہم ۱/ ۵۱۵ حدیث رقم ۴۰۲۲)۔

(بیع وفاء کے مسئلہ میں عقد کی حقیقت بدل گئی ہے، کیونکہ بیع وفاء دراصل رہن کا معاملہ تھا پھر یہ بیع کا معاملہ ہو گیا اور

بیع کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے پس یہ جائز ہوگا۔

الغرض جب یہ معاملہ جو خاص قید و بند کے ساتھ کیا جاتا ہے تین معاملات (بیع صحیح، بیع فاسد، رہن) کا مجموعہ ہے، تو اسے بیع و رہن دونوں کہنا صحیح ہے اور ان تینوں کے احکام اس پر جاری ہوں گے۔

چنانچہ بیع صحیح ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ خریدار جب تک اسے اپنے پاس رکھے گا عقد کی بنیاد پر اسے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوگا، بیع فاسد ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ عاقدین کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اس معاملہ کو فسخ کر دے اور اس کے لئے دوسرے فریق کی رضامندی ضروری نہیں ہوگی۔

رہن کی مشابہت کا فائدہ یہ ہے کہ مشتری کو حق نہیں ہوگا کہ وہ اس مال کو کسی تیسرے سے فروخت کر دے، نہ ہی اسے کسی تیسرے کے پاس رہن رکھنے کا حق ہوگا، اگر خریدار نے کسی تیسرے سے فروخت کر بھی دیا تو یہ بیع، نافذ نہیں ہوگی، ”عدم نفاذ بیع المبیع و فاء من غیر البائع و ذلک؛ لأنه کالرهن و الرهن لا یجوز بیع“ (موسومہ فقہیہ ریح الوفا)۔

مالک اول کو بیچنے کی صورت میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی اور اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کر سکتا ہے، رہا کثیر ضمانت پر کرایہ کے کم کرنے کا معاملہ تو اصل میں ضمانت کی رقم امانت ہوا کرتی ہے اور اس طرح اس پر امانت کے احکام نافذ ہونے چاہئیں، لیکن صاحب مال کی طرف سے کبھی صراحتاً اور عام طور سے عرفاً اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ اسے اپنے استعمال میں لائے گا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ استعمال میں لائی جاتی ہے، لہذا جب صورتحال یوں ہے تو اب یہ رقم امانت نہیں رہی، بلکہ اس پر قرض کے احکام نافذ ہوں گے اور یہ بات یقینی ہے کہ اسی بنیاد پر کرایہ میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے، اس طرح اسے قرض پر فائدہ حاصل کرنا سمجھا جائے گا اور جواز کے دائرہ میں نہیں آسکے گا۔

بیع الوفاء کے احکام

مفتی عبدالنواب انادی ☆

فقہاء کرام کی تصریحات اور ان کے اقوال پر نظر کرتے ہوئے اور حتی الامکان ان میں تطبیق کی راہ تلاش کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شرعی بیع صحیح اور درست ہے ضرورت کے وقت ایسی صورتوں سے فائدہ اٹھانا شرعاً درست قرار دینا چاہئے۔

بیع وفاء جس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ تم میری فلاں شی اتنے پیسے میں خرید لو اس شرط کے ساتھ کہ جب میں تم کو تمہارا ثمن واپس کر دوں تو تم میری شی مجھے واپس کر دینا، تب تک تم اس بیع سے اور ہم اس ثمن سے فائدہ اٹھائیں۔ شرعی بیع ہے اور اسے بیع ہی قرار دینا چاہئے، کیونکہ مبادلۃ المال بالمال جو بیع کی اولین شرط ہے وہ یہاں پر بھی موجود ہے اور بیع کی دوسری شرط ایجاب و قبول ہے سو وہ بھی یہاں پر موجود ہے، اس لئے اسے بیع نہ کہا جائے گا تو اور کیا کہیں گے، اور جب ایجاب و قبول ہے مبادلۃ المال بالمال ہے اور متعاقدین شرعاً لائق عقد ہیں کوئی چیز ایسی نہیں جو انعقاد عقد کے خلاف اور مانع ہو تو پھر بیع کے منعقد اور درست نہ ہونے کے کیا معنی؟ بیع وفاء درست ہے شرعاً منعقد ہوتی ہے اور جو عقود صورت بیع وفاء پر ہمارے معاشرہ میں ہوتے ہیں اور فساد عقد کوئی چیز ان عقود و معاملات بصورت بیع وفاء درست اور جائز قرار پائیں گے۔

رہی بات حکم کی تو بیع وفاء کی ہم اس صورت کا ذکر کرتے ہیں جس میں شرط وفاء صلب عقد میں نہ ہو، خواہ قبل العقد ہو یا بعد العقد اور شرط وفاء بعد العقد ہو یہی زیادہ مناسب ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بائع کے حق میں رہن ہے اور مشتری کے حق میں بیع ہوگی، مشتری کو بیع سے انتفاع کا حق حاصل ہوگا سوائے اس کے کہ وہ بیع فروخت نہیں کر سکتا ہے، کیونکہ وہ بائع کے حق میں رہن رہنے کی وجہ سے شی مرہون کے درجہ میں ہوگی اور حق انتفاع اس لئے ہوگا کہ مشتری کے حق میں یہ معاملہ خود بیع ہے اور بیع سے مستفاد بیع سے نفع اٹھانا مشتری کا حق ہے جو اسے ملتا ہے۔

الف- بیع وفاء کو بیع قرار دے دینے کے بعد مشتری کے حق میں یہ شرط کی وہ مشتری سے وقت معینہ تک نفع اٹھانے

کا مالک ہے اسے کسی غیر سے بائع کے علاوہ فروخت نہیں کر سکتا، یہ دو وجہ سے ہے، ایک تو یہ کہ متعاقدین نے بعد از معاملہ البیع یہ معاہدہ کیا کہ جب بائع ثمن لوٹا دے گا تو مشتری اسے بیع واپس کر دے گا تو ایسی صورت میں یہ ایفاء عہد مشتری پر واجب ہوگا، کیونکہ کبھی کبھی عقود میں ایفاء عہد واجب ہوتا ہے جیسا کہ فقہاء کرام کی عبارات سے مندرج ہے۔

”وفی الدرالمختار قال: ولو بعده علی وجه الميعاد جاز ولزم الوفاء به، لأن المواعيد قد تكون لازمة لحاجة الناس، وهو الصحيح كما في الكافي والخانية، وقال ابن عابدين: قلت: وهذا ظاهر علی هذا القول بأنه بيع صحيح لا يفسده الشرط اللاحق“ (شامی مطلب فی بیع الوفاء ۷/۲۲۵، دیوبند، ہندیہ ۲۰۹/۳، تاتارخانیہ ۲۰۵/۹، دیوبند، کفایۃ علی الہدایۃ لمحقق بیع القدر ۲۶۷/۹، دیوبند)۔

مذکورہ عبارت فقہاء بتلا رہی ہے کہ مشتری پر واجب ہے کہ وہ وقت معینہ پر بائع کے ثمن لوٹانے پر اسے بیع لوٹائے، کیونکہ اس صورت میں ایفاء عہد مشتری پر واجب ہے اور شرط واجب کی ادائیگی بجز اس صورت کے نہیں ہو سکتی کہ مشتری پر واجب کی جائے کہ وہ خرید شدہ بیع بر بنائے عہد بائع کے علاوہ کسی اور سے فروخت نہ کرے ورنہ گنہگار ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اس بیع کو چونکہ بر بنائے عرف استحسانا اور ضرورت فرار عن الرباء جائز قرار دیا گیا ہے اور اس میں باعتبار احکام دو چیزوں کو شامل کیا گیا ہے، یعنی اس بیع کو حکم بیع اور حکم رہن سے مرکب کیا گیا ہے اور مشتری کے حق میں بیع اور بائع کے حق میں رہن مقرر کیا گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مشتری بیع سے منتفع ہو اور بائع کی شئی مرہونہ بوقت اداء ثمن واپس ہو اور یہ بجز اس صورت کے نہیں ہو سکتا کہ مشتری وقت معینہ پر بائع کو اس کا سامان باعتبار معاہدہ یا باعتبار اقالہ یا باعتبار شئی جدید ثمن مثل میں واپس کرے۔

ب۔ مالک اول کو بیع لوٹانے یا اس سے فروخت کرنے میں مثل ثمن سابق کی واپسی ہی بائع کو لازم ہوگی، ثمن زائد کا مطالبہ درست نہ ہوگا، کیونکہ معاہدہ ثمن اول ہی کے لوٹانے کا ہوا ہے، نیز بائع کے حق میں یہ رہن ہے اور رہن مرہونہ بوقت واپسی نقص بدلیں قبول نہیں کرتے الا یہ کہ تھوڑی بہت جو بغن لیسیر کہلاتی ہے اس سے کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ شامی میں ہے: ”ان أوفى مثل ثمنه، فإنه يفسخ معه البيع يكون بأن حيث كان الثمن ثمن المثل او بغن يسير وبه افتى في الحامدية- فلو كان بغن فاحش مع علم البائع به فهو رهن، و كذا لو وضع ربح فبات - وقال: جوز لحاجة الناس إليه بشرط سلامة البدلين لصاحبهما“ (الرد المحتار، مطلب فی بیع الوفاء ۷/۲۲۵، دیوبند)۔

مذکورہ عبارت صراحت کرتی ہے کہ مشتری پر لازم اور واجب ہے کہ وہ ثمن اول پر ہی بائع کو اس کی بیع واپس کر دے زیادتی کا مطالبہ اس کے لئے جائز اور درست نہیں ہے۔

ج۔ خریدار جتنے دن اپنے پاس بیع رکھے گا اسے اس بیع سے استفادہ کا حق ہوگا بیع سے نفع اٹھا مشتری کے لئے

جائز اور حلال ہوگا یہ نفع ربا کے زمرے میں نہیں آئے گا، بلکہ مشتری کے حق میں بطریق بیع جائز اور درست ہوگا۔
 د- چونکہ بیع و فاء میں مشتری کو بیع پر ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی اسے صرف بیع سے نفع اٹھانے کا حق ملتا ہے تو وہ بیع کو جو کہ اس کے پاس ملکیت غیر ہے اسے فروخت کرنے کا حق کسی طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر مشتری نے فروخت کر دیا تو بائع اسے لوٹا لے گا اور مشتری کی بیع باطل ہوگی شی غیر کو بیچنے کا کسی کو حق نہیں وہ بیع باطل ہوگی (ردالمحتار، مطلب بیع الوفاء ۲۲۶/۷، فتاویٰ ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

اسی طرح مشتری قیمت زائد پر بھی فروخت نہیں کر سکتا چونکہ اس کی ملک نہیں اور اگر اپنے ہی بائع سے قیمت زائد پرواپسی یا فروخت کرتا ہے تو یہ غیر فاحش ہوگا اور اس صورت میں بیع و فاء رہن ہو جائے گی (شامی ۳۲۵/۷، یوبند)۔
 اگر بیع و فاء کو رہن مان لیا جائے تو مشتری پر لازم ہوگا کہ اس کے پاس جو سامان بائع کا بشکل بیع ہے وہ شی مرہون ہوگی اور شی مرہون امانت ہوتی ہے اور شی مرہون سے استفادہ بلا اذن راہن درست نہیں ہوتا اسی طرح مشتری کو بائع کی اجازت کے بغیر بیع سے انتفاع کا حق نہ ملے گا، البتہ اگر بائع اجازت دے دے تو انتفاع جائز ہوگا اگر بیع میں کچھ نقصان واقع ہو جاتا ہے تو مشتری پر ضمان واقع ہوگا اور اگر بیع مشتری کے پاس ہلاک ہو جاتی ہے تو اس کا دین، یعنی ثمن جو بائع کے پاس موجود ہے ساقط ہو جائے گا، اور بائع جب مشتری کا ثمن لوٹائے گا تو مشتری اسے بیع لوٹا دے گا۔

۲- الف: اگر بائع نے اجازت دے رکھی ہے مشتری کو بیع سے انتفاع کی تو جب تک بائع اس کا ثمن نہیں لوٹاتا مشتری کو بیع سے نفع اٹھانا جائز ہوگا، ورنہ نہیں، کیونکہ اجازت نہ ہونے کی صورت میں مشتری کے پاس بیع بطور امانت ہوگی (بشکل مرہونہ) اور مرہونہ سے بلا اذن راہن نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، لہذا مشتری کو بیع و فاء میں جبکہ بیع و فاء کو رہن مانا گیا ہو بلا اذن بائع بیع سے انتفاع جائز نہ ہوگا، اور یہ بھی استحسانا۔

ب- مرہن اگر کسی طرح شی مرہونہ سے منتفع ہونا چاہئے اور راہن اجازت دے دے تو مرہن کا شی مرہون سے نفع اٹھانا درست ہو جائے گا، لیکن یہاں بات چل رہی ہے بیع و فاء کے بارے میں کہ وہ معاملہ رہن ہے اور بائع راہن اور مشتری مرہن اور شی بیع شی مرہونہ، بائع نے مشتری کو فروخت کر دیا مکان یا مکان، دوکان یا مکان شی مرہون اور اس کا ثمن قرض ہوا، مشتری نے جو کہ مرہن ہے بائع راہن سے معاملہ ثانی کیا اجارہ کا یعنی معمولی کرایہ پر اجارہ ہوا، چونکہ یہ معاملہ اجارہ معاملہ اول کی وجہ سے ہوا ہے، اس لئے اس کو ”کل قرض جو نفعاً فہو ربا“ کے تحت حرام یا ناجائز ہونا چاہئے اور چونکہ اس حال میں اجارہ درست نہ ہوگا تو اجرت اجارہ خواہ کم ہو یا زیادہ درست نہ ہوگی، ”کما فی الشامیہ- فان آجر المبیع و فاء من البائع، فمن جعله فاسداً لاتصح الإجارة و لایجب شیء، ومن جعله رهنًا كذلك“ (شامی ۷/۲۲)۔

معلوم یہ ہوا کہ بیع و فاء کو رہن ماننے کی صورت میں اجارہ کی مذکورہ صورت کسی طرح درست نہ ہوگی قرض پر نفع

اٹھانے کی وجہ سے اسے درست قرار نہیں دیا جاسکتا اس میں رہا ظاہر ہے، جو لوگ اس طرح کر رہے ہیں وہ سود پر مبنی معاملہ کر رہے ہیں، ہمیں سود کی ہر صورت سے احتراز کرنا چاہئے اور مدامت کو ہر ایسے سودی مسائل سے بہت دور رکھنا ہے۔

ج۔ اگر بائع کی اجازت سے مشتری کسی کو بیع اجرت پر دیتا ہے تو اجرت بائع کے لئے ہوگی مشتری کے لئے حلال نہ ہوگی اور اگر بائع کی اجازت کے بغیر مشتری کسی کو بیع اجرت پر دیتا ہے تو ایسی صورت میں مشتری پر لازم ہے کہ وہ موصولہ اجرت کو صدقہ کر دے یا پھر بائع کو واپس کر دے، نیز اگر بائع کی اجازت سے مشتری کسی کو اجرت پر بیع دے رہا ہے تو ایسی صورت میں رہن باطل ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ جب رہن باطل ہو گیا تو مشتری اپنے بائع کا وکیل اجارہ بن گیا اور جب مشتری وکیل اجارہ عن البائع ہو تو اجرت اجارہ راجع الی الاصلیل ہوگی نہ کی الی الوکیل، پس معلوم ہوا کہ مشتری کو بیع میں اجارہ وغیرہ کا انتفاع درست نہ ہوگا۔

یہی حکم کا شیکاری وغیرہ کا بھی ہوگا، البتہ اگر اجرت مثل پر بائع سے زمین کرایہ پر مشتری لے لے اور اجرت مثل یا تو شمن بیع پر مضامف کرے یا الگ سے بائع کو دے دے تو کاشت کی پیداوار کا خود مشتری حقدار ہو سکتا ہے، اور اس طرح یہ معاملہ درست ہو سکتا ہے۔

د۔ جب بیع سے خود مشتری کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا ہے وہ بیع نہیں بلکہ شی مرہون ہے تو ایسی صورت میں اسے فروخت کرنے کا حق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ مشتری اجارہ کرے تو اجرت بائع کو دے، بیع کو اگر خود اجرت پر لے تو اجرت مثل بائع کو ادا کرے، اگر اجرت مثل سے کم پر لے تو کل قرض جرنفعا فوربا کے حوالے سے اسے سود قرار دیا جائے وغیرہ تو اس شی مرہون کو جس کا مالک بائع ہے اور وہ مشتری کے پاس بطور وثیقہ رکھی ہوئی ہے اسے فروخت کرنے کا حق مشتری کو کس طرح دیا جاسکتا ہے اور جب مشتری بیع کو فروخت نہیں کر سکتا تو کم اور زیادہ قیمت کا کیا سوال؟

۳۔ صورت مسئلہ میں جو صورت ذکر کی گئی ہے اس میں مذکورہ پیشگی رقم نہ کرایہ میں محسوس ہوتی ہے نہ اسے پیشگی کرایہ ہی تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ اس کثیر رقم کے دباؤ میں مثل کرایہ سے کم پر معاملہ طے ہوتا ہے تو اگر اس رقم کو قرض مان لیا جائے تو یقیناً کل قرض جرنفعا فوربا کے حوالے سے اسے ممنوع قرار دیا جائے گا اور اسے قرض پر نفع اٹھانا قرار دیا جائے گا جو حرام کے درجہ میں ہوگا۔

اور اگر امانت تسلیم کیا جائے تو پھر مکان مالک پر امانت کے احکام جاری ہوں گے اور اسے امانت کو تصرف میں لانے سے منع کیا جائے گا، کیونکہ امانت میں تصرف خیانت کہلاتا ہے جو درست اور جائز نہیں ہے، اور اگر رہن مان لیا جائے تو ایسی صورت میں دیکھا جائے گا کہ پیشگی رقم کا رکھنا اور بعد از واپسی مکان اس رقم کا واپس کرنا الگ طے ہوا ہے جو کہ بصورت رہن ہوا، اور کرایہ کا معاملہ اس کے بعد ہوا، تو ایسی صورت میں رہن ختم ہو جائے گا اور مالک کے ذمہ قرض بدستور باقی رہے گا،

لیکن چونکہ کرایہ کا معاملہ الگ معاملہ ہوگا اور کرایہ میں چونکہ کمی زیادتی ہوتی ہے، اس لئے ایسی صورت میں کل قرض جرنفعا فہو ربا کے حوالے سے اسے ناجائز نہیں کہا جائے گا۔

لیکن یہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ کرایہ مکان اور زر ضمانت ایک ہی مجلس میں ایک ہی معاملہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے حکم میں تعیین کچھ دشوار ہے۔

البتہ یہ معاملہ شبہ رہن معلوم ہوتا ہے، جیسے رہن میں بدل رہن میں تصرف راہن کے لئے حلال ہوتا ہے یہاں بھی مالک مکان زر ضمانت میں تصرف کرتا ہے، نیز جس طرح شی مرہونہ کو مرہن فروخت نہیں کر سکتا کسی کو کرایہ پر نہیں دے سکتا وغیرہ یہاں بھی وہ صورت کسی حد تک پائی جاتی ہے، البتہ وہاں، یعنی رہن میں اگر معاملہ ثانی اجارہ کا ہو جائے، یعنی مرہن راہن سے شی مرہونہ کو کرایہ پر لے لے تو رہن باطل ہو جاتا ہے اور راہن کے ذمہ بدل رہن قرض بن جاتا ہے، یہاں چونکہ ایک ہی معاملہ میں پیشگی رقم اور کرایہ دونوں طے ہو جاتے ہیں، اس لئے نہ تو رہن ہی اصلاً ہوا اور نہ ہی قرض، بلکہ مشابہ بالرہن معلوم ہوتا ہے جس کے تحت یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیشگی رقم جو مالک مکان کے پاس ہے وہ مشابہ بواسطہ رہن قرض ہے جس کا اثر کرایہ پر ہونے والی کمی پر واقع نہ ہوگا، اور یہ معاملہ کل قرض جرنفعا فہو ربا کے زمرے میں داخل ہونے سے باہر نظر آتا ہے، اس لئے اس طرح جو صورتیں دیار میں مروج ہو چکی ہیں اور ان کا ختم کرنا بھی امر مشکل ہے ”الضرورات تبیح المحذورات“ کے قاعدہ سے انہیں جواز کا حکم دینا درست معلوم ہوتا ہے۔

بیع الوفاء کے شرعی احکام

مولانا احسن عبدالحق ندوی ☆

اصولی اعتبار سے معاملہ بیع بقا و دوام کا متقاضی ہوتا ہے، اس عقد کا طبعی تقاضہ یہ ہے کہ عقد کے بعد فروخت کی گئی شئی (بیع) حتمی اور یقینی طور پر فروخت کنندہ (بائع) سے کے خریدار (مشتري) کی ملکیت میں آجائے۔

”بیع وفاء“ اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے بیع ہے، اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے نافذ اور لازم قرار دیا جائے، مگر فریقین چونکہ اس امر پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ آئندہ جب بائع (شئی) بیع کی اصول کردہ قیمت خریدار کو واپس کر دے گا تو خریدار اس شئی کو اسے لوٹا دے گا، اور اس صورت میں خریدار اس شئی کو فروخت نہیں کر سکتا ہے، البتہ اس سے انتفاع کرے گا، یعنی خریدار کو اس سے نفع اٹھانے کا حق تو ملتا ہے، لیکن کسی دوسرے کے ہاتھ اسے فروخت کرنے کا حق نہیں ملتا ہے، اس صورت میں شئی، یعنی بیع خریدار کے پاس رہن رکھی ہوئی چیز کے مانند ہوتی ہے، اور خریدنے والے شخص پر لازم ہوتا ہے کہ جب ثمن واپس مل جائے تو وہ بیع کو واپس کر دے۔

بیع وفاء کے مختلف نام: چونکہ یہ بیع دیگر بیوع لازمہ سے علاحدہ نوعیت کی ہے، اس لیے اس کے مختلف نام فقہاء نے رکھے ہیں، عام طور پر فقہاء اسے ”بیع وفاء“ کا نام دیتے ہیں، اور یہ نام اس لیے ہے کہ خریدار پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس واعدہ کو پورا کرے جو اس نے بائع سے کر رکھا ہے، کہ وہ ثمن واپس کرے گا تو یہ بیع واپس کر دے گا۔

اسی طرح اس بیع کو ”بیع الامانة“ ”رهن معاد“ ”بیع الطاعة“ ”بیع الاطاعة“ ”بیع الجائز“ ”بیع الميعادی“ ”بیع الثنیا“ ”بیع العہدہ“ ”بیع المعاملہ“ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

فقہاء کی اصطلاح میں بیع وفاء یہ ہے کہ کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب بائع (فروخت کنندہ) ثمن مشتری (خریدار) کو لوٹا دے گا، تو اسے بیع واپس کر دی جائے گی۔

اس بیع کو بیع وفاء اس لیے کہا جاتا ہے کہ خریدار پر اس شرط کی وفاداری اور تکمیل لازم ہوتی ہے۔

سوال: یہ معاملہ بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں اگر شرعاً منعقد

اور درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے کہ نہیں؟

جواب: حنفیہ اور شوافع میں سے بعض متأخرین کی رائے ہے کہ بیع جائز ہے اور بعض احکام کا فائدہ دیتی ہے، جیسے خریدار کا فروخت شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا، اور بعض احکام کا فائدہ نہیں دیتی، جیسے دوسرے کے ہاتھ بیع۔

ابن عابدین کا بیع و فاء کے بارے میں دو قول ہیں:

(۱) یہ بیع صحیح ہے، اپنے بعض احکام (یعنی اس سے فائدہ کے حلال ہونے) کا فائدہ دیتی ہے، البتہ خریدار اس کو فروخت کرنے کا مالک نہیں ہے زلیعی نے ”الاکراہ“ میں کہا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

(۲) بعض محققین کا جامع قول یہ ہے کہ یہ بیع بعض احکام کے حق میں فاسد ہے اور بعض احکام کے حق میں صحیح ہے، اور بعض احکام کے حق میں رہن ہے۔ ”النبہ“ میں ہے کہ ہمارے دیار میں عمل زلیعی کی ترجیح پر ہے (ابن عابدین: ۲۴۷/۲۴۸)۔ شرعاً یہ بیع منعقد اور درست ہے، حکماً یہ بیع ہے۔

سوال: بیع قرار دینے پر یہ شرط کے بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ سے ہی بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: بیع و فاء حقیقتاً بیع نہیں، بلکہ حکماً بیع ہے، اس لیے فروخت شدہ چیز کی بیع فروخت کرنے والے کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ اگر بیچی گئی تو بیع نافذ نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ رہن کی طرح ہے اور رہن کی بیع جائز نہیں ہے (ابن عابدین: ۲۴۷/۲۴۸)۔ اسی طرح بیع و فاء بیع مکروہ کے مثل ہے، اور اکراہ کی صورت میں خریدنے والا شخص اگر اس شے کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے تو یہ بیع چدرست نہیں ہوگی، اس جگہ بیع درست نہ ہونے کا سبب بائع (مالک) کی رضامندی کا فوت ہونا ہے، اسی طرح بیع و فاء میں جب بائع اپنی شے کو وفاء کی صورت میں فروخت کرتا ہے، تو وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ شے کسی اور کے ہاتھ فروخت کی جائے، اور بیع و فاء ہوتی ہی ہے اس غرض سے کہ جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو بیع اسے واپس کر دی جائے گی، اسی لیے عام طور پر بیع و فاء کی صورت میں (ثمن) کم رکھا جاتا ہے، لہذا بیع و فاء رضا کے فوت ہونے میں بیع مکروہ کے مشابہ ہے۔

سوال: مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی یا اس سے زائد کا بھی مطالبہ کیا جاسکتا ہے؟
جواب: مالک اول کو بیچنے میں سابق ادا کردہ قیمت ہی لازم ہوگی، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا ہے، البتہ اگر مالک اول اپنی رضامندی سے کچھ اضافہ کر کے دیدے، تو یہ اضافہ صحیح ہونا چاہیے۔

سوال: خریدار جب تک اس کو اپنے پاس رکھے تو اس سے فائدہ اٹھانے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: امام علاء الدین بدر کا یہ فتویٰ ہے کہ بیع و فاء کی صورت میں مشتری خریدی ہوئی چیز سے صرف انتفاع کا مالک ہوگا، اس چیز کا مالک نہیں ہوگا۔

سوال: خریدار اگر اس کو کسی دوسرے سے بیچ دے تو اس بیچ کا کیا حکم ہوگا اور اگر مزید قیمت لے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: بیچ الوفاء میں اگر خریدنے والا شخص اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو وہ بیچ صحیح نہ ہوگی، اس لیے کہ وفاء خریدنے والا شخص قبضہ کے بعد بھی بیچ کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مجاز نہیں رکھتا، بیچ وفاء میں جب بائع اپنی شے کو وفاء کی صورت میں فروخت کرتا ہے تو وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ شے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کی جائے، اور بیچ وفاء ہوتی ہی ہے اس غرض سے کہ جب بائع ثمن واپس کر دے گا تو بیچ اسے واپس کر دی جائے گی۔ لہذا دوسرے سے یہ بیچ صحیح نہ ہوگی، اور جب بیچ صحیح نہ ہوگی تو مزید قیمت کا لینا بھی صحیح نہ ہوگا۔

سوال: اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت خریدار کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہوگی؟

جواب: بیچ الوفاء بیچ اور رہن سے مرکب عقد ہے اور اس پر بیچ اور رہن دونوں کے احکام جاری ہوں گے، مشتری کے حق میں وہ بیچ صحیح ہے، لہذا وہ اس سے انتفاع کا مالک ہوگا، اور بائع کے حق میں رہن ہے، اس لیے وہ اس کا مجاز ہوگا کہ جب وہ مشتری کو ثمن واپس کر دے تو اس سے بیچ کی واپسی کا مطالبہ کرے، نیز رہن ہونے کا ثمرہ یہ ظاہر ہوگا کہ مشتری اس شے کو کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا مالک نہیں ہوگا، اور بیچ صحیح ہونے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بائع کو اس کا حق نہیں ہوگا کہ وہ مشتری کو اس کے انتفاع سے روکے، لہذا خریدنے والا اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

سوال: اگر خریدنے والا اس طریقے پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

جواب: اگر خریدنے والا شخص مروجہ کرایہ سے کم میں خریدتا ہے تو یہ صورت ناجائز ہوگی، اس لیے کہ یہ بیچنے والے شخص کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہا ہے، اور اگر کسی طرح کی کوئی مجبوری نہیں ہے، بلکہ دونوں کی رضامندی سے بیچ ہو رہی ہے تو ایسی صورت میں خریدنے والا کم قیمت میں لے سکتا ہے۔

سوال: اس عرصہ میں خریدار اس شے سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت یا اجارہ داری وغیرہ) حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اس عرصہ میں خریدار اس سے کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے کہ ملکیت خریدار کی طرف منتقل نہیں ہوتی، البتہ اگر فروخت کرنے والا فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدے، تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور اگر خریدنے والا بیچنے والے کی رضامندی کے بغیر فائدہ اٹھاتا ہے، تو یہ اس کے لیے جائز بھی نہیں ہوگا، اور ضمان بھی اس ہر لازم ہوگا (ہندیہ: ۲۰۹، ۳)۔

- ۲- سوال: خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں، اور اگر بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟
 جواب: بیع و فاء رہن ہونے کی صورت میں فروخت شدہ چیز کی بیع فروخت کرنے والے کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ جائز نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ رہن ہے اور رہن کی بیع ناجائز ہے (ابن عابدین: ۲۳۷/۳)۔
- سوال: آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت یا اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت یا رہن کی اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟
- جواب: اس کی حیثیت قرض کی ہوگی، اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی اور اسے قرض پر فائدہ اٹھانے سے تعبیر کیا جائے گا۔

بیع و فاء، بیع ہے یا رہن؟

مولانا محمد نجفی قاسمی درہنگوی ☆

سوال: یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں، اگر شرعاً درست ہے تو حکماً یہ بیع ہے یا نہیں؟

بیع و فاء کی تعریف:

”البيع بشرط أن البائع متى رد الثمن يرد المشتري المبيع إليه“ (الموسوعة الفقهية ۲۶۰/۹)۔ بیع و فاء کسی چیز کا اس شرط پر بیچنا ہے کہ جب بائع قیمت مشتری کو واپس دے دے گا تو مشتری اس سامان کو اسے واپس کر دے گا، بیع کے وقت آپس میں بائع اور مشتری کے درمیان اس کام کے کرنے کا معاہدہ ہوا کرتا ہے، جسے دونوں پورا کرتے ہیں، اس لئے اس بیع کے ساتھ چونکہ دو چیزیں ہو گئیں (۱) بیع، (۲) آپسی معاہدہ کو پورا کرنا، اس لئے یہ صرف بیع ہی نہیں بلکہ بیع و فاء کہلاتی ہے۔

”بیع و فاء“ بیع ہے یا نہیں؟ فتاویٰ تاتارخانیہ (۴۰۵/۹)، مجمع الانہر (۳۸/۳)، انہر الفائق (۳۶۸/۳)، اور البحر الرائق (۱۲۱۱/۶) میں سارے فقہاء نے تقریباً ایک ہی بات کہی ہے کہ بیع و فاء کے بارے میں آٹھ اقوال ہیں: (۱) رہن ہے، (۲) بیع صحیح ہے باتفاق علماء عرف کی وجہ سے، بقول زلیعی یہ بیع جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، مشتری کے لئے فائدہ اٹھانا جائز ہے لیکن اسے بیچنے کی اجازت نہ ہوگی، (۳) قاضی خان کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اگر بیع کے وقت ”لفظ بیع“ سے بیع ہوئی اور ساتھ ساتھ شرط کا بھی تذکرہ کیا تو بیع فاسد ہوگی، اور اگر لفظ بیع سے خرید و فروخت کا معاملہ کر لیا، اس کے بعد کی مجلس میں کسی طرح کی شرط لگائی تو جائز ہے، (۴) اسی سے ملتا جلتا حکم ہے، (۵) بائع اور مشتری نے بس عام بیع کرنے کی طرح (مطلق بیع) کی، پھر وکیل بنایا کہ اگر بائع ثمن حاضر کر دے گا تو وہ وکیل اسے فسخ کر دے گا، یا عہد و پیمانہ ہوا کہ جب دین پورا کر دے گا تو بیع فسخ کر دی جائے گی اور ثمن بیع کے برابر نہ ہوگا یا مشتری کچھ زیادہ وصول کرے گا (اس شکل میں غبن ہے) تو یہ رہن ہے ورنہ بیع، (۶) یہ تیسرے قول کی طرح ہے، (۷) صحیح نہیں ہے، (۸) بعض محققین کی جامع بات یہ ہے کہ وہ

بیع فاسد ہے بعض احکام میں (کہ ان میں سے ہر ایک فسخ کرنے کا مالک ہوگا) صحیح ہے بعض احکام میں جیسے خریدی ہوئی چیز کو اپنے پاس اتارنا (لانا) اور بیع کے منافع، اور رہن ہے بعض احکام میں کہ خریدنے والا دوسرے سے اس کے بیچنے کا، رہن رکھنے کا، درخت کاٹنے کا اور نہ ہی عمارت ڈھانے کا مالک ہوگا اور اس کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائے گا اور اگر اس میں کچھ نقصان پیدا ہو گیا تو اس کی وجہ سے ثمن میں کمی آجائے گی۔

بیع و فایح صحیح ہے:

بیع و فایح کے سلسلہ میں جیسا کہ ذکر ہوا کہ آٹھ اقوال ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر زمانہ کے احوال، اس کی ضرورت، حرام سے بچنے کی مجبوری، اصول کی گنجائش اور تعامل کے پیش نظر یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ بیع صحیح ہے، اور یہ شرط لگانا بھی درست ہے کہ بیع کنندہ ہی سے دوبارہ بیچا جائے، نہ کہ دوسرے سے، اس لئے کہ یہ شرط اس بیع پر کوئی زائد شرط نہیں ہے، بلکہ بیع و فایح کے اندر یہ بات داخل ہے، علامہ ابن نجیم نے زیلعی کے حوالہ سے لکھا ہے: ”إن الفتویٰ علیٰ أنه بیع جائز مفید لبعض أحكامه من حل الانتفاع به، إلا أنه لا یملک بیعہ للغير“ (البحر الرائق ۱۲/۶) فتویٰ اس بات پر ہے کہ یہ بیع جائز ہے اس کے بعض احکام کے لئے مفید ملک ہے یعنی اس سے نفع حاصل کرنا حلال ہے، مگر اس کے بیچنے کا غیر کے معرفت مالک نہیں ہوگا، اسی عبارت سے اس مسئلہ کا حل بھی ہو گیا کہ اس کے لئے اس سے نفع اٹھانا جائز ہے۔

رہی یہ بات کہ مشتری نے بیع کو اگر بیچ دیا تو کیا حکم ہے؟ تو صاحب ”النہر الفائق“، بعض محققین کی جامع رائے نقل

فرماتے ہیں:

”فاسد فی حق بعض الأحكام حتی ملک کل منهما الفسخ، صحیح فی بعض الأحكام كحل الإنزال ومنافع المبیع، رهن فی حق البعض حتی لم یملک مشتری بیعہ من آخر ولا رهن وسقط الدین بهلاکہ فهو مرکب من العقود الثلاثة“ (النہر الفائق ۳/۶۸۳)۔ رہن ہے بعض کے حق میں یہاں تک کہ مشتری دوسرے سے اس کے بیچنے اور اس کے رہن رکھنے کا مالک نہ ہوگا اور اس کے ہلاک ہونے سے دین ساقط ہو جائے گا، بعض مشائخ سمرقند کے حوالہ سے ”تاتارخانیہ“ نے ذکر کیا ہے:

”إذا لم یکن الوفاء مشروطاً فی البیع یجعل هذا بیعاً صحیحاً فی حق مشتری حتی یحل له الانتفاع بالمشتری، كما یحل الانتفاع بسائر أملاکہ، ویجعل رهنًا فی حق البائع حتی لا یتمکن مشتری بیعہ، وإذا مات لا یورث عنه، وإذا جاء البائع بالمال یؤمر مشتری بأخذ المال ورد المبیع علیہ، ویجوز أن یكون للعقد الواحد حکمان“ (فتاویٰ تاتارخانیہ ۲۰۷/۹)۔

بائع کے حق میں یہ صرف معاملہ رہن ہے اور بس، اگر مطلق رہن ہو تو مرتہن کو بالکل اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اسے

بیچے یا دوسرے سے ہبہ کرے وغیرہ اسی طرح مشتری کو بھی بالکل اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اسے دوسرے سے بیچے۔
اس سے یہ بات سامنے آئی کہ کسی درجہ میں مال بائع کی ملکیت میں ابھی تک باقی ہے گویا یہ اسی کا مال ہے، جب
اسی کا مال ہے تو قیمت کی زیادتی کا مطالبہ کیا معنی؟ لہذا جب بائع مال لے آئے تو مشتری کو مال لینے اور بیع کو لوٹانے کا حکم
دیا جائے گا، اگر مشتری مزید قیمت مانگے تو ایسی زیادتی ہوگی جو عوض کے بغیر ہوگی جس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔
اگر اس معاملہ کو رہن قرار دیا جائے تو؟

رہن کی تعریف:

”حبس شیئی بحق یمكن استیفاؤہ منہ“ (الباب فی شرح الکتب ۵/۲) (شیئی کارو کنا کسی حق کے عوض جس کی
وجہ سے شیئی کا وصول کرنا ممکن ہو)۔

رہن کا فائدہ:

جب کوئی آدمی کسی سے کچھ روپے لے تو بطور ضمانت اور گارنٹی کے اپنی کوئی چیز اس کے پاس رکھ دے، تاکہ وہ
قرض لینے والا اگر فرار ہو جائے، تنگ دست ہو جائے، یا ایسی شکل بن جائے کہ قرض دینے والے کے روپے ضائع ہو رہے
ہیں تو اس وقت اسی مال کو بیچ کر اس سے اپنی دی ہوئی رقم وصول کر لے۔
دی جانے والی چیز مرہون، دینے والا راہن، لینے والا مرہن اور یہ معاملہ رہن کہلاتا ہے۔

سوال اور صورت مسئلہ:

ایک آدمی نے روپیہ دیا اور دوسرے نے اپنا کوئی سامان، تو بیچنے والا جب تک اس کو مرہن سے واپس نہ لے لے
اس وقت تک خریدار کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کیا حیثیت ہے؟ اسی طرح کاشت کاری یا اجارہ داری وغیرہ کر کے
فائدہ اٹھانے کی؟ صاحب ”بائع“ نے لکھا ہے:

”لیس للمرتہن أن ینتفع بالمرہون“ (۲۱۲/۵)۔ مرتہن کے لئے مال مرہون سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے،
اسی کو فقہاء نے تفصیل سے اس طرح واضح کیا ہے کہ یہ ناجائز ہے، مثلاً کاشت کاری کر کے، خدمت لے کر، اجارہ داری
کر کے وغیرہ صاحب بحر تحریر فرماتے ہیں:

”ولا ینتفع المرتہن بالمرہن استخدماً و سکنی و لبساً و اجارۃ و اعارة“ (۴۳۸/۹)۔

مرہن مال مرہون سے نہ خدمت، نہ رہنے، نہ پہننے، نہ کرایہ پر دینے اور نہ ہی عاریت پر دینے کا فائدہ اٹھا سکتا
ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال مرہون غلام ہے تو اس سے خدمت نہیں لے سکتا، سواری ہے تو اس پر سفر نہیں کر سکتا، کپڑا ہے تو
اسے پہن نہیں سکتا، گھر ہے تو اس میں رہ نہیں سکتا، قرآن ہے تو اسے پڑھ نہیں سکتا وغیرہ، کیونکہ ”عقد المرہن یفید ملک

الحبس لا ملک الانتفاع“ عقد رہن روکنے کی ملکیت کا فائدہ دیتی ہے، نہ کہ فائدہ اٹھانے کی ملکیت کا (بدائع الصنائع ۲۱۲/۵)، اگر خریدار نے اب بھی کسی طرح کا فائدہ اٹھایا تو تعدی کرنے والا ہوگا اور ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر تاوان لازم آئے گا۔

رہی یہ بات کہ خریدار (مرتن) اسے بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟ یا بیچنے تو کس حد تک قیمت لے سکتا ہے؟ خریدار کو صرف ملکیت جس، یعنی روکنا حاصل ہے اور بیچنے میں عین کو مالک بنانا ہوا کرتا ہے، ”بدائع“ میں ہے:

”ولیس له (المرتھن) أن یبیع الرهن بغير إذن الراهن، لأن الثابت له لیس إلا ملک الحبس، فأما ملک العين فللراهن والبیع تملیک العين، فلا یملک المرتھن من غیر إذن الراهن“ (بدائع ۲۱۲/۵)، اس لئے راہن نے اگر اجازت دے دی تو یہ بیع ہو جائے گی، لیکن اب اس کی قیمت کا مسئلہ رہ جائے گا اس کا عمل صاحب بحر کی تحریر میں یہ ہے:

”لو باع المرتھن العبد الذی یساوی ألفاً بمائة بأمر الراهن وکان رهنًا بألف قبض المرتھن تلک المائة التی هی الثمن قضاء لحقه ورجع علی الراهن بتسع مائة“ (البحر الرائق ۵۰۶/۹، البحر الرائق ۳۸۹/۹) (اگر مال مرہون کو بیچا گیا اور اس کی قیمت اس کے دین سے کم ہے تو بقیہ دین مرتھن راہن سے لے گا، اور اگر مال مرہون کی قیمت دین سے زیادہ ہو تو اس صورت میں ”یورد الفضل علی الراهن إذا کان هناک فضل“ (موسوع فقہیہ ۱۰۰/۹) کہ زیادتی مرتھن راہن کو دے دے گا۔)

خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ اس کے مروجہ کرایہ سے بہت ہی کم ہو تو کیا یہ صورت جائز ہوگی؟ اس سوال کو اگر اس طرح دیکھیں کہ یہ معاملہ رہن ہے تو یہ شکل بالکل جائز نہیں ہوگی، کیونکہ مرتھن کے لئے رہن سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اور یہ ایک طرح کا فائدہ ہے۔

اور اگر صرف خرید و فروخت کی شکل مان لی جائے تب بھی میرے خیال میں جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں ثمن مجہول ہے، اس طرح کہ مکان یا دکان نہ جانے کتنے دنوں مشتری کے پاس رہے گا معلوم نہیں، جتنے دنوں رہے گا اس اعتبار سے اس کا ثمن ہوگا، جبکہ بیع کے وقت ثمن اور بیع کو معلوم ہونا چاہئے، ”ومن شروط صحة البیع أن یکون المبیع والثمن معلومین علماً یمنع من المنازعة، فإن کان أحدهما مجهولاً جهالة مفضیة إلی المنازعة فسد البیع“ (موسوع فقہیہ ۱۰۰/۹)۔

آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت و رہن کی، اور اس کی وجہ سے کرایہ میں کمی جانے والی کمی جائز ہوگی یا اسے قرض

پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا؟ اس جز کے سلسلہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی نے پگڑی کے نام سمینار کر رکھا تھا جس میں مقتدر علماء کرام کی آراء کی روشنی میں فیصلے آچکے ہیں، اس لئے صرف اتنی بات عرض کرنی ہے کہ اگر ضمانت کو قرض مان لیا جائے، پھر مذکورہ طریقہ پر معاملہ کیا جائے تو یہ قرض پر فائدہ اٹھانا سمجھا جائے گا اور یہ جائز نہیں ہے، اس لئے کہ قرض دینے کی وجہ سے ایسا فائدہ مل رہا ہے جس کا کوئی عوض نہیں ہے۔

اس طرح کے معاملہ نے تعامل الناس کی شکل اختیار کر لیا ہے اور اسے اختیار کرنا عاقدین کی مجبوری بھی ہو گئی ہے کہ صاحب مکان مشتری کو دھوکہ دیتے ہیں تو کہیں مشتری صاحب مکان کو، اس لئے اگر کچھ رقم ضمانت کے طور پر ادا کر دی جائے تو دونوں گرفت میں رہیں گے ایک پیسے کی وجہ سے اور دوسرے مکان کی وجہ سے۔

اب اگر رقم پیشگی ادا کر دی گئی اور اس کے بعد کرایہ رواج کے مطابق ادا کیا گیا تب تو کوئی بات ہی نہیں ہے کہ جب مکان کی واپسی ہوگی اس روپے کی واپسی ہو جائے گی اور فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔

اور اگر مروجہ طریقہ سے کم کرایہ ادا کیا جس کا رواج ہے تو اس صورت میں یہ نہ قرض رہے گا اور نہ ہی رہن، بلکہ اجارہ کی شکل ہو جائے گی جس کی فتاویٰ عالمگیری (۴۴۲/۴) نے اجازت دی ہے اور شامی (۱۷/۴) بھی اس بات کے مؤید ہیں، اس لئے اس معاملہ کو اجارہ قرار دے کر امت کو حرام خوری سے بچنے کی شکل نکالنی چاہئے۔

بیع الوفاء کی تحلیل و تجزیہ

مولانا محمد عکلیل اسلام پوری سعادتی ☆

قول راجح کی تعیین:

بندہ کی نظر میں یہ بیع ہی ہے یہ بیع صورتہ گرچہ رہن معلوم ہوتی ہے، لیکن جب الفاظ کی لڑی پر نظر جاتی ہے تو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ عقد بیع ہے رہن نہیں جیسا کہ قاضی خاں نے اختیار کیا ہے۔

”والصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهناً ثم ينظر إن ذكرنا شرط الفسخ في البيع فسد البيع وإن لم يذكر ذلك في البيع وتلفظاً بلفظة البيع بشرط الوفاء أو تلفظاً بالبيع الجائز وعندهما هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك، وإن ذكرنا البيع من غير شرط ثم ذكرنا الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (ہندیہ ۲۰۹/۳)۔

اور یہی مسلک صاحب نہایہ اور ابن نجیم مصری کا بھی ہے اور ہمارے اکابرین میں حضرت تھانویؒ نے ”امداد الفتاویٰ“ میں فریق اول کے دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصولاً عدم جواز کو ثابت کیا ہے اور بوقت ضرورت فریق ثانی کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے۔

اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے ”فتاویٰ خلیلیہ“ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے اور بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے، تاکہ فقہاء متاخرین کے دونوں فریق کے قول پر عمل ثابت ہو جائے۔

بیع ہے یا رہن؟

جو حضرات رہن کے قائل ہیں، جیسے سید امام ابوالشجاع، امام علی السعدی، امام الحسن الماتریدی ان حضرات کا کہنا ہے کہ

اس عقد میں پوری رہن کی روح کا فرما ہے، اس لیے کہ احضار دین کے وقت عین بیع کو واپس کرنا یہ رہن ہی کی صورت میں ہوتا ہے ان حضرات کا مستدل قاعدہ ہے۔

”العبرة في العقود للمعاني دون الألفاظ“، جیسا کہ علامہ زلیعی قائلین رہن کی تعیین کے بعد لکھتے ہیں: ”قالوا لما شرط فيه أخذه عند قضاء الدين أتى بمعنى الرهن؛ لأنه هو الذي يؤخذ عند قضاء الدين والعبرة في العقود للمعاني“ (المبسوط للسرخسی ۲۱۰۳)۔

لیکن اس کو رہن کہنا بدو ووجہ ناممکن ہے۔

(الف) اس لیے کہ عاقدین نے اپنے کلام میں کہیں بھی رہن کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ کیا ہے تو صرف بیع کا اور قاعدہ مسلمہ ہے کہ جب ایک لفظ بولا جائے اور دوسرے معنی مراد لئے جائیں، یعنی لفظ معنی غیر موضوع لہ میں استعمال کیا جائے تو اس میں کسی نہ کسی علاقہ کا پایا جانا ضروری ہے اور لفظ بیع اور رہن میں کوئی بھی علاقہ نہیں، یعنی رہن کو بیع نہ عرفاً کہا جاتا ہے اور نہ لفظاً۔

(ب) جب تک لفظ کا تکلم نہ کیا جائے نیت مخفی کا اعتبار نہیں، چنانچہ آپ دل میں لاکھ طلاق کے ارادے کر لیں، لیکن جب تک زبان سے نہیں نکالیں گے طلاق واقع نہ ہوگی۔ اسی طرح محشی ہدایہ نے زین الدین العراقي کے حوالہ سے نکاح موقت کے باب میں ایک جزئیہ اسی طرح کا ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص عقد نکاح میں توقیت کی شرط کا ذکر نہیں کرتا، لیکن دل میں ارادہ ہے کہ اتنی مدت، مثلاً ایک ماہ بعد طلاق دیدوں گا تو اس نکاح کی صحت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

”قال شيخنا زين الدين العراقي في شرح جامع الترمذی نكاح المتعة حرام إذا ذكر التوقيت فيه وإذا كان في نية الزوج أنه لا يقيم معها إلا سنة واحدة أو شهراً أو نحو ذلك ولم يشترط ذلك فإنه نكاح صحيح“ (معارف القرآن ۷/۵۲۳)۔

لہذا معانی محضہ کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ان معانی کا اعتبار ہوگا کہ الفاظ جن کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔

بیع جائز یا ناجائز؟

جن حضرات نے اس بیع کو ناجائز کہا ہے ان کے پیش نظر دو چیزیں ہیں:

(۱) ان حضرات نے اس کو ہزل پر محمول کیا ہے ”ومن المشائخ من جعله باطلاً اعتبره بالهازل“۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ کے مابین کوئی مناسبت نہیں، اس لیے کہ ہازل تو بیع کا ارادہ ہی نہیں رکھتا، بلکہ وہ تو صرف استہزاء اور مذاق کرنا چاہتا ہے جب کہ بیع و فاء میں بائع کا ارادہ حقیقتاً بیع کا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ بیع بات کرنا نہیں چاہتا، ورنہ نفس عقد کا ارادہ ضرور ہے۔

(۲) بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ ربا اور سود کے حلال کرنے کا ایک طریقہ ہے، اس لیے ناجائز ہے، جیسے: ”ہندیہ“ میں عبارت ہے ”البيع الذی تعارف أهل زماننا إحتیالاً للرباء وسموا ببيع الوفاء“ (زیلی ۱۸۳/۵)۔

”ولأن البيع على هذا الوجه لا يقصد منه حقيقة البيع بشرط الوفاء وإنما يقصد من ورائه الوصول إلى الرباء المحرم، والرباء باطل في جميع حالاته“ (احمد من مقالات اصحاب العرب)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اول تو جب ایجاب و قبول لفظ بیع کے ساتھ پایا جائے تو بیع تام ہو جاتی ہے، اور یقیناً یہ ربا سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، لیکن حیلہ علی الاطلاق ممنوع نہیں، بلکہ اس وقت ممنوع ہے جبکہ اس کے ذریعہ حکم شرعی کا ابطال مقصود ہو، ورنہ علی الاطلاق حیلہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ خود قرآن مقدس میں اللہ عزوجل نے اپنے نیک اور برگزیدہ بندے حضرت ایوبؑ کو ایفاء قسم کا حیلہ سکھایا تھا، جبکہ آپ نے اپنی قناعت شعرا اطاعت گزار خدمت گار اور فرماں بردار بیوی کو سوسپتی مارنے کی قسم کھائی پھر صحت یاب ہونے کے بعد جب قسم پوری نہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ہی قسم پوری کرنے کا حیلہ بتایا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”وخذ بيدك ضعفا فاضرب به ولاتحنث“ (سورہ ص: ۴۴)۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام جب اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنا اور دیگر بھائیوں سے اپنی حالت کو چھپانا چاہتے تھے، لیکن روکنے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے تدبیر اور حیلہ بتایا تھا کہ ان کے سامان میں سونے کا برتن رکھ دو پھر ملکی قانون کے مطابق جن کے پاس سے سامان مل جائے اس کو قید کر لیا جاتا تھا، اس واقعہ کو ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”كذلك كدنا ليوسف ما كان ليأخذ أخاه في دين الملك إلا أن يشاء الله“ (سورہ یوسف: ۷۶)۔

اسی طرح کتب فقہ میں اضحیہ کے بیان میں ایک جزئیہ لکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شہری اپنی قربانی عید کی نماز سے پہلے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ گنجائش ہے کہ وہ اپنے جانور کو لے کر کسی دیہات میں چلا جائے جہاں کے لوگوں پر عید کی نماز واجب نہیں ہے۔

”وحيلة المصري إذا أراد التعجيل أن يبعث بها إلى خارج المصرفي موضع يجوز للمسافر أن يقصر فيه فيضحويه كما طلع الفجر، لأن وقتها من طلوع الفجر“ (بزاز علی ہاشم البندی ۴۰۷/۲، شامی ۵۳۸/۷)۔

یہ بھی تو ایک حیلہ ہی ہے معلوم ہوا کہ حیلہ علی الاطلاق ممنوع نہیں ہے، بلکہ علامہ سرخسیؒ نے تو اگر حرام سے بچنے اور حلال طریقہ اختیار کرنے کے لیے حیلہ کیا جائے تو اس کو حسن قرار دیا ہے، البتہ اگر کسی کے حق کو باطل کرنے یا باطل کو حق بنانے کے لیے یا حق میں کسی طرح کا شبہ پیدا کرنے کے لیے حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے۔

”فالحاصل أن ما يتخلص به الرجل من الحرام أو يتوصل به إلى الحلال من الحيل فهو حسن وإنما يكره ذلك أن يحتال في حق لرجل حتى يبطله أو في باطل حتى يموهه أو في حق حتى يدخل فيه

شبهة فما كان على هذا السبيل فهو مكروه“ (شامی ۵۳۸/۷)۔

البتہ اگر فعل صریح حرام کو حلال یا حکم شرعی کے ابطال کی غرض سے، جیسے: ”زکوٰۃ کے باب میں“ حیلہ کیا جائے تو حرام اور باطل ہے، بلکہ اس میں زکوٰۃ اداء نہ کرنے کے وبال کے مقابلے میں بھاری وبال کا اندیشہ ہے (شامی ۲۸۲/۷)۔

حرام سے بچنے اور حلال طریقہ اختیار کرنے کے لیے حیلہ کے جواز کی سب سے مضبوط دلیل مسلم شریف کی وہ روایت ہے جس میں ایک صحابی دو صاع ردی کھجور دے کر ایک صاع جبہ کھجور لائے تھے تو آپ ﷺ نے اس کو رباہ قرار دیا اور فرمایا کہ اس دو صاع سے کچھ اور خرید کر لیتے پھر اس چیز کے عوض میں جبہ کھجور خرید لیتے تو جائز تھا گویا آپ ﷺ نے سود سے بچتے ہوئے یہ معاملہ کرنے کی تدبیر بتائی ہے۔

”عن أبي نضرة قال سألت ابن عمرو بن عباس عن الصرف فلم يريابه بأسا فإني لقاعد عند أبي سعيد الخدري ص فسألته عن الصرف فقال ما زاد فهو ربا فأنكرت ذلك لقولهما، فقال: لا أحدثك إلا ما سمعت من رسول الله ﷺ جاءه صاحب نخلة بصاع من تمر طيب وكان تمر النبي ﷺ هذا اللون، فقال له النبي ﷺ: أنى لك هذا؟ قال انطلقت بصاعين فاشتريت به هذا الصاع، فإن سعره في السوق كذا وسعره كذا، فقال رسول الله ﷺ ويلك أربيت إذا اردت ذلك فبع تمرك بسبعة ثم اشتر بسبعتك أي تمر شئت“ (مستفاد از مباحث فقہیہ ۴۲۶ تا ۴۲۸)۔

بیع میں شرط مذکور کا حکم:

(الف) اس بیع کے انعقاد کی مختلف صورتیں ہیں:

(۱) دونوں نے لفظ بیع سے عقد کیا اور کوئی شرط زبان سے ذکر نہیں کی، البتہ دل ہی دل میں فسخ کا ارادہ کر لیا تو اس کے جواز میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔

(۲) لفظ بیع کے ساتھ عقد کیا جس میں وفاء کا ذکر نہیں کیا جب ایجاب و قبول ہو چکا تو اب الگ سے وعدہ کے طور پر شرط کو ذکر کیا تو بیع درست ہے وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ کبھی کبھی وعدہ لازم ہوتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وعدہ ایک طرح کا دین ہے تو اس وعدہ کو بھی حاجۃ الناس کے پیش نظر لازم قرار دیا جائے گا۔

”وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالميعاد، لأن المواعيد قد تكون لازمة قال عليه السلام العدة دين فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس إليه“۔

فلو تباعثما قال أحدهما ”چوں سیم آرم بیع بمن بازده“ فقال نعم لاتفسد البيع“۔

پھر بعد میں لگائی ہوئی شرط اصل عقد کے ساتھ ملحق ہوگی یا نہیں، اس میں دونوں قول ہیں:

(۱) حضرت امام اعظمؒ کے نزدیک ملحق ہوگی پھر اس میں مجلس شرط ہے یا نہیں، سرخسی اور ابوالیسر کے نزدیک شرط ہے اور ایضاح میں ہے کہ اتحاد مجلس شرط نہیں ہے اور یہی قول صحیح ہے۔

(۲) حضرات صاحبینؒ کے نزدیک بعد میں لگائی ہوئی شرط اول کلام سے ملحق نہیں ہوگی۔

”ولو بعد العقد يلتحق به عند الإمام وهل يشترط المجلس للإلتحاق ذكر السرخسي وأبو يسر أنه يشترط، وفي الإيضاح لا يشترط وهو الصحيح..... وعندهما لا“، البتة صاحبين كقول رانج ہے۔ ”وقدمنا في البيع الفاسد ترجيح قولهما بعدم التحاق الشرط المتأخر عن العقد به“۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ پہلے شرط کا ذکر کر دیا بعد میں عقد کیا تو کیا اول شرط کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ دونوں قول ہیں:

(الف) پہلا قول یہ ہے کہ اگر بیع کے لفظ سے عقد منعقد ہوا اور شرط پہلے ذکر کی گئی ہے تو اب بیع بالکل صحیح ہے سابق شرط کا اعتبار نہیں۔

”وإن شرط الوفاء ثم عقداً مطلقاً إن لم يقر بالبناء على الأول فالعقد جائز ولا عبرة بالسابق، في جامع الفصولين أيضاً—لو شرط شرطاً فاسداً قبل العقد ثم عقداً لم يبطل العقد—وقد سنل الخير الرملي عن رجلين توأما علي بيع الوفاء قبل عقده وعقد البيع خالياً عن الشرط فأجاب بأنه صرح في الخلاصة والفيض والتاتارخانية وغيرها، بأنه يكون على ما توأما“۔

(ب) دوسرا قول یہ ہے کہ اگر عقد میں یا عقد سے پہلے فسخ کی شرط ذکر کی جائے تو یہ بیع فاسد ہے یا دونوں نے اس کے غیر لازم ہونے کا ارادہ کیا تو بھی بیع فاسد ہے۔

”قيل: إن بلفظ البيع لم يكن رهناً إن ذكر الفسخ فيه أو قبله أو زعماه غير لازم كان بيعاً فاسداً ولو بعده علي وجه الميعاد لزم الوفاء به“۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ عقد بیع میں ہی شرط فسخ کو ذکر کیا جائے تو بعض حضرات نے تو اس کو فاسد قرار دیا اور فساد کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بیع اور شرط دونوں جمع ہیں اور حدیث پاک میں دونوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے، لہذا یہ بیع ناجائز ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علی الاطلاق کوئی بھی شرط بیع کے عدم جواز کا سبب نہیں بن سکتی، بلکہ وہ شرط جس کا عرف ہو چکا ہو جس کو عقد میں ذکر کرنا لوگوں کی عادت بن چکا ہو ان شرائط سے بیع فاسد نہیں ہوتی مثلاً:

(۱) اس شرط کے ساتھ کوئی چیز خریدتا ہے کہ بائع جو تے کے ناپ کا کاٹ کر دے گا۔

(۲) یا پرانا کپڑا خریدتا ہے اس شرط پر کہ بائع پیوند لگا کر دے گا۔

(۳) یا موزہ خریدتا ہے اس شرط پر کہ بائع پھٹن سی کر دے گا، ان شرائط کو فقہاء نے عرف کی بناء پر جائز قرار دیا ہے اور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ متعارف شرط بیع کو فاسد نہیں کرتی، بلکہ وہ شرط مفسد بیع ہے جس میں احد العاقدین یا معقود علیہ کا فائدہ ہو یا وہ شرط مفضی الی المنازعة ہو، جیسا کہ کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور ظاہر ہے کہ جب اس شرط کا تعامل ہے اور عاقدین اس پر راضی بھی ہیں تو یہ مفضی الی المنازعة نہیں تو عرف کی بناء پر اس کو جائز قرار دینا ہوگا، نیز لوگوں کو اس طرح کی بیع کرنے کی حاجت ہے اور حاجت کبھی ضرورت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور قاعدہ ہے کہ ”الضرورات تبیح المحظورات“، لہذا اس معنی کو بھی اس شرط کو جائز قرار دینا ہوگا۔

نوٹ:- یہاں دو باتیں عرف کے سلسلے میں ملحوظ رہیں:

- (الف) عرف سے عرف عام مراد ہے جو ایک شہر کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ تمام شہروں میں اس کا تعامل درواج ہو۔
 (ب) وہ عرف کسی نص صریح کے معارض نہ ہو۔

اب سوالنامے میں ذکر کردہ جزئیات کا جواب لکھا جاتا ہے:

- (ب) ”المؤمن إذا وعد وفا“ اور ”المؤمنون عند شروطهم“ کی وجہ سے جب مشتری اول اسی قیمت پر مالک اول کو بیچنے کا وعدہ کر چکا ہے، لہذا اسی قیمت پر بیچنا لازم ہے۔
 (ج) خریدار کے پاس جب تک وہ چیز ہے تب تک فائدہ اٹھانا جائز ہے۔
 (د) جب خریدار مالک اول سے وعدہ کر چکا ہے کہ اسی کو واپس بیچے گا، لہذا وعدہ کی رو سے اور انسانیت و مروت کا بھی تقاضہ ہے کہ دوسرے کسی کے ہاتھوں بیچنا جائز نہ ہو۔

زر ضمانت کی حیثیت:

مکان یا دوکان کرایہ پر دیتے وقت ابتداءً جو ایک خطیر رقم وصول کی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں کرایہ میں جو کمی واقع ہوتی یہ رقم کیا ہے؟

اس زر ضمانت کو ہم رہن نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ مالک مکان یا دوکان اس رقم کو اسی لیے وصول کرتا ہے، تاکہ اس کو اپنے کاروبار میں لگائے اور یہی عرف ہے رہن قرار دینے کی صورت میں اس کے لیے انتفاع جائز نہیں، اب اس رقم کی دو حیثیتیں ہیں: (۱) قرض (۲) اجرت مجملہ۔ اگر اس کو قرض مان لیں پھر کرایہ کی کمی اسی قرض کے لین دین کی وجہ سے ہے تو یہ معاملہ سراسر حرام ہے، اس لیے کہ یہ اپنے قرض سے نفع اٹھانا ہے اور اپنے قرض سے انتفاع بہر حال حرام ہے، یہ عقد ”کل قرض جرنفعاً فهو حرام“ میں شامل ہے، ہاں البتہ اگر اس کو اجرت مجملہ قرار دیا جائے اس طور پر کہ اجرت کی دو قسمیں ہیں: (۱) اجرت مجملہ (۲) اجرت مؤجلہ۔ مالک مکان کسی ایک مقدار کو یک مشت وصول کر لے جس کو عرف میں

پگڑی کہتے ہیں اور دوسری مقدار ہر ماہ وصول کرتا رہے جس کو عرف میں کرایہ کہتے ہیں، تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔
 ”ولو يعتبر ویراعی کل ما اشترط العاقدان فی تعجیل الأجرة وتأجيلها إلی قوله وإذا كانت الأجرة
 مؤقتة بوقت معین كالشهرية أو السنوية يلزم إيفائها عند انقضاء ذلك الوقت، فلو كانت مشاهرة
 فتؤدی عند نهاية الشهر، وإن كانت سانهة ففي ختام السنة“
 مالک مکان و دوکان کے لیے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یک مشرت رقم لے لے جسے متعین مدت
 تک پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یک مشرت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی۔

بیع بالوفاء - اسلامی نقطہ نظر

مفتی لطیف الرحمن ولایت علی ☆

۱- یہ معاملہ جو بیع کے عنوان سے خاص قید و بند کے ساتھ ہوتا ہے شرعاً منعقد اور درست ہے یا نہیں۔
الف- اگر بیع قرار دینے پر یہ شرط کہ بعد میں کسی دوسرے سے نہ بیچا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیچا جائے اس کا کیا حکم ہوگا؟

یہ خرید و فروخت کی ایک خاص صورت ہے جو بعد کے زمانہ میں رائج ہوئی ہے، شریعت کی اصطلاح میں اسے ”بیع بالوفاء“ کہا جاتا ہے، یعنی ایسی خرید و فروخت جس میں خریدار کی طرف سے یہ وعدہ ہوتا ہے کہ جب فروخت کنندہ اسے پیسے ادا کر دے گا تو اسے یہ شیئی واپس کر دے گا اور اپنے وعدہ کو وفا کر دے گا، علامہ شامی نے اس کی صورت اور تعریف ”عناویہ“ اور ”کفایہ“ کے حوالہ سے ذکر فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

”وصورته كذا في العناوية، وفي الكفاية عن المحيط هو أن يقول البائع للمشتري: بعت منك هذا العين بمالك عليّ من الدين عليّ أني متي قضيتته فهو لي“ (فتاویٰ رد المحتار علی در المختار ۷/۴۲۳)، اور بیع بالوفاء کو مثال سے اس طرح سمجھنا ہوگا کہ مثلاً ”الف“ کے ہاتھ ایک بڑا روپیہ میں کوئی شیئی فروخت کرے اور یہ بات طے پائے کہ بیچنے والے کے پاس اگر ایک ہزار روپے ہو جائے اور وہ یہ رقم خریدار کو ادا کر دے تو خریدار وہ سامان اسے واپس کر دے گا۔ گویا اصل میں مقصد ”الف“ کا ایک ہزار روپیہ ”ب“ سے بطور قرض حاصل کرنا ہے، لیکن اگر یہ رقم قرض کے عنوان سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کے بدلے میں وہ شیئی اس کے پاس رہن رکھی جاتی تو ”ب“ کے لئے اس شیئی سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہوتا، کیونکہ قرض دہندہ رہن سے نفع نہیں اٹھا سکتا، ورنہ یہ سود میں شمار ہوتا۔ اس لئے اس معاملہ کو بیع کے عنوان سے کیا جاتا تھا، علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ حضرات شوافع اس کو ”رہن معاد“ اہل مصر سے ”بیع امانت“ اور اہل شام ”بیع الاطاعہ“ کہتے ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو: ”وسماه الشافعية بالرهن المعاد، وسمى بمصر بيع الأمانة، وبالشام بيع الإطاعة“ (رد المحتار علی در المختار ۷/۴۲۳، بحوالہ قاموس الفقہ ۲/۳۶۶)۔

اب یہ عند الشرع حقیقتاً بیع ہے یا صورتاً بیع اور حقیقتاً رہن کے حکم میں ہے اس بارے میں تفصیل ہوگی اگر بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا کوئی ذکر نہیں آیا، بلکہ جس طرح اور لوگ شب و روز بیع و شراء کرتے ہیں، اسی طرح زید اور بکر نے بھی بیع و شراء کر لی، پھر کسی دوسری مجلس میں دوسرے وقت زید نے بکر سے اس رعایت کی درخواست کر لی (کہ میں روپیہ ادا کر دوں گا اور تم میری جائیداد واپس کر دینا) اور بکر نے اس کو منظور کر لیا تو یہ شرعاً بیع ہوگی، اور درست ہو جائے گی۔ اب زید کا یہ شرط لگانا کہ کسی دوسرے سے نہ بیجا جائے فروخت کنندہ ہی سے بیجا جائے وہ اس بات پر بکر کو مجبور نہیں کر سکتا، زید کو قانوناً مطالبہ واپسی کا کوئی حق باقی نہیں رہے گا، بکر کو اس جائیداد میں مالکانہ تصرف کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، اگر چاہے تو دوسرے شخص کو ہی بیع یا بیع یا رہن میں سب کچھ کر سکتا ہے، زید کو ان تصرفات سے روکنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اور عرصہ معینہ میں فریقین اگر زید روپیہ ادا کر دے تب بھی بکر کو اختیار ہے کہ وہ اگر مناسب سمجھے اور اس کے مصالح کے خلاف نہ ہو، اور بھی کوئی مانع نہ ہو تو واپس کر دے اور اگر مصالح کے خلاف ہو، اور نقصان ہوتا ہو تو اس کو واپسی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ زید کا روپیہ لینے سے انکار کر سکتا ہے، غرض قضاء اس پر کوئی حق باقی نہیں رہا، البتہ دیانتہ اس وعدہ کا پورا کرنا بہتر ہے، تاہم اگر وعدہ کرتے وقت تو پورا کرنے کی نیت تھی، لیکن بعد میں کسی مصلحت و ذاتی ضرورت یا احتمال نقصان کی بنا پر پورا نہیں کرتا تب بھی شرعاً اس پر گناہ نہیں ہوگا (تخصیص فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۲۵۵-۲۵۶)، ”فتاویٰ قاضی خان“ کی عبارت ملاحظہ کی جائے:

”والصحيح أن العقد الذي جرى بينهما إن كان بلفظ البيع لا يكون رهناً ثم ينظر: إن ذكر الشرط الفسخ في البيع ففسد البيع، وإن لم يذكر ذلك وتلفظاً بلفظة البيع بشرط الوفاء أو تلفظاً بالبيع الجائز، وعندهما هذا البيع عبارة عن عقد غير لازم فكذلك، وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع ويلزمه الوفاء بالوعد، لأن المواعيد قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس“ (فصل في الشروط المفسدة على ما مش الفتاوى العالمگیریہ ۱۶/۲۵۵، بکذانی الثامیہ ۷/۲۵۵ مطلب فی بیع الوفاء)۔

ان مذکورہ عبارتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ جب بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ زید نے بکر سے واپس لینے کی کوئی شرط نہیں لگائی ہے تو یہ بیع شرعاً مکمل ہوگئی۔

الف- جب اسے بیع قرار دے دیا گیا تو زید یہ شرط نہیں لگا سکتا ہے کہ آئندہ یہ جائیداد کسی دوسرے کو نہ بیجا جائے، بلکہ میں ہی اسے خریدوں گا، قضاء بکر پر اس کا کوئی حق نہیں، البتہ بکر مناسب سمجھے اور بکر کی مصالح کے خلاف نہ ہو تو بہتر ہے، بکر اپنا وعدہ پورا کر دیں اور اگر نقصان ہوتا تو پھر شرعاً اور قانوناً بکر پر کسی طرح کا جبر نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس کی نیت اور وعدہ وفا کی تھی بعض میں کسی عارض یا مصلحت فوت ہونے کی وجہ سے اگر وعدہ پورا نہیں کر سکتا تو یہ منافق کی علامت

نہیں ہے اور عند الشرع وعدہ خلافی نہیں ہے، صاحب ”الاشباہ والنظائر“ کی عبارت سے وعدہ پورا کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اچھی طرح روشنی ملتی ہے، عبارت ملاحظہ ہو:

”وعده أن يأتيه فلم يأتيه لا يائتم، قال بعض الفضلاء: فإن قيل: ما وجه التوفيق بين هذين القولين، فإن الحرام يائتم بفعله، وقد صرح في القنية بنفى الإيتم؟ قلت: يحمل الأول على ما إذا وعد وفي نيته الخلف، فيحرم؛ لأنه من صفات المنافقين، والثاني على ما إذا نوى الوفاء وعرض مانع“
(الاشباہ والنظائر، الفن الثاني ۲۳۷/۳)۔

ب۔ جب ایک مرتبہ زید اور بکر کے مابین بیع منعقد ہوگئی اور مکمل ہوگئی اب دوبارہ زید بکر... شی کو خریدنا چاہتا ہے تو بکر کو اختیار ہے کہ شمن اول پر فروخت کرے یا کچھ زائد رقم کے ساتھ فروخت کرے، یہ بیع جدید ہے جو دوبارہ ان دونوں کے مابین منعقد ہو رہی ہے، اور بیع جدید میں چاہے زید کو فروخت کرے یا کسی اجنبی کو اصل قیمت پر زیادتی کے ساتھ فروخت کو شرعاً ”مراہحہ“ کہا جاتا ہے، اور اس کی اجازت ہے، مراہحہ کی تعریف صاحب ”تنویر الابصار“ نے یہ فرمائی ہے کہ کوئی آدمی جس چیز کو جتنے میں حاصل کرے اس پر نفع کے ساتھ فروخت کرے۔

”المراہحة بيع ما ملكه بما قام عليه وبفضل“ (رد المحتار ۲۶۱/۷)۔

ج۔ بکر (خریدار) اس شے کا مالک ہو چکا ہے وہ اپنی چیز میں ہر طرح کے تصرف کا حقدار ہے، لہذا فائدہ

اٹھائے گا۔

د۔ نیز اگر بکر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے تو یہ دوسری بیع بھی عند الشرع منعقد ہو جائے گی اور اگر مشتری

ثانی سے مزید قیمت لیتا ہے تو بکر کو اس کی اجازت ہوگی (تخصیص فتاویٰ محمودیہ ۲۵۵/۱۶-۲۵۸)۔

۲۔ اور اگر اس کو رہن قرار دیا جائے تو (الف) جب تک بیچنے والا اس کو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے

لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی حیثیت کیا ہوگی۔

ب۔ اگر خریدار اس طریقے پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کر دے۔

ج۔ اس عرصہ میں خریدار کا اس شے سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا.....

د۔ خریدار اس کو بیچنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں.....

اگر بیع نامہ میں یا مجلس عقد میں یا ان دونوں سے پہلے بطور شرط یا بطور وعدہ زید بکر (خریدار) سے واپسی کا ذکر

کر دے تو اب یہ بیع بالوفاء ہوگی اور یہ بیع ”رہن“ کے حکم میں ہو جائے گی، اور بیع باطل ہو جائے گی کل جائیداد جس کی بیع ہوئی

ہے رہن رہے گی، بکر کو اس سے انتفاع ناجائز ہوگا، نہ اس کی آمدنی لے سکتا ہے، نہ اس کو بیع کر سکتا ہے نہ اجارہ، نہ رہن نہ ہبہ،

بلکہ اس جائیداد کا محض محافظ ہے، امین رہے گا اور اس کی جس قدر آمدنی ہوگی وہ بھی تمام رہن رہے گی، روپیہ وصول ہونے پر

اس جائیداد کے ساتھ اس آمدنی کی بھی واپسی ضروری ہوگی اور جس طرح بکر کو اس جائیداد سے نفع حاصل کرنا اس عرصہ میں جائز نہیں اس طرح زید کو بھی نفع حاصل کرنے کا حق نہیں ہوگا (ملخصاً فتاویٰ محمودیہ ۲۵۷/۱۶)، اور علامہ شامی نے باب بیع الوفاء مستقل باب باندھا ہے، اور اس کو بیع باطل ثابت فرما کر اس جائیداد کو بحکم رہن تسلیم فرمایا ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۷/۴۲۴)۔

اور صاحب ”محیط برہانی“ علامہ برہان الدین البخاری نے بھی ”فتاویٰ نسفی“ کے حوالہ سے اس بیع کو بیع باطل قرار دے کر بحکم رہن تسلیم کیا ہے، ”محیط برہانی“ کی عبارت ملاحظہ ہو:

”وفی فتاویٰ النسفی: أن البیع الذی تعارفوا أهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزاً عن الربافی الحقیقة رہن، والمبیع فی ید المشتري كالرهن فی ید المرتهن، لا علیه ولا یحل له الانتفاع به إلا یاذن الراهن، وهو ضامن لما أكل من ثمرته، وعلیه فتویٰ السید الإمام أبی شجاع السمرقندی وفتویٰ القاضی الإمام علی السعدی ببخاری وکثیر من الأئمة علی هذا“ (۳۶۹/۱۰ فصل الخامس واعرشون فی البیاعات المکتروبه)۔

الف- خلاصہ یہ کہ شرعاً یہ بیع نہیں ہوئی، بلکہ یہ رہن کے حکم میں ہے اور مشتری جو کہ درحقیقت مرہن ہے اس شئی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، علامہ شامی کی عبارت ملاحظہ ہو: ”لا یحل له أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له فی الربا، لأنه یستوفی دینہ کاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً فیکون ربا، وهذا أمر عظیم“ (درمختار ۷/۴۰۱، کتاب الرهن) وکذا فی بدائع الصنائع ۶/۲۲۹ فی حکم الرهن)۔

ب- نیز اگر خریدار اس طریقہ پر خریدے کہ مکان یا زمین کا کرایہ ادا کر دے تو چاہے مروجہ کرایہ کے مطابق کرایہ ادا کرے یا کم کرایہ دے دونوں صورتوں میں کرایہ دے کر انتفاع کی اجازت نہیں ہوگی، رسول اللہ ﷺ نے قرض پر نفع حاصل کرنے کو سود قرار دیا ہے (الجامع الصغیر ۲/۸۳، نیز دیکھئے: البحر الرائق ۶/۴۳۸)۔

ج- نیز اس عرصہ میں خریدار اس شئی سے کسی طرح کا بھی فائدہ نہیں حاصل کر سکتا (درمختار ۷/۴۰۱، وکذا فی بحر ۶/۴۳۸، بدائع الصنائع ۶/۲۲۹)۔

د- نیز مرہن شئی مرہون کے بارے میں امین اور محافظ ہے مالک نہیں ہے، لہذا فروخت بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس نے کسی اور خریدار کو بیع دیا یا رہن کی اجازت کے بغیر تو اب وہ بیع اس کی اجازت پر موقوف ہوگی اور اگر وہ اجازت دیدے تو یہ قیمت مرہن کے پاس بطور رہن ہوگی اور اگر رہن کی اجازت سے فروخت کرتا ہے تب بھی یہ قیمت رہن کے حکم میں ہوگی اور مرہن اس قیمت کا امین ہوگا اگر وہ قیمت ضائع ہو جاتی ہے تو مرہن کے ذمہ اس قیمت کی واپسی لازم ہوگی جب رہن اس قرض کو ادا کر دے گا۔ ”بدائع الصنائع“ (۶/۲۲۹) کی عبارت ملاحظہ ہو:

”ولیس له أن یبیع الرهن بغير إذن الراهن، لأن الثابت له لیس إلا ملک الحبس، فأما ملک العین فللراهن والبیع تملک العین فلا یملکہ المرتهن من غیر إذن الراهن، ولو باع من غیر إذنه وقف

علیٰ اجازتہ جاز و كان الثمن رهنا، و كذا إذا باع بإذنه جاز و كان ثمنه رهناً سواء قبضه من المشتري أو لم يقبضه، ولو هلك كان الهلاك على المرتهن“۔

چند سال پہلے جدہ میں ”اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ“ نے اس موضوع (بیع بالوفاء) پر سیمینار قائم فرمایا تھا، مکہ مکرمہ کی فقہ اکیڈمی نے بھی اس کے عدم جواز کا فیصلہ صادر فرمایا ہے اور اس بارے میں دو قرارداد پیش فرمائی ہیں کہ یہ عقد شرعاً ایک ناجائز عقد اور معاملہ ہے۔ اور درحقیقت یہ بیع قرض دے کر نفع حاصل کرنے کی ایک جدید شکل ہے، اور نئی تدبیر ہے، اور جس کے بارے میں نہیں وارد ہوئی ہے، لہذا اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ اس بارے میں عدم جواز کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس فیصلہ کو بعینہ الدکتور وہبہ الزحلی نے ”الفقہ الاسلامی وادلتہ“ کی جلد سابع میں نقل فرمایا ہے (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ ۷/۵۲۰۳)۔

۳- آج کل بڑے شہروں میں کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی یا امانت و رہن کی.....

اس وقت بڑے بڑے شہروں میں اس طرح کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے، اور اچھے خاصے دیندار حضرات اس میں مبتلا ہو رہے ہیں، مکان مالک اپنا قیمتی فلیٹ کرایہ پر دے کر اس پر ایک بڑی رقم وصول کرنے کے بعد اس کے بدلے میں کرایہ دار بھی اس قیمتی مکان میں بغیر کرایہ پر یا صرف مینٹنس پر اکتفا کرتے ہوئے پورے مکان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور مکان مالک اس کثیر رقم سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اب یہ زر ضمانت کی حیثیت کیا ہوگی قرض کی یا رہن کی اس بارے میں مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں: کہ ڈپازٹ کی رقم اس غرض کے لئے ہوتی ہے کہ جب کرایہ دار مکان خالی کرے تو اگر اس نے مکان میں کوئی نقصان کر دیا ہو تو اس کا ضمان اس سے لیا جاسکے یہ ضمان فی الحال واجب نہیں ہوتا محض محتمل ہوتا ہے، لہذا اس ڈپازٹ کو رہن نہیں کہہ سکتے یہ قرض ہی ہے اور مشروط بحکم العرف ہے (فتاویٰ عثمانی ۳/۴۲۱)۔

اور یہ مذکورہ معاملہ جو اس وقت شہروں میں عام ہو گیا ہے اس کی مکمل تفصیل مفتی احمد خان پوری نے اپنے فتاویٰ ”محمود الفتاویٰ“ میں تحریر فرمائی ہے، اس کا آخری پیرا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”اس لئے صورت مسئولہ میں زید کا بکر سے دو لاکھ روپے بطور ڈپازٹ لے کر اپنا فلیٹ بلا کرایہ رہنے کے لئے دینا اور بکر کا اس میں بلا کرایہ رہنا سود کے حکم میں ہے جو ناجائز ہے، نیز صورت مسئولہ میں بکر پر اس فلیٹ کی اجرت مثل (یعنی عام طور پر اس فلیٹ کا کرایہ جو ہوتا ہے) واجب ہوگی۔“ عالمگیری“ میں ہے:

”لو استقرض رجل دراهم من رجل وقال: اسکن حانوتی هذا الخ“ (ہندیہ ۵۲۱/۴، تلخیص محمود